دلچسپ اور سنسنی خیز کہانیوں کا مجموعہ

# ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ کراچی

دسمبر 2015

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

نگران اعلیٰ
معراج رسول

07

### چینی نکتہ چینی

[illegible]

قارئین کی کرم فرمائیاں [illegible] ادا [illegible]
نامے [illegible] محبتیں عنایتیں اور شکایتیں

14

### ہوش و مدہوش

احمد اقبال

[illegible] کرداروں پر مشتمل معاشرے
کا تانا بانا [illegible] ایک بھرپور تحریر

61

### ٹھنڈا انتقام

سلیم انور

ٹھٹھرا دینے والے موسم میں لہو کو
گرما دینے والے عمل کا ردِعمل

67

### خاموش جنت

[illegible]

اپنوں سے دور [illegible]
روز گزارنے والے تنہا شہریوں [illegible]

83

### گلوریا

سکندر علیم

[illegible] کا
چونکا دینے والا کلائمکس

88

### انگارے

طاہر جاوید مغل

سطر سطر رنگ بدلتی...
ایک لہو رنگ اور دل گداز داستان

131

### ناکام فاتح

تنویر ریاض

ظلم و ناانصافی کے نفرت کدہ میں
ایثار و وفا کی ابھرتی چنگاری کا احوال

145

### چھٹکارا

سلیم فاروقی

ازدواجی زندگی کی نازک ڈوریں...
جو محبت اور غلط فہمیوں میں بندھ چکی تھیں

جلد45 • شمارہ12 • دسمبر2015 • زرسالانہ 800 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 60 روپے •
خط و کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر229 کراچی74200 • فون (021)35895313 فیکس(021)35802551 E-mail:jdpgroup@hotmail.com

مدیر اعلیٰ
عذرا رسول

159
## خام گواہی
جمال دستی

کرنل [illegible] کی کارکردگی
جس نے [illegible] پلٹ دیا

162
## آوارہ گرد
ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

تحیر... [illegible] اور ایکشن میں اُبھرتا
دو [illegible] سلسلہ...

195
## ہتھکڑی
سید [illegible] راجی

قتل کی ایک فنکارانہ واردات کا قصہ...
مجرم نے اپنا کردار بڑے سجاؤ سے نبھایا تھا

205
## جوکر
[illegible] اقبال

غیر معمولی ذہن، [illegible] کے
مالک [illegible] شخص کا طریقہ تحقیق

217
## پرفیکٹ مرڈر
بابر نعیم

چونکا دینے والے انجام کے
[illegible]... [illegible] کی جدت پسندی

220
## حرصِ دوراں
کاشف زبیر

گل و گلزار و فطرت کے حسین نظاروں کو انسانی ہوس سے
داغ دار کرنے والوں کے گھناؤنے کردار کی جھلکیاں

259
## بساط
محمد فاروق انجم

ایک تماشے کے گرد گھومتی کہانی جس میں سرکشی تھی...
بندگی تھی اور وابستگی... بزرگ کی عبرت سامان تحریر

00
## تراش خراش
ادارہ و قارئین

اقتباسات، گدگدیاں، مسکراہٹیں اور قہقہے
سب کچھ آپ کی تفریحِ طبع اور تواضع کے لیے

پبلشر و پرنٹر: عذرا رسول • مقام اشاعت: C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا، مین کورنگی روڈ، کراچی 75500
ایڈیٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

Downloaded From
READING Section
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

## عزیزانِ من...... السّلام علیکم !

گردشِ دوراں کا پیمانہ مزید ایک برس بڑھنے کو ہے۔ سالِ رواں کا آخری شمارہ نذرِ قارئین ہے۔ وقت گزرتا جاتا ہے لیکن ہم مہ وسال کی ان پیش قدمیوں سے بے پروا اپنے معمولات میں گم رہتے ہیں۔ ایک قوم کی حیثیت سے ہمارا یہ رویہ بڑی حد تک باعث ندامت ہے۔ 2015ء میں سیلاب، زلزلے، برفانی طوفان اور برسات کی تباہ کاریاں وقتی طور پر سب کو رلاتی رہیں، ہر برس یہی ہوتا ہے۔ ان قدرتی آفات سے انسانی جانوں کے تحفظ کا اختیار رب العزت نے اپنے ان بندوں کو سونپا ہوا ہے جو اقتدار پر براجمان ہیں مگر وہ جو کچھ کرتے ہیں، وہ وقتی اشک شوئی سے زیادہ نہیں ہوتا۔ سیلابی بند، بارانی نالے، شکستہ سڑکیں، بے دردی سے کاٹے گئے پہاڑی درختوں کا نوحہ کرتے ہولناک لینڈ سلائیڈز...... یہ سب اس معزز طبقۂ اشرافیہ کی نظروں سے اوجھل رہتے ہیں۔ امدادی رقوم آفت زدہ لوگوں کی عزتِ نفس کو مجروح کرتے ہوئے ایسے احسان کے ساتھ بانٹی جاتی ہیں جیسے ذاتی جیب خاص سے دی جا رہی ہوں۔ یہ سب ہمارے اور آپ کے دیے ہوئے ٹیکسوں کا سرمایہ ہوتا ہے۔ جسے لاکھوں گھوسٹ ملازمین، خیانت کار، راشی اور بدعنوان سرکاری اہل کاروں سے چاٹتے چلے آرہے ہیں۔ سارا زور درو بام کی زیبائش پر رہتا ہے۔ کھوکھلی ہوتی ہوئی بنیادوں پر کوئی سرسری نظر ڈالنا بھی پسند نہیں کرتا۔ چین نے قدرتی آفات کے مقابلے اور ان سے فائدہ اٹھانے میں بے مثال کامیابیاں حاصل کی ہیں۔ بارانی اور سیلابی پانی کو چھوٹے چھوٹے ہزاروں ڈیم بنا کر زراعت اور پن بجلی کی طرف موڑ دیا ہے۔ ہم منگلا تربیلا اور کالاباغ کے سحر میں مبتلا ہیں۔ کاش! آنے والا سال ہمارے مقتدر طبقے کے لیے چشم کشا ثابت ہو اور وہ محض باریاں بھگتانے کے بجائے ہم اور آپ جیسے عام لوگوں کو بھی کچھ فیض پہنچا سکیں اور اب فیض یاب ہوتے ہیں اپنے محترم قارئین کے کھٹے میٹھے پیغامات اور تبصروں سے۔

کراچی سے ایم عمران جونانی کی روانی ”جاسوسی جب مستقل پڑھنا شروع کیا تو خیال یہی تھا کہ صرف پڑھنے پر دھیان دیں گے لیکن اس قدر پُررونق محفل میں شامل نہ ہونا بس میں نہیں رہا۔ مجموعی طور پر آپ کا پرچا ایک شاہکار ہے جس میں تمام لوگوں کی پسند کے حوالے سے کچھ نہ کچھ ضرور موجود ہے چاہے وہ دیسی کہانیاں ہوں، مغربی تڑکا یا پھر سلسلے وار داستاں۔ (شکریہ) ایک بات کہتا چلوں کہ جاسوسی تقریباً سارے کا سارا نئے ادب پر مشتمل ہے اس میں اگر کچھ حصہ کلاسیکی ادب اور مشہور دیسی بدیسی قلم کاروں کی تحریروں کے لیے مختص کیا جائے تو دلچسپی کا گراف جو پہلے ہی بلند ہے مزید اوپر جائے گا۔ نومبر کے ٹائٹل پر غالباً انگارے کی ہیروئن کو فٹ کیا گیا، خوب صورت چہرے پر شہد رنگ کی لٹیں نمایاں ہیں اور پس منظر میں دورخی چہرہ۔ جلد باز، تنویر ریاض کی عمدہ تحریر ثابت ہوئی۔ ہمارا عموی رویہ بھی یہی ہے، آدھی بات کمزور مشاہدے کے زور پر نتیجہ اخذ کرتے ہیں اور بدلہ لینے کے لیے دوڑ پڑتے ہیں۔ غرض بے غرض بابر نعیم کے قلم سے یوں لگا کہ افراتفری میں لکھی گئی، پہلی ہی مرتبہ میں درست گھر تک پہنچنا، وہیں دوسرے ملزمان کو بلوا لینا، فوراً ہی ان پر قابو بھی پالینا اور رقم بھی درست اکاؤنٹس میں منتقل ہوگئی۔ بھئی ایسی بھی کیا جلدی تھی۔ مریم کے خان کی خاندانی، جاسوسی کا خاص رنگ لیے ہوئے ہے، ایکشن سے بھرپور اچھا ٹائم پاس تھا۔ طاہر جاوید مغل صاحب کی انگارے جوں جوں آگے بڑھ رہی ہے، دلچسپی میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے ہر پل ایک نیا موڑ، نئے کردار نکھرا ہوا نیا انداز اور جاندار منظر نگاری بندہ خود کو شاہ زیب کے ساتھ محسوس کرتا ہے۔ اس قسط کا اختتام سسپنس لیے ہوئے ہے، آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا۔ ایس انور، اعترافِ جرم کے ساتھ متاثر نہ کر سکے۔ جمال دستی کی مونگ پھلی کی گواہی دل میں نہ اتر سکی، حالانکہ سرد موسم میں مونگ پھلی سے بڑھ کر کیا سوغات ہوگی۔ سلیم فاروقی کی بلیک وارنٹ ترتیب کے اعتبار سے لیڈ کر رہی ہے۔ اس نے پہلے نمبر کی لاج بھی رکھی۔ ایکشن، تھرل سے بھرپور اس خوب صورت تحریر نے آخر تک جکڑے رکھا، امجد رئیس کی بہت سی تحریریں تین تیرہ، سے پہلے بھی پڑھی ہیں۔ وہ میرے پسندیدہ لکھاری ہیں۔ آخری صفحات میں آصف ملک کی ذریعۂ آمدنی اپنے خوب صورت پلاٹ کی بدولت بازی لے گئی۔ آمدنی کے اس ذریعے کی طرف کم از کم میرا دھیان نہیں گیا تھا۔ جاندار لکھاری، احمد اقبال صاحب نے پرائی بیٹی سرورق کے لیے دل سے لکھی۔ سین در سین کہانی بیان کرتے ہوئے ہمیں اپنے ساتھ آگے لے گئے اور پھر سارے ٹکڑے جوڑ کر کہانی کو مکمل کر دیا، ویلڈن جناب۔ سرورق کا دوسرا رنگ کاشف زبیر ٹھیک طرح جما نہ سکے۔ جانے کیوں انداز اکھڑا اکھڑا اور پُرتکلف سا لگا۔ وہ بے ساختگی نہیں کہ انسان آگے پڑھنے پر مجبور ہو۔ تیکھی نکتہ چینی جاسوسی کی جان ہے‘ دل ہے کیسے کیسے لوگ ہر ماہ بہترین تبصرہ کرتے ہیں، دکھ سکھ شیئر کرتے ہیں۔ اس ماہ بھی احسان سحر، حارث محبوب، عزیز بن یاسین، مرجاگل، معراج محبوب عباسی، محمد قاسم رحمان، شمس الحق، انور یوسف زئی، شفقت محمود، عبادت کاظمی، چوہدری سرفراز، ایف ایم اور میری بہن طاہرہ گلزار خوب صورت خطوط کے ساتھ محفل کی جان بنے ہوئے ہیں۔ سب سے زیادہ بلقیس خان کا تبصرہ پسند آیا، نہایت باریک بینی سے مطالعہ کرتی ہیں آپ۔“

چوک سرور شہید سے غلام یٰسین نوناری کی کتھا ”ماہ نومبر کا شمارہ حسبِ معمول 2 نومبر کو موصول ہوا۔ ٹائٹل اس بار منفرد انداز لیے ہوئے تھا۔

READING Section
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN

ہیرو کی پیشانی، دلہن کی پشیمانی اور ہیروئن کے فیس پہ میک اپ کی فراوانی اچھا تاثر قائم کرنے میں کامیاب رہی۔ خوشی سے بے قابو، اچھلتے کودتے محفل میں گھسنے کی ٹرائی کی۔ احسان سحر نے فوراً دروازہ کھولا، شاید انہیں ہماری آمد کی ایڈوانس خبر پہنچ چکی تھی کیونکہ آج کل جرم بعد میں ہوتا ہے خبر پہلے پھیل جاتی ہے۔ دورِ حاضر میں ہر شے ہی ایڈوانس ہو چکی ہے۔ احسان سحر نے دلچسپ انداز میں شگفتہ و برجستہ لفظوں کا برمحل استعمال کرتے ہوئے بہترین حق ادا کر دیا۔ اسلام آباد سے عزیز بن یاسین کی پہلی حاضری خوشگوار رہی۔ معراج محبوب عباسی کی خوب صورت نوک جھونک نے محفل کا رنگ بڑھا دیا۔ محمد قاسم رحمان، فلک شیر ملک اور چوہدری محمد سرفراز کے طویل تبصرے محفل کی جان تھے۔ پشاور کی ننھی منی بہن طاہرہ گلزار کو جاسوسی میں اتنا خوب صورت خط لکھنے پر مبارک باد۔ ویسے طاہرہ! آپ اتنا طویل تبصرہ لکھتی ہیں، کمال ہے۔ ہم سے تو چار لفظ لکھنا جوئے شیر لانے کے مترادف محسوس ہوتا ہے۔ ایف ایم نے بھی آخرکار جاسوسی کی محفل میں اپنی حاضری لگا ہی دی۔ کافی عرصے پہلے جاسوسی کی محفل میں بلیک زیرو کے نام سے دلچسپ تبصرے ہوا کرتے تھے۔ موصوف نہ جانے کہاں غائب ہیں۔ (آپ ڈھونڈ کے لائیں نا) اعجاز احمد راحیل، شوکت شہریار بھی نظر نہیں آ رہے۔ انگارے کی پانچویں کڑی نئی نئی دلچسپیوں اور حیرت ناک ہنگاموں سے بھرپور تھی۔ شاہ زیب اب رفتہ رفتہ فل فارم میں آتا جا رہا ہے۔ آوارہ گرد کی آوارہ گردی کو لگام ڈالنے کے لیے ماں جی نے بیگم صاحبہ کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں تھما ہی دیا۔ یہاں بھی سرمد بابا کی موت کا پڑھ کر آنکھیں نم ہو گئیں اور جب ہم نے یہ پڑھا کہ وہ وصیت میں شہزاد احمد خان کو بہت کچھ سونپ گئے تو دل بھر آیا۔ رنگوں میں دونوں رائٹرز ہی زبردست تحریریں لائے۔ احمد اقبال اس بار سنجیدگی کا لبادہ اوڑھے ہوئے تھے۔ ان کی مزاحیہ تحریریں دل کو جا لگتی ہیں۔ کاشف زبیر نے دلچسپ کہانی لکھی۔ پروفیسر کا کردار بے حد پسند آیا۔ جنید پر بے انتہا غصہ آیا۔ نہ جانے لوگ اصل حقیقت جانے بغیر کسی سے اتنی جلدی بدگمان کیوں ہو جاتے ہیں۔ زخم خوردہ اور خاندانی بھی متاثر کن تحریریں تھیں۔''

سرگودھا سے اسد عباس کی لطف اندوزی ''خلافِ توقع اس بار جاسوسی 4 نومبر کو ہی مل گیا۔ خوشی دوبالا ہو گئی (پہلی خوشی تنخواہ ملنے کی تھی) ٹائٹل والی حسینہ کی شکل میری سابق محبوبہ سے مل رہی تھی۔ فہرست پر نظر ڈالی تو آخری صفحات پر اپنے محبوب مصنف کا نام دیکھ کر خوشی سہ بالا ہو گئی۔ کہانیوں میں سب سے پہلے بے داغ منصوبہ سے انصاف کیا۔ نئے دور کی اغوا کی واردات نے بہت لطف اندوز کیا۔ تاہم جنید کی منفی سوچ نے اچھا تاثر نہیں دیا۔ احمد اقبال کی پرائی بیٹی نے بہت لطف اندوز کیا۔ احمد صاحب کا اندازِ بیاں سب سے جدا ہے۔ دیر سے ہی سہی لیکن ڈاکٹر ہما کو سچا پیار مل ہی گیا، اینڈ کچھ غیر فطری سا تھا۔ انگارے، گو کہ ٹاپک پرانا ہے لیکن مغل صاحب کا اندازِ بیاں اتنا منفرد ہے کہ قاری کو ہر بار ایک نیا پن ملتا ہے۔ گو کہ کہانی کچھ تیز جا رہی ہے لیکن پڑھنے میں لطف دے رہی ہے۔ آصف ملک صاحب کی ذریعہ آمدنی ایک اچھی تحریر تھی۔ خاص طور پر ان لوگوں کے لیے جو رات دن صرف پیسا کمانے کے چکر میں ہیں حلال و حرام کی تمیز کیے بغیر۔ ہٹلر نے کہا تھا کہ ہم ساری زندگی دوسروں کے لیے کماتے ہیں۔ ایم افضل انجم صاحب کی یکسانیت اچھی کاوش تھی۔ اینڈ توقع کے خلاف تھا۔ انگریزی تراجم میں خاندانی، اعترافِ جرم، بلاعنوان اور غرض بے غرض اچھی تھیں۔''

لاہور سے عبدالجبار رومی انصاری کی قلم نویسی ''ایک دوسرے میں مدغم خونچکاں چہرے، انگارا آنکھیں دیکھ کر لگ رہا تھا ٹائٹل کچھ زیادہ ہی خونی ہو گیا ہے مگر کائنات میں رنگ کی جلوہ گری دیکھ کر کچھ اطمینان ہوا کہ ابھی پیار و محبت کے سین باقی ہیں۔ ہلکی سی زلف خم سجائے دوشیزہ بھی آنکھوں سے حسرت و یاس کی تصویر بنی نظر آئی۔ چینی نکتہ چینی خوب رہی۔ ہمارے ہاں تو اتنے خوب صورت سیاحتی علاقے ہیں کہ بندہ دیکھ کے اش اش کر اٹھے لیکن اربابِ اقتدار مری کو اس لیے توجہ دیتے ہیں کہ خود بھی وہاں رہنا ہوتا ہے۔ احسان سحر بھئی واہ آپ نے تو تبصرے میں بھی سحر بکھیر دیا ہے۔ محمد صفدر معاویہ کا خراجِ تحسین قابلِ قدر ہے۔ حارث محبوب اتنی کم عمری میں لکھنا جذبہ قابلِ ستائش ہے۔ عزیز بن یٰسین جسارت اچھی ہے، کرتی رہنا چاہیے۔ مرحا گل اتنا غصہ۔ چلو اب خوشیاں بھی سمیٹ لیجیے، ہاہاہا۔ معراج محبوب کیا اب اعتبار کرنے کے لیے آنکھیں ہی رہ گئی ہیں۔ باقی تبصرہ اچھا ہے۔ قاسم رحمان محبوبہ کو تو بچا لیتے پسٹل دیکھ کے ہی راہِ فرار پکڑ لی۔ شمس الحق اب تصویرِ کائنات میں رنگ میں بھنگ بھی تو کسی کو ڈالنا ہوتا ہے نا، سو اس کے لیے صنفِ کرخت ہی سامنے آتی ہے۔ فلک شیر، عابد اسلم اور شفقت محمود نے بھی بہت اچھا لکھا ہے۔ بشریٰ افضل نے مختصر تبصرہ لکھ کر دوسرے کے لیے جگہ چھوڑی ہے نا۔ بلقیس خان کی تفصیلات ایک دم زبردست لگیں۔ طاہرہ گلزار کا تبصرہ بھی اثرانگیز رہا۔ چوہدری محمد سرفراز نے بھی محفل میں رنگ جما دیا ہے۔ اینڈ پہ ایف ایم کی حاضری بھی ٹھیک رہی۔ اب ذکر کرتے ہیں کہانیوں کا۔ جس میں سلیم فاروقی کی بلیک وارنٹ بہت پسند آئی۔ وطن سے محبت کرنے والوں کی جب آنکھ کھلتی ہے تو ایسے ہی ملک دشمنوں کے بلیک وارنٹ بھی جاری کروا دیتے ہیں۔ خاور اور عینا نے قربانی دے کر عظیم کام کیا۔ آوارہ گرد میں سرمد بابا تو زندگی کی بازی ہار گئے اور شہزی کی ماں نے شہزی اور زہرہ بانو کا ہاتھ ایک دوسرے کو دے کر شادی کا عندیہ دے دیا ہے۔ باقی اس دفعہ بھی شہزی نے اپنے ایکشن سے اپنے کردار کو سنسنی خیز بنائے رکھا۔ طاہر جاوید مغل کی انگارے بھی زبردست جا رہی ہے۔ پرائی بیٹی ہما نے بھی زندگی کی دوڑ دھوپ میں اپنے آپ کو منوا لیا۔ ناصر کا ملنا بھی یادگار ٹھہرا۔ احمد اقبال کی تحریر بہت خوب لگی۔ سچ کہتے ہیں جو کسی کے لیے گڑھا کھودتا ہے وہ خود اس میں گرتا ہے۔ یہی حال ہیرس کا تھا، وہ جینی کی بربادی کا جال بنتا ہوا خود ہی اس میں پھنس گیا اور جینی نے اس سے تنگ آتے کولن کو اپنا لیا۔ محمد فاروق انجم کی زخم خوردہ بھی بہترین کہانی تھی۔ سرورق کا دوسرا رنگ زبردست رہا۔ خواب گزیدہ، اعترافِ جرم، مونگ پھلی کی گواہی یہ سب کہانیاں مختصر مگر بہت محظوظ کر دینے والی اچھی رہیں۔''

میانوالی سے لبنیٰ ریحام ککوکر کی درخواست ''پہلی بار خط لکھنے کی جسارت کر رہی ہوں۔ کوئی غلطی ہو تو پہلی خطا سمجھ کر درگزر کر دینا۔ شکریہ۔ میرے تیسرے سمسٹر کے ایگزام ہو رہے ہیں، پلیز میرے لیے دعا کرنا۔ سرورق بہت خوب صورت تھا۔ چینی نکتہ چینی کا در کھٹکائے بغیر سیدھی چھلانگ لگائی انگارے پر۔ شاہ زیب کی مشکلات میں سیالکوٹی کی آمد سے مزید اضافہ ہو جائے گا۔ کہانی میں یوں گم ہو جاتی ہوں کہ ہوش نہیں رہتا۔ ہوش تب آتا ہے جب جاری ہے پر دیدہ لگتی ہے۔ طاہر جاوید مغل صاحب کی کہانیاں پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے ہیر رانجھا اور سسی پنوں بھی انہی کے قلم سے نکلی ہوں گی۔

آوارہ گرد بہت اچھی اور گرداب سے کچھ کچھ مشابہت لیے ہوئے ہے۔ موبائل فون کی دوستیاں یونہی رنگ لاتی ہیں۔ یکسانیت میں غلطی کے ساتھ بھی یہی ہوا، حالانکہ سارا قصور تو اس کے شوہر کا تھا۔ مونگ پھلی کی کہانی سر کے اوپر سے گزر گئی۔ پرائی بیٹی نے شروع شروع میں بہت اداس کیا، شکر ہے انجام اچھا ہوا، ورنہ دل اداس رہتا۔ میرے ابو اور امی بیمار ہیں ان کے لیے دعا لازمی کرنا۔"

اسلام آباد سے سید شکیل حسین کاظمی کا قصۂ چہار" کہا جاتا ہے کہ ایک ایسا وقت بھی تھا جب پاکستان میں ایک ادارہ چار معیاری ڈائجسٹ بیک وقت شائع کرتا تھا۔ ملک کے سنجیدہ اور ادبی حلقوں میں یہ تمام ڈائجسٹ ایک منفرد مقام رکھتے تھے۔ ادارے کے روحِ رواں جناب معراج رسول صاحب اور عذرا رسول صاحبہ مصنفین اور قارئین کو بہت خوش اسلوبی کے ساتھ لے کر چل رہے تھے۔ بہت سارے تبصرہ نگاروں کے آپس میں رابطوں کی زیادتی کی وجہ سے دوستوں میں دوریاں اور غلط فہمیاں پیدا ہونا شروع ہو گئیں۔ صنفِ مخالف میں مقبول ہونے کا جنون ہر بندے پر سوار ہو گیا۔ ابھی یہ طوفان تھما نہیں تھا کہ انٹرنیٹ کی دنیا پر تقریباً سارے تبصرہ نگار اور بہت سارے مصنفین اکٹھے ہو گئے۔ پہلے پہل یہاں پر بھی لوگ بہت خوش ہوئے۔ مگر ہر چیز کی زیادتی نقصان دہ ہوتی ہے اسی لیے یہاں پر بھی تفریق پیدا ہونا شروع ہو گئی۔ اب میں مزید وضاحت یہ کرتا چلوں کہ یہ جو لکھا وہ میری آنکھوں دیکھی باتیں ہیں اور فی الحال میرے ساتھ آج تک ایسا کوئی معاملہ نہیں ہوا مگر میں دوسروں کی آواز پہنچا رہا ہوں۔" (ادارے کی طرف سے آپ کو جواب بھیج دیا گیا ہے)

ورابن کلاں سے مرحا گل کے گِلے "صنفِ کرخت کی اکلوتی آنکھ ٹائٹل گرل کو گھورنے میں مصروف تھی، اس سے بچتے دوستوں کی محفل میں پہنچے، جہاں احسان سحر کی سحر انگیز باتیں پڑھ کر سحر زدہ رہ گئے۔ آخر معصوم بچے جو ٹھہرے، تبصرے ایک سے بڑھ کر دو تھے۔ چوہدری سرفراز جی کیا بات ہے جو آپ صنفِ نازک پر ملنڈے مار رہے ہیں، آپ کا اپنا تبصرہ کم تفصیلی تھا کیا؟ حارث محبوب کی آمد اچھی لگی۔ سب سے پہلے انگارے پڑھی، آہ... شاہ زیب نے عمران کی یاد دلا دی۔ ویسے طاہر انکل کی ہر اسٹوری کی ہیروئن شادی شدہ یا منگنی شدہ کیوں ہوتی ہے؟ سلیم فاروقی بلیک وارنٹ لے کر آئے۔ خاور اینڈ عما نے جان پر کھیل کر حب الوطنی کا ثبوت دیا، ویلڈن۔ یکسانیت ایک بھیانک تحریر تھی۔ مانا کہ عورت کو برائی کی طرف راغب کرنے میں مرد کا ہاتھ ہے پھر برا انجام بھی عورت کا، افسوس صد افسوس۔ آوارہ گرد بس جی کیا کہیں اللہ شہزی کو کامیاب کرے اور جلد اختتام ہو اسٹوری کا۔ پلیز مریم کے خان سے کئی سلسلہ وار ناول لکھوائیں۔ پہلا رنگ احمد اقبال صاحب کا بس ٹھیک تھا۔ ترین حادثہ پر اسٹوری لکھی گئی نہ مار دھاڑ تھی نہ ٹھاہ ٹھاہ... بے داغ منصوبہ، کاشف زبیر نے اپنے ہاتھوں میں قید قلم سے موتی بکھیرے ہوں اور وہ ہمارے دل میں نہ اتریں تو یہ ناانصافی ہوگی، سو بیسٹ رہی۔ پروفیسرز کے کردار ہمیشہ سے اچھے لگتے ہیں۔ ہر گزرتا پل سسپنس، جاسوسی کو دن دگنی رات چگنی ترقی دیتا رہے، آمین۔"

بہاولپور سے سعید عباسی کے اندازے "نومبر کا جاسوسی یکم کو مل گیا تھا۔ ٹائٹل میں اگر کچھ دیکھنے کے لائق تھا تو وہ حسین اور خوب صورت لڑکی تھی۔ چاند سا چہرہ، کالی گھٹاؤں جیسی زلفیں، کشادہ پیشانی، تاروں جیسی ٹمٹماتی آنکھیں، گلاب کی پنکھڑیوں جیسے ہونٹ، ہیرے جیسے چمکتے دانت گویا حسن کی ملکہ تھی۔ [illegible] چینی کے تمام دوستوں کے لیے اتنا کہیں گے کہ زندگی چار دن کی ہے کسی سے کیا شکوہ شکایت کریں۔ شروعات بلیک وارنٹ سے کی۔ حالاتِ حاضرہ پر لکھی گئی داستان۔ جانے کتنے دشمن عناصر ہمارے ملک میں اس طرح کی سرگرمیوں میں ملوث ہیں پر اللہ پاک ہر بار خاور اور عما جیسے بھلے لوگوں کو بھیج کر ان کی سازشیں ناکام بنا دیتا ہے۔ اے میرے عظیم وطن تجھ پر اٹھنے والی ہر بری نظر کو خدا اسی طرح ختم کر دے، آمین۔ بے داغ منصوبہ، کاشف زبیر اس بار ہمیشہ کی طرح کیا خوب سے خوب تر کاوش لے کر آئے۔ ہما، جنید کو بے حد پسند کرتی تھی پر جنید کے ردِعمل سے ہما کو سخت ٹھیس پہنچی اور اس نے پروفیسر کو اپنا لیا۔ جنید کو جب پچھتاوا ہوا تب دیر ہو چکی تھی، تیر کمان سے نکل چکا تھا اور کمان سے نکلے تیر کبھی واپس پلٹا نہیں کرتے، زبردست کاشف زبیر صاحب۔ پرائی بیٹی احمد اقبال کی اچھی کاوش تھی۔ ناصر اور ہما کا کردار اچھا لگا۔ ذریعہ آمدنی آصف ملک کی اچھی تحریر تھی، برے کام کا برا انجام۔ زخم خوردہ بھی اچھی کہانی تھی۔ ہیرس انتقام کی آگ میں جل رہا تھا اور جب اسے موقع ملا تو اس نے جینی کو نیست و نابود کرنا چاہا پر خدا کی لاٹھی بے آواز ہوتی ہے جو گڑھا اس نے جینی کے لیے کھودا تھا خود اسی میں جا گرا، کولن نے ٹھیک وقت پر آکر ہیرس کو ناک آؤٹ کر دیا اور ہیرس کے سارے منصوبے دھرے کے دھرے رہ گئے۔ جلد باز، بس ٹھیک ہی تھی، نیکو اور کولبی قتل کے الزام میں پکڑے گئے۔ مونگ پھلی کی کہانی بھی خوب رہی۔ مسز ڈوروتھی کی موت کا ذمے دار ٹھہرا اینڈی مین ڈی کروٹ۔"

ضلع بکھر سے ثمر خان کی التجا "میں تقریباً جاسوسی ڈائجسٹ کا 11 سال سے مستقل قاری ہوں، ایک مرتبہ پہلے بھی خط لکھ چکا ہوں لیکن وہ ردی کی ٹوکری کی نذر ہو گیا، اب دوسری مرتبہ کوشش کر رہا ہوں۔ سب سے پہلے ٹائٹل کی بات۔ ٹائٹل بہت پسند آیا۔ کہانیوں میں سے سب سے پہلے آوارہ گرد پڑھی، ڈاکٹر صاحب کے کیا کہنے، بہت اچھی تحریر ہے۔ پڑھنے میں بہت مزہ آیا۔ اس کے بعد طاہر جاوید مغل صاحب بھی کسی سے کم نہیں۔ انگارے بھی زبردست کہانی ہے اور اس ماہ رنگ بھی بہت اچھے تھے۔ کاشف زبیر کی ہر کہانی اچھی ہوتی ہے۔ پروفیسر نے واقعی بے داغ منصوبہ بندی کی تھی اور کامیاب بھی ہو گیا۔ سلیم فاروقی صاحب نے خاور عرف شہزاد خان کے ساتھ کچھ اچھا نہیں کیا اگر زندہ رہ کر کسی خفیہ محکمے کے ساتھ منسلک کر دیتے تو بہت ہی اچھا ہوتا۔ خیر کہانی پھر بھی اچھی تھی۔ باقی کہانیاں ابھی زیرِ مطالعہ ہیں۔ اس مرتبہ میانوالی سے احسان سحر آغاز میں براجمان تھے، مبارک ہو بھئی۔ باقی تقریباً سب کے تبصرے اچھے ہوتے ہیں۔ میری تمام تبصرہ نگاروں سے عرض ہے کہ میرے لیے دعا کرو کہ میرا گہرا دوست جو مجھ سے ناراض ہے صلح کر لے۔ وہ بھی جاسوسی کا مستقل قاری ہے، آمین۔"

احمد پور شرقیہ سے چوہدری عاصم سعید کی آمد ”نومبر 2015ء کے شمارے نے بنا انتظار کے دیدار کروا دیا۔ سرورق کی دلکش حسینہ فوراً ہی دل میں اتر گئی۔ سب سے پہلے اپنے فیورٹ مصنف طاہر جاوید مغل کی تحریر انگارے سے آغاز کیا۔ شاہ زیب بڑی تیزی سے واقعات کو اور حالات کو مدِنظر رکھتے ہوئے روپ بدل کر بہت اچھا کام کر رہا ہے۔ انیق بھی بہت اچھا کردار ہے اور تاجور مجھے بھی بے حد اچھی لگی ہے۔ مولوی فدا حسین کی بیٹی زینب کی بیماری کی تشخیص بھی ہو ہی گئی۔ یا اللہ تیرا شکر ہے۔ محمد فاروق انجم بھی میرے پسندیدہ رائٹر ہیں۔“

خانیوال سے محمد صفدر معاویہ کی عمدہ پسندی ”سرورق کو خوب صورت، حسین اور بہت پیاری دوشیزہ اور ساتھ میں صنفِ مخالف کے افراد سے سجایا گیا۔ آپ کا اداریہ پڑھا، آپ حالیہ زلزلے اور پاکستان کے حکمرانوں کے کارناموں پر روشنی ڈالتے نظر آئے۔ محفل میں انٹر ہوئے تو جناب احسان سحر نظر آئے۔ اچھا تبصرہ تھا۔ محبوب عباسی کا تبصرہ بھی بہت عمدہ رہا۔ روی انصاری کا تبصرہ بہت اعلیٰ۔ محمد قاسم رحمان کی اچھی تبصرہ نگاری۔ سید عبادت کاظمی اور بلقیس خان کی آمد بھی عمدہ رہی۔ چوہدری سرفراز بھائی اگر آنکھوں میں کرب نظر آ جاتا ہے اور کبھی خوشی کی چمک نظر آ جائے کبھی روتی بلکتی آنکھوں کی سمجھ آ جائے، کبھی ہنستی مسکراتی آنکھوں کی سمجھ آ جائے تو پھر وفا اور بے وفائی نظر کیوں نہیں آتی۔ بس اس کے لیے تجربہ اور آنکھوں کو پڑھنے کا علم چاہیے۔ ایف ایم کو ویلکم کہتے ہیں۔ باقی مختصر لکھنے والوں اور نئے دوستوں کے تبصرے بھی عمدہ رہے۔ سلیم فاروقی کی بلیک وارنٹ عمدہ رہی۔ خاور اور نیما کے کردار عمدہ رہے۔ خاور کا برے کاموں سے اچھے کام کی طرف کم بیک اور پھر نیما کا اس مشن کو پورا کرنا اچھا لگا۔ امجد رئیس کی تین تیرہ میں ہیری کو سکتہ سا ہو گیا جب سامنے زندہ کھڑی میری کو دیکھا، انجانے میں ولما کا کام تمام کر دیا، بے چارہ۔ محمد فاروق انجم کی زخم خوردہ میں ہیرس نے بدلہ لینے کے لیے جینی کو بہت تڑپایا۔ تنویر ریاض کی جلد باز میں نیکو کی جلد بازی نے اسے موت کی کرسی کا راستہ دکھایا۔ سلیم انور کی بلاعنوان روپے پیسے کی ہوس میں کھیلی جانے والی گیم میں سب نے جان سے ہاتھ دھو لیا تو پیسا کسی کے کام نہ آیا۔ غرض، بے غرض، بابر نعیم کے قلم سے جوزف اور ایکن نے عمدہ طریقے سے اپنا کیس نمٹایا۔ آوارہ گرد اب تیزی سے آگے بڑھ رہی ہے۔ جمال دستی کی مونگ پھلی کی گواہی بھی عمدہ رہی۔ آرتھر کو نمکین مونگ پھلی نے مروا دیا۔ مریم کے خان کی خاندانی بھی بہت عمدہ رہی۔ آپس کے جھگڑے میں دونوں منشیات گروپ جان سے گئے اور علاقے میں امن ہو گیا۔ ایم افضل انجم کی یکسانیت کا اختتام پڑھ کر دکھ ہوا۔ انگارے کی یہ قسط بھی عمدہ رہی جس میں شاہ زیب کا طارق سے سچ اگلوانا، مولوی سے ملاقات اور پھر موت اور آخر میں عالمگیر پارٹی کا سجاول کی طرف جانا کافی عمدہ رہا۔ سکندر علیم کی خواب گزیدہ بھی اچھی رہی۔ اویس انور کی اعترافِ جرم بھی اچھی اسٹوری تھی۔ آصف ملک کی ذریعہ آمدنی بھی عمدہ تھی۔ احمد اقبال پرائی بیٹی لے کر آئے کافی جاندار کہانی تھی خصوصاً ہما کا کردار پسند آیا۔ کاشف زبیر کی بے داغ منصوبہ بہت ہی نائس رہی، جنید کے کردار نے مایوس کیا۔ بہرحال پروفیسر اور ہما کا کردار بہت بیسٹ رہا، بہت عمدہ طریقے سے رقم نکلوائی۔“

جتوئی سے چوہدری محمد سرفراز کی عرق ریزی ”ماہ نومبر کا جاسوسی خلافِ توقع 2 تاریخ کو موصول ہوا۔ سرورق پر نگاہ پڑی تو خوشگواری کی لہر پورے جسم میں دوڑ گئی۔ ٹائٹل گرل کا دلکش انداز اور صنفِ کرخت کا تخریبانہ انداز، دونوں اپنی اپنی جگہ سرورق کی شان بڑھا رہے تھے۔ سب سے بڑھ کر ٹائٹل گرل کی ماتھے والی لٹ تھی، جو الگ ہی انداز میں قیامت ڈھا رہی تھی۔ چینی نکتہ چینی کی جانب بڑھے تو احسان سحر صاحب کو براجمان پایا۔ عزیزی یٰسین صاحب! کسی کے کہنے پر محفل میں حاضری لگوا کر آپ نے بڑا ہی نیک کام سرانجام دیا ہے۔ بس اب ایسے ہی آتے جاتے رہا کریں۔ مرحا گل اور شفقت محمود صاحب تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ۔ طاہرہ گلزار صاحبہ! فیس بک گروپس سے خاصا شاکی نظر آئیں۔ اتنا زیادہ غصہ اور وہ بھی اس عمر میں صحت کے لیے چنگا نہیں ہوتا۔ بلقیس خان صاحبہ یہ چوہدری ہوتے ہی اتنے جینئس ہیں کہ آپ کا متاثر ہونا بنتا ہی ہے۔ ابتدا مغل صاحب کے شاہکار انگارے سے کی۔ موجودہ قسط میں بہت ساری گتھیاں سلجھنے کے باوجود تحریر ابھی الجھی سی رہی۔ کچھ معاملات سامنے آ گئے ہیں اور باقی کا بے صبری سے انتظار ہے۔ سسپنس میں ڈالے رکھنا مغل صاحب کی تحریروں کا خاصہ ہے اور یہ سسپنس اینڈ تک جاری رہے گا۔ پہلا رنگ پرائی بیٹی احمد اقبال صاحب کا مخصوص انداز تحریر لیے ہوئی تھی۔ عرصہ دراز سے مجھے احمد اقبال صاحب نے گرویدہ بنا رکھا ہے۔ کاشف زبیر صاحب کی تحریروں میں سب سے منفرد چیز ان کی ٹیکنالوجی اور جدید ایجادات سے آگاہی اور پھر ان کا اپنی تحریروں میں بہترین انداز میں پیش کرنا ہے۔ یہی چیز ان کی تحریروں کو چار چاند لگا دیتی ہے۔ دوسرا رنگ بے داغ منصوبہ میں اسی چیز کا لطف لیا اور تحریر کو خوب انجوائے کیا۔ پروفیسر کے منصوبے میں چھوٹی سے چھوٹی جزئیات کا اتنے شاندار انداز میں خیال رکھا گیا کہ پڑھتے وقت کچھ بھی غیر فطری نہیں لگا۔ سلیم فاروقی صاحب کی تحریروں کا ہمیشہ سے ہی یہ خاصہ رہا ہے۔ فائٹ ایکشن اینڈ ایکشن فائٹ۔ چاہے اس چکر میں کہانی کا پلاٹ راستے میں گم ہو جائے۔ بلیک وارنٹ میں بھی صرف مار دھاڑ ہی تھی۔ کہانی کا پلاٹ بہتر تھا۔ مگر مصنف نے اس کا خیال نہیں رکھا۔ نتیجتاً اینڈ میں کہانی عجلت میں سمیٹی گئی اور تحریر کا سارا امپریشن ایک دم سے ختم ہو کر رہ گیا۔ محمد فاروق انجم کی زخم خوردہ میں ہیرس نے چالاکی سے کولن اور جینی کے لیے جال بچھایا مگر تمام تر ہوشیاری کے باوجود اختتام پر وہ خود اپنی ہی چال کا شکار ہو گیا۔ انتقام پر مبنی یہ تحریر اچھی رہی۔ محبت کے جہاں اچھے اثرات ہوتے ہیں وہاں برے اثرات بھی ہو سکتے ہیں۔ تنویر ریاض کی جلد باز میں یہی سب نہایت عمدگی سے دکھایا گیا۔ غرض بے غرض، پیچیدہ سی تحریر تھی اور کہانی سمجھنے کے لیے اچھی خاصی دماغ سوزی بھی کرنی پڑی۔ ذریعہ آمدنی کو آصف ملک نے منجھے ہوئے انداز میں تحریر کیا۔ مونگ پھلی کی گواہی میں کچھ بھی چونکا دینے والا نہیں تھا۔ مریم کے خان کی تحریر خاندانی بھی بہتر رہی۔“

رضوان تنولی کریڑوی کی لفاظی کراچی سے ”30 کی سندر شام مخمور نگاہوں نے سرورق کا طواف کیا۔ ادھوری ٹاپ ناری کے سرخ و سپید رخسار، ادھ کھلے لبوں پہ بھی نیم مسکان، زلفوں کی شریر لٹ، ایسے حسین نظارے میں 2 سرورقی لنگوروں نے ڈالا رنگ میں بھنگ۔ لفظوں کے جادوگر،

احسان سحر عمدگی کے ساتھ دلکش الفاظ کا چناؤ کرتے ہوئے بزمِ دوستاں کا الیکشن جیت کر رونق افروز ہوئے۔ واہ کینٹ کی بلقیس عرف بلّو اینڈ پشاور کی طاہرہ عرف گلّو وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ، آپس میں نہ بجایا کرو طبلِ جنگ، باتیں کیا کرو ست رنگ۔ ہری پور ہزارہ سے قاسم رحمان کے معصومانہ انداز پر بے ساختہ پیار آیا۔ غازی علم الدین شہید لاہور کی نگری سے عبدالجبار روی انصاری خوش گفتاری کے ساتھ نمایاں رہے۔ دبنگ چودھری محمد سرفراز جاہ و جلال کے ساتھ فل فارم میں نظر آئے، کستوری لگا کے۔ شفقت محمود نے سیلہ لوٹ لیا نمک لگا کے۔ بشریٰ افضل شکوہ شکایت کرتی نظر آئیں۔ فلک شیر ملک، ابرار وارث، سید عبادت کاظمی کے نامے پسند آئے، غلام یٰسین، محمد یوسف سانول کی کمی محسوس ہوئی۔ چٹپٹی نکتہ چینی میں نئے دوستوں حارث محبوب عباسی، عزیز بن یاسین، عابد اسلم کو خلوصِ دل سے خوش آمدید۔ انگارے نے ابتدائی تحریر سے سحر زدہ کیا ہوا ہے، چھاگئے ہو مغل اعظم، بہت خوب۔ سلیم فاروقی کے جذبۂ حب الوطنی کا میں اسیر مگر بلیک وارنٹ ابتدائی صفحات کے لائق ہرگز نہیں۔ امجد رئیس کی تین تیرہ سر پر سے گزر گئی۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی آوارہ گرد یہ قسط شاندار رہی۔ سرورق کے دونوں رنگ احمد اقبال کی پرائی بیٹی اور کاشف زبیر کا بے داغ منصوبہ نے رنگوں کا حق ادا کر دیا، کستوری لگا کے۔“

Downloaded From Paksociety.com

مظفر گڑھ سے بہار حسنین کی خوشی و سرشاری ”سب سے پہلے تو ادارے کا ممنون ہوں کہ میرا پہلا خط بغیر کسی کاٹ چھانٹ کے شائع کیا اور پھر ان دوستوں کا از حد ممنون ہوں جنھوں نے میرے الفاظ کو سراہا اور اپنے تبصروں میں ناچیز کا تذکرہ کیا۔ اس بار سرورق خاصا خوفناک لگ رہا تھا۔ سرخ رنگ خون کا رنگ ہوتا ہے۔ اس خونی سرورق کو دیکھ کر ایک دم جھرجھری سی آگئی۔ البتہ سرورق کی خوبرو، دلنشین ہونٹوں والی حسینہ کا حسنِ باکمال دیکھ کر خوشگوار احساس ہوا۔ اسی خوشگوار احساس کے سنگ چٹپٹی نکتہ چینی کی دلچسپ محفل میں داخل ہوا جہاں پہ زلزلے کے حوالے سے اداریے میں مدیرِ اعلیٰ کے قیمتی خیالات جان کر بے حد خوشی ہوئی۔ صدارت کی کرسی میانوالی کے نوجوان احسان سحر نے سنبھال رکھی ہے بہت خوب، دلکش انداز، خوب صورت تحریر۔ لاہور سے عبدالجبار روی انصاری کا دل چھو لینے والا بے ساختہ انداز، بے حد اچھا لگا سدا خوش رہو۔ انگارے کی ہیر را مجھے سے مشابہت والی بات بھی خوب کہی۔ ہری پور سے محمد قاسم رحمان دلچسپ تبصرہ نگاری کے ساتھ چھاگئے۔ لفظوں کا خوب استعمال کیا اور برمحل کیا، ویلڈن۔ پشاور کی طاہرہ گلزار کی باتوں پر بے حد پیار آیا۔ اب بات ہو جائے کہانیوں پر۔ آوارہ گرد میں خاصی تیزی آگئی ہے۔ سرمد بابا کی موت نے افسردہ کر دیا۔ عابدہ ہنوز دشمن کی قید میں، اب دیکھو شہزاد احمد خان ماں کی مانتا ہے یا دل کی۔ دل میں تو عابدہ کی محبت ہے۔ انگارے میں ناساعد حالات کا دھارا شدت اختیار کر گیا۔ مولوی فدا حسین کی بیٹی زینب کی پُراسرار بیماری کی اصل حقیقت بھی آشکارا ہو گئی۔ آخری رنگ پر کاشف زبیر کا نام پا کر بے حد خوشی ہوئی۔ اس بار ان کی تحریر میں پروفیسر کا کردار انتہائی دلچسپ لگا۔ مختصر تحریروں میں جلد باز، تین تیرہ اور زخم خوردہ بے حد اچھی لگیں۔“

کراچی سے محمد ادریس احمد خان کی تشریف آوری ”ماہ نامہ جاسوسی ڈائجسٹ اپنے وقت پر دستیاب ہوا۔ ہمیشہ کی طرح ٹائٹل زبردست رہا۔ ٹائٹل گرل کے چہرے پر ایک آوارہ لٹ آئی ہوئی، پسٹل کی نال سے خون ٹپکتا ہوا پس منظر میں دو اور چہرے۔ پہلے اداریے سے مستفیض ہوئے۔ حالیہ زلزلے نے کتنے لوگوں کے گھر اجاڑ دیے۔ سیکڑوں، ہزاروں گھر تباہ و برباد ہو گئے۔ دس سال پہلے بھی زلزلہ اکتوبر میں آیا تھا اور اس سال بھی اکتوبر میں آیا؟ شاید قدرت کی طرف سے نوعِ انسانی کو پیغام ہو کہ سنبھل جاؤ مگر افسوس صد افسوس کہ بے حس دنیا جلد بھول جاتی ہے اور پہلے کی طرح لہو و لعب میں معروفِ عمل ہو جاتی ہے۔ ناموں کی محفل میں احسان سحر سرِ فہرست تھے۔ ہماری طرف سے مبارک باد۔ محمد قاسم رحمان کا تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ۔ طاہرہ گلزار، تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ۔ آپ بھی اچھے انداز میں تبصرہ لکھتی ہو۔ ابتدائی صفحات کی پہلی کہانی بلیک وارنٹ، سلیم فاروقی کی بہتر پیرائے میں لکھی ہوئی اچھی کہانی تھی۔ تین تیرہ امجد رئیس کی کہانی میں ہیری نے اپنی گرل فرینڈ کو ہی قتل کر دیا۔ جوشِ انتقام میں اتنا اندھا ہو گیا کہ اس کو گرل فرینڈ نظر ہی نہیں آئی۔ اور اس نے اندھا دھند فائر کر کے زندگی کا چراغ گل کر دیا۔ فاروق انجم کی زخم خوردہ بھی اچھی لگی۔ ہیرس نے کولن اور جینی کے لیے غلط سوچ اپنائی۔ نتیجتاً وہ خود ہی اپنی کھودی ہوئی کھائی میں گر گیا، جو دوسروں کے لیے غلط سوچتا ہے وہ اس کے آگے آتا ہے۔ تنویر ریاض کی جلد باز بھی اثر انگیز رہی۔ سلیم انور کی بلا عنوان بھی اچھی رہی۔ ہمیشہ کی طرح ایک عورت نے مکر و فریب سے ہیری کو ٹریپ کر لیا۔ غرض بے غرض بھی پسند آئی۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی آوارہ گرد کامیابی سے جاری و ساری ہے اور شہزاد نے اپنے دشمنوں پر دھاک بٹھا دی ہے۔ شاید کہانی کا اینڈ بھی قریب ہے۔ مونگ پھلی کی گواہی میں محض ایک چھوٹے سے نکتے پر غور کرنے سے سراغ رساں نے قاتل کو پکڑ لیا اور اس نے ڈورتھی کے قتل کا اعتراف کر لیا۔ یوں مونگ پھلی کے دانوں نے قتل کا پول کھول دیا اور قاتل کیفرِ کردار کو پہنچا۔ مریم کے خان کی خاندانی بھی بہتر تحریر تھی۔ ربی کی ہمت اور ثابت قدمی سے منشیات فروشوں کا خاتمہ ممکن ہوا۔ یکسانیت میں فلک نے ایک چلتے بستے گھر کو شعلہ زار کر دیا اور شعلہ کی بھڑکتی آگ نے گرہستی کا نشیمن جلا کر خاک کر دیا۔ انگارے، جاوید مغل کی بہترین کہانی، بہترین انداز میں اپنا آپ منوانے میں کامیاب ہے۔ اس میں ہر دلچسپی کا عنصر موجود ہے جو کسی تحریر کے لیے لازم و ملزوم ہے۔ خواب گزیدہ اور اعترافِ جرم بھی اچھی تحریریں ثابت ہوئیں۔ آصف ملک کی ذریعہ آمدنی میں حمید اور ماریہ نے بے لوث جذبوں کی وجہ سے کامیابی کی منزل تلاش کر لی۔ پرائی بیٹی احمد اقبال کی تحریر اور بے داغ منصوبہ کاشف زبیر کی تحریر دونوں آخری صفحات کی بہترین تحریریں ثابت ہوئیں۔ کترنیں بھی بہت پُراثر اور سبق آموز رہیں۔“

شاہ گڑھ سے فلک شیر ملک کے تجربات و تجزیے ”نومبر کا جاسوسی پڑھا، ٹائٹل آخری دونوں تحریروں کے مطابق تھا۔ تبصروں میں عبدالجبار روی انصاری، بلقیس خان اور طاہرہ گلزار بھرپور انداز میں جلوہ گر تھے۔ انگارے اور آوارہ گرد کے علاوہ میری پسندیدہ تحریریں بلیک وارنٹ، زخم خوردہ، یکسانیت، جلد باز، ذریعہ آمدنی، اعترافِ جرم اور خواب گزیدہ تھیں۔ آخری دونوں رنگ بہت زبردست تھے مگر کہانی کو طول دینے کے لیے منظر کشی بہت

زیادہ کی گئی تھی۔ پرائی بیٹی میں غلام محمد کا سوا اور شرفو (شریف) کی فیملی کا ڈسپوزل نہیں کیا گیا۔ بے داغ منصوبہ بہت اچھی لکھی گئی مگر اس تحریر میں بھی ہر ہر چیز کی منظر کشی کی گئی مثلاً پروفیسر کے گھر کا نقشہ کافی لمبا چوڑا کھینچا گیا بہر کیف نمبرون تحریر تھی۔ چبھی نکتہ چینی میں مدیرِ اعلیٰ نے حکمرانوں سے التجا کی لیکن یہ بھی تو دیکھیں کہ ہمارے اعمال کیا ہیں۔ جب آٹھ اکتوبر 2005ء میں زمین ہلی، تو میں اس وقت کشمیر میں تھا اور میں نے خود اپنی آنکھوں سے کئی بستیاں پہاڑوں کے نیچے آتی دیکھیں۔ ٹھیک ایک ماہ بعد وہ لوگ پھر اسی طرح ان برے اعمال میں لگ گئے جس کی وجہ سے جھٹکا دیا گیا۔ اب یہ پھر بڑا جھٹکا لگا ہے۔ عمارتیں منہدم ہو رہی ہیں، کبھی فیکٹریوں میں آگ تو کبھی جھگیوں میں آگ لگ رہی ہے۔ سیلاب کی صورت میں عذاب نازل ہو رہا ہے۔ کسی انسان کے چہرے پر مسکراہٹ نہیں ہے۔ ماسوائے چند ایک کے ہر بندہ پریشان ہے۔ کیونکہ ہم نوے فیصد لوگ گناہوں کی لذت میں پڑ چکے ہیں اور ہمارا مکافاتِ عمل شروع ہو چکا ہے۔ یہ نا کہانی آفات قیامت کی جھلکیاں ہیں جو دکھائی جا رہی ہیں۔ مجھے تو ڈر ہے کہ کہیں سورج اوزون کی چادر پھاڑ کر نیچے نہ آئے۔ کراچی میں ریکارڈ توڑ گرمی پہلے تو نہیں تھی۔ وجہ اللہ سے دوری ہے۔ قیامت کی کافی نشانیاں ظاہر ہو چکی ہیں۔ مثلاً گھر گھر گانے کا سامان، موسیقی وغیرہ، قتلِ عام، زنا وغیرہ وغیرہ۔ بس جو وقت ملا ہے تو غنیمت جان کر ہمیں ربِ ذوالجلال سے معافی مانگ لینی چاہیے۔ کیونکہ کسی وقت موت اچانک ہی اچک لے گی۔ سب ٹھاٹ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارہ۔''

ڈیرہ اسماعیل خان سے سید عبادت علی کاظمی کی تفصیلات'' خلافِ معمول جاسوسی 3 تاریخ کو مل گیا تھا۔ سرورق اس مرتبہ کچھ خاص تاثر قائم نہیں کر پایا، البتہ حسینہ ماہ جبینہ کے بکھرے بال اور کان کی بالی بہت اچھی لگی۔ کبھی تو حسینہ کا منہ بند بھی کر دیا کریں ایسا لگتا ہے کہ وہ ہم سے کچھ کہنا چاہتی ہے۔ ہم منتظر رہتے ہیں مگر وہ تو بولتی تک نہیں۔ چبھی نکتہ چینی کی ابتدائی سیٹ احسان سحر کے حصے میں آئی۔ تبصرہ زبردست لکھا گیا تھا۔ اسلام آباد سے عزیز بن یٰسین آپ کو محفلِ دوستاں میں گوڈے گوڈے ویلکم۔ ہری پور سے پیارے دوست قاسم رحمان کا تبصرہ مزیدار سے لذیذ تر تھا محبت سے گوندھا ہوا تبصرہ بہترین تھا۔ طاہرہ گلزار آپی تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ اور میری پہلی ترجیح پڑھائی ہی ہوتی ہے۔ لیکن جاسوسی کی تو عادت ہے جب تک پڑھ نہ لیں کھانا ہضم نہیں ہوتا۔ آپ کی اتنی محبت پر شکر گزار ہوں۔ کافی عرصے کے بعد بشریٰ افضل کی آمد بہت اچھی لگی۔ ساگر تلوکر، طاہرہ گلزار، قاسم رحمان اور چوہدری محمد فراز کے تبصرے بہترین تھے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے آوارہ گرد پڑھی، بھئی میرا اندازہ درست نکلا، شہزی اور میڈم جی کی جوڑی بن رہی ہے لیکن عابدہ کی گمشدگی کا تاثر اچھا نہیں ہے، عابدہ کو مارنا مت ڈاکٹر صاحب، عارفہ سے سخت نفرت محسوس ہوئی جو اخلاقیات کا پاس نہیں رکھتیں، وہ عورتیں کہلانے کی حق دار نہیں۔ اس ماہ آوارہ گرد کی کارکردگی بہترین رہی۔ حسبِ معمول آوارہ گرد کے بعد انگارے اسٹارٹ کی۔ شاہ زیب کی گمشدہ محبوبہ آخر تاجور ہی نکل آئی۔ انیق کی کارکردگی نہیں دکھا رہے رائٹر، لگتا ہے آگے چل کر یہ کردار اہم ہوگا۔ مولوی صاحب کی موت شاہ زیب کی پریشانی بڑھا گئی ہے۔ ابھی تک کہانی کچھ خاص تاثر قائم نہیں کر پائی جیسے مغل صاحب کی باقی کہانیوں میں ہوتا ہے۔ ابتدائی صفحات پر سلیم فاروقی کی کہانی دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ جس طرح خاور تنظیموں سے لڑتا رہا۔ ہمت کی بات ہے لیکن رائٹر نے اینڈ شاید جلدی میں کیا، تشنگی رہ گئی۔ خاور کی موت نہیں ہونی چاہیے تھی محبت میں جدائی کے روگ بہت تکلیف دہ ہوتے ہیں۔ عینا کی زندگی بھی خاور کے بنا خالی خالی تھی۔ رنگ اس مرتبہ کچھ خاص تاثر نہیں قائم کر پائے۔ احمد اقبال نے پھر بھی کچھ اچھا لکھا لیکن کاشف زبیر نے کہانی بہت بور لکھی۔ معذرت کے ساتھ کاشف زبیر کی تحریر لگ ہی نہیں رہی تھی۔ زخم خوردہ اس ماہ کی بہترین کہانی تھی۔ نبیل کا کردار زبردست تھا۔ فاروق انجم صاحب اچھی کہانیاں لکھتے ہیں۔ مریم کے خان کی کہانی خاندانی عمدہ اور مکمل کہانی تھی۔''

کندیاں سے نادر سیال کے پُر آلام لمحات'' حیرت انگیز طور پر اور معمول سے ہٹ کر جاسوسی ہمیں 3 نومبر کو موصول ہوا۔ اتنے ماہ جاسوسی کی محفل سے غیر حاضر رہا کیونکہ میرے محترم والد مجھے اس دنیا میں اکیلا چھوڑ کر اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اسی صدمے میں تھا۔ تمام قارئین سے گزارش ہے میرے والد صاحب کے لیے دعائے مغفرت کریں۔ (ہمیں بے حد افسوس ہے اللہ تعالیٰ آپ کے والد محترم کو جنت الفردوس میں جگہ عطا کرے) 26 اکتوبر کو زلزلہ نے پاکستان کے صوبہ خیبر پختونخواں پشاور میں بہت تباہی مچائی، بہت سے لوگ اللہ کو پیارے ہوئے، بہت گھر تباہ ہوئے اللہ ان سب کو حوصلہ دے اور ان سب کی مشکلات آسان کرے، آمین۔ ہم بھی تمام اسیران اس وقت کوٹھری میں بند تھے، بڑا شدید زلزلہ تھا، ہمیں کسی نے بھی بند کوٹھریوں سے باہر نہیں نکالا۔ ہم نے بہت شور شرابا کیا لیکن ہم قیدیوں کی کوئی سننے والا نہیں تھا۔ اس وقت میں نے اپنے آپ کو بہت بے بس محسوس کیا۔ بس یہی دعا ہے کہ یا اللہ ہمارے پاک ملک کو اپنی پناہ میں رکھے۔ (اللہ تعالیٰ آپ کو بے بسی کی زندگی سے باہر نکالے) ٹائٹل گرل تو جناب شاہ زیب کی تاجور محبوبہ لگ رہی ہے۔ وہی خوب صورت چہرہ، وہی پیشانی، وہی بالوں کی لٹ جو ہوا کے دوش پر لہراتی بل کھاتی، پیشانی پر ناگن کی طرح بیٹھ جاتی ہے۔ یہی لٹ تو ہے جو شاہ زیب کو دیوانہ کیے ہوئے ہے۔ واہ ذاکر افگن کمال کر دیا آپ نے (واقعی) اب چلتے ہیں اس ہال کی طرف جہاں لوگ اسی کو دیکھتے ہیں جو اس ہال میں داخل ہو۔ مجھے کسی نے بھی یاد تک نہیں کیا۔ اگر یاد کیا تو وہ ہے بلقیس خان جو درد سمجھتی ہے اور محسوس کرتی ہے اسی کو کہتے ہیں پاکیزہ دوستی۔ مرحاکل صاحب، بالکل آپ نے بجا فرمایا اتنے انتظار کے باوجود جب محفل میں خط شامل نہ ہو تو غصہ آنا فطری سی بات ہے۔ معراج محبوب عباسی آنکھوں پر اعتبار مت کرنا یہی آنکھیں تو کم بخت لے ڈوبتی ہیں۔ عبدالجبار رومی انصاری جی آپ کی سوچ پر ترس آ گیا جو آنکھیں بے وفا ہوں بھلا وہ خوب صورت کیسے ہو سکتی ہیں۔ محمد قاسم رحمان، میں آپ کی اس بات پر اتفاق نہیں کرتا، مجھ سمیت بہت سے اور بھی لوگ ہیں جن کو اکتوبر اور نومبر کے مہینوں میں دلچسپی نہیں ہوتی، لگتا ہے بشریٰ افضل کو کہیں جانے کی جلدی تھی یا پھر ناراض تھی۔ سید عبادت کاظمی آپ اچھے دوست ہو بھی مجھے یاد بھی نہیں کیا۔ اللہ پاک آپ کی تمام پریشانیاں آسان کرے۔ بلقیس خان جی، یہ دہشت گردی کی لعنت ہمارے ملک سے صاف ہو جائے اللہ کرے تو پھر ہمارا ملک بھی خوش حال ہو جائے گا۔ طاہرہ گلزار صاحبہ میں تو آپ کو سو پرسنٹ نمبر دوں گا، بہت اچھا تبصرہ تھا آپ کا۔ اسلام آباد سے عزیز بن یٰسین، آپ جیسے شاید کوئی ہوں جو اپنے نام کے ساتھ اپنے والد حضور کا نام بھی زندہ رکھا ہوا ہے، خوش آمدید! اچھا رہا۔ باقی تبصرے بھی اچھے تھے۔ رخ کرتے ہیں کہانیوں کی طرف۔ سب سے پہلے

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی آوارہ گرد پڑھی، بابا سرمد کی موت کا افسوس ہوا۔ دولت کی خاطر اپنے ہی اپنوں کا خون کرتے ہیں۔ شیزی خان بھی بہت مشکلات میں پھنستا چلا جا رہا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ماں کی بات مانتا ہے یا نہیں۔ امید ہے ماں کا کہنا مان جائے گا۔ میڈم! زہرہ بانو سے شادی کرے گا ماں کے کہنے پر۔ اب میری پسندیدہ کہانی طاہر جاوید مغل صاحب کی انگارے کی بات کرتے ہیں۔ یہ تو ایکشن سے بھرپور ہوتی جا رہی ہے۔ اب تو سیالکوٹی بھی اِن ہو گیا ہے اِدھر مولوی جی کو اسحاق وغیرہ نے مار دیا اور اب شاید اسحاق وغیرہ سیالکوٹی سے تاجور کو اغوا کرانے اس سے ڈیل کرنے گئے ہوں۔ بھرپور ایکشن دیکھنے کو ملے گا۔ اس دعا کے ساتھ اجازت چاہوں گا کہ ہماری پاکستانی ٹیم انگلینڈ سے فتح سمیٹے۔”

بہاولپور سے علی محمد کی محبت ”میں جاسوسی کا اس وقت سے قاری ہوں جب سے یہ شروع ہوا، میرے پاس پورا ریکارڈ موجود ہے۔ پرانی بات ہے آپ کے ریکارڈ میں تین رسالے نایاب تھے۔ آپ نے نکتہ چینی میں اشتہار دیا تو میں نے یہ رسالے بھیجے اور آپ نے دو سال جاسوسی مفت میرے نام کیا۔ اتنی لمبی رفاقت۔”

معراج محبوب عباسی کی ہری پور ہزارہ سے دلی معذرت ”اس بار جاسوسی کا دیدار 2 نومبر کو ہوا۔ اداریہ حسبِ سابق ملک کی ابتر حالت پہ لکھا گیا۔ محفل میں سرفہرست تبصرہ احسان سحر کا تھا۔ کہانیوں پر اس قدر شاندار تبصرہ نگاری کے بعد یہ حق تو تھا جناب کا۔ کاشف عبید صاحب، آپ اتنا وقت کہاں سے لاتے ہیں، میں تو جاسوسی بھی کسی کسی ماہ پورا نہیں پڑھ پاتا۔ چھوٹے بھائی کے کارنامے پہ کافی حیرانی ہوئی۔ بلکہ پہلے تو یقین ہی نہیں آیا کہ یہ اسی کا خط ہے۔ عزیز بن یٰسین صاحب ویلکم! اور اگر ایک بار جسارت کر ہی لی ہے تو اب باقاعدہ حاضر ہوتے رہنا۔ مرحا گل آپ اسے ڈاکیے کی ہی غلطی کہیں ورنہ کے بعد کچھ نہیں لگاتا۔ اور جہاں تک یاد کا تعلق ہے تو ہم سب یہاں ایک فیملی کی طرح ہیں۔ شمس الحق بھائی ہم تو بس خانہ پُری ہی کرتے ہیں ورنہ تو ٹیوشن کے بچے بھی اکثر بھول جاتے ہیں۔ فلک شیر ملک صاحب یہی دو شہد رنگ لٹیں ہیں جن کے چکر میں طاہر صاحب نے مسز شاہ زیب کو پوری کہانی کے دوران چکرا کر رکھا ہے۔ بشریٰ افضل اس بار جناب جمال دستی صاحب کے طرزِ تحریر سے مرعوب نظر آئیں تبھی تو اتنے اختصار سے کام لیا۔ بلقیس خان اور عبادت کاظمی کی جرأت کو سلام کہ مجھ ناچیز کا تبصرہ پسند کر لیا۔ کہانیوں میں سب سے پہلے سب کی طرح میں نے بھی انگارے پڑھی۔ جاندار قلم کاری اس شاندار تحریر کے تو کیا کہنے۔ شاہ زیب سیاہ رات کی ہولناکی میں ایک ڈھاٹا پوش خدائی فوجدار خلقِ خدا کی خدمت کو نکلتا ہے۔ واہ جی واہ۔۔۔ کیا کہنے جناب شاہ زیب صاحب کے۔ آخر میں مولوی کی ناگہانی موت نے بنا بنایا کھیل بگاڑ کر رکھ دیا۔ لگتا ہے اب اگلا چھاپا اس ڈبا پیر پر ہی پڑے گا۔ آوارہ گرد میں سرمد بابا کی موت شہزادہ احمد خان عرف شہزی کے لیے ناقابلِ تلافی نقصان ہے مگر سرمد بابا کی معاملہ فہمی کی بدولت عارفہ اپنے مقصد میں پوری طرح کامیاب نہیں ہو پائی۔ بے داغ منصوبہ میں پروفیسر اور ہما کا منصوبہ بے شک فول پروف تھا اور وہ کامیاب بھی ہوئے۔ جنید کی زندگی بھی بچ گئی اور پروفیسر کا گھر بھی بس گیا۔ ہما ایک کم ظرف انسان سے بھی بچ گئی یعنی ہر طرح سے ہیپی اینڈنگ۔ ویلڈن کاشف زبیر۔ سلیم فاروقی، بلیک وارنٹ لے کر اولین صفحات پر اپنے مخصوص اسٹائل کے ساتھ آن دھمکے۔ وہی انداز جس میں صراطِ مستقیم پر چلنے والے ہیرو بھیا کو قدم قدم رکاوٹیں پیش آتی ہیں مگر کچھ اتفاقات اور کچھ زورِ بازو کے سہارے وہ کشتی پار لگا ہی لیتا ہے۔ شادی کی بے تحاشا مصروفیات کے باعث مکمل تبصرہ ممکن نہیں جس پہ دلی معذرت۔”

آزاد کشمیر سے افتخار حسین اعوان کی ازدواجی اسیری ”چند ماہ کی غیر حاضری کے بعد ایک بار پھر حاضر ہوں۔ امید ہے کہ مجھے بھلایا نہیں گیا ہو گا۔ چند مصروفیات تھیں جن کی وجہ سے محفل سے دوری رہی جن میں سے ایک بڑی وجہ یہ کہ مابدولت 14 اکتوبر کو شادی کے پُروقار بندھن سے منسلک ہوئے ہیں۔ (مبارک ہو، پھر تو غیر حاضری بنتی ہے) ماہ نومبر کا جاسوسی 5 تاریخ کو جلوہ گر ہوا۔ ٹائٹل جاسوسی کے عین مطابق پایا۔ ٹائٹل گرل کا اندازِ تفاخر قابلِ داد تھا۔ ماتھے پر آئی بالوں کی پریشان لٹ، سانپ کی طرح بل کھاتی، رخساروں کو چھیڑتی، بھلی لگ رہی تھی۔ (اچھا!) زیادہ تعریف میں نہیں جاؤں گا کیونکہ اب چوبیس گھنٹے سر پر خطرے کی گھنٹی بجتی رہتی ہے۔ (ہو جالو بھی) نکتہ چینی میں، احسان سحر کو دیکھ کر خوشی ہوئی۔ معراج محبوب عباسی نے اچھا لکھا۔ عبادت کاظمی بھی اپنے معصوم سے تبصرے کے ساتھ حاضر تھے۔ مرحا گل بھی اچھا اضافہ ثابت ہوئی ہیں۔ بلقیس خان اور طاہرہ گلزار معمول کے مطابق تبصرہ لیے حاضر ہیں۔ مجال ہے جو ناغہ کریں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اس بار نکتہ چینی کی محفل پھیکی سی لگی۔ (آپ جو نہیں تھے) ابتدا انگارے سے کی۔ دیہاتی ماحول میں لکھی گئی یہ قسط للکار کی یاد تازہ کر گئی۔ تاجور اور شاہ زیب کی محبت فی الحال خاموشی اختیار کیے ہوئے ہے۔ مولوی صاحب کی موت کا دکھ ہوا۔ یہ قسط بہترین رہی۔ دیکھو پھر اگلے واقعات کیا رنگ لاتے ہیں۔ آوارہ گرد کی قسط بھی بہترین رہی، سرمد بابا جیسے شریف اور نیک دل بزرگ سازشوں کا شکار ہو کر دنیا سے چل بسے۔ افسوس یہ کہ ان سازشوں میں اپنوں ہی کا ہاتھ تھا۔ اس قسط کے آخر پر ایک چونکا دینے والا موڑ ہے جہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا شہزی، بیگم صاحب سے شادی کر کے، عابدہ کی محبت کی قربانی دے گا؟؟ اگلی قسط کا شدت سے انتظار ہے۔ سرورق کے رنگوں میں، بے داغ منصوبہ پسند آئی۔ جذبات و محبت کے اصول اور دبیز پردوں میں چھپی مطلب پرستی اور پُرفریب چہروں کو بے نقاب کرتی یہ تحریر فیورٹ رہی۔ پرائی بیٹی، احمد اقبال ہمیشہ کی طرح زبردست رنگ لے کر حاضر ہوئے۔ اس رنگ میں ساتوں رنگ شامل نظر آئے۔ دل میں کسی چاہنے والے کا نہ ہونا کتنی سخت اذیت ہوتی ہے اور انسان در در کی ٹھوکریں کھاتا پھرتا ہے۔ دنیا جہان کی دولت ہو اگر پیار کی دولت سے محروم ہو تو وہ شخص تہی دامن رہتا ہے۔ اس کہانی کو پڑھ کر اندازہ ہوا کہ انسانی زندگی میں پیار کس قدر اہمیت کا حامل ہے۔ بہترین کاوش۔ مجموعی طور پر اس ماہ کا جاسوسی بہترین رہا۔ کترنیں بھی کافی بہتر رہیں۔”

ان قارئین کے اسمائے گرامی جن کے محبت نامے شاملِ اشاعت نہ ہو سکے۔

انور یوسف زئی، اسلام آباد۔ سجاد علی شکری، اسکردو۔ ایم نیو خان، سوات۔ تحریم فاطمہ، کراچی۔

# ہوش و مدہوش

احمد اقبال

تجسّس... تحیّر اور تاثر کسی بھی کہانی کے بنیادی جزو ہیں... ان تینوں عناصر کی موجودگی کہانی کار کی فنکارانہ ہنرمندی کی مرہونِ منت ہے... انہی خوبیوں سے مزین ایسی ہی داستانِ حیات... ہمارے تہذیبی اور سماجی ڈھانچے میں ہونے والی شکست و ریخت... بدتری اور بے سکونی بخوبی منعکس ہوتی ہے۔ بعض لمحات زندگی میں ایسے آتے ہیں جن کی تلاطم خیزی زندگی کا سکون تہ و بالا کر کے رکھ دیتی ہے... ہوش و خرد کی دنیا کے ایسے ہی کرداروں سے سجی کہانی کے تانے بانے... کرداروں کی نفسیاتی الجھنیں... عورت اور مرد کے متصادم فکری رویے اور روابط... قدم قدم پر بکھری انسانی بے بسی اور مجبوریوں کا نوحہ... جاسوسی کے اوّلین صفحات کی زینت...

Downloaded From Paksociety.com

**حقیقت سے قریب زندہ کرداروں پر مشتمل معاشرے کی صحیح عکاسی کے ساتھ ایک بھرپور تحریر......**

وہ سب فرشی دسترخوان کے گرد بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ وہ، اس کا اٹھاون سالہ کارپینٹر باپ اور اس سے عمر میں آٹھ سال کم مگر برابر کی نظر آنے والی بیوی... اب ڈھائی فٹ چوڑا سبز رنگ کا بلیک پرنٹ والا دسترخوان دُہرا کر کے بچھایا جاتا تھا کیونکہ کھانے پر بیٹھنے والوں کی تعداد نصف رہ گئی تھی۔ یکے بعد دیگرے اس کے تین بھائی چلے گئے تھے۔ جو سب سے بڑا تھا، اسے استاد کمال دین نے اعلیٰ تعلیم کے لیے ولایت بھیجا تھا۔ تعلیم تو پتا نہیں اس نے کیا حاصل کی، برطانیہ کی شہریت ضرور حاصل کی تھی اور اس کے لیے وہیں شادی کر لی تھی۔ دوسرے کے لیے کمال دین یہ نہ کر سکا تو وہ باغی ہو گیا اور اس نے پڑھنا چھوڑ دیا۔ آوارہ گردی کے دوران میں ہی اسے کچھ دوست مل گئے جو اسے ایک مدرسے میں لے گئے اور ایک دن پتا چلا کہ وہ جہاد پر افغانستان چلا گیا ہے۔ اس کے بعد نہ کوئی اطلاع آئی نہ وہ خود آیا۔ تیسرا، جو دراصل پہلا تھا۔ بچپن ہی میں لیوکیمیا یعنی بلڈ کینسر میں مبتلا ہوا۔

Downloaded From

کچھ عرصے اسے رفاہی اداروں سے خون کا عطیہ ملتا رہا۔ پھر بون میرو ٹرانسپلانٹ کا مرحلہ آیا تو وہ مر گیا۔

کمال دین نے کھانا کھاتے اسے غور سے دیکھا۔ ”ہیرو شیما پر کون سا بم گرا ہے جو چپ ہے۔ کیا ہوا ہے پُتر۔“

شمائلہ کو پیار سے سب شیما تو کہتے ہی تھے جب اس کے بھائی نہ رہے تو باپ نے اپنی سب توقعات اسی سے وابستہ کر دیں یا اپنی بیوی کا حوصلہ بڑھانے کے لیے اسے ہیرو شیما کہنا شروع کر دیا۔ ”یہ میری ہیرو بیٹی ہے، ہیرو شیما...“ وہ شیما کی امتحانات میں شاندار کارکردگی پر خوش ہو کے ہنستے ہنستے کہتا۔ اس کی ہنسی میں بیٹوں سے محرومی کا دکھ صاف جھلکتا تھا۔

شیما کا دل اس کے سینے میں زور سے دھڑکا مگر وہ مسکرائی۔ ”کچھ نہیں ہوا۔“

وہ کیسے بتاتی کہ ایٹم بم تو وہ خود گرانے والی ہے۔ بس وہ مناسب وقت کے انتظار میں حوصلہ مجتمع کر رہی تھی۔ اس کی ماں نے سالن کی خالی پلیٹوں کو اکٹھا کیا اور دسترخوان سمیٹا تو کمال دین نے بیڈ کا سہارا لے کر پاؤں پھیلا دیے۔ ”آج تو خیر سے پھر جہیز کے لیے چنیوٹی کام آ گیا۔ ڈبل بیڈ، تین پٹ کی الماری، ڈبل بیڈ کے ساتھ کی سائڈ ٹیبلز اور ڈریسنگ ٹیبل تین پٹ والی... جس میں بیچ والے بڑے آئینے کے ساتھ اسی لمبائی کے دو آئینے والے کم چوڑے پٹ ہوتے ہیں۔ بند کر دو تو شیشے کے اوپر کھولو تو خود کو دونوں سائڈوں سے دیکھ لو۔“

”وہ تو بڑا مہنگا پڑتا ہوگا؟“ اس کی ماں بولی۔

وہ سگریٹ جلا کے ہنسا۔ ”ان کو کیا مہنگا سستا۔ جو ایک بیٹی کو شادی میں دس لاکھ کا فرنیچر دیں... سونا کتنا ہوگا اور باقی جہیز کیا ہوگا، میں نے سات لاکھ مانگے تو مجال ہے جو دوسری بات کی ہو۔ بولے ابھی تین ہفتے ہیں، میں نے صاف کہا کہ کسی اور سے کرا لو یہ کام... میرے ہاتھ میں آرڈر ہے۔ وہ اگلے ہفتے پورا کرنا ہے پھر آپ کا کام کروں تو چار ہفتے لگیں گے مجھے... آ گئے منت سماجت پر کہ استاد کسی اور کے پاس ہم کیوں جائیں... پہلے بھی دو بیٹیوں کو تم نے ہی بنا کے دیا تھا۔ تم بے شک سات کے آٹھ لے لو۔“

شیما کی ماں نے سینے پر ہاتھ رکھا۔ ”آٹھ لاکھ، تم کر لو گے؟“

”ہاں... بس دن رات ایک کرنا پڑے گا۔ کافی دن سے کام مندا تھا۔ اب اچانک اللہ نے کرم کیا کہ دو آرڈر آ گئے۔ سوچتا ہوں ہیرو شیما اپنے گھر کی ہو جائے تو میں بھی گھر کو دیکھوں... تجھے تو فکر ہے نہیں۔“

”فکر سے کیا ہوتا ہے جی... میں کیا بے شرم بن کے خود گھر گھر جاؤں اور شیما کے لیے رشتے کی بھیک مانگوں...“

اپنی بات کرنے کا یہی سب سے اچھا موقع تھا۔ ”ابا آپ میری فکر مت کریں۔“

کمال دین سگریٹ کے دھوئیں کو اوپر چھوڑ کے بولا۔ ”اچھا؟ پھر کون کرے گا؟“

”فکر ہوتی تمہیں تو اس نامراد شے کو چھوڑ دیتے۔“ شیما کی ماں دوپٹے کو ناک منہ پر رکھ کے بڑبڑائی۔ ”کتنا منع کیا تھا ڈاکٹر نے... خدا خدا کر کے کام کے قابل ہوئے ہو پھر...“

”میں نے کہا نا ابا، میری نہیں اپنی فکر کریں۔ انکار کر دیں سات کے آٹھ دینے والوں کو... وہ تو آپ کی جان سے کھیل رہے ہیں۔ دیکھتے نہیں رندہ چلاتے ہو تو سانس دھونکنی کی طرح چلتا ہے۔ چھوڑ دیں اب یہ کام جو چالیس سال سے کر رہے ہیں۔“

وہ ہنسنے لگا۔ ”اچھا چھوڑ دوں گا۔ ہیرو شیما کا حکم جو ہے مگر اس کے بعد تو کرے گی یہ کام...؟“

”اور بہت کام ہیں دنیا میں۔“

”لیکن پہلا کام ہے تجھے گھر سے نکالنا۔“

ساری ہمت کو جمع کر کے اس نے منہ سے بات نکال ہی دی۔ ”میں خود کر لوں گی اپنی شادی۔“

وہ غیر سنجیدہ لہجے میں بولا۔ ”خود کر لے گی۔ واہ بھئی واہ۔“

”آپ کا کوئی خرچہ نہیں ہوگا۔ ایک پیسا بھی نہیں۔“

یکلخت کمال دین کا چہرہ تاریک ہو گیا۔ بات کو اس کے دماغ کی گہرائی تک اترنے میں کچھ وقت لگا۔ شیما کا چہرہ دیکھتا رہا، شیما کا بدلا ہوا لہجہ اس کا خوف بن گیا۔ ماں کی نظر اس پر جم کے رہ گئی۔

”میں ان پڑھ آدمی اس بات کا کیا مطلب سمجھوں شمائلہ...؟“ وہ بالآخر سپاٹ لہجے میں بولا۔

شمائلہ پہلا قدم اٹھا چکی تھی اس کے لیے واپسی کا راستہ بند رکھنا ضروری تھا۔ ”وہی جو میں نے کہا ابا... مجھے آپ کی اجازت چاہیے۔“

”اجازت؟“ وہ یوں بولا جیسے یہ کسی اور زبان کا لفظ تھا جو اس نے پہلی بار سنا ہو۔

''کیا کہنا چاہتی ہے آخر تو؟'' اس کی ماں چلائی۔ ''کیا کسی کو پسند کرلیا ہے؟''

شمائلہ نے ماں کی طرف دیکھا۔ ''ہاں مگر چیخنے چلانے کی ضرورت نہیں... نہ میں نے گناہ کیا ہے نہ جرم۔''

''کمینی... مجھے منع کرتی ہے یاریاں لگا کے...''

''بس۔'' کمال دین ایک دم دہاڑا۔ ''خبردار جو یہ بکواس کی۔''

اس کی ماں دہائی دینے لگی۔ ''بکواس میں کررہی ہوں یا تمہاری یہ لاڈلی جو بی اے کرنے سے پہلے کسی سے آنکھ مٹکا کرچکی ہے۔''

''ہاں تو بتا ہیرو شیما... کون ہے وہ جسے تو نے پسند کیا ہے؟''

شیما کا دل جو تتلی کی طرح کانپ رہا تھا شیر جیسا ہو گیا۔ ''ابا، صرف دو منٹ میری بات سن لیں... پھر آپ کا جو فیصلہ ہوگا مجھے منظور... صرف دو منٹ۔''

''ہاں ہاں... تو بول، میں سن رہا ہوں۔''

''ابا! جب ہم شرع کی بات کرتے ہیں تو بی بی خدیجہؓ کی مثال دیتے ہیں جنہوں نے خود ہمارے پیارے نبیؐ کو پسند کیا اور شادی کے لیے پیغام دیا۔ میں بالغ کی حیثیت سے قانونی حق کی بات نہیں کرتی۔ آپ ولی ہیں، آپ کی رضامندی ہوگی تو میں شادی کروں گی ورنہ نہیں... یہ میرا آپ سے وعدہ ہے۔'' شیما نے مضبوط لہجے میں آہستہ آہستہ کہا۔

کمال دین کے چہرے پر طمانیت کا احساس صبح کی دھوپ کی طرح پھیلا۔ ''اللہ خوش رکھے تجھے۔''

''وہ ایک وکیل ہے ابا، اس کا باپ بھی یہی کام کرتا تھا، لاہور میں۔''

''ترکھان تھا؟'' وہ سوچ میں پڑ گیا۔

شیما نے اقرار میں سر ہلا دیا۔ ''اس کا نام رشید تھا۔ عبدالرشید... بڑا مشہور کاریگر تھا۔''

''رشید؟'' کمال دین چونکا۔ ''وہ تو نہیں... جس کو پولیس نے ماردیا تھا۔''

''وہی ابا، اس نے کسی کا آرڈر لینے سے انکار کردیا تھا آپ کی طرح۔''

''مجھے پتا ہے، بہت پرانی بات ہے یہ... ایک تھانے دار کی بیٹی کے لیے جہیز تیار کرتا تھا۔ اس نے بھی کہا تھا کہ پہلے ایک کام نمٹا لوں... بس یہی انکار مہنگا پڑ گیا اُسے... وہ تھانے لے گئے اُسے... صبح اس کی لاش سڑک پر پڑی ملی تھی۔ دکان کے سامنے... لوگوں نے بڑا احتجاج کیا تھا۔ اس کا بیٹا وکیل بن گیا ہے؟ نام کیا ہے اس کا؟''

''حامد رشید... اس نے بتایا کہ ماں نے بڑی محنت کی، گارمنٹ فیکٹری میں کپڑے سیئے اور اسے پڑھایا۔ وہ بھی مرچکی ہے۔ اس نے سب رشتے داروں سے تعلق ختم کردیا تھا جو مدد ایک پیسے کی نہیں کرتے تھے، بدنام بہت کرتے تھے۔ شادی کو صرف سات سال ہوئے تھے، وہ جوان تھی اور خوب صورت تھی مگر اس نے دوسری شادی نہیں کی تھی۔''

کمال دین افسردہ نظر آنے لگا۔ ''وہ کیسے مرگئی؟''

''چلتی ویگن سے اتری تھی۔ پچھلے پہیے کے نیچے آگئی۔ اب دنیا میں حامد کا کوئی نہیں... وکالت سے اچھی آمدنی ہوتی ہے آج بھی کسی بڑے وکیل کا ماتحت ہے۔ ایک دن اپنی وکالت شروع کرے گا تو لاکھوں کمائے گا، آپ اس سے مل لیں۔''

''کیوں نہیں، میں اس سے ضرور ملوں گا۔'' کمال دین کی آنکھوں میں جیسے کوئی خواب اتر آیا۔ ''رشید کاریگر کا بیٹا غلط آدمی نہیں ہوسکتا۔ اس نے بھی جان دے دی تھی اصول کی خاطر... اس کا بیٹا بھی انصاف دلا رہا ہے... اچھا بھئی مجھے تو نیند آرہی ہے۔''

وہ سونے کے لیے اٹھا تھا کہ آگے جھکا اور منہ کے بل گر گیا۔

''ابا۔'' وہ چلائی۔

''ابا کی بچی۔'' اسپیشل پرائیویٹ روم میں لیٹے ہوئے مریض نے چلا کے کہا۔ ''تو سونے آئی ہے یہاں... سونا تھا تو میرے ساتھ سوجاتی۔''

شیما نے ضبط سے کام لیا۔ ''آئی ایم سوری... مجھے جھپکی آگئی تھی۔''

''اسی لیے میں نے کہا تھا کہ یہاں آجا... بیڈ پر جگہ اتنی کم بھی نہیں۔''

''مسٹر سلیمان، زبان سنبھال کے بات کریں... یہ واہیات بات آپ دوسری بار کررہے ہیں۔'' شیما نے برہمی سے کہا۔

''کیا؟ میرے ساتھ زبان لڑاتی ہے؟ دو ٹکے کی نرس... کیا اتنا پیسہ ہم بے عزتی کرانے کے لیے دیتے ہیں؟'' اس نے سرہانے لگی گھنٹی کا بٹن دبایا۔

''آپ کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہوں، میں یہاں ملازم نہیں، مالک ہوں اس اسپتال کی۔''

احسن اندر آیا اور اسے باہر لے گیا۔ وہ غصے سے

کانپ رہی تھی۔ ''احسن اس بدتمیز مریض سے کہو کہیں اور چلا جائے، کسی بھی اسپتال میں جاسکتا ہے وہ۔''

''ڈارلنگ، تم جانتی ہو وہ ایک سیاسی بھگوڑا ہے جو اسپتال میں آکے لیٹ گیا ہے۔''

''احسن، میں نے پھر ابا کو خواب میں دیکھا۔ کل اُن کی برسی تھی نا، میں نے مجبوری میں یہ ڈیوٹی قبول کی تھی۔ وہ نرس نہیں آئی تھی۔'' اس نے احسن کے کندھے پر سر رکھا اور رونے لگی۔

''کم آن، تم گھر جاکے آرام کرو، اس سے میں نمٹ لوں گا۔'' احسن نے کہا۔

☆☆☆

دوسرے خوابوں کی طرح یہ خواب بھی اب شیما کا آسیب بن گیا تھا۔ اس کی حالت کسی نان اسٹاپ ائرکنڈیشنڈ ٹرین میں سکون سے سونے والے مسافر جیسی تھی جو صبح ایک نئے دن میں سلامتی کے ساتھ منزل پر پہنچنے کا اتنا ہی یقین رکھتا تھا جتنا اپنی زندگی کے تسلسل پر، مگر ٹرین الٹ گئی اور منزل یوں غائب ہوگئی جیسے اس کا وجود ہی نہ تھا۔

ابھی اس سانحے کو دن ہی کتنے ہوئے تھے آٹھ مہینے پہلے استاد کمال دین سونے کے لیے اٹھا تو ایک خوش اور مطمئن آدمی تھا۔ اس کو ایک کام ملا تھا جس میں جان مار کے وہ چار پانچ لاکھ روپے کما سکتا تھا اور گزشتہ دو ماہ کا سارا نقصان پورا کرسکتا تھا۔ یہ سب زندگی بھر کی نیک نامی تھی کہ دکان پھر کھولتے ہی قدرداں آگئے تھے۔ اچانک اس کی ہیرو بیٹی شیما نے اس کی آخری اور سب سے بڑی فکر بھی دور کردی تھی۔ وہ مطمئن تھا کہ اس کا انتخاب ہر لحاظ سے بہترین تھا۔ وہ رشید کو جانتا تھا، اس کا بیٹا اگر وکیل تھا تو باپ جیسا ہی ہوگا۔ وہ کسی طرح بھی شیما کے خوابوں کو شرمندہ نہیں ہونے دے گا۔ وہ اس کی شادی اتنی دھوم دھام سے کرے گا اور اسے اتنا جہیز دے گا کہ وہ تمام عمر سر اٹھا کے جی سکے۔

مگر وہ گرا تو پھر نہ اٹھا۔ اسپتال میں ڈاکٹرز نے اسے دیکھ کے کہا۔ ''ہمارا اندیشہ درست تھا۔ تمہارے والد نے اس وقت ہماری بات مان لی ہوتی تو یہ وقت نہ آتا، اب کچھ نہیں ہوسکتا۔''

''ایسے مت کہیے ڈاکٹر صاحب، آج کل تو ہر مرض کا علاج ہے۔''

ڈاکٹر نے اسے افسوس سے دیکھا۔ ''ہاں ہے، انڈیا میں لیور ٹرانس پلانٹ پر تقریبا دس لاکھ خرچ ہوں گے۔ اپالو (APPOLO) انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنس میں علاج، دوا، رہائش، آمدورفت کے اخراجات... سب ملا کے یہ زیادہ تو نہیں مگر تم کہاں سے لاؤ گی دس لاکھ؟''

''اس کے بعد ابا ٹھیک ہوجائے گا نا؟''

''آئی ہوپ سو... لیکن دس لاکھ تم کہاں سے کرو گی، ہی از اے کارپینٹر... جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، اس نے یہی بتایا تھا دو مہینے پہلے۔''

''اگر میں دس لاکھ کا انتظام کرلوں... تو دوسرے مرحلے بھی ہوں گے ڈاکٹر صاحب... پاسپورٹ پر ویزا کے...''

سینئر ڈاکٹر نے ہمدردی سے اس موت سے لڑنے پر کمربستہ لڑکی کو دیکھا۔ ''اس کے لیے تم مجھ پر بھروسا کرسکتی ہو۔ ریفرنس، این او سی اور میڈیکل ہسٹری، ان سے ویزا جلدی مل جائے گا۔ میں آن لائن بات کرلیتا ہوں وہاں کے ڈاکٹرز سے، گڈ لک۔''

اسپتال سے واپس آکے اس نے ماں سے کہا۔ ''ہم ابا کو علاج کے لیے انڈیا لے جائیں گے۔''

''انڈیا؟'' اس کی ماں نے سوجی ہوئی آنکھیں اٹھا کے یوں کہا جیسے یہ لفظ اس نے پہلی بار سنا ہو۔

''ہاں ماں انڈیا، بڑے ڈاکٹر نے آج مجھے بتایا کہ یہاں ابھی علاج کی سہولت نہیں، برطانیہ، امریکا میں ہے، لیکن سب سے کم خرچہ انڈیا میں ہے علاج کرانے کا۔'' شیما نے کہا۔

اس کی ماں نے ڈاکٹروں کے رویّے سے مایوس ہو کے خود پر قبل از وقت بیوگی طاری کرلی تھی۔ یہ رونے کی بات نہیں تھی مگر اس کی آنکھیں بہنے لگیں۔ ''کتنا کم، لاکھ کی تو اب کوئی اوقات ہی نہیں رہی۔''

شیما نے جھجکتے ہوئے کہا۔ ''دس لاکھ میں سب ہو جائے گا، آنا جانا اور وہاں آپریشن وغیرہ...''

ماں اسے یوں دیکھتی رہی جیسے پہچاننے کی کوشش کررہی ہو۔ ''کہاں سے آئیں گے یہ دس لاکھ؟ دس ہزار کی بات ہوتی تو اتنا میرا زیور تھا، باقی سب تو نکل گیا جب تیرا ابا دو مہینے پہلے بیمار پڑا تھا۔ وہ سب جو تیری شادی کے لیے جوڑ کے رکھا تھا۔''

''ہاں میں علاج کی بات کررہی ہوں، تم شادی کو لے کر بیٹھ گئیں۔''

''تو بتا دے نا کہ دس لاکھ کہاں سے آئیں گے؟ تیرے پاس ہیں جو انڈیا جانے کی بات کررہی ہے؟'' ماں تلخی سے بولی۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں؟ ۔

- ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
  سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابنِ صفی کی مکمل رینج
- ایڈ فری لنکس، لنکس کو پیسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

- ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور رژیوم ایبل لنک
- ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو ہر پوسٹ کے ساتھ
- پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- مشہور مصنفین کی کُتب کی مکمل رینج
- ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

**We Are Anti Waiting WebSite**

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

⇦ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

⇦ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

Online Library For Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety

twitter.com/paksociety1

شیما نے سر اٹھا کے چاروں طرف دیکھا۔ ''یہ مکان ہے ہمارے پاس۔''

وہ چونکی۔ ''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ ہم اسے گروی رکھ دیں گے۔ اب تو بینک بھی لون دیتے ہیں پراپرٹی پر... اگر بیچا ہو تو کھڑے کھڑے پندرہ لاکھ مل سکتے ہیں، مجھے پتا ہے۔''

ماں نے اسے متوحش نظر سے دیکھا۔ ''مکان بیچ کے جائیں گے تو واپس آ کے کہاں رہیں گے؟''

وہ اٹھ بیٹھی۔ ''ماں، میرا باپ ہے وہ مگر تمہارا بھی شوہر ہے۔ کیا اس مکان سے اس کی زندگی کم اہم ہے تمہارے لیے؟''

''یہ میں نہیں کہہ رہی ہوں۔''

''تم یہی کہہ رہی ہو ماں... لیکن میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔'' وہ منہ پھیر کے سو گئی مگر نیند اس کی آنکھوں سے بہت دور تھی۔ تقدیر بڑی سفاک تماشائی تھی۔ اس نے رنج اور خوشی کے تصادم کے لیے ایک ہی لمحہ منتخب کیا۔ انتظار کیا کہ وہ اپنی زندگی کا سب سے اہم فیصلہ کسی مشکل اور پریشانی کے بغیر تسلیم کر لے تو اسی لمحے محبت کرنے والے باپ کی زندگی واپس لینے کا فیصلہ سنا دے۔ جیسے یہ کوئی مشروط سودا تھا کہ شوہر کی محبت کے بدلے باپ کی محبت دے دو۔ یہ دکھ سکھ کا ڈراما آگے پیچھے بھی تو ہو سکتا تھا۔ ایک دن یا ایک ہفتے یا ایک مہینے پہلے یا بعد... تدبیر کند بندہ تقدیر کند خندہ... یہ بات اس کے باپ نے نہ جانے کب اپنے فارسی کے استاد سے سنی تھی اور اسے یاد رہ گئی تھی کہ اسے دہراتا رہتا تھا۔

حامد سے ملاقات صرف چھ مہینے پہلے کی بات تھی۔ کالج سے اِدھر اُدھر کہیں جانا شیما کا دستور نہیں تھا حالانکہ وہ دیکھتی تھی کہ اس کے ساتھ کی لڑکیاں کتنی بے خوفی سے افیئرز چلاتی تھیں اور کتنے فخر سے سب کے بیچ میں بیٹھ کے سناتی تھیں۔ ان پر مرنے والے کالج کے گیٹ سے انہیں ساتھ لے جاتے تھے۔ کبھی کالج لگنے سے پہلے تو کبھی چھٹی کے بعد... نامہ بری تو اب کوئی مسئلہ ہی نہیں تھی۔ ان کے درمیان طویل رومانی گفتگو کے لیے موبائل فون کے پیکیج دستیاب تھے۔ ان کے لیے جان دینے والے پرستار بدلتے بھی رہتے تھے۔ شیما سب دیکھتی اور سنتی تھی مگر اسے اپنے باپ کا محبت کرنے والا اور اعتماد کرنے والا مظلوم چہرہ کوئی غلط قدم اٹھانے سے روک لیتا تھا۔ وہ ایک نہیں تین بیٹے گنوا چکا تھا اور اب اس نے ساری توقعات شائلہ سے... اپنی بیرو شیما سے وابستہ کر رکھی تھیں۔

وہ ماں کو بتا کے آئی تھی کہ کالج کے بعد وہ غزالہ کے گھر جائے گی۔ اس کے بھائی کی منگنی تھی۔ غزالہ ان کے گھر آتی جاتی تھی۔ اس کا باپ کسی سرکاری محکمے کا چھوٹا موٹا افسر تھا۔ ظاہر ہے کہ وہ کوئی بہت ایماندار آدمی نہیں تھا۔ اس نے ملازمت کے دوران ہی اپنا چار سو گز کا گھر بنا لیا تھا، اس پر ہاؤس بلڈنگ کارپوریشن کا قرض بھی تھا مگر زمین لینا اور تعمیر کے زیادہ تر اخراجات برداشت کرنے کے بعد ماہانہ قسط ادا کرنا بھی صرف تنخواہ میں مشکل ہی نہیں، ناممکن تھا۔ تاہم وہ شریف لوگ تھے۔ ایک تقریب میں انہوں نے شیما کے والدین کو بھی مدعو کیا تھا تو انہوں نے ایک کارپینٹر کو بھی مساوی عزت دی تھی اور دبے لفظوں میں اعتراف بھی کر لیا تھا کہ ایمانداری تو جرم ہو گئی ہے۔ سب کے درمیان رہ کے وہی کرنا پڑتا ہے جو سب کرتے ہیں ورنہ نوکری نہیں چلتی... اور شیما کے باپ نے بعد میں کہا تھا کہ چلو اس نے مجبوری کا اعتراف تو کیا، زمانہ واقعی ایسا ہی ہے۔

غزالہ کے باپ نے اسے کالج آنے جانے کے لیے ایک چھوٹی سی پرانی مگر اچھی حالت کی گاڑی لے دی تھی۔ اس کا گھر مخالف سمت میں نہ ہوتا تو وہ روز شیما کو لانے لے جانے کی ذمّے داری قبول کر لیتی۔ یہ اس نے استاد کمال دین سے بھی کہا تھا۔ اس روز کالج سے نکل کے گھر جانے کے بجائے غزالہ نے گاڑی کا راستہ بدلا تو شیما نے پوچھا۔ ''یہ کدھر جا رہی ہے تو...؟''

''بس یار ایک چھوٹا سا کام ہے وکیل سے... میرے والد کا کلاس فیلو تھا۔ میں اسے بھی چاچاجی کہتی ہوں۔''

''وہی کرائے دار کا معاملہ ہے؟''

''ہاں، وہ شرافت سے گھر خالی کرنے کی بات ہی نہیں سنتا۔ حالانکہ ابھی شادی میں چھ مہینے تھے جب ہم نے اپنی ضرورت بتائی تھی۔ ورنہ اتنے سالوں سے ڈیڈی نے تو کرایہ بھی نہیں بڑھایا تھا۔ یہی غلطی ہو گئی شرافت میں، اب اتنے کرائے میں ایسا گھر کون دے گا۔ ٹال رہا تھا کہ ہاں دیکھ رہا ہوں، تلاش کر رہا ہوں، اب منگنی کے تین مہینے بعد شادی کی تاریخ طے ہو گئی تو خبیث مکر گیا کہ وعدہ نہیں کر سکتا... دوسرا مکان ملے گا تو خالی کروں گا۔ ہم نے تو خالی ہونے والے دو گھر بھی بتائے مگر اس کی نیت ہی نہیں تھی ایک کو کہا کہ خراب بنا ہوا ہے رہنے کے قابل نہیں تو دوسرے کا کرایہ... اسے بہت لگا۔ اب یہ تو ہو گا... مکان اچھا بھی چاہیے اور سستا بھی... یہ ہو سکتا ہے بھلا؟ اور جب مجبوری

کوئی نہ ہو۔''

''کرتا کیا ہے؟''

''جب آیا تھا تو ایم، اے کر رہا تھا۔ باپ کے تعلقات سے کسی نیوز چینل میں نوکری مل گئی۔ بس وہیں سے اس کا رویّہ بدل گیا۔ اب تعلقات کی دھمکی ہے۔ پولیس اور ایف آئی اے کیا ہر جگہ مراسم ہیں۔ باپ تو شریف آدمی تھا۔ یہ سیدھے منہ بات نہیں کرتا۔ یہ جو صحافی ہیں اور وکیل آج کل کے... ان کے اسی رویّے کی وجہ سے بینک بھی انہیں قرضہ نہیں دیتے۔''

''وہ تمہیں مشکل میں نہیں ڈالے گا اگر اس پر مقدمہ کیا؟''

''یار پھر کیا کریں... ہمارے بھی تعلقات ہوتے نا بدمعاشوں سے، پولیس یا فوج میں... تو ہم تھانہ کچہری کیوں کرتے... ترڑی لگواتے، اس کی صحافت والی بدمعاشی نکال دیتے۔ ابا نے کہا تھا کہ وکیل چاچا سے کہنا ہم اور انتظار نہیں کر سکتے، کیس کر دیں۔''

وہ کوئی معمولی وکیل کا آفس نہیں تھا۔ وہاں پورا دفتر لگا دیکھ کے شیما بھی سمجھ گئی تھی کہ کوئی لیگل فرم ہے جس میں ماتحت وکیل بھی اپنے اپنے کیبن میں بیٹھتے تھے۔ دو کلرک ٹائپ ملازم تھے اور ایک سیکریٹری... اس وقت وہاں سب موجود تھے۔ احمد محمود ایسوی ایٹس کے مالک احمد صاحب کے لیے انہیں انتظار کرنا پڑا۔ سیکریٹری غزالہ کو جانتی تھی چنانچہ ان کے لیے چائے آ گئی۔

احمد صاحب آدھے گھنٹے بعد آئے۔ وہ سفید بالوں والے پُرکشش شخصیت کے مالک تھے اور غزالہ کو بیٹی ہی سمجھتے تھے۔ ''دیکھو، قانون کا راستہ جلیبی کی طرح ہے... مطلب یہ کہ بہت الجھا ہوا اور الجھا دینے والا۔ تمہارے والد صاحب ہیں بھولے خاں کیا کیس کریں گے؟ یہی نا کہ اس نے چار ماہ سے کرایہ نہیں دیا، وہ لے آئے گا جعلی رسیدیں بنا کے تمہارے والد صاحب کے دستخط بھی ہوں گے اس پر، اور صاف مکر جائے گا کہ ہم سے تو کبھی گھر خالی کرنے کی بات بھی نہیں ہوئی۔ اب پہلے تو اسے دیں نوٹس... اس کے بعد ہی کیس ہوگا۔ تین مہینے تو اسی میں نکل جائیں گے۔''

''پھر آپ ہی بتائیں نا کوئی طریقہ۔'' غزالہ پریشان ہو کے بولی۔ ''اب وہ کہتا ہے کہ ایک لاکھ دو تو مکان خالی کر دوں گا۔''

''یہی ہوتا ہے نورِ چشم... آسان تو یہی ہوتا مگر ظاہر ہے بھولے خاں کے پاس اس وقت ایک لاکھ کہاں... پہلے تو بیٹھا رہا اس بھروسے پر کہ جب ضرورت پڑے گی کرایہ دار چلا جائے گا۔ اب شادی سر پر آ گئی تو خیال آیا۔ خیر، پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ کرائے دار وہ تو نہیں ہے نا، اس کا باپ ہے۔ اس کا کچھ بندوبست کرتے ہیں۔''

''کیسا بندوبست؟''

''سرکاری مہمان بنانے کا...'' وہ مسکرایا۔

''انکل... وہ تو بوڑھا اور بیمار آدمی ہے۔''

''یہی تو فائدہ ہے۔ دشمن کی کمزوری ہی اس کی شکست کا سبب بنتی ہے۔ مجھے اصل کرائے نامے کی کاپی چاہیے۔ کب آئے تھے یہ لوگ تمہارے اس گھر میں؟'' احمد صاحب نے انٹرکام کا بٹن دبایا۔

''میرا خیال ہے آٹھ سال پہلے... جب یہ مکان بنا تھا۔''

''دیکھو ذرا حامد کو بھیجو۔'' احمد صاحب نے کہا۔ ''ہاں، آٹھ سال بالکل ٹھیک بتایا تم نے... اب یہی قانونی غلطی کرتے ہیں مالک مکان جو گلے پڑ جاتی ہے کہ کرایہ نامہ رجسٹریشن نہیں کراتے۔ گیارہ مہینے والا چلتا رہتا ہے اور خرابی کی بنیاد بن جاتا ہے ورنہ سال کے سال بناؤ۔''

ایک نوجوان اندر آ گیا جس کی شخصیت میں اعتماد تھا اور نفاست بھی۔ کوٹ کے بغیر وہ سفید شرٹ بلیک ٹائی اور پینٹ میں تھا۔ ٹائی کو بھی اس نے قمیص کا اوپر والا بٹن کھولنے کے لیے ڈھیلا کر لیا تھا۔ ''آپ نے بلایا ہے سر۔'' پھر اس نے ان کو دیکھ کے سر خم کیا۔

''ہاں، تم ذرا جاؤ غزالہ کے ساتھ... اور ان کے والد سے کرایہ نامہ لے کر آؤ۔ کوئی فائل ہو تو وہ بھی۔'' پھر وہ اسے ہدایت دیتے رہے کہ مزید کیا معلومات حاصل کرنا ضروری ہیں۔ وہ صرف سر ہلاتا رہا لیکن شیما نے نوٹ کیا کہ ساری توجہ باس کی طرف رکھنے کے باوجود وہ چوری چوری ایک نظر اس پر ڈالتا تھا اور پکڑا جاتا تو جھینپ کر سرخ ہو جاتا۔ شیما مسکرائے بنا نہ رہ سکی۔

''آپ برا نہ مانیں تو میں گاڑی چلاؤں۔'' وہ نیچے آ کے بولا۔

''کیوں...؟'' غزالہ حیران ہوئی۔ ''میں تو کئی سال سے گاڑی لا رہی ہوں۔''

''جی... وہ... ایسے پیچھے بیٹھنا اچھا نہیں لگتا مجھے... آپ بیٹھیں۔''

خلافِ توقع غزالہ نے گاڑی اسے وے دی''اوکے

کے... مگر مجھے راستے میں ایک دو کام اور بھی ہیں۔''

''کوئی بات نہیں جی...'' وہ بولا۔

ایک گھنٹے بعد گھر پہنچ کے وہ ڈرائنگ روم میں بیٹھ گیا تو شیما نے کہا۔ ''خوار کر دیا تو نے اس بے چارے کو... ڈرائیور تھا وہ تیرا۔''

وہ ہنسی۔ ''بڑا شوق تھا نا اسے اپنی کیٹس کی نمائش کا... بیٹھ جاتا آرام سے پیچھے۔''

دو ہفتے بعد وہ کالج میں تھی کہ اسٹرائک ہوگئی اور اس کے باہر نکلنے تک حالات خراب ہو گئے۔ سڑکوں پر سے پبلک ٹرانسپورٹ غائب ہوگئی۔ پیٹرول پمپ بند اور ٹریفک جام ہوگیا۔ وہ سڑک پر کھڑی تھی، دور کہیں فائر ہوئے اور پھر دھواں اٹھا۔ وہ سخت گھبراہٹ میں مبتلا ہوگئی۔ اسی وقت موبائل فون پر اس کے باپ کی کال آئی۔ ''میرو شیما، کہاں ہے تو بیٹا؟ شہر میں ہنگامے ہو رہے ہیں۔''

شیما نے جھوٹ بولا۔ ''اِدھر تو سب ٹھیک ہے ابھی تک۔ کالج بند ہوگیا۔ میں آرہی ہوں۔''

''کیسے آئے گی، بس، ویگن ہے؟''

''میں رکشا، ٹیکسی پکڑ لوں گی، آپ فکر نہ کریں۔''

اس نے فون بند کر دیا۔

اسی وقت ایک لمبی سیاہ کار اس کے سامنے آرکی۔ خودکار پاور ونڈو کا شیشہ نیچے اترا تو اسے حامد کا چہرہ نظر آیا۔

''حامد صاحب۔''

''خاتون جلدی کیجیے... بیٹھیے۔'' اس نے شیما کی بات کاٹ دی۔

وہ پیچھے بیٹھ گئی۔ ''یہ کیا ہو رہا ہے حامد صاحب...''

''کیا ہو رہا ہے؟ وہی جو معمول ہے اس شہر کا... آدھے گھنٹے میں پورا شہر بند... وہ تو اچھا ہوا میری نظر پڑ گئی آپ پر۔''

''آپ کہاں سے آرہے تھے؟ یہ آپ کی گاڑی ہے؟''

وہ ہنسا۔ ''ابھی تو میں نے ایسی گاڑی کے خواب بھی دیکھنا شروع نہیں کیے۔ اللہ آپ کی زبان مبارک کرے خاتون... یہ احمد صاحب کی گاڑی ہے۔ سروس کرا کے لا رہا تھا۔ اب آفس کیسے جاؤں گا، خطرناک راستہ ہے۔''

''پھر کیا کریں گے؟''

''ان کے گھر پہنچاؤں گا گاڑی... پھر سوچوں گا کہ اپنے گھر کیسے جاؤں؟ مجھے راستہ بتاتی جائیں... خاتون۔''

''یہ کیا خاتون لگا رکھی ہے... کیا آپ کو معلوم نہیں کہ میرا نام شائلہ ہے؟''

وہ جھینپ کے ہنسا۔ ''جی... معلوم تو ہے۔''

''بڑی پریشانی سے بچا لیا اس وقت آپ نے... ابا کے فون پر فون آرہے تھے۔ میں نے جھوٹ بول دیا تھا کہ ٹیکسی لے کر آجاؤں گی۔''

''اور دیکھیں ٹیکسی آگئی۔ اللہ میاں بھی تو فوراً سن لیتے ہیں۔''

''سچ کہا آپ نے... وہ غزالہ کا کام ہوگیا؟''

''بتایا نہیں اس نے... آج کیا تاریخ ہے، اٹھائیس... دو دن بعد ان کا مکان خالی ہو جائے گا۔ سامان وہ اٹھا چکے ہیں۔''

''اچھا؟ کیسے ہوا یہ سب؟''

''بس خا... مس شائلہ... ترپ کا پتا سب کے پاس ہوتا ہے، اس کے پاس صحافت کا تھا ہمارے پاس قانون کا۔'' وہ سامنے دیکھتا رہا۔

وہ ہنسنے لگی۔ ''سب کے پاس؟ میرے پاس تو کوئی نہیں۔''

اس نے نظر سڑک سے ہٹا کے شائلہ کو غور سے دیکھا۔ ''ہے شائلہ... بس تمہیں معلوم نہیں... زبردست ترپ کا پتا ہے تمہارا۔''

اس نے حیرانی سے کہا۔ ''ایسا کون سا ترپ کا پتا ہے میرے پاس جس کا مجھے بھی پتا نہیں۔''

''تمہارا حسن...'' وہ سیدھا سامنے دیکھتا رہا۔ ''آگے کچھ گڑبڑ ہے۔''

شائلہ کا رنگ بدلا مگر اس نے بات پلٹ دی۔ ''پیچھے والی گلی سے نکال لیں۔''

اس نے صرف سر ہلایا۔ ''کرائے دار کے والد کے خلاف ایک درخواست آگئی تھی دھوکا دہی کی... انہوں نے مکان کو اپنا بتا کے فروخت کرنے کی کوشش کی، ایک لاکھ بیعانہ بھی وصول کر لیا۔ ایک بروکر کی گواہی اور رسید تھی۔ انہیں ایک رات عزت سے تھانے میں رکھا۔''

شائلہ ہنسنے لگی۔ ''واقعی شرافت کا زمانہ نہیں۔''

''یہ نہ کہیں... میں کیا شریف آدمی نہیں لگتا آپ کو... آپ کے والد... احمد صاحب کون سے بدمعاش ہیں مگر ایک بدمعاش کے سامنے سو شریفوں کی گھگی بندھ جاتی ہے تو وہ شیر ہو جاتا ہے ورنہ سو آدمی مار مار کے اسے دنبہ بنا دیں۔''

شائلہ ہنسی۔ ''بقرعید کے لیے؟ یہ کدھر چل پڑے

آپ؟‘‘

’’گھبراؤ نہیں، تم کو بحفاظت گھر ڈیلیور کرنا میری اخلاقی ذمّے داری ہے لیکن راستہ نہیں ہے ابھی... کچھ دیر لگ جائے گی، اپنے والد سے فون پر دوسرا جھوٹ بول دو ان کی تسلی کے لیے۔‘‘

’’سچ کیوں نہ بول دوں کہ ایک شریف آدمی کے ساتھ ہوں۔‘‘

’’کوئی حرج نہیں اس میں بھی... شرافت کی سند تو ملی آپ سے... کسی طرح بھی سہی۔‘‘

شمائلہ نے گھر کا نمبر ملایا۔ ’’امی، گھبرانا مت... میں کالج کے اندر ہوں... ذرا یہ ہنگامہ کم ہو جائے تو کالج والے اپنی بس میں سب کو پہنچا دیں گے، رینجرز والے آگئے ہیں۔‘‘

رینجرز کی گاڑیاں واقعی آرہی تھیں۔ سامنے ٹائر جلانے والوں کا ایک مجمع ہاتھ میں لمبے لمبے ڈنڈے لہراتا نظر آرہا تھا۔ حامد نے ایک عمارت کے گیٹ پر ہارن دیا اور گاڑی کو گھما کے پیچھے لے گیا۔ یہ سپریم کورٹ آف پاکستان کی مقامی رجسٹری تھی جہاں پہلے واٹر بورڈ کا آفس تھا۔ شمائلہ کے کچھ پوچھنے سے پہلے گاڑی عقبی حصے میں رک گئی۔ غالباً احمد صاحب کی گاڑی کو یہاں پہنچایا جاتا تھا۔ وہ سپریم کورٹ بار کے رکن تھے۔

’’چائے نہایت فضول ملتی ہے یہاں اور چائے کا نہ موڈ ہے نہ موسم... کولڈ ڈرنک کیا لو گی؟‘‘ وہ اتر کے کھڑکی میں جھک گیا۔

شمائلہ اب کیسے انکار کرتی۔ ’’کچھ بھی لے آؤ، جو تم پیو۔‘‘

وہ ایک دروازے میں غائب ہو گیا اور پھر دو ٹن لیے نمودار ہوا۔ ’’افسوس کہ بریانی ختم ہو گئی۔ سینڈوچ بھی دو ہی بچے تھے۔ میری اور تمہاری قسمت کے۔‘‘ وہ اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

’’یہ سب کرنے کی کیا ضرورت تھی؟‘‘ اس نے رسماً کہا۔

’’اور کیا کرتا... آگے پی سی ہے۔ اچھا تھا عزت سے بیٹھ کے کھانا کھاتے... مگر تم جاتیں کہاں، تم لڑکیوں پر خوف کا بھوت جو سوار رہتا ہے کہ ہر شخص انہیں اغوا کرنے کے لیے پھر رہا ہے۔‘‘

’’کیا غلط ہے اس میں؟‘‘ شمائلہ نے برا مان کے کہا۔

’’رہتی کہاں ہیں آپ؟‘‘ وہ سکون سے بولا۔

’’گلستان جوہر۔‘‘

’’اور علم حاصل کرنے جاتی ہیں چینن... برنس روڈ کیا کم دور ہے... کتنی لڑکیاں ہیں کالج میں؟‘‘

’’میرا خیال ہے ہزار سے اوپر... مطلب کیا ہے آپ کا...؟‘‘

’’آج تک کتنی اغوا ہوئیں؟ چار سال میں... فرسٹ ایئر سے بی اے فائنل تک... بہت ہوں گی جو آپ کی طرح دور سے آتی ہوں گی اسی طرح بس، ویگن میں... چاروں طرف سے۔‘‘

’’آپ یہاں بھی وکیل بن کے دلائل دے رہے ہیں۔‘‘ وہ مسکرائی۔

’’بات دلیل سے کرنی چاہیے، ورنہ نہیں کرنی چاہیے۔ بغیر دلیل کے صرف محبت ہوتی ہے۔‘‘ وہ متانت سے بولا۔

شمائلہ چونکی مگر اس نے ظاہر نہیں ہونے دیا۔ ’’پہلے جو پرنسپل تھیں دور کے رشتے سے میری تائی تھیں... ابا نے ان کی مانی ورنہ اتنی دور آنے کی ضرورت نہیں تھی۔‘‘

’’وقت ضائع کرنے کے لیے تم بھی بی اے کے بعد ایم اے کرو گی۔ یونیورسٹی نزدیک ہے۔‘‘ وہ ٹن سے سپ کرتا رہا۔

’’کیسی باتیں کرتے ہو تم؟ ایم اے کیا وقت ضائع کرنے کے لیے کیا جاتا ہے؟‘‘ وہ برہمی سے بولی۔

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ ’’سب کرتے ہیں۔ پھر جھک مارتے پھرتے ہیں نوکری کے لیے... وہ رشوت یا سفارش سے ملتی ہے... سفارش بھی کم سے کم وزیر کی... دو لاکھ نقد میں کلرکی، صرف ان محکموں میں جہاں خدا کا فضلِ ربی نہیں ہے۔ روکھی سوکھی تنخواہ ہے۔ اور لڑکیاں تو بس جھک مارتی ہیں ڈاکٹری پڑھ کے بھی... وہی گھر، شوہر اور بچے سنبھالنا جو میٹرک پاس لڑکی بھی کر لیتی ہے اور بہتر کر لیتی ہے کیونکہ وہ عدم اطمینان کا شکار نہیں ہوتی۔‘‘

’’اُفوہ، بڑی ریسرچ کر رکھی ہے جناب نے... اس قدر تنگ نظری اور تعصب ہے بلکہ جہالت کہ لڑکیاں کیوں پڑھ رہی ہیں جب انہیں کام وہی کرنے ہیں۔‘‘ اسے اب واقعی غصہ آرہا تھا۔

حامد کا لہجہ نہیں بدلا۔ ’’میری ماں نے تو میٹرک کیا تھا۔ مطلب یہ کہ میٹرک تک پڑھا تھا۔ رزلٹ آیا تو وہ فیل تھی مگر اس نے دیکھا بھی نہیں۔ اس کی شادی ہو چکی تھی۔ اس سے پہلے میری دادی اور نانی البتہ بہت عالم فاضل

تھیں۔ قرآن شریف کے بعد بہشتی زیور بھی پڑھا تھا انہوں نے اور مولانا اشرف علی تھانوی کے فرمودات پر عمل بھی کیا تھا۔''

''یہ تم مجھے کیوں بتا رہے ہو؟''

''میرے والد چار بھائی تھے چھ بہنیں...'' وہ بولتا گیا۔ ''والد صاحب پرچون کی دکان کرتے تھے محلے میں... کتنی آمدنی ہوگی... گھر میں دو کمرے نیچے اور دو اوپر... میرے ایک چاچے نے دکان سنبھال لی۔ میرے باپ نے ترکھان سے کام سیکھا اور کمال کا کاریگر تھا۔ قیمت دینے کے ساتھ لوگ اس کی منت ساجت کرتے تھے فرنیچر بنوانے کے لیے... دو ریلوے میں ملازم ہو گئے تھے۔ لڑکیاں بھی سب بیاہی گئیں اِدھر اُدھر... سب نے میٹرک کیا، پھر بی اے، مگر میری ماں اور نانی دادی نے ڈگری کے بغیر بھی بچوں کی اچھی تربیت کی۔''

''وہی بات نا کہ لڑکیوں کو نہیں پڑھنا چاہیے؟''

''نہیں، مقصد سامنے رکھ کے پڑھنا چاہیے۔ یہ جو آج کل دلیل دی جا رہی ہے نا کہ تعلیم یافتہ مائیں، بچوں کی بہتر پرورش کرتی ہیں، یہ بکواس ہے۔ پہلے والی مائیں تو سب اَن پڑھ تھیں خواہ سرسید کی ہوں یا قائداعظم کی... یا علامہ اقبال کی۔''

''اچھا اب آپ برائے مہربانی مجھے گھر پہنچا دیں۔'' وہ جھلا کے بولی۔

اس نے سر ہلایا اور خالی ڈبے لے کر باہر ایک ڈرم میں ڈال آیا۔ ''آپ کے والد بھی اچھے کاریگر شمار ہوتے ہیں۔'' وہ باہر آ کے کافی دیر بعد بولا۔

وہ چونکی۔ ''آپ جانتے ہیں؟''

''احمد صاحب نے ذکر کیا تھا۔ اپنی دو بیٹیوں کے جہیز کا فرنیچر بنوانا چاہتے تھے لیکن بنا نہیں تو انہیں افسوس تھا۔''

شائلہ کو فخر کے ساتھ دکھ بھی ہوا۔ ''انہوں نے بہت کام کیا، اب بیمار رہنے لگے ہیں۔''

''میرے والد کی طرح ان کو بھی بزنس کرنا نہیں آتا ورنہ وہ لکھ پتی ہوتے۔ محنت کی اجرت کم لی، بہت کم، ورنہ ان کا جو کام تھا وہ آرٹ تھا۔ نہایت فضول مشینی فرنیچر احمد صاحب کو چار گنا قیمت میں ملا۔''

''شاید یہی بات ہے۔''

''شاید نہیں ایسا ہی ہے شائلہ، ہاتھ سے شاہکار بنانے والے ختم ہو گئے یا فاقے کر رہے ہیں۔ چینل گلی ختم ہو رہی ہے۔ قلعی گر، کمہار، روئی دھننے والے سب ختم، کیا بیماری ہے تمہارے والد کو؟''

''کچھ سینے میں سانس کی نالی اور پھیپھڑوں کی پرابلم ہے۔ آری چلاتے، رندہ پھیرتے گل کاری کرتے لکڑی کا برادہ سانس کے ساتھ اندر جاتا رہا۔ پالش کے بخارات گئے۔ اب سانس لینا مشکل ہے، علاج سے فرق نہیں پڑ رہا۔''

''ڈاکٹر کہتے ہوں گے آرام کرو، اچھی خوراک لو۔'' وہ تلخی سے بولا۔

''میرا کوئی بھائی ہوتا تو سنبھال سکتا تھا ان کا کام... کچھ مدد کرتا۔''

''اونہہ... ہوتا تب بھی یہ کام نہ کرتا... رشوت والی نوکری یا افسری کی فکر کرتا، پڑھنے کے بعد قصاب، نائی، دھوبی، کسی کا بیٹا یہ کام نہیں کرتا۔''

''ایم اے کر کے میں پروفیسر بن جاؤں گی، تم دیکھنا۔''

''جیسے میں وکیل بن گیا۔'' وہ خوش دلی سے مسکرایا۔ ''اب ذرا مجھے گائیڈ کرو۔''

وہ گھر سے کچھ دور ہی اتر گئی۔ اس میں یہ بتانے کی ہمت نہیں تھی کہ اس گلی کے شاندار بنگلوں میں سے کوئی بھی اس کا نہیں۔ گلستان جوہر کی رہائشی ہونے کے باوجود ان کے پاس ایک سو بیس گز کا لیز والا گھر نہیں ہے۔ وہ سو گز کے مکان میں رہتی ہے جو پہلے ناجائز آبادی میں تھا مگر اب کچی بستی کو تسلیم کر لیا گیا ہے تو یہ خطرہ نہیں رہا کہ کسی دن بلڈوزر ناجائز تعمیرات کو گرانے آ گئے تو وہ ٹوٹے پھوٹے سامان کے ساتھ کھلے آسمان کی چھت تلے بیٹھے رہ جائیں گے۔ اب تو ان کی آبادی میں بجلی گیس کے ساتھ کیبل بھی تھا اور نوجوان قسطوں پر موٹر سائیکل لے کر تنگ گلیوں میں دوڑاتے پھرتے تھے۔ دو چار گھروں میں کار بھی آ گئی تھی۔

بعد میں کچھ بھی اتفاق سے نہیں ہوا۔ جیسے اس کا غزالہ کے ساتھ احمد صاحب کے آفس جانا یا حامد کا ہڑتال والے دن نمودار ہونا، بعد میں سب مرضی والی پیش قدمی اور اس کی رضامندی والی قبولیت سے ہوا۔ حامد کا دماغ پلاننگ کے ساتھ کام کرتا تھا۔ بے حد منطقی انداز میں سوچتا تھا اور بے خوفی والے اعتماد کے ساتھ ہر کام کو تکمیل تک پہنچاتا تھا۔ اسی لیے وہ احمد صاحب کا معتمدِ خاص تھا اور اس کا ارادہ بالآخر اپنی وکالت شروع کر کے اس سے بھی بڑی لیگل فرم بنانے کا تھا اور جب ان کی ملاقاتوں کا سلسلہ بڑھا تو شائلہ کو اس

میں کوئی شک نہ رہا کہ جو وہ کہتا ہے، کرسکتا ہے۔

بہت کم وقت میں اس نے گاڑی خرید لی۔ کمال دین سے پہلے ہی وہ شائلہ کو بتا چکا تھا کہ اس کے باپ کو پولیس نے کیسی بے دردی سے مارا تھا۔ اس روز وہ کلفٹن کے ساحل کے آخر میں اس دیوار پر پاؤں لٹکا کے بیٹھے تھے جس سے بپھری ہوئی موجیں آ کے ٹکراتی تھیں تو پھوار اوپر تک آتی تھی۔ ہر بار بھیگ جانے والی خواتین خوف، خوشی اور لطف سے چیخیں مار مار کے ہنستی تھیں۔ وہاں ان جیسے بہت تھے مگر کسی کو کسی کی طرف دیکھنے کی فرصت تھی نہ ضرورت۔

''تو تم نے بدلہ لینے کے لیے وکالت شروع کی؟''

شائلہ نے گیلے دوپٹے کو جسم کے گرد لپیٹا۔

''ہاں، ارادہ تو یہی تھا لیکن وہ ایک جذباتی احمق نوجوان کا غصہ تھا۔ میں ایسا کرتا تو میرا انجام بدتر ہوتا۔ میں پولیس مقابلے میں مارا جاتا یا کئی قتل کی وارداتوں میں ملوث کر کے لٹکا دیا جاتا۔ چنانچہ میں سب بھول گیا۔ بدلہ لینے کا طریقہ یہ بھی تو ہوسکتا تھا کہ جو خواب میرے باپ نے دیکھے، وہ میں پورے کروں، اور تم دیکھنا ایک دن میرے پاس ایسی ہی کئی کوٹھیاں ہوں گی۔'' اس نے سی ویو کے پیچھے والی آبادی کی طرف اشارہ کیا۔

''اور جب وہ دن آئے گا تو مجھے بتانے آؤ گے تم؟'' وہ ہنسی۔

''نہیں، تم دیکھو گی سب... کامیابی کا ہر دن۔''

''وہ کیسے؟'' اس نے غیر سنجیدہ لہجے میں سوال کیا۔

''میری شریکِ حیات بن کے اور کیسے۔''

وہ دم بخود رہ گئی۔ ''اچھا؟ یہ فیصلہ آپ کر بھی چکے، مجھے بتائے بغیر۔''

وہ سمندر کی لہروں کو دیکھتا رہا۔ ''ہر بات الفاظ اور زبان کی محتاج نہیں ہوتی، محسوس کی جاسکتی ہے۔ جیسے محبت... ہم جو یہاں بیٹھے ہیں تو یہ کسی فلم کا رومانٹک سین پکچرائز نہیں ہورہا ہے۔ ویسے تم کو پسند ہے یا تم ضروری سمجھتی ہو تو میں ابھی چٹان پر کھڑے ہو کے اعلان کردیتا ہوں کہ لیڈیز اینڈ جنٹلمین... میں اس لڑکی شائلہ سے محبت کرتا ہوں اور شادی کرنا چاہتا ہوں اس سے۔'' وہ اچانک کھڑا ہوگیا۔

شائلہ گھبرا گئی۔ ''پاگل ہوگئے ہو... بیٹھو۔'' اس نے حامد کا ہاتھ پکڑ کے کھینچ لیا۔

''پتا ہے، شرع کی رُو سے اگر میں اور تم یہاں اعلان کردیں کہ ہم نے شادی کرلی ہے تو یہ نکاح تصور کیا جائے گا قانون میں بھی... اور شرع میں بھی... دو بالغ گواہوں کی موجودگی میں یہ اعلان کافی ہوتا ہے اور یہ سب بالغ ہی ہیں۔''

''میرا خیال ہے کہ مجھے چلنا چاہیے۔ تم آج ہوش میں نہیں ہو۔''

''جتنا ہوش میں اس وقت ہوں میں... اتنا ہی کورٹ میں رہتا ہوں اور بات قانون کی کرتا ہوں۔ تم بتاؤ اس میں کیا غلط ہے۔ تم کیوں ملتی ہو مجھ سے... اگر کوئی کہے کہ وقت گزاری کے لیے تو میں اسے قتل کردوں۔''

''تم عجیب آدمی ہو۔'' وہ حامد کو دیکھتی رہی۔

''اچھی بات یہی ہے کہ آدمی ہوں، حیوان نہیں ہوں۔ کسی غرض کے لیے تمہیں بے وقوف نہیں بنا رہا ہوں۔ میں نے تمہیں اور تم نے مجھے بہت اچھی طرح جج کرلیا ہے۔ سمجھ لیا ہے پھر کیا فلموں کی طرح گا کے بتانا ضروری ہے کہ مجھے تم سے محبت ہوگئی ہے اور شادی کے لیے جدائی کے عذاب سے گزر کے فلم کے ختم ہونے کا انتظار ضروری ہے۔''

پلک جھپکے بغیر اسے دیکھتے ہوئے غیر ارادی طور پر اس نے اقرار میں سر ہلا دیا۔

''اب ہماری راہ میں رکاوٹ ڈالنے والا ولن بھی کوئی نہیں۔ میرا خیال ہے تمہارے والدین کو بھی اعتراض نہیں ہوگا۔ میری طرف سے احمد صاحب بات کرسکتے ہیں کیونکہ اور کوئی نہیں ہے۔''

''والد کا بتایا تھا تم نے... والدہ بھی نہیں ہیں؟''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ پھر اپنا پرس نکالا، اس میں چوبیس پچیس سال کی ایک جوان اور خوب صورت لڑکی مسکرا رہی تھی۔ اس نے دس بارہ سال پہلے کے فیشن کی بلیو شرٹ کے ساتھ زرد شلوار پہن رکھی تھی۔ زرد دوپٹا اس کے ایک شانے پر تھا۔ دوسرے شانے پر سے اس کے گھنے ریشمی سیاہ بال سامنے آئے ہوئے تھے۔ ''یہ کون ہے؟''

''میری امی۔'' وہ بولا۔ ''وہ تم سے زیادہ خوب صورت تھیں۔ ان کا نام زیب النسا تھا۔''

شیما نے برا نہیں مانا۔ ''یہ کب کی تصویر ہے، شادی سے پہلے کی؟''

''یہ ان کی حادثاتی موت سے صرف ایک ہفتے پہلے کی تصویر ہے۔ انہیں بس سے اترنا تھا۔ ان کراچی کے بس والوں کو تم جانتی ہی ہو، لاہور کے ویگن والے بھی کم نہیں... امی کے چلانے پر اس نے بریک لگا کر رفتار کم کی تو وہ اتر گئیں اور ویگن کے پچھلے پہیے نے انہیں کچل دیا۔''

''ان کو جلدی کیا تھی... ڈرائیور بس روکتا۔'' وہ کچھ

دیر بعد بولی۔

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”رش آور میں انہیں بڑی جلدی ہوتی ہے اور مسافر اتر ہی جاتے ہیں، ای بھی روز اترتی ہوں گی۔ ایک دن کسی نے فون کر کے مجھے بتایا۔ بہت عرصے بعد کہ جب وہ اتریں تو سامنے سے گزرنے والا ایک موٹر سائیکل سوار ان سے ٹکرا گیا تھا مگر وہ بھاگ گیا، یہ گیارہ سال پرانی بات ہے۔“

”گیارہ سال۔“ اس نے تصویر کو پھر غور سے دیکھا۔ ”تصویر اتنی پرانی نہیں لگتی۔ اس کے رنگ بھی برائٹ ہیں۔“

”میں ڈیجیٹل لیب سے ہر مہینے نیا پرنٹ بنوا لیتا ہوں۔“

”اس کا کیا فائدہ؟ میرا مطلب ہے گیارہ سال پہلے یہ ٹیکنالوجی کہاں تھی؟“

اس نے پرس کو کھولا۔ ”یہ ہے اصل تصویر... دراصل میں ان کو اسی رنگ روپ کے ساتھ دیکھنا چاہتا ہوں۔ جیسی وہ تھیں، تو میں نے پرانی تصویر سے چند سال قبل یہ پرنٹ نکلوایا۔“

”تمہیں ان کی صورت یاد ہے؟“

”ہاں، وہ بالکل ایسی ہی تھیں۔“ اس کی آنکھیں خلا میں دیکھتی رہیں۔

”گھر میں... جہاں تم رہتے تھے، تمہیں ان کی کمی کا احساس پریشان نہیں کرتا تھا؟“

”اسی لیے تو میں لاہور سے کراچی آ گیا تھا۔“ اس نے گھڑی دیکھی۔ ”میرا خیال ہے اب چلنا چاہیے۔ اندھیرا ہو جائے گا تو تمہارے گھر والے پریشان ہوں گے۔“

”نہیں ہوتے وہ پریشان۔ آج سالگرہ ہے میری، چلو تمہیں پیزا کھلاؤں۔“ وہ دیوار سے اترے اور پیزا کھانے چلے گئے۔

☆☆☆

حامد نے اس کی اتری ہوئی صورت کو غور سے دیکھا۔

”کیا ہوا، انکار کر دیا انہوں نے... مجھے معلوم تھا۔“

شیما نے نفی میں سر ہلایا۔ ”ماں ناراض ہوئی تھی مگر ابا نے ساری بات سنی اور وہ خوش ہوئے تھے کیونکہ وہ تمہارے والد کو جانتے تھے۔“

”وہ کیسے جانتے تھے؟“

”انہوں نے کہا کہ اخبار میں پڑھا تھا۔ لاہور میں پبلک نے پولیس تشدد کے خلاف احتجاج کیا تھا اور خاصا ہنگامہ ہوا تھا۔“

”ہاں، وہ تو ہوا تھا، تمہارے ابا صرف اس لیے مان گئے کہ میری بھی وہی ذات ہے ترکھان کا بیٹا ہوں میں۔“

”فضول بات مت کرو، میں نے بتایا کہ تم وکیل ہو... احمد صاحب کے ساتھ کام کرتے ہو۔“

”تو پھر رونی شکل کیوں بنا رکھی ہے؟“

”ابا کو کل پھر دورہ پڑ گیا۔ وہ اسپتال میں داخل ہیں اور ڈاکٹرز نے ایک طرح سے جواب دے دیا ہے۔“

وہ متفکر ہو گیا۔ ”ایسی کیا بیماری ہے؟“

”بیماری لگی ایک تو اس کام سے، لکڑی کا برادہ سانس کے راستے پھیپھڑوں میں جاتا رہا۔ ایک تو انہوں نے ابتدائی علامات کو اہمیت نہیں دی۔ علاج کرایا، کبھی ڈاکٹر، کبھی حکیم یا ہومیو پیتھ... ذرا بہتری آئی تو چھوڑ دیا۔ مزید خرابی پیدا کی سگریٹ نے... چھوڑنے کی بات کرتے ہیں، چھوڑتے نہیں۔“

”اس معاملے میں بڑے بڑے بالکل بے بس ہو جاتے ہیں۔ کسی بچے کی طرح... پہاڑ کی چوٹی سر کر لیں اگر چاہیں... ایک سگریٹ نہیں چھوڑ پاتے، تو اب ڈاکٹر کیا کہتے ہیں؟“

”کہتے ہیں انڈیا لے جاؤ، جگر کے ٹرانسپلانٹ کے لیے۔“

”انڈیا؟ اور معاملہ سانس کی نالی یا پھیپھڑوں کا ہونا چاہیے، جگر کیسے متاثر ہو گیا؟“

”یہ سب مجھے نہیں معلوم، ڈاکٹر پہلے کیا دوا دیتے تھے، کیا بتاتے تھے، ابا خود ہی جاتے تھے اور ہمیں مطمئن کرنے کے لیے کہتے رہے تھے کہ ایسی کوئی بات نہیں، اماں کو یا مجھے اصل بات پتا چلتی تو ہم اس کام سے روک دیتے جو بیماری کا سبب بنا، یہ باپ بھی کتنے پاگل ہوتے ہیں۔ میرے سامنے بڑی بڑی باتیں کرتے تھے کہ میں اپنی ہیرو شیما کے لیے یہ کروں گا وہ کروں گا اور جو کچھ وہ کر رہے تھے وہ خودکشی نہیں تو اور کیا تھا، نہ علاج نہ آرام... اور کام وہی۔“

”آئی ایم سوری، ان کی مجبوری سمجھ میں آتی ہے، اس عمر میں وہ اور کیا کرتے، جتنی آمدنی تھی اسی پیشے میں تھی۔“

”پیشہ بھی کیا منتخب کیا انہوں نے۔ جس میں ان کی مدد صرف بیٹے کرتے... بیٹے کو کچھ پتا ہی نہیں۔“

”چھوڑو یہ بات، پتا ہوتا تب بھی فرق نہ پڑتا۔“

”نہیں حامد، یہ بدقسمتی کی انتہا ہے۔ بیٹے اتنے بے حس بھی نہیں ہوتے، کام میں چاہے ان کا ہاتھ نہ بٹاتے، علاج تو کراتے... جو علاج انڈیا میں ہوسکتا ہے لندن میں بھی ہوسکتا ہے، امریکا میں بھی، وہ مالی مدد تو کرسکتے تھے۔“

”تم کو معلوم ہے انڈیا آنا جانا بھی لاکھوں کا نسخہ ہے۔ سستا ہونے کے باوجود۔“

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ ”ڈاکٹر کے اندازے کے مطابق دس لاکھ... برطانیہ میں اس سے تین گنا اور امریکا میں دس گنا، ابھی وہ آئی سی یو میں ہیں۔ اس کے بھی اخراجات کم نہیں مگر میں نے انڈیا جانے کا فیصلہ کرلیا ہے۔“

حامد اسے بے یقینی سے دیکھتا رہا۔ ”دس کے بارہ لاکھ بھی ہوسکتے ہیں، پندرہ بھی۔“

”مجھے بھی اندازہ ہے۔“

”اور گارنٹی؟ سو فیصد یقین ہے ڈاکٹرز کو کہ وہ بالکل صحت مند ہوجائیں گے؟“

”حامد، زندگی اور موت تو خدا کے ہاتھ میں ہے۔“ وہ بگڑ گئی۔ ”دنیا میں ہے کوئی ڈاکٹر جو علاج کے بعد سو فیصد شفا کی گارنٹی دے۔ سب آپریشن سے پہلے ہی وارثوں سے دستخط حاصل کرلیتے ہیں کہ کسی بھی وجہ سے ڈیتھ ہوجائے تو وہ ذمے دار نہیں، یہ تو معمولی اپنڈکس کے آپریشن کا بھی پروسیجر ہے۔“

”یار مجھے سب معلوم ہے۔ اتنی رقم ہے تمہارے پاس یہ جوا کھیلنے کے لیے؟“

وہ اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ ”اس کو جوا کہتے ہو تم؟ تمہارا باپ ہوتا تو تم کیا کرتے، ہارنے کے ڈر سے جوا نہ کھیلتے پیسا بچاتے، کتنے بے حس ہو تم۔“

”پلیز، مجھے غلط نہ سمجھو۔“ اس نے شیما کو ہاتھ پکڑ کے بٹھا لیا۔ ”شیما، میں تمہارے ساتھ ہوں۔ تمہارا مسئلہ میرا مسئلہ بھی ہے۔ مجھے اتنا غلط نہ سمجھو۔“

شیما نے ایک گہرا سانس لیا۔ ”میں تم سے کچھ چھپاؤں گی نہیں، جو ہمارے پاس ہے وہ تو جانے سے پہلے ہی ختم ہوجائے گا۔ آئی سی یو کے اخراجات بہت ہوتے ہیں پرائیویٹ اسپتال میں... سرکاری اسپتال میں تو وینٹی لیٹر بھی خراب پڑا ہوتا ہے۔ ڈاکٹر توجہ نہیں دیتے۔“

”میں احمد صاحب سے کہتا ہوں...“

”چھوڑو، یہ ایک ہفتے یا ایک مہینے کی بات نہیں ہے اور پھر ڈاکٹرز نے خود بتا دیا ہے مجھے کہ واحد علاج لیور کا ٹرانسپلانٹ ہے جو سب سے اچھا اور سستا انڈیا میں ممکن ہے تو پھر وقت ضائع کرنے سے فائدہ۔“

”پندرہ لاکھ کا انتظام کیسے ہوگا؟ کسی رفاحی ادارے سے مدد لوگی یا اخبار میں اپیل شائع کراؤ گی؟“

”نہیں، مجھے معلوم ہے اس سے کچھ نہیں ہوگا۔ ایسے کیس تو بہت ہیں۔ کوئی میڈیا پر آجائے تو لگتا ہے بندوبست ہوگیا مگر میں نے سنا ہے وہ سارے مدد کرنے والوں کے فون بوگس ہوتے ہیں۔ شو کو کامیاب بنانے کے لیے وہیں اندر سے کیے جاتے ہیں۔ یہ بھی ہوتا ہے کہ کوئی فون کر دیتا ہے جذباتی ہوکے اور پھر بیک آؤٹ کر جاتا ہے۔ میں کوئی رسک نہیں لے سکتی۔“

”پھر پندرہ لاکھ کہاں سے لاؤ گی میرے پاس...“

”مجھے کسی سے کچھ نہیں لینا۔“ اس نے حامد کی بات کاٹ دی۔ ”تم سے بھی نہیں... میں بینک سے لون لوں گی۔“

”بینک لون... سیکیورٹی کیا ہے تمہارے پاس؟ بینک زیورات پر نوے فیصد دے دیتے ہیں۔ پراپرٹی پر زیادہ سے زیادہ مالیت کا تین چوتھائی۔“

وہ سوچ میں پڑ گئی۔ ”یعنی مکان پر بارہ لاکھ تو ملیں گے... مجھے قیمت کا صحیح اندازہ نہیں۔ ہوسکتا ہے پندرہ لاکھ نہ ہو اٹھارہ بیس لاکھ ہو۔“

”کون سا مکان؟“

”وہی جس میں ہم رہتے ہیں، وہاں یہی قیمت ہے۔“

حامد اسے پلک جھپکائے بغیر دیکھتا رہا۔ ”مائی ڈیئر شیما... کس کے نام پر ہے وہ مکان؟“

”ابا کے نام پر... ان کو میں راضی کرلوں گی۔“

حامد نے نفی میں سر ہلایا۔ ”دیکھو، اس میں کوئی شک نہیں کہ مکان تمہارے ابا نے لیا تھا۔“

”انہوں نے زمین لے کر بنوایا تھا۔“

حامد نے سر ہلایا۔ ”میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ وہ زمین کے ڈی اے کی ضرور تھی مگر لیز تمہارے ابا کے نام پر نہیں ہے۔ وہ غیر قانونی قبضہ تھا۔“

”یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟ وہ پوری کچی آبادی رجسٹرڈ ہے۔ آخر بجلی، گیس سب ملی ہوئی ہے۔ بل بھی آتے ہیں ابا کے نام پر ہی۔“

”وہ سب ٹھیک ہے لیکن بینک والے لیز مانگتے ہیں۔ کچھ آبادیوں کو ریگولر کر دیا گیا ہے یعنی جو رہتے ہیں ان کا حقِ ملکیت تسلیم کرلیا گیا ہے اب کوئی ان کو ہٹائے گا

نہیں۔ مگر نہ لیز ہے کسی کے نام پر نہ میوٹیشن... اس کے بغیر بینک لون نہیں دیتے کسی کو۔ ویسے ان کی خرید وفروخت چلتی رہتی ہے۔ رجسٹری بھی ہوجاتی ہے۔''

شیما کا چہرہ اتر گیا۔ ''میں بیچ تو سکتی ہوں؟''

''ہاں، اگر فوراً کوئی نقد قیمت ادا کردے... گاہک مل جائے۔''

''مجھے بھی اتنی جلدی نہیں، پاسپورٹ بنوانے اور ویزا حاصل کرنے میں وقت لگے گا۔ تب تک یہاں علاج چلتا رہے گا۔ ڈاکٹر نے کہا ہے کہ وہ ابا کی پوری میڈیکل ہسٹری نیٹ پر انڈیا بھیج دے گا۔ ان کا جواب آنے پر ویزا ملنے میں دیر نہیں لگے گی۔ ایک طریقہ اور بھی ہے۔ میں اسے گروی رکھ سکتی ہوں۔''

''کس کے پاس، ان سودخوروں کے پاس... وہ تمہیں دس لاکھ دیں گے، زیادہ سے زیادہ۔''

''مجھے کچھ تو کرنا ہی ہوگا حامد۔ میں خاموشی سے ہاتھ پر ہاتھ رکھے ان کو مرتا ہوا نہیں دیکھ سکتی۔ میرے پاس لے دے کے یہی ایک مکان ہے اور کچھ بھی نہیں، میری ماں کا تھوڑا سا زیور ہے۔'' وہ منہ چھپا کے رونے لگی۔

''پلیز، پلیز شیما رونے سے کچھ نہیں ہوگا۔'' اس نے شیما کا سر اپنے کندھے پر رکھ کے اس کے آنسو پونچھے۔

وہ کچھ دیر سسکیاں لیتی رہی پھر پُرسکون ہوگئی۔

''حامد، میں یہ سب اکیلی نہیں کرسکوں گی اور تمہارے سوا کون ہے میری مدد کرنے والا۔ تم چپ کیوں ہو، بولتے کیوں نہیں۔ بتاتے کیوں نہیں کہ میں کیا کروں؟''

''جانِ من، کیا تمہیں مجھ سے مدد مانگنے کی ضرورت ہے۔ میں کچھ اور نہیں سوچ رہا تھا۔ زیادہ فکر مجھے ان اخراجات کی ہے جو پورے کرنے کے لیے تم اپنا گھر بیچ رہی ہو۔ لیکن مجھے یہ بھی فکر ہے کہ مہینے دو مہینے یا چھ ماہ بعد جب تمہارے والد کا علاج ہوجائے گا اور وہ صحت یاب ہوجائیں گے تو واپس آکے تم سب کہاں رہو گے؟ وہ دوبارہ کام کرنے کے قابل ہوں گے تو کیا کریں گے، ظاہر ہے تم ان کو پھر یہی کام تو کرنے نہیں دوگی۔''

''کام میں کروں گی۔'' شیما نے پُرعزم لہجے میں کہا۔

''تم؟ کیا کام آتا ہے تمہیں؟''

''میں بی اے کا امتحان تو دے چکی۔ ایم اے پرائیویٹ کرلوں گی اور کچھ نہیں، میں ٹیچر تو بن ہی سکتی ہوں۔''

حامد نے کچھ دیر بعد کہا۔ ''دیکھو، تمہیں اپنا بنانے کے فیصلے کے بعد تم میری ذمّے داری ہو۔ میری آمدنی میں گزارا ہوسکتا ہے۔ ابھی تک میرا کوئی گھر نہیں ہے۔ احمد صاحب کے سرونٹ کوارٹر میں رہتا ہوں۔ لیکن تمہیں وہاں نہیں رکھ سکتا۔ مگر ہم کرائے کا کوئی مکان لے سکتے ہیں اور مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا اگر تم بھی کسی اسکول میں پڑھاؤ مگر صرف بی اے ہو، بی ایڈ بھی نہیں ہو... تمہیں یہ تعلیم کو پیشہ بنانے والے مشکل سے تین ہزار دیں گے۔ اب تم اپنے سارے فکروغم مجھے دے دو، میں سب سنبھال لوں گا۔''

وہ روتے ہوئے اس سے لپٹ گئی۔ ''سچ حامد، تم میرا ساتھ دو گے؟''

حامد نے اسے چوما۔ ''ہم نے زندگی بھر ساتھ دینے کی بات کی تھی۔ سمجھو وہ دن آگیا۔ آج مجھے اپنے ساتھ اسپتال لے چلو۔ میں تمہارے والدین کے سامنے خود کو پیش کرتا ہوں۔ اس درخواست کے ساتھ کہ کسی اہتمام کے بغیر مجھے اپنا بنالیں۔ اب یہ تو تقدیر کے فیصلے ہیں۔ دھوم دھام نہیں تو نہ سہی... نکاح اسپتال میں بھی ہوسکتا ہے، تمہیں منظور ہے؟''

اس نے روتے کانپتے کہا۔ ''مجھے کیوں منظور نہیں ہوگا حامد، ایک تم ہی تو ہو میرے۔''

''اچھا، اب ہم پہلے کہیں بیٹھ کے کھانا کھاتے ہیں۔ تم ایزی ہوجاؤ۔ اتفاق سے آج وکیلوں کی ہڑتال تھی تو میں فارغ ہوں۔'' اس نے اپنی گاڑی آگے بڑھادی۔

کمال دین کو تین دن بعد آئی سی یو سے وارڈ میں منتقل کردیا گیا۔ یہ بھی پرائیویٹ اسپتال تھا جس کے اخراجات بڑے نام والے اسپتالوں کے مقابلے میں کم تھے۔ قدرتی طور پر یہاں زیادہ مریض آتے تھے اور انہیں کم توجہ ملتی تھی۔ صفائی اور دیکھ بھال کا معیار بھی مثالی نہیں تھا.... کئی دوائیں تو بہرحال مریض اس کی پوری قیمت ادا کرتے تھے مگر بعض اوقات وہ غیر معیاری اور غیر معروف کمپنی کی بنی ہوتی تھیں۔ عام لوگ اس فرق کو کیسے جان سکتے تھے۔ یہ اس ملک کی بدقسمتی تھی کہ وہ تمام ذمّے داریاں جو کسی بھی حکومت کی کارکردگی کا پیمانہ ہوتی ہیں اب پرائیویٹ اداروں نے پیسا کمانے کے لیے سنبھال لی تھیں۔

حامد نے ڈاکٹر سے ملنے سے پہلے احمد صاحب کا وسیلہ استعمال کیا تو کمال دین کا علاج کرنے والے ڈاکٹر نے اسے اپنے کمرے میں پندرہ منٹ دیے۔ اس وقت شیما اس

کے ساتھ نہیں تھی۔ ڈاکٹر نے وہی بتایا کہ سب سے کم خرچ انڈیا میں ہوگا جہاں آنے جانے کے اخراجات بھی کم ہیں اور اسپتالوں کے بھی۔

’’رپورٹ میں نے آن لائن ارسال کر دی ہے۔ وہاں کے ڈاکٹر باری آنے پر دیکھیں گے اور پھر کوئی تاریخ بتا دیں گے۔ اس دوران میں آپ دوسرے انتظامات کر لیں۔ ویزا مل جائے گا۔‘‘

’’باقی ہم کر لیں گے۔ بس مجھے آپ لگی لپٹی رکھے بغیر بتا دیں کہ سرجری کے بعد مریض کے مکمل صحت یاب ہونے اور نارمل زندگی گزارنے کے چانس کتنے ہیں؟‘‘

ڈاکٹر نے نفی میں سر ہلایا۔ ’’مسٹر حامد! آپ پڑھے لکھے آدمی ہیں۔ اس میں کوئی ایک فیکٹر نہیں ہے۔ کمال دین کی عمر زیادہ ہے۔ جوان آدمی کے چانس زیادہ ہوتے ہیں۔ پھر بیماری محض غفلت کی وجہ سے پرانی ہو گئی ہے۔ ابتدائی مرحلے میں چانس زیادہ ہوتا ہے کہ شفایابی مکمل ہو اور سب سے اہم بات یہ کہ قدرت کا بنایا ہوا جسم ایک ایسی مشین ہے جس کا کوئی پرزہ بگڑ جائے تو اس کی جگہ دوسرا لگانے سے بات نہیں بنتی۔ کام چل جاتا ہے وقتی طور پر... مگر مشین کی کارکردگی میں فرق آ جاتا ہے۔‘‘

’’وہ میں سمجھتا ہوں۔ آپ اپنا اندازہ بتائیں۔‘‘

’’ففٹی ففٹی... اور اس کے بعد جسمانی کارکردگی بھی ففٹی پرسنٹ... لائف بھی... فیصلہ آپ کا ہے۔ یہاں ایسے لوگ ہیں جو وینٹی لیٹر افورڈ کر سکتے ہیں جانتے ہیں کہ سانس مریض نہیں لے رہا۔ مشین لے رہی ہے۔ پہلے وہ کہتے ہیں کہ چلو جیسا بھی... مریض زندہ ہے اور ہمارے سامنے ہے۔ مگر ایک مہینا کسی نے نہیں گزارا۔ ایک ہفتے بعد ہی وہ خود کہہ دیتے ہیں کہ مریض کا اور ہمارا عذاب ختم کرو۔ اتنا پیسہ خرچ کرنے سے کس کو کتنا فائدہ ہوگا۔ یہ حساب آپ خود کر لیں۔‘‘

معاملہ حساب کا نہیں، جذبات کا تھا۔ وہ شیما کو نہیں بتا سکتا تھا کہ کمال دین کا آپریشن کامیاب رہا اور وہ مرض سے شفایاب ہو کے لوٹ آیا تب بھی نارمل زندگی نہیں جیئے گا۔ وہ اپنا کام نہیں کر پائے گا جبکہ علاج کے اخراجات بہت ہوں گے۔ شیما ایک فیصلہ کر چکی تھی اور حامد ساتھ دے نہ دے اس کو یہ کام کرنا تھا۔ اس معاملے میں نفع نقصان غیر اہم تھا۔

اگلے دن اس نے احمد صاحب کو وقت نکالنے کے لیے راضی کر لیا۔ ان کے ساتھ وہ ملاقات کے اوقات میں اسپتال جا پہنچا۔ وارڈ میں رش تھا لیکن کمال دین کا بیڈ ایک قطار کا آخری تھا۔ شیما نے کسی کے ہاتھ پر پیسے رکھ کے ایک بینچ حاصل کر لی تھی جو دیوار کے ساتھ تھی اور جب ڈاکٹر چکر لگاتا تھا بیڈ کے نیچے کر دی جاتی تھی۔ رات کو یہاں کسی کو ٹھہرنے کی اجازت نہ تھی مگر کمال دین کی بیوی نے دن میں موجود رہنے کا اجازت نامہ بھی لے لیا تھا۔ دن میں دو چار بار نرس کے خبردار کرنے پر اسے باہر جانا پڑتا تھا۔

احمد صاحب کے ساتھ حامد کو دیکھ کے شیما کھڑی ہو گئی۔ ’’ابا، یہ احمد صاحب ہیں۔ بہت بڑے وکیل ہیں۔‘‘

کمال دین نے لیٹے لیٹے ان سے ہاتھ ملایا۔ ’’احمد صاحب کو کون نہیں جانتا۔‘‘

اب احمد صاحب نے اپنے ماتحت کا تعارف کرایا۔ ’’بھئی یہ ہے میرا جانشین... حامد ایڈووکیٹ۔‘‘

کمال دین سمجھ گیا مگر اس کی بیوی چونکی پھر اس کی نظر اپنے ہونے والے داماد پر جم کے رہ گئی۔

کمال دین نے اخلاقاً کہا۔ ’’احمد صاحب ادھر آ جائیں آپ۔‘‘

احمد صاحب نے خواتین کو بینچ پر بیٹھے رہنے کا اشارہ کیا۔ ’’ہم ٹھیک ہیں یہاں... مجھے حامد نے سب بتایا کہ تم انڈیا جا رہے ہو۔‘‘

’’میں تو نہیں جانا چاہتا مگر یہ ہیرو شیما... میری بیٹی شائلہ ضد پر اڑی ہوئی ہے، کہتی ہے بندوبست ہو گیا ہے۔‘‘

احمد صاحب نے سر ہلایا۔ ’’شی از رائٹ، تمہیں بیٹی کی بات ماننی چاہیے۔ انشاء اللہ تم بالکل ٹھیک ہو کے واپس آؤ گے۔ میرے پاس وقت کم ہے کمال دین، آفس میں کلائنٹس اسی وقت آتے ہیں لیکن تم سے ایک بات کرنی تھی۔‘‘

’’آپ حکم کریں سر۔‘‘ کمال دین کا دل دھڑکا۔ شیما کا رنگ سرخ ہونے لگا۔

’’بھئی یہ میرا نائب حامد، میرے بیٹے جیسا ہے۔ میرے ساتھ ہی رہتا بھی ہے۔ اس کے اپنے ماں باپ تو ہیں نہیں، ماشاء اللہ محنتی اور ذہین ہے۔ اس وقت بھی اچھا کما رہا ہے۔ آگے مزید ترقی کرے گا۔ اس کی شرافت کی کیا بات کروں، بھروسے کے قابل نہ ہوتا تو میں اپنے ساتھ گھر میں رکھتا۔ میں اس کے لیے تمہاری بیٹی ہیرو شیما کا رشتہ مانگنے آیا ہوں۔ سوری یہ جگہ بالکل مناسب نہیں ایسی بات کے لیے مگر اس معاملے میں تاخیر نہیں کی جا سکتی۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ تمہارے ساتھ جائے تمہارا بیٹا بن کے۔ کسی مرد کا

ساتھ ہونا ضروری ہے۔ لیکن وہ اجنبی نہیں ہوسکتا۔ میں چاہتا ہوں کہ تمہیں منظور ہو تو نکاح یہاں کردیا جائے تاکہ یہ نامحرم نہ رہے۔ باقی رخصتی وغیرہ تمہارے واپس آنے کے بعد۔۔۔''

خاموشی کا ایک طویل وقفہ آیا جس میں سب ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ کمال دین بھی سمجھتا تھا کہ ''میں جانتا ہوں'' کے الفاظ درحقیقت احمد صاحب کے نہیں۔۔۔ شیما کے بھی ہیں اور حامد کے بھی۔۔۔ اچانک وہ خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا۔ اسے اپنی بیماری کی کوئی فکر ہی نہیں رہی۔ حامد میں ایک مثالی داماد والی ہر خوبی تھی۔ وہ پڑھا لکھا برسر روزگار، خوبرو اور نیک تھا۔ احمد صاحب ایسے آدمی نہیں تھے کہ یہاں اس کے سامنے جھوٹ بولنے آتے۔ انہوں نے بڑے سلیقے سے کمال کی ذمّے واری خود نبھادی۔

کمال دین رضامندی کا اظہار کرنے اور بیٹھ کے حامد کو گلے لگانے کے سوا کیا کرسکتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں جو آنسو تھے، وہ خوشی کے بھی تھے اور شکرگزاری کے بھی کہ خدا نے اس کا مسئلہ حل کردیا۔ اب وہ مرنے کے لیے بھی راضی تھا۔ شیما اور حامد نے بس آنکھوں ہی آنکھوں میں پیغام دیے۔ حامد نے شیما کا حیا آمیز مسرت سے تمتماتا چہرہ دیکھا اور سر کی خفیف سی جنبش کے ساتھ مسکراتا احمد صاحب کے ساتھ ہی چلا گیا۔ باقی وقت شیما اپنے ابا کی دونوں آنکھوں سے بہنے والے آنسو پونچھتی رہی جو اپنے دکھ سے زیادہ خوشی کے تھے۔ دکھ تھا تو محض اس بات کا کہ زندگی نے اسے یہ خوشی بھی اس اہتمام کے ساتھ نہ منانے دی جس کی وہ آرزو رکھتا تھا لیکن اچانک وہ محسوس کرنے لگا کہ اس کے سینے پر رکھی ہوئی فکرمندی کی چٹان ہٹ گئی ہے اور بعد میں بیٹی کی خاطر مسکراتے ہوئے اس نے کہا۔ ''ہیرو شیما، میری ایک بات مانے گی؟''

''کیا ابا؟ ماننے والی ہوگی تو کیوں نہیں مانوں گی۔''

''مجھے گھر لے چل۔ میں اب ٹھیک ہوں اور یہ آپریشن وغیرہ کے چکر میں گھر کا سودا نہ کر۔ میں وعدہ کرتا ہوں تیری قسم کھا کے۔۔۔ میں سگریٹ چھوڑ دوں گا۔ ہومیوپیتھی میں بڑا کامیاب علاج ہے۔ آزمانے میں کیا حرج ہے۔''

''ابا آپ جانتے ہیں کہ آپ جتنی قسمیں چاہیں کھائیں۔ نہ میں کوئی بات سنوں گی نہ اپنا فیصلہ بدلوں گی۔''

وہ مایوسی سے بولا۔ ''ارے پاگل، میری اتنی سی خواہش پوری نہیں کرسکتی۔ نکاح کے بعد میں تجھے دلہن بنا کے رخصت کردوں۔'' وہ پھر رونے لگا۔

شیما نے دل پر پتھر رکھ کے وہاں سے چلے جانا بہتر سمجھا۔ رات کو وہاں صرف اس کی ماں رہتی تھی اور اسے یہ پریشانی الگ لاحق رہتی تھی کہ جوان لڑکی گھر پر اکیلی ہوتی ہے حالانکہ شیما اسے یقین دلاتی رہتی تھی کہ وہ رات کو سب دروازوں کی کنڈیاں تالے لگا کے سوتی ہے اور حامد کے کہنے پر اس نے ایک گھنٹی پڑوسیوں کے گھر میں رکھوادی تھی جو وائرلیس تھی۔ اس کا بٹن شیما اپنے تکیے کے نیچے موبائل فون کے ساتھ رکھ کے سوتی تھی۔ پڑوسی شریف لوگ تھے۔ اگر خطرے کے وقت کیا غلطی سے بھی شیما سے بٹن دب جاتا تو دونوں جوان بھائی دیوار پھاند کے ایک منٹ میں آجاتے اور شاید ان کی بیویاں بھی۔۔۔ لیکن بے اطمینانی کا علاج الفاظ سے ممکن ہوتا تو کمال دین کم سے کم بیٹی کے سامنے آنسو روک لیتا۔

محبت کی وارفتگی کے باوجود ابھی تک شیما اور حامد کے درمیان وہ حدِ فاصل قائم تھی جو عشق کو ہوس سے جدا کرتی تھی۔ وہ دن میں ملتے تھے۔ رات کا کھانا اکثر باہر کھالیتے تھے لیکن نہ وہ کبھی اس کے ساتھ احمد صاحب کے گھر کے عقب میں دو کمروں کا سرونٹ کوارٹر دیکھنے گئی تھی جس کو وہ شروع شروع میں اور عام لوگوں کے سامنے کوٹھی کی انیکسی کہتا تھا اور نہ کبھی اس نے شیما کو گلی کے موڑ پر ڈراپ کرنے کے بعد اس کے گھر کی دہلیز کو عبور کرنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔

اس رات وہ سونے لیٹی تو نیند اس کی آنکھوں سے دور تھی۔ ایسا اب اکثر ہونے لگا تھا۔ حامد سے ملنے کے بعد اس کے خواب بدل گئے تھے۔ اس کے خیالوں کی دنیا میں جذبات کے وہ رنگ بھر گئے تھے جن سے وہ ناآشنا تھی۔ وہ راتوں کو اس کے بارے میں سوچتی تھی۔ اس کی قربت کو محسوس کرتی تھی اور اس کا جسم اپنی ہی خواہش کی آگ میں جلتا تھا۔ اسے وہ خواب آتے تھے جو اسے زیادہ مضطرب کرتے تھے۔ ایسے میں باپ کے بغیر رہ جانے کا خیال اسے دہشت زدہ کرنے آجاتا تھا اور وہ سوچتی تھی کہ سہارے نہ ہوں تو عورت کی زندگی تو مالِ غنیمت جیسی ہوجاتی ہے۔ یہ سہارے پہلے باپ فراہم کرتے ہیں پھر بھائی، پھر شوہر اور آخر میں بیٹے۔۔۔ ایسے میں حامد فرشتہ غیب کی طرح نمودار ہوا اور اس نے شیما کا ہاتھ تھام لیا۔ ڈرتی کیوں ہو، میں ہوں نا۔

فون کی گھنٹی نے اس کی نیند میں ایک دم خوف بھر

دیا۔ یا اللہ خیر، اس کا ذہن فوراً اسپتال کی طرف گیا جہاں اس کی ماں اپنے زندگی اور موت کے درمیان بے یقینی کے عذاب سے گزرنے والے شوہر کے ساتھ تنہا تھی۔ مگر روشن اسکرین پر سرخ رنگ کا دل نظر آرہا تھا۔ اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ پوچھا۔ ”حامد! تم جاگ رہے ہو؟“

”کیا تم سو رہی ہو؟ یہ کیسے ہوسکتا ہے؟“

”میں بھی بہت دیر تک جاگتی رہی... ایک خواب دیکھتی رہی، کیا تم بھی وہی خواب دیکھ رہے تھے؟“

”ہاں، اور وہ خواب مجھے تمہارے دروازے تک لے آیا ہے۔“

”کیا مطلب... کہاں ہو تم؟“ کھڑکی پر بجلی کی چمک لہرائی۔

”میں باہر کھڑا ہوں۔“ اس نے جواب دیا۔ باہر زور سے بادل گرجا۔

وہ گھبرا کے اٹھ بیٹھی۔ کیا مطلب؟“

”مطلب کیا... دروازہ کھولو، بارش شروع ہو گئی ہے۔“

”نہیں... نہیں حامد... تم واپس جاؤ۔ میں دروازہ نہیں کھولوں گی۔“

”میں دیوار پھاند کے اندر آگیا ہوں۔ کھولو دروازہ...“ اس نے کمرے کے دروازے پر دستک دی۔

اور اس رات شیما ایمرجنسی میں استعمال ہونے والے پش بٹن کو نہیں دبا سکی۔

☆☆☆

ڈاکٹر نے کہا۔ ”لڑکی، کیا انتظام کیا ہے تم نے؟ تمہارے کیس کی کنفرمیشن آگئی ہے انڈیا سے۔“ اور ایک بڑے سائز کا سفید لفافہ اس کی طرف بڑھا دیا۔

لفافے پر ایک میڈیکل انسٹی ٹیوٹ کا نام تھا۔ اس نے صرف ایک لیٹر پڑھا جس میں لکھا تھا کہ اگلے ماہ کی کوئی تاریخ سرجری کے لیے دی جاسکتی ہے۔ باقی سب اس کی سمجھ میں نہ آنے والا ریکارڈ تھا۔ سی ٹی اسکین، الٹرا ساؤنڈ اور ان پر ریمارکس... یہ بھی کہا گیا تھا کہ مریض اپنی آمد کی اطلاع کم سے کم پندرہ دن قبل دے اور ایک ہفتہ قبل داخل ہوجائے۔

”میں نے... رقم کا انتظام کر لیا ہے۔ تمام اخراجات کے لیے۔“ شیما نے کہا۔

”اور پاسپورٹ، ویزا... اس میں وقت لگ سکتا ہے۔ حالانکہ تمہارا کیس ارجنٹ ویزے کی منظوری کے لیے انڈین ہائی کمیشن کو بھیج دیا گیا ہے۔“

”پاسپورٹ کل ہی ملے ہیں۔ میں ویزا درخواست کے ساتھ کل ہی جمع کرا دیتی ہوں۔“

ڈاکٹر نے نفی میں سر ہلایا۔ ”خود جاؤ اسلام آباد۔ ہائی کمیشن میں کسی سے ملو۔ سفیر نہ سہی... فرسٹ سیکریٹری، پروٹوکول افسر اور ڈرنا نہیں۔ نہ ویزا کی بھیک مانگنی ہے۔ کوئی سیدھے منہ بات نہ کرے تو کہنا کہ میں پاکستان کے سفیر عبدالباسط سے بات کرتی ہوں، وہ متعلقہ حکام کے سامنے معاملہ اٹھائیں گے۔“ ڈاکٹر کو تنہا ساری ذمے داری کا بوجھ اٹھانے والی اس معصوم صورت لڑکی سے ہمدردی ہو گئی تھی۔

”جی سر۔“ وہ ڈاکٹر کے دیے ہوئے کاغذات کا پلندا سنبھالے باہر آگئی۔ اسلام آباد جانے کا مرحلہ تھا، وہ نہ ماں سے بات کرسکتی تھی نہ باپ سے۔ تو اکیلی کیسے جائے گی؟ ان کا پہلا سوال ہوتا۔ اس کے لیے بے شرم بن کے یہ کہنا ناممکن تھا کہ میں حامد کے ساتھ جاؤں گی۔ احمد صاحب کی اسلام آباد سپریم کورٹ میں پیشی کے باعث اسپتال میں سادگی سے ہونے والی نکاح کی تقریب تو ابھی تک نہیں ہوئی تھی لیکن حامد نے بطور شوہر اس کا چارج لے لیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ دو چار دن سے کیا فرق پڑتا ہے اور اب وہ بحث کرنے کی پوزیشن میں نہیں رہی تھی کہ فرق کو واضح کرسکے۔ اس نے اپنی غلطی اور کمزوری یا نوشتۂ تقدیر کو قبول کر لیا تھا۔

وہ ڈھائی بجے آیا جب وہ کھڑے کھڑے تھک گئی تھی۔ دھوپ کی تپش سے بچنے کے لیے وہ ایک دکان کے سائبان کے نیچے چلی گئی تھی۔ دکاندار شریف آدمی تھا۔ شیما نے کہا کہ میرے شوہر کو لینے آنا تھا۔ پتا نہیں اتنی دیر کیوں کر دی تو دکاندار نے کہا تھا کہ اندر آکے کرسی پر بیٹھ جاؤ۔ ایک لمحے اس کا جی چاہا کہ اردگرد کے لوگوں کی کئی سوالیہ اور مشتبہ نظروں سے بچنے کے لیے وہ دکان میں چلی جائے مگر اسے اندیشہ تھا کہ حامد فٹ پاتھ پر شیما کو غیر موجود پا کے سیدھا نہ نکل جائے۔

وہ بیٹھتے ہی حامد پر برس پڑی۔ ”اتنی دیر کر دی، سب مجھے ایسے گھورنے لگے تھے جیسے میں کسی شکار کے انتظار میں کھڑی ہوں۔“

وہ ہنسا۔ ”شکار آگیا نا بالآخر... جانم، کورٹس کے معاملات میں دیر سویر ہو جاتی ہے۔ اب میں جج سے کیسے کہتا کہ میری مکھن ملائی جیسی بیوی کا رنگ دھوپ میں سنولا رہا ہوگا۔“

''یہ رپورٹ آگئی ہے انڈیا سے اور جانے کا کچھ انتظام نہیں ہوا ہے۔''

''ابھی بیٹھ کے بات کرتے ہیں۔ میرا بھوک سے دماغ کام نہیں کررہا۔'' اس نے ایک چائنیز ریسٹورنٹ کے سامنے گاڑی روک دی۔

اس وقت وہاں پر سناٹا تھا۔ نیم تاریک ماحول میں ان کے علاوہ ایک اور جوڑا دوسرے کونے میں سر جوڑے بیٹھا تھا۔ ویٹر یا کسی اور کی طرف دیکھے بغیر وہ ایک دوسرے کو بھی کھلا رہے تھے۔ کیا یہ بھی میاں بیوی نہیں ہوں گے؟ شیما نے سوچا۔

''اب بتاؤ، مکان کی بات کی؟'' شیما نے کرسی پر بیٹھتے ہی کہا۔

ویٹر نے منرل واٹر کی ٹھنڈی بوتل کے ساتھ مینو کارڈ درمیان میں رکھ دیا۔ حامد نے سکون سے ایک گلاس پانی پیا اور پھر بولا۔ ''دس لاکھ سے زیادہ نہیں ملیں گے۔''

''مجھے دس لاکھ فوراً چاہئیں اب... اور کل تمہیں میرے ساتھ اسلام آباد جانا ہے، ویزا لینے کے لیے۔''

حامد اسے دیکھتا رہا۔ ''چار فیصد ماہانہ سود ہوگا۔''

''چار فیصد... یعنی اڑتالیس فیصد سالانہ... دس کے پندرہ واپس کرنے پڑیں گے، ایک سال میں۔''

''زیادہ، یہ سود در سود ہے، ہر ماہ چالیس ہزار نہ دیے تو وہ اصل میں شامل ہو جائیں گے۔ کیسے دوگی تم؟''

''حامد دفع کرو مکان کو... واپس آکے کرائے کا مکان لے لیں گے۔'' دس ہزار میں تین بیڈ کا فلیٹ مل جائے گا۔''

حامد نے اقرار میں سر ہلایا۔ ''میں اور تم احمد صاحب کی انیکسی میں رہ سکتے تھے خیر...'' اس نے ویٹر کو آرڈر لکھوایا۔

''اب یہ تو مجبوری ہے، میں ماں باپ کو اکیلا کیسے چھوڑ دوں؟''

''نہیں، وہ میری بھی ذمے داری ہیں اور آمدنی اتنی کم بھی نہیں میری... احمد صاحب نے اضافے کا وعدہ کیا ہے۔ کہہ رہے تھے کہ ذمے داریاں بڑھ جائیں گی تمہاری... یہ رپورٹ میں نے کل ہی دیکھ لی تھی۔ تمہیں ڈاکٹر نے کیا بتایا آج؟''

''کوئی نئی بات نہیں۔ وہی جو پہلے کہا لیکن یہ کہا کہ دیر مت کرو، کیوں؟''

ویٹر نے ان کے درمیان سوپ رکھ دیا۔ ''کچھ نہیں، میرے ساتھ بھی ایک ڈاکٹر تھا۔ میرا سابق کلاس فیلو... اس نے زیادہ تفصیل سے ڈسکس کیا۔''

''اسے کوئی نئی بات معلوم ہوئی؟''

''نئی تو نہیں... لیکن یہ معلوم ہو گیا کہ یہ ڈاکٹر تمہیں ضرورت سے زیادہ امید دلا رہا ہے۔''

وہ چونکی۔ ''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ شفایابی کے امکانات بہت کم ہیں۔ وہ تمہیں کہہ رہا ہے کہ تمہارے والد مکمل طور پر صحت یاب ہو کے لوٹیں گے۔ ایسا نہیں ہے۔'' حامد بولا۔ ''سوپ پیتی رہو۔''

''اور تمہارے اس دوست سے اس نے کچھ اور کہا؟''

حامد نے اقرار میں سر ہلایا، وہاں ان کی بحث کے بعد یہ بات سامنے آئی کہ وقتی طور پر افاقہ ہوگا اور تمہارے والد بظاہر نارمل ہو جائیں گے تین ماہ میں... لیکن ایک تو یہ تین مہینے انتہائی احتیاط کے ہیں اور نہ صرف یہ کہ دوائیں جاری رہیں گی بلکہ ان کو یہاں کے کسی ماہر ڈاکٹر سے ہفتہ وار چیک اپ کراتا ہوگا۔ وہ صرف آغا خان اسپتال میں ممکن ہے۔ اندازہ ہے کہ اس پر ماہانہ خرچ ہزاروں میں ہوگا۔''

شیما نے کھانا چھوڑ دیا۔ ''یہ سب ڈاکٹر نے مجھے کیوں نہیں بتایا؟''

''ڈاکٹر کسی کو مایوس نہیں کرتے، خصوصاً قریبی رشتہ رکھنے والوں کو پُرامید رکھنا بہتر سمجھتے ہیں۔''

وہ چلائی۔ ''آخر کیا کہنا چاہتے ہو تم؟''

اس نے گھبرا کے اِدھر اُدھر دیکھا۔ ''فار ہیون سیک... ہم ریسٹورنٹ میں ہیں۔''

''مجھے صاف بتاؤ، اور کیا کہا ڈاکٹر نے؟'' اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

''صاف بات یہ ہے شیما کہ تمہارے والد کے اس طویل اور مہنگے علاج کے بعد ان کے مکمل شفایاب ہونے اور ایک نارمل زندگی گزارنے کے چانس بہت کم ہیں۔ خرچ تو تمہارا ہو رہا ہے ڈاکٹر کو کیا؟''

''ہاں ڈاکٹر کو کیا، ظاہر ہے والد بھی وہ میرے ہیں۔ تمہاری باتوں سے لگتا ہے کہ تم بھی اس علاج کے حق میں نہیں، لیکن حامد! میں کسی کی مدد یا سہارے کی محتاج نہیں ہوں۔ امکانات ایک فیصد ہوں گے تب بھی میں کوشش ترک نہیں کروں گی۔'' وہ رونے لگی۔

''چلو ہم باہر چل کے بات کرتے ہیں۔ تم یہاں تماشا

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN

بنا رہی ہو۔''

''نہیں، اب ہمارے سوا یہاں کوئی نہیں۔ تم بات کرو۔'' شیما نے اپنے آنسو پونچھ لیے۔

''اوکے، جو بات ایک غیر جذباتی حقیقت ہے، اس پر یہ جذباتی ردِعمل خود اپنے پیروں پر کلہاڑی مارنے کے مترادف ہے، تم کسی مداخلت اور ہسٹریا کے بغیر میری بات سن سکتی ہو تو میں آگے بولوں۔''

''بولو، مجھے اندازہ تو ہو گیا ہے کہ تم کیا کہو گے۔'' وہ ضبط کرتے ہوئے بولی۔

''شیما، زندگی کے حقائق کسی جذباتی مظاہرے سے بدلتے نہیں۔ پہلے میں اپنے باپ کی بات کرتا ہوں۔ ایک باپ... یا شوہر کی حیثیت سے وہ کتنے بھی اچھے ہوں، کاروباری طور پر وہ اتنے کم عقل تھے کہ انہوں نے محض اپنے جذباتی ردِعمل پر اپنی جان گنوائی۔''

وہ اسے حیرت سے دیکھتی رہی۔ ''تم اپنے باپ کو بےوقوف کہہ رہے ہو؟''

''ہاں، جذبات کی رو میں بہہ کر اپنے فائدے کے ساتھ جان گنوانے والا ہر شخص بےوقوف ہی تو ہے، ان کی جگہ میں ہوتا تو اس انتہائی منافع بخش آرڈر سے انکار نہ کرتا صرف اس لیے کہ جو کام پہلے لیا ہے، وہ پہلے کرنا ہے... ایک لاکھ کے منافع پر وعدہ نبھانے کے لیے دس لاکھ چھوڑے، وہ ایک لاکھ والے کو صاف بتا دیتا کہ کام کسی اور سے کرا لے... اس سے کیا ہوتا؟ وہ واویلا کرتا، لیکن رو پیٹ کے چلا جاتا۔ اس نے ڈی آئی جی پولیس کو انکار کیا اور اپنی جان گنوائی، اس کا کام کر دیتا تو منافع کے ساتھ آئندہ کے راستے کھل جاتے۔ اسے مزید ایسے ہی ٹھیکے ملتے۔ وہ اپنا کارخانہ بنا لیتا۔ اس کی حمایت میں ہنگامہ کرنے والوں کو کیا ملا؟ بعد میں ایک ایک کر کے پولیس نے سب کے دماغ درست کر دیے ہوں گے۔''

''او مائی گاڈ، آج بیٹا اپنے باپ کو بےوقوف ثابت کر رہا ہے۔ دعائے مغفرت کے بجائے۔''

''دیکھو، جذبات اور حقائق متضاد باتیں ہیں۔ یہ حرام حلال، جائز ناجائز... ان کا پیسے سے کیا تعلق۔ بلیک اور وائٹ منی میں کون فرق بتا سکتا ہے۔ نوٹ سب ایک جیسے ہوتے ہیں۔ کیا میں عدالت میں جا کے سچ بول سکتا ہوں۔ میں ہی کیا احمد صاحب بھی... کہ جناب حقیقت تو یہی ہے کہ ملزم نے قتل کیا ہے مگر اس نے مجھے دس لاکھ دیے ہیں اور پانچ لاکھ پولیس کو کھلائے ہیں تو ہم ثابت کریں گے کہ وہ مجرم نہیں ہے۔ وکالت کا پیشہ چلتا ہی جھوٹ پر ہے۔ گواہ کیوں منحرف ہوتے ہیں؟ فیملی کمک مکا کیوں کرتی ہے۔ ظاہر ہے دھمکی سے... یہ جج بھی جانتا ہے۔''

وہ دم بخود اس کی باتیں سنتی رہی۔ ''خدا کے لیے، باپ کو احمق ثابت کر چکے، اب کیا ماں کی باری ہے؟''

''اگر میرا باپ اس روز ڈی آئی جی کو انکار نہ کرتا، تو کیا میری ماں خوار ہوتی؟ اس خودغرض آدمی نے کسی کا خیال نہیں کیا سوائے اپنے اصولوں کی پاسداری کے... میں آج احمد صاحب کے سرونٹ کوارٹر میں نہ ہوتا۔ ہماری ایک کنال کی کوٹھی ہوتی گلبرگ میں... مگر اس نے موقع سے فائدہ نہیں اٹھایا۔ تم ماں کا کہتی ہو تو مجھے کہنے میں شرم آئے نہ آئے... حقیقت تو اپنی جگہ رہتی ہے۔ دوسروں کو چھوڑو... آخر وہ سمجھتی کیا تھی خود کو... گارمنٹس فیکٹریوں میں ہی کیا دنیا میں جو کچھ لاوارث رہ جانے والی عورتوں کے ساتھ ہوتا ہے، اس کو وہ ختم کر سکتی تھی؟''

شیما نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ ''پھر وہ کیا کرتی؟ بھوکے بھیڑیوں کو اجازت دیتی...''

''ڈائیلاگ مت مارو، چلو پیچھے والوں پر لعنت بھیجو... منیجر کی دوسری بیوی بننے میں اس کا کیا نقصان تھا؟ نقصان میں ہمیشہ پہلی بیوی رہتی ہے۔ نئی بیوی تو غلام بنا کے رکھتی ہے شوہر کو... اگر وہ بےوقوف نہ ہو۔ میں نے بتایا نا کہ وہ بہت خوب صورت تھی۔ اس نے کیا فائدہ اٹھایا قدرت کے اس تحفے سے... خوب صورتی کیا ہر ایک کو ملتی ہے؟ اگر وہ عقل سے کام لیتی تو مالک پر ڈورے ڈالتی۔ نکالا جاتا منیجر... وہ فیکٹری کی مالک بن سکتی تھی۔ وہ بھی اخلاق اور شرافت کے چکر میں پڑی رہی، جذباتی بےوقوفی۔''

شیما ایک دم اٹھی اور باہر نکل گئی۔ حامد میز پر ہزار کا نوٹ چھوڑ کے اس کے پیچھے لپکا۔ گاڑی تک پہنچنے سے پہلے اس نے شیما کو جا لیا۔ ''یہی خطرہ تھا مجھے... تم ہسٹریا کا شکار ہو رہی ہو بلاوجہ... ورنہ تم سے میں نے کچھ نہیں کہا۔ بیٹھو ورنہ میں کسی کی پروا کیے بغیر پکڑ کے بٹھا دوں گا۔''

شیما احتجاجی انداز میں بیٹھ گئی۔ ''مجھے گھر چھوڑ دو اور پلیز جتنا تم کر سکتے تھے کر دیا۔ باقی میں خود کر لوں گی، تمہاری مدد کے بغیر...''

دس منٹ کی خاموش ڈرائیونگ کے بعد اس نے کہا۔ ''احمد صاحب آ گئے ہیں ہم کل نکاح کر سکتے ہیں۔''

وہ چپ رہی۔ اس کے جذبات کا دھارا دوسری سمت میں بہنے لگا تھا۔ نکاح اب اس کی ضرورت نہیں، مجبوری بن

گیا تھا۔ خود اپنی کمزوری کے گناہ کی پردہ پوشی اور دل کے اطمینان کے لیے یہ ضروری تھا کہ وہ حامد کی بیوی بن جائے۔ اس سے پہلے کہ وہ حامد کے کسی بچے کی ماں بنے۔ حامد نے بڑی ہوشیاری سے ترپ کا پتا چلا تھا اور بازی پلٹ دی تھی۔ چنانچہ جب اس نے کلفٹن کا رخ کیا تو نہ چاہنے کے باوجود وہ انکار نہ کر سکی۔ اس نے خدا کا شکر ادا کیا کہ حامد ابھی تک نکاح کے وعدے پر قائم ہے ورنہ شیما کی جذباتی کمزوری پر الزام دھر کے وہ رسی تڑا سکتا تھا کہ ایسی کمزور کردار کی لڑکی پر میں کیسے بھروسا کر سکتا ہوں کہ وہ میری وفادار رہے گی۔

کلفٹن پہنچتے پہنچتے شیما نے خود سے مفاہمت کر لی تھی۔ اگر آج وہ اپنے ماں باپ کو بے وقوفی کے جذباتی فیصلوں کا ذمے دار قرار دے رہا تھا تو یہ غیر اخلاقی بات تھی مگر وہ ایسا سمجھتا تھا تو اس نے شیما کے سامنے حد درجہ صاف گوئی سے کام لیا تھا منافقت نہیں کی تھی۔ وہ حامد کی اس بات سے کیسے اختلاف کر سکتی تھی کہ وکیل فیس لے کر قاتل کو بے گناہ ثابت کرتے ہیں اور پھانسی کا پھندا محض جرمِ غریبی کے باعث کسی بے گناہ کے گلے میں پڑ جاتا ہے۔ یہ تو فطرت کا اصول ہے۔ SURVIVAL OF THE FITTEST... ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگ مناجات... اس کا دماغ کنفیوژن کا شکار تھا۔ ماحول، معاشرے، کتابوں اور والدین کی تربیت اس کے برعکس تھی۔

وہ ایک شیشے کی دیوار والے کافی ہاؤس سے خاموش سمندر کو متحرک دیکھتی رہی۔ اس کا سارا شور شیشے سے گزر کے اندر کے پُرسکون ائرکنڈیشنڈ ماحول پر اثر انداز نہیں ہو سکتا تھا۔

''آئی ایم سوری... بات کہاں سے کہاں چلی گئی۔''
اس نے بالآخر خاموشی کو توڑا اور اپنا ہاتھ شیما کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

''تم میرے ساتھ اسلام آباد چل رہے ہو یا نہیں؟''
شیما نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔

''اگر کل پرسوں نکاح ہو جائے تو آگے دو چھٹیاں ہیں ہفتہ اتوار... ہم پیر کو جا سکتے ہیں۔''

''چار دن بعد... لیکن اس دوران میں رقم مل جائے...''

''رقم مل سکتی ہے ابھی... ایک گھنٹے میں۔'' وہ بولا۔

''مگر بینک تو بند ہو چکے۔''

وہ ہنسا۔ ''بے وقوف لڑکی، جو اس طرح گروی رکھ کے مکان کی قیمت دیتے ہیں۔ ان کے تہ خانوں اور تجوریوں میں پیسا یوں بھرا رہتا ہے جیسے آڑھتی کے گودام میں چاول... وہ چوبیس گھنٹے بینکنگ جاری رکھتے ہیں... ہنڈی کا سارا کاروبار وقت دیکھے بغیر ہوتا ہے۔ یہاں دن ہے تو امریکا میں رات... تم چلو اور دس لاکھ لے لو ابھی۔''

''یعنی اگر ہم صبح جائیں... تو ادائیگی ہو جائے گی۔ ابھی تو بینک بند ہیں۔ وہ مجھ سے کیا لیں گے؟''

''اس گھر کی خرید و فروخت کی دستاویزات... رسیدیں اور اسٹامپ پیپر... جن سے صرف یہ ثابت ہوگا کہ تم ہی اس جگہ کی مالک ہو۔ عدالت میں ان کی قانونی حیثیت کچھ نہیں۔ اور لیگل پیپر پر تم سائن کر کے دو گی کہ تم نے یہ جگہ گروی رکھی ہے۔ رقم کا ذکر ہوگا اور ماہانہ شرح منافع کا... سود کا لفظ حرام ہے۔ قرض کی رقم کے علاوہ واپسی کی مدت ہوگی اور یہ کہ مقررہ مدت میں تم اصل رقم اور منافع ادا نہ کرنے کی صورت اس جگہ کی مالک نہیں رہو گی۔''

شیما کا چہرہ اتر گیا۔ ہاں، یہ تو ہوگا لیکن کیا وہ مجھے قانونی وارث مان لیں گے؟''

''شیما ڈارلنگ، قانون کی بات مت کرو۔ یہ سب غیر قانونی بدمعاشی کے زور پر چلنے والا دھندا ہے۔ پیسا دینے والے وصولی کے لیے کسی عدالت میں نہیں جاتے۔ وہ خود چار چھ مسلح افراد کے ساتھ آتے ہیں، مقروض اور اس کی فیملی سمیت اسے اٹھا کے باہر پھینک دیتے کہ جاؤ قانون کا دروازہ کھٹکھٹاؤ اور گھر پر قابض ہو جائیں گے۔''

شیما نے موضوع بدل دینا بہتر سمجھا۔ ''چلو یہ سب بعد کی بات ہے۔ پہلا کام ویزا لینا ہے اسلام آباد سے، تم میرے ساتھ چلو گے نا؟''

''کیوں نہیں۔'' اس نے خوش دلی سے کہا۔

وہ پوچھنا چاہتی تھی کہ کیا درمیان کے دو دنوں میں جب عدالتوں میں بھی تعطیل ہوگی، وہ نکاح ہو سکتا ہے جس کا وعدہ احمد صاحب نے کیا تھا۔ ایک فطری جھجک کے ساتھ اب اسے خود سے شرم آتی تھی کہ شبِ عروسی کے بعد نکاح پر اصرار کس درجہ مضحکہ خیزی کی بات ہے اور کتنی بے معنی... اگر وہ پلٹ کے کہہ دے کہ یار کیا جلدی ہے اب... دو بول کبھی بھی پڑھوا لیں گے کسی سے بھی... ابھی ضد اور اصرار کا وقت بھی نہیں آیا تھا۔ بس اپنی تمام خودداری اور قوتِ ارادی کے قتل کے جرم میں اپنی شراکت کا رسوا کن احساس ایسا تھا کہ وہ خود سے بھی نظر نہیں ملا سکتی تھی۔

رات کو اس نے پھر موبائل فون کی ٹیون سنی اور اس

نے سوچا کہ وہ نظر انداز کر دے۔ کون ہوگا اس وقت حامد کے سوا اور کیا کہے گا وہ اس کے سوا کہ دروازہ کھول دو، میں باہر کھڑا ہوں اور وہ کسی مسمرائز کیے ہوئے غلام کی طرح تعمیل کرے گی۔ لیکن ایک خیال یہ بھی تھا کہ فون کہیں اسپتال سے اس کی ماں نے نہ کیا ہو۔ اس نے روشن اسکرین پر جو نمبر دیکھا، وہ بالکل اجنبی تھا۔ شاید رانگ نمبر تھا۔

پھر بھی اس نے پوچھ لیا۔ ''ہیلو۔''

دوسری طرف سے ایک بھاری بھرکم سنجیدہ آواز میں سوال کیا گیا۔ ''کون بول رہا ہے؟ شائلہ...''

''جی... جی... آپ کون ہیں؟''

''جمال دین... جانتی ہو نا مجھے...''

اس کے دماغ کو جھٹکا سا لگا۔ ''تایا جی... السلام علیکم...'' وہ محتاط ہو کے بولی۔

''ہاں، مجھے کمال کی بیماری کا پتا چلا، بہت دیر سے۔''

''آپ کو کس نے بتایا؟''

''تم نے نہیں بتایا۔'' وہ خفگی سے بولا۔ ''خود کمالے نے فون کیا مجھے... آج کچھ دیر پہلے... وہ رو رہا تھا۔ کہنے لگا بھائی جی کہا سنا معاف کر دیں... پتا نہیں پھر موقع ملے نہ ملے۔ شکایت بھی کر رہا تھا کہ آپ بھول گئے مجھے... میں نے کہا بھول گئے تھے... مر تو نہیں گئے تھے۔ تو نے خبر لی کبھی... میری بات مانی کبھی... کتنا کہا تھا کہ سعودی عرب آجا۔ آج میرے ساتھ ہوتا... خیر پھر میں نے اس سے سب پوچھا۔ وہ بولا کہ مجھے صرف یہ پتا ہے کہ جگر کا مسئلہ ہے اور آپریشن کے لیے شیما انڈیا لے جائے گی اور کچھ نہیں معلوم... سب چھپاتے ہیں مجھ سے... ڈاکٹر بھی اور شیما بھی... میں نے پوچھا کہ تیری بیوی کو تو پتا ہوگا۔ تو وہ بولا کہ جب مجھے کوئی کچھ نہیں بتاتا تو وہ اللہ میاں کی گائے... پھر میں نے اس سے تمہارا نمبر لیا... وہ کہہ رہا تھا کہ بی اے کر لیا ہے تم نے...''

''بس ہو جائے گا اسی مہینے... رزلٹ آنے والا ہے۔''

''اچھا مجھے بتاؤ، یہ کیا مسئلہ ہے جو پاکستان کے ڈاکٹر اور بڑے بڑے اسپتالوں کے بس کا نہیں۔''

''لیور ٹرانسپلانٹ ہوگا تایا جی، یہاں نہیں ہو سکتا۔''

''مگر اس کے لیے انڈیا کیوں؟''

''وہ سستا ہے تایا جی... دس لاکھ میں سب ہو جائے گا۔ اس سے زیادہ نہیں تھے ہمارے پاس ورنہ برطانیہ اور امریکا جاتے۔''

''اب میں کیا کہوں تجھے... سامنے ہوتا تو تھپڑ لگاتا۔ میں تو کمالے سے بھی کچھ نہیں کہہ سکا لیکن اب میری بات سن... جو میں کہوں گا تو وہی کرے گی۔ ورنہ امریکا کوئی آسمان پر نہیں ہے۔ میں پہنچ جاؤں گا خود... تو سن رہی ہے نا؟''

''جی تایا جی۔''

''انڈیا پر بھیج لعنت، لندن آجا... پاسپورٹ ہیں سب کے؟''

''جی... خیال تھا کہ پیر کو اسلام آباد جا کے انڈین ایمبیسی میں ویزے کے لیے جمع کرا دوں۔''

''کوئی ضرورت نہیں، میں نے اسپتال والوں سے بات کی تھی۔ میں نے کیا احسن نے کی تھی۔''

''کون احسن؟'' شیما کے منہ سے نکل گیا مگر اس کے ساتھ ہی یاد آ گیا کہ وہ تایا جی کا بڑا بیٹا تھا۔

''احسن؟ احسن نہیں یاد تجھے... ارے وہ تیرا کزن ہے... میرا بڑا بیٹا... وہ لندن میں ہے۔''

''احسن لندن میں ہے؟ آپ کے ساتھ نہیں ہے؟''

''میرے ساتھ محسن ہے۔ چھوٹا والا۔ اس کا اچھا بزنس چل رہا ہے۔ احسن ڈاکٹر ہے۔ لندن سے ایف آر سی ایس کر کے اب وہیں کے ایک اسپتال میں ہے دو سال سے... احسن نے اسپتال کے ڈاکٹرز سے سب پوچھا۔ کیس ہسٹری دیکھی کمپیوٹر پر اور مجھے بتایا۔''

''پھر مجھ سے کیوں پوچھ رہے تھے آپ؟''

''دیکھنا چاہتا تھا کہ تو کتنا جھوٹ بول سکتی ہے۔ اب جو میں کہہ رہا ہوں غور سے سن۔ کمالے کا علاج لندن میں ہوگا۔ تو انڈین ایمبیسی نہیں برٹش ایمبیسی جا کے ویزے کے لیے پاسپورٹ جمع کرا... بلکہ کراچی میں تو ان کا کونسلیٹ ہے۔''

''جی تایا جی ہے مگر...''

''اگر مگر کچھ نہیں۔ میں سب کے اوپن ٹکٹ بھیج رہا ہوں۔ باقی سب احسن کر لے گا۔ یہ اس کا شعبہ نہیں مگر وہ بہت اچھے اسپتال میں ہے۔ اس نے کہا ہے کہ انڈیا سے بہتر علاج ہو جائے گا۔''

''ابا جی ٹھیک ہو جائیں گے نا؟''

''دیکھ پتر! ڈاکٹر کوشش کرتے ہیں زندگی موت سب اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اس سے دعا کرنی چاہیے اور شفا کی امید کے ساتھ کوشش پوری کرنی چاہیے۔ میری بات سمجھ آ گئی

ہے نا، یا میں خود آؤں؟“

”میں ابا جی سے بات کرلوں...“

”کیا بات کرلوں؟ مردہ بدست زندہ... سب کچھ تو کررہی ہے اپنی مرضی سے... وہ تو انڈیا بھی نہیں جانا چاہتا۔ وہ بالکل انکار نہیں کرے گا۔ کرے تو مجھے بتانا... کمالے نے کہا کہ تو نے گھر بیچا ہے علاج کے لیے؟“

”ابھی بیچا تو نہیں تایا... مگر بیچنا پڑے گا۔ علاج کے لیے پیسا تو چاہیے۔ انڈیا میں ہو یا لندن میں۔“

”جب ایک بار سمجھا دیا کہ سب ہو جائے گا تو اخراجات کی ذمّے داری سب میری... اور اس معاملے میں تیرا بولنے کا حق نہیں بنتا۔ میں جو کروں گا اپنے چھوٹے بھائی کے لیے کروں گا۔ تیری اجازت سے نہیں کروں گا اپنی مرضی سے کروں گا۔ ٹھیک ہے اب تک دوری تھی مگر کیا اس سے رشتہ ختم ہوتا ہے۔ میں بڑا ہوں تیرے باپ سے... تجھے بھی میرا حکم ماننا پڑے گا بلا چون و چرا... آئی بات سمجھ میں۔“

وہ دو گھنٹے بات کرتا رہا۔ درمیان میں اس کا فون کارڈ کئی بار ختم ہوا۔ لائن کٹ جاتی تھی اور تھوڑی دیر بعد پھر کال آجاتی تھی۔ جمال دین نے بتا دیا تھا کہ ایسا ہوگا۔ وہ کمال دین کے مرض کی ساری تفصیل پوچھتا رہا۔ اس کے کہنے کے مطابق اسپتال میں بھرجائی سے یہ سب باتیں نہیں ہو سکتی تھیں۔ اس نے شیما کے بھائیوں کا پوچھا۔ شیما نے ان کی فیملی کا حال دریافت کیا۔ تایا نے بہت سی دعائیں دے کر فون بند کیا تو وال کلاک میں رات کے دو بج رہے تھے۔ ٹیکساس میں پچھلے دن کی شام کے چار بجے تھے۔ لندن میں رات کے نو... سب زمین کی گردش ہے جو وقت بن جاتی ہے۔ گردشِ رنگِ چمن ہے ماہ و سال عندلیب... جو کچھ شیما کے کانوں نے سنا تھا خواب کی گفتگو جیسا لگتا تھا۔ اچانک وہ خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگی۔ جیسے اس کے سر پر ایک پہاڑ جتنی چٹان تھی۔ وہ اٹھا کے کسی نے اس کی جگہ گلاب کا پھول رکھ دیا ہو۔ ایک سوال وال کلاک کی ٹک ٹک کے ساتھ اس کے ذہن میں گونج رہا تھا۔ کیا سچ یہ سب ہو گیا ہے؟ جو میں نے سنا سچ تھا۔ حقیقت تھی، خواب نہیں تھا۔

دونوں بھائیوں کے درمیان آخری ملاقات دس سال پہلے ہوئی تھی جب بڑے بھائی نے چھوٹے بھائی کو فیملی کے ساتھ حج کے لیے بلایا تھا۔ ان کے درمیان رابطہ جمال دین کے امریکا جانے کے بعد تک رہا تھا۔ اب چھ سات سال سے کسی کو دوسرے کی خبر نہ تھی لیکن یہ بہت زیادہ پرانی بات نہ تھی۔ شیما آج بھی اپنے تایا کی بیوی اور دونوں بچوں کے چہرے تصور میں دیکھ سکتی تھی اور اسے یقین تھا کہ ان سے سامنا ہوگا تو کسی کو بھی شناخت میں دشواری نہیں ہوگی۔ جو فرق کمال دین اور جمال دین میں تھا وہی شیما کے دونوں تایازاد بھائیوں میں بھی تھا۔ بڑا زیادہ شرارتی لڑاکا اور ضدی تھا۔ اس کے مقابلے میں محسن للو تھا۔ وہ احسن کے ساتھ مل کے آئے دن اسے اپنی شرارتوں سے تنگ کرتے تھے۔ تایا کے ساتھ والے گھر میں شیدا قصاب رہتا تھا۔ دونوں گھروں کو جدا کرنے والی دیوار پہلے آٹھ فٹ اونچی تھی۔ اس دیوار کے دوسری طرف آم کا درخت تھا۔ جب اس پر آم پک جاتے تھے تو شیدا ہر آم پر نظر رکھتا تھا۔ احسن اور شیما مل کے محسن کو اوپر اٹھاتے تھے اور وہ دیوار پر چڑھ کے وہ سارے آم توڑ لیتا تھا جو اس کی دسترس میں ہوں۔ شیدے نے دیوار کو دو فٹ اونچا کرایا تو احسن نے ایک سیڑھی ایجاد کی۔ اس نے دو بانس حاصل کیے۔ پھر لکڑی کے دو فٹ لمبے ٹکڑے لایا اور ان کو بانسوں کے ساتھ باندھ دیا۔ رات کو انہوں نے یہ سیڑھی استعمال کی اور محسن کو آٹھ فٹ اونچی دیوار پر چڑھا دیا۔ آم توڑ کے وہ نیچے اتر آیا تو سیڑھی کے بانس اور انہیں ملانے والے ڈنڈے کھول کے اِدھر اُدھر ڈال دیے گئے۔ یہ سیڑھی ہر رات جوڑی جاتی۔ احسن اس کام میں ماہر ہو گیا تھا۔ اس نے بانسوں پر کیل ٹھوک کے رسی سے بندھے ڈنڈوں کو سلپ ہونے کا خطرہ بھی دور کر دیا تھا۔

شیدے کی نظر نے چار دن میں تاڑ لیا کہ آم رات کو غائب ہو رہے ہیں اور ایک رات محسن کو اس وقت پکڑ لیا جب وہ آم کی شاخوں پر کھڑا اوپر والے آم توڑ رہا تھا۔ اس نے نیچے سے ٹارچ لائٹ ڈالی اور محسن کو پکڑ لیا۔ احسن اور شیما اپنی سیڑھی اٹھا کے بھاگ لیے۔ دو منٹ میں احسن نے دونوں بانس الگ کیے۔ ایک کو صحن کے ایک حصے میں ڈالا اور دوسرے کو بیس فٹ دور گھر کی دیوار کے سائے میں۔ ان کے دو فٹ لمبے ٹکڑے صحن میں اِدھر اُدھر بکھیر کے وہ دونوں غائب ہو گئے اور اندر جا کے لیٹ گئے۔ محسن نے پہلے شیدے سے مار کھائی۔ پھر اپنے ابا سے... وہ چادر میں منہ چھپائے کھی کھی کرتے رہے۔

تو احسن اب سرجن ہو گیا ہے۔ ایف آر سی ایس کر کے اسپیشلسٹ بن گیا ہے اور لندن میں ہے۔ اس نے نہ جانے کس سے یہ سنا تھا کہ ان کی بڑا ہونے کے بعد شادی کر دی جائے گی تو شیما نے بہت شور کیا تھا کہ میں اس کلو سے

شادی نہیں کر سکتی۔ وہ سب کو مارتا ہے۔ مجھے بھی مارے گا اور یہ ارادہ بھی ظاہر کر دیا تھا کہ اسے تو شاہ رخ خان پسند ہے۔ بات ہنسی مذاق میں ٹل گئی تھی۔ بلاشبہ احسن کا رنگ گہرا سانولا اپنے باپ جیسا تھا اور نازک بدن محسن اپنی ماں پر گیا تھا۔

ناشتا بنا کے اس نے ٹی وی کھولا تو اسے بی اے کے نتائج کے اعلان کی خبر ملی۔ وہ ناشتا چھوڑ کے اخبار کی تلاش میں نکلی اور جب تک اسے اپنا رول نمبر نظر نہیں آ گیا، اس کے حواس گم رہے۔ اس نے تھرڈ کلاس کی فہرست سے شروع کیا تھا۔ سیکنڈ کلاس میں بھی رول نمبر نہ ملا تو اس کا دل بیٹھ گیا۔ اسے اپنے فیل ہو جانے میں کوئی شک نہ رہا۔ فرسٹ کلاس میں نام ہونے کا سوال ہی نہیں تھا مگر کسی خاص کوشش کے بغیر اسے مختصر فہرست میں اپنا رول نمبر نظر آیا تو وہ جیسے بھک سے راکٹ کی طرح اڑ گئی۔ بے یقینی دور کرنے کے لیے اس نے آنکھیں مل مل کے ایک ایک عدد کو کئی کئی بار چیک کیا اور جب بالآخر اسے یقین آ گیا کہ اس نے فرسٹ کلاس لی ہے تو وہ اسپتال بھاگی۔

کمال دین بیٹی کا سر سینے پر رکھ کے روتا رہا۔ شیما کی خاموش طبع صابر و شاکر ماں بار بار ''لکھ شکر ہے تیرا مرے ربا'' کی گردان کرتی رہی اور دوپٹے کے کونے سے آنکھوں کے کونے صاف کرتی رہی جہاں سے آنسو خود بخود خاموشی سے پھوٹ رہے تھے۔ وہ اپنے ساتھ مٹھائی لے گئی تھی۔ کمال دین نے تمام احتیاط کو بالائے طاق رکھتے ہوئے دل کھول کے مٹھائی کھائی اور ساتھ ہی اس کو دعائیں دیتا رہا۔

کچھ پرسکون ہو جانے کے بعد بالآخر شیما کے ہونٹوں پر سوال آ گیا۔ ''آپ کی تایا جی سے بات ہوئی تھی؟''

کمال نے اعتراف میں سر ہلایا۔ ''بڑا بھائی ہے وہ میرا۔''

''کل رات انہوں نے مجھے فون کیا تھا۔'' شیما نے کہا اور پھر ان سے ہونے والی ساری گفتگو سنا دی۔

خوشی سے کمال دین کا چہرہ تمتما رہا۔ وہ ''اچھا؟ یہ کہا انہوں نے... پھر'' کے الفاظ بار بار دہراتا رہا۔

''وہ میری ایک سننے پر راضی نہیں ہے۔''

''انہوں نے بتایا کہ احسن بہت بڑا ڈاکٹر بن گیا ہے۔'' کمال دین اپنے خیالات میں نہ جانے کہاں تھا اور کیا دیکھ رہا تھا۔ اس کا خون برسوں بعد جوش مار رہا تھا۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ ابھی اُڑ کے بھائی کے پاس پہنچ جائے۔

''اب ہم انڈیا نہیں، لندن جائیں گے۔ مجھے اسلام آباد جا کے ویزا لینے کی ضرورت نہیں۔ یہاں برٹش قونصلیٹ میں ہی کام ہو جائے گا۔ ڈاکٹر احسن کو سب معلوم ہے پوری کیس ہسٹری کا پتا ہے۔ وہ یہاں کے ڈاکٹروں سے بات بھی کر چکے ہیں۔''

''تو نے تایا جی سے احسن کا فون نمبر نہیں لیا؟''

''وہ تو مل ہی جائے گا۔ یہاں کے ڈاکٹر کو بھی پتا ہو گا۔'' شیما کا دل امید سے روشن ہو رہا تھا۔

''تو نے دیکھا ہیرو شیما، نبھانے والے خون کے رشتوں کی آبرو کیسے نبھاتے ہیں۔ بات تو ساری دل کی ہوتی ہے۔ بڑے بھائی بھی ایسے ہوتے ہیں کہ باپ کی جگہ... اور نہ ہوں تو سگی اولاد نہ پہچانے... ان سے غیر اچھے... پتا نہیں ایک جیسے نظر آنے والے انسانوں کے دلوں میں اتنا فرق کیسے آ جاتا ہے۔ گوروں کے دیس میں جا کے بسنے سے تیرے تایا کا خون تو سفید نہیں ہوا۔''

وہ بھائی کے لیے سخت جذباتی ہو رہا تھا اور شیما کا ذہن حامد کی طرف چلا گیا تھا۔ واقعی ساری بات تو دل کی ہوتی ہے۔ کیسی بے حسی کے ساتھ وہ اپنے اصول پرست باپ کو بے وقوف ثابت کر رہا تھا اور اپنی عزت دار ماں کی جدوجہد کو اس کی کم عقلی ثابت کر رہا تھا۔ وہ اس باپ کے لیے مغفرت کی دعا کیسے کرے گا جس کی نادانی نے وہ موقع گنوا دیا جب خوش نصیبی نے اس کے دروازے پر دستک دی تھی مگر وہ اصول کی بات کرتا رہا کہ جس کا آرڈر پہلے لیا تھا، اس کا کام پہلے کرے گا اور ملا کیا اس سے ذلت کی پرتشدد موت کے سوا۔ اس نے وہ موقع گنوا دیا جب وہ ڈی آئی جی کی مدد سے فرنیچر سپلائی کے ٹھیکے لے سکتا تھا۔ اسے تو غرور ہونا چاہیے تھا اس ماں پر جو اپنی عزت کو جو اس کے شوہر کی امانت تھی کسی کے ہاتھوں بیچنے پر راضی نہ ہوئی۔ حامد کو افسوس تھا کہ اس نے اپنے حسن و شباب سے فائدہ نہیں اٹھایا ورنہ آج وہ گارمنٹس فیکٹری کا مالک ہوتا۔

اسے حامد کی ذہنیت پر افسوس ہونے لگا۔ یہ احساسِ محرومی نہیں تھا۔ یہ ضمیر فروشی جیسی بے غیرتی تھی اگر اس کی ماں نے خود کو بیچ دیا ہوتا تو اسے وہ عقل مندی کہتا۔ وہ ایک ہائی کلاس طوائف بن کے کوٹھی کا کیش سب حاصل کر لیتی تو بیٹا اسے ماں کی ذہانت سمجھتا۔ کیسی عجیب سوچ تھی اس کی جس کا اخلاقیات سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ وہ صرف معاشیات کی زبان سمجھتا تھا۔

اس کی ماں نے شیما کا بازو ہلایا۔ ''ابا نے پوچھا ہے کچھ... تو کہاں کس خیال میں گم ہے؟''

اس کا باپ ہنسا۔ ''بھئی اتنی بڑی کامیابی کے بعد دماغ تو آسمان پر ہی پرواز کرے گا مگر بیٹا میں نے پوچھا تھا کہ وہ نہیں آیا۔ اسے معلوم ہے کہ تو نے کیا تیر مارا ہے؟ اسے تو پہلے بتایا ہوگا تو نے؟'' وہ ہنسا۔

شیما کا رنگ بدلا۔ ''نہیں ابا، میں اخبار دیکھ کے سیدھی یہاں آگئی تھی۔ حامد کو نہیں معلوم ابھی... وہ دو بجے تک فارغ ہوتا ہے نا۔''

وہ احمد صاحب کے آفس میں پہنچ کے حامد کے لیے مخصوص کیبن میں بیٹھ گئی۔ اس کو حامد سے بہت کچھ کہنا تھا۔ رات بھر میں دنیا بدل گئی تھی۔ احمد صاحب کا دوسرا معاون جو کرمنل کیس دیکھتا تھا اور ساتھ والے دوسرے کیبن میں بیٹھتا تھا، حامد سے پہلے آگیا۔ اس نے مسکرا کے سر کے اشارے سے شیما کو سلام کیا۔ ''آپ تو بہت خوش نظر آرہی ہیں آج...'' اس نے اخلاقاً رک کر کہا۔

''جی... وہ دراصل میرا رزلٹ آیا ہے۔ بی اے میں فرسٹ کلاس لی ہے میں نے۔''

''اچھا اچھا، بہت مبارک ہو۔ حامد آنے ہی والا ہوگا۔''

''یہ احمد صاحب کب آرہے ہیں اسلام آباد سے؟''

وہ جاتے جاتے رک گیا۔ ''احمد صاحب تو یہیں ہیں... آج ذرا دیر سے آئیں گے۔''

شیما کو ایک شاک سا لگا۔ حامد نے جھوٹ کیوں بولا تھا کہ حامد صاحب سپریم کورٹ میں کسی کیس کی پیروی کرنے اسلام آباد گئے ہوئے ہیں۔ وہ آجائیں تو نکاح بھی ہو جائے گا۔ شیما کا دل ڈوبنے لگا۔ کیا وہ نکاح کو ٹال رہا تھا؟ اسے معلوم تھا کہ سوموار کو شیما ویزے کے لیے اسلام آباد جائے گی۔ درمیان میں دو دن تھے۔ کورٹس بند تھیں، نکاح کے دو بول پڑھوانے کے لیے یہ فرصت کافی تھی۔ وہ شیما کے ساتھ جاتا تو لازمی وہ کسی ہوٹل میں قیام کرتے۔ ویزا کا ملنا ہمیشہ غیر یقینی ہوتا ہے۔ دو دن میں مل جائے یا دو ہفتے لگ جائیں۔ اس کے ساتھ ایک کمرا شیئر کیے بنا چارہ نہ ہوتا۔ خود کو مسٹر اور مسز لکھوائے بنا ہوٹل میں ان کی پوزیشن مشکوک ہوتی اور حامد کو تو جیسے اب فائدہ اٹھانے کا اوپن لائسنس مل گیا تھا۔

شیما کا چہرہ گرم ہونے لگا۔ انڈیا کے ویزے والی بات تو اب ختم ہوئی۔ اسے یہیں برٹش کونسلیٹ سے ویزا مل سکتا ہے مگر کسی بڑی خرابی سے پہلے اسے حامد کو روک دینا چاہیے۔ پہلے بھی وہ ایسی بے دست و پا نہ تھی مگر اب تو اسے حامد کی مدد کی ضرورت بھی نہیں رہی۔

''ارے، تم کب سے آئی بیٹھی ہو؟'' حامد اچانک نمودار ہوا اور اس کے مقابل اپنی کرسی پر جا بیٹھا۔

''بہت دیر سے، میں کچھ بتانے آئی تھی۔ میں نے بی اے کرلیا ہے اور میری فرسٹ کلاس آئی ہے۔''

حامد نے اسے غور سے دیکھا۔ ''اچھا بھئی مبارک، ایک اچھی خبر میرے پاس بھی ہے تمہارے لیے... ایک شریف آدمی تمہاری پریشانی سن کے بارہ لاکھ دے رہا ہے نقد... وہ چار بجے آئے گا، چلو۔'' وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ''اچھا ہے آج کوئی ارجنٹ معاملہ نہیں ہے میرے پاس۔''

''یہ تو خیر اچھا ہوا لیکن اب ہم کہاں جائیں گے؟''

''تمہارے گھر... وہ وہیں ادائیگی کرے گا۔ کاغذات لے گا اور گواہوں کے دستخط لے گا، تمہارے علاوہ۔''

وہ حامد کے ساتھ بیٹھ گئی۔ ''گواہ کہاں سے آئیں گے، کون ہوں گے؟''

''گھر پہنچ کے سب بتادوں گا۔''

''لیکن مجھے تم کو کچھ اور بتانا ہے گھر پہنچنے سے پہلے... کل رات امریکا سے میرے تایا نے فون کیا تھا۔'' وہ بولی اور اس نے گھر پہنچنے تک حامد کو سب بتا دیا۔ وہ سنجیدگی سے سنتا رہا۔

''یعنی تم انڈیا نہیں، لندن جاؤ گی۔''

''بس، وہ تین ٹکٹ بھیج رہے ہیں اور لندن کے علاج کا سارا خرچ بھی اٹھائیں گے۔ ان کا بیٹا لندن ہی میں سرجن ہے۔''

''چلو، تمہارا مسئلہ تو حل ہو گیا مگر یہ تایا جی کو اتنے عرصے بعد کیا دورہ پڑ گیا بھائی کی محبت کا؟''

''تم اسے دورہ کہتے ہو؟ یہ محبت ہے بھائی کی۔ خون کا اثر ہے۔''

''خون؟ مائی فٹ... تم دیکھ لینا اس کے پیچھے بھی ان کی کوئی غرض ہوگی۔''

''فضول بات مت کرو۔ میرا خیال ہے کہ یہ بارہ لاکھ بھی خرچ نہیں ہوں گے۔ مجھے اور امی کو اپنے رہنے کا کوئی انتظام تو کرنا ہی ہوگا اور ضرورت کا پتا نہیں ہوتا۔ ہو سکتا ہے واپس آکے میں قرضہ اتار دوں اور مکان واپس لے لوں۔''

وہ گلی کے آغاز میں سڑک پر گاڑی سے اتری تو اسے اپنے دروازے پر دو افراد نظر آئے۔ ''لو، وہ تو ہم سے بھی

پہلے پہنچ گئے۔ مدعی سست گواہ چست۔''

وہ دونوں پٹھان یا افغانی لگتے تھے مگر بہت شرافت سے بات کر رہے تھے۔ ''مکان تو تمہارا دس سے اوپر کا نہیں ہے مگر اب ہم زبان دے دیا۔''

''خان صاحب۔'' شیما نے کہا۔ ''اب مجھے اتنی رقم کی ضرورت نہیں۔ کیا یہ ہوسکتا ہے کہ آپ مجھے تین لاکھ دے دیں اور دو مہینے بعد ساڑھے تین لے لیں۔''

انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھ کے نفی میں سر ہلایا۔ ''بی بی، تمہارا مرضی ہے۔ مکان تو ہم پورا لے گا۔ قرضہ ایک کمرے پر نہیں ہوگا۔''

''بارہ لے لو شیما۔ مکان تو پورا ہی گروی رکھا جائے گا۔'' حامد نے کہا۔ ''فائل لے آؤ، اپنے دو پڑوسیوں کو بلا لو۔ جو گواہ بن جائیں کہ مکان تمہارے والد کا ہے اور تم ان کی بیٹی ہو۔ تمہارے سوا کوئی وارث نہیں۔ رقم ابھی تم میرے اکاؤنٹ میں رکھوا سکتی ہو۔ تمہارا اپنا اکاؤنٹ تو ہے نہیں۔''

شیما تذبذب کا شکار ہوگئی۔ آمدورفت اور علاج کے اخراجات کا بندوبست ہوجانے کے بعد اس کے لیے پیسے کی ضرورت بہت کم ہوگئی تھی۔ اب اتفاقیہ اخراجات یا طعام و قیام کا خرچہ رہ گیا تھا۔ احسن بھی تو لندن میں ہی تھا۔ وہاں گھر چھوٹے ہوتے ہیں تو دل بھی چھوٹے ہوجاتے ہیں۔ پھر اس کی فیملی بھی ہوگی۔ بیوی بچے تو کسی شیما کو نہیں جانتے۔ وہ چاہے یا تایا جی کی ہدایت ہو تب بھی احسن کے گھر میں قیام مشکل ہوگا۔ اسے بارہ لاکھ ساتھ لے جانے کی ضرورت نہیں تھی لیکن لاکھ دو لاکھ تو پاس ہونے ضروری تھے۔ اور وہ تایا جی سے نہیں کہہ سکتی تھی کہ آپ نے اتنا کیا ہے تو باقی بھی کردیں۔

''کیا سوچ رہی ہو شیما؟'' حامد نے کہا۔

''ہاں، ہمارا ٹائم ضائع مت کرو۔'' قرض دینے والوں میں سے ایک نے کہا۔

شیما نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''آپ کو یہاں آنے کی تکلیف ہوئی۔ اس کے لیے معافی چاہتی ہوں۔ مگر اب مجھے قرض کی ضرورت نہیں رہی۔''

حامد نے ترشی سے کہا۔ ''یہ کیا بے وقوفی ہے؟''

''یہ میرا فیصلہ ہے۔'' شیما نے کہا۔

دونوں قرض دینے والے رقم ساتھ لائے تھے۔ وہ برا سا منہ بنا کے اٹھے اور باہر نکل گئے۔ سودا منسوخ ہوگیا تھا جس کا انہیں غصہ بھی تھا اور صدمہ بھی... لیکن شیما کو لگتا تھا کہ جس دستِ غیب نے باقی انتظام کیا تھا اسی نے آج شیما کو ایک غلط قدم اٹھانے سے روک دیا تھا۔

''میں نے بہت دوڑ دھوپ کے بعد اتنا اچھا سودا کرنے والوں کو تلاش کیا تھا۔'' حامد نے خفگی سے کہا۔

''اس کے لیے میں شکریہ ادا کرسکتی ہوں تمہارا... لیکن حالات بدل گئے ہیں جس خدا نے اتنا کردیا ہے، وہ باقی بھی کرہی دے گا۔ میرا خیال ہے لاکھ دو لاکھ ساتھ رکھ لینا کافی ہوگا۔''

''مانگ لو نا تایا جی سے۔'' وہ طنز سے بولا۔

''میں سوچ رہی تھی کہ تم سے مانگ لوں۔ اب یہ مت پوچھنا کہ کس رشتے سے؟''

وہ نظر چرا کے بولا۔ ''میرے پاس تو اب کچھ بھی نہیں، یہ گاڑی لے لی۔''

''میرے لیے گاڑی نہیں بیچ سکتے تم... پھر لے لینا۔''

حامد نے اسے عجیب سی نظر سے دیکھا۔ ''چیز بار بار نہیں بنتی خاتون... کیسے پیسا پیسا جوڑ کے یہ گاڑی لی ہے میں نے۔''

''اگر تم تین لاکھ کی گاڑی کے لیے ایسا سوچتے ہو تو میں بارہ لاکھ کے گھر کے لیے کیوں نہ سوچوں حامد۔ حامد صاحب تم پر اتنا ٹرسٹ کرتے ہیں، بیٹوں جیسا سمجھتے ہیں، کیا وہ تمہیں تھوڑی سی رقم ادھار نہیں دے سکتے؟''

''یہ تم کیسی باتیں کر رہی ہو؟ میں ان سے ادھار نہیں مانگ سکتا۔'' وہ برہمی سے بولا۔

''اچھا، وہ تمہارے لیے میرا رشتہ مانگنے آسکتے ہیں۔ تمہیں لاکھ دو لاکھ ادھار بھی نہیں دے سکتے۔ چلو تم مت کرو ان سے بات، میں خود ان سے کہوں گی۔ آج ہی بات کرتی ہوں اُن سے... اب تک تو وہ آفس پہنچ گئے ہوں گے۔ مجھے ان سے یہ بھی پوچھنا ہے کہ وہ ایک دو دن میں نکاح کا بندوبست کر رہے تھے۔ اس بات کو کتنے دن ہوگئے ہیں؟''

''میں نے بتایا تھا تمہیں کہ وہ اسلام آباد گئے ہوئے ہیں۔''

''اور میں تمہیں بتا رہی ہوں کہ وہ اسلام آباد نہیں گئے تھے۔'' اس نے پُرسکون لہجے میں کہا۔

حامد کسی زخم خوردہ ناگ کی طرح بل کھا کے اٹھا اور غصے میں دروازے کو دھڑ سے مار کے باہر نکل گیا۔

شیما قہقہہ مار کے ہنسی۔ اسے اندازہ تھا کہ حامد کا ردِعمل یہی ہوگا۔ ایک جھوٹ نے جیسے اچانک اس کی

آنکھوں پر پڑے ہوئے سارے پردے اٹھا دیے تھے۔

حامد نے احمد صاحب کے عدالتی پیشی کے سلسلے میں اسلام آباد جانے کا جھوٹ کیوں بولا تھا؟ جواب صرف ایک تھا اور بہت واضح تھا اب وہ شیما سے نکاح کی ضرورت محسوس نہیں کرتا تھا اور اس تعلق کو ایسے ہی چلانا چاہتا تھا۔ معلوم نہیں احمد صاحب سے اس نے کیا جھوٹ بولا ہوگا کہ شیما سے نکاح تو اب نہیں ہوسکتا۔ اس نے الزام خود شیما پر رکھ دیا ہوگا کہ وہ کوئی شریف لڑکی نہیں ہے۔ یہ مجھے اب پتا چلا ہے۔

جو شخص اپنی ماں کے بارے میں ایسے خیالات رکھ سکتا ہے کہ وہ اپنی آبرو کو اتنا عزیز رکھنے کی حماقت نہ کرتی تو وہ ایک گارمنٹ فیکٹری کی مالک بن سکتی تھی۔ اس کے لیے کسی کارپینٹر کی کچی آبادی میں رہنے والی غریب لڑکی کی آبرو کیا ہے۔

شاید تم یہ سمجھ رہے ہوگے کہ سستے چھوٹے... نہیں حامد، اپنے جرم کی سزا تو تمہیں ضرور ملے گی۔

☆☆☆

اس وقت اسے پھر کسی کے فون کا انتظار تھا۔ اس نے تایا جی کو بتا دیا تھا کہ وہ برٹش ہائی کمیشن کے آفس میں ویزے کی درخواست کے ساتھ اپنے پاسپورٹ جمع کرا آئی ہے۔ انہوں نے تین گھنٹے پہلے کال کیا تھا۔

''ٹکٹ تو نہیں ملے۔'' تایا جی نے پوچھا تھا۔

''ابھی تک تو نہیں ملے، مل جائیں گے۔''

''او بے وقوف لڑکی... کوئی ٹکٹ لے کر تیرے گھر نہیں آئے گا۔ ٹریولنگ ایجنٹ سے لینے تجھے خود جانا ہوگا۔''

''کس ٹریولنگ ایجنٹ سے تایا جی؟''

''میں نے نام نہیں بتایا تھا تجھے... میری بھی مت ماری گئی ہے بڑھاپے میں۔ غلطی اپنی اور ڈانٹ رہا ہوں تجھے... اچھا نام لکھ لے اور سن احسن آج کمالے کی ساری ہسٹری برٹش ہائی کمیشن کو بھیج چکا ہوگا۔ ویزے میں زیادہ دیر نہیں ہوگی، کمالا کیسا ہے؟''

''ویسے ہی تایا جی، آپ سے ایک بات پوچھنا تھی۔'' اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔

''تو پوچھ... اجازت لینا ضروری ہے۔''

''وہ تایا جی، لندن میں ٹھہرنے کا کیا انتظام ہوگا میرا اور ماں کا... کسی سستے سے ہوٹل میں قریب ہی...''

تایا بگڑ گیا۔ ''مجھے پتا چلا تھا بی اے میں فرسٹ کلاس لی ہے تو نے... غلطی ہوگئی یونیورسٹی والوں سے... ایسی بے وقوفی کی بات کرنے والی لڑکی کو تو پاس بھی نہیں کرنا چاہیے... او بے احمق، تم احسن کے پاس رہو گی اور کہاں؟''

''مگر تایا جی... اس کی بیوی اور بچے...''

''کیا اس نے شادی کر لی ہے؟ سوُر دا پتر... باپ کو نہیں بتایا اور تجھے بتا دیا۔ بچے بھی ہو گئے خیر سے اور دادا جی کو پتا ہی نہیں، میں ابھی خبر لیتا ہوں اس کی...'' انہوں نے مصنوعی غصے میں مسخرے پن کا اظہار کرتے ہوئے فون بند کر دیا۔ تایا جی کتنی شفقت اور محبت سے خفا ہوتے تھے۔

اس کے لیے امیدوں کے نئے افق روشن ہو گئے تھے۔ حالات نے یوں پلٹا کھایا تھا کہ تدبیر پر تقدیر کی دائمی بالادستی کا ایک اور ثبوت سامنے آ گیا تھا۔ یکلخت سب کچھ بدل گیا تھا اور ایسے بدلا تھا کہ جو اس کے خواب و خیال میں نہ تھا، وہ از خود ہو گیا تھا۔ علاج کے لیے انڈیا کے بجائے اب وہ مخالف سمت میں لندن جا رہے تھے۔ علاج کے لیے گھر بیچ کے دس لاکھ حاصل کرنے کی ضرورت اچانک ختم ہو گئی تھی۔ دستِ غیب کی طرح تایا جی نے سارا انتظام کر دیا تھا۔ برسوں کے ٹوٹے رشتے پھر یوں ملے تھے جیسے کبھی ٹوٹے ہی نہ تھے۔ کہتے ہیں کہ رشتے کی پہچان مصائب و آلام میں ہی ہوتی ہے۔ خوش وقتی میں تو سب ہی اپنائیت کے دعویدار نظر آتے ہیں۔ حالات کی آزمائش میں حامد کا اصل خود غرض چہرہ سامنے آ گیا تھا۔ ہوس پر دو نمبر مال کی طرح لگی ہوئی محبت کی مہرِ صداقت اتر گئی تھی۔

شیما جتنا حامد کے بارے میں سوچتی تھی، اتنا ہی اس کی شخصیت کا اصل روپ سامنے آتا جاتا تھا۔ صدیوں پرانی بات میں کیسی بنیادی حقیقت سیدھے سادے الفاظ میں بیان کر دی گئی تھی۔ سچائی چھپ نہیں سکتی بناوٹ کے اصولوں سے... کہ خوشبو آ نہیں سکتی کبھی کاغذ کے پھولوں سے۔ دل کی بات از خود حامد کی زبان تک آ گئی تھی جب اس نے مرحوم باپ کو عاقبت نااندیش اور عقل سے پیدل قرار دیا تھا، اگر وہ اصول پرست نہ ہوتا تو حامد کی نظر میں عقل مند کہلاتا۔ ماں جس نے زمانے سے لڑ کے اپنی عزت کے دامن پر دھبا نہیں آنے دیا تھا اور حامد کو پڑھا لکھا کے وکیل بنا دیا تھا اس کے نزدیک اخلاقیات کے چکروں میں نہ پڑتی تو آج وہ گارمنٹس فیکٹری کا وارث اور مالک ہوتا۔ اقدار کے پیمانے جیسے بالکل الٹ گئے تھے۔ قابلِ صد ستائش صرف وہی تھا جو دولت مند تھا۔ دولت حاصل کرنے کے ذرائع غیر اہم تھے اور حامد کی فطرت کے اسی نظر نہ آنے والے پہلو نے بالآخر شیما کی نظر میں اس کی دلفریب شخصیت

کے سارے کچے رنگ حالات کی پہلی بارش میں دھل گئے تھے اور ان سے مسٹر بلیک اینڈ وائٹ کا اصل روپ عیاں ہو گیا تھا۔

اب جبکہ وہ حقائق کی صحیح تصویر دکھانے والی عینک سے جائزہ لینے پر قادر بھی اور جذبات پر دوبارہ عقل کا غلبہ تھا، وہ بہت کچھ دیکھ رہی تھی اور سمجھ رہی تھی۔ جیسے اندھیرے میں سائے کچھ اور مفہوم رکھتے ہیں مگر روشنی میں اپنی ہیئت ہی تبدیل کر لیتے ہیں۔ شاید مکان بیچ کے بارہ لاکھ وصول کرنے میں اس کا بھی کوئی پوشیدہ مفاد ہوگا۔ یہ ہوسکتا ہے کہ مکان کی اصل قیمت بارہ سے زیادہ ہو۔ خود اس نے تو کسی سے پوچھا ہی نہیں تھا۔ اس نے سودا کیا ہو کہ ایک پارٹی مجبوری میں گھر بیچ رہی ہے۔ میں سستا دلا سکتا ہوں مگر میرا حصہ کیا ہوگا۔ فرض کرو مکان تھا پندرہ کا۔ وہ بارہ میں فروخت کرا دیتا تو تین لاکھ کے منافع میں برابر کا حصہ دار بھی بن سکتا تھا۔ یہ تو طے تھا کہ ایک بار ہاتھ سے نکل جانے والا مکان انہیں واپس نہیں ملے گا۔ اگر حامد کا کردار اور ایمان ایسا ہی ہے تو کچھ بعید نہیں کہ وہ مکان کی ساری رقم خرد برد کر جاتا۔ وہ شیما کا ہی نہیں پوری فیملی کا مکمل اعتماد حاصل کر چکا تھا۔ رقم کی منتقلی، حفاظت، تحویل سب شیما کے لیے مشکل مرحلے تھے، حامد ہی سب کرتا۔

یہ سب بدگمانی کے کرشمے تھے کہ شیما وہ بھی دیکھ رہی تھی جو ہوا نہیں تھا۔ خوف، وسوسے، اندیشے آج سامنے آ رہے تھے اور وہ اکیلی تھی تو ڈر رہی تھی۔ آخر ایسا کیوں ہے؟ اسلامی جمہوریہ پاکستان کے مہذب شہری معاشرے میں بھی اکیلی عورت کو تحفظ کی کوئی ضمانت حاصل نہیں۔ وہ باپ ہو، بھائی، شوہر ہو یا بیٹا۔ اس کا حفاظتی حصار نہ ہو تو بھیڑ جیسی معصومیت رکھنے والے بھی بھوکے بھیڑیے اسے ہر طرف سے کیوں گھیر لیتے ہیں۔ سنا ہے گوروں کے دیس میں ایسا نہیں ہوتا۔ عورت اکیلی رہ سکتی ہے۔ اس نے اخبار میں پڑھا تھا کہ ملک ایران میں عورت آدھی رات کو اپنی ٹیکسی لے کر سواری اٹھانے جا سکتی ہے اور اسے کوئی خطرہ نہیں ہوتا۔ حجاب کے ساتھ ملائیشیا میں عورت ہر وہ کام کر رہی ہے جو مرد کر رہے ہیں۔

فون کی گھنٹی پر وہ چونکی اور اسے احساس ہوا کہ وہ کتنی دیر سے آنکھیں کھولے صرف سوچ رہی ہے۔ ورنہ اسے تو لائٹ آف کر کے لیٹنے کے بعد خواب کی دنیا میں پہنچنے میں دس منٹ بھی نہیں لگتے تھے۔ اس نے اندھیرے میں روشن [illegible] نمبر دیکھا تو اجنبی تھا مگر اب اسے مختلف ممالک کے کوڈ معلوم ہو گئے تھے۔

”ہیلو۔“ اس نے محتاط مگر پُراعتماد انداز میں پوچھا۔

”کون بولتا ہے؟“ کسی نے بدتمیزی سے اکھڑ لہجے میں سوال کیا۔

”آپ نے کس کو فون کیا ہے، کس سے بات کرنی ہے؟“

”مجھے سوکھی چوہیا سے بات کرنی ہے‘ ہیروشیما سے۔“ وہ ہنسا۔

Downloaded From

”احسن، بدتمیز، ابھی تک بڑے نہیں ہوئے تم... موٹے کدو۔“

”ارے چھوڑو، کیا کرتا ہے بڑے ہو کے، اسکائپ نہیں ہے؟“

”ہے، میں آن کرتی ہوں، ایک منٹ۔“

چند سیکنڈ بعد احسن کا صحت مند مسکراتا ہوا چہرہ اسکرین پر آ گیا۔ ”شاید غلط نمبر مل گیا تھا مجھ سے... اور جھوٹ بولا ہے تم نے، تم وہ نہیں ہو سوکھی چوہیا۔“

”ارے، جب نمبر میرا ہے تمہیں تایا جی نے دیا ہو گا۔“

”مگر وہ تو اتنی خوب صورت نہیں تھی بلکہ ذرا بھی خوب صورت نہیں تھی۔ اچھا وہ قسم کھاؤ جو ہم کھاتے تھے۔“

وہ ہنس پڑی۔ ”قسم نیلی چھتری والے کی اب تو یقین آیا؟“

”آیا، لیکن بائی گاڈ ہیروشیما... واٹ اے چینج۔“

شیما مسکرائی۔ ”مگر تم موٹے کدو ہی ہو، ڈاکٹر ہونے کے باوجود۔“

”یار کیا کروں، جاگنگ مشین بھی لی تھی، استعمال بھی کی کچھ دن... فرصت نہیں ملتی۔“

”تو ملازم رکھ لو اس کے لیے... مجھے تایا نے بتایا کہ تم سرجن بن گئے ہو بہت بڑے... مجھے یقین نہیں آتا۔“

”تم آؤ گی تو دیکھ لینا، اچھا اب میری بات غور سے سنو، کل ٹکٹ لو۔ مجھے امید ہے تین چار دن میں ویزا لگ جائے گا۔ اب دیر کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔“

”ابا جی ٹھیک تو ہو جائیں گے نا؟“

”انشاء اللہ... ہم دوا کے ساتھ دعا پر ایمان رکھنے والے لوگ ہیں۔ لیکن یہ یاد رکھو کہ ڈاکٹر کے ہاتھ میں زندگی اور موت نہیں ہے، وہ کوشش کرتا ہے، شفا اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ یہاں ڈاکٹرز کے ایک پینل نے کیس ہسٹری دیکھی

تھی۔ وہ پُرامید ہیں۔ میں تم سے روز رابطے میں رہوں گا۔ مجھے وہاں کی پروگریس بتاتی رہو، ائرپورٹ میں خود تمہیں لینے آؤں گا۔ چاچا جی کو ہم سیدھا اسپتال لے جائیں گے۔ ان کو داخل کرانے کے بعد باقی کام... میرا چھوٹا سا گھر ہے۔ اسٹوڈیو اپارٹمنٹ... ایک بیڈروم والا، تم اپنی امی کے ساتھ بیڈروم میں رہنا، میں لاؤنج میں رہوں گا۔''

''احسن، تمہیں تکلیف ہوگی۔ اگر ہمارے رہنے کا اور کوئی بندوبست ہوسکتا ہے...''

''میرے رہنے کا ہوسکتا ہے۔''

''ہاں، کسی گرل فرینڈ کے پاس جگہ نکل آئے تو... اچھا ہے۔''

''آخر ہونا وہی مڈل کلاس کی جاہل لڑکی... جو اس سے آگے سوچ ہی نہیں سکتی۔'' اس نے فون بند کردیا۔

شیما کو اپنی بات پر افسوس ہوا۔ بے شک اس نے جو کہا مذاق کی بات تھی مگر کہنے کی بات نہیں تھی۔ مجھے کیا حق پہنچتا ہے یوں اس کے کردار کو مشکوک بنانے کا... وہ نیک نیتی میں سب کچھ تو کررہا ہے... سوری کہنے کے لیے اس نے خود کال ملائی مگر دوسری طرف اس نے غصے میں خفا ہو کے فون آف کردیا تھا۔ قصور شیما کے اس ذہن کا تھا جو نچلے طبقے کے روایتی طور پر فرسودہ ماحول میں پرورش پا کے یورپ، امریکا جانے والوں کے بارے میں اور وہاں کی زندگی کے طور طریقوں کے بارے میں اسی انداز میں سوچنے کا عادی تھا کہ وہ جنسی اخلاقیات میں مادر پدر آزاد معاشرہ ہے جس میں پہنچ کے یہاں کے طالب علموں کے قدم فوراً بہک جاتے ہیں اور کسی گوری چمڑی والی بے حیا میم کے دامِ الفت میں گرفتار ہوکے شادی کر بیٹھنا تو ایک عام بات ہے۔ گرل فرینڈ اور بوائے فرینڈز بلوغت کی عمر سے بہت پہلے ہی جنسی تجربات کرتے پھرتے ہیں اور پینا پلانا تو ایسا ہی ہے جیسے یہاں چائے اور کولڈ ڈرنک... چنانچہ اس نے پہلے تایا جی سے سوال کرلیا تھا کہ احسن کے گھر میں تو اس کے بیوی بچے بھی ہوں گے اور اسے شرمندگی سے زیادہ حیرانی ہوئی تھی کہ ولایت میں ڈاکٹر بن کے رہنے والے نے ابھی تک کسی گوری میم سے شادی نہیں کی۔ آج پھر اسے خفت اٹھانا پڑی تھی جب مذاق کی بات میں اس نے احسن کو طعنہ دے دیا تھا کہ اس کے سونے کا کیا ہے کسی بھی گرل فرینڈ کے پاس چلا جائے۔ حالانکہ اس کی پیشکش روایتی مشرقی آدابِ مہمان نوازی کے عین مطابق تھی۔

کسی دشواری کے بغیر اسے ٹریول ایجنٹ سے تین ٹکٹ مل گئے اور ٹورسٹ ڈپارٹمنٹ کے شائع کردہ کچھ پمفلٹ بھی جن میں لندن آنے والوں کے لیے مفید اور دلچسپ معلومات تھیں۔ اس نے کونسلیٹ میں ویزا کی درخواست کے ساتھ پاسپورٹ جمع کرائے تو کاؤنٹر پر ہی اسے ایک خوشگوار حیرت کا سامنا کرنا پڑا جب پیچھے بیٹھی ہوئی پاکستانی لڑکی نے کمپیوٹر پر چیک کرنے کے بعد کہا۔

''اوہ، آپ فادر کو علاج کے لیے لے جارہی ہیں۔''

میڈیکل رپورٹ کی فائل شیما کے ہاتھ میں ہی رہ گئی۔ ''جی یہ فائل...''

وہ مسکرائی۔ ''میں نے سب ریکارڈ دیکھ لیا ہے کمپیوٹر پر مس شائلہ، آپ کا کیس ترجیحی بنیادوں پر ڈیل ہوگا۔''

اب محاورے کے مطابق سات سمندر پار بیٹھے بھائیوں، اس کے اور تایا جی کے علاوہ احسن کے ساتھ رابطہ معمول کی بات ہوگیا تھا۔ سیٹلائٹ کمیونیکیشن کی وجہ سے فاصلوں کا وجود بے معنی ہوگیا تھا۔ کوئی لوکل کال کرنا اور لندن یا امریکا بات کرنا ایک ہی جیسی بات تھی۔ شیما کو اچانک گمشدہ رشتوں کا خزانہ ہاتھ آگیا تھا۔ اسے بھی اور کمال دین کو بھی۔ بڑے بھائی کی محبت اور مدد نے اس کا آدھا مرض تو ویسے ہی دور کردیا تھا۔ احسن پہلے دن کی بات بالکل بھول گیا تھا بلکہ اس نے دوسرے دن خود معذرت کی تھی کہ شیما کے مذاق پر اس نے بداخلاقی کا مظاہرہ کیا۔

حامد کا رویّہ اس کے برعکس رہا۔ شیما کو یقین تھا کہ وہ اپنے طرزِعمل پر شرمندہ ہوگا اور معمول کے مطابق اس سے ملنے بھی آئے گا لیکن دو دن تک اس کی طرف سے مکمل خاموشی رہی تو شیما کا شک یقین میں بدلنے لگا کہ حامد کے بارے میں اس کے اندیشے بے بنیاد نہیں تھے، موقع پاتے ہی اس نے قطع تعلق کا بہانہ بنالیا ہے۔ شیما کو اس کی محتاجی نہیں رہی تھی اور صرف اپنے شبہات کی تصدیق کے لیے اس نے تیسرے دن خود فون کیا۔

''کیا بات ہے، تم کیوں روٹھے بیٹھے ہو؟''

اس نے سردمہری سے جواب دیا۔ ''محض وہم ہے تمہارا۔ میں مصروف تھا۔''

''لگتا ہے تم نے میرے مکان فروخت نہ کرنے کے فیصلے کا برا مان لیا ہے۔ حالانکہ میرے ساتھ تمہیں بھی خوش ہونا چاہیے تھا...''

''بات برا ماننے یا خوش ہونے کی نہیں ہے۔ چلو اچھا ہوا تمہارا گھر بچ گیا۔ لیکن میری پوزیشن بہت خراب ہوئی۔ میں بڑی مشکل سے انہیں لایا تھا اور انہیں تمہاری ضرورت

READING Section
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

مندی پر قائل کرنے کے لیے بہت منت سماجت کی تھی۔‘‘

‘‘حالانکہ اس کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی اور پھر قصور تو میرا تھا۔‘‘

‘‘وہ جاہل لوگ تھے، انہوں نے مجھے بہت بے عزت کیا اور یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا، میں دیکھ رہا ہوں کہ قبلہ بدلتے ہی تمہارا رویّہ بھی بدل گیا ہے۔ اب تمہیں میری ضرورت نہیں رہی۔‘‘

‘‘ضرورت تو تمہیں میری اس حد تک تھی کہ تم احمد صاحب کو سفارش کے لیے ساتھ لائے تھے۔ یہ تو زندگی بھر کا ساتھ نبھانے کی بات تھی۔ لندن آنا جانا تو ایک ہنگامی ضرورت ہے۔‘‘

‘‘میں تمہیں بڑے مضبوط کردار کی لڑکی سمجھتا تھا...‘‘

شیما بھڑک اٹھی۔ ‘‘اچھا، الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے... اگر میں دروازہ نہ کھولتی اور تمہارے منہ پر تھپڑ مارتی... تم نے صورتِ حال سے ناجائز فائدہ اٹھایا تھا اور اب الزام مجھے دے رہے ہو کہ میں نے کمزوری دکھائی۔ وہ تو خدا کا شکر ہے کہ نتائج بھگتنے سے بچ گئی میں... تمہارا رویّہ اس کے بعد ہی بدلا ہے...‘‘

اچانک اسے احساس ہوا کہ دوسری طرف کی خاموشی اس کا مذاق اڑا رہی ہے۔ وہ اکیلی بولے چلی جا رہی تھی۔ حامد فون بند کر چکا تھا۔ غصے اور صدمے سے اس کا برا حال ہو گیا۔ اس نے فون کو بیڈ پر پھینکا اور تکیے میں منہ چھپا کے رونے لگی۔ باپ کو کم عقل اور ماں کو نادان قرار دینے والا اب اسے بھی بدکردار قرار دے چکا تھا۔ اس کے نزدیک سارے رشتے ضرورت کے رشتے تھے۔ مفاد پرستی کی اہمیت اخلاق و کردار سے زیادہ تھی۔ دنیاداری میں جذبات کی حیثیت دولت سے زیادہ نہیں تھی۔

☆☆☆

لندن تک ہوائی سفر اس کے لیے ایک طلسماتی تجربہ تھا۔ ایلس ان ونڈر لینڈ وہ خود ہو گئی تھی۔ اس کے باپ کا چہرہ بیماری کے باوجود امید اور خوشی کے جذبات سے دمک رہا تھا اور ہمیشہ کی طرح اس کی خاموش ماں کے جذبات اس کی آنکھوں سے بہہ رہے تھے۔ خاموش آنسو جو بہت کچھ کہتے تھے۔ جن کو الفاظ کی زبان کی ضرورت ہی نہ تھی۔ شیما نے قدم قدم پر کوئی ایسی بات کی جس نے باقاعدگی سے ہوائی سفر کرنے والوں کو مسکرانے پر مجبور کر دیا لیکن بالآخر ان کو جہاز میں ایک ساتھ تین سیٹوں پر بٹھا دیا گیا۔ اسے کھڑکی کے ساتھ والی سیٹ دے دی گئی۔ اس کے اور کمال دین کے درمیان شیما کی ماں رہی جہاز اٹھا تو شہر نیچے ڈوبتا چلا گیا۔ پھر بادلوں کے پردے میں غائب ہو گیا۔ اس نے اپنے سامنے والے اسکرین پر ایک فلم بھی لگائی مگر پھر ایک سین پر گھبرا کے بند کر دی۔ باقی وقت وہ گانے سنتی رہی اور باہر دیکھتی رہی۔

لندن تک کا سفر کسی انوکھے ست رنگے خواب جیسا تھا۔ وہ نیچے سمندروں، بادلوں اور کبھی ان دھبے جیسے جزیروں کو دیکھتی رہی جو مختلف ممالک تھے۔ جہاز کے اندر کی دنیا الگ تھی۔ خوش حال خوب صورت مسافر، ائرہوسٹس، سر، میڈم کہتی، ہر فرمائش پوری کرتی، اور ایک احساس کہ حرکت کا پتا نہ چلنے کے باوجود ہزاروں فٹ کی بلندی پر ایک بہت بڑے ہال میں بیٹھے سیکڑوں لوگوں کے ساتھ اڑ رہی ہے۔ اسکرین پر لکھا ہوا آجاتا تھا کہ ان کی بلندی کیا ہے۔ رفتار کتنی ہے اور باہر کا درجہ حرارت کتنے ڈگری منفی سینٹی گریڈ ہے۔ کمال دین کی تکلیف وقتی طور پر کم تھی۔ اس کا مرض اندر ہی اندر پھیل رہا تھا۔ یوں جیسے دیمک پرانے درخت کے مضبوط تنے کو اندر ہی اندر سے کھوکھلا کرتی جاتی ہے اور ایک دن اچانک ہوا کا ایک جھونکا اسے گرا دیتا ہے۔ وہ دوائیں کھا رہا تھا۔ فرطِ جذبات میں وہ ہنس کے کہتا تھا کہ میری بیماری تو ایسے ہی ٹھیک ہو گئی ہے۔ بھائی صاحب سے ملوں گا تو بالکل ٹھیک ہو جاؤں گا اور پھر میرا بھتیجا خود اب بڑا ڈاکٹر ہے۔ اس کا سر فخر سے بلند ہو جاتا تھا۔

لندن کا ائرپورٹ، اس کی وسعت، رونق اور چکاچوند دیکھ کے شیما دنگ رہ گئی۔ ہزاروں لوگ اِدھر سے اُدھر بھاگے جا رہے تھے۔ کوئی کسی کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ گورے کالے، عورت، مرد، بے شمار لائٹس، سیکڑوں جہاز جو شفاف شیشے کی دیواروں کے پیچھے اترتے چڑھتے دکھائی دیتے تھے۔ احسن خود ان کو لینے کے لیے موجود تھا۔ پہلے کے مقابلے میں ایک بہت صحت مند اور ہینڈسم جوان آدمی... ٹی شرٹ اور جینز میں وہ ذرا بھی ڈاکٹر نہیں لگتا تھا۔ وہ چاچاجی سے گلے ملا اور پھر چاچی کے سامنے جھک گیا کہ وہ اس کے سر پر ہاتھ رکھیں۔ پھر اس نے مسکرا کے شیما کو دیکھا اور اس کے دونوں کندھوں پر ہاتھ رکھ کے ہنسا۔ ‘‘تم تو... بہت بدل گئی ہو۔‘‘ غالباً عادت کے مطابق... وہ ‘‘خوب صورت ہو گئی ہو‘‘ کہتے کہتے رک گیا۔

‘‘بھائی جی نہیں آئے؟‘‘ کمال دین کچھ مایوس تھا۔

‘‘چاچاجی، امریکا سے بارہ چودہ گھنٹے لگتے ہیں اور اب ان کی صحت بھی اچھی نہیں رہتی۔‘‘ وہ سامان سمیت باہر

کی طرف چل پڑا۔ ”گھر سے بھی کم ہی نکلتے ہیں۔“

”کیوں؟ بھائی جی کو کیا ہوا ہے؟“

”جو سب کو ہوتا ہے اس عمر میں... بڑھاپا... وہ اب ستر کے قریب ہیں لیکن صحت کا خیال نہیں رکھتے اور انہوں نے تو نہیں بتایا ہوگا وہ بہت زیادہ پینے لگے ہیں۔“

کمال دین چلتے چلتے رک گیا۔ ”بھائی جی شراب پیتے ہیں؟“

”چلو چاچاجی، یہاں سب ہی پیتے ہیں، حد میں رہ کر پینے سے کچھ نہیں ہوتا۔“

کمال دین کا صدمہ چہرے سے عیاں تھا۔ ”توبہ توبہ... پھر تو وہ خنزیر بھی کھاتے ہوں گے؟“

”اب ایسی بات بھی نہیں...“ اس نے ایک لمبی چوڑی کار میں سامان رکھا۔ ”آپ اور چاچی پیچھے بیٹھیں۔“

شیما چپ چاپ لندن کی سڑکوں کی گہما گہمی دیکھتی رہی۔ اس کا یہ خیال تو غلط ثابت ہوا تھا کہ وہاں سب عورتیں فلموں کا وہی برائے نام لباس پہنے گھومتی ہوں گی۔ بیشتر عورتیں ٹی شرٹ اور جینز میں تھیں۔ ہاں اسے کمر میں ہاتھ ڈالے ایک دوسرے کے سہارے چلتے یا بوس وکنار کرتے کچھ نوجوان ضرور نظر آئے۔ یہ گورے کالے اور پیلے لوگوں کا ملا جلا ہجوم ہر جگہ تھا۔ وہ سیدھے اسپتال گئے۔ ان کا سامان گاڑی میں رہا۔ شیما اور اس کی ماں کو ایک ویٹنگ روم میں بٹھا کے احسن اندر چلا گیا۔ کمال دین کو اسپتال کی دو نرسیں ایک کرسی پر بٹھا کے پہلے ہی لے جا چکی تھیں۔

شیما دو گھنٹے تک بے قراری سے پہلو بدلتی رہی۔ آتے جاتے مریضوں یا مردوں کو دیکھتی رہی۔ کسی کو کسی سے سروکار نہ تھا۔ کوئی بے وجہ بولتا ہی نہ تھا۔ اسپتال کے اندر موبائل فون بھی بند تھے۔ احسن دو گھنٹے بعد مسکراتا ہوا نمودار ہوا۔ ”چلو، چاچاجی کو وارڈ میں لے گئے ہیں۔ ہم پہلے کچھ کھائیں گے۔“ وہ بولا۔

”ہم انہیں مل نہیں سکتے؟“ شیما نے کہا۔

احسن نے نفی میں سر ہلایا۔ ”یہاں یہ سب نہیں ہوتا۔ اسپتال والے کہتے ہیں کہ مریض کو ہمارے سپرد کریں اور جائیں۔ آگے ہمارا کام ہے اور ہم پر اعتبار نہیں تو لے جائیں اپنے مریض کو۔“

”کیا مطلب؟ اب اباجی سے ملاقات ہی نہیں ہو گی؟“

”ہو گی... سرجری کے بعد جب ڈاکٹر اجازت دیں گے۔“ احسن نے کہا۔ ”فکرمند ہونا چھوڑ دو سوکھی چوہیا۔ وہ بالکل ٹھیک ہو جائیں گے۔“

شیما اس بے موقع مذاق پر مسکرائی بھی نہیں۔ اس کی ماں کو بہت فکر تھی کہ کھانے پینے میں حرام شے نہ آ جائے۔ احسن نے اسے تسلی دی۔ ”یہاں تیس لاکھ پاکستانی اور انڈین ہیں اور وہی کھاتے پیتے ہیں جو اپنے ملک میں کھاتے تھے۔ ہاں گھروں میں کھانا کم پکتا ہے۔ روٹیاں تھوپنا اور بھون بھون کے مرغن کھانے بنانا یہاں نہیں ہوتا۔“

احسن کا اپارٹمنٹ دیکھ کے اسے مایوس ہوئی۔ اس سے بڑا تو ان کا کراچی والا گھر تھا۔ احسن نے بتایا کہ یہاں مکان بھی چھوٹے ہوتے ہیں۔ وہ چار چھ بیڈروم اور اٹیچ باتھ والی عیاشی امیروں کو بھی میسر نہیں۔ پانی کم ہے۔ ضائع نہیں کیا جاتا۔ وہ بہت دیر تک بتاتا رہا کہ لندن میں رہنے کے طور طریقے کیا ہیں۔ اپارٹمنٹ میں ہر چیز تھی اور بجلی سے چلتی تھی۔ اس کا اپنا بیڈروم بارہ فٹ لمبا چوڑا ہوگا۔ لاؤنج اس سے کچھ کم تھا۔ اس کے آخر میں اوپن کچن تھا اور ان سب کے لیے چار بائی چار فٹ کا باتھ روم... لیکن اتنے بڑے شہر کے اتنے چھوٹے گھر میں رہنا ان کی مجبوری تھی۔

احسن نے سارا انتظام پہلے سے کر رکھا تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ کوشش نہ کرتا تو شاید انہیں چھ ماہ انتظار کرنا پڑتا۔ چھٹے دن کمال دین کا آپریشن تھا تو شیما کا تایا آ پہنچا۔ شیما اسے دیکھ کے حیران رہ گئی۔ وہ بہت موٹا ہو گیا تھا اور چلتے ہوئے یا بات کرتے ہوئے بھی ہانپتا تھا۔ وہ اسپتال کے ویٹنگ روم میں بیٹھ کے بھی پیتا رہا۔ وہ تھوڑی دیر بعد جیب میں سے ایک چپٹی سی بوتل نکال کے گھونٹ بھر لیتا تھا۔

”یہ تم نے کیا لت لگالی ہے بھائی جی؟“ شیما کی ماں نے کہا۔

”یہ تو ٹانک ہے، سب پیتے ہیں یہاں... تو بھی پینے لگے گی یہاں رہ کے۔“ وہ ہنسنے لگا۔ اس نے اپنی بیوی اور بچوں کے بارے میں سرسری بات کی۔ ”سب مست ہیں۔ اپنا اپنا کام کرتے ہیں۔ بس میں فارغ ہوں، مجھے احسن نے بلایا تو آنا پڑا۔“

”اچھا ہے بھائی سے بھی مل لو گے۔“

”اور کیا، تم کو اتنی دور سے بلانے اور خود اتنی دور سے آنے کا اور مقصد کیا ہے۔ تم لوگوں کا تو خون سفید ہو گیا ہے مگر بڑا بھائی تو ہوتا ہے باپ کی جگہ... میں نے تو ہمیشہ کوشش کی کہ سب ساتھ رہیں۔“

شام کو احسن نے آ کے بتایا کہ اس نے باری باری

READING Section
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

سب کی چاچاجی سے ملاقات کا بندوبست کیا ہے۔'' ان کو یہاں ایک کمرے میں لا رہے ہیں۔ سب ایک ساتھ نہیں مل سکتے۔ اباجی پہلے آپ آجائیں۔ پانچ منٹ کی ملاقات ہو گی۔ بعد میں شاید تین چار دن موقع نہ ملے۔''

شیما بے چینی سے اپنی باری کا انتظار کرتی رہی۔ جمال دین برسوں بعد چھوٹے بھائی سے مل کے آیا تو رو رہا تھا۔ وہ صوفے پر گر کے بھی ہچکیاں لیتا رہا اور پیتا رہا۔ اس کے بعد شیما کی ماں گئی اور شیما بے قراری سے ویٹنگ روم کے اندر ٹہلتی رہی۔ اس کی ماں واپس آئی تو احسن کے تسلی دینے اور سمجھانے کے باوجود کہ اب خطرے کی کوئی بات نہیں، وہ خاموشی سے آنسو بہاتی رہی۔

''چلو تم آجاؤ۔'' احسن نے شیما کو اشارہ کیا۔ وہ احسن کی حوصلہ افزائی کے باوجود سخت نروس تھی۔ اسے ایک کمرے میں جا کے لباس اور جوتے سب بدلنے پڑے۔ پھر ایک نرس نے اس کے ہاتھ دھلائے اور اسے پیر دھو کے چپل پہننے کو دی۔ آخری چیز کپڑے کا ایک ماسک تھا جو نرس نے اس کے منہ پر یوں چڑھا دیا کہ سوائے آنکھوں کے اس کا سارا چہرہ اور بال اس میں چھپ گئے۔ ''کسی سرجری کے مریض سے ملنے کے لیے یہ تمام احتیاطی تدابیر معمول کا حصہ تھیں۔ شیما سے کہا گیا کہ وہ مریض کے بیڈ سے دور رہے۔ باپ کے کمرے میں جا کے اسے اندازہ ہوا کہ قریب جانا ویسے بھی ممکن نہیں۔

کمال دین آپریشن کے کپڑوں میں اسٹریچر پر سیدھا لیٹا ہوا تھا۔ درمیان میں دو فٹ کے فاصلے پر شیشے کی دیوار تھی جو چار فٹ اونچی تھی۔ اس سے لگ کر شیما نے آنسو روکتے ہوئے کہا۔ ''کیسے ہیں آپ ابا؟''

وہ ہمت سے کام لے کر مسکرایا۔ ''بالکل ٹھیک... بھائی جی تو بڑے کم ہمت ہیں۔ رو رہے تھے بچوں کی طرح۔''

شیما نے کہا۔ ''وہ بہت جذباتی ہیں آپ کے لیے بھی۔''

''اور تیرے لیے بھی... کہہ رہے تھے کہ شیما میری ہے... مجھے میرا وعدہ یاد دلا رہے تھے۔''

سمجھ جانے کے باوجود شیما نے بات کو ٹال دیا۔ ''آپ کے ٹھیک ہونے تک وہ لندن میں ہی رہیں گے۔''

''ڈاکٹر کہتے ہیں کہ اسپتال سے ایک ہفتے بعد چھٹی ملے گی۔''

''ایک ہفتہ بھی گزر جائے گا۔ آپ بالکل ٹھیک ہو جائیں گے۔ واپس پاکستان جانے کے لیے۔''

وہ کچھ نہیں بولا۔ بس شیما کو دیکھتا رہا۔ صاف نظر آتا تھا کہ وہ اپنے آنسو پینے کی سخت جدوجہد کر رہا ہے۔ ''اپنا خیال رکھنا ہیرو شیما... احسن بہت اچھا لڑکا ہے۔ تجھے کوئی تکلیف نہیں ہونے دے گا۔''

شیما کی سمجھ میں یہ آخری بات نہیں آئی تھی مگر اسی وقت نرس نے جھانک کے کہا۔ ''یور ٹائم از اوور پلیز۔'' وہ پلٹ گئی۔ باہر نکلنے سے پہلے اس نے دوبارہ باپ کی طرف مڑ کے نہیں دیکھا۔ وہ بہت کمزوری محسوس کر رہی تھی اور لگتا تھا کہ بے ہوش ہو کے گر جائے گی۔ باہر نکلتے ہی اس نے سہارے کے لیے احسن کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ احسن نے سنبھال لیا۔ ایک ہاتھ شیما کی کمر میں ڈال کے وہ اسے ویٹنگ روم تک لے گیا۔ ''حوصلے سے کام لو۔ میں تو سمجھتا تھا کہ تم بہادر لڑکی ہو، تم سے زیادہ ہمت والی تو چاچی ہے۔''

وہ صوفے پر گر گئی اور ماں کے کندھے پر سر رکھ کے رونے لگی۔ اس کے اندر کا خوف جو پہلے شیما کے کان میں سرگوشی کرتا تھا۔ اب لاؤڈ اسپیکر کی طرح چلا رہا تھا۔ تم اپنے باپ کو آخری بار دیکھ چکی ہو۔ اب اسے پھر زندہ نہیں دیکھو گی۔ احسن نے اس وقت ڈاکٹر ہونے کا ثبوت دیا۔ اسے اندازہ ہوگا کہ ان دواؤں کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ اس نے نرس کو بلا کے اسے ایک انجکشن دیا۔ نرس نے انجکشن شیما کو لگا دیا۔ اس نے چاچی کو بھی دو گولیاں کھلا دیں۔

رات کو شیما کی آنکھ پھر احسن کے اپارٹمنٹ میں اس کے بیڈ پر کھلی۔ اس کی ماں ہر روز کی طرح ساتھ تھی۔ اس نے گھڑی دیکھی تو رات کے تین بجے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ سات گھنٹے سوتی رہی تھی۔ اسے اپنے باپ کا خیال آیا۔ شاید اب تک اس کا آپریشن ختم ہو گیا ہوگا مگر وہ کہیں آئی سی یو میں بے ہوش پڑا ہوگا۔ اس کے بدن سے ٹیوبس اور تار منسلک ہوں گے اور مختلف مشینیں اس کے اندر کی ساری کیفیت دکھا رہی ہوں گی۔

پیاس محسوس ہوئی تو وہ بیڈ سے اتر کے باہر آئی۔ کاؤچ پر احسن کی جگہ اس کا تایا سیدھا پڑا ہوا تھا اور منہ کھول کے سانس لے رہا تھا۔ اپارٹمنٹ میں چوتھے آدمی کے لیے جگہ ہی نہیں تھی۔ وہ خود نہ جانے کہاں جا کے سویا ہوگا۔ پھر اسے یاد آیا کہ آج وہ نائٹ ڈیوٹی دے گا جو پورا ہفتہ چلے گی۔ وہ دوبارہ سو گئی۔ انجکشن کا تھوڑا بہت اثر ابھی باقی تھا۔ اس کی آنکھ پھر کھلی تو باہر سے اس کی ماں اور تایا جی کے باتیں کرنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ ان کے چہرے دیکھ کر

RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

وہ ٹھٹک گئی۔ وہ خاصے پریشان دکھائی دے رہے تھے۔

''کیا ہوا تایا جی، اسپتال سے کوئی خبر ملی؟''

''ہاں، احسن نے بتایا کہ آپریشن تو ہو گیا... مگر...''

''مگر کیا تایا جی؟'' وہ چلائی۔

''ابھی کچھ کہنا مشکل ہے۔ میں احسن کی بات بتا رہا ہوں۔ اس نے کہا کہ جسم کا دفاعی نظام نئی چیز کو کم قبول کرتا ہے۔ جیسے گردے میچ کر جائیں پھر بھی فیل ہونے کا خطرہ رہتا ہے۔ اس کے لیے دوائیں تمام عمر کھانی پڑتی ہیں۔''

شیما وہیں بیٹھ گئی۔ ''یہ کب معلوم ہوگا... کہ سب ٹھیک ہے؟''

''شام تک... اچھا تو دیکھ یہ جو چھوٹا سا کیبنٹ ہے۔ اس میں سب کچھ ہے۔ چائے، کافی، پتی... اور فریج میں بھی کچھ ہوگا تو ذرا ناشتا بنا... بنا لے گی یا میں بناؤں؟ دراصل یہاں سب کچھ الیکٹرک ہے۔''

تایا کے اصرار پر اور ماں کی خاطر اس نے ناشتا کیا ورنہ اس کا دل کچھ بھی کھانے کو نہیں چاہ رہا تھا۔

''میں نے ابھی تیری ماں سے بات کر لی ہے۔'' تایا اچانک بولا۔ ''کوئی نئی بات نہیں، سب پہلے سے طے تھا۔''

وہ چونکی اور ماں کی طرف دیکھا۔ ''تایا جی کیا کہہ رہے ہیں ماں؟''

ماں چپ رہی۔ تایا نے کہا۔ ''تیرا رشتہ احسن سے طے تھا۔ بھابی جانتی ہے اور کمالے کو بھی پتا ہے۔ اسے بھی کوئی اعتراض نہیں، میں نے بھاوج کو سب سمجھا دیا ہے۔''

''کچھ مجھے بھی سمجھائیے تایا جی۔'' اس نے دبے دبے لفظوں میں احتجاج کیا۔

''پتر ہیر و شیما، اب پہلے میری ساری بات سن لے اور سمجھ لے پھر جو کہنا ہے ابھی کہہ دینا۔ اتنی سیانی تو تبھی تھی جب ہم گھر سے گئے تھے۔ پہلے سعودی عرب پھر امریکا... معلوم ہوگا تجھے بھی۔ جب تمہارے یہاں آنے کا ہوا تو احسن نے مجھ سے بات کی اور کہا کہ ایسا ہو جانا چاہیے۔ موقع اچھا ہے۔ تو میں نے اور تیری تائی نے بھی یہی مناسب سمجھا۔ پہلے میں نے کمال سے بات کی۔ اس سے کہا کہ ہیر و شیما سے پوچھ لے تو اس نے مجھے بتایا کہ زبانی بات ہو چکی ہے کسی وکیل سے... مگر نہ اس کے ماں باپ کا پتا ہے نہ گھر ٹھکانا ہے اور تو جانتا ہے کہ احسن کے ساتھ بات پکی ہے تو پھر مجھے بتائے بغیر تو نے کہیں اور بات کیسے کی۔ اس نے اپنی غلطی مانی اور مجھ سے کہا کہ بات ہمارے تمہارے درمیان ہوئی تھی۔ بہت پہلے جب بچے چھوٹے تھے۔ اب ان کی کیا مرضی ہے۔ میں نے کہا کہ مرضی کے گھوڑے... احسن مجھ سے زیادہ مایوس ہے کہ چاچا جی نے ایسا کیوں کیا۔ خیر فیصلہ یہ ہوا کہ لندن آنے کے بعد دونوں کی مرضی پوچھ لیں گے۔ احسن کا تو مجھے پتا ہے۔ اس نے کہا کہ شیما کا مجھے پتا نہیں۔ ہو سکتا ہے اب اسے برسوں پہلے طے ہونے والا رشتہ قبول نہ ہو اور وہ کہے کہ میری بات تو خود آپ نے طے کی ہے اس وکیل کے ساتھ... کیا نام ہے اس کا... حامد... اب تو بول تیری کیا مرضی ہے۔ تیرا ابا تو یہی چاہتا ہے کہ جو پہلے طے ہوا تھا، وہی ہو۔''

شیما دم بخود بیٹھی رہی۔ ''میں کیا بولوں تایا جی... یہ کون سا موقع ہے۔''

''تو موقع کو چھوڑ... غلطی میری بھی کہ میں نے رابطہ نہیں رکھا اور دوبارہ بات کرنا ضروری نہیں سمجھا کہ جب وقت آیا تو ہم احسن کے ساتھ آجائیں گے پاکستان اور تجھے لے آئیں گے۔ اس کھوتے نے فرض کر لیا کہ اتنا عرصہ بات نہیں ہوئی تو وہ بات بھی ختم... حالانکہ یہ زبان کے قول ہی ہوتے ہیں۔ اب میں اور کمالا راضی... تیری ماں راضی... احسن راضی... زبردستی کوئی نہیں، تو اس وکیل سے ہی شادی کرنا چاہے تو تیری مرضی... ورنہ احسن کی بات طے تھی۔''

وہ فرش کو دیکھتے ہوئے پیر کے انگوٹھے سے قالین کو کریدتی رہی۔

''بولتی کیوں نہیں۔ کہہ دے ہم نے بے وقوفی کی تھی...'' تایا گرم ہونے لگا۔

''میں... انکار کیسے کر سکتی ہوں تایا جی... اگر ابا راضی ہے اور اس کی یہی خوشی ہے لیکن... یہ کون سا موقع ہے کہ میں شادی رچاؤں؟''

''پھر کیا دوبارہ آئے گی یا تو چاہتی ہے ہم بینڈ باجے کے ساتھ برات لے کر آئیں۔ زندگی کا کوئی بھروسا نہیں۔ میں کمالے کی بات نہیں کر رہا۔ اپنی بھی کر رہا ہوں۔ دو بائی پاس ہو چکے ہیں میرے بھی۔''

شیما نے نظر اٹھائی۔ ''اور اس کے باوجود... آپ پینا نہیں چھوڑتے، احسن منع نہیں کرتا۔''

وہ ہنسا۔ ''اوئے پتر، ایک شعر کسی نے پڑھا تھا میرے سامنے۔ چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی۔ اس کا بس چلے تو میرا کھانا بھی بند کر دے۔ کہتا ہے وزن کم کرو، میں نے کہا کہ کھاتے پیتے رہنا اچھا ہے۔ اب میری بات

سن۔ تیرا ابا اسپتال سے آجائے تو ٹھیک... ورنہ نکاح کرانے کے لیے میں ہوں اور تیری ماں ہے۔"

"تایا جی، میرا ویزا تین مہینے کا ہے اور باقی سب کا بھی۔"

"اس کی فکر تو مت کر، یہاں نکاح کے ساتھ رجسٹریشن بھی ہوتی ہے۔ اس کے بعد تیرا مسئلہ تو خود بخود حل ہو جائے گا۔ احسن برطانوی شہری ہے۔ تو بھی ہو جائے گی۔ اب کمالے اور بھابی کا یہ ہے کہ پہلے ویزا بڑھائیں گے۔ سال بھر کے لیے۔ ویسے تو یہاں دس لاکھ افراد بغیر ویزا کے رہتے ہیں۔ کبھی جا کے دیکھ بریڈفورڈ... لگے گا کراچی میں ہے یا لاہور میں۔ ایسٹ اینڈ سارا ایشیائی لوگوں سے بھرا ہوا ہے۔ انڈین، بنگلہ دیشی، سری لنکا والے۔ تجھے شہریت ملے گی تو تیرے ماں باپ کو خود بخود مل جائے گی۔"

"مجھے یہ سب نہیں معلوم تایا جی، یہ قانونی معاملات ہیں۔"

وہ ہنسا۔ "قانونی معاملات احسن سنبھال لے گا تو اپنی بات کر... احسن کا خیال ہے کہ شادی کے بعد اگر تو اس کے اسپتال میں نرسنگ کورس جوائن کر لے تو تعلیم کے لیے چار سال ملتے ہیں اور پہلے سال کے بعد تجھے اچھی خاصی تنخواہ ملنے لگے گی۔ اور چار سال کا کورس پورا کر لیا تو پھر تیری تنخواہ بھی احسن سے کچھ ہی کم ہو گی۔ اب یہاں کا نظام ایسا ہے کہ میاں بیوی دونوں کام کرتے ہیں۔ ایک کی آمدنی سے گھر نہیں چلتا۔"

شیما خاموشی سے سنتی رہی۔ یہ سب تقدیر کے کھیل تھے جس میں اس کی حیثیت ایک تماشائی جیسی ہو کے رہ گئی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ اس کے مستقبل کا ساتھی احسن ہو گا مگر پھر وہ مستقبل وقت کے ساتھ ماضی کی دھند میں گم ہو گیا تھا۔ وقت کے شاطر ہاتھ نے بساط پلٹ دی تھی۔ حامد ایک مہرے کی طرح پٹ گیا تھا اور اس کی جگہ احسن نے لے لی تھی۔ زندگی کا ہر دن ایک نیا خواب لے کر طلوع ہوتا تھا۔ ایک صبح اچانک اسے پتا چلا کہ اب وہ انڈیا نہیں لندن جا رہی ہے۔ اور آج کی صبح اسے یہ بتانے کے لیے طلوع ہوئی تھی کہ اب وہ واپس نہیں جا رہی ہے۔ معلوم نہیں تقدیر کے اس کھیل کا انجام کیا ہو گا۔ اس نے بے بسی سے سوچا۔

☆☆☆

آپریشن کے بعد چھٹے دن شیما کی اپنے باپ سے ملاقات ہوئی۔ اس سے پہلے وہ اسے شیشے کی شفاف دیوار والے کیبن میں دو بار دیکھ چکی تھی۔ پہلی بار کیبن میں لیٹے کمال دین نے بیوی اور بیٹی کو دیکھ کر صرف ہاتھ ہلایا تھا اور بیک وقت آنسو بہاتے اور مسکراتے ہوئے دو انگلیوں سے وی فار وکٹری کا نشان بنایا تھا۔ دوسری بار ان کو چند منٹ کے لیے بات کرنے کی اجازت ملی تھی۔ اس کی حالت بہتر ہو رہی تھی۔ طبیعت کا حال پوچھنے کے بعد شیما نے باپ سے براہِ راست سوال کر لیا تھا کہ کیا وہ احسن کے ساتھ بچپن میں طے ہونے والے رشتے پر قائم رہنا چاہتا ہے اور کمال دین نے اسے سر جھکانے کو کہا تھا۔

"چاہتا تو ہوں ہیرو شیما۔" اس نے بیٹی کے سر پر ہاتھ رکھا۔ "لیکن تیری رضامندی ضروری ہے۔"

شیما کو یہ سوال اس لیے کرنا پڑا تھا کہ ماں اور تایا کی طرف سے اس پر نکاح کے لیے دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ اب وہ پُرسکون اور مطمئن تھی۔ ایک احساس یہ تھا کہ اس نے بزرگوں کا فیصلہ تسلیم کر کے سعادت مندی کا ثبوت دیا۔ اس سے تایا کو شاید وہ خوشی نہ ملی ہو جو اس کے باپ کو ملی تھی۔ وہ بڑے بھائی سے کیے گئے عہد کو نبھانے میں کامیاب رہا تھا۔ خون کے رشتے پھر پہلے جیسے مضبوط ہو گئے تھے اور اس پر نہ وعدہ خلافی کا الزام آیا تھا نہ احسان فراموشی کا... اور یہ سب شیما کی قربانی کا نتیجہ تھا۔ کم سے کم کمال دین یہی سمجھتا تھا کہ حامد سے محبت کرنے والی شیما نے اپنی خوشی کی قربانی دی تھی۔

شیما کے دل پر سے ایک بوجھ تھا جو ہٹ چکا تھا۔ اس کی روح کا یہ زخم رفتہ رفتہ ماضی کی گرد کے نیچے دفن ہو جائے گا۔ حامد کی غرض پرستی اور رشتوں کی تقدیس کے بارے میں افسوسناک رویّہ شیما کو اس سے دور لے گیا تھا۔ احسن سے ملنے کے بعد اور زندگی کا ایک نیا سفر شروع کرنے سے اس کے لیے ماضی کے اس تلخ تجربے کو بھلانا بہت آسان ہو گیا تھا۔

اسپتال سے واپسی پر احسن بہت خوش تھا اور اس کی خوشی شیما کو نیا اعتماد عطا کر رہی تھی۔ قدرت کے کھیل بھی کیا نیارے ہیں کہ آگ لینے کو جائیں اور پیغمبری مل جائے۔ یہ اس کے باپ کی بیماری تھی جو شیما کو وہاں لے آئی تھی جہاں اسے آنا تھا۔ کیونکہ نوشتہ تقدیر میں ایسا ہی تھا اور بدلا نہیں جا سکتا تھا۔ اس نے حامد کو چاہا، اس سے عہدِ وفا کیا اور نصیب ہوئی احسن کا۔ اس نے باپ کو علاج کے لیے انڈیا لے جانے کا فیصلہ کیا اور وہ لیٹا ہوا تھا لندن کے ایک اسپتال میں۔

"کس سوچ میں گم ہیں سرکار؟" احسن نے ڈرائیو

کرتے کرتے شوخی سے پوچھا۔

شیما چونکی۔ ''یہ ہم کہاں جا رہے ہیں؟''

''دیکھو، میں تمہارا نامزد مجازی خدا ہوں۔ تم کو مجھ سے سوال کرنے کا حق حاصل نہیں۔ جہاں چاہے لے جاؤں تمہیں...''

وہ ہنسی تو اسے احساس ہوا کہ اچانک اس کا دل کتنا ہلکا ہو گیا ہے۔ ''ابھی سے حکم چلانا شروع کر دیا۔ دیسی لڑکی سب سن لیتی ہے، ولایتی ہوتی تو جواب دیتی۔''

اس نے بے تکلفی سے شیما کے شانے کے گرد ہاتھ رکھا اور اسے اپنی طرف کھینچ کے چوم لیا۔

شیما نے گھبرا کے کہا۔ ''یہ... یہ کیا بدتمیزی ہے۔ ہم سڑک پر ہیں اور تم ڈرائیونگ کر رہے ہو۔''

وہ ہنسا۔ ''یہاں اظہارِ عشق کوئی جرم نہیں۔ اس پر چالان بھی نہیں ہوتا۔ آج میں بہت خوش ہوں۔ مجھے اپنی وہ محبت مل گئی ہے جو بچپن سے میرے خواب و خیال میں بسی ہوئی تھی۔''

''ڈائیلاگ مت مارو۔ میری جگہ ہوتی نا کوئی کالی کلوٹی موٹی بھدی اَن پڑھ... تو بھاگ جاتے رسی تڑا کے...''

''یہ تو ہے۔ اب میں اپنی قسمت پر ناز کیوں نہ کروں کہ ایک سوکھی چوہیا کو اللہ میاں نے کیا چیز بنا دیا میرے لیے۔''

''اگر میں انکار کر دیتی... پھر...؟''

''پھر کیا، میں سمجھ لیتا کہ قصور میرا ہے جو اتنا عرصہ لاتعلق رہا۔'' اس نے گاڑی روک دی۔

''یہ کہاں لے آئے ہو تم مجھے؟'' شیما نے اپنے کپڑوں پر نگاہ کی۔

''میں نے ایک اسٹیمر ریسٹورنٹ میں ٹیبل بک کرائی تھی۔ ڈنر کے لیے۔''

''مگر میرے کپڑے...''

وہ ہنسا۔ ''ہاں کپڑے واقعی بہت زیادہ ہیں۔ ابھی تم دیکھ لو گی کہ جو یہاں آتے ہیں وہ صرف ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں۔'' اس نے ہاتھ پکڑ کے شیما کو اتارا۔

یہ شیما کے لیے خواب جیسا منظر تھا۔ اسٹیمر دریائے ٹیمز کی لہروں پر سبک خرامی سے رواں تھا۔ اس کے کناروں پر میزیں لگی ہوئی تھیں جہاں سے پانی میں روشنیوں کا عکس چراغوں کی طرح جھلملاتا تھا۔ درمیان میں بوفے ڈنر کا اہتمام تھا اور ایک آرکسٹرا جس میں زیادہ تر نیگرو اور کچھ لڑکیاں تھیں بہت مدھم سُروں میں موسیقی بکھیرتا تھا۔ جو میزوں پر بیٹھے تھے بیشتر نوجوان یا نوعمر لوگ تھے اور احسن نے مذاق میں جو کہا تھا درست تھا۔ خواتین میں کم سے کم لباس پہننے کا مقابلہ سا محسوس ہوتا تھا۔ انہوں نے اپنے حسن و شباب کی رعنائی کی نمائش میں ذرا کنجوسی یا جھجک کا مظاہرہ نہیں کیا تھا اور وہ جو اُن پر فریفتہ تھے مزید فریفتہ ہو رہے تھے۔ لیکن جیسا کہ مہذب اور روایت پسند انگریز قوم کی عادت ہے کوئی کسی کی طرف گھور کے بھی دیکھے تو بدتمیزی... شیما کے چمکتے ستاروں والے بلیو شلوار قمیص اور دوپٹے پر... جسے اس نے سر کے گرد لپیٹ رکھا تھا، کسی نے نظر بھی نہیں ڈالی۔

''کھانا تو محض خانہ پُری کی رسم ہوتی ہے یہاں... دراصل تو لوگ دل کی بات کہنے اور سننے آتے ہیں اور یہی میں بھی چاہتا تھا۔'' ایک ویٹریس کی نگرانی میں اپنی ٹیبل پر پہنچ کے بیٹھنے کے بعد وہ بولا۔

''یہ تم نے اچھا کیا۔ کیونکہ باتیں مجھے کہنی تھیں اور سننی تھیں۔''

''یہاں ڈنر سے پہلے کچھ پینے کا رواج ہے درمیان کے ڈرنکس الگ ہیں۔''

اس نے احسن کو حیرانی سے دیکھا۔ ''تم بھی پیتے ہو؟ کیونکہ سب پیتے ہیں؟''

اس کا لہجہ دیکھ کے احسن نے بات پلٹ دی۔ ''کیسی باتیں کرتی ہو۔ چلو پھر کچھ کھانے کو لے آئیں۔''

کھانے کے دوران میں شیما نے کہا۔ ''احسن! میں ایک روایتی مشرقی لڑکی ہوں۔ یہاں ابا کو علاج کے لیے لائی تھی۔ بڑوں نے شادی کا طے کر لیا۔ غلط نہیں کیا لیکن میں ڈری ہوئی ہوں۔''

''میں سمجھتا ہوں مگر اب تم اکیلی نہیں ہو۔'' احسن بولا۔

''ہاں، میں اکیلی نہیں ہوں۔ پہلا مسئلہ تو یہی ہے۔ وہ گھر تو بہت چھوٹا ہے اور ابھی مجھے اپنا پتا نہیں کہ حکومت رہنے کی اجازت دے گی یا نہیں۔ اماں ابا کو واپس جانا پڑا... پھر وہاں تو ان کا خیال رکھنے والا کوئی نہیں ہے۔''

''ایسی بات مت کرو۔ جب تم مسز احسن ہو جاؤ گی قانونی طور پر بھی... تو برطانوی حکومت کیسے کہہ سکتی ہے کہ تم یورپ میں رہو گے اور تمہاری بیوی ایشیا میں، اب رہی گھر کی بات... تو تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ میرا ایک اور اپارٹمنٹ بھی ہے۔ وہ میں کرائے دار سے خالی کرا لوں گا۔

وہاں ہم رہیں گے اور جہاں میں اب ہوں وہاں تمہارے والدین... چاچا اور چاچی۔''

شیما کے دل کو کچھ اطمینان ہوا۔ ''چلو، یہ تو ٹھیک ہے مگر کیا انہیں اجازت ملے گی؟''

''وہ میں لے لوں گا۔ اس کے معقول اسباب ہیں۔ ایک تو یہ علاج جو چل رہا ہے۔ چاچاجی کا بار بار چیک اپ کے لیے آنا مشکل ہے۔ دوسرے یہ کہ وہاں ان کی دیکھ بھال کرنے والا اب کوئی نہیں ہوگا۔ سال بھر کا ویزا تو آسانی سے بڑھ جائے گا اور اس دوران میں ان کی ذمے داری لوں گا۔ اسپانسر شپ... یعنی تمام اخراجات کی ذمے داری... اب حالات بدل گئے ہیں۔ امریکا، برطانیہ میں یہ سمجھا جاتا ہے کہ بوڑھے ایک بوجھ بن جاتے ہیں حکومت پر... ان کو لاوارث نہیں چھوڑا جا سکتا جیسے ہمارے ملک میں ہوتا ہے کہ بھیک مانگو یا فٹ پاتھ پر رہو۔ لیکن کسی کا اسپانسر ہو تو حکومت کو پھر کیا اعتراض، وہ اب یہیں رہیں گے۔''

شیما عام لڑکی تھی جسے پاکستان کے قوانین کا علم نہیں تھا تو برطانیہ کے امیگریشن لاز کا خاک علم ہوتا لیکن اس نے دیکھ لیا تھا کہ دونوں خاندانوں کے درمیان خون کا رشتہ کتنا پائیدار ہے کہ درمیان میں حائل سات سمندر اس کو ختم نہ کر سکے۔ یہ غالباً خون کا اثر تھا کہ احسن ڈاکٹر بن جانے کے باوجود بچپن کی منگنی پر قائم تھا اور اس نے کسی میڈاِن انگلینڈ لڑکی سے رشتہ نہیں جوڑا تھا۔ خالق و مالکِ تقدیر کے احسان کا شکر ادا کرنے کے لیے شیما کے پاس الفاظ نہیں تھے جس نے اسے حامد جیسے ہوس پرست اور بے ضمیر شخص کے ہاتھوں لٹنے سے محفوظ رکھا اور وہ جس کی امانت تھی، اس کے پاس پہنچا دیا۔

جب احسن نے اسے دوسری بار چوما تو شیما نے مزاحمت نہیں کی۔ جیسا دیس ویسا بھیس۔ اظہارِ محبت کے زیادہ جذباتی مظاہرے وہ دیکھ ہی رہی تھی۔ اب یہاں رہنا ہے تو احسن کی خاطر اسے خود کو بدلنا تو پڑے گا۔ لباس، رہن سہن، زندگی کے معمولات، طور طریقے، آخر وہ اس کا شوہر ہے۔ اس نے رات دو بجے احسن کے ساتھ کار میں بیٹھ کے سوچا اور آہستہ سے اپنا سر اس کے کندھے پر رکھ دیا۔

اس نے اپارٹمنٹ کے سامنے گاڑی روکی تو شیما کو خیال آیا۔ ''تم کہاں ہوتے ہو آج کل؟''

''رات میں اسپتال... دن میں ایک دوست کے اپارٹمنٹ میں جا کے سو جاتا ہوں کیونکہ وہ ڈیوٹی پر جاتا ہے لیکن اب دو چار دن کی بات ہے۔ ابا جی بھی واپس چلے جائیں گے۔ چاچاجی کو اسپتال سے چھٹی ملے گی تو وہ اور چاچی یہاں آجائیں گے اور ہم اپنے گھر میں... گڈ نائٹ۔'' اس نے لندن اسٹائل میں پھر شیما کو کس کیا۔

اب اسے اجازت جو مل چکی تھی۔

نکاح کی تقریب میں احسن کے دو ساتھی شریک ہوئے۔ دو پاکستانی ڈاکٹر۔ ان میں سے ایک کی ولایتی بیوی تھی مگر خوش مزاج تھی۔ دوسرا بار بار آہیں بھرتا تھا کہ اس نے شیما کو پہلے دیکھا ہوتا تو احسن کو قتل کر دیتا۔ اسی اپارٹمنٹ سے ایک انڈین جوڑے کو بھی مدعو کیا تھا۔ قریب کے ایک کمیونٹی سینٹر کی مسجد سے آنے والا نکاح خواں بھی نوجوان تھا۔ شیما خاموشی سے آنسو پیتی رہی۔ اس کی شادی ہو رہی تھی اور وہ تقریب میں تنہا تھی اور اجنبی تھی۔ اس کا باپ آئی سی یو میں لیٹا ہوا تھا اور ماں نے اصرار کے باوجود آنے سے انکار کر دیا تھا۔

نکاح سے پہلے ہی احسن نے شادی کی رجسٹریشن کی درخواست دے رکھی تھی۔ دو گواہوں کے ساتھ وہ آج رجسٹرار کے آفس پہنچی۔ احسن نے اسے تمام طریقۂ کار سمجھا دیا تھا۔ وہ پھر بھی نروس تھی۔ لیکن وہاں یہ معمول کی دفتری کارروائی تھی جو دس منٹ میں ختم ہوگئی۔ اب وہ قانونی طور پر بھی احسن کی بیوی تھی۔ شیما خود کو بادلوں سے اوپر اڑتا محسوس کر رہی تھی۔ اب وہ لندن میں رہتی تھی۔ ایک ڈاکٹر کی بیوی تھی۔ اسے بہت کچھ یاد آتا تھا۔ اپنا دو کمروں کا چھوٹا سا مکان جو ناجائز تعمیرات میں شمار ہوتا تھا۔ اپنی گلی اور وہ محلہ... وہ سڑک جس پر کباڑی قبضہ جمائے بیٹھے تھے۔ وہ گندگی اور لاقانونیت، راہ چلنے والے ہر شخص کے لیے کسی انجانے خوف کا احساس کہ نہ جانے کب اور کہاں سے کوئی اس کو لوٹنے آجائے گا۔ اس کے نصیب کی گولی دل میں اتر جائے گی۔ فساد اور ہڑتالیں اور خوف کا آسیب۔ نوجوان جائز اور ناجائز طریقے سے برطانیہ، امریکا اور آسٹریلیا جانے کا ضرور سوچتے تھے لیکن وہ تو خدا سے دعا بھی نہیں مانگ سکتی تھی کہ خداوند... تیری قدرت میں کیا نہیں، بس مجھے لندن پہنچا دے۔ مگر وہ بھی کیسا بے نیاز ہے، بن مانگے ہی دے دیتا ہے۔

☆☆☆

شادی کے چوتھے دن وہ اپنی ماں کے ساتھ تھی۔ احسن کا باپ تو نکاح کے بعد دوسرے دن ہی امریکا لوٹ گیا تھا۔ ماں تیسرے چوتھے دن گھر آکے نہا دھو لیتی تھی اور

کپڑے بدل کے واپس چلی جاتی تھی۔ اسپتال کے کمرے میں کسی کو مقررہ وقت کے علاوہ جانے کی اجازت بھی نہ تھی۔ وہ ویٹنگ روم میں بیٹھ بیٹھ کے تھک جاتی تھی تو باہر کا چکر لگاتی تھی یا باغ کی کسی بینچ پر جا بیٹھتی تھی۔ اس پر کسی کے سمجھانے کا اثر نہیں ہوتا تھا۔ آپریشن سے پہلے وہ رات کو فلیٹ میں آ کے سو جاتی تھی مگر اب اس کا خوف ایک پاگل پن بن گیا تھا۔ وہ رات بھی ویٹنگ روم میں گزارتی تھی اور کئی بار ایسا ہوا کہ وہ بیٹھے بیٹھے سو گئی یا گر گئی۔ اسپتال کا عملہ اسے نکال سکتا تھا مگر ان میں کچھ انسانیت کی رمق باقی تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ اس عورت کے پاس واقعی نہ کوئی ٹھہرنے کی جگہ ہے نہ ہوٹل میں قیام کی گنجائش۔

شیما نے پھر اسے سمجھانا چاہا۔ ’’دیکھو ماں، ابا کا آپریشن کامیاب رہا۔ اب دو چار دن میں گھر آ جائے گا۔‘‘

’’پھر میں بھی گھر آ جاؤں گی۔‘‘ وہ آہستہ سے بولی۔

شیما نے خفگی سے کہا۔ ’’نہیں، پھر تم بیمار پڑ جاؤ گی۔ یہ کیا پاگل پن ہے۔ ذرا اپنی حالت دیکھو کیا ہو رہی ہے۔‘‘

’’کچھ نہیں ہو رہا ہے مجھے شیما۔‘‘ وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔

’’تم برسوں کی بیمار لگتی ہو۔‘‘

اس کی حلقوں میں دھنسی ہوئی بے نور آنکھیں پرانی شکستہ قبروں جیسی تاریک اور بے جان تھیں جو کبھی سنگ مرمر کی لوح اور بناوٹ رکھتی ہوں۔ شیما کو یاد تھا کہ اب سے دس سال پہلے بھی وہ اپنی عمر سے دس سال کم لگتی تھی اور اس کے ساتھ کھڑی ہوئی شیما کی بڑی بہن نظر آتی تھی مگر پھر پے در پے ہونے والے جذباتی صدموں نے اسے اندر سے بیمار کر دیا۔ ایک بیٹے سے جدائی کا غم وہ سہار گئی مگر دوسرے کا صدمہ اسے یوں لے کے بیٹھ گیا جیسے زلزلے میں کھڑی رہنے والی دیوار بعد میں آنے والے خفیف سے صدمے سے زمیں بوس ہو جائے۔

شیما کیسے اندازہ کر سکتی تھی کہ عورت کیسا محسوس کرتی ہے جب ایک ایک کر کے زندہ رہنے کے سارے بہانے ختم ہوتے جائیں۔ خوف اور اندیشوں کے بڑھتے ہوئے تاریک سایوں میں امید کی ایک روشن کرن بھی بجھتی نظر آئے۔ اس نے ایک وجود کو زندگی دی تھی مگر اسی کرۂ ارض پر کہیں موجود ہونے کے باوجود اتنا ہی اجنبی ہو جتنا لندن کی سڑک پر پھرنے والا کوئی بھی راہ گیر... وہ تو یہ بھی سوچتی ہو گی کہ انہی میں کہیں وہ نظر آئے اور پہچانا نہ جائے۔ دوسرے کو زندگی کے احساس سے خارج کر دینے کے بعد اب اس کے لیے جینے کا کوئی بہانہ تھا تو وہ اس کا جیون ساتھی تھا۔ اب تو شیما بھی پرائی ہو گئی تھی۔ اس نے اپنا جیون ساتھی اور زندگی کا مقصد سب الگ کر لیا تھا۔ ایسے میں یہ خوف بڑا سوہانِ روح تھا کہ کمال دین نہ رہا تو وہ کہاں رہے گی اور کیسے... اور یہ کہ کیوں رہے گی؟

ماں کا ہر وقت اسپتال میں شوہر کے قریب رہنا بے فائدہ تھا لیکن وہ کمال دین سے دوری کو محسوس کرتی تھی۔ اسے نہ کسی چیز کی ضرورت تھی نہ کسی تکلیف کا احساس تھا۔ شیما نے طے کیا کہ وہ احسن سے کہہ کے ماں کا بھی مکمل چیک اپ کرائے گی۔ اور ضروری ہوا تو علاج بھی۔ امید یہ تھی کہ اگلے ہفتے خود کمال دین کو بھی اسپتال سے چھٹی مل جائے گی۔ شیما کے لیے خود شادی کر کے یہاں بس جانا اور ماں باپ کو اکیلے رہنے کے لیے پاکستان بھیج دینے کا کوئی تصور نہ تھا۔ یہ تو احسن کی اور تایا جی کی یقین دہانی تھی اور ایک جذباتی دباؤ تھا جس کے تحت اسے فوری طور پر نکاح اور شادی کا فیصلہ قبول کرنا پڑا۔ ابھی تک اسے یقین تھا کہ ماں باپ بھی اس کے قریب ہی رہیں گے۔ لیکن بفرضِ محال ایسا نہ ہو سکا تو؟... یہ خیال ہی شیما کے قدم اکھاڑ دیتا تھا۔

اسی شام کمال دین جو اطمینان بخش طریقے پر صحت یابی کی طرف جا رہا تھا، اچانک مر گیا۔ پاکستان ہوتا تو لواحقین فرطِ جذبات میں ہنگامہ کرتے مگر یہاں یہ سب ناممکن تھا۔ شیما خود ان تجربہ کار قابل ڈاکٹروں سے کیا بحث کرتی جو کمال دین کی صحت یابی کے عمل میں اول تا آخر شریک تھے۔ وہ اپنا کام نیک نیتی اور تندہی سے کر رہے تھے۔ بے یقینی کا غیر متوقع عنصر تمام میڈیکل سائنس کی کرشمہ سازی میں موجود تھا۔

ایک قدرے عمر رسیدہ ڈاکٹر نے اسے روتے دیکھ کر نرمی سے کہا۔ ’’یہ خدائی فیصلے ہیں۔ وہ اڑنے والا جہاز ہو یا ٹریک پر دوڑتی ٹرین... کبھی اچانک غیر متوقع اور ناقابلِ تصور لمحہ آ جاتا ہے۔ ٹرین الٹ جاتی ہے جہاز کریش ہو جاتا ہے۔ انسان کے جسم کی مشینری تو زیادہ کمپلیکس ہے۔‘‘

دوسرے ڈاکٹر نے بات کو مختصر کیا۔ ’’ہم دیکھیں گے کیا ہوا اور تمہیں بتا دیں گے اگر تم جاننا چاہو گی۔ اگرچہ وہ بہت پیچیدہ اور ٹیکنیکل رپورٹ ہو گی۔‘‘

شیما کے لیے سب بیکار تھا۔ کہانی دو لفظوں کی تھی۔ ڈاکٹروں نے شفا کی کوشش کی اور ناکام ہو گئے۔ اسپتال میں زندگی اور موت کی یہ آنکھ مچولی دن رات جاری رہتی ہے۔ شیما کے لیے بھی یہی حادثہ تھا جس کے بارے میں وہ

سوچتے ہوئے بھی ڈرتی تھی۔

احسن نے اسے روک دیا تھا کہ فی الحال ماں کو کچھ نہ بتائے۔ ''پہلے ہم سوچ لیں اور طے کرلیں کہ جب اسپتال والے ڈیڈ باڈی ہمارے حوالے کریں گے تو ہم کیا کریں گے۔''

سکون آور دوا کے باوجود وہ کانپ رہی تھی۔ ''وہی جو سب کرتے ہیں، تدفین۔''

''اگر تمہاری ماں نے کہا کہ میں تو میت لے کر پاکستان جاؤں گی... پھر؟''

''پھر یہی کرنا پڑے گا۔''

''اس میں بہت سے قانونی مرحلے آئیں گے۔ خیر ان سے میں نمٹ لوں گا۔ اسپتال سے باڈی انٹرنیشنل فلائٹ کے لیے باکس میں بند کر کے دی جائے گی پھر کارگو والوں سے بکنگ لینی ہوگی۔ تمہاری ماں ساتھ جائے گی۔''

''وہ اکیلی تو نہیں جائیں گی۔ ہم بھی ساتھ جائیں گے اور تمہاری دیکھ بھال کی ضرورت ماں کو راستے میں بھی ہو گی۔''

احسن نے کہا۔ ''شیما! اس وقت اسپتال میں ایمرجنسی ہے۔''

وہ چلانے لگی۔ ''میں یہ سب نہیں جانتی۔''

''آہستہ آہستہ...'' احسن نے اسے چمکارا۔ ''دیکھو ایک پرابلم ہے جو ہم مل کے حل کریں گے۔ میں تمہارا ساتھ دوں گا خواہ مجھے نوکری چھوڑنی پڑے لیکن تمہاری ماں سفر کے قابل نہیں ہے۔''

''پھر؟ کیا ہم ڈیڈ باڈی کو کچھ عرصہ کولڈ اسٹوریج میں رکھ سکتے ہیں؟''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''ویزے پر آنے والوں کو یہ سہولت نہیں ملتی۔ ان کو فوراً واپس ان کے ملک بھیجنا ضروری ہے۔''

''احسن مجھے مت ڈراؤ، ماں کو راستے میں کچھ ہو گیا... پھر؟''

احسن نے کہا۔ ''اسی لیے ایک تجویز یہ ہے کہ چاچاجی کی تدفین یہیں کردی جائے۔ وہاں اب کون ہے تمہارا جس کے لیے اتنا تردد کیا جائے۔ چاچی کو بعد میں یہیں رہنا ہے۔ یادہ جائیں اور شوہر کو دفن کرکے آئیں۔''

''شاید پاکستان میں تدفین کے بعد ماں نہ آئے، وہ میرے لیے مسئلہ ہوگا۔''

''گویا تم اتفاق کرتی ہو مجھ سے کہ انہیں یہیں دفنا دیا جائے؟''

## آٹے کی بوری

مجسٹریٹ ملزم سے: ''تم نے آٹے کی ایک بوری کیوں اٹھائی؟''

ملزم: ''جناب میں ایک بوری سے زیادہ اٹھا نہیں سکتا تھا۔''

عبدالجبار رومی انصاری، لاہور

شیما نے کہا۔ ''یہی بہتر ہے۔ اس طرح کبھی میں بھی جاسکوں گی ان کی قبر پر...''

اصل آزمائش کا مرحلہ شیما کی ماں کو بتانے کا تھا مگر انہیں بڑی حیرانی ہوئی جب یہ خبر سن کے اس کا کوئی خطرناک رَدِّعمل سامنے نہیں آیا۔ وہ کچھ دیر خلا میں دیکھتی رہی اور پھر بولی۔ ''کمالا مر گیا۔ مجھے پتا تھا اس نے مرجانا ہے۔''

خاموشی کے ایک مختصر وقفے کے بعد احسن بولا۔ ''چاچی! آپ نے تو اب ہمارے ساتھ ہی رہنا ہے۔ اس لیے ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ چاچاجی کی تدفین یہیں مسلمانوں کے قبرستان میں کردی جائے۔''

وہ ایک دم بگڑ گئی۔ ''لو، تم کون ہوتے ہو یہ فیصلہ کرنے والے، کمالے نے کہا تھا کہ وہ مرجائے تو اسے لاہور مزنگ والے قبرستان لے جانا... وہاں اس کا باپ اور دادا بھی دفن ہیں۔''

وہ رو رہی تھی اور نہ چیخ پکار کر رہی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے اسے سب معلوم تھا کیا ہونے والا ہے اور اس کو کیا کرنا ہے۔ اب بحث سے کچھ حاصل تھا نہ تاخیر سے۔ احسن نے بڑی دوڑ بھاگ کی اور سارے مراحل طے کرلیے۔

تیسرے دن وہ واپس پاکستان جارہی تھی تو اسے باہر کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ بس ایک بیکراں تنہائی کا خلا تھا جس میں زندہ آنے والا کمال دین لکڑی کے صندوق میں بند عام مسافروں سے الگ کولڈ اسٹوریج میں رکھا ہوا تھا۔ اس کی جگہ احسن نے لے لی تھی۔

لاہور میں کمال دین کی مزنگ کے قبرستان میں تدفین بھی ایک میکانکی عمل تھا۔ جس میں جذبات کا دخل نہ تھا۔ ائرپورٹ سے وہ ایک ائرکنڈیشنڈ ایمبولینس کے پیچھے چلنے والی ائرکنڈیشنڈ کار میں تھے۔ وہ کار باہر کھڑی رہی۔ صرف چار افراد نے تابوت نکالا اور سڑک کے دونوں طرف پھیلے ہوئے قبرستان کی ایک دیوار میں بنے راستے سے اندر لے

READING Section
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN

گئے۔ شیما نے کار میں سے ''مزار غازی علم الدین شہید'' کا چھوٹا سا بورڈ اور لہرانے والا جھنڈا دیکھا۔ کسی زندہ لاش کی طرح اس کی ماں اپنے سامنے خلا میں گھورتی رہی۔ سارا راستہ اس نے کچھ بھی کھایا پیا نہیں تھا اور نہ کچھ بولی تھی۔

شیما کے دماغ میں بے ترتیب واقعات کی ایک فلم چل رہی تھی۔ اس کی زندگی میں جو کچھ ہو رہا تھا اس نے پہلے کسی کی زندگی میں ہوتا نہیں دیکھا تھا۔ حالانکہ اتنی بڑی دنیا میں کیا نہیں ہوتا۔ اس کی نظر میں وہ دن اور وہ منظر ٹھہر جاتا تھا جب اس نے باپ کو اپنے فیصلے سے آگاہ کیا تھا کہ وہ حامد سے شادی کرنا چاہتی ہے اور وہ جیسے اسی وقت کا منتظر تھا کہ اجازت دے اور اپنی زندگی کی بساط لپیٹ دے۔ بعد میں جو ہوتا رہا، شیما کی مرضی اس میں شامل نہ تھی۔ اس کی تقدیر کے فیصلے دوسروں نے اپنے ہاتھ میں لے لیے تھے۔ علاج کے لیے انڈیا جانے کا، گھر بیچنے کا، پھر تایا جی کا فون آنے اور ان کے لندن میں تمام انتظامات ہونے کا، اس کے بعد احسن سے ملنے اور شادی تک اور اب کمال دین کی لاہور میں ایسی تدفین تک... شیما تو اپنے تصور میں بھی ایسا سوچ سکتی تھی نہ کر سکتی تھی۔ اس نے گلی محلے میں متعدد جنازے اٹھتے دیکھے تھے۔ سوگواروں کے سوم، چہلم دیکھے تھے۔ ایک وہ تھی اور اس کی ماں کہ قبرستان کے باہر ایک ائرکنڈیشنڈ کار میں بیٹھی تھیں جبکہ اندر کہیں کمال دین کو چار افراد جس میں تین کرائے کے اجنبی تھے۔ زمین میں دبا رہے تھے۔ تدفین کوئی ایسی ہوتی ہے؟ معلوم نہیں احسن کو نماز جنازہ کا خیال آیا کہ نہیں۔ کیا کوئی تدفین کے بعد دعائے مغفرت کرے گا؟ قبر پر پھول ڈالے گا۔ پچاس ساٹھ سال قبل لاہور سے فکرِ معاش میں کراچی جانے والا کمال دین واپس لوٹ آیا تھا۔ اس کے باپ دادا کے علاوہ اس کو یہاں خوش آمدید کہنے والے نہ جانے کتنے ہوں گے۔

ایک طرف سے تھکن سے بے حال احسن نمودار ہوا اور گاڑی کی اگلی سیٹ پر گر گیا۔ اس نے ٹیکسی کیب کو کسی ہوٹل کا نام بتایا۔ ٹیکسی خاموشی سے آگے بڑھی۔ کمال دین پیچھے رہ گیا۔

''احسن تم نے نماز جنازہ کا بندوبست کیا تھا؟'' شیما کی ماں نے پوچھا۔

''ہاں، اندر مسجد ہے۔ فاتحہ خوانی بھی ہو گئی تھی۔ ظہر کی نماز میں کچھ لوگ شریک تھے، وہ آ گئے تھے۔''

شیما خاموشی سے روتی رہی۔ اس کی ماں زندہ لاش کی طرح پڑی اپنی سوالیہ نظریں اِدھر اُدھر گھماتی رہی۔ یہ سب کیا ہو رہا ہے اور کیوں ہو رہا ہے آخر؟ کوئی مجھے بتائے گا کہ اس کے بعد کیا ہونے والا ہے۔ وہ ایک دم ہنس پڑی۔ احسن چونکا اور اس نے گاڑی کو ایک کیمسٹ کی دکان کے سامنے روک لیا۔ وہ واپس آیا تو اس کے پاس ایک سرنج تھی اور ایک انجکشن... شیما سے پوچھے بغیر اس نے مضبوطی سے چاچی کا بازو پکڑا اور اس میں انجکشن کی سوئی اتار دی۔ چاچی اس وقت بھی ہنس رہی تھی۔

انہوں نے ہوٹل میں دو کمرے لیے تھے۔ ایک ڈبل اور ایک سنگل۔ ڈبل میں ماں کے ساتھ رات بھر شیما رہی۔ وہ خود اتنی تھکی ہوئی اور صدمے سے بدحال تھی کہ رات کا کھانا کھاتے ہی سو گئی۔ باپ کی موت کے بعد سے اب تک اس نے سخت ذہنی اذیت جھیلی تھی لیکن... درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا۔ بالآخر اس نے صورتِ حال کو قبول کر لیا تھا۔ باپ کی موت کے بارے میں پہلے تشویش تھی۔ پھر علاج کی تبدیلی ہوئی تو شک اور خوف کا عنصر اس میں ہمیشہ شامل رہا۔ لندن میں ڈاکٹر زیادہ بات نہیں کرتے تھے اور احسن خود ڈاکٹر تھا۔ اس نے کبھی حامد کے سفاک لہجے میں اس کی حوصلہ شکنی نہیں کی تھی۔ خواہ جانتا وہ بھی ابتدا سے ہو کہ ایسے کیس میں اور اس مرحلے میں کیا ہو سکتا ہے اور کیا نہیں ہو سکتا۔ خوف کا آخری مرحلہ گزر جانے کے بعد ڈرنے کو کیا رہ گیا تھا۔

شیما نے حقائق سے سمجھوتا کر لیا۔ یہی صورتِ حال اگر انڈیا میں پیش آتی اور ان کے ساتھ حامد ہی ہوتا تو کتنا برا ہوتا۔ اب کم سے کم وہ بے سہارا نہیں تھی۔ اس کے سامنے وہی مستقبل تھا جس کی آرزو اس کے باپ نے بہت پہلے کی تھی۔ مرنے سے پہلے وہ ایک مطمئن شخص تھا کہ اس کی بیٹی اپنوں میں ہے۔ اور اول تا آخر احسن نے رفاقت کا حق ادا کر دیا تھا۔ فکر اسے تھی تو صرف ماں کی... وہ صبح اٹھی تو اس نے ضد شروع کی۔ ''مجھے اپنے گھر جانا ہے۔ یہاں میرا کون ہے؟''

ناشتا کرتے ہوئے احسن نے اس کی بات سنی۔ ''ہماری بکنگ اسلام آباد سے ہے۔''

شیما نے کہا۔ ''فلائٹ جائے گی تو کراچی سے۔ ہم وہاں رک سکتے ہیں۔''

احسن نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میں نے جاب چھوڑنے کی دھمکی دے کر چار دن کی چھٹی لی تھی۔ مجھے ہر حال میں کل جوائن کرنا ہے۔''

''اچھا تو تم جاؤ۔ میں تاریخ آگے بڑھوا لیتی ہوں،

ایک ہفتے کے لیے۔''

اس نے کچھ دیر سوچا اور پھر سر ہلا دیا۔ ''او کے، تم کراچی سے امارات کی فلائٹ بھی لے سکتی ہو۔ ٹریول ایجنٹ سب انتظام کر دے گا۔ اچھا ہے چاچی کو ایک ہفتے کا بریک مل جائے گا۔ ابھی ان کی حالت سفر کے قابل نہیں تھی۔

☆☆☆

اپنے گھر پہنچ کے خود شیما کو ایک پُرآسیب اجنبیت کے احساس نے گھیر لیا۔ یہ گھر جہاں اس نے اپنا بچپن گزارا تھا اور جس سے گزری ہوئی تمام یادیں وابستہ تھیں اب اسے کاٹنے کو دوڑتا تھا۔ کمال دین کے انتقال کی خبر پھیلی تو محلے کی عورتوں نے آنا شروع کیا۔ شیما کی ماں کے دماغ پر اثر تو لندن میں ہی ہو چکا تھا جب اس نے شوہر کی بیماری اور پھر موت کو برداشت کرنے کی ناکام کوشش کی تھی۔ اب اس کا اثر بڑھتا جا رہا تھا جو شیما کے لیے بڑی تشویش کی بات تھی۔

اچانک اس کے ذہن نے پلٹا کھایا اور اس نے شوہر کی موت کی حقیقت کو جھٹلانا شروع کر دیا۔ اس نے گھر آنے والی عورتوں سے لڑنا شروع کر دیا۔ ''کون بکواس کرتا ہے کمالا مر گیا۔ وہ تو کام پر گیا ہوا ہے۔'' وہ ہر ایک سے کہتی اور پھر انہیں کوستی کہ برا چاہنے والوں کا بیڑا غرق ہو۔ اسے بیوہ بنانے والی خود بیوہ ہوں۔ اس کی ذہنی کیفیت کو سب ہی سمجھتے تھے۔ احسن کی دی ہوئی دوائیں اپنا اثر کھو رہی تھیں۔ وہ تیسرے دن ماں کو بہلا پھسلا کے ایک اچھے نیورو فزیشن کے پاس لے گئی۔ ساری بات سن کے وہ بھی دوائیں ہی دے سکتا تھا۔ اس کی حالت ایسی بہرحال نہ تھی کہ اسپتال یا پاگل خانے میں داخل کرانے کا مشورہ دیا جائے۔

شیما کے پاس احسن کا فون ہر رات آتا تھا۔ اس صورتِ حال سے وہ بھی پریشان تھا۔ ''آخر کب تک ایسے رہو گی تم وہاں، بہتر ہے ماں کو ساتھ ہی لے آؤ۔''

''کیسے لے آؤں احسن، ایک تو ان کی حالت ایسی نہیں... دوسرے شاید ان کو پھر ویزا نہ ملے۔ یہاں کوئی ہے نہیں جس کے آسرے پر ماں کو چھوڑوں۔'' شیما نے ماں کی ذہنی کیفیت بتائی۔

''میرا خیال ہے انہیں وہاں لے جانا ہی غلطی تھی۔ خیر، اب کچھ تو کرنا ہی ہوگا۔ میری مانو تو ان کے لیے دوبارہ ویزا لو، مکان کو ٹھکانے لگا دو اور آ جاؤ۔ نہ وہاں تم اکیلی رہ سکتی ہو نہ یہاں تمہارے بغیر میں...'' احسن نے کہا۔

شیما کی پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔ اس نے ڈاکٹر کے کہنے پر ماں کے گلے میں ایک نیکلس کے ساتھ جو وہ ہر وقت پہنے رہتی تھی ایک پلاسٹک کوٹنگ والا کارڈ لگا دیا تھا جو اس کی گردن کے پیچھے رہتا تھا۔ اس پر شیما کا نمبر بھی تھا اور لندن میں احسن کا بھی۔ یہ احتیاط اس لیے ضروری تھی کہ کہیں وہ دماغی رو بہک جانے سے باہر نکل جائے تو بھٹکتی نہ پھرے۔ یہ صرف احتیاط تھی۔ شیما نہیں سمجھتی تھی کہ اس کی ضرورت کبھی پیش آئے گی۔

شیما کی ماں کے لیے دوائیں کوئی علاج ثابت نہیں ہو رہی تھیں۔ جب تک ان کا اثر باقی رہتا، وہ چپ چاپ بیٹھی رہتی تھی پھر بولنا شروع کر دیتی تھی۔ وہ فرض کر لیتی تھی کہ کمال دین زندہ ہے اور اس سے باتیں کرتی تھی یا شیما سے کہتی تھی کہ وہ کھانا بنانے میں دیر کیوں کر رہی ہے۔ اس کا باپ آنے والا ہے اور وہ سارا دن کا بھوکا ہوتا ہے۔ کسی خودکار طریقے پر اس کے حافظے سے لندن جانے آنے کا سارا واقعہ یوں صاف ہوا تھا جیسے پیش ہی نہیں آیا تھا۔ ڈاکٹر اسے شارٹ ٹرم ڈمینشیا کہتے تھے۔ لانگ ٹرم میں تین ماہ سے پہلے کی باتیں بھول جاتی تھیں۔

تیسرے دن صبح کے وقت شیما نے ماں کے بیڈ کو خالی پایا۔ اس نے آواز دی اور پھر اٹھ کے باہر دیکھا۔ مکان کی کل کائنات دو ہی کمرے تھے۔ وہ دوسرے کمرے میں بھی نہیں تھی جو پہلے اس کا اور کمال دین کا تھا۔ صحن کا دروازہ کھلا دیکھ کے شیما کا دل ڈوبنے لگا۔ اس نے گلی میں دیکھا۔ پاس پڑوس سے پوچھا اور سمجھ گئی کہ ماں رات کے کسی وقت گھر سے نکل گئی ہوگی۔ اتنے بڑے شہر میں اس کا کوئی ٹھکانا ہوتا تو شیما وہاں سے پوچھتی۔ وہ سیدھی پولیس اسٹیشن گئی۔ تھانے دار کی عدم موجودی میں ایک محرر ہی تھانے دار بنا اونگھ رہا تھا۔

شیما کے سوال پر وہ ناراض ہونے لگا۔ ''لو جی تھانے دار صاحب کیا میرے ماتحت ہیں کہ مجھے بتا کے جاتے۔ سارے علاقے کے بادشاہ ہیں، گشت پر نکلے ہیں۔''

شیما نے سخت لہجے میں کہا۔ ''اور تم موجود ہو تو سو رہے ہو۔''

''فالتو بات مت کرو بی بی، کون ہو تم؟ کسی حوالاتی کی کچھ لگتی ہو؟'' اس نے اندر تاریک گلی کی طرف نگاہ ڈالی جس کے آخر میں سلاخوں کے پیچھے انسانی سائے سے متحرک تھے۔

''گل زیب خان۔'' شیما نے وردی پر سے اس کا

نام پڑھ کے کہا۔ ’’میں لندن کے ڈاکٹر احسن جمال کی واقف ہوں، ایک برٹش نیشنل... مجھے اپنی والدہ کی گمشدگی کی رپورٹ لکھوانی ہے۔‘‘

وہ سیدھا ہو کے بیٹھ گیا۔ ’’خیر سے مجھے بتاؤ والدہ صاحبہ کب غائب ہوئیں۔ ان کی عمر اور دماغی حالت کیسی ہے؟‘‘

’’ان کی دماغی حالت اطمینان بخش نہیں ہے اور وہ صبح سے غائب ہیں۔‘‘

وہ بال پوائنٹ رکھ کے پھر نیم دراز ہو گیا۔ ’’صبح تو ابھی ہوئی ہے جی! آپ بھی کمال کرتے ہو، آجائیں گی گھوم پھر کے واپس۔‘‘

’’تمہارا کام صرف رپورٹ لکھنا ہے جو میں لکھواؤں اور تمہارا کام ہے ان کو تلاش کرنا۔‘‘

’’او میڈم جی، یہ ولایت نہیں، پاکستان ہے۔ ہم چوبیس گھنٹے سے پہلے تو گھر سے بھاگنے والی لڑکی کے اغوا کی رپورٹ نہیں لکھتے، کل آنا اگر والدہ صاحبہ لوٹ کے نہ آئیں۔ کل تک دیکھ لو خود انہیں کہ کہاں جا سکتی ہیں۔‘‘

سخت پریشانی اور مایوسی میں اس نے حامد کو فون کیا۔ ’’حامد میں شیما بول رہی ہوں۔‘‘

’’کہاں سے، لندن سے... مگر نمبر تو پاکستان والا تھا۔‘‘

’’میں واپس آگئی ہوں۔ ابا کا آپریشن ناکام ہو گیا۔ ان کی تدفین لاہور میں ہوئی۔‘‘

’’اوہ آئی ایم سوری۔ ابھی تو میں کورٹ پہنچا ہوں، شام کو آجاؤ۔‘‘

اس نے جلدی سے کہا۔ ’’حامد! میں تھانے گئی تھی ایک رپورٹ لکھوانے، امی لاپتا ہیں ان کے دماغ پر صدمے کا اثر ہے۔ مگر تھانے والے کہتے ہیں کہ چوبیس گھنٹے سے قبل گمشدگی کی رپورٹ نہیں لکھی جا سکتی۔‘‘

’’وہ ٹھیک کہتے ہیں، یہاں سگنل کمزور ہے۔ تمہاری آواز کٹ کٹ کے سنائی دے رہی ہے۔ ہاں قانون یہاں کا ایسا ہی ہے۔ ہیلو، ہیلو شیما...‘‘

’’ہاں میں سن رہی ہوں۔‘‘ شیما نے کہا مگر دوسری طرف سے ہیلو ہیلو کرنے والے حامد کی آواز بند ہو گئی۔

شیما تھانے کے سامنے والے فٹ پاتھ پر تنہا اور لاوارث کھڑی رہ گئی۔ اب وہ کیا کرے۔ کس سے مدد لے، اس نے مایوسی میں واپس گھر جانا ہی بہتر سمجھا۔ کیا پتا وہ کچھ دیر بھٹکنے کے بعد گھر لوٹ آئیں۔ اس نے ایک فضول سی امید کا سہارا لیا۔ کیونکہ یہاں کھڑے رہنا بھی لاحاصل ہی تھا۔ اس نے گھر پہنچ کے وقت دیکھا۔ لندن میں صبح کے چھ بجے ہوں گے۔ کوئی بات نہیں۔ اسے ایک گھنٹا پہلے جگایا جا سکتا ہے۔ یہ ایمرجنسی ہے۔ وہ مدد نہیں کر سکتا کم از کم اپنی بیوی کو تسلی تو دے سکتا ہے۔

دوسری طرف سے کسی عورت نے نیند کے خمار میں ڈوبی آواز میں کہا۔ ’’ہے... لو...‘‘

’’کون...؟ آپ کون ہیں۔ شاید مجھ سے غلط نمبر مل گیا۔ مجھے ڈاکٹر احسن سے بات کرنی تھی۔‘‘

’’نمبر ٹھیک ہے ہنی... لو بات کرو۔‘‘ وہ بولی اور شیما نے اس کی آواز سنی۔ ’’احسن... کال فار یو۔‘‘

ریسیور میں احسن سوتے سوتے بولا۔ ’’صبح صبح کون ہے۔ ٹال دینا تھا۔ ہیلو۔‘‘

’’احسن، میں شیما بول رہی ہوں... پاکستان سے۔‘‘

وہ مستعد ہو گیا۔ ’’ہاں شیما، خیریت ہے نا، صبح صبح یہ کال۔‘‘

’’احسن، امی لاپتا ہیں گھر سے نکل گئی ہیں رات کو۔ تم تو جانتے ہو ان کی ذہنی کیفیت۔ میں بہت پریشان ہوں۔‘‘

’’اوہ، سوری۔ پریشانی کی بات تو ہے، رپورٹ کی تم نے؟‘‘

’’میں گئی تھی مگر وہ چوبیس گھنٹے گزر جانے کے بعد گمشدگی تسلیم کرتے ہیں۔ سب کہتے ہیں جاننے والوں کے گھر دیکھو مگر ہمارا کون جاننے والا ہے یہاں۔ ابھی میں گھر پر انتظار کر رہی ہوں لیکن میرا خیال ہے کہ گھوم پھر کے اسپتال اور ایدھی ہوم وغیرہ میں دیکھوں... اور تصویر دے دوں... اپنے فون نمبر کے ساتھ۔‘‘

’’ہاں کچھ نہ کرنے سے کچھ کرنا اچھا ہے لیکن میری مانو تو لاہور جاؤ۔ میرا دل کہتا ہے وہ وہیں گئی ہوں گی۔ چاچا جی کی قبر پر۔‘‘

احسن کی بات شیما کے دل کو لگی۔ ’’یہ ہو سکتا ہے بلکہ یہی ہوا ہوگا۔ میں گھر کھلا چھوڑ کے کسی کو یہاں بٹھا جاتی ہوں اگر وہ آئیں جس کی امید کم ہے تو ان کو روک لے۔ سوری مجھے مزید دیر ہو گی واپسی میں۔‘‘

’’نو پرابلم، سوری کہ میں تمہاری مدد نہیں کر سکتا۔‘‘

’’احسن، یہ عورت کون تھی؟ جس نے فون ریسیو کیا؟‘‘

''وہ... صفائی کرنے والی، آج بہت صبح آ گئی۔ کہیں جانا تھا اسے۔''

''اس نے تمہاری کال کیوں ریسیو کی؟ اور پہلے تو کوئی میڈ نہیں دیکھی میں نے جب میں وہاں تھی؟''

''اب تم نہیں ہو تو یہ نیا گھر صاف رکھنا پڑتا ہے۔ اس کے لیے رکھی ہے۔ فون ذرا دور پڑا تھا اس لیے اس نے کال ریسیو کر کے مجھے دے دیا۔ اچھا، خدا حافظ۔''

شیما کے دل میں احسن کے جواب سے خلش اور بڑھ گئی۔ کسی ملازمہ کی کیا مجال کہ کسی دوسرے کی کال ریسیو کرے۔ وہ فون اٹھا کے ضرور دے سکتی تھی اور کام کرنے والی صبح چھ بجے چہ معنی دارد... کہیں جانا تھا تو نہ آتی کام کے لیے اور پھر اس کا لہجہ... نیند میں ڈوبا ہوا، شیما کے لیے یہ عذر گناہ بدتر از گناہ والی بات تھی۔ ضرور یہ کوئی سابق چہیتی ہوگی۔ گرل فرینڈز کے بارے میں شیما نے بھی بات نہیں کی تھی مگر لندن میں یہ کون سی انوکھی بات تھی۔ چار دن بھی صبر نہیں ہوا۔ کیا ایسے ہی ہوتے ہیں سب شوہر۔''

اس کے دل میں چھپا ہوا بے سکونی کا کانٹا موجود رہا جو اسے یاد دلاتا رہا کہ اب اسے واپس اپنے شوہر کے پاس پہنچنے میں تاخیر نہیں کرنی چاہیے۔ ورنہ وہ نظریۂ ضرورت کے تحت اپنی گرل فرینڈز یا کسی مہمان کو ہر شب بلاتا رہے گا اور اس سے بھی جھوٹ بولتا رہے گا۔ اسی نظریۂ ضرورت کے تحت... شیما دو مخالف دنیاؤں میں تقسیم ہو کے رہ گئی تھی اور کسی ایک کو چھوڑنا اس کے اختیار کی بات نہیں رہی تھی۔ اس نے وہ سارا دن چند سرکاری اسپتالوں اور ایدھی ہوم جیسے اداروں میں پھر کے گزارا۔ اس نے ہر جگہ کسی منتظم کو اپنی ماں کی تصویر کی ایک کاپی دی جس کے پیچھے اپنا فون نمبر تھا کہ وہ یہاں لائی جائے تو اسے مطلع کر دیا جائے۔ وہاں اتنی افراتفری اور بے حسی تھی کہ انہوں نے تصویر لے کر دراز میں ڈال دی اور شیما سے کسی ہمدردی کے بغیر ''اچھا جی'' کہہ دیا۔ ان کے نزدیک یہ کوئی افسوسناک سانحہ تھا تو شیما کے لیے۔ شہر میں ایک پاگل بڑھیا کی کیا اوقات تھی جہاں ہر روز جوان بیٹے اور شوہروں کے بوریوں میں سے بند لاشے ملنا ایک معمول تھا۔ کوئی آخر کس کس کے لیے دکھی ہو۔

وہ رات کی فلائٹ سے لاہور جا سکتی تھی مگر اس کے سامنے بہت سے سوالات اٹھ کھڑے ہوئے۔ یہ بھی ایک معاشرتی المیہ تھا کہ تمام معتبر حوالے رکھنے کے باوجود وہ کسی ہوٹل میں قیام کے لیے ایک کمرا نہیں حاصل کر سکتی تھی۔ شام کو وہ گھر کا چکر لگا کے احمد صاحب کی طرف چلی گئی۔ اسے صاف محسوس ہوا کہ حامد محض رسمی اخلاق برت رہا ہے۔ وہ بھی شاید احمد صاحب کی وجہ سے۔ شیما نے بھی اسے احسن سے شادی کے بارے میں نہ بتانا ہی بہتر سمجھا۔ فرصت ہوتے ہی احمد صاحب نے اسے بلا لیا۔

''بھئی شیما، کیسی ہو۔ واپس آ گئیں؟ تمہارے والد کیسے ہیں اب؟'' انہوں نے ایک ہی سانس میں پوچھا۔

شیما نے مختصراً انہیں سب بتا دیا اور چائے پیتی رہی۔

احمد صاحب کے شفیق چہرے پر دکھ واضح نظر آیا۔

''بھئی بہت افسوس ہوا مجھے۔ حقیقت ہے لیکن یہ خدائی فیصلے ہیں۔ اب تم لاہور جا رہی ہو، خدا کرے ماں تمہیں مل جائے لیکن نہ ملی تو کیا کرو گی تم؟''

''میں واپس چلی جاؤں گی سر... اپنے شوہر کے پاس۔''

وہ چونکے۔ ''شوہر... گویا شادی بھی کر لی تم نے لندن میں... کون ہے وہ؟''

''میرا کزن ہے سر، بچپن سے یہ منگنی طے تھی۔ وہ ایک اسپتال میں ڈاکٹر ہے۔ اس کی وجہ سے یہ ممکن ہوا تھا کہ میں ابا کو انڈیا کے اپالو اسپتال کے بجائے لندن لے جاؤں۔''

وہ کچھ دیر چپ رہے۔ ''چلو، جو ہوا سو اچھا ہوا۔ شادی تمہارا بھی ذاتی معاملہ تھا اور حامد کا بھی۔ لیکن یہ حیرانی ضرور تھی مجھے کہ حامد اس وقت مجھے ساتھ لے گیا تھا، اسے جلدی تھی۔ دنیا واقعی ہم جیسے بوڑھوں کو بہت تیز رفتار لگتی ہے۔ تم نے بھی دوسری جگہ شادی کر لی... اس نے بھی... یقیناً تم نے اپنا فائدہ دیکھا، اس نے اپنا۔ پرانے وقتوں کے قول و قرار اور عہد و پیمان محض جذباتی باتیں ہیں۔ نظریۂ ضرورت پر سب قربان ہو جاتا ہے۔ فائدہ زیادہ اہم ہے، خیر، کیسے آنا ہوا؟''

صاف نظر آتا تھا کہ وہ ان دونوں سے خوش نہیں جنہوں نے ان کی پرسٹیج کو سفارش کے طور پر استعمال کیا اور پھر ضائع کر دیا جیسے اس کی اہمیت ہی نہ تھی۔

''سر ایک تو اگر آپ پولیس کے کسی اعلیٰ افسر سے کہہ دیں تو وہ...''

''تو وہ حکم دیں اور سارا پولیس ڈپارٹمنٹ تمہاری ماں کی تلاش میں نکل کھڑا ہو۔ لڑکی یہ پاکستان ہے۔ میں جانتا ہوں وہ ہزار وعدے کریں گے مگر اپنی جگہ سے ہلنے والا کوئی نہیں۔''

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN

''دوسرے میں چاہتی تھی کہ اپنا گھر بیچ دوں۔ پہلے حامد کسی کو لایا تھا جو پندرہ میں خرید رہے تھے۔'' شیما نے کہا۔

''دیکھو، تمہارے آس پاس ہی کئی پراپرٹی ڈیلر ہوں گے' اخبار میں برائے فروخت کا اشتہار دو۔ وہ خود آئیں گے تمہارے پاس اور گاہک بھی لائیں گے۔ تم لاہور جا رہی ہو تو اشتہار میں فون پر لکھوا دیتا ہوں۔ تفصیلات بولو۔''

جب وہ ناپسندیدہ مہمان کی طرح احمد صاحب کے آفس سے نکلی تو رات ہو چکی تھی۔ اسے باہر پھرتے سارا دن ہو گیا تھا۔ گھر جانے سے پہلے اس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ وہ حامد سے ملے اور اسے بتا دے کہ اب وہ لندن کی اور برطانوی شہری کے منصب اعلیٰ پر فائز ہونے والی ہے اور اس کا شوہر کزن ہی نہیں ایک نامور سرجن بھی ہے۔ لیکن حامد کا کیبن خالی پڑا تھا۔ وہ شیما سے بچنے کے لیے بھاگ گیا تھا۔ تاہم شیما کو ذرا بھی شک نہ تھا کہ ایسا ہی فائدے کا سودا اس نے بھی کیا ہوگا۔ وہ گھاٹے کا سودا کرنے والا آدمی ہی نہیں تھا۔

شیما کو ابھی تنگ مالی پریشانی نہیں تھی۔ اس کے پاس واپسی کا اوپن ٹکٹ تھا اور احسن سے زیادہ تایا جی نے منہ دکھائی کی رسم میں اسے دس ہزار ڈالر دے دیے تھے۔ اس نے ہوائی جہاز سے جانے کا فیصلہ کیا۔ صبح معلوم کرنے پر پتا چلا کہ اس روز کی ہر فلائٹ بک ہے۔ سیٹ اگلے روز کی فلائٹ پر تھی۔ وہ ٹرین سے جاتی تب بھی اگلے دن ہی پہنچتی۔ اس نے دوسرے دن کی ریزرویشن لے لی۔

وہ سارا دن شیما کسی امید کے بغیر سرکاری اسپتالوں کے مردہ خانے اور ایدھی ہوم کے کولڈ اسٹوریج میں جھانکتی پھری جہاں ایک اعصاب شکن ماحول اور دہشت ناک منظر دیکھنے کے سوا کچھ حاصل نہ ہوا۔ اسے اپنے کھانے پینے کا ہوش نہ تھا۔ صرف احسن تھا جو لندن سے خود فون کر کے اسے ہدایت کرتا رہتا تھا کہ اپنا خیال رکھے۔ یہ نہ ہو وہ خود بھی بیمار یا نروس بریک ڈاؤن کا شکار ہو جائے۔

وہ شام کو لاہور پہنچی۔ لاہور اس کے لیے باپ دادا کی جنم بھومی ہونے کے باوجود اجنبی شہر تھا۔ آج جیسے گردش حالات نے اسے لندن پہنچایا تھا ایسے ہی نصف صدی قبل کمال دین کو کراچی پہنچا دیا تھا۔ اب اگر شیما کے دور پار کے چاچے مامے یا ان کی اولادیں کہیں تھیں تو اسے کسی کا پتا ٹھکانا معلوم نہ تھا۔ وہ تو کسی کے نام سے بھی واقف نہ تھی۔ اسے صرف ایک بات یاد رہی تھی۔ اس کے باپ کو تدفین کے لیے جس راستے سے قبرستان کے اندر لے جایا گیا تھا وہاں غازی علم الدین شہید کے مزار کا سائن بورڈ اور جھنڈے وغیرہ لگے ہوئے تھے۔ اسے تو کمال دین کی قبر کی لوکیشن کا بھی علم نہ تھا جس پر کوئی کتبہ نہیں لگایا گیا تھا۔

وہ غازی علم الدین شہید کے مزار کے ایک دروازے سے اندر جانے لگی تو ایک عمر رسیدہ سفید ریش شخص سر پر رومال لپیٹے نکل آیا۔ ''بابا جی، آپ اِدھر ہی ہوتے ہو؟'' شیما نے اسے روک لیا۔

بوڑھا رک گیا۔ 'آہو پتر، اس مزار کی حفاظت اللہ نے مجھے سونپ دی ہے، کیا کروں۔''

''مجھے اس قبرستان کے گورکن سے ملنا تھا۔''

''گورکن تو کئی ہیں، اتنا بڑا قبرستان ہے سڑک کے دونوں طرف۔''

''نہیں جی، ابھی کچھ دن پہلے ایک تدفین ہوئی تھی۔ لندن سے ایک تابوت آیا تھا۔ صرف چار بندے تھے جو اسے اٹھا کے اندر لائے تھے۔''

اس نے سوچ کے سر ہلایا۔ ''ہاں، ظہر کی نماز کا وقت تھا نا؟ میں بھی شریک تھا۔''

''آپ بتا سکتے ہیں وہ قبر کہاں ہے۔ اس پر کتبہ کوئی نہیں۔ وہ میرے والد کمال دین تھے۔''

اس نے غور سے شیما کو دیکھا۔ ''ویسے تو مشکل تھا... مگر... پرسوں ایک انوکھی بات ہوئی۔ اِدھر ایک جھلی آ گئی پتا نہیں کدھر سے گھومتی پھرتی۔''

شیما چلائی۔ ''وہ میری ماں تھی۔ اسی کو تلاش کرنے آئی ہوں میں کراچی سے۔''

اس نے حیرانی سے زیرِ لب دہرایا۔ کراچی سے؟ اچھا آ جا میرے ساتھ۔''

بڈھا شیما کو تقریباً سو گز دور لے گیا جہاں بہت سی نئی پرانی کچی پکی قبریں ساتھ ساتھ بنی ہوئی تھیں۔ اچانک ایک جگہ وہ ٹھہر گیا۔ ''یہ ہے اس بندے... تمہارے والد کی قبر۔''

''اور... وہ کہاں ہے میری ماں؟'' شیما نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔

بڈھے نے ساتھ بنی دوسری قبر کی طرف اشارہ کیا جس کی تازہ مٹی ابھی نم تھی۔ ''کل رات وہ مر گئی۔ پتا نہیں کس وقت، گورکن نے صبح دیکھا تو وہ اس قبر کے اوپر سر

رکھے سو رہی تھی۔ مگر وہ مر چکی تھی۔ پولیس لاش لے گئی تھی پوسٹ مارٹم کے لیے، ہم نے آج دوپہر دفن کر دیا۔‘‘

شیما بت بنی کھڑی تھی مگر اس کا وجود زلزلے کی زد میں تھا۔ آنسو خودبخود اس کی دونوں آنکھوں سے پھوٹ کے رخساروں پر بہہ رہے تھے۔

’’گورکن نے بھی بولا تھا۔ میں نے بھی کہا تھا اس سے کہ رات کو یہاں نہ رکے۔ اندر آجائے لیکن وہ تو لگتا تھا نہ سن رہی تھی نہ سمجھ رہی تھی۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ کپڑے میلے تھے۔ ہاں ایک نیکلس تھا اس کے گلے میں۔ وہ سونے کا لگتا تھا۔ وہ قبر کی مٹی کو ٹھیک کرتی رہی اور بولتی رہی۔ جیسے کسی زندہ آدمی سے باتیں کر رہی ہو۔ بالکل جھلی تھی وہ۔ اسے سمجھانا مشکل تھا۔ ہم نے سوچا کہ صبح اسے کہیں بھیج دیں گے۔ ایدھی ہوم یا دارالامان۔ ایسے قبرستان میں کون رہ سکتا ہے۔ رات کا مجھے پتا نہیں کہ گورکن نے اسے کھانے پینے کو کچھ دیا تھا یا نہیں۔ لیکن صبح وہ دونوں ہاتھ قبر کے اوپر رکھے اور سر کو مٹی پر لگائے سوتی نظر آئی۔‘‘

وہ خاموش ہو گیا اور کچھ دیر شیما کو ہچکیوں سے روتا دیکھتا رہا۔ شیما کا دل اس خیال سے خون ہو رہا تھا کہ وہ ایک دن پہلے پہنچ جاتی۔ اسے گزشتہ روز کسی فلائٹ پر سیٹ مل جاتی تو وہ ماں کو ساتھ لے جاتی۔ پہنچی تو وہ صحیح جگہ تھی مگر اس وقت جب نہ آنا ہی بہتر تھا۔ کم سے کم ماں کی اس کسمپرسی کی موت سے وہ بے خبر رہتی۔ مٹی کے ایک ڈھیر نے دل کا خون کرنے والے ایک منظر کی پوری فلم سی اس کے تصور میں چلا دی تھی۔

☆☆☆

ایک بار پھر وہ زمین آسمان کے درمیان بنی نظر نہ آنے والی سڑک جیسے راستے پر سے اڑتی ہوئی گزر رہی تھی۔ ہوائی جہاز، اس کے مسافر، عملہ، اوپر آسمان کی اور نیچے سمندر کی بیکراں وسعت سب وہی تھے۔ کوئی کیسے جان سکتا تھا کہ صرف دو ماہ قبل یہی لڑکی پہلی بار اس راستے سے گزری تھی تو اس کے پُرمسرت چہرے پر امید اور تجسس کے کیسے دمکتے ہوئے رنگ تھے اور آج وہ تنہا ہے تو اتنی افسردہ اور مضمحل کیوں ہے۔ اس کی وہ چاندنی جیسی مسکراہٹ کہاں کھو گئی ہے۔ اس کے رخساروں کے گلاب کیوں مرجھا گئے ہیں۔ وہ ایک معصوم شباب کی اولین دہلیز پر دستک دینے والی پُرامید لڑکی سے ایک دل شکستہ مایوس اور زندگی سے نالاں عورت کیسے بن گئی ہے۔ نہ کسی کو یہ جاننے کی فرصت تھی نہ ضرورت۔

شمائلہ نے تیس دن میں تیس برس کے جذباتی بحران گزار دیے تھے۔ سمندر میں کھڑی چٹان کی طرح جو مسلسل غضبناک لہروں کے تھپیڑ کھاتی رہتی ہے اور پتا بھی نہیں چلتا کہ اس کا وجود کسی ٹوٹ پھوٹ کے عمل سے گزر رہا ہے۔ کسی پریشانی یا بدحواسی کے بغیر وہ اپنے ٹرالی سوٹ کیس کو کھینچتی ہیتھرو ائرپورٹ کے سارے مرحلوں سے گزر گئی۔ جانتے بوجھتے اس نے احسن کو اپنی آمد کی تاریخ اور فلائٹ کے وقت سے آگاہ نہیں کیا تھا۔ اچانک پہنچ کے نہ وہ احسن کو حیران کرنا چاہتی تھی اور نہ اس کی خوشی کا اندازہ کرنا چاہتی تھی۔ وہ دیکھنا چاہتی تھی کہ شادی سے پہلے اور بعد والے احسن کے جذبات کی دنیا میں اس کی اور کسی گرل فرینڈ کی اہمیت کیا ہے۔ ایک بیوی اس کے لیے شریکِ حیات ہے یا محض ایک اور عورت۔ جس پر اسے شرعی اور قانونی بالادستی بھی حاصل ہے۔

اس نے پورے اعتماد کے ساتھ ٹیکسی لی اور اسے احسن کے فلیٹ کا پتا بتا دیا۔ اب وہ جانتی تھی کہ اسے تردد کرنے کی ضرورت نہیں۔ کیب اسے بحفاظت صحیح جگہ پہنچا دے گی۔ نہ کوئی اسے اغوا کر کے لے جائے گا نہ لوٹے گا اور نہ اس کو گھما پھرا کے چار گنا کرایہ وصول کرے گا۔ خوش مزاج نیگرو ڈرائیور نے اس کی درخواست پر سوٹ کیس بھی زینے کے راستے فرسٹ فلور پر پہنچایا۔ ایک چابی شیما کے پاس تھی۔ وہ دروازہ کھول کے اندر داخل ہوئی اور رک گئی۔

لاؤنج میں صوفے پر بیٹھ کے اور میز پر پاؤں پھیلا کے کوئی رسالہ دیکھنے والی چالیس پچاس سالہ دبلی پتلی عورت نے رسالہ رکھ دیا۔ ’’تم کون ہو؟ اندر کیسے آ گئیں؟‘‘

شیما نے اسے چابی دکھائی۔ ’’میں یہاں رہتی ہوں کیونکہ یہ میرے شوہر کا گھر ہے۔ یہ چابی اس کا ثبوت ہے۔‘‘

’’کیسی عجیب بات ہے کہ یہاں میں رہتی ہوں لیکن مجھے نہیں معلوم کہ یہاں احسن کی دوسری بیوی بھی رہتی ہے۔‘‘ وہ حیران ضرور تھی مگر پریشان یا برہم نہیں تھی۔

شیما اس کے سامنے بیٹھ گئی۔ ’’دیکھنے میں تو تم میری ساس لگتی ہو۔ احسن کی ماں۔‘‘

’’یہ تم انڈین لوگوں کا ڈھکوسلا ہے کہ شادی صرف ہم عمر لوگ کر سکتے ہیں۔ تم نے کب شادی کی اس سے۔۔۔ ابھی جب وہ انڈیا گیا تھا؟‘‘

’’میں پاکستان سے ہوں اور میری شادی لندن میں رجسٹرڈ ہے۔‘‘

وہ بے یقینی سے شیما کو دیکھتی رہی۔ ''مجھے معلوم ہے مسلمان دو بیویاں رکھتے ہیں۔ چار کی اجازت ہے انہیں مگر دوسری ان کے ملک میں ہی رہتی ہے۔ لندن میں یہ جرم ہے۔ اور تم سچ کہہ رہی ہو تو وہ جیل جائے گا۔''

''وہ ایک معزز ڈاکٹر ہے۔''

وہ ہنسی۔ ''اس سے تو کوئی فرق نہیں پڑسکتا۔ اس کے پاس کچھ نہیں بچے گا۔ اس کا یہ فلیٹ بھی مجھے مل جائے گا تم کہاں رہو گی اس کی فکر مت کرنا، اس کا دوسرا فلیٹ بھی ہے۔''

مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہوگئیں۔ شیما کا چھاپا کامیاب رہا تھا۔ اسے خیال ضرور آیا تھا کہ اگر اس کے بیڈ پر احسن کسی دوسری لڑکی کے ساتھ نظر آیا تو وہ کیا کرے گی؟ اور بہت سوچنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچی تھی کہ وہ کچھ نہیں کرسکتی۔ اس کی ساری کشتیاں وقت کے بے رحم ہاتھوں نے جلا دی ہیں۔ لندن نہ ہوا اپنے دیس کا معاملہ ہو تب بھی عورت کا تو کوئی گھر نہیں ہوتا۔ باپ کے گھر سے شوہر کے گھر اور اگر اس کے بعد قسمت میں ہو تو بیٹے کا گھر... شوہر کے گھر کی بات تو آج بھی وہی پتھر کی لکیر ہے کہ وہاں ڈولی جاتی ہے اور وہاں سے جنازہ ہی اٹھتا ہے۔

چنانچہ شیما نے کہا۔ ''تم یہ نہیں کہہ سکتیں کہ اس نے محبت کی وجہ سے تم سے شادی کی تھی۔''

اس نے سگریٹ کے کش کا دھواں اوپر چھوڑا۔ ''ظاہر ہے، اسے شہریت کے لیے کسی برطانوی نژاد عورت سے شادی کرنی تھی۔ وہ امریکا سے آیا تھا جہاں اس کے باپ کو ابھی شہریت نہیں ملی تھی۔''

شیما نے تلخی سے کہا۔ ''اس سے پہلے کتنے شوہر ہوئے تھے اس کاروبار میں۔''

''چھ... زیادہ ہوسکتے تھے لیکن میں محتاط تھی۔ زندگی سہولت سے گزر گئی۔''

''جب میں نے فون کیا تھا، تو ریسیو کرنے والی تم تھیں؟ ابھی ہفتہ بھر پہلے؟''

وہ کچھ حیران ہوئی۔ ''میں کل شام کو آئی ہوں۔ احسن ماہانہ اخراجات کی ادائیگی کے معاملے میں گڑبڑ کرتا ہے پھر مجھے یہاں رکنا پڑتا ہے۔ اگر وہ آج حساب کرے تو میں چلی جاؤں گی۔ تم اس سے کہہ سکتی ہو کہ رقم مجھے ارسال کردیا کرے۔ پھر مجھے یہاں آنے کی ضرورت کیا ہے۔ خوش رہیں سب... یہ سلسلہ چلتا رہے۔''

''ایسا نہیں ہوسکتا۔'' شیما نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''اس کی بیوی صرف میں رہوں گی۔ تمہارا اس پر کوئی اخلاقی حق نہیں۔'' شمائلہ مطمئن تھی کہ اس نے جذبات کے آتش فشاں کو پھٹنے نہیں دیا۔

''معاملہ قانونی ہے ڈیئر، اخلاقی نہیں۔ تم مجھے سمجھدار لگتی ہو۔''

''ہم اس کا کوئی حل نکال سکتے ہیں۔ وہ تمہیں ماہانہ کتنی رقم ادا کرتا ہے؟''

''تین سو پاؤنڈ... لیکن وہ مجھے چھوڑے گا تو اس کو یہ گھر مجھے دینا ہوگا اور اس کے علاوہ...''

''دیکھو، کیا نام ہے تمہارا... میں شیما ہوں۔''

اس نے کہا۔ ''میں جینی ہوں۔''

''جینی، اچھا ہو اگر تم مجھ سے سودا کرلو۔ میں اپنے فادر کو علاج کے لیے لائی تھی یہاں مگر ڈاکٹر اسے نہیں بچا سکے اور اسی صدمے سے میری ماں بھی مر گئی۔ میں ان دونوں کی آخری رسوم کے لیے پاکستان گئی تھی۔''

''آئی ایم سو سوری۔''

''تم یہ اپارٹمنٹ لے لو۔ اسے دینا ہی پڑے گا۔ اس کے بعد باہمی رضامندی سے الگ ہوجاؤ۔ قانونی طور پر۔ اس ماہانہ آمدنی کے بدلے میں تمہیں یکمشت ادائیگی کر سکتی ہوں۔ بس میں تم سے کچھ رعایت مانگتی ہوں۔''

وہ سوچ میں پڑ گئی۔ ''میرا خیال تھا کہ دس ہزار پاؤنڈ لوں گی۔ لیکن نہ جانے کیوں مجھے تم سے ہمدردی ہوگئی ہے۔ اگر تم مجھے اس کی آدھی رقم دے دو، تو کوئی قانونی مسئلہ پیدا نہیں ہوگا اور میں اسے چھوڑ دوں گی۔ وہ صرف تمہارا شوہر رہ جائے گا۔ اچھے موقع پر آئی ہو تم... کل ہی کوئی کہہ رہا تھا کہ ایک انڈین کو شہریت کے لیے شادی کرنی ہے، دیکھتی ہوں وہ کون ہے۔''

''دیٹ اِز گڈ، ابھی میں تم کو تین سو پاؤنڈ دے سکتی ہوں۔ تاکہ تم احسن کے آنے سے پہلے چلی جاؤ۔ باقی معاملات تم احسن کے ساتھ طے کرلو تو میں تمہیں پانچ ہزار پاؤنڈ بھی ادا کردوں گی۔''

وہ شیما کو دیکھتی رہی۔ ''میں کس طرح تم پر بھروسا کر سکتی ہوں۔''

''بھروسا تو تمہیں کرنا ہی ہوگا۔'' شیما نے سوٹ کیس میں سے تین سو پاؤنڈ نکال کے جینی کو پکڑا دیے۔

''او کے ڈیئر! اٹ اِز اے ڈیل...'' وہ اٹھی اور ایک بیگ کندھے پر لٹکا کے جانے کے لیے تیار ہوگئی۔

☆☆☆

زندگی کا وہ دن بہت پیچھے رہ گیا تھا جب شیما نے اس پیسے سے جو وہ ساتھ لے کر آئی تھی، اپنے لیے بہت کچھ خریدا تھا۔ ایک اچھا شوہر، ازدواجی زندگی کا اعتماد۔ سیکیورٹی کا یقین، خلافِ توقع اس کا وہ گھر جس کے لیے حامد بڑی کوشش سے پندرہ لاکھ کا گاہک احسان کر کے لایا تھا، اس سے دگنی قیمت پر کھڑے کھڑے بک گیا تھا۔ اس میں کوئی عدالتی اور قانونی چکر نہیں تھے۔ خریداروں نے اس بات کو یقینی بنایا تھا کہ مکان کا شیما کے علاوہ اور کوئی وارث نہیں ہے۔ نہ حقِ وراثت کا عدالتی سرٹیفکیٹ... نہ تصدیق... نہ عدالتی کارروائی، بس ایک سیل ڈیڈ بنی تھی جس کی رجسٹریشن کرانے کی ذمے داری بھی خریدار نے لے لی تھی۔ اور رقم ہنڈی کے ذریعے اس کے سامنے رکھ دی گئی تھی۔ اکاؤنٹ میں جمع کرانے کے بجائے اس نے تمام رقم ہنڈی کے ذریعے لندن بھجوا دی تھی اور جہاز میں بیٹھ کے پیا گھر سدھار گئی تھی۔ حامد کے بارے میں اسے معلوم ہو گیا تھا کہ بن گیا رقیب آخر تھا جو رازداں اپنا... جس غزالہ کی معرفت وہ حامد سے ملی تھی، اسی نے حامد سے شادی کر لی تھی۔ اس کے دولت مند باپ نے کالج کے لیے بھی بیٹی کو گاڑی خرید کے دے رکھی تھی۔ بعد میں وہ کوٹھی بھی اسی کو مل گئی تھی جس میں وہ رہتی تھی۔ اس کے اکلوتے بھائی نے بعد میں دبئی میں کاروبار کیا تو وہیں رہنے لگا تھا۔

زندگی ایسے ہی نقد سوودوں کا بیوپار بن گئی تھی۔ کامیابی صرف دولت مندی تھی۔ عزت صرف دولت سے تھی۔ اگر وہ جینی سے احسن کی شادی پر عام بے وقوف لڑکیوں کی طرح ہنگامہ کرتی تو بھی احسن کا اعتماد حاصل نہ کر پاتی۔ ان کے درمیان عدم اعتماد کی تلخی سے پیدا ہونے والی خلیج ہمیشہ حائل رہتی۔ اس دن وہ لوٹ کے آیا تو شیما کو بیڈ پر لیٹا دیکھ کے دم بخود رہ گیا۔ شیما نے اس کے چہرے پر جو خوشی دیکھی وہ مصنوعی نہیں تھی۔

جب شیما سے ہمدردی کے جذبات کا وقفہ گزر گیا اور وہ رات بھی گزر گئی تو شیما نے اسے جینی سے ملاقات کے بارے میں سب بتا دیا۔ وہ شرمندگی اور سکون کے ملے جلے جذبات کے ساتھ سنتا رہا۔

پھر اس نے والہانہ اپنائیت کے ساتھ شیما کے ماتھے کو چوما۔ ”تم نے میری ساری ٹینشن ختم کر دی۔ ایک نہ ایک دن میں خود تمہیں بتاتا۔ اس سے پہلے کہ حقیقت کسی انکشاف کی صورت میں تمہارے سامنے آئے۔ مگر میں ڈرتا تھا، سوچتا رہا کہ ابھی نہیں۔ تمہاری پریشانی کو آڑ بنا کے اعترافِ جرم کے لمحے کو ٹالتا رہا۔“

شیما مسکرائی۔ ”حالات کی مجبوری میں سرزد ہونے والا جرم قابلِ معافی ہوتا ہے۔ تم سے پہلے بھی چھ نے شہریت حاصل کرنے کی مجبوری میں اس عورت کو بیوی بنا لیا تھا جو کسی طرح بھی ان کے لائق نہ تھی اور اسے پھر کوئی لڑکا مل گیا ہے۔“

”وہ جائے جہنم میں، مجھے تم پھر سے مل گئی ہو۔ سات سمندر کی دوری کے باوجود مجھے اور کیا چاہیے؟“

وہ مسکرائی۔ ”جنم جنم کے ساتھ والی بات اتنی غلط بھی نہیں لگتی۔“

”ہاں جن کو ملنا ہو تقدیر انہیں خود ملا دیتی ہے۔“

یہ چار سال پرانی بات تھی۔ اب ان کا اپنا چھوٹا سا اسپتال تھا۔ ان کا ڈھائی سال کا بچہ اس مطمئن زندگی کا انعام تھا جس میں اپنے جذبات کو اس نے ہمیشہ عقل کے تابع رکھا تھا۔ اب اسے حامد کی باتیں ٹھیک ہی لگتی تھیں کہ جب وقت مہربان ہو تو اس سے فائدہ اٹھا لینا چاہیے۔ اسے معلوم تھا کہ احسن بہرحال عام انسانی کمزوریوں سے مبرا نہیں۔ وہ پیتا بھی ہے اور موقع ملے تو اِدھر اُدھر منہ مارنے سے بھی نہیں چوکتا۔ بس اس نے خود کو شک سے دور رکھا تھا اور درگزر میں عافیت جانی تھی۔ بے شک گزر جانے والے وقت کے آسیب اب بھی اسے خوابوں میں دہشت زدہ کرتے تھے مگر وہ مطمئن تھی کہ آنے والا وقت تو اس کا ہے۔

کال بیل پر اس نے دروازہ کھولا۔ احسن نے اندر آ کے اسے چوما۔ ”تم ہمیشہ حسین لگتی ہو مجھے، آخر کیوں؟“

یہ جملہ وہ اسی وقت بولتا تھا جب اسے اپنے کسی احساسِ جرم کو خوب صورت پیار بھرے لفظوں سے دبانا ہوتا تھا۔

شیما نے اس سے ہینڈ بیگ لے لیا۔ ”تم ایک پرائیویٹ کال پر گئے تھے۔ کیسا ہے وہ مریض؟“

اس نے ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرتے ہوئے کہا۔

”اچھا ہے۔“

شیما نے اس کے کوٹ پر ایک لمبا سنہرا بال دیکھا۔ احسن کے قرب میں اسے ایک نامانوس خوشبو کا سراغ بھی ملا تھا مگر اس نے مسکرا کے کہا۔ ”تم فریش اپ ہو کے آ جاؤ۔ میں کھانا لگاتی ہوں۔ گڈو تو ابھی سویا ہے۔“

پرانے لوگ بھی کیا پتے کی بات کہہ گئے تھے کہ جو عورت محکوم بن کے رہنا جانتی ہے، وہی مرد پر حاکم ہوتی ہے۔ اس نے کھانا لگاتے ہوئے سوچا۔

***

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN

Downloaded From

# ٹھنڈا انتقام

## سلیم انور

دشمنی نبھانا اور انتقام لینا بھی ایک فن ہے... یہ فن ہر کسی کو نہیں آتا... اور جو اس میں ماہر ہو... پھر تو کیا کہنے... ٹھوٹ پھوٹ اور ریزہ ریزہ ہو جانے والے جہاز کے خستہ حال مسافروں کے گرگھومتی دلچسپ اور دل کش کہانی... وہ موت سے بچ نکلی تھی اور اب زندگی کے تعیشات کو اپنے لیے پُریقین بنانا چاہتی تھی...

**ٹھٹھرا دینے والے موسم میں لہو کو گرما دینے والے عمل کا ردعمل...**

میری آنکھ اچانک کھل گئی۔ میری نظروں کے سامنے ایک سفید دیوار تھی... ایک ایسی دیوار جو یوں دکھائی دے رہی تھی جیسے بہت بڑے سفید پتھروں سے بنی ہوئی ہو۔ مجھے ایسے پتھروں کے بارے میں معلوم نہیں تھا جو اتنے سفید ہوتے ہیں۔ گو میرا جسم گرم تھا لیکن مجھے کپکپی سی آ گئی۔ صرف مجھے اپنا چہرہ ٹھنڈا محسوس ہو رہا تھا۔

میں نے سوچنے کی کوشش کی لیکن میرے سر میں شدید درد ہو رہا تھا اور مجھے یہ بھی علم نہیں تھا کہ میں کہاں پر

ہوں۔

پھر دھیرے دھیرے مجھے تین چیزوں کا احساس ہوا۔ اول یہ کہ میں ایک عورت ہوں۔ دوسرا یہ کہ مجھے اپنا نام معلوم نہیں ہے۔ اور تیسرا یہ کہ کمرے میں میرے علاوہ کوئی اور بھی موجود ہے۔

وہ جو کوئی بھی تھا، اس کی کوئی آواز نہیں آرہی تھی۔ سو میں نے دھیرے دھیرے اپنے بائیں جانب دیکھا۔ ادھر بھی سفید دیوار تھی۔

پھر میں نے اپنے دائیں جانب دیکھا تو میرا منہ حیرت سے کھل گیا۔

ایک بوڑھی عورت آلتی پالتی مارے بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کی چھوٹی سیاہ آنکھیں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ اس کی ناک چونچ دار تھی جس کے برابر میں ایک بڑا سا مسا تھا۔ ٹھوڑی آگے کو نکلی ہوئی تھی اور بال لانبے اور سیاہ رنگ کے تھے۔

اس کے جسم پر جو لباس تھا، وہ میں نے فلموں میں اسکیموز کو پہنے ہوئے دیکھا تھا۔ اس نے لباس کا ہڈ پیچھے کیا ہوا تھا۔ مجھے اس بات کا احساس تھا کہ جانوروں کی کئی کھالوں نے مجھے ڈھانپا ہوا تھا لیکن اس کے باوجود بھی میں کپکپا رہی تھی۔ ان کھالوں کی بُو سے مجھے متلی سی محسوس ہو رہی تھی۔

اور پھر اس احساس سے میرا سر بُری طرح چکرانے لگا کہ میں گھر سے دور کسی اگلو میں ہوں۔

''تم کون ہو؟'' میں نے اس بڑھیا سے بیٹھی ہوئی بھاری آواز میں پوچھا۔ ''اور میں کہاں ہوں؟''

''میں ناکی ہوں۔ تم الاسکا میں یونالیکلیٹ کے ایک نواحی علاقے کے شکاری اگلو میں ہو۔'' یہ کہہ کر وہ بوڑھی عورت اٹھی اور میری جانب بڑھنے لگی۔

میں نے دبکنے کی قطعی کوئی کوشش نہیں کی۔

''تم انگلش بول سکتی ہو۔''

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ البتہ مجھے دکھانے کے لیے اپنے ہاتھ کھول دیے جس میں ایک بھاری گول پتھر، ایک بالوں کا برش اور پچیس ڈالر کے نوٹ تھے۔

''تمہاری جیبوں سے بس یہی چیزیں نکلی ہیں۔ ہم نے تمہیں ایک ہوائی جہاز میں پایا تھا۔ تمہارے ساتھ جو آدمی تھا وہ پہلے ہی مر چکا تھا۔ اگر تم اسے دیکھنا چاہتی ہو تو وہ برابر کے کمرے میں موجود ہے۔''

ہوائی جہاز؟

آدمی؟

میرا ذہن اس بارے میں بالکل کورا تھا۔ میں کسی ہوائی جہاز میں الاسکا میں کیوں تھی؟ اور اس سے زیادہ اہم بات یہ تھی کہ میں کون ہوں؟

میں نے اپنے سر کو ایک جھٹکا دیا۔ پھر ان چیزوں پر نظریں جما دیں جو اس بوڑھی عورت نے اپنے ہاتھوں میں رکھی ہوئی تھیں۔

پتھر چکنا، بڑے سائز کا اور گول تھا۔ بالوں کا برش خاصا استعمال شدہ لگ رہا تھا اور کرنسی... وہ کرنسی امریکن تھی۔

اس بوڑھی عورت نے وہ تمام چیزیں میری چٹائی کے برابر میں فرش پر رکھ دیں۔ میں اپنے بالوں میں برش کرنا چاہتی تھی لیکن مجھ میں اتنی قوت بھی نہیں تھی کہ میں برش تک اپنا ہاتھ لے جاسکوں۔

''کوئی شناختی کارڈ وغیرہ نہیں؟'' میں نے نحیف لہجے میں پوچھا۔

اس بوڑھی عورت کی آنکھوں کے گرد کی جلد مزید سکڑ گئی۔ ''تمہیں نہیں معلوم کہ تم کون ہو۔'' یہ کوئی سوال نہیں تھا اور میں نے محسوس کیا کہ اس نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔

میرا سر درد شدت اختیار کر گیا اور پھر میں بے ہوش ہوگئی۔

☆☆☆

میری آنکھ کسی عمدہ سی خوشبو محسوس ہونے پر کھلی۔ میرے خیال سے وہ کسی قسم کے شوربے کی خوشبو تھی۔

تب مجھے احساس ہوا کہ میں نے اپنی جگہ سے کوئی حرکت نہیں کی ہے۔ مجھ پر خوف و دہشت کی کیفیت طاری ہوگئی۔ میں سمجھ رہی تھی کہ میری آنکھ کسی ہسپتال میں کھلی ہے۔ لیکن یہاں تو نہ وہ باقاعدہ ٹائلز والی دیواریں نظر آرہی تھیں۔ نہ چمک دار فلوریسنٹ لائٹیں۔ نہ میڈیکل کی مشینیں تھیں نہ ڈاکٹروں اور نرسوں کی چہل پہل! اور نہ ہی میں کسی اسپتال بیڈ پر تھی۔ میں اسی طرح فرش پر ایک چٹائی پر لیٹی ہوئی تھی۔

یہ سب کیا ہے۔

تب مجھے احساس ہوا کہ جب پہلی بار میری آنکھ کھلی تھی تو میں نے اپنے جسم کے کسی حصے کو حرکت دینے کی کوشش نہیں کی تھی اور صرف گردن گھما کر چاروں طرف کا جائزہ لیا تھا۔

اب میں نے نہایت احتیاط کے ساتھ وزنی کھالوں تلے دبے ہوئے اپنے پیروں کے پنجوں کو ہلایا اور دائیں بائیں حرکت دی۔ پھر اپنا دایاں پیر اوپر اٹھایا، پھر بایاں پیر۔ مجھے اپنے بائیں کولہے میں تکلیف محسوس ہوئی لیکن وہ زیادہ شدید نہیں تھی۔

پھر میں نے اپنے ہاتھوں کی انگلیوں کو گھمایا پھرایا۔ پھر دایاں ہاتھ اوپر اٹھایا اور پھر بایاں ہاتھ۔ سب اعضا صحیح کام کر رہے تھے۔ بس سر میں اٹھنے والے درد میں کوئی کمی نہیں ہو رہی تھی۔

”تم جاگ چکی ہو۔“ بوڑھی عورت نے کہا اور ایک پیالہ لے آئی۔ ”ہمیں کوئی شدید قسم کی چوٹیں دکھائی نہیں دیں۔ حتیٰ کہ کوئی ہڈی بھی نہیں ٹوٹی۔ لیکن ہمیں یہ معلوم نہیں کہ اس شخص کی ہلاکت کا کیا سبب ہوا ہے۔ اس کے سر پر ایک گہرا گھاؤ ہے اور اس کا پیر ٹوٹا ہوا ہے۔“

بوڑھی عورت نے شوربے کا پیالہ نیچے چٹائی کے پاس فرش پر رکھ دیا اور اٹھ کر بیٹھنے میں مدد دیتے ہوئے دو تکیے میرے پیچھے رکھ دیے۔ ”کیا تم خود سے پی لوگی؟“ اس نے پوچھا۔

میں نے پیالہ اٹھا لیا اور چمچہ اس میں ڈبو دیا۔ شوربا مناسب گرم تھا اور مجھے واقعی بھوک بھی لگ رہی تھی۔ چار چمچے شوربا پینے کے بعد میں نے پوچھا۔ ”یہ کیا ہے؟ یہ بے حد لذیذ ہے؟“

”یہ ہرن کے گوشت کا اسٹو ہے۔“

”اوہ۔“ میں نے جلدی جلدی شوربا ختم کر لیا۔

ناگی نے اپنی جیب میں سے ایک رول نکال کر مجھے تھما دیا۔ ”میں چائے لے کر آتی ہوں۔“ اس نے خالی پیالہ اٹھاتے ہوئے کہا اور چلی گئی۔

میں نے رول چبانا شروع کر دیا۔

وہ گرما گرم چائے لے کر آگئی۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور جلدی جلدی چائے پی لی۔

”کیا تمہیں اب بھی یاد نہیں آرہا کہ تم کون ہو؟“

”نہیں۔“ میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

”اب دیکھتے ہیں کہ تم چل پھر سکتی ہو یا نہیں۔ اگر تم اس شخص کو دیکھ لو تو شاید تمہیں سب کچھ یاد آجائے۔“

”عمدہ آئیڈیا ہے۔“

اس نے مجھ پر سے بھاری کھالیں اٹھانے میں میری مدد کی۔ پھر میں نے اپنے جوتے پہن لیے۔

میں نے جینز کے ساتھ لمبی آستین کا ہرا اور سفید رنگ کا دھاری دار سویٹر پہنا ہوا تھا۔ ناگی نے مجھے اسکیمو کا خصوصی لباس تھما دیا جو کھال کے کوٹ اور ٹوپ پر مشتمل تھا۔ اسکیمو کی زبان میں اس لباس کو پارکا کہتے ہیں۔ یہ لباس مجھے جانا پہچانا سا لگا۔ میں نے یہ لباس پہن لیا اور چٹائی کے پاس رکھی ہوئی اپنی اشیا اٹھا کر اپنی جیبوں میں ڈال لیں۔ مجھے داہنی جیب میں کچھ پتھر قسم کی شے محسوس ہوئی۔ اس پتھر

## وصیت زدہ

مال دار خاتون نے ممنونیت کے ساتھ اپنے معالج سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ ”تم نے ہمیشہ میرا خیال رکھا، ہم اچھے دوست بن گئے ہیں۔ اب میں تم کو فیس کی حقیری رقم دے کر اس رشتے کی تحقیر نہیں کرنا چاہتی... لیکن مجھے یہ بتاتے ہوئے خوشی ہے کہ میں نے اپنی وصیت میں تمہارے لیے معقول حصہ رکھا ہے۔“

”اوہ... تم کتنی مہربان ہو۔“ ڈاکٹر جذبات سے مغلوب لہجے میں بولا۔ ”مطب سے میری آمدنی بہت محدود ہے... اب شاید میری زندگی بدل جائے۔“

چند ثانیوں تک گمبھیر خاموشی رہی پھر ڈاکٹر بولا۔ ”ذرا وہ نسخہ دو جو میں نے ابھی تم کو دیا ہے... اس میں کچھ معمولی سی تبدیلی کرنی ہے۔“

## انتقام

آخری سانس لیتے ہوئے شوہر نے بیوی سے کہا۔ ”میرے مرنے کے بعد تم انبل سے شادی کر لینا۔“

”انبل سے؟“ بیوی نے تعجب سے پوچھا۔ ”لیکن تم تو اس کے جانی دشمن ہو؟“

شوہر نے کہا۔ ”ہاں میں اس مردود سے انتقام لینا چاہتا ہوں۔“

رحیم النسا بیگم... کوٹری

## مردِ محفل

ایک بڑے صنعت کار نے پارلیمنٹ کے ممبروں کے ایک گروپ کو دعوت پر بلایا۔ کھانے پینے کے دوران میں مختلف موضوعات پر باتیں ہوتی رہیں۔ ایک صاحب کے علم، حاضر جوابی اور زورِ بیان سے صنعت کار خاص طور سے متاثر ہوا اور ان سے جان پہچان بڑھانے کے لیے ان سے پوچھ بیٹھا۔

”آپ کون سے انتخابی حلقے سے ہیں؟“

وہ صاحب بولے۔ ”میں پارلیمنٹ کا ممبر نہیں ہوں۔ میں تو اس بس کا ڈرائیور ہوں جو معزز ممبروں کو یہاں لے کر آتی ہے۔“

مرسلہ: نظیر سہروردی، انڈیا

سے ہاتھ ٹکراتے ہی میں سوچنے لگی کہ میں اپنی جیب میں یہ پتھر کیوں لیے پھر رہی تھی؟

ہم ایک تنگ سی راہداری سے گزرتے ہوئے ایک اور گول نما کمرے میں داخل ہو گئے۔ وہاں فرش پر بچھی چٹائی پر ایک شخص لیٹا ہوا تھا۔ میں اسے بہتر طور پر دیکھنے کے لیے اس پر جھک گئی۔

وہ ایک ہینڈسم شخص تھا۔ اس کی عمر لگ بھگ چالیس بیالیس رہی ہوگی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اس لیے میں یہ نہ دیکھ سکی کہ ان کی رنگت کیا تھی۔ اس کے چہرے پر ہلکی سی داڑھی تھی اور مونچھیں نفاست سے تراشیدہ تھیں۔ اس نے ٹخنوں سے اونچے بوٹ پہنے ہوئے تھے جو پولو کے کھلاڑی پہنتے ہیں۔ اس کی جینز کی رنگت پھیکی پڑ چکی تھی اور اس کا پارکا گہرے نیلے رنگ کا تھا۔

میں اسے پہچان نہیں پائی۔

میں اٹھنے لگی تو مجھے اس کے ماتھے پر ایک چھوٹے سے زخم کا نشان دکھائی دیا۔ اور تب مجھے تیزی سے یہ یاد آنے لگا کہ وہ کون تھا۔

میں نے فوری طور پر اپنے دونوں ہاتھ فرش پر ٹکاتے ہوئے خود کو اس شخص کے اوپر گرنے سے بچا لیا۔

''تم جانتی ہو یہ کون ہے؟'' بوڑھی ناگی نے جھک کر مجھے کھڑے ہونے میں مدد دیتے ہوئے پوچھا۔

''میرا شوہر۔'' میں نے سرگوشی کے لہجے میں جواب دیا۔

☆☆☆

مجھے یاد نہیں کہ میں اگلو کے دوسرے حصے میں واپس کس طرح پہنچی تھی۔ لائنل کو دیکھنے کے بعد میں بے ہوش ہو گئی تھی اور مجھے کوئی آئیڈیا نہیں کہ میں کتنی دیر بے ہوش رہی تھی۔

جب مجھے ایک بار پھر ہوش آیا تو میں نے محسوس کیا کہ اس مرتبہ مجھے کوئی نہیں دیکھ رہا ہے۔ میں سنبھل کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ ناگی نے میرے جوتے نہیں اتارے تھے اور پارکا چٹائی کے کنارے پر رکھا ہوا تھا۔

دروازے پر پہنچ کر میں رک گئی اور چاروں طرف دیکھنے لگی۔ کوئی فرد نظر نہیں آ رہا تھا۔ تب اچانک میرا بھاگ جانے کا دل چاہا۔ لیکن مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ کس طرف جانا چاہیے اور نہ ہی یہ خیال تھا کہ میں کہاں جانا چاہتی ہوں۔

میں بس یہ جانتی تھی کہ میں یہاں اب مزید نہیں رہنا چاہتی تھی۔

اتنے میں مجھے ایک چھوٹی سی پہاڑی پر سے دو افراد آتے دکھائی دیے۔ مجھ پر خوف و دہشت کی کیفیت طاری ہو گئی۔ میں کمزور قدموں سے واپس اندر آ گئی اور چٹائی پر بیٹھ کر انتظار کرنے لگی۔

ناگی اندر داخل ہوئی تو اس کے ہمراہ بھاری جسم کا ایک پستہ قد آدمی تھا۔ اس کے جسم پر بھی اسکیمو کا مخصوص لباس تھا۔ اندر داخل ہو کر ان دونوں نے اپنے پارکا کے ہڈ پیچھے کھسکا لیے تھے۔ مجھے ان دونوں میں مشابہت نظر آئی۔ البتہ اس شخص کی ناک سیدھی تھی اور اس کا مسا اس کی پیشانی پر تھا۔

وہ شخص مجھے کھڑا دیکھتا رہا اور پھر وہ دونوں آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئے۔

''میں تائیکو ہوں۔ اس گاؤں کا سردار۔'' اس شخص نے کہا۔ ''ناگی نے مجھے بتایا کہ تمہیں یاد آنا شروع ہو گیا ہے اور وہ پائلٹ تمہارا شوہر ہے۔''

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''کیا تمہیں یاد ہے کہ جہاز کے کریش ہونے سے پہلے کیا واقعہ پیش آیا تھا؟'' سردار تائیکو نے پوچھا۔

اس کے سوال کرتے ہی مجھے تیزی سے سب کچھ یاد آنے لگا۔ یہ کہ کس طرح میں نے اپنی جیب میں رکھا ہوا گول پتھر نکال کر اس سے اپنے شوہر کی پیشانی پر ضرب لگائی تھی۔ پھر جونہی میں نے وہ پتھر واپس اپنی جیب میں رکھا تو جہاز ڈولنا شروع ہو گیا تھا اور پھر رن وے پر اس کا رخ تیزی سے بدل گیا تھا۔ پھر وہ گھومتا ہوا ایک لمبی کھائی میں پلٹ گیا تھا۔ میں اس دوران آگے پیچھے جھٹکے کھا رہی تھی اور پھر میرا سر کسی سخت چیز سے ٹکرا گیا تھا۔

اور اس کے بعد میری آنکھ اگلو ہی میں کھلی تھی۔

''نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''مجھے صرف یہ یاد ہے کہ ہم پرواز کر رہے تھے اور وہ لینڈ کرنے جا رہا تھا پھر اس کے بعد کیا ہوا، مجھے کچھ یاد نہیں۔''

''تمہاری جیب میں ایک گول وزنی پتھر پایا گیا تھا۔ کیا تم جب بھی اپنے شوہر کے ہمراہ پرواز پر جاتی تھیں تو ہمیشہ یہ پتھر اپنی جیب میں رکھا کرتی تھیں؟'' تائیکو نے پوچھا۔

''ہاں۔'' میں نے جواب دیا۔

ان دونوں کے چہروں پر حیرت کے تاثرات ابھر آئے۔

''یہ ایک لطیفہ ہے۔ میں ایک گول وزنی پتھر، بالوں کا برش اور چند سو ڈالر ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتی تھی۔ اگر کبھی ہمارا جہاز کریش ہو جائے اور اس میں آگ لگ جائے تو میں پتھر سے کھڑکی کا شیشہ توڑ کر خود کو جلتے جہاز سے نکال کر بچا تو سکتی تھی۔'' میں نے ہلکا سا قہقہہ لگاتے ہوئے کہا لیکن اس قہقہے میں لرزش تھی۔ ''میں اپنے بالوں کو برش سے سنوارے

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں؟۔

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بُک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
  سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابنِ صفی کی مکمل رینج
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو پیسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بُک کا ڈائریکٹ اور رژیوم ایبل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بُک کا پرنٹ پریویو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کُتب کی مکمل رینج
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

⇦ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

⇦ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

Online Library For Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety

twitter.com/paksociety1

حسنِ موسمِ سرما میں ذہن و دل کو گرماتا دسمبر 2015ء کا دل گداز پاکیزہ

ماہنامہ پاکیزہ کراچی

**قیصرہ حیات** کا ناول **آخری امید** جگمگاتے اختتام کی طرف گامزن

**نگہت سیما** اور **در ثمن بلال** کے دلکش ناولوں کی بھرپور اقساط

**شیریں حیدر** نے **زندگی خاک نہ تھی** میں دکھایا دلسوز انجامِ وفا

**سکینہ فرخ** کا خوب صورت مکمل ناول **نبھانا ہے محبت سے**

**تابندہ نعیم** کے پُراثر انداز و بیان کا شاہکار ناولٹ...... **کھوئے کھوئے لمحے**

**نیلم احمد بشیر** کی ایک چشم کشا حساس تحریر...... **زندگی تماشا بنی**

**FM101** کی قابلِ رشک آواز
**ربیعہ اکرم** سے دلچسپ گفتگو

**ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی**
کا روحانی سفر...... **یادوں کی مالا**

Visit Paksociety.com To Download

اس کے علاوہ

**شمیم فضل خالق**، **غزالہ عزیز**، **شبانہ شوکت**، **قرۃ العین خرم ہاشمی**، **عاشفہ مسعود**، **شہناز وسیم** و دیگر مشاق لکھاریوں کی دلکش تحریریں......

تفریحی معلومات سے پُر اور متنوع مضامین کا مجموعہ...... صرف آپ کی اعلیٰ ذوقی کے لیے

READING Section

رکھنے کی عادی ہوں۔۔۔ بغیر برش کیے بالوں سے مجھے شدید جھنجلاہٹ ہوتی ہے۔''

''لیکن رقم صرف سو ڈالر؟ کوئی کریڈٹ کارڈ نہیں؟''

''یہ بھی ایک لطیفہ ہے۔ مجھے کبھی یہ توقع نہیں رہی کہ ہمارا جہاز کریش بھی ہو سکتا ہے۔ لائنل ایک نہایت ماہر پائلٹ تھا۔''

''ہو سکتا ہے کہ وہ ماہر پائلٹ رہا ہو۔ لیکن اس مرتبہ اس کی مہارت کسی کام نہیں آئی۔'' تانیکو نے کہا۔ ''ہمارے مقامی مکینک جہاز کا مکمل معائنہ کر چکے ہیں۔ انہیں جہاز کے کریش ہونے کا کوئی سبب دکھائی نہیں دیا۔ سو یہ لازی پائلٹ کی غلطی رہی ہوگی۔''

ہاں، یہ پائلٹ ہی کی غلطی تھی جس کے بارے میں مجھے ہمارے اس ٹرپ سے کچھ پہلے خبر ہوئی تھی کہ وہ مجھ سے بے وفائی کر رہا تھا اور یہ اس کی بے وفائی کا پہلا واقعہ نہیں تھا۔

اس صدمے نے مجھے تقریباً تباہ و برباد کر دیا تھا۔

اور شاید میں برباد ہو بھی جاتی کیونکہ میں نے اس بے وفائی کے واحد حل کے طور پر یہی فیصلہ کیا تھا کہ ہم دونوں ایک ساتھ ہلاک ہو جائیں۔ مجھے اسے ایک بے وفا کے روپ میں دیکھنا گوارا نہیں ہو رہا تھا۔ طلاق بے حد تکلیف دہ ثابت ہوتی۔ مجھے فوری طور پر سکون کی طلب تھی۔

جب اس نے مجھے اپنے الاسکا کے ٹرپ کے بارے میں بتایا جہاں وہ کچھ زمینیں چیک کرنے جا رہا تھا تو میں نے اس کے ساتھ جانے کا یہ بہترین موقع جانا۔ اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ میں اس کے گھٹیا معاشقوں سے واقف ہو چکی ہوں۔ اب میں اس کے ہونٹوں پر وہ اطمینان بخش مسکراہٹ کبھی نہیں دیکھنا چاہتی تھی جو اپنی ان محبوباؤں کے تصور سے اکثر اس کے چہرے پر رقص کرنے لگتی تھی۔

اسی لیے میں نے اسے جہاز اڑانے کے دوران ہلاک کرنے کا پلان بنایا تھا لیکن پرواز کے دوران میری ہمت جواب دے گئی اور میرا ارادہ کمزور پڑ گیا۔ لیکن پھر میری ہمت اس وقت زور پکڑ گئی جب وہ جہاز کو لینڈ کر رہا تھا۔

اب وہ مر چکا تھا اور میں اب بھی زندہ تھی۔

مجھے کچھ یقین نہیں تھا کہ اس بارے میں، میں کیا محسوس کر رہی تھی۔

''جہاز کو کس حد تک نقصان پہنچا ہے؟'' میں نے جاننا چاہا۔

''ٹائر پنکچر ہیں اور فریم کو کچھ نقصان ہوا ہے۔ نقصان زیادہ نہیں ہے۔ اسے ٹھیک کرنے میں زیادہ وقت نہیں لگے گا۔ تمہارے شوہر کی لاش کا طبی معائنہ کر لیا گیا ہے۔ یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ اس کی موت حادثاتی تھی۔'' تانیکو نے بتایا۔

میں نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ''میں کب تک یہاں سے جا سکوں گی؟ اور اپنے شوہر کی لاش گھر لے جا کر دفنا سکوں گی؟''

تب مجھے احساس ہوا کہ میں نے اپنے شوہر کی موت پر ایک آنسو تک نہیں بہایا۔ شاید یہ بات انہیں پریشان کر رہی ہو یا شاید وہ یہ سوچ رہے ہوں کہ میں ابھی تک صدمے میں ہوں۔ میں بھی یہی امید رکھ رہی تھی۔

مجھے گھر واپس جانے کی کوئی زیادہ فکر نہیں تھی۔ لیکن یہاں کی سردی مجھ سے برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ میرے دانت بجنے لگے اور تب اچانک میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ یہ تاسف اور نامرادی کے آنسو تھے کہ میں نے سوچا کیا تھا اور یہ کیا ہو گیا۔

میں نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے تانیکو کی طرف دیکھا۔

''تم جب بھی انتظامات مکمل کر لو یہاں سے فوری طور پر جا سکتی ہو۔'' یہ کہتے ہوئے وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

مجھے بے ساختہ بے حد اطمینان محسوس ہوا اور دل میں ٹھنڈک سی پڑ گئی جو میرے لیے حیرت کا باعث تھی۔ میں نے کوشش کی کہ میں نہ مسکراؤں۔

انصاف ہو چکا تھا اور میں بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔

لیکن ابھی پورا انصاف نہیں ہوا تھا۔ ابھی ایسی دو عورتیں باقی تھیں جنہوں نے میرے شوہر پر ڈورے ڈال کر اسے مجھ سے بے وفائی کی ترغیب دی تھی۔ شاید الاسکا سے واپس اپنے شہر پہنچ کر مجھے ان سے نمٹنے کی ضرورت بھی پیش آ جائے۔

میری انگلیاں بے ساختہ اپنی جیب میں موجود اس گول وزنی پتھر کو سہلانے لگیں لیکن پھر میں نے اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔

لوگ کہتے ہیں کہ ایک عمدہ زندگی بسر کرنا بہترین انتقام ہے۔

اب اپنے شوہر کی تمام دولت اور بیمہ کی رقم سے میں ایک بھرپور عیش و عشرت کی زندگی بسر کر سکتی تھی۔

اپنے شوہر کی بے وفائی کا اس سے بہتر انتقام اور کیا ہو سکتا تھا؟

◆

Downloaded From Paksociety.com

# خاموش جنت

منظر امام

گوہر نایاب مچھلی کی طرح دریائوں کی بالائی سطح پرنہیں بہتا... اسے گہرائیوں میں جاکے تلاش کرنا پڑتا ہے... وہاں جہاں بہائو تیز ہوتا ہے اور پانی بھی صاف شفاف ... بعض لوگ اس کی تلاش میں پوری عمر گنوا دیتے ہیں اور کسی کو صرف ایک دن... ایک لمحے میں کامیابی کے خزانے مل جاتے ہیں... ایک ایسے ہی شخص کا ماجرا... جو اجنبیوں کے درمیان داخل ہو کے شناسائی اجاگر کرنے کا ہنر رکھتا تھا... لمحوں میں اپنا بنا لینا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا... اور وہ اپنے اس ڈرامے میں اس حد تک کامیاب تھا کہ غیروں نے اسے اپنا سمجھ کے اپنا سب کچھ اس کے حوالے کردیا...

**اپنوں سے دور رہ کے اجنبی دیواروں کے سنگ شب و روز گزارنے والے تنہا نشینوں کا دل گداز فسانہ**

ایک ریٹائرمنٹ ہوم کا نام ہے۔ اس قسم کے ریٹائرمنٹ ہوم بوڑھوں کے لیے ہوتے ہیں جہاں وہ اپنی زندگی کے آخری دن گزار سکیں۔ بہت سے علاقوں میں انہیں اولڈ ہاؤس بھی کہا جاتا ہے۔

خاموش جنت نام کا یہ اولڈ ہاؤس کلائسن شہر کی حدود سے آگے جنوب کی طرف ایک سرسبز وادی میں ہے۔ یہ

جنت چونکہ کچھ نشیب میں ہے اس لیے اوپر سے گزرتی ہوئی گاڑیوں سے اسے دیکھا نہیں جا سکتا۔ وہاں تک جانے کے لیے ایک ذیلی سڑک موجود ہے۔

اس قسم کے اولڈ ہاؤسز عام طور پر ایسی ہی پرفضا جگہوں پر بنائے جاتے ہیں تاکہ یہاں داخل ہونے والے نفوس قدرت کے حسین نظاروں سے لطف اندوز ہوتے رہیں۔

لیکن میرا تجربہ یہ بتاتا ہے کہ ایسے مقامات خطرناک بھی ہوتے ہیں۔ اس کی کئی وجوہات ہیں۔ پچھلے دنوں میں ایک ایسے ہی اولڈ ہوم میں کام کر رہا تھا جب میں نے ایک حادثہ دیکھا۔

ایک بوڑھا البرٹ اولڈ ہوم سے نکل کر دوڑتا ہوا روڈ پر آگیا اور ایک ٹینکر کی زد میں آکر مارا گیا۔

البرٹ نوے برس کی عمر کا تھا اور میں اسے پسند بھی کرتا تھا۔ اس کی باتیں بہت دلچسپ ہوا کرتیں۔ وہ اپنے پرانے قصے بہت مزے لے کر سنایا کرتا لیکن افسوس میں اسے بچانے کے لیے کچھ نہیں کر سکا اور وہ مر گیا۔

اولڈ ہومز میں اسی قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ گھبرائے ہوئے خوف زدہ، دنیا کی شکایتیں اپنے سینوں میں لیے ہوئے اداس لوگ۔ بہت سے مریض بھی ہوتے ہیں۔

ان میں سے کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو وحشت زدہ ہو کر بھاگ جانا چاہتے ہیں لیکن بے چارے بھاگ نہیں پاتے۔ میں نے پہلی نگاہ میں ''خاموش جنت'' کا جائزہ لے لیا تھا۔

یہ ایک پرانی عمارت تھی۔ ساٹھ کی دہائی میں جس طرح کے بیرکس بنائے جاتے تھے۔ یہ ویسی ہی تھی۔ اینٹوں سے بنی ہوئی کھپریل کی سرخ چھت۔ اس کے کئی حصے تھے اور اس کو دیکھ کر محسوس ہوتا تھا کہ وہ کوئی اولڈ ہوم نہیں ہے بلکہ ایک جیل ہے۔ جہاں بوڑھوں اور لاوارثوں کو اس لیے لاکر قید کر دیا جاتا ہے کہ وہ اپنی زندگی کے آخری دن آرام سے گزاریں۔

اس قسم کی جگہوں کو پہلے نرسنگ ہومز کہا جاتا تھا۔ پھر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ اولڈ ہومز ہو گئیں اور اب ریٹائرمنٹ ہومز کے طور پر جانی جاتی ہیں۔

بہرحال ان کے نام جو بھی ہوں، میرے لیے بہت دلچسپی کا مرکز رہی ہیں۔ میں نے ہمیشہ انہیں ایک مشن کے طور پر لیا ہے ایک چیلنج سمجھا ہے۔

میں نے اپنی پرانی اور وفادار واکس ویگن خاموش جنت کی پارکنگ میں کھڑی کی جہاں اس وقت کوئی گاڑی نہیں تھی اور آثار بھی یہی تھے کہ شاید کوئی گاڑی اس طرف آئی بھی نہ ہو۔

میں نے انگلیوں سے اپنے الجھے ہوئے بال سنوارے۔ اپنی عینک صحیح کی جس کا فریم قیمتی تو تھا لیکن بہت پرانا ہو چکا تھا۔ اپنی ٹائی کی گرہ درست کی اور گاڑی سے باہر آگیا۔

بلڈنگ کے طویل برآمدے میں کئی کرسیاں پڑی ہوئی تھیں جن پر میرے نئے دوست بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ سب بوڑھے لوگ تھے۔ جو یوں ہی بیٹھے ہوئے آسمان کو دیکھ رہے تھے۔ ایک دوسرے سے لاتعلق اور خود اپنی زندگی سے لاتعلق۔

میں نے بڑی خوش دلی اور گرم جوشی کے ساتھ انہیں ہیلو کہا۔ لیکن سوائے ایک بوڑھی عورت کے کسی نے میری طرف توجہ نہیں دی۔ سب اپنے اپنے خیالوں میں گم تھے۔

میں کمرے میں داخل ہوا۔

یہاں اسی مخصوص بُو نے میرا استقبال کیا جو اس قسم کے اولڈ ہومز میں ہوا کرتی ہے۔ دواؤں کی بُو، فنائل کی بُو اور اسپرے کی بُو۔ میں اس قسم کی بُو کا عادی ہو چکا تھا۔

کمرے میں ایک استقبالیہ کاؤنٹر تھا جس کے عقب میں ایک نرس بیٹھی تھی۔ کہنے کو وہ جوان ہی تھی لیکن اس تھکے ہوئے ماحول نے اسے بھی بوڑھا بنا دیا تھا۔

وہ کسی رجسٹر پر جھکی ہوئی کوئی کام کر رہی تھی۔ اس نے میری طرف دیکھا تو سہی لیکن کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا۔

''محترمہ!'' میں نے اسے مخاطب کیا۔ ''میری دس بجے کی اپائنٹ منٹ ہے مس ولما سے۔'' میں نے بتایا۔

اس نے سر اٹھا کے دوبارہ میری طرف دیکھا۔ اس بار بھی اس کے چہرے پر بیزاری کی کیفیت تھی۔ ''تمہارا نام؟'' اس نے پوچھا۔

میں نے جواب دینے سے پہلے اس کے سینے پر لگے ہوئے سستے قسم کے پلاسٹک کے ٹیگ کو دیکھا جس پر اس کا نام لکھا ہوا تھا ''ٹروڈی۔'' مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ مس تھی یا مسز؟

''اپنا نام بتاؤ۔'' اس نے دوبارہ پوچھا۔

''گردنن۔'' میں نے بتایا۔ ''گردنن جیرالڈ۔''

''بیٹھ جاؤ۔'' اس نے پلاسٹک کی کرسیوں کی ایک قطار کی طرف اشارہ کیا۔ میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ ٹروڈی اپنی فائل اور کاغذات میں مصروف ہو گئی۔ میں نے اپنے

جوتوں کا جائزہ لیا۔ جوتے پرانے اور گرد آلود تھے۔ وہی حال میری پتلون کا تھا۔ وہ بھی پرانی ہو چکی تھی۔

کبھی کبھی کاؤنٹر پر رکھے ہوئے فون کی گھنٹی بجنے لگتی اور ٹروڈی فون کا جواب دیتی۔ اس وقت اس کا لہجہ بہت نرم ہو جاتا تھا۔

دس منٹ کے بعد مس ولما نمودار ہوئی۔ ٹروڈی کی طرح اس نے بھی سفید یونیفارم پہن رکھا تھا۔ اس کے جوتے اور موزے بھی سفید تھے۔ ٹروڈی کی نسبت وہ بھاری بدن کی تھی۔

جب وہ قریب آئی تو میں جلدی سے کھڑا ہو گیا۔

''گرونن جیرالڈ۔'' میں نے اپنا نام بتایا۔

''میں ولما۔'' اس نے رسمی طور پر اپنا ہاتھ مصافحے کے لیے بڑھا دیا۔

میں اس وقت کسی خوف زدہ بلّی کے بچّے کی طرح ہو رہا تھا۔

''میرے ساتھ آؤ۔'' اس نے کہا اور ایک طرف بڑھ گئی۔

میں اس کے پیچھے چل پڑا۔ اس کے جوتوں کی نرم چاپ یوں محسوس ہو رہی تھی جیسے دور سے آ رہی ہو۔ ہال کے آخر میں رک کر میں نے ٹروڈی کی طرف دیکھا۔ وہ میری ہی طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے اس کے تاثرات میں اپنے لیے ناپسندیدگی محسوس کی تھی اور اس وقت میں نے اپنی ہٹ لسٹ میں اس کا نام پہلے نمبر پر لکھ لیا تھا۔

ہم ایک کمرے میں داخل ہوئے۔ جس کی سجاوٹ بہت سستے انداز میں کی گئی تھی۔ دیواروں پر بوڑھے مردوں اور عورتوں کی تصاویر تھیں۔ ایک بڑی سی میز تھی جس کے دوسری طرف گھومنے والی کرسی تھی اور میز کے سامنے دو تین عام قسم کی کرسیاں تھیں جو میز کی سطح سے کچھ نیچے تھیں۔ اسی لیے ایک کرسی پر بیٹھ کر ولما کو دیکھنے کے لیے مجھے گردن اٹھانی پڑ رہی تھی جبکہ وہ اپنی گردن جھکا کر مجھے دیکھ رہی تھی۔

''تو تم نے یہاں ملازمت کے لیے درخواست دی تھی۔'' اس نے میز پر رکھی ہوئی میری درخواست اٹھالی۔

''جی ہاں، میں اسی لیے یہاں تمہارے سامنے موجود ہوں۔''

''اٹینڈنٹ کے طور پر۔ یعنی میل نرس کے طور پر۔'' اس نے کہا۔ ''تم نے لکھا ہے کہ تمہیں اس قسم کے اولڈ ہوم میں کام کرنے کا تجربہ ہے۔''

''جی ہاں، میں نے کئی اولڈ ہوم میں کام کیا ہے۔'' میں نے بتایا۔ ''تین کے تو سرٹیفکیٹ بھی درخواست کے ساتھ ہیں۔ تم دیکھ سکتی ہو اور دوسری بات یہ ہے کہ مجھے کہیں سے ہٹایا نہیں گیا بلکہ میں خود ہی ہٹا ہوں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ میرا ریکارڈ صاف ستھرا ہے۔''

میں جانتا تھا کہ اس قسم کی جگہوں پر اس قسم کی باتوں کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ ان لوگوں کو صرف کام کرنے والا چاہیے ہوتا ہے۔ چاہے وہ کوئی بھی ہو۔ اغوا کرنے والا..... قاتل یا پھر مجھ جیسا الجھی ہوئی زندگی گزارنے والا۔

''ہمیں ایک اٹینڈنٹ کی ضرورت ہے رات کی شفٹ کے لیے۔'' اس نے بتایا۔ ''رات نو بجے سے صبح سات بجے تک۔ اس کا کام یہاں اولڈ ہوم اور مریضوں کی دیکھ بھال کرنا ہے۔''

''میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ مریضوں کی دیکھ بھال کا کیا مطلب ہوتا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''انہیں وقت پر دوائیں دینا، انہیں کھانا کھلانا، جب وہ واش روم سے واپس آئیں تو واش روم کو صاف کرنا، ان کی گندگی صاف کرنا، ان کو نہلانا، ان کے کپڑے بدلنا، دل بہلانے کے لیے کتابیں پڑھ کر سنانا، ان کے لیے خطوط لکھنا، وغیرہ۔''

اس کے ہونٹوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور غائب بھی ہو گئی۔

''تم کو مریضوں میں دلچسپی محسوس ہوتی ہے یا اُکتا جاتے ہو؟'' اس نے سوال کیا۔

یہ ایک احمقانہ سوال تھا جو اکثر کیا جاتا ہے۔ یہاں آنے کا مطلب یہی ہو سکتا تھا کہ درخواست دینے والا ذہنی طور پر اس قسم کے کاموں کے لیے تیار ہو کر آیا ہے۔

میری درخواست ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھی۔

''عمر کیا ہے تمہاری؟'' اس نے پوچھا۔

''چونتیس سال۔'' میں نے بتایا۔ ''ویسے میں نے اپنی درخواست میں اپنی عمر لکھ دی ہے۔''

وہ میری طرف دیکھنے کے بعد پھر درخواست کی طرف متوجہ ہو گئی۔ شاید وہ یہ سوچ رہی ہو گی کہ چونتیس برس کے ایک آدمی کو ایسا پیشہ اختیار کرنے کی کیا ضرورت پیش آ گئی۔

''ہم ایک گھنٹے کے چھ ڈالرز دیتے ہیں۔'' اس نے بتایا۔

اور یہی معاوضہ اس ہوم کے اشتہار میں بھی تھا۔ ایک

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN

گھنٹے کے چھ ڈالرز۔ خاموش جنت صرف ایک ہی جگہ نہیں تھی بلکہ ریاست کے کئی شہروں میں اس کی شاخیں تھیں۔ اس کمپنی کا کام بہت پھیلا ہوا تھا۔ اولڈ ہومز سے لے کر جانماز کے مقدے تک۔

''ٹھیک ہے۔'' میں نے ہامی بھرلی۔ ''میں تیار ہوں۔''

ویسے بھی ایک گھنٹے کے چھ ڈالرز اتنے بُرے نہیں تھے اور میں یہاں اس قسم کے معاوضوں کے لیے آیا ہی کب تھا۔

''تم نے ہائی اسکول تک تعلیم حاصل کی ہے۔ اس کے بعد کالج نہیں گئے؟'' اس نے کہا۔

''جی ہاں، زندگی نے زیادہ تعلیم حاصل کرنے کی مہلت نہیں دی۔''

''بہت بُرا ہے۔ تعلیم مکمل ہونی چاہیے۔'' اس نے طنزیہ انداز سے میری طرف دیکھا۔ ''چاہے کام کوئی بھی ہو، آدمی کو تعلیم یافتہ ضرور ہونا چاہیے جیسے میں۔ میں نے گریجویشن مکمل کرلی ہے۔''

اس کے انداز میں کچھ ایسی بات تھی کہ مجھے اس سے چڑ سی ہونے لگی۔ میں نے دل ہی دل میں اپنی لسٹ میں اس کے نام پر ایک اور ٹک لگادی۔

''تمہارا کوئی کرمنل ریکارڈ تو نہیں ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''بالکل نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''میرا ریکارڈ بالکل صاف ہے۔ معمولی سا جرم بھی نہیں کیا ہے میں نے۔ اور نہ ہی کسی معاملے میں عدالت میں جانے کی نوبت آئی ہے۔''

''ہوں۔'' اس نے ایک ہنکاری لی۔ ''اور کلائٹسن میں کتنے دن رہے تھے تم؟''

میں جانتا تھا کہ وہ بیکار قسم کے سوالات کررہی ہے۔ صرف وقت گزاری کے لیے۔ اور یہ بات میں بھی جانتا تھا اور اس کو بھی معلوم تھی کہ یہ جاب بالآخر مجھ ہی کو ملنے والی ہے کیونکہ میں خاموش جنت کا اشتہار گزشتہ دو مہینوں سے دیکھ رہا تھا اور ابھی تک ان کو کوئی ڈھنگ کا بندہ نہیں مل سکا تھا۔

''میں نے کلائٹسن میں کئی مہینے گزارے۔ اس کے بعد ٹوپیلو چلا گیا تھا۔'' میں نے بتایا۔

''پھر ٹوپیلو کیوں چھوڑ دیا؟'' اس نے سوال کیا۔

''اوہ، وہاں کسی نے مجھ سے بے وفائی کی تھی۔'' میں نے بتایا۔ حالانکہ یہ میری غلط بیانی تھی لیکن یہ بہانہ کئی مواقع پر کام آتا رہا ہے۔

''اوہ، افسوس ہوا سن کر۔'' وہ سرسری انداز میں بولی۔ حالانکہ میں بھی جانتا تھا کہ اس کو افسوس وفسوس کچھ بھی نہیں ہوا ہوگا۔

اس نے میری درخواست ایک طرف رکھ دی۔ ''تم کب سے کام شروع کرنا پسند کرو گے؟'' اس نے پوچھا۔

''جب سے تم کہو۔''

''کل شام سے آجاؤ۔''

میں اس کے کمرے سے باہر آگیا۔ مجھے ٹروڈی کے ساتھ بیٹھ کر فارم بھرنے اور دوسرے کاغذات لکھنے میں آدھ گھنٹا اور لگ گیا۔ اس موقع پر ٹروڈی کی تیوریاں چڑھی رہی تھیں۔ اسے اس بات کا احساس تھا کہ وہ اس اولڈ ہوم میں مجھ سے برتر درجہ رکھتی ہے۔

باہر آکر میں نے اپنی گاڑی میں بیٹھتے ہوئے اس اولڈ ہوم پر نظر ڈالی اور یہ سوچنے لگا کہ میں اس اولڈ ہوم میں کتنے دنوں کام کرسکوں گا۔ زیادہ سے زیادہ چار مہینے۔ کیونکہ یہی میرا ریکارڈ تھا۔

کلائٹسن میں میری عارضی قیام گاہ دو کمروں پر مشتمل تھی۔

وہ ایک پرانی خستہ عمارت تھی جبکہ اشتہارات میں اس کے حوالے سے دعوے کیے گئے تھے کہ جنت بے نظیر قسم کا مکان ہے اور ہر کمرے میں قیمتی اور آرام دہ فرنیچر بھی ہیں جبکہ وہاں ایسی کوئی چیز نہیں تھی۔

ایک پرانی مسہری۔ ایک طرف ایک قدیم سی الماری۔ دیوار کے ساتھ ایک ایسا صوفہ جس کے کشن کے رنگ اُڑ چکے تھے۔ درمیان میں ایک چھوٹی سی میز۔

کونے میں ایک ریفریجریٹر بھی تھا جس کے چلاتے ہی گھر گھر کی آوازیں گونجنے لگتیں۔ اس کے علاوہ چولہا شاید استعمال کے قابل ہی نہیں تھا۔

ان دو کمروں کا کرایہ بیس ڈالر ہفتہ وار تھا۔ اس کی مالکہ ایک ایسی عورت تھی جس کی صحیح عمر کا اندازہ بھی نہیں لگایا جاسکتا تھا۔ شاید وہ پچاس اور اسّی کے درمیان کی کوئی چیز تھی۔ روبی نام تھا اس کا۔

اس نے کمرے کی چابی دینے سے پہلے کہا۔ ''اس کمرے میں کوئی بھیڑ بھاڑ اور کوئی پارٹی وغیرہ نہیں ہوگی۔''

''بالکل نہیں ہوگی۔'' میں نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

''تم چونکہ پہلی بار آئے ہو اس لیے میری طرف سے

ایک گلاس حاضر ہے۔'' اس نے کہا۔

وہ مجھے کافی روم میں لے آئی اور مجھے بٹھا کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ کچھ دیر بعد وہ دو گلاس اور ایک بوتل لے آئی تھی۔

میں نے اس کا دل رکھنے کے لیے چسکیاں لینا شروع کر دیں۔ مجھے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ ایک تنہا عورت ہے اور وہ یہ چاہتی ہے کہ کوئی اس کے ساتھ بیٹھے اور باتیں کرے۔

اس نے شہر اور آس پاس کے لوگوں کے بارے میں بتانا شروع کر دیا کہ کون کیا ہے۔ کس کا کیا نیچر ہے، وغیرہ وغیرہ۔

ظاہر ہے مجھے ایسی باتوں سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی اس لیے میں اس کی باتیں سنتا رہا اور بور ہوتا رہا۔ یہ اور بات ہے کہ میں نے اپنی بیزاری کا اظہار نہیں کیا۔

کچھ دیر بعد جب اس نے دوسرے گلاس کی بات کی تو میں نے نرمی سے انکار کر دیا اور اس سے اجازت لے کر کافی روم سے باہر آ گیا۔

نینسی نام تھا اس بوڑھی نرس کا جس کے ہونٹوں پر ایک خوش گوار سی مسکراہٹ ہوا کرتی اور جس کا لہجہ بہت شفیق تھا۔ اس کے ذمے یہ کام لگایا گیا تھا کہ وہ مجھے اس اولڈ ہوم سے متعارف کروا دے۔ وہ مجھے ایک وارڈ سے دوسرے وارڈ اور ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں لے جاتی رہی۔

وہ بہت بڑا اولڈ ہوم تھا۔ صفائی کا خاص خیال رکھا گیا تھا۔

ہر جگہ مجھے ایک ہی جیسے تاثرات کے چہروں والے لوگ ملتے رہے۔ اداس اور پریشان لوگ۔ کسی کی آنکھوں میں گزرے ہوئے دنوں کی یادیں تھیں تو کسی کی آنکھیں بجھ گئی تھیں۔ شاید اپنوں کی راہ دیکھتے دیکھتے۔ ان پریشان حال اور اداس لوگوں کو دیکھ کر افسوس بھی ہو رہا تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جو زندگی گزار چکے تھے اور اب اپنے آخری دن کے انتظار میں تھے۔

ہر کمرے میں دو دو آدمی تھے۔ میں بڑی خوش دلی سے انہیں ہیلو کہتا چلا گیا لیکن اُن کے چہرے سپاٹ ہی رہے۔

نرس نینسی پھر مجھے اولڈ ہوم کے ایسے حصے میں لے آئی جہاں عام طور پر ذہنی مریض رکھے جاتے تھے۔

''یہ کچھ مشکل لوگ ہیں۔'' اس نے بتایا۔ ''اسی لیے

خاموش خنت

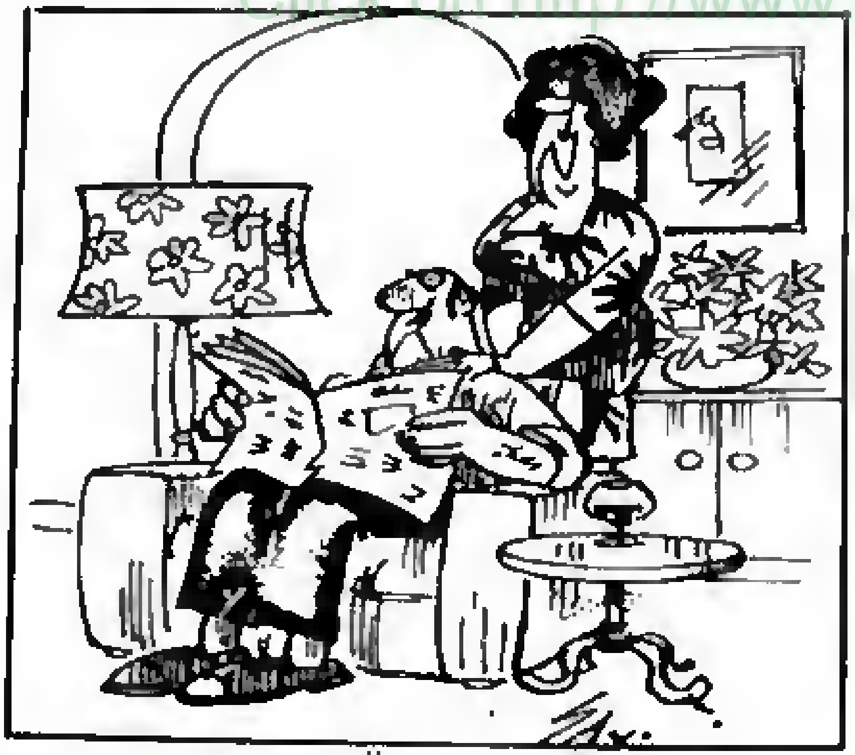

ڈیئر تمہاری سالگرہ پر کیا تحفہ دوں ؟

ویسے تو تمہارے پاس میری ضرورت کی ہر چیز موجود ہے

ایک کمرے میں ایک ہی کو رکھا گیا ہے۔''

اس نے مریضوں کے نام بتائے، ان سے تعارف کروایا اور میں بغیر کسی حادثے یا واقعے کے اس مرحلے سے بھی گزر گیا۔

پھر اس نے مجھے کچن دکھایا جو اچھا خاصا بڑا تھا۔ پھر فارمیسی دکھائی۔ جہاں فوری دوائیں دستیاب تھیں۔ وہ بڑا کمرا دکھایا جہاں یہ مریض کھانا کھایا کرتے اور ایک دوسرے سے گپ شپ کیا کرتے۔

اس نے مجھے ان مریضوں کے حوالے سے ہدایات دیں کہ مجھے ان کی دیکھ بھال کے سلسلے میں کیا کرنا ہے اگر کسی کے ساتھ کوئی ایمرجنسی پیش آ جائے تو ایسی صورت میں کیا کرنا ہے۔ کسی ڈاکٹر کو بلانا ہے وغیرہ وغیرہ۔ ویسے اس قسم کی باتیں میرے لیے نئی نہیں تھیں۔ میں پہلے بھی ایسے مراحل سے گزر چکا تھا۔ ہم پھر استقبالیہ میں واپس آ گئے، جہاں کاؤنٹر کے پیچھے کھڑے ہو کر نینسی نے مجھے کچھ اور بتانا شروع کر دیا۔

اسی وقت ایک تیز بھونپو کی آواز سنائی دی۔ ایسا بھونپو جو کبھی ٹرک یا بھاری گاڑیوں میں لگایا جاتا تھا۔

''دیکھو اسے۔'' نینسی چلائی۔

میں کمرے سے باہر آ گیا۔

طویل برآمدے میں ایک وہیل چیئر تیزی سے دوڑتی چلی آ رہی تھی۔ ایک بوڑھا شخص اس پر بیٹھا تھا۔ وہ بھونپو ایک پہیے کے پاس لگا ہوا تھا۔

اس بوڑھے کی عمر ساٹھ سے زیادہ ہی ہو گی۔ اس نے پاجامہ پہن رکھا تھا۔ اس کی قمیص سے اس کا پیٹ جھانک رہا

تھا۔

’’رک جاؤ والٹر۔‘‘ نینسی چلائی۔ ’’کیوں شور کررہے ہو؟‘‘

اس وہیل چیئر کو دھکا دیتے ہوئے لایا جارہا تھا۔ دھکا دینے والا بھی پچاس کے لگ بھگ ہوگا۔ برآمدے میں موجود دوسرے مریض اِدھر اُدھر سمٹ گئے تھے۔

’’یہ والٹر ہے۔‘‘ نینسی نے بتایا۔ ’’اس کی یہی حالت ہے۔ اس کو اپنی وہیل چیئر سے بہت پیار ہے۔ دن بھر اس پر گھومتا رہتا ہے۔‘‘

’’اور اس کو دھکیلنے والا کون ہے؟‘‘ میں نے پوچھا۔

’’اس کا نام ٹونی ہے۔‘‘ اس نے بتایا۔ ’’یہ دونوں دن بھر میں کم از کم تیس چالیس چکر پورے برآمدے کے لگاتے رہتے ہیں۔ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ لانگ ڈرائیو پر نکلے ہیں۔ ایک بار وہیل چیئر سے گر کر زخمی بھی ہوچکا ہے۔‘‘

وہ وہیل چیئر ہارن بجاتی ہوئی ہمارے برابر سے گزر گئی۔

ہم نے کوشش کی تھی لیکن بات نہیں بنی۔

اب مجھے اپنی ڈیوٹی سنبھالنی تھی لیکن ابھی نہیں۔ کم از کم تین گھنٹوں کے بعد۔ ابھی بہت وقت تھا۔ میں اپنے اپارٹمنٹ بھی نہیں جاسکتا تھا۔ وہ یہاں سے بہت دور تھا اس لیے میں نے وہیں وقت گزارنے کا فیصلہ کرلیا۔ اِدھر اُدھر بھٹکتا رہا۔ لوگوں سے الٹی سیدھی باتیں کرتا رہا۔

مس ولما سے باتیں کیں۔ جو ہمیشہ کی طرح مصروف دکھائی دے رہی تھی۔ پھر کچن میں آگیا۔ وہاں دو سیاہ فام خواتین کھانا بنانے میں مصروف تھیں۔

میں نے ان سے اپنا تعارف کروایا۔ گپ شپ کی اور ڈائننگ روم میں آگیا۔ سات بجنے والے تھے۔ رات کے کھانے کا وقت ہوچلا تھا۔

روم میں لوگ آ آ کر جمع ہونے لگے تھے۔ بہت سے لوگ کسی مددگار کے ساتھ آرہے تھے اور کچھ ایسے بھی تھے جو خود آرہے تھے۔

مجھے بتایا گیا تھا کہ خاموش جنت میں اس وقت باون مریض ٹھہرے ہوئے ہیں۔ میں نے ان کے پاس جاکر اپنا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔ ’’اگر آپ لوگوں کو اس وقت کسی مدد کی ضرورت ہو تو مجھے بتادیں۔‘‘

جب کھانا لگادیا گیا تو دعائیہ تقریب ہوئی۔

یہ تقریب روزانہ ہوا کرتی۔ ریٹائرڈ پادری ڈان رات کے کھانے سے پہلے دعا کروایا کرتا تھا۔ وہ نوے برس کا بوڑھا تھا لیکن اس کی آواز حیرت انگیز طور پر ابھی تک صاف اور بلند تھی۔ وہ بہت دیر تک دعائیں پڑھتا رہا۔

اس کی دعاؤں کے اختتام پر چھریوں اور کانٹوں کی آوازیں گونجنے لگیں۔ پلاسٹک کی ٹریز میں کھانے سرو کیے گئے تھے۔

کھانے کے اختتام پر ایک شو تھا۔

شو کیا تھا۔ شہر کے کسی اسکول کے بچے وزٹ کرنے آئے ہوئے تھے۔ وہ بچے مریضوں کے لیے بسکٹ اور پھل وغیرہ لے کر آئے تھے۔ ان کی استانیاں اور استاد ان کے ساتھ تھے۔

اس مرحلے کے بعد انہیں کچھ گیت سنانے تھے۔ کھانے سے فارغ ہوکر سب بڑے پیانو کے پاس جمع ہوگئے۔ نو سے بارہ سال تک کے بچے بچیوں کا یہ گروپ گانے سناتا رہا۔

شو کے اختتام پر بچے واپس چلے گئے اور مریضوں نے اپنے اپنے کمروں کا رخ کیا۔

اس وقت میں نے بھی اپنی ڈیوٹی کے طور پر کئی مریضوں کی وہیل چیئر کو ان کے کمروں تک پہنچایا۔ اس کے بعد ایک معاون کے ساتھ مل کر ڈائننگ روم کی صفائی کروائی۔ اس میں اچھا خاصا وقت گزر گیا تھا۔

اب مجھے ایک اور مرحلہ تھا۔ یہ مرحلہ اس قسم کے ہر نرسنگ ہوم اور ہر اسپتال میں پیش آیا کرتا ہے۔ سونے سے پہلے ہر مریض کو دوا دینی۔

یہ دوا عام طور پر ان کے لیے خواب آور ہوا کرتی ہے۔ وہ اپنے اپنے گزشتہ دنوں کو یاد کرتے ہوئے سو جایا کرتے ہیں۔

جب وہ بھی کسی مریض کی تیمارداری کرتے تھے۔ بچہ بیمار ہوجائے تو اس کی دیکھ بھال کرتے تھے لیکن یہ بہت پرانی بات تھی۔ اب تو وہ بیمار بچہ تندرست ہوکر، بڑا ہوکر انہیں بھول بھی گیا ہے۔ اس لیے وہ اس اولڈ ہوم میں پڑے ہوئے ہیں۔

گولیاں کھالینے کے بعد سناٹا ہوجاتا ہے۔ سب کے سب سوجاتے ہیں۔ رات دس بجے روشنیاں گل کردی جاتی ہیں۔ مجھے معلوم تھا کہ اس پورے جنوبی حصے کا اس وقت نگراں صرف میں ہوں جبکہ شمالی حصے کا نگراں کوئی اور ہوگا اور اس طرف یہاں مشکل قسم کے مریض ہوتے ہیں۔ وہاں دوا اور ہوں گے۔

یعنی اب اس طرف کے حصے میں میں اکیلا تھا اور اپنی کارروائی کرسکتا تھا۔

میں نے سب سے پہلے استقبالیہ کاؤنٹر کے درازوں اور الماریوں کا جائزہ لیا۔ مریضوں کی لسٹ دیکھی۔ لاگ بک اور چندے وغیرہ کی رسیدیں دیکھیں۔

ہاں ایسے موقعوں پر میرے پاس ایک پاکٹ سائز کیمرا ضرور ہوتا ہے جو ایسے موقعوں پر بہت کام آتا ہے۔ یہ گندے باتھ رومز، خستہ حال کچن، بے حال مریضوں وغیرہ کی تصاویر لینے میں کام آتا ہے۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت کچھ ہوا کرتا ہے۔

ہڈرڈ کاؤنٹی کورٹ ہاؤس شہر کے درمیان میں واقع ہے۔

اس عمارت کے اردگرد کے لان بہت خوب صورت ہیں جن میں لوگوں کے بیٹھنے کے لیے بینچیں بنائی گئی تھیں۔ چوراہے کے وسط میں تانبے سے بنا ہوا کسی سپاہی کا بڑا سا مجسمہ ہے۔ جس کے ہاتھ میں ایک بندوق ہے اور جو سامنے کی طرف دیکھ رہا ہے۔ جیسے دشمنوں کو گھور رہا ہو۔

اس چوک میں ہر چار جولائی کو ایک شاندار پریڈ ہوا کرتی ہے اور تقریریں ہوتی ہیں۔ یہ تو باہر کا حال ہے۔

اور عمارت کے اندر زمینوں وغیرہ کے کاغذات اور ریکارڈ ہوتے ہیں۔ مختلف قسم کے وصیت نامے آس پاس کی زمینوں کے حساب کتاب، انکم ٹیکس ریٹرن وغیرہ وغیرہ۔ اور یہ سارے کاغذات میرے مشن کو آگے بڑھانے کے لیے بہت مفید ہیں۔

اس قسم کی عمارتوں میں داخل ہونے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ وکیلوں جیسا حلیہ بنا کر جائیں۔ آپ کو کوئی پوچھنے والا نہیں ہوگا۔

آپ سے کوئی اس وقت بات نہیں کرتا جب تک آپ خود اس سے بات نہ کریں اور ظاہر ہے کہ میں کسی سے بات نہیں کرتا۔

میرا پہلا وزٹ سرسری سا ہوتا ہے۔ صرف ماحول کا اندازہ لگانے کے لیے۔ خوب اچھی طرح پورے اعتماد کے ساتھ۔

کسی بھی ادارے یا کسی بھی گھر کے بارے میں سن گن لینے کے لیے آپ کو اس ادارے یا گھر کے کسی بڑے سے ملنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ اس گھر کے عام ملازمین سے آپ اس ادارے یا گھر کے بھید لے سکتے ہیں اور اس قسم کے عام ملازمین عام طور پر کچن میں پائے جاتے ہیں۔

کھانے بنانے والے باورچی، یہ بھی عام طور پر خواتین اور سیاہ فام ہوں تو زیادہ مناسب ہیں۔ ان سے بہت کچھ معلوم کیا جاسکتا ہے۔

جہاں میں جاتا ہوں۔ اس قسم کے بھید حاصل کرنے کو اپنے لیے ایک چیلنج سمجھ کر قبول کر لیتا ہوں۔ طریقہ کار آسان ہوتا ہے۔

کچن میں جاکر ان سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنی اور ان کے بنائے ہوئے بدمزہ کھانوں کی بے حد تعریف کرنی، اس کے ساتھ ساتھ ان کی زندگی کو کریدتے رہنا، آہستہ آہستہ وہ کھل ہی جاتی ہیں۔

ہمارے ادارے میں کام کرنے والی روزیلی بھی ایسی ہی تھی۔

وہ ایک سفید فام عورت تھی۔ پچاس اور پچپن کے درمیان کی۔ شاید تنہا زندگی گزار رہی تھی۔ اسی لیے مجھے اسے شیشے میں اتارنے میں دیر نہیں لگی تھی۔

میں اس کی مہربانیاں حاصل کرنے میں ناکام نہیں رہا تھا۔ جب میں سات بجے اپنی ڈیوٹی پر پہنچتا تو وہ میرے لیے انڈے اور کافی تیار رکھتی۔

صبح کا ناشتا بھی اس کے ساتھ کر کے میں سات بجے رخصت ہوجاتا تھا لیکن مکمل طور پر نہیں جاتا تھا۔ بلکہ اور کچھ دیر اِدھر اُدھر بھٹکتا رہتا۔

میں روزیلی کو شکایت کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا۔ اس لیے میں وقت سے پہلے اپنی ڈیوٹی پر پہنچتا اور وقت کے بعد وہاں سے روانہ ہوتا۔

روزیلی سے دوستی کرنے کے بعد یہ ہوا کہ مجھے وہاں کام کرنے والوں اور مریضوں کے بارے میں بہت کچھ معلوم ہوتا چلا گیا۔

اس نے ولما کے بارے میں کچھ بتایا۔ روبی کے بارے میں انکشافات کیے اور بھی کئی لوگوں کے بارے میں اپنے تاثرات اور مشاہدات بیان کرتی ہوئی وہ جب ایک بوڑھے مریض لائل پر آئی تو اس کا منہ بن گیا۔

”میرا خیال ہے کہ اس سے زیادہ کمینہ فطرت بوڑھا روئے زمین پر کوئی نہیں ہوگا۔“ اس نے بتایا۔

”وہ کیسے؟“

”وہ ایک نمبر کا جنسی مریض ہے۔ عورتوں کو دیکھتے ہی ان کو پکڑنے کی کوشش کرتا ہے۔ چاہے وہ نرس ہو یا کوئی

مریضہ ہو، ایک بار تو اس نے گرجا گھر سے آئی ہوئی ایک نن پر بھی جنسی حملہ کر دیا تھا۔''

''اوہ، لیکن وہ تو بہت بوڑھا ہو چکا ہے۔''

''ہاں، اس کی عمر چوراسی برس ہے۔'' روزیلی نے بتایا۔ ''لیکن اس کی حرکتیں وہی ہیں۔ حالانکہ اسے شوگر ہے۔ اس کی ایک ٹانگ زہر پھیلنے کی وجہ سے کاٹی جا چکی ہے لیکن اس کے دونوں ہاتھ تو سلامت ہیں نا، اور وہ ان ہی ہاتھوں سے عورتوں پر حملہ کر دیتا ہے۔ اس لیے کوئی نرس اس کے قریب نہیں جاتی۔''

''اوہ، یہ تو بیڈ کہانی ہے۔''

''ہاں۔'' روزیلی نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے سرگوشی کی۔ ''ایک بار تو وہ کم بخت پکڑا بھی جا چکا ہے۔''

''میں نہیں سمجھا، کیسے پکڑا گیا تھا؟''

''ایک نرس کے ساتھ۔'' اس نے بتایا۔ ''وہ نرس بھی ویسی ہی تھی۔ بدمعاش قسم کی۔ دونوں پیچھے والے ایک کمرے میں پکڑے گئے تھے۔''

''کس نے پکڑا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے جواب دینے سے پہلے پھر اس طرح دیکھا جیسے کسی بڑے راز کا انکشاف کرنے جا رہی ہو۔ کچن میں موجود دوسرا کک کافی بنانے کی مشین سے الجھا ہوا تھا اور وہ اتنے فاصلے پر تھا کہ ہماری باتیں نہیں سن سکتا تھا۔

''اینڈی نے پکڑا تھا۔'' اس نے بتایا۔ ''اینڈی کو تو جانتے ہو نا؟''

''ہاں، وہ جو پچھلے کمروں کی دیکھ بھال کرتا ہے۔''

''ہاں ہاں وہی..... ایک بات اور بتاؤں۔ تم نے مسٹر لوک مالون کو تو دیکھا ہوگا؟''

''ہاں، وہ بے چارہ بوڑھا۔ میرا خیال ہے کہ وہ نوے برس سے کم کا نہیں ہوگا۔ اس کے ساتھ ہی وہ بے چارہ نابینا بھی ہے۔'' اس بوڑھے کی نگرانی میرے ہی ذمے تھی۔ اس لیے میں نے روزیلی کو اس کے بارے میں بتا دیا تھا۔

''یہ اب سے کئی برس پہلے کی بات ہے۔ مسٹر لوک کی بیوی اپنے شوہر کو دیکھنے کے لیے آیا کرتی تھی۔'' روزیلی نے بتایا۔ ''وہ اپنے شوہر سے بہت کم عمر کی تھی اور ٹھیک ٹھاک تھی۔ نہ جانے کس طرح اس کم بخت بوڑھے لائل نے اس سے دوستی کر لی۔ یوں سمجھو کہ ان دونوں کا چکر ہی شروع ہو گیا۔''

''بہت دلچسپ، پھر کیا ہوا؟''

''ہونا کیا ہے۔ شوہر بے چارہ دیکھ نہیں سکتا تھا۔ اس لیے بہت دنوں تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ پھر اس عورت کا انتقال ہو گیا۔''

دو راتوں کے بعد میں ایک میگزین لے کر روم نمبر چودہ میں داخل ہوا۔ وہ بوڑھا ہوس زدہ لائل اس کمرے میں ہوتا تھا۔ میں یہ بتا چکا ہوں کہ ہر کمرے میں دو مریض رکھے جاتے تھے۔ دونوں کے بستروں کے درمیان خاصا فاصلہ ہوا کرتا تھا۔

میں اپنی ڈیوٹی پر تھا اور اس وقت میری ڈیوٹی یہ تھی کہ میں مریضوں کو نیند کی گولیاں کھلا دوں۔ لیکن اپنے ساتھ نیند کی گولیاں نہیں لایا تھا۔ بلکہ عام سے درد کی گولیاں تھیں۔ لائل کا ساتھی اس وقت بے خبر سو رہا تھا۔ میں نے لائل کے پاس جا کر کہا۔ ''یہ لو، یہ گولی کھا لو۔ اس کے بعد تمہیں ایک تحفہ دوں گا۔''

تحفے کے لالچ میں اس نے جلدی سے وہ گولی نگل لی۔

''یہ لو۔'' میں نے میگزین اس کی طرف بڑھا دیا۔ ''انجوائے کرو۔''

وہ فحش تصاویر والا میگزین تھا۔ لائل نے اس طرح اسے اُچک لیا جیسے برسوں کا بھوکا روٹی پر جھپٹتا ہے۔

''خبردار، کسی کی نظر نہ پڑے۔'' میں نے تنبیہ کی۔

''تمہارا بہت بہت شکریہ۔'' اس کی آواز کانپ رہی تھی۔

''خاموش جنت'' کی حدود میں اس قسم کے میگزین لانا جرم تھا۔ یہاں شراب بھی نہیں پی جا سکتی تھی۔ سگریٹ پینے والے بھی عمارت سے باہر جا کر سگریٹ پیا کرتے تھے۔ ایسے ماحول میں اس قسم کا کوئی میگزین لائل کے لیے کسی نعمت سے کم نہیں تھا۔ وہ بار بار میرا شکریہ ادا کر رہا تھا۔

''کوئی بات نہیں۔'' میں نے اس کے شانے پر تھپکی دی۔ ''بس ذرا احتیاط رکھنا۔''

میں نے اسے اپنا دوست بنا لیا تھا۔

میں اس کے بارے میں مواد جمع کرتا رہا۔ اس نے تین شادیاں کی تھیں۔ اس کی اولادیں بھی تھیں لیکن شاید سب نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اس کی زندگی اولڈ ہوم میں اچھی گزر سکتی ہے۔ اسی لیے اسے اولڈ ہوم میں داخل کرا دیا تھا۔ لیکن آنے جانے والوں کی لاگ بک دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا تھا کہ اس کو داخل کرانے کے بعد سب اسے تقریباً بھول گئے تھے۔

اس کی ایک شادی شدہ بیٹی تھی جس نے ایک دولت مند ٹھیکیدار سے شادی کی تھی۔ وہ صرف دو بار اس بوڑھے کو دیکھنے آئی تھی۔

لائل کا ایک بیٹا تھا جو کسی ریلوے کمپنی میں کام کرتا تھا۔ وہ ایک بار بھی نہیں آیا تھا اور نہ ہی اس نے کبھی کوئی کارڈ وغیرہ بھیجا تھا۔

لائل زندگی بھر بجلی کی مصنوعات کی ایک دکان چلاتا رہا۔ اس کے پاس سرمایہ یا جائداد نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔

پھر اس نے تیسری شادی کی۔ اس عورت کے پاس کلنٹن میں ستر ایکڑ زرعی زمین تھی جو اس کی موت کے بعد لائل کے پاس آ گئی تھی۔

میں نے یہ ساری معلومات حاصل کرنے اور زمین کے کاغذات وغیرہ کی تلاش میں کئی دن لگائے۔ یہاں وہی وکیل کے حلیے والا حربہ کام آیا تھا اور جب میری تلاش مکمل ہوئی تو اندازہ ہوا کہ میری محنت رائگاں نہیں گئی ہے۔

اس رات میرا آف تھا۔ اور مس روبی کی یہ خواہش تھی کہ میں اس کے ساتھ برگر کھانے چلوں۔ مس روبی کے پاس ایک پرانی کیڈی لاک تھی۔ جہازی سائز کی اس گاڑی کو چلاتے ہوئے مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا، جیسے میں کوئی بس چلا رہا ہوں۔

روبی اس دوران سگریٹ کے کئی کش لیتی اور بیئر کے گھونٹ بھرتی رہی تھی۔ ہم نے ایک پوائنٹ سے روبی کی پسند کے برگر کھائے اور واپس آ گئے۔ بہرحال اس کے ساتھ وقت اچھا گزرا تھا۔

روبی سے کئی بار کی ملاقاتوں اور باتوں کے بعد اس کے بارے میں یہ معلوم ہوا کہ وہ بے چاری ایک تنہا عورت ہے۔ کوئی نہیں تھا اس کا۔

ایک دن جب میں نے روزیلی کو بتایا کہ میں کہاں رہتا ہوں۔ تو وہ شاک سی ہو کر رہ گئی۔ اس نے جلدی جلدی اپنے سینے پر کراس بناتے ہوئے کہا۔ ”ہوش میں آؤ لڑکے، یہ تم کہاں رہنے لگے ہو؟ جتنی جلد ہو تم وہ جگہ چھوڑ دو۔ کیونکہ وہاں کے در و دیوار پر شیطان کا قبضہ ہے۔“

اب پتا نہیں اس رات وہاں شیطان کا قبضہ تھا یا کچھ اور تھا۔ بہرحال میرے کمرے کی چھت کے اوپر یعنی اوپر والے کمرے سے ایک عورت اور ایک مرد کی آوازیں آ رہی تھیں جبکہ میں یہ جانتا تھا کہ اوپر والا کمرا بالکل خالی رہتا ہے۔

دوسری صبح بیدار ہو کر میں نے قریبی بیکری کا رخ کیا۔ وہاں سے اچھے سے بسکٹ خریدے اور واپس اپنی قیام گاہ پر پہنچ گیا۔

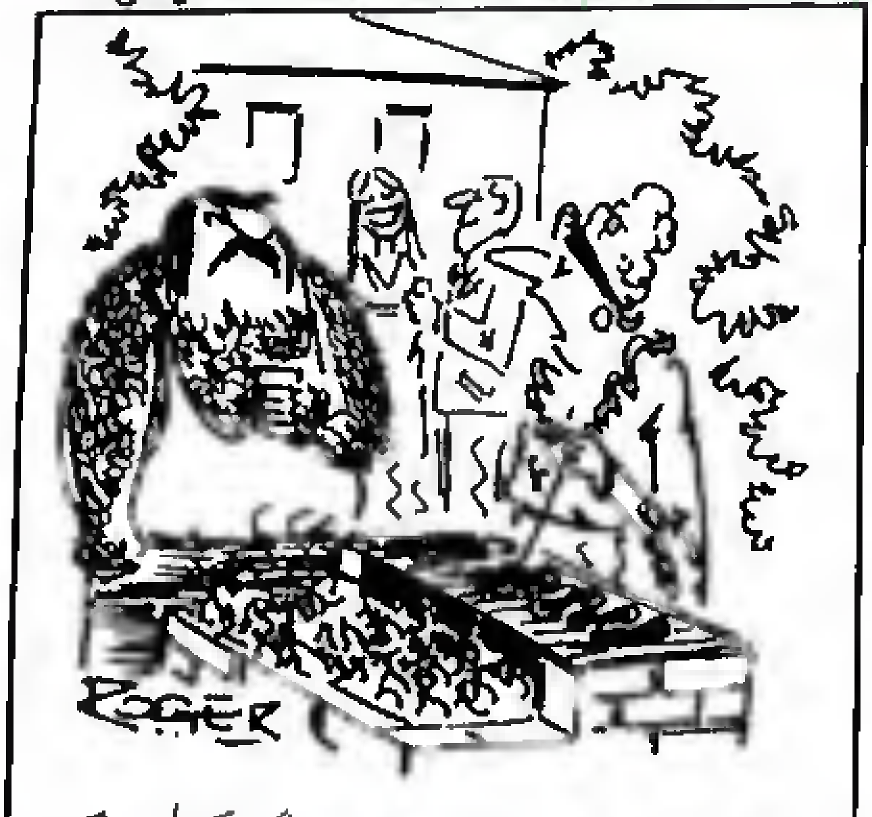

چولہے سے دور رہو... تمہارے بال آگ پکڑ لیں گے

روبی اس وقت سو رہی تھی۔ جب میں نے اس کے دروازے پر دستک دی۔ کچھ دیر بعد وہ آنکھیں ملتی ہوئی باہر آ گئی۔

”روبی! میں تمہارے لیے بسکٹ لایا ہوں۔“

”بہت خوب!“ وہ مسکرا دی۔ ”تم کچن میں چلو، میں آ کر کافی بنا دیتی ہوں۔“

کافی پینے کے دوران میں نے اس سے دریافت کیا۔ ”میرے کمرے کے اوپر والے کمرے میں کون رہتا ہے۔“

”کوئی نہیں، وہ کمرا تو خالی ہے۔“

”لیکن میں نے رات آوازیں سنی ہیں۔“

”اوہ، وہ ٹیمی ہوگی۔“ اس نے بتایا۔ ”وہ جمعہ اور ہفتہ کی رات اپنے کسٹمرز کو لے کر آیا کرتی ہے۔“

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ”کون ہے یہ ٹیمی؟“

”میری ہی ایک کارکن ہے۔“

”کتنی لڑکیاں ہیں تمہارے پاس؟“ میں نے پوچھا۔

”پہلے تو اچھی خاصی تھیں۔ اب گنتی کی رہ گئی ہیں۔“ اس نے بتایا۔ ”ٹیمی کا شوہر ایک ٹرک ڈرائیور ہے۔ وہ جمعہ اور ہفتہ کی رات کو شہر سے باہر رہتا ہے تو ٹیمی یہاں آ جاتی ہے۔“

”ہوں۔“ میں نے ایک ہنکاری لی۔ ”تم نے اس

جگہ کے بارے میں پہلے سے کیوں نہیں بتایا؟''

''تم نے پہلے پوچھا ہی کہاں تھا۔''

''یہ بھی ٹھیک ہے۔'' میں نے ایک گہری سانس لی۔ ''ویسے تمہاری اس ٹیمی کا معاوضہ کتنا ہوتا ہے؟''

''کوئی طے نہیں ہے۔ ویسے تمہاری سفارش کر سکتی ہوں۔''

''رہنے دو، بعد میں اس پر بات کروں گا۔''

تین دن گزر گئے۔ تین دنوں کے بعد میں ولما کے سامنے بیٹھا ہوا اسے مشورے دے رہا تھا کہ کس طرح اس نرسنگ ہوم کو زیادہ بہتر طور پر چلایا جا سکتا ہے۔

میں دراصل یہ جاننا چاہتا تھا کہ ان تین دنوں کے دوران میرے خلاف کسی نے کوئی شکایت تو نہیں کی ہے۔

لیکن سب ٹھیک تھا۔ میرے خلاف کوئی شکایت نہیں تھی۔ البتہ ولما کو اس بات پر حیرت تھی کہ میں ڈیوٹی ختم ہو جانے کے بعد بھی بہت دیر تک یہیں رہتا ہوں۔

''اور ہاں، یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ تم کچن میں اچھا خاصا وقت گزارتے ہیں۔'' اس نے کہا۔

''میڈم، کیا یہ یہاں کے کسی اصول کے خلاف ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں تو، ایسی تو کوئی بات نہیں ہے لیکن ایسا چونکہ ہوتا نہیں ہے۔ اس لیے حیرت ہوئی تھی۔''

''بس میڈم یونہی۔ وقت گزارنے کے لیے گپ شپ کر لیتا ہوں۔'' میں نے بتایا۔

''ایک بات اور، بوڑھے لائل کے بستر کے نیچے سے ایک فحش قسم کا میگزین ملا ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''کیا تمہیں اندازہ ہے کہ ایسا میگزین اسے کس نے لا کر دیا ہوگا۔''

''نہیں میڈم، مجھے کوئی اندازہ نہیں ہے۔ آپ نے اس سے پوچھا ہوتا۔''

''میں نے پوچھا تھا لیکن وہ کوئی جواب دینے کے لیے تیار نہیں ہے۔'' ولما نے بتایا۔

''میرا خیال ہے کہ اگر وہ بوڑھا لائل اپنے آپ کو بہلانے کے لیے اس قسم کی حرکتیں کر رہا ہے تو اسے اس کی اجازت ہونی چاہیے۔'' میں نے کہا۔

ولما نے کہا تو کچھ نہیں۔ لیکن اس کے ہونٹوں پر ایک باریک سی لکیر نمودار ہو گئی۔ پھر وہ میری طرف دیکھ کر بولی۔ ''مسٹر گرونن! تمہاری اب تک کی رپورٹ میرے سامنے ہے۔ تمہاری کارکردگی اچھی ہے۔''

''شکریہ مس ولما۔''

میں کچن واپس آ گیا۔ جہاں روزیلی نے میرے لیے کافی تیار کر رکھی تھی۔ ولما سے باتیں کرنے کے بعد یہ اندازہ ہوا تھا کہ وہ اتنی بری نہیں ہے جتنا میں نے پہلی بار خیال کیا تھا۔

میں نے اس کا نام ہٹ لسٹ سے نکالا تو نہیں لیکن تیسرے نمبر پر رکھ لیا۔

میں نے کچھ اور دن لگا کر، کچھ اور محنت کر کے اپنی ریسرچ مکمل کر لی۔ مجھے بہت کچھ معلوم ہو چکا تھا۔ اس کے لیے میں نے پرانے ریکارڈز چھانے، فائلیں دیکھیں اور برسوں پرانے اخبارات کا مطالعہ کیا۔ تب جا کر بہت کچھ معلوم ہو سکا۔

ایک مسٹر پلانک تھے جن کی تین سو ایکڑ کی زمین کلنٹن شہر سے کچھ فاصلے پر تھی۔ پلانک نے وصیت نامہ مرتب تو کر لیا تھا لیکن وہ ابھی تک کسی کو فائدہ نہیں پہنچا سکا تھا۔ اس کی بیوی کا انتقال بھی گیارہ برس پہلے ہو چکا تھا۔

دوسرا بوڑھا لائل تھا۔ اس کے پاس بھی بہت زمین تھی۔ لائل کے حالات میں بتا چکا ہوں۔ اور ہاں، اس مکان کی مالکہ روبی تھی، میں جس مکان میں کرائے پر کمرا لے کر رہ رہا تھا۔

اس کے بارے میں ریسرچ کرنے کے بعد اتنا معلوم ہو سکا تھا کہ اس نے تین شادیاں کی تھیں جو سب ختم ہو گئیں۔ اس کی اولاد کوئی نہیں تھی۔ اس کے پاس قابلِ ذکر جائداد وغیرہ بھی نہیں تھی۔ سوائے اس مکان اور اس پرانی کیڈی لاک کے۔

اس کے باوجود اس میں میری دلچسپی کم نہیں ہوئی تھی۔

وہ اکثر مجھے اپنے ساتھ بیٹھ کر پینے کے لیے کہتی اور میں اس کی بات مان لیتا۔ اس دوپہر کو بھی ایسا ہی ہوا۔ اس نے مجھے دعوت دی جو میں نے قبول کر لی۔

میں نے باتوں باتوں میں اس سے کہا۔ ''مس روبی! کیا میں کبھی تمہاری گاڑی استعمال کر سکتا ہوں۔''

''کیوں، تمہاری گاڑی کے ساتھ کیا ہوا؟'' اس نے پوچھا۔

''وہ کچھ پریشان کر رہی ہے۔'' میں نے کہا۔

''خیریت تو ہے۔ کیا تمہیں کہیں دور جانا ہے؟''

''تم یہ بتاؤ کیا تم کسی لائل نام کے آدمی کو جانتی ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''لائل۔'' اس نے اپنے ذہن پر زور دیا۔ ''نہیں،

اس وقت تو یاد نہیں آرہا۔ کیوں کیا بات ہوگئی؟''

''وہ ایک بوڑھا آدمی ہے۔'' میں نے بتایا۔ ''اولڈ ہوم میں ہے۔ میرا پسندیدہ مریض ہے۔ میں اسے اپنے ساتھ فلم دکھانے لے جانا چاہتا ہوں۔''

''کون سی فلم؟''

''وہی، جیسے دوسری قسم کے لوگ دیکھتے ہیں۔'' میں نے ایک آنکھ دبا کر کہا۔

روبی مسکرا دی۔ ''بدمعاش آدمی ہو تم۔ اس قسم کی فلم دکھانے ایک بوڑھے کو اپنے ساتھ لے جاؤ گے؟''

''ہاں، میں اسے زندگی کی طرف واپس لانا چاہتا ہوں۔'' میں نے بتایا۔

روبی مسکرا دی۔ میں نے اولڈ ہوم میں اس بوڑھے لائل کے حوالے سے اب تک جو کچھ بھی سنا تھا، وہ اسے بتا دیا۔ وہ بہت مزے لے لے کر سنتی اور ہنستی رہی بلکہ میرا اندازہ ہے کہ وہ خود بھی اس سے ملنے کی خواہش کر رہی ہو گی۔

میں نے اپنے طور پر انتظامات مکمل کر رکھے تھے۔ اس لیے مجھے مس اینجلی کی زیادہ پروا نہیں تھی۔ اینجلی دوسری شفٹ کی انچارج تھی۔ وہ اپنے آپ کو بہت لیے دیے رکھتی۔ اس کا لہجہ بھی سخت ہوا کرتا تھا۔

اس نے لائل کو باہر لے جانے کی تجویز یکسر رد کر دی تھی۔ ''نہیں، تم اسے نہیں لے جاسکتے۔ یہ اصول کے خلاف ہے۔''

''لیکن میں نے ولما سے باقاعدہ تحریری اجازت لے لی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''تم فائل میں دیکھ سکتی ہو۔''

اس نے تیوریاں چڑھاتے ہوئے فائل دیکھی اور لائل کو لے جانے کی اجازت دے دی۔

کچھ دیر بعد ہم روبی کی لمبی چوڑی کیڈی لاک کی اگلی نشستوں پر تھے۔ لائل کسی بچے کی طرح خوش دکھائی دے رہا تھا۔

اس نے اس وقت وہی کوٹ پہن رکھا تھا جس کو وہ نہ جانے کتنے برسوں سے استعمال کرتا چلا آرہا ہوگا۔ میں نے کچھ دور چلنے کے بعد اس سے دریافت کیا۔ ''اگر میں کسی کو ساتھ بٹھا لوں تو تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا؟''

''کس کو بٹھاؤ گے؟''

''ایک عورت ہے۔'' میں نے بتایا۔

عورت کے نام پر اس کی بوڑھی ہوس زدہ آنکھوں میں چمک سی پیدا ہوگئی۔ ''کون عورت ہے؟''

''میری لینڈ لیڈی۔ میں جس مکان میں رہتا ہوں۔ اس کی مالکہ ہے۔''

''نہیں نہیں، مجھے کیا اعتراض ہوسکتا ہے۔''

میں نے گاڑی روبی کے مکان کے گیٹ پر روک دی۔ ہارن دینے پر وہ فوراً ہی اس طرح باہر آگئی جیسے بالکل انتظار میں بیٹھی ہو۔

لائل پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ میں نے ان دونوں کا آپس میں تعارف کروا دیا۔ لائل نے بڑی گرم جوشی سے ہاتھ ملایا تھا۔

گاڑی آگے چلی تو روبی نے لائل کو آفر کی۔ ''مسٹر لائل! کیا خیال ہے بوربن کے بارے میں؟''

''نہیں، میں وہ نہیں پیتا۔''

روبی نے اپنا بڑا سا بیگ کھول کر اس میں سے ایک بوتل نکالی اور گھونٹ لینے لگی پھر اچانک اس نے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ راستے سے چیز برگر اور فرائز لیتے ہوئے چلیں۔''

''اچھا خیال ہے۔'' مجھ سے پہلے لائل بول پڑا۔

میں نے گاڑی ایک ایسے اسپاٹ پر روک دی جہاں کا چیز برگر بہت مشہور اور لذیذ ہوا کرتا تھا۔ ہم نے برگر خریدے اور آگے بڑھ گئے۔

ابھی کچھ فاصلہ باقی تھا کہ لائل نے بیئر کی خواہش ظاہر کی۔

میں نے ایک شاپ پر گاڑی روکی اور چھ ڈبوں کا ایک بیگ خرید کر لے آیا۔ روبی اپنے چیز برگر کے ساتھ الجھی ہوئی تھی۔

ہمارا رخ جس سنیما ہال کی طرف تھا وہ اوپن ایئر تھا اور گاڑی میں بیٹھے بیٹھے فلم دیکھی جاسکتی تھی۔ بس یہ ہوتا تھا کہ مائیکروفون گاڑی کے اندر کھینچ لیا جاتا۔ جس سے آوازیں سنائی دیا کرتیں۔

فلم شروع ہوئی۔ میں ان دونوں کے بارے میں تو نہیں جانتا لیکن مجھ پر کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ میں ان دونوں کو واش روم کا کہہ کر گاڑی سے باہر آگیا۔

ہماری گاڑی کے ٹھیک پیچھے ایک دوسری گاڑی تھی جس میں تین نوجوان بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ فلم سے بھرپور لطف اندوز ہو رہے تھے اور جب بھی کوئی زوردار منظر اسکرین پر آتا وہ ترنگ کے عالم میں ہارن بجانے لگتے۔

میں اس طرف آگیا جہاں واش روم بنے ہوئے تھے اور ایک چھوٹا سا کینٹین تھا۔ میں نے وہاں سے پاپ کارن

کا ایک پیک خریدا اور آہستہ آہستہ چباتا ہوا کچھ فاصلے پر ایک بینچ پر جا کر بیٹھ گیا۔

میں کبھی کبھی اچٹتی ہوئی نگاہ سے اسکرین کو دیکھ لیتا پھر پاپ کارن کی طرف متوجہ ہو جاتا۔ کچھ دیر بعد جب پاپ کارن ختم ہو گئے تو میں ٹہلتا ہوا گاڑی کی طرف آ گیا۔

روبی اگلی سیٹ پر نہیں تھی۔

وہ پیچھے لائل کے ساتھ بیٹھی تھی۔ دونوں ہنس رہے تھے۔ دونوں کی آوازیں اس طرح بوجھل ہو رہی تھیں جیسے نشے میں ہوں۔

میری ڈیوٹی ساڑھے نو بجے سے شروع ہوتی تھی۔

وقت بہت کم رہ گیا تھا۔ میں نے گاڑی کے پاس جا کر بلند آواز میں کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ اب ہمیں چلنا چاہیے۔ میری ڈیوٹی کا وقت شروع ہونے والا ہے۔''

دونوں کچھ بڑبڑانے لگے پھر چلنے کے لیے تیار ہو گئے۔

میں نے راستے میں روبی کو اس کے مکان کے گیٹ کے سامنے ڈراپ کیا اور اولڈ ہوم کی طرف گاڑی دوڑا دی۔ میرے پاس ابھی بھی وہی کیڈی لاک تھی اور ڈیوٹی ختم ہونے کے بعد اسی پر مجھے واپس آنا تھا۔

اس کے بعد اور کئی دن گزر گئے۔

میں نے لائل سے ڈھیر ساری باتیں کیں اور اس نے بھی مجھے اپنے گزارے ہوئے دنوں کے بارے میں بہت کچھ بتا دیا۔

اس کے آباؤ اجداد کا تعلق بھی فوج سے تھا اور وہ خود فوج میں رہ چکا تھا اور اسی حوالے سے باتیں کیا کرتا۔

دشمن کی فوج، اپنی فوج، جنگی محاذ، میدانِ جنگ، گولہ بارود، ہتھیار، پلاٹون اور بھی وہ تمام اصطلاحات جو جنگ کے دوران یا فوج میں سامنے آیا کرتی ہیں۔

اس کو تحریک دلانے کے لیے میں نے بھی بازار سے فوجی ساز و سامان اور دوسری جنگِ عظیم وغیرہ کے واقعات کی کتابیں خرید کر ان کا مطالعہ شروع کر دیا۔ تاکہ گفتگو کرتے ہوئے اس کو یاد دلا سکوں کہ ایسا بھی ہو چکا ہے اور فلاں محاذ پر فلاں جرنیل لڑ رہا تھا۔ وغیرہ وغیرہ۔

وہ انیس سو بتیس اور چونتیس کے واقعات بتاتا، جب ہیڈ فورڈ کے جنگلات میں گھمسان کی جنگ ہوئی تھی۔ اس میدانِ جنگ سے اس کی بہت سی یادیں وابستہ تھیں۔

اس محاذ کا ذکر کرتے ہوئے اس کی بجھی ہوئی آنکھوں میں روشنی پیدا ہو جاتی۔

ایک بار میں نے اس سے پوچھا۔ ''کیا تمہیں اپنی یادیں تازہ کرنے کے لیے اس محاذ کو دوبارہ دیکھنا ہوگا۔''

''کاش ایسا ہو سکتا۔'' اس نے ایک گہری سانس لی۔

''اس جگہ پر دوبارہ جانا میرا خواب ہے۔''

''یہ میرا تم سے وعدہ ہے۔ میں تمہارا یہ خواب پورا کر دوں گا۔''

''میں وہاں اپریل کے مہینے میں جانا پسند کروں گا۔'' اس نے کہا۔ ''میں دیکھنا چاہوں گا کہ موسمِ بہار میں وہ جنگل کیسا لگتا ہے۔''

''ضرور، میں ہر حال میں تمہیں لے جاؤں گا۔'' میں نے دوبارہ وعدہ کیا۔

''لیکن تم ایسی باتوں میں کیوں دلچسپی لیتے ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''اس کی وجہ یہ ہے کہ میرا تعلق ایک ایسی سوسائٹی سے ہے جو اس قسم کی یادگاروں کو محفوظ رکھتی ہے۔'' میں نے بتایا۔ ''یہ ایسی سوسائٹی ہے جو حکومت سے ایک پائی نہیں لیتی۔ مخیر لوگوں کے ڈونیشن سے کام چلاتی ہے۔ حالانکہ میں ایک غریب سا آدمی ہوں۔ اس کے باوجود ہر سال کچھ نہ کچھ بھیج ہی دیتا ہوں۔''

''ہوں۔'' اس نے ہنکار لی لیکن خاموش رہا۔

میں نے بات آگے بڑھائی۔ ''مسٹر لائل! یہاں ایسے بھی لوگ ہیں جنہوں نے اپنی پوری وصیت ایسی سوسائٹی کے نام کر دی ہے۔''

لائل اس پر بھی خاموش رہا۔ کوئی تاثرات نہیں۔

میں اسے اس کے کمرے میں لے آیا۔ بستر پر بٹھانے کے بعد جب میں جانے لگا تو اس نے مجھے آواز دی۔ ''مسٹر گرونن! میں ایک بات بتا دوں۔ میرا کوئی وصیت نامہ نہیں ہے۔ کچھ بھی نہیں ہے۔''

اس کی بات سن کر ایک لمحے کے لیے مجھے بجلی کا جھٹکا سا لگا۔ بے پناہ مایوسی، لیکن میں نے اس پر کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا اور اس کو خدا حافظ کہہ کر اس کے کمرے سے باہر آ گیا۔

صبح کے ساڑھے پانچ بج رہے تھے۔ میں دوسری جنگِ عظیم پر ایک کتاب پڑھنے میں مصروف تھا کہ کسی کی آہٹ سنائی دی۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔

وہ مس ڈیفنی تھی۔ چوراسی پچاسی برس کی ایک بوڑھی عورت۔ جس کو پچھلے کمروں میں رکھا جاتا تھا اور ان کمروں

کے دروازے آسانی سے نہیں کھلتے تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کمرے سے کیسے نکل آئی تھی۔

''کیا بات ہے مس ڈیفنی؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ ہیرٹ کو دیکھو، اس کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ وہ فرش پر پڑی ہوئی ہے۔''

میں کتاب ایک طرف رکھ کر کھڑا ہو گیا۔

میں مس ڈیفنی کو چھوڑ کر پچھلے کمروں کی طرف دوڑا۔

میں نے اپنا کارڈ پنچ کیا جس سے دروازہ کھلا کرتا تھا۔

میں دروازے سے گزر کر تقریباً دوڑتا ہوا مس ہیرٹ کے کمرے میں پہنچ گیا۔

اس کی عمر بھی اچھی خاصی تھی۔

اس وقت وہ فرش پر بے ہوشی کے عالم میں پڑی تھی۔ اس کے جسم پر لباس بھی ناکافی تھا۔ وہ اپنی غلاظت میں لتھڑی ہوئی تھی۔

میں ایسے موقعوں کے لیے ہمیشہ تیار رہتا ہوں۔ میں نے اپنی جیب سے اپنا چھوٹا کیمرا نکالا اور جلدی جلدی چار پانچ تصویریں لے لیں۔

پچھلے کمروں کی ڈیوٹی پر ایک نرس ریٹا ہوا کرتی تھی لیکن اس وقت ریٹا کا پتا نہیں تھا۔ میں نے دوسری طرف سے ایک مددگار گرے کو ساتھ لیا اور دوبارہ اسی کمرے میں پہنچ گیا۔

ہم نے ماسک باندھ لیے تھے اور چمڑے کے دستانے پہن لیے تھے۔ گرے اور میں نے مل کر ہیرٹ کو بستر پر لٹا دیا۔

میں صفائی کرنے میں مصروف ہو گیا جبکہ گرے اسے گاؤن پہنانے لگا۔ مس ہیرٹ کو گرنے سے چوٹیں بھی آئی تھیں جس سے زخم پیدا ہو گیا تھا۔ گرے اس کے زخم پر دوائیں لگانے اور پٹی باندھنے لگا جبکہ میں نے آس پاس پھیلی ہوئی غلاظت صاف کر دی تھی۔

گرے کو اپنے کام میں مصروف چھوڑ کر میں تیزی سے اس طرف آیا جہاں ہر مریض کے بارے میں روزانہ کی بنیاد پر رپورٹ تیار کی جاتی تھی۔

میں نے جلدی جلدی رپورٹ دیکھی۔ ہیرٹ گزشتہ اٹھارہ گھنٹوں سے بھوکی تھی۔ اس کو کچھ نہیں دیا گیا تھا۔ اس کو اٹینڈ کرنے والوں کی بے پروائی تھی۔

میں نے جلدی جلدی اس رپورٹ کی بھی تصویریں لیں۔ اسی دوران شور مچاتی ہوئی ایمبولینس بھی آ پہنچی تھی۔

مس ہیرٹ کو ایمبولینس میں ڈال کر اسپتال روانہ کر دیا گیا۔ ولما اور نرس ایشلی بوکھلائی بوکھلائی سی گھوم رہی تھیں۔

حضور والا تیار! ہم حاضر ہیں

دوسرے دن ایک آدمی آ پہنچا۔

اس کا نام ڈکلیئر تھا۔ وہ ان وکیلوں میں سے تھا جن کو اس قسم کے کیس لڑنے میں بہت دلچسپی ہوتی ہے اور وہ کسی بھی ادارے کی خامیوں اور کمزوریوں کی سونگھتے پھرتے ہیں۔

وہ بہت دیر تک مجھ سے اور گرے سے سوالات کرتا رہا کہ مس ہیرٹ کے ساتھ آخر ہوا کیا تھا۔ میں نے اشاروں میں اسے بتایا کہ میں اس کے پاس آ کر بتاؤں گا۔

ہیرٹ کا سر پھٹ گیا تھا۔ اس کے سر میں ٹانکے آئے تھے اور بہت سا خون ضائع ہو گیا تھا۔ اس کی حالت ٹھیک نہیں تھی۔

دو چار دنوں کے بعد پتا چلا کہ اس کی طبیعت سنبھلنے لگی ہے اور وہ پیٹ بھر کے کھا بھی رہی ہے۔

ایک دوپہر کو میں ڈکلیئر کے دفتر پہنچ گیا۔ وہ مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوا تھا۔ ''میں تو تمہارا انتظار کر رہا تھا۔''

''اسی لیے میں کام پکا کر کے آیا ہوں تمہارے پاس۔''

میں نے ساری تصویریں اور ریکارڈ وغیرہ اس کے سامنے کر دیے۔ یہ تصویریں مس ہیرٹ کی اس وقت کی تھیں

جب وہ فرش پر گندگی کے درمیان پڑی تھی اور وہ ریکارڈ تھا جو ہیریٹ کے حوالے سے تھا کہ کس طرح اس کو نظرانداز کیا جارہا ہے۔

ڈکلیئر یہ سب کچھ دیکھ کر اچھل پڑا پھر ہم دونوں کے درمیان ایک معاہدہ طے پا گیا۔ ایک ڈیل ہوگئی۔

☆☆☆

اولڈ ہوم میں خوشی اور جشن کا موقع اس وقت ہوتا ہے جب کسی کی برتھ ڈے منائی جاتی ہے۔

اس وقت اسٹاف اور دوسرے لوگ کیفے ٹیریا میں جمع ہوجاتے ہیں۔ موم بتیاں روشن کی جاتی ہیں۔ کیک کاٹا جاتا ہے۔ سب مل کر گانا گاتے ہیں اور زندگی ایک بار پھر ان کے درمیان لوٹ آتی ہے۔ کچھ ہی دیر کے لیے سہی۔

ان دنوں ولما مجھ سے بہت خوش رہا کرتی۔ کیونکہ اسے بتایا گیا تھا کہ جب ہیریٹ گری پڑی تھی تو میں نے اس تک پہنچنے میں کتنی پھرتی دکھائی تھی۔

تو میں یہ بتا رہا تھا کہ اس قسم کے اولڈ ہومز میں کسی کی سالگرہ کا کیا مطلب ہوتا تھا۔ کتنی خوشیاں ان لمحوں سے وابستہ ہوجاتی ہیں۔

اس شام بوڑھے لائل کی برتھ ڈے تھی۔ وہ بچاسی برس کا ہو چکا تھا۔ اس شام اس کی بیٹی بھی سالگرہ کی مبارک باد دینے آئی تھی۔

اس کے ساتھ اس کے دو چھوٹے بچے بھی تھے جو اپنے نانا کے لیے تحفے وغیرہ لے کر آئے تھے۔

ان تحائف میں کچھ چاکلیٹس، بسکٹ، ایک دو جوڑے کپڑے اور اسی قسم کی دیگر چیزیں تھیں۔ اس کے دونوں بچے .... اِدھر اُدھر شور کرتے پھر رہے تھے۔ وہی رسمی سی تقریب ہوئی جو ایسے مواقع پر ہوا کرتی ہے۔ یعنی کیک کاٹا گیا اور بوڑھے لائل کے لیے دعائیں کی گئیں۔ اس کے ساتھ ہی اس کی بیٹی نے اپنی بے سُری آواز میں سالگرہ کا گیت بھی سنایا اور یہ تقریب ختم ہوگئی۔

آنے والے واپس چلے گئے پھر پہلے جیسا سناٹا ہو گیا۔ ایسا ہی ہوتا ہے۔ خوشی کا لمحہ بہت مختصر ہوتا ہے۔ اب میں نے اپنا تحفہ پیش کیا۔

یہ تحفہ لائل کی پرانی تصویروں کا تھا۔ جنہیں میں نے بڑی محنت سے حاصل کیا تھا۔ اخبارات میں دیکھ کر ان کی فوٹو کاپیاں بنا کر ایک خوب صورت البم میں سجالیا تھا۔

میں نے جب وہ البم لائل کو پیش کیا تو خوشی سے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ ان تصویروں میں لائل گھڑسواری کررہا تھا۔ فوجی وردی میں تھا۔ پریڈ کررہا تھا۔ گالف کھیل رہا تھا۔ یہ سب اس کی یادیں تھیں جو میں نے اسے لوٹا دی تھیں۔

اب اسے اس رات دوسرا تحفہ دینا تھا۔

اس کے لیے میں نے تیاری کر رکھی تھی۔ میں نے روبی سے کہہ دیا تھا کہ وہ اپنی کسی لڑکی کو تیار رکھے۔ اسے بوڑھے لائل کے پاس پہنچانا ہے۔

دوسری تیاری یہ تھی کہ لائل کے ساتھ جو دوسرا بندہ رہتا تھا، اسے خواب آور گولیوں کی بھاری مقدار دینی تھی تاکہ وہ صبح تک آرام سے سوتا رہے۔

اس کے گہری نیند میں جانے کے بعد میرا کام آسان ہوگیا۔ میں نے روبی کے پاس سے جس عورت کو لیا اس کا نام ڈولی تھا۔

اسے اس بات سے کوئی غرض نہیں تھی کہ اسے کسی بوڑھے کے پاس پہنچایا جارہا ہے یا کسی جوان کے پاس۔ اسے بس اپنے معاوضے سے مطلب تھا جو میں نے پہلے ہی ادا کردیا تھا۔

لائل کے کمرے کا ساتھی بے خبر سو رہا تھا جب میں نے ڈولی کو لائل کے کمرے میں پہنچایا، لائل حیران رہ گیا تھا۔ ”یہ..... یہ کون ہے۔“

”تمہاری سالگرہ کا تحفہ۔“

میں یہ کہہ کر باہر چلا آیا۔

اس کے بعد ہم ایک دوسرے کے اور قریب آگئے۔ اب ہم رات کو دیر تک پوکر کھیلتے رہتے۔ اسے مجھ پر بے حد اعتماد ہوگیا تھا۔

ایک رات اس نے کہا۔ ”گرونن! میں نے ایک دن شاید تمہیں اپنے وصیت نامے کے بارے میں بتایا تھا کہ میں نے وہ ابھی تک تیار نہیں کیا ہے۔“

”ہاں بتایا تو تھا۔“ میں نے سرسری انداز میں کسی قسم کی دلچسپی ظاہر کیے بغیر کہا۔

”لیکن اب میں وصیت نامہ لکھنے کی سوچ رہا ہوں۔“ وہ دھیرے سے بولا۔ ”لیکن کس کے نام۔ میرا ایک بیٹا ہے اور برسوں سے اس کی کوئی خبر نہیں ہے۔ ایک بیٹی ہے تو اس کے پاس پہلے ہی سے بہت دولت ہے۔ میں اسی الجھن میں ہوں۔ ہاں یاد آیا۔ تم نے شاید کسی سوسائٹی کے بارے میں کہا تھا۔ اس کا کیا طریقہ ہوتا ہے۔“

میرا چہرہ ابھی تک سپاٹ ہی رہا تھا۔ حالانکہ وہ آہستہ آہستہ میرے مطلب پر آرہا تھا۔

''اس کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ کسی شخص کو ساری جائداد کا ٹرسٹی بنا دیا جاتا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اور وہی اس کے مفادات کی دیکھ بھال کیا کرتا ہے اور ہر مہینے یا ہر سال اس سوسائٹی کو رقم پہنچاتا رہتا ہے۔''

''میرے پاس کچھ زمینیں ہیں گرونن۔'' اس نے بتایا۔

''کتنی ہوں گی؟'' میں نے پوچھا۔

''چھ سو ایکڑ۔'' اس نے بتایا۔ ''اور اس وقت ایک ایکڑ کی قیمت ہزار ڈالر ہے۔''

میں ابھی بھی سپاٹ ہی رہا۔ حالانکہ لائل نے بہت بڑی خبر سنادی تھی۔

''گرونن! میں یہ چاہتا ہوں کہ تم میری زمینوں کے ٹرسٹی بن جاؤ۔''

اس نے وہ بات کہہ دی جو میں سننا چاہتا تھا۔

دوسرے دن یہ افواہ گرم تھی کہ وکیلوں کی ایک ٹیم اس خاموش جنت کا معائنہ کرنے آرہی ہے۔ اس ٹیم کو شہری حکومت کی طرف سے بھیجا گیا ہے۔

ظاہر ہے اس ٹیم کا سربراہ ڈکلیئر تھا۔ اس دن خاموش جنت میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔ صفائی ستھرائی کا خاص انتظام کیا گیا تھا۔ پلاسٹک کے پھولوں کی جگہ اصلی پھول منگوا کر لگائے گئے تھے۔

میری ڈیوٹی گرچہ رات نو بجے سے ہوتی تھی لیکن میں اس وقت بھی وہیں بھٹک رہا تھا اور کسی نے توجہ اس لیے نہیں دی کہ ڈیوٹی ٹائم کے بعد بھی اِدھر اُدھر بھٹکنا میرا معمول تھا۔

میں کئی مہینوں سے اسی دن کے لیے اتنی محنت کررہا تھا۔

ڈکلیئر...... کی ٹیم میں ایک لڑکی اور دو مرد تھے۔ پروفیشنل لوگ، کالے لباسوں والے، انہوں نے بڑی جاں فشانی سے پورے اولڈ ہاؤس کا دورہ کیا۔ مریضوں کو دیکھا۔ صحت اور صفائی کے انتظامات کا جائزہ لیا۔ ریکارڈز دیکھے۔

ہیرٹ کے گھر والوں کی طرف سے ڈکلیئر ہی کو وکیل مقرر کیا گیا تھا۔

شام کے کھانے کے وقت جب سب کیفے ٹیریا میں جمع ہوئے تو میں نے رضاکارانہ طور پر کام کرنا شروع کر دیا۔ حالانکہ وہ میری ڈیوٹی کا وقت نہیں تھا لیکن یہ بھی کھیل کا حصہ تھا۔

لائل اب تک اپنے کمرے میں تھا۔

جب میں اس کے کمرے میں پہنچا تو اس کے ہاتھ میں وہی وصیت نامہ تھا جو ڈکلیئر نے تیار کر کے مجھے دیا تھا۔ یہ ایک مکمل وصیت نامہ تھا۔ جس میں دنیا بھر کی قانونی موشگافیاں کردی گئی تھیں۔

''لائل! تم نے وصیت نامہ پڑھ لیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں، ٹھیک ہے۔'' اس نے جواب دیا

''تو پھر آؤ میرے ساتھ۔''

میں اُسے سہارا دے کر ہال میں لے آیا۔ ڈکلیئر اور اس کے دونوں ساتھی ایک طرف بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے لائل کو ان کے سامنے پیش کردیا۔

انہوں نے لائل سے قانونی باتیں شروع کردیں۔ اس سے پوچھا گیا کہ اس نے یہ وصیت نامہ اپنی مرضی ہی سے لکھا ہے یا کسی دباؤ کے تحت لکھا ہے، وغیرہ وغیرہ۔

لائل لمبے چوڑے قانونی دلائل اور نکات سے اُکتانے لگا۔ پھر اس نے وصیت نامے پر دستخط کردیے۔ جس کے تحت میں اس کی جائداد کا مکمل نگراں تھا پھر گواہان کے دستخط ہوئے۔ یہ گواہان بھی ڈکلیئر کی ٹیم کے لوگ تھے۔ ایک بڑا مرحلہ سر ہوچکا تھا۔

کچھ دنوں کے بعد ڈکلیئر نے مجھ سے ملاقات کی۔

''گرونن! تمہارے دیے ہوئے ثبوت بہت کام آرہے ہیں۔ کمپنی ولما اور نرس آنجیلی کو ہٹانے کے لیے تیار ہوگئی ہے۔ اس کے ساتھ ہی چار لاکھ ڈالرز کا ہرجانہ بھی دے رہی ہے۔''

''اور میرے کمیشن کا کیا ہوگا؟''

''وعدے کے مطابق دس فیصد۔'' اس نے بتایا۔

''دس فیصد بھی بہت ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ تمہیں بوڑھے لائل کی جائداد بھی مل رہی ہے۔ اب یہ بتاؤ، اس میں میرا کیا حصہ ہے؟''

''وہی دس فیصد۔''

ہم دونوں ہنس پڑے۔

اس شہر اور اس اولڈ ہوم ''خاموش جنت'' میں میرا کام ختم ہوچکا تھا۔ مجھے اب دو چار مہینے آرام کرنا تھا۔ اس کے بعد کسی اور جنت کی تلاش میں نکل جانا تھا۔

امریکا بہت بڑا ہے اور اس قسم کے سیکڑوں ادارے پورے ملک میں پھیلے ہوئے ہیں۔

READING Section

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN

# گلوریا

### سکندر علیم

عورت واقعی ایک پہیلی ہے... پھول... شبنم... خوشبو... تو کبھی... آگ... شعلہ... زہریلی ناگن... یہ اس کے مختلف روپ ہیں... محبتیں نچھاور کرنے پر آئے تو... خاک ہو جائے... چالاکی و عیاری کا لبادہ اوڑھے تو... سانس لینا مشکل بنادے... ایسی ہی شبنم و شعلہ کا بھڑکتا... سلگتا... شاہانہ کارنامہ

**جامع و مکمل ڈرامے چونکا دینے والا ایکشن**

**الماری** کے بند دروازوں کے درمیان کوئی جھری نہیں تھی اس لیے میں انہیں دیکھ نہیں سکتا تھا، البتہ ان کی آوازیں یقینی طور پر مجھے سنائی دے رہی تھیں۔ وہ دونوں پورے جوش و خروش کے ساتھ ایک دوسرے میں گڈمڈ تھے جیسے ہالی ووڈ کی کسی فلم کا جذباتی منظر فلمایا جارہا ہو۔

لیکن مجھے ان کی موجودہ ہیجانی کیفیت کی قطعی کوئی پروا نہیں تھی۔ میں اپنے سائلنسر لگے ریوالور کی نال سے دھیرے دھیرے اپنے رخسار کو تھپتھپاتے ہوئے اپنی اس میٹنگ کے بارے میں سوچ رہا تھا جو دو گھنٹے قبل ڈومنگو کے ساتھ ہوئی تھی۔

ڈومنگو نے دو سال قبل مجھے اپنی سیکیورٹی اور نگہبانی کے لیے ملازم رکھا تھا۔ وہ پٹس برگ میں ریسٹورنٹس اور اسٹرپ کلبس کی ایک چین کا مالک تھا جس سے اس کے سرمائے میں روز بروز اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ اس سے اس

بات کی وضاحت بھی ہو جاتی تھی کہ ڈومنگو شہر میں کوکین اور ہیروئن کا نصف کاروبار کیوں کر چلا رہا تھا۔

اسٹرپ کلبس ہی کی وجہ سے اس کی چوتھی شادی کی وضاحت بھی ہو جاتی تھی۔ اس کی پہلی شادی اپنی ہائی اسکول کی ساتھی اور محبوبہ کے ساتھ ہوئی تھی جس سے اس کے تین بچے تھے۔ پھر اپنے کلب کی رقاصہ کی خاطر اس نے اپنی پہلی بیوی کو چھوڑ دیا تھا اور اس رقاصہ سے شادی کر لی تھی۔ پانچ سال بعد اس نے دوسری بیوی کو بھی طلاق دے دی تھی اور تیسری شادی رچالی تھی۔ اس کی ہر بیوی کی ازدواجی زندگی کی اوسط مدت پانچ سال ہوا کرتی تھی۔

سوائے اس کی موجودہ بیوی گلوریا کے جو اس وقت مجھ سے چند فٹ کے فاصلے پر بیڈ پر فرطِ طرب میں ہم آغوش تھی۔ ازدواجی مدت کے پانچ سال پورے ہونے میں کچھ ہی عرصہ باقی رہ گیا تھا۔

لیکن ڈومنگو کے ساتھ ہونے والی میری اس میٹنگ کا خیال کسی طرح بھی میرے ذہن سے محو نہیں ہو رہا تھا۔

میری اس سے ملاقات اس کے اسٹرپ کلب کے عقبی حصے میں واقع دفتر میں ہوئی تھی۔ وہاں کمرے میں صرف ایک خستہ دھاتی میز اور ایک کرسی رکھی ہوئی تھی۔ کمرے میں کوئی کھڑکی نہیں تھی۔ کمرے میں ٹالکم پاؤڈر اور پسینے کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ میں وہاں کھڑا اس وقت تک اسے دیکھتا رہا جب تک وہ کوکین کی تھوڑی مقدار سونگھنے اور جونی واکر بلیو کا ایک پیگ حلق سے نیچے اتارنے سے فارغ نہیں ہوا۔

ڈومنگو ایک وضع دار شخص تھا پھر وہ میری جانب متوجہ ہو گیا۔ اس نے اپنی سوجی ہوئی براؤن آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور بولا۔ ‘‘میں جانتا ہوں کہ وہ میرے ساتھ چیٹنگ کر رہی ہے۔’’ اس کا اشارہ اپنی موجودہ اور چوتھی بیوی گلوریا کی جانب تھا۔ ‘‘میں چاہتا ہوں کہ تم خوش اسلوبی کے ساتھ اس کا کام تمام کرو۔ وہ ساؤتھ سائڈ میں واقع ہمارا سیف ہاؤس استعمال کر رہی ہے۔’’

‘‘تم واقعی چاہتے ہو کہ میں اس کا کام تمام کر دوں؟’’

‘‘ہاں۔’’ اس نے اپنی ناک رگڑتے ہوئے کہا۔ ‘‘میں علیحدگی کے بعد کسی چیٹنگ کرنے والی کتیا کو رقم ادا کرنا گوارا نہیں کر سکتا اور اس کا جو ساتھی ہے، میں چاہتا ہوں کہ تم اسے بھی قتل کر دینا۔’’ اس نے اطمینان سے اپنی دلی خواہش بیان کی۔

‘‘چاہے وہ جو کوئی بھی ہو؟’’ میں نے کہا۔

ڈومنگو کا منہ لٹک گیا کیونکہ اسے حیرانی ہوئی تھی کہ میں سب کچھ جانتا ہوں۔

جو شخص ڈومنگو کی ستائیس سالہ بیوی کے ساتھ بے ہودہ پن میں ملوث تھا، وہ کوئی اور نہیں بلکہ ڈومنگو کا اپنا بیٹا ڈومنگو جونیئر تھا جو اس کی پہلی بیوی سے تھا۔ وہ اس سال اکیس برس کا ہونے والا تھا۔

ڈومنگو کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا تھا، اب بند ہو گیا۔ اسے اپنے چہرے کے تاثرات معمول پر لانے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔

‘‘کوئی بھی شخص میری بیوی کے ساتھ گل چھرے نہیں اڑا سکتا۔ کوئی بھی نہیں۔ حتیٰ کہ میرا اپنا خون بھی نہیں۔’’

‘‘اور تم چاہتے ہو کہ میں اسے قتل کر دوں... ڈومنگو جونیئر کو! کیا تم سو فیصد یہی کہہ رہے ہو اور یہی چاہتے ہو؟’’ میں نے پوچھا۔

‘‘میں بالکل سو فیصد یہی کہہ رہا ہوں۔’’ اس نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ‘‘اور یہی چاہتا ہوں۔’’

اسی وجہ سے میں ڈومنگو جونیئر اور گلوریا کی سیف ہاؤس آمد سے پون گھنٹا قبل وہاں بیڈروم کی الماری کے اندر چھپ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ جب ان دونوں کی ہیجانی آوازوں کی شدت کچھ کم ہوئی تو میں نے سوچنا شروع کر دیا کہ ڈومنگو کے ساتھ ہونے والی میری اس میٹنگ کی کوئی بات مجھے پسند نہیں آئی تھی۔ اس کی ڈھیروں وجوہات تھیں۔ بات تو احمقانہ لگتی ہے لیکن یہ حقیقت تھی کہ میں نے عراق کے بعد کبھی کسی عورت کو گولی نہیں ماری تھی۔ میں نے اپنے آپ سے وعدہ کیا تھا کہ میں خود کو پہلے سے بہتر بنا لوں گا اور کسی عورت پر ہاتھ نہیں اٹھاؤں گا۔

اور سچی بات تو یہ تھی کہ میں گلوریا کو پسند کرتا تھا۔ وہ بھی مجھ پر توجہ دیتی تھی۔ جب ہم باتیں کیا کرتے تھے تو وہ اس دوران بارہا میرے بازو کو چھوچکی تھی اور اس بات پر بھی کبھی برا نہیں مانتی تھی جب میں اس کے لباس میں کھوجنے کی کوشش کرتا تھا۔

ابھی ایک ہفتہ قبل اس نے مجھے ایک اسپیشل قسم کا کولون تحفے میں دیا تھا اور یہ بھی بتایا تھا کہ اسے کس طرح لگایا جاتا ہے۔ اس دوران میں اس کی انگلیاں میرے کانوں اور میری گردن کے چاروں طرف گردش کرتی رہی تھیں۔ اس بات کا خیال آتے ہی مجھے اپنے جسم میں حدت سی محسوس ہونے لگی۔

نکتے کی بات یہ تھی کہ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ جب

ڈومنگو پر سے جانی واکر کا نشہ ہرن ہو جائے گا اور اسے احساس ہوگا کہ اس کا اکلوتا بیٹا مر چکا ہے تو وہ اس شخص سے شدید نفرت کرے گا جس نے اس کے بیٹے کو گولی ماری ہو گی۔ میں یہ بات گارنٹی سے کہہ سکتا تھا۔ اور یہ میرے دو سالہ لیکن غیر آئیڈیل کیریئر کا سب سے زیادہ گھناؤنا منظر ہوتا جن کا میں نے اب تک سامنا کیا تھا۔

ڈومنگو جونیئر کو بالآخر قرار آ گیا۔ میں اس کی سانسیں دوبارہ سے نارمل ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ وہ چونکہ ایتھلیٹک بدن کا مالک تھا اس لیے اسے نارمل ہونے میں کچھ وقت لگ گیا۔ پھر مجھے بیڈ کے چرچرانے کی آواز سنائی دی۔ اب مجھے اپنے پلان بی پر عمل کرنے کی ضرورت تھی۔

میں نے فیصلہ کیا کہ ڈومنگو جونیئر کو ڈرا دھمکا کر بھاگنے پر مجبور کر دوں گا۔ ساتھ ہی گلوریا کو بھی فرار ہونے کا موقع فراہم کر دوں گا۔ ڈومنگو سینئر ہرگز ایسا نہیں چاہتا تھا لیکن گلوریا کے فرار ہونے کے بعد شاید وہ اپنے اکلوتے بیٹے کو معاف کر دے اور میرا مزید ممنون ہو جائے کہ میں نے اس کے بیٹے کو شوٹ نہیں کیا۔

جب میں نے الماری سے نکل کر باہر قدم رکھا تو گلوریا اپنا لباس پہن چکی تھی اور دروازے کے پاس کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے مجھے دیکھ کر کسی قسم کے ردعمل کا اظہار نہیں کیا۔ بلکہ ایک قسم کی گہری نظروں سے مجھے دیکھتی رہی جیسے کوئی خاص بات سوچ رہی ہو۔ اس نے اتنی تیزی سے اپنا لباس کس طرح پہنا تھا، یہ میرے قیاس سے باہر تھا۔

دوسری جانب ڈومنگو جونیئر نے مجھے دیکھتے ہی ایک چیخ ماری اور کروٹ بدلتے ہوئے تکیے کے نیچے چلا گیا۔ مجھے اس کے ہاتھ میں کسی ہتھیار کی جھلک سی دکھائی دی۔

'اوکے! مجھے واپس اپنے پلان اے پر جانا ہوگا' میں نے پلک جھپکتے میں فیصلہ کیا۔ میں نے لگاتار دو فائر کر دیے۔

ڈومنگو جونیئر کے چہرے پر حیرت کے تاثرات ابھر آئے۔ ساتھ ہی وہ پیچھے دیوار کے ساتھ جا لگا۔ اس کے سینے میں تازہ دو سوراخوں سے تیزی سے خون ابلنا شروع ہو گیا۔

پھر میں نے اپنا ریوالور گلوریا کی جانب گھما دیا۔

لیکن وہ جا چکی تھی۔ مجھے نچلے زینے پر اس کے دوڑتے قدموں اور پھر داخلی دروازے کی ایک جھٹکے کے ساتھ بند ہونے کی آواز سنائی دی۔

'یہ برا ہوا' میں نے سوچا۔ 'اب پیچیدگیاں شروع ہو جائیں گی۔'

میں نے بیڈ شیٹ کا ایک کنارہ پھاڑا اور اس سے

## شگوفے

شک کرنے والی بیوی نے میکے سے شوہر کو کال کی۔

بیوی: ''کہاں ہو تم؟''
شوہر: ''گھر پر ہوں۔''
بیوی: ''جوسر مشین چلا کے سناؤ مجھے۔''
شوہر: لو سنو، گھررر... گھررر... گھررر۔''
بیوی: ''او کے ٹھیک ہے، بائے۔''

اگلے دن بیوی سرپرائز دینے اچانک گھر پر آ جاتی ہے اور دیکھتی ہے بیٹا اکیلا ہے تو پوچھا۔ ''بیٹا آپ کے ڈیڈی کدھر ہیں؟''

بیٹا: ''پتا نہیں ای کل سے ڈیڈی جوسر لیے گھوم رہے ہیں کہیں۔''

عبدالجبار روی انصاری، لاہور

## انکشاف

انگلش فلم کا ہیرو ایک پاکستانی فلم دیکھ رہا تھا کہ ایک سین دیکھ کر بے ہوش ہو گیا۔ سین کچھ اس طرح تھا کہ ہیرو کے پستول میں گولیاں ختم ہو گئی تھیں۔ ولن نے گولی چلائی تو ہیرو نے گولی کیچ کر لی اور اپنی بندوق میں ڈال کر فائر کر کے ولن کو مار ڈالا۔

کاش! سورج کی بھی کوئی بیوی ہوتی کچھ تو اسے کنٹرول میں رکھتی۔

☆☆☆

کچھ لوگ یہ نکتۂ اعتراض اٹھاتے ہیں کہ اردو شاعری میں محبوب کے لیے صرف مذکر کا صیغہ ہی کیوں استعمال کیا جاتا ہے؟ اس اعتراض کا ایک شاعر نے کیا تسلی بخش جواب دیا ہے۔ شاعر نے کہا کہ صرف ایک شعر میں محبوب کو ''مونث'' کر کے دیکھ لیں آپ کو وجہ سمجھ میں آ جائے گی۔ تبدیلی کے بعد کا شعر ملاحظہ ہو۔

تم میرے پاس ''ہوتی'' ہو گویا
جب کوئی ''دوسری'' نہیں ہوتی

محمد قدرت اللہ نیازی، حکیم ٹاؤن، خانیوال

ڈومنگو جونیئر کے سینے کے سوراخوں کو بند کر دیا اور اسے کھینچ کر باتھ روم میں لے گیا۔ میں نے اس کی لاش کو اٹھا کر باتھ ٹب میں رکھ دیا۔ پھر میں واپس بیڈ پر آکر بیٹھ گیا اور اطراف کا جائزہ لینے لگا۔

گلوریا کے زیر جامے نیچے فرش پر پڑے ہوئے تھے۔ جبھی تو اس نے اتنی جلدی اپنا لباس پہن لیا تھا جس پر مجھے حیرت ہوئی تھی۔ لیکن اس سے یہ ظاہر ہو رہا تھا جیسے اسے یہ معلوم تھا کہ میں وہاں موجود ہوں۔ اور یہ بات میرے لیے پریشانی کا باعث بن گئی۔

میں نے اس تمام معاملے کو اپنے ذہن میں دہرانا شروع کر دیا۔ اب گلوریا کو معلوم ہو گیا تھا کہ ڈومنگو سینئر اس کی جان کے درپے ہے۔ لہٰذا اس کے پاس اپنی جان بچانے کے لیے بھاگ نکلنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں۔ راہِ فرار اختیار کرنے ہی میں اس کی عافیت ہے۔

میں ڈومنگو سے کہہ دوں گا کہ میں نے اس کے تعاقب کا پلان تیار کر لیا ہے اور کچھ دنوں کے بعد میں اسے بتا دوں گا کہ میں نے اسے ٹھکانے لگا دیا ہے۔

یہ مناسب رہے گا بلکہ درحقیقت میں اس کے متعلق جتنا سوچ رہا تھا، یہ مجھے اتنا ہی زیادہ بہتر لگ رہا تھا۔

میں نے الماری میں سے ڈسکاؤنٹ اسٹور پلاسٹک ریپ اور ڈکٹ ٹیپ کا سب سے بڑا رول نکالا اور ڈومنگو جونیئر پر کام کرنے چلا گیا۔

مجھے ڈومنگو جونیئر کی لاش کو ممی کی طرح تیار کرنے میں آدھا گھنٹا لگ گیا۔ میں نے سوچا کہ اسے ٹھکانے لگانے کے لیے میں بعد میں یہاں سے نکال کر لے جاؤں گا۔

پھر میں نے ڈومنگو کو فون کیا۔

''کام ہو گیا۔'' میں نے اس کے جواب دینے پر اسے بتایا۔ ''لیکن مجھے گلوریا کا پیچھا کرنا پڑے گا۔''

''وہ کتیا بچ کر کس طرح نکل گئی؟''

''یہ اس کی خوش قسمتی تھی لیکن میں اسے پکڑ لوں گا۔''

''تم سے چوک ہو رہی ہے۔''

فون پر دھماکے کی آواز نے مجھے اچھلنے پر مجبور کر دیا پھر دوسری طرف خاموشی چھا گئی۔

میں اس آواز کو بخوبی پہچانتا تھا۔ وہ اعشاریہ تین آٹھ ریوالور کے فائر کی آواز تھی۔ میں نے یہ آواز اس لیے پہچان لی تھی کہ میرا بیک اپ اعشاریہ تین آٹھ کا ایک پرانا ریوالور تھا جو کہ میرے باپ کی ملکیت تھا۔ میں نے احتیاط کے ساتھ اپنا فون بند کیا اور سیڑھیاں اُتر کر داخلی دروازے پر آگیا۔

میں نے محتاط انداز میں باہر سڑک کا دونوں طرف کا جائزہ لیا۔ پھر اطمینان کرنے کے بعد پیدل چلتا ہوا دو بلاک کا فاصلہ طے کر کے اس مقام پر آگیا جہاں میں نے اپنی کار پارک کی ہوئی تھی۔

مجھے ایک عجیب سا احساس ہو رہا تھا لیکن میرا کام ڈومنگو کی نگہبانی کرنا تھا۔ سو میں واپس اس کی جانب چل دیا۔

ڈومنگو، پٹس برگ کے شیڈی سائڈ نامی اعلیٰ درجے کے رہائشی علاقے میں رہتا تھا۔ علاقے کا نام اس کے کاروباری معاملات کے لحاظ سے نہایت موزوں تھا۔ مکان کی تمام روشنیاں بجھی ہوئی تھیں سوائے گراؤنڈ فلور پر واقع ڈومنگو کے دفتر کے جہاں روشنی نظر آرہی تھی۔

اندر پہنچ کر میں نے نہ تو روشنیاں آن کیں اور نہ ہی کوئی آواز دی۔ مجھے آوازیں سنائی دیں تو میں نے ان کے خاموش ہونے کا انتظار نہیں کیا اور ان آوازوں کے تعاقب میں ڈومنگو کے دفتر کی جانب بڑھنے لگا۔ یہ مکان سو سال سے زیادہ پرانا تھا اور اس کے لکڑی کے فرش یوں چرچراتے تھے جیسے آپ خزاں زدہ سوکھے پتوں پر چل رہے ہوں۔

میں نے ڈومنگو کے دفتر کا دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔

کمرے میں گلوریا ڈومنگو کی کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ ڈومنگو اس بات کا برا نہیں منا رہا تھا کیونکہ وہ فرش پر پڑا ہوا تھا۔ اس کی نظریں کمرے کی چھت پر جمی ہوئی تھیں اور اس کی پیشانی کے عین درمیان ایک سوراخ دکھائی دے رہا تھا۔

ڈومنگو کا وکیل ولیم اسٹون میز پر گلوریا کے مقابل ایک کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ جب میں اندر داخل ہوا تو سو ڈالر کے سوٹ میں ملبوس وہ وکیل میری جانب گھوم گیا اور اپنی موٹی گول شیشوں والی عینک کی اوٹ سے سرتاپا میرا جائزہ لینے لگا۔

''ویل، دیکھو کون حاضر ہوا ہے۔'' گلوریا نے مجھے دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ مجھے یہ اعتراف کرنا پڑے گا کہ وہ ایک دلکش مسکراہٹ تھی۔ اس کے جسم پر ابھی تک وہی لباس تھا جو اس نے سیف ہاؤس سے فرار ہوتے وقت پہنا تھا۔ میری نظریں اس کے دلکش جسم پر بھٹکنے لگیں۔ بلاشبہ وہ ایک متاثر کن جسم کی مالک تھی۔

اس سے قبل کہ میں کچھ کہتا، گلوریا نے دوبارہ بولنا

شروع کر دیا۔

''ڈومنگو جونیئر کو تم نے عمدگی سے ٹھکانے لگا دیا۔ وہ اسی انجام کا مستحق تھا۔''

''میرا تو خیال تھا کہ تم دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے۔'' میں نے کہا۔ لیکن جب گلوریا کی آنکھوں میں مصنوعی خوف کی جھلک دیکھی تو بات بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''یا کوئی اور بات رہی ہوگی۔''

''مجھے بس ڈومنگو سینئر کو ایک پیغام بھیجنے کی ضرورت تھی۔ میں چاہتی تھی کہ وہ کوئی قدم اٹھائے۔ اس کا وہ قدم تم تھے جس کا مجھے پہلے سے اندازہ تھا۔ اس لیے کہ وہ اپنے تمام گندے کام تم سے کروایا کرتا تھا۔ لیکن میں ڈومنگو جونیئر کو راستے سے ہٹانا چاہتی تھی تاکہ وارث میں بن جاؤں۔''

''تو تم نے ڈومنگو کو گولی ماردی؟ اس طرح تو یہ کام نہیں بنے گا کہ وراثت تمہیں مل جائے۔'' میں نے کہا۔

گلوریا نے اپنی کرسی کی پشت سے ٹیک لگالی اور حیرانی سے بولی۔ ''اسے میں نے گولی ماری ہے!'' ساتھ ہی اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ابھر آئی۔ کسی بنا پر اس مرتبہ مجھے اس کا اس انداز سے مسکرانا کسی طور اچھا نہیں لگا۔

میں نے نظریں گھما کر ڈومنگو کی جانب دیکھا۔ میں یہ یقین کرلینا چاہتا تھا کہ اس کی پیشانی پر سوراخ کیا حقیقت میں گولی لگنے کا ہی ہے! میں نے چیک کیا تو یہ ایک حقیقت ہی تھی۔

''گلوریا اب ایک غم زدہ بیوہ ہے۔'' وکیل ولیم اسٹون نے اپنے سر کے مہین بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''وہ اس دہرے سانحے سے دوچار ہوئی ہے جس میں اقتدار کے بھوکے ایک چچے نے اس کے شوہر اور اس کے سوتیلے بیٹے دونوں کو مہلک حملوں کا نشانہ بنایا ہے۔''

میں ابھی اس کی بات کا مطلب سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ مجھے اپنی پیٹھ میں کسی شے کی چبھن کا احساس ہوا۔

''ہائے۔'' مجھے ایک جانی پہچانی آواز سنائی دی۔

وہ لوئس تھا۔ وہ بندہ جسے چند ماہ قبل میں نے سیکیورٹی میں اپنی مدد کے لیے ملازم رکھا تھا۔ میں نے پلٹنے کی کوشش کی تو میری پیٹھ میں گڑے ہوئے اسلحے کے زور پر مجھے آگے دھکیل دیا گیا اور میں حقیقت میں قدرے لڑکھڑا گیا۔

''یہ کیا مذاق ہے، لوئس؟''

''یہ واقعی مذاق ہے۔'' گلوریا نے کہا۔ پھر اس نے میز کی دراز میں سے ایک بیگ نکال کر نمایاں کرتے ہوئے بولی۔ ''اسے پہچانتے ہو؟''

''یہ میرا اعشاریہ تین آٹھ کا ریوالور ہے۔ میرا بیک اپ۔'' میں نے جواب دیا۔

''وہی جو تمہارے باپ نے تمہیں دیا تھا۔'' میرے عقب میں موجود لوئس نے کہا۔ ''اور یہ تمہارے نام پر رجسٹرڈ ہے۔''

''بالکل ٹھیک۔''

''اور بالکل یہی وہ پستول ہے جس سے ڈومنگو سینئر کو شوٹ کیا گیا ہے۔'' گلوریا نے بات کو مکمل کرتے ہوئے کہا۔

کمرے میں خاموشی چھائی رہی۔ میں آنکھیں پھاڑے گلوریا کو تک رہا تھا۔

''یہ تو اچھا ہوا کہ لوئس یہاں موقع پر آ گیا۔'' گلوریا دوبارہ گویا ہوئی۔ ''اس نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا اور کسی طرح تم پر قابو پالیا تاکہ ہم پولیس کے یہاں آنے تک تمہیں یہاں تھامے رکھیں۔''

اس دوران میں میرا ہولسٹر ہلکا اور کھوکھلا ہو گیا کیونکہ لوئس نے عقب سے میرا آٹو میٹک نکال لیا تھا۔ اب میں نہتا ہو گیا تھا۔

''میں نے تمہیں بچ نکلنے کا موقع فراہم کیا تھا۔ میں یہ فیصلہ پہلے ہی کر چکا تھا۔'' میں نے گلوریا سے ہکلاتے ہوئے کہا۔ میرے الفاظ یوں ادا ہو رہے تھے جیسے کسی اور کے منہ سے نکل رہے ہوں۔ ''میں نے اس طرح ڈومنگو کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا تھا۔''

''اسی بنا پر تو تم میری اس نئی تنظیم کے لیے درست آدمی نہیں ہو۔'' گلوریا نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ مجھے وہ لوگ چاہئیں جو حکم کی تعمیل کرتے ہیں... حکم عدولی نہیں۔''

اس دوران میں دور سے سائرن کی آواز سنائی دی۔ جو بتدریج نزدیک آتی جا رہی تھی۔

''مزید ایک اور بات۔'' گلوریا نے کہا۔ ساتھ ہی وہ اپنے مخصوص بھرپور انداز میں مسکرانے لگی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے یہ مسکراہٹ صرف میرے لیے ہے۔ ''اس کولون کو لگانے کا شکریہ جو میں نے ایک ہفتہ قبل تمہیں تحفے میں دیا تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ تم اسے لازمی استعمال کرو گے۔ جبھی تو جب میں سیف ہاؤس کے بیڈروم میں ڈومنگو جونیئر کے ساتھ بیڈ پر تھی تو اس کولون کی مہک نے جو کمرے کی فضا میں پھیلی ہوئی تھی، مجھے یقین دلا دیا تھا کہ تم الماری کے اندر چھپے ہوئے ہو۔'' ایک بار پھر وہ جان لیوا انداز میں مسکرائی۔

Downloaded From Paksociety.com

# انگارے

طاہر جاوید مغل

## چھٹی قسط

نیکی کر دریا میں ڈال... بات محاورے کی حد تک ٹھیک ہو سکتی ہے لیکن خود غرضی اور سفاکی کے اس دور میں نیکی کرنے والے کو ہی کمر میں پتھر باندھ کر دریا میں ڈال دیا جاتا ہے۔ انسان بے لوث ہو اور سینے میں دردمند دل رکھتا ہو تو اس کے لیے قدم قدم پر ہولناک آسیب منہ پھاڑے انتظار کررہے ہوتے ہیں۔ بستیوں کے سرخیل اور جاگیرداری کے بے رحم سرغنہ لہو کے پیاسے ہو جاتے ہیں... اپنوں کی نگاہوں سے نفرت کے انگارے برسنے لگتے ہیں... امتحان در امتحان کے ایسے کڑے مراحل پیش آتے ہیں کہ عزم کمزور ہو تو مقابلہ کرنے والا خود ہی اندر سے ریزہ ریزہ ہو کر بکھرتا چلا جاتا ہے لیکن حوصلہ جوان ہو تو پھر ہر سازش کی کوکھ سے دلیری اور ذہانت کی نئی کہانی ابھرتی ہے۔ وطن کی مٹی سے پیار کرنے والے ایک بے خوف نوجوان کی داستان جسے ہر طرف سے وحشت و بربریت کے خون آشام سایوں نے گھیر لیا تھا مگر وہ ان پیاسی دلدلوں میں رکے بغیر دوڑتا ہی چلا گیا... اثر ورسوخ اور درندگی کی زنجیریں بھی اس کے بڑھتے ہوئے قدم نہیں روک سکیں۔ وقت کی میزان کو اس کے خونخوار حریفوں نے اپنے قدموں میں جھکا لیا تھا مگر وہ ہار مان کر پسپا ہونے والوں میں سے نہیں تھا...

**لمحہ لمحہ رنگ بدلتی... ایک لہو رنگ اور دل گداز داستان...**

Downloaded From Paksociety.com

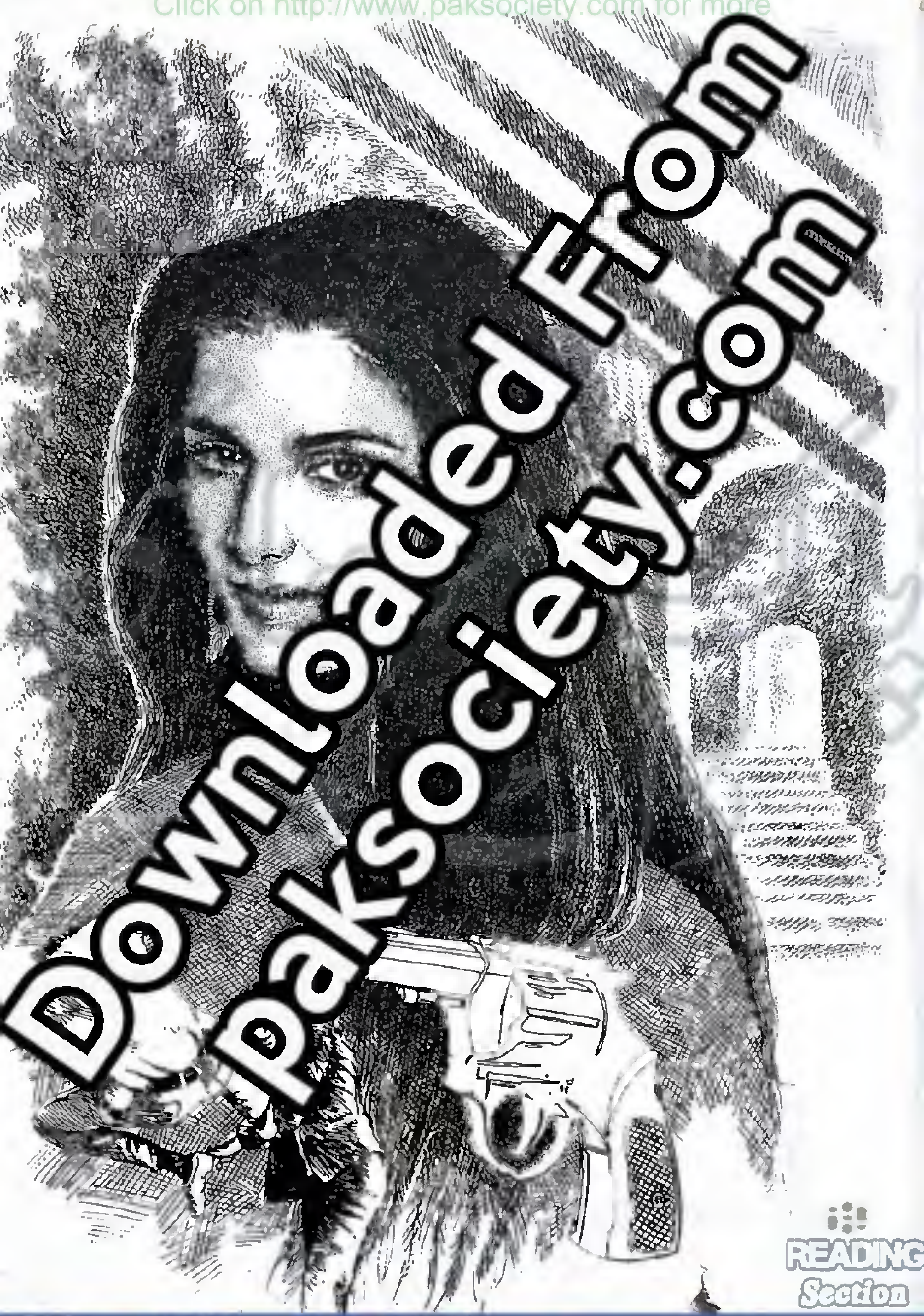

Downloaded From paksociety.com

READING
Section

## گزشتہ اقساط کا خلاصہ

میں ڈنمارک سے اپنے پیارے وطن پاکستان لوٹا تھا۔ مجھے کسی کی تلاش تھی۔ لیکن یہ تلاش شروع ہونے سے پہلے ہی میرے ساتھ ایک ایسا واقعہ ہوگیا جس نے میری زندگی کو تہ و بالا کردیا۔ میں نے سرِراہ ایک ایسے زخمی کو اٹھا کر اسپتال پہنچایا جسے کوئی گاڑی ٹکر مار کر گزر گئی تھی۔ مقامی پولیس نے مجھے مددگار کے بجائے مجرم ٹھہرایا اور یہیں سے جبر و ناانصافی کا ایسا سلسلہ شروع ہوا جو مجھے شکیل داراب اور لالہ نظام جیسے خطرناک لوگوں کے سامنے لے آیا۔ یہ لوگ ایک قبضہ گروپ کے سرخیل تھے جو رہائشی کالونیاں بنانے کے لیے چھوٹے زمینداروں اور کاشت کاروں کو ان کی زمینوں سے محروم کررہا تھا۔ میرے چچا حفیظ سے بھی زبردستی ان کی آبائی زمین ہتھیانے کی کوشش کی جارہی تھی۔ چچا کا بیٹا ولید اس جبر کو برداشت نہ کرسکا اور شکیل داراب کے دستِ راست انسپکٹر قیصر چودھری کے سامنے سینہ تان کر کھڑا ہوگیا۔ اس جرأت کی سزا اسے یہ ملی کہ ان کی حویلی کو اس کی ماں اور بہن فائزہ سمیت جلا کر راکھ کردیا گیا اور وہ خود دہشت گرد قرار پاکر جیل پہنچ گیا۔ اب انسپکٹر قیصر چودھری اور لالہ نظام جیسے سفاک لوگ میرے تعاقب میں تھے، لیکن وہ نہیں جانتے تھے کہ میرا ماضی کیا ہے۔ کوئی بھی نہیں جانتا تھا۔ میں WWF کا یورپی چیمپئن تھا، وسطی یورپ کے کئی بڑے بڑے گینگسٹر میرے ہاتھوں ذلت اٹھا چکے تھے۔ میں اپنی پچھلی زندگی سے بھاگ آیا تھا لیکن اپنے وطن پہنچتے ہی یہ زندگی پھر مجھے آواز دینے لگی تھی۔ میں نے اپنی چچی اور چچازاد بہن فائزہ کے قاتل لالہ نظام کو بیدردی سے قتل کردیا۔ انسپکٹر قیصر چودھری شدید زخمی ہوکر اسپتال نشیں ہوا۔ شکیل داراب ایک شریف النفس زمیندار کی بیٹی عاشرہ کے پیچھے ہاتھ دھوکر پڑا ہوا تھا۔ وہ اسی عارف نامی نوجوان سے محبت کرتی تھی جسے میں نے زخمی حالت میں اسپتال پہنچانے کی ،،غلطی‘‘ کی تھی۔ میں نے شکیل داراب کی ایک نہایت اہم کمزوری کا سراغ لگایا اور یوں اس پر دباؤ ڈال کر عاشرہ کی جان اس سے چھڑا دی۔ عاشرہ اور عارف کو میں نے بیرونِ ملک بھجوادیا تاکہ وہ تحفظ کے ساتھ اپنی نئی زندگی شروع کرسکیں۔ میں خود بھی بیزار ہوگیا تھا اور واپس ڈنمارک لوٹ جانے کا تہیہ کرچکا تھا مگر پھر ایک انہونی ہوئی۔ وہ جادوئی حسن رکھنے والی لڑکی مجھے نظر آگئی جس کی تلاش میں، میں یہاں پہنچا تھا۔ اس کا نام تاجور تھا اور وہ اپنے گاؤں چاند گڑھی میں کچھ نہایت پریشان کن حالات کا شکار تھی۔ میں تاجور کے ساتھ گاؤں پہنچا اور ایک ٹریکٹر ڈرائیور کی حیثیت سے اس کے والد کے پاس ملازم ہوگیا۔ انیق بطور مددگار میرے ساتھ تھا۔ مجھے پتا چلا کہ تاجور کا غنڈا صفت منگیتر اسحاق اپنے ہمنواؤں زمیندار عالمگیر اور پیر ولایت کے ساتھ مل کر تاجور اور اس کے والد دین محمد کے گرد گھیرا تنگ کررہا تھا۔ پیر ولایت نے گاؤں والوں کو باور کرا رکھا تھا کہ اگر تاجور کی شادی اسحاق سے نہ ہوئی تو چاند گڑھی پر آفت آئے گی۔ ان لوگوں نے چاند گڑھی کے راست گو امام مسجد مولوی فدا کو بھی اپنے ساتھ ملا رکھا تھا۔ مولوی فدا جو پہلے زبردستی کی شادی کو غلط قرار دے رہے تھے، اب نامعلوم وجہ سے اسحاق کی حمایت کرنے لگے تھے۔ اسی دوران میں کسی نے تاجور کے گھر آئی ہوئی مہمان نمبردارنی کو بُری طرح زخمی کردیا۔ اسحاق کے ہمنواؤں نے اس کا الزام بھی تاجور پر لگانے کی کوشش کی لیکن میں نے کھوج لگانے کی ٹھانی۔ مجھے شک گزرا کہ اس کام میں مولوی فدا یا اس کا کوئی شاگرد ملوث ہے۔ ایک رات میں نے چہرے پر ڈھاٹا باندھ کر مولوی فدا کا تعاقب کیا۔ وہ ایک ہندو میاں بیوی رام پیاری اور وکرم کے گھر میں داخل ہوئے۔ پہلے تو مجھے یہی غلط فہمی ہوئی کہ شاید مولوی فدا یہاں کسی غلط نیت سے آئے ہیں لیکن پھر حقیقت سامنے آگئی۔ مولوی فدا ایک خداترس بندے کی حیثیت سے یہاں وکرم اور رام پیاری کی مدد کے لیے آئے تھے۔ تاہم اسی دوران میں وکرم اور رام پیاری کے کچھ مخالفین نے ان کے گھر پر ہلہ بول دیا۔ ان کا خیال تھا کہ ٹی بی کا شکار وکرم ان کے بچے کی موت کا باعث بنا ہے۔ اس موقع پر مولوی فدا نے دلیری سے وکرم اور رام پیاری کا دفاع کیا، لیکن جب حالات زیادہ بگڑے تو میں نے ہڈیوں کے ڈھانچے وکرم کو کندھے پر لادا اور رام پیاری کو لے کر وہاں سے بھاگ نکلا۔ میں نمبردارنی کو زخمی کرنے والے کا کھوج لگانا چاہتا تھا۔ پتا چلا کہ یہ مولوی صاحب کے شاگرد طارق نے کیا ہے۔ وہ تاجور کی جان لینا چاہتا تھا کیونکہ اس کی وجہ سے مولوی صاحب کسی بلیک میلنگ کا شکار ہورہے تھے۔ طارق سے مجھے معلوم ہوا کہ مولوی جی کی بچی زینب ایک عجیب بیماری کا شکار ہے۔ وہ زمیندار عالمگیر کے گھر میں ٹھیک رہتی ہے لیکن جب اسے وہاں سے لایا جائے تو اس کی حالت غیر ہونے لگتی ہے۔ اسی دوران میں ایک خطرناک ڈاکو سجاول نے گاؤں پر حملہ کیا۔ حملے میں عالمگیر کا چھوٹا بھائی مارا گیا۔ میں تاجور کو حملہ آوروں سے بچا کر ایک محفوظ جگہ لے گیا۔ ہم دونوں نے کچھ اچھا وقت گزارا۔ واپس آنے کے بعد میں نے بھیس بدل کر مولوی فدا سے ملاقات کی اور اس نتیجے پر پہنچا کہ عالمگیر وغیرہ نے زینب کو جان بوجھ کر بیمار کر رکھا ہے اور یوں مولوی صاحب کو مجبور کیا جارہا ہے کہ وہ اپنی بچی کی جان بچانے کے لیے اسحاق کی حمایت کریں۔ میں نے مولوی صاحب کو اس ”بلیک میلنگ“ سے نکالنے کا عہد کیا، مگر اگلی رات مولوی صاحب کو قتل کردیا گیا۔ میرا شک عالمگیر اور اسحاق وغیرہ پر تھا۔ رات کی تاریکی میں، میں نے عالمگیر اور اسحاق کو کسی خاص مشن پر جاتے دیکھا۔ میں نے ان کا تعاقب کیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ ڈکیت سجاول سے بدلہ لینے جارہے ہیں۔ وہ ایک ویرانے میں پہنچے۔ یہاں سے گانے کی آواز آرہی تھی۔

## اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

میں درختوں میں دُبکا بیٹھا رہا اور گانے کی آواز سنتا رہا۔ ہوا کی لہروں پر تیر کر یہ آواز کبھی تیز اور کبھی مدھم ہو جاتی تھی۔ ذہن میں پہلا خیال یہی آیا کہ یہ سجاول سیالکوٹی کا ڈیرا ہے اور یہ ڈکیت یہاں رقص و سرور کی محفل جمائے بیٹھا ہے۔ اب عالمگیر اپنے ساتھیوں سمیت اس ڈیرے تک پہنچ چکا تھا۔ یقینی بات تھی کہ اپنے مقتول بھائی کا بدلہ لینے کے لیے عالمگیر، سجاول سیالکوٹی پر حملہ کرے گا۔ عنقریب مجھے فائرنگ کی آوازیں سنائی دے سکتی تھیں۔ یہ فائرنگ شدید خون خرابے کا آغاز بھی ہو سکتی تھی۔

قریباً دس پندرہ منٹ اسی طرح گزر گئے۔ مجھے فائرنگ سنائی نہیں دی۔ نہ ہی کسی اور طرح کی ہلچل محسوس ہوئی۔ شاید عالمگیر کے ساتھی بہتر موقع کی تلاش میں گھات لگائے بیٹھے تھے یا پھر اس طرح کا کوئی اور معاملہ تھا۔ اب ایک اور گیت کے بول اُبھر رہے تھے اور سرد رات کی خاموش تاریکی میں ارتعاش پیدا کر رہے تھے۔

رات بھر جام سے جام ٹکرائے گا
جب نشہ چھائے گا، تب مزہ آئے گا

مخمور مردوں کے پُرنشاط قہقہے بھی گاہے بگاہے فضا میں ابھرتے تھے۔

قریباً آدھ گھنٹا اسی طرح گزر گیا تو میرے ذہن میں شبہات پیدا ہوئے۔ میں نے اپنی جگہ سے حرکت کی اور جھاڑیوں کے درمیان بڑی احتیاط سے چلتا ڈیرے کی طرف بڑھا۔ میری جیکٹ میں اعشاریہ 38 کا بھرا ہوا پستول تھا۔ پندرہ بیس فالتو راؤنڈ بھی جیکٹ کی اندرونی جیب میں موجود تھے۔ تھوڑا آگے جا کر مجھے عالمگیر کی جیپ نظر آئی۔ یہ وہی جیپ تھی جسے میں نے ڈیڑھ گھنٹا پہلے حلقے کے قابل بنایا تھا۔ یہ دیکھ کر میں مزید چونکا کہ جیپ کو درختوں میں چھپانے کی کوشش نہیں کی گئی تھی۔ یہ جیپ ڈیرے سے تیس چالیس قدم کے فاصلے پر کھلی جگہ کھڑی تھی۔ ڈیرے کی روشنیاں نظر آرہی تھیں۔ یہ چار پانچ کمروں پر مشتمل نیم پختہ سی جگہ تھی۔ برآمدہ نظر نہیں آرہا تھا۔ اردگرد اور صحن میں کثرت سے جھاڑ جھنکاڑ اگا ہوا تھا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ یہ بے آباد جگہ ہے مگر... کم از کم آج کی رات تو یہ بے آباد ہرگز نہیں تھی۔ اندر روشنی تھی۔ گھنگروؤں کی جھنکار تھی، بھنے ہوئے گوشت کی خوشبو تھی اور پُرکیف قہقہے تھے۔ مغنیہ کی آواز اب مزید واضح ہو چکی تھی۔ مجھے اندازہ ہوا کہ یہاں سازندے وغیرہ موجود نہیں ہیں بلکہ ٹیپ ریکارڈر پر گانا پلے کر کے اس پر رقص کیا جا رہا ہے۔

یکایک مجھے اپنی بائیں جانب آہٹ کا احساس ہوا۔ میں نے مڑ کر دیکھا مگر دیر ہو چکی تھی۔ ایک شخص توپ کے گولے کی طرح مجھ سے آ ٹکرایا۔ ہم اوپر نیچے گرے۔ گہری تاریکی میں، میں اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکا۔ بس اتنا اندازہ ہوا کہ وہ طاقت ور شخص ہے اور اس کے جسم سے شراب کی بو آرہی ہے۔ اس شخص کو ہرگز توقع نہیں تھی کہ اس کے ساتھ ایسا ہوگا اور اتنی تیزی سے ہوگا۔ میں نے نیچے پڑے پڑے سر کی طوفانی ضرب اس کی پیشانی پر بائیں جانب لگائی۔ مارشل آرٹ کی زبان میں بعض لوگ ایسی چوٹ کو ”راؤنڈ امپیکٹ“ کا نام دیتے ہیں۔ یہ مضروب کے دماغ کی چولیں اس طرح ہلاتی ہے کہ اسے زمین و آسمان گھومتے محسوس ہوتے ہیں۔ میرے مدِمقابل کی مزاحمت بھی آناً فاناً دم توڑ گئی۔ وہ اپنے منہ سے آواز تک نہیں نکال پایا تھا۔ میں نے مزید تسلی کے لیے نیچے لیٹے لیٹے اس کی کنپٹی پر ایک اور زوردار ہاتھ جمایا اور اسے مکمل انٹاغفیل کر دیا۔ اسے اپنے اوپر سے ہٹا کر میں اٹھ کھڑا ہوا۔ تاریکی میں آنکھیں پھاڑ کر دھیان سے دیکھنے پر احساس ہوا کہ وہ سجاول سیالکوٹی کا کوئی ساتھی تھا۔ اس کی کمر کے گرد گولیوں والی بیلٹ بندھی ہوئی تھی۔ ایک ٹرپل ٹو رائفل اس کے پاس ہی گری ہوئی تھی۔ غالباً وہ یہاں پہرے پر تھا اور میری آہٹ سن کر اپنی بدقسمتی کے طفیل اس طرف چلا آیا تھا۔

میں نے اس کو گھسیٹ کر گھنی جھاڑیوں کے اندر کر دیا اور اس کی رائفل بھی خالی کر کے ایک گڑھے میں پھینک دی۔ بڑی احتیاط سے چلتا ہوا میں ڈیرے کے پہلو میں پہنچا اور دیوار پھاند کر اندر داخل ہو گیا۔ میری تمام حسیات پوری طرح بیدار ہو چکی تھیں۔ کسی بھی خطرے سے نمٹنے کے لیے میں بالکل تیار تھا۔ مجھے ایک ادھ کھلا دروازہ ملا تو میں اس کے اندر چلا گیا۔ یہ شاید کسی وقت اس کھنڈر گھر کا باورچی خانہ رہا ہوگا مگر اب اس میں جالے لگے ہوئے تھے اور سیلن کی بو تھی۔ میں بے آواز قدم اٹھاتا ہوا ایک ساتھ والے کمرے میں پہنچا۔ یہاں بس دو تین چارپائیاں پڑی تھیں اور ایک ٹرنک رکھا تھا۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ ان لوگوں نے بس وہ دو تین کمرے ہی صاف کر رکھے ہیں جہاں یہ محفل برپا ہے، باقی گھر اسی طرح اجاڑ پڑا ہے اور جالوں سے اٹا ہوا ہے۔ لکڑی کے ایک ٹوٹے ہوئے دروازے کے سوراخ سے میں نے آنکھ لگائی تو ٹھٹک کر رہ گیا۔ یہ وہی کمرا تھا جہاں محفل جمی ہوئی تھی۔ یہ شاید کوئی برآمدہ ہی تھا جسے بعد میں کمرے کی شکل دے دی گئی تھی۔ یہاں گیس لیمپس کی

روشنی تھی۔ دو انگیٹھیوں میں کوئلے دہک رہے تھے۔ فرش پر ایک بڑی دری بچھی تھی جس پر کم و بیش پندرہ افراد موجود تھے۔ یہ سب کے سب دیواروں سے ٹیک لگائے آلتی پالتی مارے بیٹھے تھے۔ تین چار ''معتبر'' افراد نے گاؤ تکیے سے ٹیک لگا رکھی تھی۔ ایک رقاصہ پاؤں میں گھونگرو باندھے بڑی مشاقی سے ناچ رہی تھی۔ ٹیپ ریکارڈر پر گانا پلے ہو رہا تھا۔ تماش بین نشے میں جھوم رہے تھے اور گاہے بگاہے رقاصہ سے چھیڑ چھاڑ بھی کر رہے تھے۔

میں نے سجاول سیالکوٹی کو دیکھا نہیں تھا مگر اس کا حلیہ اچھی طرح معلوم تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اسے پہچاننے میں مجھے زیادہ دشواری نہیں ہوئی۔ خاکستری قمیص شلوار والا وہ تنومند شخص بڑے ٹھاٹ سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اس کی پیشانی پر پرانی چوٹ کا نشان نمایاں تھا۔ پیشانی کے نیچے بڑی بڑی آنکھوں میں بلا کی چمک تھی۔ کرخت نقوش اور کانٹے دار داڑھی نے اسے ایک سکہ بند ڈکیت کا روپ دے رکھا تھا۔ مجھے جس چیز نے ششدر کیا وہ یہ تھی کہ لمبوترے چہرے والا عالمگیر بھی یہاں موجود تھا۔ وہ سجاول سیالکوٹی کے کندھے سے کندھا ملائے بیٹھا تھا... اور رقاصہ پر نوٹ نچھاور کر رہا تھا۔

یہ حیران کن ماجرا تھا۔ سیالکوٹی کے ساتھیوں نے عالمگیر کے چھوٹے بھائی کو قتل کیا تھا اور یہ خونی واقعہ ہوئے چند روز ہی گزرے تھے۔ مجھے وہ منظر یاد آیا جب عالمگیر آتشیں آنسو بہا رہا تھا اور اس کے قریبی عزیز بھی دہاڑیں مار مار کر رو رہے تھے۔ پچھلے کئی دن سے عالمگیر کسی بگولے کی طرح چکرا رہا تھا اور لوگ یہی سمجھ رہے تھے کہ وہ اپنے بھائی کے قاتل سیالکوٹی کو ڈھونڈ رہا ہے لیکن یہاں کچھ اور ہی سین تھا۔ سجاول نے رقاصہ کو کھینچ کر آغوش میں لیا تو عالمگیر نے اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا بدبودار گلاس رقاصہ کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ رقاصہ نے ہونٹ بھینچ لیے اور انکار میں سر ہلانے لگی۔ سجاول نے ایک نازیبا حرکت کرنے کے بعد رقاصہ کو چھوڑ دیا اور وہ پھر محوِ رقص ہو گئی۔

رقص ختم ہوا تو وہ بدمست تماش بینوں سے بدن چرا کر دوسرے کمرے میں بھاگ گئی لیکن وہ تھی تو اسی چار دیواری میں۔ ان بہکے ہوئے مردوں کے لیے اس کی حیثیت گھڑے کی مچھلی جیسی تھی۔ وہ جب چاہے اس کو پکڑ سکتے تھے۔ ٹیپ ریکارڈر پر گانا پلے ہوا۔ جھانجریا پہنا دو... بندیا بھی لگا دو... ایک اور چھمکتی دمکتی رقاصہ اندر آ گئی۔ اس نے نہایت مختصر لباس پہن رکھا تھا۔ پوری کمر اور کندھوں پر ریشمی ڈوریاں سی نظر آ رہی تھیں۔ کانوں میں بڑے بڑے آویزے تھے۔ اس نے اپنے بال کھلے چھوڑ رکھے تھے۔ اس نے گانے پر رقص شروع کیا۔ یہ حیرت کا دوسرا ریلا تھا جس نے مجھے جھنجوڑا۔ یہ رقاصہ میرے لیے اجنبی نہیں تھی۔ یہ وہی جاناں نامی لڑکی تھی جو ماڈلنگ وغیرہ بھی کرتی رہی تھی۔ اس سے میری ملاقات پاشا کی شاندار کوٹھی میں ہوئی تھی۔ پاشا نے اپنی ٹیچر بیوی ناہید کو شکیل واراب کے حوالے کر دیا تھا اور اس کے عوض خود موج مستی کی زندگی گزار رہا تھا۔ اس پاشا کو آڑے ہاتھوں لینے کے لیے جب میں لاہور میں اس کے گھر میں گھسا تھا تو وہاں میری ملاقات پاشا کی اس رکھیل جاناں سے ہوئی تھی۔ وہ ٹی وی کی ثانوی اداکارہ تھی اور رسالوں وغیرہ کے اشتہارات میں بھی دکھائی دیتی تھی۔ ایک قانونی چکر میں پھنس کر وہ پاشا کے شکنجے میں آ گئی تھی۔ اب غیر متوقع طور پر وہ لاہور سے قریباً دو سو میل دور مجھے یہاں اس ویرانے میں دکھائی دی تھی۔

سیالکوٹی کی مخمور آواز میرے کانوں میں پڑی۔ اس نے اپنے کسی ساتھی سے کہا۔ ''اوئے کبوتر! وہ دوجا گانا لگا۔ پتنگ وانگوں مینوں سجناں... اڑائی جا اڑائی جا۔''

سیاہ چہرے والے کارندے نے ادب سے اثبات میں سر ہلایا اور ٹیپ ریکارڈر سے چھیڑ چھاڑ کی۔ فلمی گانے کے بول فضا میں بلند ہونے لگے۔ جاناں نے گانے کی موسیقی سے مطابقت پیدا کی اور پھر رقص کی کوشش کرنے لگی۔ صاف پتا چلتا تھا کہ وہ پہلی رقاصہ کی طرح اس کام میں ماہر نہیں ہے۔ وہ الٹے سیدھے ہاتھ پاؤں پھینک رہی تھی اور ڈری ڈری سی کوشش کر رہی تھی۔ بہرحال تماش بینوں کو اس کی یہ ناپختگی اور گھبراہٹ بھی لطف دے رہی تھی۔ پتا نہیں کیوں میرا دل گواہی دینے لگا کہ اگر جاناں یہاں موجود ہے تو پھر کسی نہ کسی طرح ان لوگوں کا تعلق پاشا اور شکیل وغیرہ سے بھی ہو گا۔ وہی قبضہ گروپ جو مراد پور کے علاقے میں زمینداروں اور کاشت کاروں کو ان کے رقبوں سے محروم کر رہا تھا اور رہائشی کالونیاں [illegible]نے کے لیے زندگیاں اُجاڑ رہا تھا۔

وہ سارے دلدوز مناظر ذہن میں تازہ ہو گئے جو پہلے مراد پور اور پھر لاہور میں نظر آئے تھے۔ ہماری آبائی حویلی پر دولت کے پجاریوں کی حریص نظریں۔ چچا حفیظ کو ملنے والی خفیہ اور اعلانیہ دھمکیاں، پھر حویلی میں سازش کے تحت لگنے والی آگ، میری چچا زاد بہن فائزہ اور چچی کی

المناک موت۔ ولید کا زخمی اور گرفتار ہوتا، میرا غم و غصے سے دیوانہ ہونا اور پھر داؤد بھاؤ کے تعاون سے فائزہ اور چچی کے دہرے قتل کا انتقام لالہ نظام سے لینا، ان کی کار کو ہیوی لوڈر سے کچلنا... اس کے بعد نوجوان سیاست داں شکیل کے سنگین کرتوت کا کھوج لگا کر اسے اپنی گرفت میں لانا اور عارف کی محبت عاشرہ کی جان شکیل سے چھڑانا... سب مناظر ایک فلم کی طرح میرے تصور کے پردے پر چلنے لگے۔ میرا دل گواہی دینے لگا کہ شاید یہاں بھی وہ لوگ کسی نہ کسی طور پر موجود ہیں۔

عالمگیر کا ساتھی ساقا نشے کی ترنگ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے شراب کی بوتل اپنے سر پر رکھی اور جاناں کے اردگرد بھونڈے انداز میں ڈانس کرنے لگا۔ اس نے ایک ہاتھ سے اپنی شلوار کا پائنچا اونچا کیا ہوا تھا اور بے ہودہ انداز میں ٹھمکے لگا رہا تھا اور یہ وہ شخص تھا جو تاجور جیسی خوب صورت روشن کتاب کے سارے جملہ حقوق اپنے نام محفوظ کرنا چاہتا تھا۔ اس کے جسم و جان کا مالک بننا چاہتا تھا۔

میرے سینے میں چنگاریاں سی چھوٹ گئیں۔ ساقے کا ڈانس اور اشتعال انگیز حرکات دیکھ کر عالمگیر بھی جوش میں آ گیا۔ وہ ڈگمگاتا ہوا اٹھا اور بھنگڑے کے انداز میں ناچنے لگا۔ تماش بینوں نے بھڑکیں ماریں اور رقاصہ پر نوٹ نچھاور کیے۔ عالمگیر نے ہلکی پھلکی جاناں کو اپنے کندھے پر اٹھا لیا اور اسی طرح رقص کرتا رہا۔ میری حیرت بڑھ رہی تھی۔ یہ شخص چاند گڑھی میں زہریلے سانپ کی طرح پھنکار رہا تھا اور اپنے بھائی کے قاتلوں کو عبرت کا نشان بنانے کی قسمیں کھا رہا تھا مگر یہاں وہ قاتلوں کے ساتھ بیٹھا داد عیش دے رہا تھا۔ مطلب یہ کہ صورتِ حال وہ نہیں تھی جو دکھائی دیتی تھی۔ عین ممکن تھا کہ عالمگیر کے بھائی کا قتل عالمگیر کی منشا پر ہی ہوا ہو... وہی بات کہ... ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ۔

اچانک مجھے اپنے قریب آہٹ محسوس ہوئی۔ میں جلدی سے ایک کھڑی چارپائی کی اوٹ میں ہو گیا۔ اندر آنے والا ایک رائفل بردار تھا۔ اس نے ٹرنک میں سے انڈین شراب کی دو بوتلیں اور سگریٹس کے چند پیکٹ نکالے اور جیسے جھومتا ہوا آیا تھا، ویسے ہی باہر نکل گیا۔ میں اپنی جگہ ساکت بیٹھا رہا۔ بہرحال اس کے بعد میں نے ایک بوسیدہ سا میز پوش احتیاطاً اپنے چہرے اور سر کے گرد لپیٹ کر مضبوط گرہ لگالی۔

میری جیکٹ کی اندرونی جیب میں ایک چھوٹا سا لیکن

گھر کے ہر فرد کے لیے
بے مثال تحریروں کا مجموعہ
ماہنامہ
پاکیزہ
کراچی
میں نیا دل گداز سلسلے وار ناول
گمشدہ محبت
آپ کی ہر دلعزیز اور مایہ ناز مصنفہ
انجم انصار
کے ماہرانہ قلم کا شاہکار......شوخ و چنچل......جملوں سے سجا......معاشرتی و نفسیاتی گرہیں کھولتا یہ ناول محبت کے ایک نئے اور بے حد خوب صورت رنگ سے بھی روشناس کرائے گا
بہت جلد صفحات کی زینت بننے جا رہا ہے

طاقتور اسپائی کیمرا موجود تھا۔ یہ اصل فوٹوگرافی کے علاوہ مووی بھی بناتا تھا۔ میں نے کیمرا نکال کر دروازے کے سوراخ میں لگایا اور بڑے اطمینان سے تصویریں کھینچ لیں۔ بے شک اندر روشنی بہت تیز نہیں تھی مگر کیمرے کی خوبی یہی تھی کہ وہ نیم تاریکی اور کم روشنی میں بھی واضح فوٹو لے سکتا تھا۔ تصویر کشی کے بعد میں نے ایک ایک منٹ کے دو تین کلپس بھی بنائے۔ یہ بات ثابت کرنے کے لیے کہ عالمگیر گاؤں والوں کو ڈکیت سجاول کے سلسلے میں دھوکا دے رہا ہے، یہ بڑے ٹھوس ثبوت تھے۔

دفعتاً آہٹ دوبارہ ہوئی۔ ایک بار پھر وہی شخص نمودار ہوا جو اس سے پہلے بوتلیں اور سگریٹ لے کر گیا تھا۔ شاید وہ مزید لوازمات لینے آیا تھا۔ وہ اپنی ترنگ میں ایک فحش سا گیت گنگناتا داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں بکرے کی چانپ کی ایک بڑی بوٹی تھی۔ گنگنانے کے ساتھ ساتھ وہ اسے نوچ بھی رہا تھا۔ اس مرتبہ بالکل غیر متوقع طور پر وہ آگے آگیا۔ میں چارپائی کے پیچھے تھا۔ ہمارے درمیان بمشکل دو ڈھائی فٹ کا فاصلہ رہا ہوگا۔ میں نے سانس تک روک لی۔ اس نے ٹارچ جلائی اور ٹوٹے پھوٹے فرش پر کچھ تلاش کرنے لگا۔ پھر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ ٹارچ کا روشن دائرہ کھڑی چارپائی کی ادوائن سے گزر کر میرے پاؤں پر پڑا۔ وہ شخص بری طرح چونکا۔ اس کا ہاتھ بے ساختہ اپنی پنڈلی کی طرف گیا۔ میں نے بھانپ لیا کہ وہ کوئی تیز دھار آلہ نکالنے جارہا ہے۔ میں لپک کر چارپائی کے پیچھے سے نکلا۔ میری لات اس کے سینے پر پڑی اور وہ الٹ کر کاٹھ کباڑ پر گرا۔ میں نے اس پر جھپٹا مارا مگر اس دوران میں وہ بڑے ماہرانہ انداز میں اپنی پنڈلی سے ایک خم دار خنجر نکال چکا تھا۔ یقینا وہ خنجر زنی میں ماہر بھی تھا۔ مجھے پیچھے ہٹنے میں ایک لمحے کی دیر بھی ہوتی تو وہ بے دریغ میرا پیٹ چاک کردیتا۔ خنجر کی نوک میری جیکٹ کو چیرتی ہوئی گزر گئی۔ میں اسے دوسرا وار کرنے کا موقع دیتا تو یہ میری سنگین غلطی ہوتی۔ میں نے اس کی ٹھوڑی کے نیچے گردن پر اس جگہ وار کیا جہاں چوٹ لگنے سے سانس رک جاتی ہے اور ریڑھ کی ہڈی تک ضرب کا اثر ہوتا ہے۔ پہلی ضرب درست جگہ پر نہیں لگی۔ وہ سہم گیا اور چلایا۔ ”رحمو... شوکے... رحمو۔“

دوسری ضرب نے اس کی بولتی بند کردی اور وہ مردہ چھپکلی کی طرح ایک طرف ڈھ گیا۔

صورتِ حال نازک ہوچکی تھی۔ میں نے پستول نکالا اور مڑ کر دروازے کی طرف گیا۔ ناچ گانے والے کمرے میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔ سجاول سیالکوٹی کی پاٹ دار آواز گونجی۔ ”اوئے کون ہے؟ دیکھو ذرا جلدی سے۔“

بھاگتے قدموں کی آوازیں آئیں۔ میں چار دیواری کے قریب پہنچا تو ایک دراز قد شخص نے ٹارچ کی روشنی مجھ پر پھینکنے کی کوشش کی۔ میں نے بھاگ کر اس کے سینے پر ٹانگ جمائی۔ ”مومینٹم“ کی وجہ سے یہ ضرب اتنی زوردار تھی کہ مقابل کی پسلی ٹوٹنے کی واضح آواز آئی۔ وہ دیوار سے ٹکرا کر اوندھے منہ گرا۔ مزید لوگ پہنچ رہے تھے۔ میں نے پھرتی سے دیوار پھاندی اور جھاڑیوں میں اندھا دھند بھاگتا اس سمت بڑھا جہاں میری موٹر بائیک موجود تھی۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ کئی افراد میرے پیچھے آرہے ہیں۔ پھر جی تھری رائفل کی خوفناک فائرنگ سنائی دی۔ یہ ہوائی فائرنگ تھی لیکن مجھ سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھی۔

مجھے جھاڑیوں کے اندر ایک اور ایسی چیز دکھائی دی جس نے مجھے مزید چونکنے پر مجبور کیا۔ اس کا ذکر میں آگے چل کر کروں گا۔ میری پوری توجہ اس بات پر مرکوز تھی کہ میں اپنی بائیک تک پہنچ جاؤں۔ میری یادداشت نے درست کام کیا اور میں ایک جوہڑ کے سرکنڈوں کے اندر بھاگتا بائیک تک پہنچ گیا۔

ہوا کے دوش پر تیر کر ایک گرج دار آواز مجھ تک پہنچی۔ کسی نے ہانپتے لہجے میں گالی دی اور پکار کر بولا۔ ”زیادہ دور نہیں گیا... دیکھو اس طرف۔“

بائیک اسٹارٹ کرنے میں خطرہ تھا۔ میں کافی دور تک بائیک کو ویسے ہی کھینچ کر لے گیا۔ دس پندرہ فٹ اونچے سرکنڈے مجھے مکمل آڑ فراہم کررہے تھے پھر دور سے آنے والی آوازوں سے پتا چلا کہ میں محفوظ فاصلے پر پہنچ گیا ہوں۔ میں نے بائیک اسٹارٹ کی اور تیزی سے چاند گڑھی کی طرف روانہ ہوگیا۔ مجھے راستوں کا علم نہیں تھا لیکن سمت کا اندازہ تھا۔ یہ بالکل بے آباد جگہ تھی۔ خودرو جھاڑیوں، ٹیلوں کے درمیان اور کچے دشوار راستوں پر میں بائیک کو دوڑاتا چلا گیا۔

☆☆☆

میں جو کچھ دیکھ کر آرہا تھا وہ بہت انکشاف انگیز تھا۔ انیق میرے انتظار میں جاگ رہا تھا۔ میں نے اسے ساری صورت حال سے آگاہ کیا۔ وہ میری کٹی ہوئی جیکٹ دیکھ کر حیران ہوا اور اسے پتا چلا کہ وہاں ہونے والی لڑائی مارکٹائی کتنی سنگین نوعیت کی تھی۔ ہم نے کیمرے کی ننھی سے اسکرین پر وہ تصویریں اور کلپس دیکھے جو میں نے

دروازے کے سوراخ میں سے بنائے تھے۔ سب کچھ بہت واضح تھا۔ آوازیں بھی ریکارڈ ہوئی تھیں۔ انیق نے کہا۔ ''لگ تو یہ رہا ہے کہ عالمگیر نے خود ہی بھائی کو مروایا ہے۔''

''ہاں، اندر خانے کی کوئی دشمنی لگتی ہے۔''

''ایک ایسا واقعہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہوا ہے شاہ زیب بھائی۔ بڑے بھائی نے چھوٹے بھائی کو قتل کرایا اور پھر ایسا چکر چلایا کہ خود ہی اس کا خون بہا وصول کر کے قاتل پارٹی سے صلح بھی کی۔''

''ہمیں یہ صورتِ حال گاؤں والوں کے سامنے لانی ہے۔ تم کل ہی لاہور چلے جاؤ اور تصویروں کے پرنٹ تیار کرواؤ۔''

انیق نے اثبات میں سر ہلایا پھر بولا۔ ''آپ کے جانے کے بعد یہاں ایک اور واقعہ ہوا ہے۔''

''کیا؟''

''مولوی جی کی بیٹی زینب کو بے ہوشی کی حالت میں اسپتال لے کر گئے ہیں۔''

''کیا ہوا اسے؟''

''وہی جو ہوتا ہے۔ پہلے جی خراب ہونے کی شکایت کرتی رہی پھر زمین پر گر کر تڑپنے لگی۔ آخر منہ سے جھاگ نکلنے لگے اور بے ہوش ہوگئی۔ پہلوان حشمت، ماسٹر جی اور مولوی صاحب کا ایک عزیز اسے گاڑی پر ڈال کر لے گئے ہیں۔ فی الحال تو وہ ڈسکہ جائیں گے۔ وہاں سے لاہور جانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ مولوی صاحب کی بیوی بھی ساتھ ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''یہ لاہور جانے والی بات تو اچھی ہے۔ تم بھی لاہور جا رہے ہو، سامنے آئے بغیر تم ان لوگوں کو گائیڈ کر سکتے ہو۔''

''ممکن ہے کہ مولوی جی کی بیوی کے پاس وہ ایڈریس بھی ہو جو آپ نے مولوی جی کو دیا تھا۔ میرا مطلب ہے ڈاکٹر کا اتا پتا۔''

''بالکل ایسا ہو سکتا ہے اور اگر نہیں بھی تو تم دوبارہ یہ ایڈریس ان تک پہنچا سکتے ہو۔''

انیق اور میں دیر تک باتیں کرتے رہے۔ میں نے انیق کو بتایا۔ ''مجھے ایک اور شبہ بھی ہو رہا ہے، ہو سکتا ہے کہ ہمارے لاہور والے ''دوست'' بھی چاند گڑھی کے آس پاس موجود ہوں اور ان سے پھر ملاقات ہو جائے۔''

''میں سمجھا نہیں جی۔''

''شرابی پاشا اور شکیل واراب وغیرہ۔ میں نے تمہیں

## کترنیں

ایک سردار کو ''تیرا بھائی'' کہنے کی بُری عادت تھی۔

شادی کی رات دلہن کے کمرے میں داخل ہوا اور گھونگھٹ اٹھا کر بولا۔ ''کیسا لگ رہا ہے تیرا بھائی؟''

دلہن نے فوراً جواب دیا۔ ''الو کا پٹھا۔''

☆☆☆

پہلا طالب علم: ''مجھے انگریزی والے پروفیسر بہت پسند ہیں۔ ان کی یہ عادت بھی کیا خوب ہے۔''

دوسرا طالب علم (حیران ہو کر): ''کون سی عادت؟''

پہلا طالب علم: ''وہ کلاس میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے میری طرف دیکھتے ہیں اور دیکھتے ہی کلاس سے باہر نکال دیتے ہیں۔''

☆☆☆

ساس نے بہو کو کام سمجھاتے ہوئے کہا: ''میں اس گھر کی ہوم اور فنانس منسٹر ہوں۔ سسر فارن منسٹر ہیں۔ تمہارے شوہر منسٹری آف ڈیمانڈ اور سپلائی چلاتے ہیں اور میری بیٹی کے پاس پلاننگ اینڈ ڈیولپمنٹ منسٹری ہے، اب بتاؤ تم کون سی منسٹری سنبھالو گی؟''

بہو مسکراتے ہوئے بولی: ''لیڈر آف اپوزیشن۔''

جینا ہو گا مرنا ہو گا
دھرنا ہو گا دھرنا ہو گا

☆☆☆

ایک صاحب کی نئی نئی شادی ہوئی تھی۔

شادی کے کچھ دن بعد ایک صاحب نے ایک کان کے ڈاکٹر کے پاس جا کر کہا۔ ''ڈاکٹر صاحب، میری بیوی کم سنتی ہے۔ اس کا علاج کیجیے۔''

ڈاکٹر صاحب نے کچھ مشورے دیے۔ اس کے بعد ان صاحب نے گھر آ کر دیوان خانے میں سے کہا۔ ''بیگم! کیا کر رہی ہو؟'' کوئی جواب نہیں ملا تو انہوں نے ہال میں جا کر کہا۔ ''بیگم! کیا کر رہی ہو؟'' پھر بھی کوئی جواب نہیں ملا۔ اس کے بعد انہوں نے کمرے میں جا کر کہا۔ ''بیگم کیا کر رہی ہو؟'' تب بھی کوئی جواب نہیں ملا تو انہوں نے چوتھی بار باورچی خانے میں جا کر غصے سے کہا۔ ''بیگم آخر تم کر کیا رہی ہو؟''

''کتنی بار پوچھو گے، میں یہاں چائے بنا رہی ہوں۔'' ان کی بیوی نے غصے سے چلاتے ہوئے کہا۔ ''تم بہرے ہو گئے ہو، علاج کراؤ اپنے کانوں کا۔''

فیاض الحق فیاض، ایبٹ آباد

جن ڈانسرز کا بتایا ہے ان میں سے ایک وہی جاناں نام کی لڑکی تھی جس سے پاشا کی لاہور والی کوٹھی میں ملاقات ہوئی تھی۔''

انیق حیران رہ گیا۔ میں نے اسے تفصیل بتائی اور پھر اس خاص چیز کا ذکر بھی کیا جو مجھے وہاں بھاگتے ہوئے جھاڑیوں میں دکھائی دی تھی۔ میں نے سرگوشی میں کہا۔ ''تمہیں وہ گاڑی تو یاد ہوگی جسے میں نے ہیوی لوڈر کے ساتھ ٹکر ماری تھی۔ وہ بالکل تباہ ہو کر رہ گئی تھی۔ وہ سفید رنگ کی مرسیڈیز تھی۔ مجھے بالکل ویسی ہی گاڑی وہاں جھاڑیوں میں بھی نظر آئی ہے۔''

''امیزنگ۔'' انیق نے حیران ہو کر کہا۔

''میں اس کا نمبر ٹھیک طرح نہیں دیکھ سکا۔ مجھے تو نمبر بھی ملتا جلتا ہی لگتا تھا۔ ہوسکتا ہے کہ یہ لالہ نظام کے چھوٹے بھائی لالہ وریام کی گاڑی ہو۔ یعنی دونوں بھائیوں کے پاس ایک جیسی گاڑیاں ہوں۔''

''آپ کہنا چاہتے ہیں کہ لالہ نظام کی فیملی میں سے کوئی اور شخص بھی وہاں ناچ گانے کی محفل میں موجود تھا؟''

''بالکل ایسا ہوسکتا ہے۔ اگر وہ رقاصہ لڑکی جاناں یہاں موجود ہے اور لالہ نظام کی گاڑی جیسی گاڑی یہاں موجود ہے تو پھر ان لوگوں کی یہاں موجودگی بھی ناممکن نہیں۔''

''اس کا مطلب ہے، آپ کی بات درست ہے۔ لاہور والے دوستوں سے پھر ملاقات ہونے والی ہے۔'' انیق نے کہا۔

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میرا ذہن جیسے گھڑ دوڑ کا میدان بنا ہوا تھا، بہت سے خیالات ذہن پر یلغار کر رہے تھے۔

میں نے روانگی کے وقت کھیتوں میں عالمگیر اور اس کے ساتھیوں کی جو گفتگو سنی تھی، اس کے مطابق انہیں صبح منہ اندھیرے واپس چاندگڑھی پہنچ جانا تھا مگر ان کی واپسی دن گیارہ بجے کے لگ بھگ ہوئی۔ انیق نے مجھے جگا کر بتایا کہ عالمگیر کی کھٹارا جیپ گاؤں میں داخل ہورہی ہے۔ میں نے دیکھا جیپ دھول اڑاتی آرہی تھی۔ یقینا یہ لوگ اب تک مجھے تلاش کرنے کے چکر میں ہی رہے تھے۔ عین ممکن تھا کہ وہ اردگرد کے ٹیلوں اور جنگل میں بھٹکتے رہے ہوں۔ میں نے دور ہی سے عالمگیر کا لمبوترا چہرہ دیکھا۔ وہ پریشانی کے سبب کچھ اور لمبا نظر آرہا تھا۔ اسحاق بھی گم صم بیٹھا تھا۔ وہ لوگ میرے سامنے سے گزرے۔ مجھے یہ سوچ کر مزہ آیا کہ میں ان کے روبرو ہوتے ہوئے بھی ان کی نظروں سے اوجھل ہوں۔

☆☆☆

انیق نے لاہور میں اپنا کام بڑی تیزی سے کیا۔ نہ صرف اس نے منی کیمرے سے تصویروں کے شاندار پرنٹ نکلوا لیے بلکہ مولوی جی کی بیٹی زینب کے بارے میں بھی معلومات حاصل کرلیں۔ میرا یہ اندازہ درست تھا کہ زینب کی سوتیلی والدہ کے پاس وہ ایڈریس موجود تھا جو میں نے مولوی جی کو دیا تھا اور وہ 20 ہزار روپیا بھی جو میں نے اصرار کر کے مولوی جی کو زینب کے علاج کے لیے مہیا کیا تھا۔ زینب کی یہ سوتیلی والدہ... حقیقی والدہ ہی کی طرح اس کی ہمدرد اور غم گسار تھی۔ انیق نے پسِ پردہ رہتے ہوئے مطلوبہ کلینک اور ڈاکٹر تک پہنچنے میں ان لوگوں کی مدد کی۔ زینب کا فوری علاج شروع ہوگیا۔ یہ علاج اسلام آباد کے ایک اچھے پرائیویٹ کلینک میں ہورہا تھا۔ علاج شروع ہو جانے کے بعد انیق فوراً چاندگڑھی واپس پہنچ گیا۔ انیق نے یہ بھی بتایا کہ شکیل داراب ابھی تک اپنے وعدے کی پاسداری کررہا ہے۔ اس نے اپنا اثر رسوخ استعمال کیا ہے اور میرے چچا زاد ولید کو جیل بھجوانے کے بجائے ابھی تک اسپتال میں ہی رکھا گیا ہے۔ چچا حفیظ مراد پور میں جلی ہوئی حویلی کو ای طرح دوبارہ بنانے کی کوشش کررہے تھے۔ انہیں یہی معلوم تھا کہ میں پاکستان سے واپس جا چکا ہوں۔ انیق کا اہم کام یہی تھا کہ اس نے مطلوبہ تصویروں کے بہترین پرنٹ نکلوائے تھے۔

میں نے تصویریں دیکھیں۔ زبردست تھیں۔ پانچ چھ تصویریں تو اتنی واضح تھیں کہ شک شبہے کی کوئی گنجائش ہی باقی نہیں رہ جاتی تھی۔ عالمگیر اور سجاول سیالکوٹی نے ایک دوسرے کے گلے میں بانہیں ڈالی ہوئی تھیں اور ان کے ہاتھوں میں وہسکی کے گلاس چمک رہے تھے۔ ایک تصویر میں وہ ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ مار رہے تھے اور کھل کر ہنس رہے تھے۔ کئی تصویروں میں نیم عریاں جسم والی جاناں بھی صاف پہچانی جاتی تھی۔ اسحاق اس کے ساتھ ناچ رہا تھا، اور بیک گراؤنڈ میں سیالکوٹی اور عالمگیر دکھائی دیتے تھے۔

ہم تصویریں دیکھ رہے تھے جب دور سے پہلوان حشمت آتا دکھائی دیا۔ وہ بھی آج ہی اسلام آباد سے واپس آیا تھا۔ انیق کے ساتھ حشمت کی گاڑھی چھننے لگی تھی اور وہ سب بے تکلفی سے باتیں کرتے تھے۔ ہم نے تصویریں فوراً

چھپا دیں۔ حشمت جھومتا ہوا سا اندر آ گیا۔ وہ چلنے میں ذرا دشواری محسوس کر رہا تھا۔ غالباً اس کی وجہ وہی گہری خراشیں تھیں جو کانٹے دار جھاڑیوں میں گرنے سے اس کی پشت پر آئی تھیں، اور جن کی ”لوکیشن“ بتا کر وہ خود ہی ہنسنے لگتا تھا۔ رسمی کلمات کی ادائیگی کے بعد وہ چارپائی پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا اور ہمیں سفر کی روداد سنانے لگا۔ اس نے اپنے تئیں ہم پر انکشاف کیا کہ بچی زینب کی بیماری بالکل اور طرح کی چیز نکلی ہے، یہ آسیب یا جادو ٹونے والا چکر نہیں ہے، بلکہ اس کو کسی نے خاص طرح کی نشہ آور دوا کھلائی ہے اور کئی ماہ تک کھلائی ہے۔ اب جب وہ اس دوا سے محروم ہوتی ہے تو اس کی حالت غیر ہو جاتی ہے۔ اسلام آباد کے ڈاکٹروں نے پورا پورا کھوج لگا لیا ہے۔

انیق نے کہا۔ ”حشمت بھائی! اگر ایسا ہوا ہے تو کس نے کیا ہے؟“

”یہی سوچنے کی بات ہے۔ عالمگیر کے گھر کے علاوہ اس بے چاری کا کہیں آنا جانا ناہیں تھا۔ لگت تو یہی ہے کہ یہ بدعادت اس کو عالمگیر کے گھر سے ہی لاگی ہے۔ کیا پتا اس میں عالمگیر کا ہی ہاتھ ہو مگر عالمگیر پر اس طرح کا الزام لگانا کسی کے بس کا روگ ناہیں۔ چودھری نیاز تو ابھی بچہ بچونگڑا ہے۔ چاندگڑھی کا اصل چودھری اور کرتا دھرتا تو یہی عالمگیر ہے۔“ پہلوان حشمت کے لہجے میں زہر تھا۔

انیق نے کہا۔ ”اس کا مطلب تو یہی نکلا کہ عالمگیر اور اسحاق وغیرہ اس بچی کے ذریعے اللہ بخشے مولوی جی کو بلیک میل کر رہے تھے اور تاجور کے سلسلے میں اپنی زبان بولنے پر مجبور کر رہے تھے۔“

”دھیان تو یقیناً اسی طرف جاوت ہے بھیا مگر یہ بات اپنی زبان پر کون لاوے؟ جو لاوے گا اس کا حشر نشر ہو جاوے گا۔ ویسے بھی اب مولوی صاحب تو اس دنیا میں ہیں ناہیں، اب ان کے بارے میں کچھ بھی کہا جا سکت ہے۔ اس کے علاوہ یہاں چاندگڑھی میں ہی بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں جو آنکھیں بند کر کے عالمگیر اور پیر ولایت جیسے لوگوں پر یقین کرتے ہیں۔“

مولوی جی کے ذکر پر حشمت ایک دم اداس ہو گیا اور یہ صرف اکیلے حشمت ہی کی بات نہیں تھی، گاؤں کی اکثریت نے مولوی جی کی ناگہانی موت کا گہرا دکھ محسوس کیا تھا۔

انیق نے نکتہ اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”حشمت بھائی! اگر عالمگیر وغیرہ مولوی جی کو بلیک میل کر رہے تھے تو پھر تو یہ بھی سوچا جا سکتا ہے کہ اپنا بھید کھلنے کے ڈر سے انہوں نے ہی مولوی جی کو مسجد کی سیڑھیوں سے دھکا دے کر مار دیا ہو۔“

پہلوان حشمت کے چہرے پر ایک رنگ سا لہرا گیا۔ اس نے ذرا پریشانی سے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ شام کے ٹھنڈے سائے قرب و جوار کو ڈھانپ رہے تھے۔ کہیں سے بانسری کی آواز آ رہی تھی۔ کھیت کے کنارے دو کھیت مزدور سروں پر سبز چارا اٹھائے گھروں کی طرف جا رہے تھے۔ پہلوان حشمت نے دبی آواز میں کہا۔ ”دھیان رکھو بھائی! ایسی بات اونچی آواز میں نہ کہو۔ دیواروں کے بھی کان ہووت ہیں اور چاندگڑھی میں تو یہ کان کچھ زیادہ ہی تیز ہیں۔ وہ کیا فرمایا ہے علامہ اقبال نے بات بندے سے کہتی ہے کہ تم مجھے منہ سے نکالو، میں تمہیں گاؤں سے نکالوں گی۔“

انیق نے حیرت سے دیدے گھمائے۔ ”حشمت بھائی! یہ علامہ اقبال نے کہا تھا؟“

”تو کیا تیرے کسی رشتے دار نے کہا تھا۔ ایسی بڑی باتیں بہت بڑے لوگ ہی کہہ سکتے ہیں۔“

اسی دوران میں میری نظر کھڑکی سے باہر ایک سجے سجائے خوب صورت تانگے پر پڑی۔ تانگے میں عالمگیر بڑے ٹھاٹ سے بیٹھا تھا۔ اس کی بغل میں گورا چٹا نوعمر چودھری تھا۔ چودہ پندرہ سالہ چودھری کی پگڑی کا شملہ کوئی دو فٹ اونچا تو ضرور رہا ہو گا۔ پچھلی سیٹ پر بھی تین افراد موجود تھے۔ میں نے انیق اور حشمت کی توجہ اس منظر پر مبذول کرائی۔ انیق نے حشمت سے پوچھا۔ ”یہ سواری کدھر جا رہی ہے؟“

حشمت نے گہری سانس لی اور بڑے تدبر سے بولا۔ ”سمجھو کہ شیر کے دانت کھانے کے اور دکھانے کے اور ہووت ہیں۔“

”ہاتھی کے دانت۔“ انیق نے تصحیح کی۔

حشمت سنی اَن سنی کرتے ہوئے بولا۔ ”اوپر اوپر سے تو عالمگیر اپنے بھائی کی موت پر غم زدہ ہے مگر حقیقت میں اس کو کوئی ایسی سوگواری بھی ناہیں ہے۔ کل چودھری نیاز کی پیدائش کا دن ہے۔ پچھلے سالوں میں یہ دن گاؤں کے اندر ہی بڑی دھوم دھام سے منایا گیا تھا۔ ساری ساری رات کنجر خانہ لگا رہا تھا مگر اب چونکہ مولوی جی اور پرویز والا واقعہ ہو گیا ہے، اس لیے یہ لوگ باہر جا رہے ہیں۔“

”کہاں... کس لیے؟“

”میرا خیال ہے کہ ڈسکہ جاویں گے۔ وہاں عالمگیر کا

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN

ایک امیر کبیر یار ہے۔ اس کی کوٹھی پر جشن وغیرہ کر لیں گے۔ یعنی موج میلے سے باز نہیں آنا، چاہے مرنے والے کا کفن بھی میلا نہ ہوا ہو۔“

”ناچ گانا ہوگا؟“ انیق نے پوچھا۔

”سب کچھ ہووے گا۔“ حشمت نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ کچھ دیر خاموش رہ کر وہ بولا۔ ”سچی بات تو یہ ہے بھیا کہ عالمگیر نے چودھری نیاز کا اس چھوٹی سی عمر میں بیڑا غرق کر دیا ہے۔ شراب تو رہی ایک طرف، عورت تک لگا دی ہے اسے۔“

”عورت لگا دی ہے؟ کیا مطلب؟“

”یہ ناچنے والیاں... اس چھوٹی سی عمر میں اسے ان کے ڈانس دکھاوت ہے اور پھر اسے ان کی عادت بھی ڈالت ہے۔ اس کا ارادہ یہی ہے کہ یہ لڑکا کسی کام کا نہ رہے اور اصلی چودھراہٹ کے مزے یہ خود ہی لیتا رہے۔“

یہ بڑی حیران کن اور سنگین صورتِ حال تھی۔ کچھ دیر اس موضوع پر بات ہوتی رہی۔ عالمگیر کے کئی کرتوت سامنے آئے۔

انیق نے حشمت سے پوچھا۔ ”کیا عالمگیر اور اس کے مقتول بھائی میں جھگڑا وغیرہ بھی تھا؟“

”ایسے جھگڑے اکثر گھروں میں رہتے ہی ہیں۔ مقتول کی بیوی اور عالمگیر کی بیوی میں زیادہ چپقلش تھی۔ کوئی مکان کا معاملہ بھی تھا۔“

حشمت کی باتوں سے پتا چلا کہ مقتول پرویز کے سسرال والے تگڑے لوگ ہیں اور چاند گڑھی میں ہی رہتے ہیں۔ اس کے دو سالوں نے کچھ عرصہ پہلے جیل بھی کاٹی ہے۔ خاص طور سے اس کا بڑا سالا صولت ٹوانہ جو نائب تحصیل دار بھی ہے، بڑا دبنگ بندہ ہے۔ یہ گفتگو سننے کے بعد میں نے فوراً فیصلہ کر لیا کہ اس وقت جو تصویریں میرے تکیے کے نیچے رکھی ہیں وہ آج رات تک مقتول پرویز کی بیوی یا پھر اس کے بھائی صولت ٹوانہ تک پہنچ جائیں گی۔

عالمگیر ایک خبیث دشمن کے طور پر سامنے آیا تھا اور اپنے دشمن کو کسی بھی طرح کمزور کرنا لڑائی کا حصہ ہوتا ہے۔

☆☆☆

انیق شام کو ہی سروے کر آیا۔ اس کی صلاحیتیں اب کھل کر سامنے آ رہی تھیں۔ میں جو کام اسے سونپتا تھا نہایت خوش اسلوبی اور چالاکی سے انجام دیتا تھا۔ داؤد بھاؤ نے یقیناً اپنا ایک ہیرا ہی میرے حوالے کیا تھا۔ انیق نے نہ صرف نائب تحصیل دار صولت کا گھر دیکھ لیا تھا بلکہ یہ بھی جان لیا تھا کہ وہ گاؤں میں ہی ہے۔ اس کے علاوہ ایک خاص کام اس نے یہ کیا تھا کہ صولت کا موبائل فون نمبر بھی حاصل کر لیا تھا۔ یہ نمبر اسے پٹواری کے ملازم سے مل گیا تھا۔ کام اب اور آسان ہو گیا تھا۔ رات ساڑھے دس بجے میں نے انیق سے کہا کہ وہ تصویروں والا لفافہ صولت ٹوانہ کے گھر کی چھت پر پھینک آئے۔

انیق یہ کام کر کے سردی میں ٹھٹھرا ہوا واپس آ گیا۔

گیارہ بجے کے لگ بھگ میں نے انیق کے نمبر سے صولت کو کال کی۔ دوسری طرف سے ایک بھاری بھرکم آواز سنائی دی۔ شاید اس شخص نے پیگ وغیرہ لگایا ہوا تھا۔ ”کون؟“ اس نے پوچھا۔

”تمہارا ایک ہمدرد۔“ میں نے بڑے اطمینان سے کہا۔

”سیدھی سیدھی بات کرو۔ کون ہو تم؟“ نہایت خشک لہجے میں کہا گیا۔

”سیدھی بات تو یہ ہے کہ ایک بہت سیدھی بات تم لوگوں کی سمجھ میں نہیں آئی ہے۔ اس کا تعلق تمہارے بہنوئی پرویز اور اس کی موت سے ہے۔“

”تمہاری بات میرے پلّے نہیں پڑ رہی اور تم ہو کون؟“ ذرا چونکے لہجے میں پوچھا گیا۔

میں نے کہا۔ ”میرے بارے میں جاننے سے تمہیں کوئی خاص فائدہ نہیں ہوگا۔ مگر جو بات میں تمہیں بتانے جا رہا ہوں وہ تمہارے بہت فائدے کی ہے۔ تمہارا بہنوئی، ڈکیت سیالکوٹی کے بندوں نے نہیں مارا۔ اسے ان بندوں کے ذریعے مروایا گیا ہے اور مروانے والا کوئی اور نہیں... تمہارے مقتول بہنوئی کا بڑا بھائی عالمگیر ہے۔“

دوسری طرف چند سیکنڈ خاموشی رہی، پھر لرزاں آواز میں پوچھا گیا۔ ”تم اپنے ہوش میں تو ہو۔ یہ کیا بات کر رہے ہو اور... اور اس کا کیا ثبوت ہے تمہارے پاس؟“

”تمہارے آخری فقرے سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاید تمہارے دل کے کسی دور دراز گوشے میں بھی اسی طرح کا شک موجود ہے اور میں تمہیں پورے یقین کے ساتھ بتا رہا ہوں کہ یہ شک سو فیصد درست ہے۔ عالمگیر نے سیالکوٹی سے ملی بھگت کر کے تمہارے بہنوئی کو مارا ہے اور تمہاری جوان بہن کو بیوہ کیا ہے۔“

ایک بار پھر اسی لرزاں آواز میں پوچھا گیا۔ ”کون ہو تم؟“

"خدائی فوجدار۔ چاند گڑھی کے کچھ لوگ مجھے اچھی طرح جانتے ہیں۔ ان میں مولوی جی کا شاگرد طارق... رام پیاری اور وکرم وغیرہ شامل ہیں۔"

"تت... تم وہی پگڑی والے (ڈھاٹے والے) ہو؟"

"چلو جو بھی نام دے لو۔ لیکن میں وہی ہوں اور جو بات کہہ رہا ہوں پورے ثبوت سے کہہ رہا ہوں۔"

"کیا ہے ثبوت؟"

"تصویریں اور اگر چاہو تو موقع آنے پر باقاعدہ ویڈیو بھی دی جاسکتی ہے۔"

"تم کن تصویروں کی بات کررہے ہو؟"

"وہ تمہارے گھر کی چھت پر گلی والی منڈیر کے پاس سفید لفافے میں پڑی ہیں۔ ابھی جاکر دیکھ لو۔ مزید تصدیق چاہتے ہو تو عالمگیر کے ساتھی ساتے سے بات کرلو۔ ذرا مرد بن کر پوچھو گے تو وہ چچہ بھی سب کچھ بتادے گا۔" میں نے فون بند کردیا۔

☆☆☆

صبح بڑی سہانی تھی۔ میں کمرے سے باہر ایک کچی منڈیر پر بیٹھا تھا۔ دور تک سبز کھیتوں کے سلسلے تھے۔ ہریالی پر ہلکا ہلکا کہرا تھا اور گھاس پر اوس کے قطرے تھے۔ کوپن ہیگن اور لندن وغیرہ میں ایسی تازہ ہوا کا میں نے کبھی تصور بھی نہ کیا تھا۔ چند ننھی بچیاں اسکول جانے کے لیے میرے پاس سے گزریں تو میری طرف دیکھ کر مسکرائیں اور اشارے سے سلام کیا۔ کیا شگفتہ کلیوں جیسے چہرے، کیا معصومیت تھی۔ وہ گلے میں بستے لٹکائے ہاتھوں میں لکڑی کی تختیاں لہراتی، میری نگاہوں سے اوجھل ہوگئیں تو چڑیوں کا ایک جھنڈ بھی فرّاٹے مار کر زمین سے اڑا اور فضا میں گم ہو گیا۔ یہ لڑکیاں بھی تو چڑیوں کا جھنڈ ہی ہوتی ہیں، اکٹھی دانہ دنکا چگتی ہیں، پھر اڑ جاتی ہیں اور بکھر جاتی ہیں۔

اڑنے اور بکھرنے سے میرا دھیان تاجور کی طرف چلا گیا۔ کیا وہ بھی اڑ کر کسی گھونسلے کی زینت بننے والی ہے اور ہمیشہ کے لیے میری نظروں سے اوجھل ہونے والی ہے۔ اس سے میری آخری ملاقات کافی مایوس کن رہی تھی۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ میں جلد از جلد یہاں سے چلا جاؤں اور دوبارہ ادھر کا رخ نہ کروں۔ وہ اس بات پر بھی سیخ پا ہوئی تھی کہ میں نے اس سے اظہارِ محبت کردیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ میں بارود کے بہت بڑے ڈھیر کو چنگاری دکھانے کی بات کررہا ہوں۔ اگر یہ چنگاری چمک گئی تو یہاں میری اور انیق کی لاشوں کا بھی پتا نہیں چلے گا۔ چاند گڑھی کی زمین ہمیں یوں نگل جائے گی جیسے کبھی ہمارا وجود ہی نہ تھا۔

## جمع

ایک نہایت بیزار، ادھیڑ عمر اور غیر شادی شدہ خاتون سے لفظ مرد کی جمع پوچھی گئی تو بے ساختہ جواب آیا۔ "مردود!"

## چٹکلے

☆ پھولوں کی چادر پر سو رہے ہوں تو یہ آپ کی ازدواجی زندگی کی پہلی رات ہے اور پھولوں کی چادر اوپر پڑی ہو تو زندگی کی آخری رات گزر چکی ہے۔

☆ موم بتی جلا کر مرے ہوئے لوگوں کی یاد منائی جاتی ہے اور موم بتی بجھا کر سالگرہ منانے کا آغاز کیا جاتا ہے۔

☆ دنیا کی ہر عورت شب و روز دوسری عورتوں کی برائیاں کرتی ہے اور مرد اتنے فراخ دل ہوتے ہیں کہ اپنی بیوی کے سوا دوسری تمام عورتوں کی تعریف کرتے نہیں تھکتے... مرد زندہ باد!

☆ ایک عورت ایک گھنٹے میں دو ڈریس تیار کرتی ہے تو چار عورتیں چوبیس گھنٹوں میں کتنے ڈریس تیار کریں گی؟ سوال سیدھا لیکن جواب مشکل ہے۔ وہ کچھ نہیں کرسکیں گی۔ غیبت اور باتوں سے فرصت ہی نہیں ملے گی۔

**محمد اقبال، کراچی**

ڈرانے والے ہمیشہ ڈراتے رہے ہیں اور عشق کی راہ میں آگے بڑھنے والے ہمیشہ آگے بڑھتے رہتے ہیں اور یہاں تو ڈر کا کوئی وجود ہی نہیں تھا۔ اگر مجھے کوئی شدید خطرہ محسوس ہوتا تو میں انیق کو فوراً یہاں سے نکال دیتا اور خود چاند گڑھی کی زمین میں دفن ہونے کو تیار ہوجاتا۔ اس کی چوڑیوں کی ایک چھنک اور اس کی پیشانی کی ایک جھلک کے لیے میں اپنے جسم میں سیکڑوں کانٹے پرونے کو تیار تھا۔

ایک آواز نے مجھے خیالوں سے چونکایا۔ کوئی دیہاتی زور سے بولا۔ "جلدی کرو... خون نکل رہا ہے۔ ہڈی بھی باہر آرہی ہے۔"

ایک دوسرا بولا۔ "پیلی (کھیت) کے اندر سے ہی نکل چلو۔"

میں نے مڑ کر دیکھا۔ سات آٹھ افراد تیز قدموں سے چلے آرہے تھے۔ انہوں نے لکڑی کی ایک کرسی اٹھا رکھی تھی۔ کرسی پر کوئی لہولہان حالت میں پڑا تھا۔ میں نے غور سے دیکھا، یہ تاجور کا دعویدار اسحاق تھا۔ لگتا تھا کہ کچھ لوگوں نے اس کی خوب ٹھکائی کی ہے۔ اس کے چہرے پر نیلگوں ابھار تھے۔ سر پھٹا ہوا تھا اور ایک بازو شاید ٹوٹ گیا تھا۔ اندازہ ہوا کہ یہ لوگ اسے پہلوان حشمت کی طرف لے کر جارہے ہیں۔

اتنے میں انیق بھی کمرے سے نکل کر میرے پاس آن کھڑا ہوا۔ ''سبحان اللہ!'' اس نے مطمئن انداز میں کہا۔ ''لگتا ہے کہ آپ کی اتاری ہوئی تصویروں نے کام دکھانا شروع کردیا ہے۔''

''اس کا مطلب ہے کہ... اب بات اور آگے بڑھے گی۔'' میں نے کہا۔

''انشاء اللہ! مجھے تو جیمز بانڈ کی ایک پرانی فلم یاد آنا شروع ہوگئی ہے۔ اس میں شان کونری نے ایسے ہی اپنے دو مخالف گروہوں کو آپس میں لڑا دیا تھا اور خود اپنا مطلب حاصل کرلیا تھا۔''

''یعنی تم مجھے مطلب پرست قرار دے رہے ہو؟''

''توبہ توبہ... میری یہ جرأت؟'' اس نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔ ''ہم جنگ لڑ رہے ہیں اور جنگ میں سب کچھ جائز ہوتا ہے۔ دشمن کی کمزوری اپنی طاقت بنتی ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ اسحاق کی یہ حالت مقتول پرویز کے سسرالیوں نے بنائی ہے اور اس سے اصل بات اگلوالی ہے۔''

اسی دوران میں حق نواز بھی وہاں پہنچ گیا۔ اس کے آنے سے پہلے ہی ہم دونوں خاموش ہوگئے تھے۔ حق نواز کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ اس کو ابھی اسحاق کے زخمی ہونے کی خبر نہیں ملی۔ وہ ٹوانوں کی حویلی اور احاطے میں نظر آنے والی ہلچل کی بات کررہا تھا۔ کہنے لگا۔

''مجھے کوئی گڑبڑ والی گل لگ رہی ہے انیق! شاید تحصیل دار کی حویلی میں کوئی جھگڑا ہوا ہے۔ وہاں تین چار تانگے آئے ہیں۔ ان میں سے بری بری شکلوں والے بندے اترے ہیں۔ ان میں بہت سوں کے پاس ہتھیار بھی ہیں۔ ہلچل کا پتا چل رہا ہے۔''

انیق نے پوچھا۔ ''کیا تحصیل دار کی کسی سے دشمنی وغیرہ بھی ہے؟''

''چھوٹی موٹی دشمنیاں تو ہوتی ہی ہیں۔ بڑی دشمنی تو اسی بندے سے ہوسکتی ہے جس نے تحصیل دار کی بہن کو بیوہ کیا ہے۔ میرا مطلب ہے پرویز کو قتل کرنے والا سجاول سیالکوٹی۔ ہوسکتا ہے کہ ان لوگوں کو سجاول سیالکوٹی کا کوئی کھوج کھرا لگ گیا ہو اور اب وہ اس پر ہلا بولنے جارہے ہوں۔''

وہ بے چارہ نہیں جانتا تھا کہ سیالکوٹی کا کھوج ملنا اتنا آسان نہیں، ہاں سیالکوٹی کے کچھ ساتھیوں کا پتا ٹوانوں کو چل گیا ہے اور وہ ساتھی اس گاؤں کے کرتا دھرتا عالمگیر وغیرہ ہی ہیں۔

انیق نے حق نواز سے کہا۔ ''حشمت پہلوان کی طرف جاؤ۔ وہاں کچھ لوگ زخمی ساقے کو لے کر گئے ہیں۔ پتا کرو کیا ہوا ہے اس کے ساتھ۔''

حق نواز کی واپسی پندرہ بیس منٹ کے بعد ہوئی۔ اس نے حیرت زدہ لہجے میں بتایا۔ ''بڑی بری خبریں ہیں۔ تحصیل دار صاحب اور ان کے دو ساتھی فجر کے وقت ساقے کو اس کے گھر سے اٹھا کر لے گئے تھے۔ اپنے ڈیرے پر جا کر انہوں نے اس کی بڑی چنگی مرمت کی ہے۔ پتا نہیں کہ کس طرح کا شک تھا ان کو اس پر۔ عالمگیر کے دو ملازم ساقے کو چھڑانے کے لیے ڈیرے پر گئے تو ان کو بھی چپیڑیں ماری گئیں۔''

اچانک گاؤں کے وسطی حصے کی طرف سے فائرنگ کی زوردار آواز آئی۔ یہ آٹومیٹک رائفل کا ایک کڑاکے دار برسٹ تھا۔ پرندے درختوں سے اڑ گئے۔ میرے عین سامنے سے دو بکریاں بدک کر کھیتوں میں گھس گئیں۔ رائفل کے پہلے برسٹ کے بعد چند سنگل فائر ہوئے اور پھر ایک دم جیسے کسی سیلاب کا بند ٹوٹ گیا۔ اندھا دھند فائرنگ ہونے لگی۔ چھوٹے بڑے ہتھیار آزادانہ استعمال ہورہے تھے۔

''یا اللہ خیر!'' ملازم حق نواز نے ڈرے ڈرے لہجے میں کہا۔

اس دوران میں حق نواز کی بیوی نذیراں بھی چلاتی ہوئی باہر نکل آئی۔ ''ہائے میں مرگئی، ہائے ربا، کیا وہ مرن جوگے پھر آگئے ہیں؟'' اس کا دھیان یقیناً ڈاکوؤں کے حملے کی طرف چلا گیا تھا۔

چار پانچ مسلح گھڑسوار انتہائی تیزی سے گھوڑے بھگاتے عالمگیر کے ڈیرے کی طرف سے آئے اور گاؤں میں داخل ہوگئے۔ ان کے عقب میں ایک تیز رفتار ٹریکٹر ٹرالی اچھلتی کودتی آرہی تھی۔ اس میں بھی دس پندرہ افراد سوار تھے۔ کچھ کے ہاتھ میں رائفلیں اور کچھ کے ہاتھ میں کلہاڑیاں تھیں۔ یہ لوگ بھی گھڑسواروں کے پیچھے لپکتے

ہوئے گاؤں کے وسطی حصے کی طرف بڑھ گئے۔

میں نے معنی خیز نظروں سے انیق کی طرف دیکھا۔ وہی ہو رہا تھا جس کی توقع تھی۔ دفعتاً ایک خوفناک دھماکا ہوا اور زینب گرتے گرتے بچی۔ آواز اتنی شدید تھی کہ ایک گھوڑی رسا تڑا کر بھاگ کھڑی ہوئی۔ یہ دھماکا ڈیرے سے صرف سو ڈیڑھ سو قدم کے فاصلے پر سنائی دیا تھا۔ یہ دستی بم کا دھماکا تھا۔ میں نے بہت سی دھول اور گرد و غبار فضا میں بلند ہوتے دیکھا۔ اس گرد و غبار میں کسی ٹوٹے ہوئے دروازے یا کھڑکی وغیرہ کے ٹکڑے بھی تھے۔ دھماکے کے فوراً بعد تابڑ توڑ فائرنگ ہونے لگی۔ میں نے رسا تڑانے والی گھوڑی کو گرتے اور تڑپتے ہوئے دیکھا۔ مطلب تھا کہ لڑائی کا دائرہ پھیل رہا ہے۔ ہم لپک کر کمرے کے اندر چلے گئے۔

پورے گاؤں میں تہلکہ سا مچا ہوا تھا۔ قریبی میدان میں کچھ بچے ربر کی گیند سے کرکٹ کھیل رہے تھے۔ وہ بھی ڈر کر بھاگے۔ یقیناً ان میں سے بہت سوں نے یہی سمجھا تھا کہ شاید پھر سیالکوٹی کے گھڑ سواروں نے ہلا بول دیا ہے۔ بچوں کا ڈر کر چاروں طرف بھاگنا اور چلانا ایک دلدوز منظر تھا۔ ایک بچے کی ٹانگ میں گولی لگی مگر ایک بڑی عمر کا لڑکا اسے سہارا دے کر گھسیٹتا ہوا ایک گھر میں گھس گیا۔

فائرنگ مسلسل جاری تھی۔ حق نواز نے دہشت زدہ آواز میں کہا۔ ”سمجھ نہیں آرہی کہ اس گاؤں میں کیا ہو رہا ہے۔“

انیق نے پُرخیال لہجے میں کہا۔ ”لگتا ہے دونوں طرف کے لوگ مورچا بند ہو کر فائرنگ کر رہے ہیں۔ پولیس کہیں نظر نہیں آرہی۔“

”ایسے موقعوں پر یہاں کی پولیس نظر آتی بھی نہیں۔ یہ پولیس تو ہم جیسے غریبوں کو چھتر مارنے کے لیے رہ گئی ہے۔“

فائرنگ کا دائرہ بڑھتا جا رہا تھا۔ لوگ گھروں میں دبک کر رہ گئے تھے۔ جو کھیتوں کھلیانوں میں تھے، انہوں نے وہیں پر دبکے رہنے میں عافیت سمجھی تھی۔ اسی دوران میں دستی بموں کے دو اور زوردار دھماکے ہوئے۔ ان دھماکوں کے فوراً بعد کہیں آگ لگ گئی، گاڑھا سیاہ دھواں فضا میں بلند ہونے لگا۔ ہم نے دیکھا گاؤں کی طرف سے دو زخمی افراد دوڑتے ہوئے کھیتوں کی طرف آئے لیکن ابھی وہ ہمارے ڈیرے سے کافی دور تھے کہ ان کے عقب میں تین مسلح افراد نمودار ہوئے۔ انہوں نے ٹرپل ٹو اور سیون ایم ایم رائفلوں سے بے دریغ برسٹ چلائے۔ ایک زخمی تو جان بچا کر کھیتوں میں گھس گیا دوسرا وہیں مردہ گھوڑی کے پاس گر کر ڈھیر ہو گیا۔ مرنے والا عالمگیر کے ساتھیوں میں سے تھا۔

اب اس بات میں شک شبہے کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی کہ مقتول پرویز کے سسرالی اور عالمگیر کا گروہ پوری شدت کے ساتھ ایک دوسرے سے ٹکرا گئے ہیں۔

اچانک مجھے کہیں پاس سے کسی بچے کے رونے چلانے کی آوازیں آئیں۔ انیق اور حق نواز نے بھی یہ آوازیں سن لیں۔

”لگتا ہے آواز سامنے والے کنوئیں سے آرہی ہے۔“ حق نواز نے کہا۔

”کون ہو سکتا ہے؟“ انیق نے پریشانی ظاہر کی۔

”شاید بھاگتے ہوئے کوئی بچہ کنوئیں میں گر گیا ہے۔“

بچہ مسلسل دلدوز انداز میں چلا رہا تھا۔ ”ہمیں اس کی مدد کرنی چاہیے۔“ انیق نے کہا۔

”لیکن کیسے؟“ سامنے فائرنگ ہو رہی ہے۔“ حق نواز بولا۔

کچھ دیر بعد بچہ خاموش ہو گیا۔ یوں لگا جیسے وہ بے ہوش ہو گیا ہے لیکن ایسا نہیں تھا، کچھ دیر بعد وہ پھر چلانے لگا۔ اچانک میرے پورے جسم میں ایک تیز سنسناہٹ دوڑ گئی۔ مجھے لگا یہ آواز میرے لیے نئی نہیں ہے۔ یہ تاجور کے چھوٹے بھائی کی آواز ہے۔ اگلے دو چار منٹ میں میرا یہ شک یقین میں بدل گیا۔ کنوئیں میں گرنے والے بچے کی مدد کرنے کے لیے میں پہلے ہی پر تول رہا تھا مگر اب مجھے فیصلے تک پہنچنے میں بالکل بھی دیر نہیں لگی۔ انیق بھی میرے تاثرات سے جان گیا کہ میں کچھ کہنا یا کرنا چاہتا ہوں۔ اس نے حق نواز سے کہا۔ ”نواز بھائی! اپنی دونوں بکریوں کو اندر باندھ دو۔ کہیں گھوڑی کی طرح ان کے ساتھ بھی کوئی مسئلہ نہ ہو جائے۔“

حق نواز باہر نکلا تو میں نے سرگوشی میں کہا۔ ”انیق مجھے شک ہو رہا ہے کہ کنوئیں میں گرنے والا بچہ تاجور کا بھائی چھوٹو ہے۔“

”مگر کرکٹ کھیلنے والے بچوں میں مجھے وہ تو نظر نہیں آیا۔ ان دونوں بھائیوں کو تو گاؤں کے بچے اپنے ساتھ کھیلنے ہی نہیں دیتے۔“

”لیکن... جو بھی ہے وہ بچہ تو ہے۔ ہمیں مدد کرنی چاہیے۔“

"اس میں تو کوئی دو رائے ہو ہی نہیں سکتیں۔" انیق نے کہا۔

انیق نے حق نواز سے کہہ کر ایک لمبا رسا منگوا لیا۔

میں کمرے سے نکلا اور پیٹ کے بل رینگتا ہوا کنوئیں کے کنارے پہنچ گیا۔ بھینسوں کے لیے استعمال ہونے والے رسے کو گرہیں دے کر لمبا کیا گیا تھا۔ بہرحال اس طویل رسے کی زیادہ ضرورت نہیں پڑی۔ کنوئیں سے پانی نکالنے کے لیے لوہے کے چوکور ڈبوں کا ایک بیضوی دائرہ سا کنوئیں کے اندر جاتا تھا۔ پنجابی میں ان ڈبوں کو ٹنڈیں کہا جاتا ہے۔ کنواں چونکہ بند تھا اس لیے ٹنڈوں کا یہ سلسلہ بھی بے حرکت تھا۔ میں نے گہرائی میں جھانکا۔ قریباً پندرہ فٹ نیچے پانی چمک رہا تھا اور اس پانی میں لہولہان بچہ سینے تک ڈوبا ہوا مدد کے لیے پکار رہا تھا۔ یہ چھوٹو ہی تھا۔ اسفند عرف چھوٹو۔

مجھے دیکھ کر اس نے اپنے ننھے ننھے ہاتھ اوپر اٹھا دیے اور پورے زور سے پکارا۔ "گونگے بھائی... گونگے بھائی۔"

میں نے اوندھے لیٹے لیٹے ہاتھوں کے اشارے سے اسے تسلی دی اور آہنی ڈبوں کی لڑی کا سہارا لیتے ہوئے نیچے اترا، میرا حوصلہ اور اطمینان دیکھ کر اسفند کی دہشت میں بھی تھوڑی سی کمی واقع ہوئی۔ میں جونہی نیچے پہنچا وہ مجھ سے کسی چھپکلی کی طرح چمٹ گیا۔ زیادہ چوٹ اس کے ایک پاؤں اور سر پر آئی تھی۔ پانی یخ بستہ تھا۔ وہ خوف اور سردی کی وجہ سے تھر تھر کانپ رہا تھا۔ اس کی شلوار قمیص جسم سے چپک کر رہ گئی تھی۔ میں نے اسے پشت پر سوار کیا اور اشاروں میں سمجھایا کہ وہ اپنی ٹانگیں مضبوطی سے میری کمر کے گرد لپیٹ لے اور بازو گلے میں ڈال لے۔ مزید احتیاط کے طور پر میں نے رسے کا ایک ٹکڑا بھی اپنے اور اس کے گرد کس دیا۔ میں آہنی ڈبوں کے سہارے اوپر چڑھنے لگا تو مجھے پانی میں اسفند کا کرکٹ بیٹ تیرتا نظر آیا۔ میں نے وہ بھی اٹھا کر رسے کی بندش میں اڑس لیا۔

فائرنگ کی خوفناک آوازیں قرب و جوار کو مسلسل لرزہ رہی تھیں۔ میرے خیال میں کنوئیں سے نکلنا اتنا مشکل نہیں تھا جتنا نکل کر ڈیرے کے کمرے تک پہنچنا۔ بہرحال یہ دونوں کام خوش اسلوبی سے ہو گئے۔ کنوئیں سے نکل کر میں نے نرم و نازک اسفند کو اپنی اوٹ میں لیا اور جھک کر بھاگتا ہوا چار دیواری تک پہنچ گیا۔ انیق نے ہم دونوں کو اپنی بانہوں میں لے لیا۔

اسفند عرف چھوٹو مسلسل رو رہا تھا۔ ہم نے اسے چارپائی پر لٹایا۔ اس کا پاؤں بری طرح چھل گیا تھا اور اس میں سخت قسم کی موچ بھی آ گئی تھی۔ کنوئیں کا آہنی ڈبا لگنے کی وجہ سے اس کے سر پر بھی گہری چوٹ آئی تھی اور خون رس رہا تھا۔ انیق نے چولھے کی راکھ سے سر کے زخم کا خون بند کیا۔ میں نے پاؤں پر پٹی باندھی۔ وہ مسلسل باجی اور امی کو پکار رہا تھا۔ یقینی بات تھی کہ اس کے گھر والے بھی سخت پریشان ہوں گے۔

انیق نے حق نواز سے کہا۔ "دین محمد صاحب کو اطلاع دینا بہت ضروری ہے۔ وہ بہت پریشان ہوں گے۔"

"لیکن باہر کیسے نکلا جائے۔ ہر طرف گولیاں چل رہی ہیں۔" حق نواز نے کہا۔

"میں شہر سے ایک موبائل فون لایا ہوں اور میرا خیال ہے کہ دین محمد صاحب کے پاس بھی ایک فون ہے۔ اس پر کوشش کر کے دیکھتے ہیں۔" انیق نے کہا۔

"ہاں مالک کے فون کا نمبر تو میں نے ادھر دیوار پر لکھا ہوا ہے۔" حق نواز نے بتایا۔

انیق اور حق نواز نے کوشش کی۔ قسمت اچھی تھی، وہ رابطہ کرنے میں کامیاب رہے۔ دوسری طرف سے تاجور نے ہی بات کی۔ وہ یقیناً رو رہی تھی۔ باقی گھر والوں کا بھی بہت برا حال تھا لیکن جب انیق نے انہیں بتایا کہ اسفند بالکل خیریت سے ہے اور ڈیرے پر ہمارے ساتھ ہے تو ان کی جان میں جان آئی۔

وہ بڑی پُرخطر شام تھی۔ چاند گڑھی میں جیسے غیر اعلانیہ کرفیو لگ گیا تھا۔ گاہے بگاہے فائرنگ کی آواز بھی آنے لگتی تھی۔ خبریں آ رہی تھیں کہ دونوں طرف کے لوگ مورچا بند ہیں اور کم از کم آٹھ افراد ہلاک ہو چکے ہیں۔ ان میں سے تین چار لاشیں ابھی تک کھلی جگہ پر پڑی تھیں اور کسی کی ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ آگے بڑھ کر انہیں اٹھائے۔ ان میں سے ایک لاش عالمگیر کے اسی ساتھی کی تھی جسے تحصیل دار ٹوانہ کے ساتھیوں نے ٹرپل ٹو رائفل کا برسٹ مارا تھا۔ یہ سب کچھ دہلا دینے والا تھا۔

اسفند متواتر درد سے کراہ رہا تھا اور باجی کے پاس جانے کی ضد کر رہا تھا۔ رات تک اسے تیز بخار بھی ہو گیا۔ میں مسلسل اس کی تیمارداری میں لگا ہوا تھا۔ میں نے اسے پین کلر کھلائی اور اس کے ماتھے پر ٹھنڈی پٹیاں رکھیں۔ تاجور کا فون دو دفعہ مزید آیا۔ وہ اسفند سے بات کرنا چاہتی تھی۔ انیق نے ایک دفعہ اسفند سے اس کی تھوڑی سی بات

کرائی اور پھر میرے اشارے پر کال منقطع کر دی۔ ہم نہیں چاہتے تھے کہ اسفند تفصیل سے اپنی تکلیف کا ذکر کر کے گھر والوں کو مزید پریشان کرے۔ اس بے چارے کا پاؤں سوج کر کپا ہو گیا تھا۔ اور سر کا زخم بھی تکلیف دے رہا تھا۔ وہ نیم غنودگی میں گاہے بگاہے بڑبڑانے لگتا تھا۔ ''ڈاکو آ گئے، گولی مار دیں گے... گولی مار دیں گے...''

رات گئے پولیس کی بھاری نفری تین چار گاڑیوں پر چاند گڑھی پہنچ گئی۔ پولیس کی آمد سے ذرا پہلے شدید فائرنگ ہوئی لیکن پھر یہ سلسلہ رک گیا۔

صبح حالات کچھ بہتر نظر آئے۔ وہ لاش بھی ہٹائی جا چکی تھی جو کل ہمیں کھڑکی سے نظر آ رہی تھی۔ اسفند کو پاؤں کی چوٹ سخت تکلیف دے رہی تھی۔ انیق گیا اور پہلوان حشمت کو بلا لایا۔ پہلوان کے پاس گاؤں کے بارے میں تازہ ترین خبریں موجود تھیں۔ اس نے کہا۔ ''عالمگیر اور صولت ٹوانہ دونوں گرفتار ہو گئے ہیں۔ دونوں طرف کے پندرہ بیس اور بندے بھی گرفتار ہوئے ہیں۔ پولیس نے دونوں طرف کے لوگوں کے ہتھیار بھی جمع کر لیے ہیں۔ یہ کوئی معمولی بات نا ہیں ہے۔ دونوں پارٹیوں کے آٹھ بندے جان سے گئے ہیں۔ زخمی ہونے والے بھی بیس کے لگ بھگ ہیں۔ سچ کہوت ہیں بھیا! خدا کی ''تلوار'' بے آواز ہووت ہے۔''

''لیکن... یہ ہوا کیسے حشمت بھائی؟'' انیق نے انجان بن کر پوچھا۔

''جب لوگ طاقت کے نشے میں حد سے بڑھ جاوت ہیں تو پھر کچھ نہ کچھ تو ہووت ہی ہے۔ عالمگیر اور ٹوانہ دونوں اپنے اردگرد کے لوگوں کو کیڑوں مکوڑوں کی طرح سمجھتے ہیں۔ اب یہ آپس میں ہی بھڑ بیٹھے ہیں۔''

''مگر یہ سب ہوا کیسے حشمت بھائی، کوئی وجہ تو بنی ہو گی؟''

''یہ سب یاسر احمد کا کیا ہوا ہے۔'' حشمت نے بڑے معاملہ فہم انداز میں کہا۔

''یاسر احمد؟ یہ کون ذات شریف ہیں؟'' انیق نے پوچھا۔

''تم اس گاؤں کے نا ہیں ہو، اس لیے اسے نا ہیں جانت ہو۔ پورا گاؤں اس کو جانت ہے۔ کھاتے پیتے زمیندار گھر کا ہے۔ بڑا جی دار بندہ ہے۔ کچھ عرصہ فوج میں بھی رہا ہے۔''

''اس نے کیا کیا ہے حشمت بھائی؟''

''آج کل جو کچھ یہاں چاند گڑھی میں ہو رہا ہے، وہی کر رہا ہے۔ پہلے تو لوگوں کو صرف شک تھا پر اب یقین ہو گیا ہے۔ اس نے رام پیاری اور وکرم کی جان مارواڑیوں سے بچائی تھی۔ اپنے پلے سے رقم دے کر مولوی جی کی بچی کو شہر بھی اسی نے بھجوایا ہے۔ اب عالمگیر اور ٹوانہ کا بیڑا غرق بھی وہی کر رہا ہے۔''

''آ... آپ اس کالی پگڑی والے کی بات کر رہے ہیں؟'' انیق نے ذرا حیران ہو کر پوچھا۔

حشمت نے اپنا تربوز جیسا سر بڑے یقین کے ساتھ اثبات میں ہلایا۔ ''یہ یاسر ہی ہے۔ سو فیصد یاسر ہی ہے۔ کوئی ایک سال ہو گیا ہے وہ گاؤں سے غائب ہو گیا تھا مگر سب جانت تھے کہ وہ گاؤں کے آس پاس ہی کہیں ہے اور گاؤں کے حالات کے بارے میں خبر رکھت ہے۔''

انیق نے کن انکھیوں سے میری طرف دیکھا۔ میں ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ میں نے جو کچھ کیا تھا، اس کا کریڈٹ یہاں کسی یاسر نام کے بندے کو دیا جا رہا تھا۔ بہرحال مجھے اس سے کوئی فرق پڑنے والا نہیں تھا۔ میں جو کچھ کر رہا تھا بے لوث کر رہا تھا اور اس کے پیچھے صرف ایک ہی مقصد تھا اور وہ یہ کہ تاجور کی مشکلات ختم ہو جائیں۔

یاسر نامی اس بندے کے بارے میں انیق نے پہلوان حشمت سے تفصیل پوچھی تو اس نے اپنے مخصوص انداز میں جو کچھ بتایا وہ مختصراً یوں تھا۔ ایف اے میں فیل ہو جانے والے ایک لڑکے نے اپنے باپ کی جمع پونجی سے گاؤں میں ہی کریانے کی ایک دکان کھولی تھی۔ اس نے دن رات محنت کر کے یہ دکان چلا لی۔ چاند گڑھی کے باہر سے بھی لوگ اس کے پاس سودا سلف لینے کے لیے آنے لگے۔ اسی دوران میں عالمگیر کے کچھ چمچوں نے بالے نامی اس لڑکے کو تنگ کرنا شروع کر دیا۔ وہ اس کی دکان سے مفت بوتلیں اور سگریٹ وغیرہ پینے لگے۔ بالا پہلے تو برداشت کرتا رہا لیکن جب کام حد سے بڑھا تو اس نے بڑی عاجزی کے ساتھ دبے لفظوں میں منع کر دیا۔ عالمگیر کے چمچے انکار سننے کے عادی ہی نہیں تھے۔ انہوں نے بالے کو بری طرح مارا پیٹا اور یہیں پر بس نہیں ہوا۔ اس بے چارے کو حکم دیا کہ اب وہ خود بوتلیں اور سگریٹ وغیرہ ڈیرے پر پہنچایا کرے۔ لوگوں نے بالے کو سمجھایا کہ وہ چون و چرا نہ کرے۔ اسی میں اس کی خیریت ہے مگر ہونی ہو کر رہتی ہے۔ ایک دن بالے کو پھر کسی بات پر عالمگیر کے چمچے ساتے کا تھپڑ سہنا پڑا۔ وہ آنسو بہاتا ہوا یاسر کے پاس پہنچا۔ بالے

کی ماں یاسر کے گھر میں برتن وغیرہ دھوتی تھی۔ یاسر بھی اس سارے معاملے سے باخبر تھا۔ وہ آگ بگولا ہو کر اٹھا اور بالے کے ساتھ عالمگیر کے ڈیرے پر پہنچا۔ اس روز وہاں زبردست لڑائی ہوئی۔ چاقو چلے اور فائرنگ بھی ہوئی۔ یاسر نے مفت خوری کرنے والے ایک چمچے کی دونوں ٹانگیں توڑ دیں۔ ایک چمچہ جان بچانے کے لیے بھاگا اور چھت سے کود گیا۔ بھینسوں کے لیے گاڑا گیا ایک کھونٹا اس کے سینے میں لگا اور وہ وہیں دم توڑ گیا۔ مرنے والا پورے گاؤں کے لیے ایک ولن کی طرح تھا۔ بہرحال یہ قتل کا کیس بن گیا تھا۔ یاسر، بالے سمیت موقع سے فرار ہو گیا اور وہ اب تک فرار ہی تھا۔

یہ روداد سنگین اور دلچسپ تھی۔ اندازہ ہوتا تھا کہ چاند گڑھی والے دل ہی دل میں یاسر نامی اس بندے کے کردار کو سراہتے ہیں۔ اب ان میں سے اکثر یہ سوچنے لگے تھے کہ چاند گڑھی میں ڈھانے والا جو شخص نظر آ رہا ہے وہ ہو نہ ہو یاسر ہی ہے۔

پہلوان حشمت نے کہا۔ ”جہاں تک میری ”سی آئی ڈی“ کام کرت ہے، یاسر نے بڑی ہوشیاری سے سجاول سیالکوٹی اور عالمگیر کی کچھ تصویریں اتاری ہیں۔ ان تصویروں میں وہ دونوں اکٹھے موج میلہ کر رہے ہیں۔ اس موج میلے سے یہ بات ثابت ہووت ہے کہ دونوں میں ملی بھگت ہے اور پرویز کا قتل بھی اسی ملی بھگت کی وجہ سے ہوا ہے۔ اب پرویز کے سسرالی پنجے جھاڑ کر عالمگیر پر چڑھ دوڑے ہیں۔“

ہماری گفتگو جاری ہی تھی کہ دین محمد صاحب وہاں پہنچ گئے۔ اسفند چارپائی پر سویا ہوا تھا۔ دین محمد نے اسے سینے سے لگایا، چوما۔ وہ اس کی چوٹیں دیکھ کر پریشان ہو گئے۔ حشمت نے اسفند کے پاؤں کی بڑی اچھی طرح مرہم پٹی کر دی تھی۔ اس نے کہا۔ ”بھائی دین محمد! آپ گھبرائیں نہیں، ہڈی کو کچھ نا ہیں ہوا۔ فقط ٹخنے میں موچ آئی ہے۔ انشاء اللہ تین چار ہفتوں میں بالکل ٹھیک ہو جاوے گا، سر کا زخم بھی اب بہتر ہے۔“

”لیکن... لیکن یہ چوٹیں اسے لگیں کس طرح؟“ دین محمد نے پوچھا۔

انیق نے میری طرف دیکھا پھر مؤدب انداز میں بولا۔ ”مالک! اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اسفند کو کچھ زیادہ نقصان نہیں پہنچا۔ یہ کنوئیں میں گر گیا تھا۔“

”کنوئیں میں؟“ دین محمد کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔

”جی مالک۔“ حق نواز نے کہا۔ ”جب گولیاں چلنا شروع ہوئیں تو میدان میں کھیڈنے والے منڈے ڈر کر بھاگے، اپنا اسفند بھی بھاگا اور کیچڑ میں پھسل کر اندر گر گیا۔“

دین محمد نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ لیا پھر لرزاں... آواز میں بولے۔ ”پھر نکلا کس طرح؟“

حق نواز نے میری طرف دیکھا اور ساری روداد کہہ سنائی۔ بتایا کہ کس طرح میں فائرنگ کے دوران میں کنوئیں تک گیا اور اسفند کو نکالا۔

دین محمد کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ انہوں نے بے ساختہ آگے جھک کر مجھے اپنے ساتھ لگایا اور میرا سر چوما پھر انہوں نے دوبارہ اسفند کو اپنے ساتھ لپٹایا اور اس کی پیشانی اور گالوں پر بوسے دینے لگے۔

وہ اور حق نواز زخمی اسفند کو گود میں اٹھا کر گھر لے گئے۔ میں اور حشمت وہیں ڈیرے پر رہے۔ انیق اور حشمت میں گاؤں کے بدلے ہوئے حالات کے بارے میں گفتگو ہوتی رہی۔ حشمت کا خیال تھا کہ عالمگیر اور اس کے قریبی ساتھیوں کے گرفتار ہونے سے عام لوگوں کا خوف کم ہوا ہے اور اب ہوسکتا ہے کہ مولوی جی کے حادثے والے معاملے پر بھی بات ہونے لگے... اور غائب ہو جانے والے مؤذن لڑکے کا کھوج بھی سرگرمی سے لگایا جائے۔

پہلوان حشمت کا یہ قیافہ چوتھے پانچویں دن بالکل درست ثابت ہو گیا۔ اس دن مولوی جی کی نوجوان بیوہ پروین شہر سے گاؤں آئی تھی۔ بچی زینب ابھی تک اسپتال میں داخل تھی اور اس کا علاج بڑی کامیابی سے جاری تھا۔ پروین اپنا اور بچی کا کچھ سامان وغیرہ لینے کے لیے ایک دن کے لیے آئی تھی۔ دوپہر کو میں ٹریکٹر کا ڈیزل لینے کے لیے ڈپو کی طرف گیا تو مسجد کے قریب شور سنائی دیا۔ نئے امام صاحب کے علاوہ دیگر کئی افراد بھی دروازے کے قریب جمع تھے۔ ایک چادر پوش عورت بلند آواز میں بول رہی تھی۔ میں ٹریکٹر سے اتر کر موقع پر پہنچا۔ عورت کی صرف پیشانی اور آنکھیں نظر آ رہی تھیں۔ لیکن میں نے پہچان لیا۔ وہ مولوی جی کی بیوہ ہی تھی۔ وہ ہیجانی انداز میں چلا رہی تھی۔ ”میں اللہ کے گھر کے سامنے کھڑے ہو کر کہہ رہی ہوں، زینب کا یہ حال کرنے والا وہ خبیث عالمگیر ہے۔ اسی ظالم نے مولوی جی کی جان لی ہے... اسی نے لی ہے۔“

اس کی آواز بیٹھ گئی لیکن وہ اپنے جسم کی پوری قوت جمع کر کے چلاتی رہی۔ ”وہی ہے مجرم۔ مولوی جی نے ایک دن پہلے مجھے سب کچھ بتا دیا تھا۔ وہ جانور ہے درندہ ہے۔

وہ زینب کو نشہ پلاتا رہا ہے۔ اس کے ساتھ بُری حرکتیں کرتا رہا ہے۔ اس بدبخت کو اللہ نے موقع نہیں دیا، ورنہ پتا نہیں وہ کیا کر گزرتا، اپنا بھید کھلنے کے ڈر سے اس نے مولوی جی کی جان لی ہے۔ میں اس کے خلاف گواہی دوں گی، ہر جگہ گواہی دوں گی۔''

وہ پکار رہی تھی اور اس کی آواز جیسے پورے چاند گڑھی میں گونج رہی تھی۔ امام صاحب نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور اسے سنبھالنے کی کوشش کی۔ ''ہمیں تمہارے ساتھ پوری ہمدردی ہے بیٹی... لیکن الزام کے ساتھ ثبوت بھی چاہیے ہوتے ہیں۔''

''ہیں میرے پاس ثبوت۔ ڈاکٹروں نے پوری رپورٹ دی ہے۔ زینب کو جو نشہ دیا جاتا رہا ہے، اس میں سانپوں کا زہر ہے اور یہ پیر ولایت کی کارستانیاں ہیں۔ میں اس کے خلاف بھی پرچہ کٹواؤں گی اور زینب سے بڑا ثبوت اور کیا ہوگا۔ وہ خود گواہی دے گی اس بدبخت عالمگیر کے خلاف۔''

لوگ چہ میگوئیاں کر رہے تھے۔ سرگوشیوں میں بات کر رہے تھے۔ ان کے چہرے بتا رہے تھے کہ ان میں سے زیادہ تر پروین کے ہمنوا ہیں۔ اس کی بات کو درست سمجھ رہے ہیں۔ چاند گڑھی کے لوگوں پر سے جمود ٹوٹنا شروع ہو گیا تھا۔ ان کے دل کی آوازیں، ان کے ہونٹوں تک پہنچنا شروع ہو گئی تھیں۔ جمود ایسے ہی ٹوٹا کرتے ہیں، خوف کے سائے ایسے ہی سمٹا کرتے ہیں۔ جب جبر و ستم کی سیاہ چٹان میں دراڑیں پڑتی ہیں تو عوامی غیظ و غضب کا سیلابی پانی اسی طرح ان دراڑوں میں گھستا ہے اور چٹان کو ٹکڑوں میں بانٹ دیتا ہے۔

اس شام میں نے خود کو بے حد پُرسکون محسوس کیا، اسی گلابی شام میں، میں سبز کھیتوں کے کنارے کنارے دور تک چلا گیا۔ پرندوں کی چہکاریں، مویشیوں کے گلے کی گھنٹیاں، رہٹ کی آوازیں، میرے کانوں میں کسی موسیقی کی طرح گونجتی رہیں۔ میں نے دل ہی دل میں کہا... اے کوپن ہیگن والو... مشینوں کے شور اور گاڑیوں کے دھوئیں میں زندہ رہنے والو! آؤ میرے دیس کی اس خوش رنگ شام کو دیکھو اور محسوس کرو۔ زندگی کا اصل حسن کہاں ہے۔ تمہارے نائٹ کلبوں کے تھرکتے جسموں میں یا اس پگڈنڈیوں پر قطار میں جاتی ہوئی دیہاتی دوشیزاؤں کے لہراتے آنچلوں میں؟

آج میں تاجور کی طرف سے بھی بہت مطمئن تھا۔ اس کا دعویدار اسحاق عرف ساقا، صولت ٹوانہ کے ہاتھوں شدید زخمی اور ذلیل ہو کر اسپتال میں پڑا تھا اور اس کی ''شادی خانہ بربادی'' کا دور دور پتا نہیں تھا۔ یہ بات بھی عین ممکن تھی کہ وہ عالمگیر کے ساتھ ہی مولوی جی کے قتل والے کیس میں پھنس جاتا۔ یہ لوگ وہی کچھ کاٹ رہے تھے جو انہوں نے بویا تھا۔

رات کا کھانا شام کے ایک گھنٹے بعد ہی کھا لیا جاتا تھا۔ ڈیرے کے کمرے میں لالٹین کی روشنی تھی۔ میں انیق، سونگی اور حق نواز اکٹھے ہی کھانا کھا رہے تھے۔ آلو گوبھی کا چٹ پٹا سالن تھا۔ ساتھ میں دودھ کی نمکین لسی تھی۔ حق نواز کی بیوی نذیراں گرم گرم روٹیاں اتار کر لا رہی تھی۔ کھانے کے ساتھ ساتھ دوپہر والے واقعے پر بھی بات ہو رہی تھی اور مولوی جی کی بیوہ کی انکشاف انگیز باتوں پر تبصرہ ہو رہا تھا۔ سونگی نے بڑا سا لقمہ منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔ ''ویسے اب تو سب کو یقین ہوتا جا رہا ہے کہ پنڈ میں یہ جو سکھ کی ہوا چلی ہے اس میں یاسر بھائی کا ہاتھ بھی ہے۔ بڑا جی دار بندہ ہے۔ لوگ پہلے ہی کہتے تھے کہ وہ کہیں گیا نہیں۔ پنڈ کے آلے دوالے ہی ہے اور یہاں کی اونچ نیچ پر پوری نظر رکھے ہوئے ہے۔

حق نواز نے کہا۔ ''ہاں، پڑھا لکھا منڈا ہے۔ مولوی جی وچارے تو یہی سمجھ رہے تھے کہ بچی پر سایہ وغیرہ ہے۔ یہ اسی نے مولوی جی کو شہر کا رستہ دکھایا تھا۔ اب تو یہ گل ثابت ہو گئی ہے نا۔''

سونگی نے نمکین لسی کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔ ''کیا پتا اب وہ کھل کر سامنے بھی آجائے۔ عالمگیر تو اب اتنی جلدی باہر نہیں نکلے گا۔''

اسی دوران میں دین محمد صاحب کے کھنکھارنے کی آواز سنائی دی۔ ہم سب ذرا سنبھل کر بیٹھ گئے۔ دین محمد صاحب اندر داخل ہوئے اور میری طرف دیکھ کر اشارے سے بولے کہ ''چلو۔''

میں سوالیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھنے لگا۔ انہوں نے اشاروں سے مجھے بتایا کہ گھر جانا ہے۔ اشاروں کے ساتھ ساتھ وہ وضاحت کے لیے بول بھی رہے تھے۔ کہنے لگے۔ ''چھوٹو کا بخار نہیں اتر رہا۔ بے ہوشی میں بار بار تمہارا نام لے رہا ہے۔ کہہ رہا ہے کہ گوتلے بھائی جان کو بلاؤ۔ تم دیکھ بھال کرتے رہے ہو نا اس کی...''

میں دین محمد صاحب کی ساری باتیں سن رہا تھا لیکن ظاہر یہی کیا جیسے ان کے اشاروں سے بس تھوڑا بہت ہی سمجھ

پار ہا ہوں۔ اسفند قریباً چوبیس گھنٹے میرے پاس رہا تھا۔ وہ پہلے بھی مجھ سے انسیت محسوس کرتا تھا، میری تیمارداری نے اسے مجھ سے مزید مانوس کر دیا تھا۔ یہ میرے لیے خوش آئند بات تھی۔

میں دین محمد صاحب کے ساتھ گھر روانہ ہو گیا۔ وہ مجھے سیدھا اسی اندرونی کمرے میں لے گئے جہاں اسفند چارپائی پر نیم بے ہوش لیٹا تھا۔ اس کا پاؤں کافی سوجا ہوا تھا۔ پہلوان حشمت ابھی ابھی اس کی پٹی بدل کر گیا تھا۔ لالٹین کی روشنی میں جو کمزور عورت اس کے سرہانے بیٹھی تھی، وہ اس کی والدہ تھی۔ میں آج انہیں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ عمر پینتالیس سے اوپر ہی رہی ہو گی۔ چہرے پر بیماری کی نقاہت تھی۔ تاہم بیٹے کو تکلیف میں دیکھ کر وہ اپنی تکلیف بھول چکی تھیں۔ مجھے حیرانی ہوئی جب انہوں نے اٹھ کر مجھے گلے سے لگایا اور میرا ماتھا چوما۔ پھر فوراً ہی مجھے وجہ بھی سمجھ میں آ گئی۔ میں نے ایک نہایت مشکل وقت میں ان کے بچے کی مدد کی تھی۔ وہ لرزتی آواز میں بولیں۔ ”ہم تمہارا احسان نہیں دے سکتے پُتر، تم اسے کھوہ سے باہر نہ نکالتے تو پتا نہیں کیا بیت جاتی اس پر۔“

میں نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر عاجزی کا اظہار کیا اور جیسے خاموشی کی زبان میں بتایا کہ یہ تو میرا فرض تھا۔

انہوں نے پھر میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بولیں۔ ”گولیاں چل رہی تھیں پُتر، تو نے اپنی جان کی پروا بھی نہیں کی، کسی بڑی چنگی ماں کا لال ہے تو۔ اللہ تجھے حیاتی دے۔“

انہوں نے چادر سے اپنے آنسو پونچھے اور اپنے الفاظ کو اشاروں کی زبان سے واضح کرتے ہوئے بولیں۔ ”یہ دوپہر سے بار بار تیرا نام لے رہا ہے۔ اس کے پاس بیٹھ... اس کو دوا وغیرہ کھلا۔ یہ تجھے دیکھے گا تو اسے بڑا آسرا ملے گا۔“

میں نے نیازمندی سے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ پھر مجھے دعائیں دینے لگیں۔ مجھے کبھی کبھی افسوس بھی ہوتا تھا کہ میں اتنے اچھے اور مہربان لوگوں کو دھوکے میں رکھ رہا ہوں اور خود کو ان کے سامنے بے زبان ظاہر کر رہا ہوں۔ لیکن اب یہ ایک مجبوری بن گئی تھی۔

دفعتاً آہٹ ہوئی۔ دروازے پر تاجور کی صورت میں چاند چمکا۔ اس کے پہلو میں کاکا کھڑا تھا جس طرح چھوٹو کا اصل نام اسفند تھا، اسی طرح کاکے کا اصل نام راحیل تھا۔ تاجور نے ممنونیت بھری آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ میرے ”اظہارِ محبت“ کے بعد یہ پہلی بار تھی کہ وہ مجھے دکھائی دی تھی اور اچھے انداز میں دکھائی دی تھی۔ اس کا یہ انداز دل کی گہرائی میں دور تک اتر گیا مگر ابھی یقین سے نہیں کہا جا سکتا تھا کہ اس نے میری گستاخی پر مجھے معاف کیا ہے یا نہیں۔

وہ اندر آ گئی اور موڑھے پر بیٹھ گئی۔ پورا کمرا جیسے اس کی خوشبو اور روشنی سے بھر گیا۔ یہ پیرس کے کسی مہنگے پرفیوم کی خوشبو نہیں تھی۔ نہ ہی یہ روشنی مصنوعی لائٹس کی تھی، یہ خوشبو اور روشنی اس کی ذات کی سادگی اور پاکیزگی سے اُبھرتی تھی۔

ماں نے تاجور کے سامنے ایک بار پھر میرے کندھے پر ہاتھ پھیرا اور تاجور سے مخاطب ہو کر بولیں۔ ”ہمارے لیے تو یہ رحمت کا فرشتہ ہی ثابت ہوا ہے۔ پہلے سیالکوٹ والے واقعے میں اس نے تجھے بچایا اور ان خبیثوں سے لڑ جھگڑ کر تجھے نکال لے گیا۔ اب اس نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر اسفند کو بچایا۔“

تاجور نے اقرار میں سر ہلایا اور ایک بار نرم نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ میں لاتعلق سا بیٹھا تھا جیسے کچھ بھی سن نہیں پا رہا ہوں۔ انہوں نے غور سے میری طرف دیکھا اور بولیں۔ ”دیکھو کتنا سادہ اور معصوم سا ہے لیکن دلیر بھی ہے۔“

سادہ اور معصوم کے الفاظ میرے کانوں میں گونج کر رہ گئے۔ اس بے چاری کو کیا پتا تھا کہ یہ سادہ اور معصوم ڈنمارک اور انگلینڈ جیسے ملکوں میں کیا گل کھلاتا رہا ہے۔ کیسے کیسے ماحول کا حصہ رہا ہے اور اب بھی اگر وہ یہاں آیا ہے تو اس کی بیٹی کی خاطر۔ اس کے عشق میں ڈوب کر۔ اور اس کے ”ارادے“ بہت آگے کے ہیں۔ انہوں نے اشارے کنائیوں میں مجھ سے پوچھا کہ میں کہاں کا رہنے والا ہوں اور میرے ماں باپ کہاں ہیں؟

میں نے مبہم سے اشارے دیے اور بے بسی سے ان کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ ذرا تاسف سے بولیں۔ ”کتنا جوان ہے، سوہنا بھی ہے پر اللہ نے زبان نہیں دی۔“

تاجور نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ”ہر کام میں اللہ نے کوئی بہتری رکھی ہوتی ہے امی۔ ہو سکتا ہے کہ زبان ہوتی تو اس کا استعمال کیسے کیسے ہوتا۔“ تاجور کی والدہ نے اپنی ناک کو انگلی سے چھو کر مجھ سے پوچھا کہ میری شادی ہوئی ہے یا نہیں؟

میں نے فوراً نفی میں سر ہلایا۔ تاجور ذرا شوخی سے بولی۔ ”امی، میرا خیال ہے آپ لڑکی ڈھونڈنا شروع کر

دیں۔ یہ بھی نیکی کا کام ہوگا۔“

کاکا چہک کر بولا۔ ”امی، بابے نتھے کی دونوں بیٹیاں کونگی ہیں۔ چھوٹی تو شکل کی بھی چنگی ہے۔“

والدہ نے ہاتھ ہلا کر کہا۔ ”چل دے، اتنا سوہنا... گبرو ہے۔ اس کے لیے وہی رہ گئی ہے۔ یہ دل کا نیک ہے۔ اللہ اس کے لیے بھی چنگا کرے گا۔“

میں نے تاجور کی طرف دیکھا، اتفاقاً تب وہ بھی میری ہی طرف دیکھ رہی تھی، اس نے گڑبڑا کر نظریں جھکا لیں۔ میرے سینے میں میٹھا میٹھا درد ہلکورے لینے لگا۔ اسی دوران میں اسفند کسمسایا اور زور سے کراہ کر پکارنے لگا۔

”ہائے، امی... ہائے باجی... ہائے باجی۔“

تاجور تڑپ کر اس کے سرہانے پہنچی اور اس کے منہ پر ہاتھ پھیر کر اسے پچکارنے لگی۔ ”میں یہاں ہوں اسفند... اور یہ دیکھ... تیرے گونگے بھائی جان بھی آئے ہیں۔“ اسفند عرف چھوٹو نے پلکیں اٹھائیں۔ اس کی آنکھیں بخار کی حدت سے سرخ ہو رہی تھیں۔ مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر طمانیت ابھری۔ تاجور نے مجھے اشارے سے کہا کہ میں اس کے سرہانے بیٹھ جاؤں۔ میں نے بیٹھ کر اس کا سر گود میں رکھ لیا اور اس کا ماتھا دبانے لگا۔ اس نے آنکھیں موند لیں۔

اسی دوران میں دین محمد صاحب کھنکھارتے ہوئے اندر آگئے۔ ”کہاں گئے تھے؟“ تاجور کی والدہ نے پوچھا۔

”ذرا باہر کی خبر لینے گیا تھا۔“ دین محمد نے کہا۔ ”پھر ذرا توقف سے بولے۔ ”پتا ہے کیا ہوا ہے؟“

تاجور اور اس کی والدہ سوالیہ نظروں سے دین محمد کی طرف دیکھنے لگیں۔ میں نے اپنا چہرہ سپاٹ رکھا اور جوں کا توں بیٹھا رہا۔ ظاہر ہے میں تو ”گونگا بہرا“ تھا۔ دین محمد نے کہا۔ ”پیر ولایت بڑا کنجرا نکلا ہے۔ بالکل گرگٹ کی طرح رنگ بدلا ہے اس نے۔ کہتا ہے کہ عالمگیر سے میرا ملنا جلنا ضرور رہا ہے پر ان کی کسی کارستانی سے میرا کوئی تعلق واسطہ نہیں۔ پولیس والے ابھی شام سے پہلے اس کے پاس گئے تھے پوچھ گچھ کے لیے۔ اس نے ان کو بتایا ہے کہ وہ بھی سجاول سیالکوٹی کو اتنا ہی برا سمجھتا ہے جتنا پنڈ کے دوسرے لوگ۔ وہ دن رات سیالکوٹی کے لیے بددعا کرتا ہے اور اپنے پنڈ کی خیر مانگتا ہے۔ اس نے یہ بھی کہا ہے کہ اگر عالمگیر اور ساقا وغیرہ قصوروار ہیں تو انہیں اس کی سخت سے سخت سزا ملنی چاہیے۔“

”اب تو اس نے ساقے کے ویاہ کی گل نہیں کی ہوگی؟“ تاجور کی والدہ نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

”نہیں، اب کس منہ سے کرے گا۔“ دین محمد نے جواب دیا۔

”اور مولوی جی کی بیٹی کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے اس کے بارے میں کیا کہتا ہے وہ؟“ تاجور نے پوچھا۔

”کہتا ہے کہ اس سے بھی میرا کوئی تعلق واسطہ نہیں۔ کہتا ہے کہ سانپوں کے زہر سے بنائی گئی زکام ریشے کی ایک دوائی اس کے پاس ضرور ہے، اگر عالمگیر نے یا کسی اور نے اس دوائی میں کچھ اور ملا کر کوئی نشہ وغیرہ بنا لیا ہے تو اس میں اس کا کوئی قصور نہیں ہے۔“

کچھ دیر تک دین محمد اپنے اہلِ خانہ کے پاس بیٹھ کر گفتگو کرتے رہے۔ ان کی باتوں سے یہ پتا بھی چلا کہ عالمگیر اور تحصیل دار ٹوانہ کے درمیان جو سنگین جھگڑا شروع ہوا ہے وہ عارضی طور پر ختم تو گیا ہے لیکن یہ دشمنی اتنی آسانی سے ختم نہیں ہوگی۔ پولیس کی بھاری نفری گاؤں میں موجود ہے اس لیے دونوں طرف کے لوگ کونے کھدروں میں دبکے ہوئے ہیں۔

اتنے میں کوئی دین محمد صاحب سے ملنے آگیا، وہ باہر چلے گئے۔ تاجور کی والدہ نے میرے سامنے ہی تاجور سے بات کی کہ اب کیا کرنا ہے، وہ بولیں۔ ”کم از کم آج کی رات تو شاہ زیب کو یہیں رہنا پڑے گا لیکن جو کچھ بھی ہے یہ غیر بندہ ہے، تھوڑی سی احتیاط کرنا پڑے گی۔“

”چلیں دیکھ لیتے ہیں۔“ تاجور نے کہا۔ ”اگر رات گیارہ بارہ بجے تک اسفند کی طبیعت اچھی ہوگئی تو پھر یہ واپس بھی جا سکتا ہے۔“

”نہیں، آج کی رات تو یہ یہیں رہ لے۔ لیکن ایسا کرتے ہیں کہ اسفند کی چارپائی بیٹھک میں بچھا دیتے ہیں۔ وہاں تخت پوش بھی پڑا ہے، اگر شاہ زیب نے کمر سیدھی کرنی ہوگی تو اس پر لیٹ جائے گا۔“

دو چار منٹ ماں بیٹی میں مشورہ ہوا پھر ہم نے مل کر اسفند والی چارپائی اٹھائی اور گھر کی کشادہ بیٹھک میں لے آئے۔

تاجور کی والدہ کی طبیعت خراب تھی۔ تاجور نے بہت اصرار کر کے انہیں دوا کھلائی اور سونے کے لیے بھیج دیا۔ میں اور تاجور، اسفند کے پاس بیٹھے رہے، گاہے بگاہے دین محمد صاحب بھی چکر لگاتے رہے۔ کچھ دیر مجھ سے غنودگی بھری باتیں کرنے کے بعد اسفند... سو گیا تھا۔ میں نے

سرگوشی میں تاجور سے کہا کہ وہ بھی جا کر آرام کرلے لیکن وہ وہیں بیٹھی رہی۔ راحیل کونے میں بچھی چارپائی پر نیم دراز تھا اور لالٹین کی روشنی میں اپنے کورس کی کتاب پڑھ رہا تھا۔ اسی طرح پڑھتے پڑھتے وہ سو گیا۔ موقع غنیمت جان کر میں نے سرگوشی میں تاجور سے کہا۔ ''مبارک ہو، ساقا اب اپنے شیطانی ارادوں سمیت تم سے کافی دور جاچکا ہے، اگر میں غلط نہیں ہوں تو شادی میرا مطلب ہے جبری شادی کا خطرہ مستقل طور پر تمہارے سر سے ٹل گیا ہے۔''

''اس میں یاسر بھائی نے بہت بڑا کردار ادا کیا ہے۔'' وہ بھی مدھم آواز میں بولی۔ ''اگر وہ اس طرح زینب کی بیماری کی اصلیت نہ بتاتے... اور پھر عالمگیر کا کچا چٹھا، سیالکوٹی کے بارے میں نہ کھولتے تو کایا کبھی اس طرح نہ پلٹتی۔ انہوں نے تصویروں کے ذریعے عالمگیر اور سیالکوٹی کی دوستی کا بھانڈا پھوڑا اور نتیجے میں عالمگیر کی پکڑ ہوگئی۔''

جی چاہا اسے بتادوں کہ وہ جس شخص کی تعریفیں کر رہی ہے اس بے چارے کو تو شاید اس سارے معاملے کا پتا بھی نہ ہو۔ اصل ''ہیرو'' تو تمہارے سامنے بیٹھا ہے اگر کوئی میٹھا بول بولنا ہے تو میرے بارے میں بولو۔ لیکن ابھی یہ ساری باتیں افشا کرنے کا وقت نہیں آیا تھا۔

وہ کھوئی کھوئی سی آواز میں بولی۔ ''یاسر بھائی، اماں برکتے کے بیٹے ہیں۔ بڑے چنگے اخلاق کے ہیں۔ پنڈ والوں کو ہمیشہ ان کی طرف سے کوئی اچھی امید ہی ہوتی ہے۔''

میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ''بالکل... بندہ اچھا ہو تو اس سے اچھی امید خودبخود پیدا ہوجاتی ہے۔''

''مجھے تو لگتا ہے کہ اب یاسر بھائی پنڈ بھی واپس آجائیں گے۔ دیکھا جائے تو انہوں نے دونوں پارٹیوں کی کمر توڑ دی ہے۔ میرا مطلب ہے عالمگیر اور تحصیل دار ٹوانہ... دونوں پکڑے گئے ہیں اور دونوں پر پرچے شرچے بھی کٹے ہیں۔''

''اور تیسری پارٹی؟'' میں نے پوچھا۔

''کیا مطلب؟''

''تمہارا دعویدار اسحاق صاحب، سنا ہے جناب کو ٹوانہ کے بندوں نے خوب مار لگائی ہے۔ کمر تو خیر اس کی نہیں ٹوٹی لیکن کلائی ٹوٹ گئی ہے۔''

تاجور کے چہرے پر نفرت اور کراہت کے آثار نمودار ہوئے، وہ بولی۔ ''چھوڑیں اس بات کو۔''

''تو کس کی بات کریں؟ میرا مطلب ہے... میں اپنی بات کرلوں؟''

اس کے شفاف چہرے پر رنگ سا آکر گزر گیا۔ اس نے چونکی ہوئی نظروں سے دونوں چھوٹے بھائیوں کی طرف دیکھا۔ دونوں ہی سو رہے تھے۔ ساتھ والے کمرے سے دین محمد صاحب کی کھانسی بھی سنائی نہیں دیتی تھی۔ لگتا تھا کہ ان کی غنودگی بھی نیند میں بدل گئی ہے۔ دور کی کسی گلی سے آوارہ کتوں کا مدھم سا شور سنائی دے رہا تھا۔

''آپ کو کیا کرنی ہے اپنی بات؟'' وہ نرم لہجے میں بولی۔

''میں تو ماضی کی بات ہی کروں گا۔ بس وہی دو دن... جو میں کبھی بھولا نہیں اور نہ بھول سکوں گا۔ سچ تاجور! ایسا لگتا ہے، وہ دن میرے دل پر کسی نے کندہ کردیے ہیں۔ گہرائی تک کھود دیے ہیں۔ اب شاید موت بھی انہیں مٹا نہ سکے۔''

''آپ گونگے زیادہ اچھے لگتے ہیں۔'' وہ زیرلب مسکرائی۔

''چلو، کسی طور اچھا تو لگتا ہوں۔''

وہ ایک دم سنجیدہ ہوکر بولی۔ ''شاہ زیب! آپ واقعی بہت اچھے ہیں، اس لیے میں چاہتی ہوں کہ آپ کسی بڑی مصیبت میں گرفتار نہ ہوجائیں۔ آپ نے جو کچھ میرے لیے اور میرے بھائی کے لیے کیا ہے، میں اسے زندگی بھر بھول نہیں سکوں گی لیکن پلیز... آپ یہاں سے چلے جائیں۔''

میں نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''کیا اس وقت تک رہنے کی اجازت بھی نہیں جب تک یہاں کے حالات کچھ ٹھیک نہ ہوجائیں؟''

وہ سر جھکا کر بولی۔ ''میں اجازت دینے یا نہ دینے والی کون ہوتی ہوں۔ میں تو صرف گزارش کرسکتی ہوں۔''

لالٹین کی روشنی مدھم ہوگئی تھی۔ اچانک کہیں سے ہوا کا ایک جھونکا آیا اور وہ بجھ گئی۔ کمرے میں گہری تاریکی چھا گئی۔ ''مم... میں موم بتی دیکھتی ہوں۔'' تاجور نے جلدی سے کہا اور کھڑی ہوگئی۔

وہ لکڑی کی الماری کی طرف بڑھی تو اسے ٹھوکر لگی اور وہ میرے اوپر گرتے گرتے بچی۔ اس کا گداز جسم ایک لمحے کے لیے میرے شانے سے ٹکرایا۔ جب اس نے سنبھل کر سیدھا ہونا چاہا تو ہو نہیں سکی۔ اس کے چہرے پر ہر وقت جھولنے والی بالوں کی دو لٹوں میں سے کوئی ایک لٹ میری جیکٹ کے بٹن میں اٹک گئی تھی۔

’’ہائے اللہ۔‘‘ اس کے ہونٹوں سے بے ساختہ سسکاری نکلی۔

جیکٹ کے کالر پر لگے ہوئے ستارہ نما بٹن نے اسے رکوع کے بل جھکے رہنے پر مجبور کردیا تھا۔ میں نے بٹن کو ٹٹولا اور اس کی لٹ کو آزاد کرنے کی کوشش کی۔ اس کی گرم خوشبودار سانسیں میرے چہرے سے ٹکرا رہی تھیں۔ پتا نہیں کیسے میں نے بے ساختہ اپنے سر کو حرکت دی اور اپنے گرم ہونٹوں سے اس کی تابندہ پیشانی چوم لی۔ لٹ آزاد ہو چکی تھی۔ وہ تڑپ کر سیدھی کھڑی ہوگئی۔ یہ سب کچھ چار پانچ سیکنڈ کے اندر وقوع پذیر ہوا۔ وہ باہر نکل گئی۔

میرا دل بے طرح دھڑک رہا تھا۔ جو کچھ ہوا اتنا آنا فانا تھا کہ خود میری سمجھ میں بھی نہیں آیا۔ میرے ہونٹوں پر ابھی تک اس کی پیشانی کا بے مثال لمس تھا۔

وہ لوٹی تو اس کے ہاتھ میں شمع تھی۔ میں نے اس کا چہرہ دیکھا اور سٹپٹا گیا۔ وہ سخت غصے میں نظر آتی تھی۔ اس نے شمع دروازے کے قریب طاق میں جمائی اور میری طرف دیکھے بغیر بولی۔ ’’شاہ زیب صاحب! آپ میرے اور اپنے حال پر رحم کریں۔ آپ یہاں سے چلے جائیں... اگر کہتے ہیں تو میں آپ کے سامنے ہاتھ جوڑ دیتی ہوں۔‘‘

’’سوری تاجور، میں شرمندہ ہوں۔‘‘

’’میں آپ سے زیادہ شرمندہ ہوں۔ میں آپ کو... یہاں دوبارہ دیکھنا نہیں چاہتی۔‘‘ اس نے انتہائی روکھے پن سے کہا اور پلٹ کر باہر نکل گئی۔

مجھے لگا کہ اگر میں نے ایک لفظ بھی اور کہا تو شاید وہ ہر اندیشے کو نظر انداز کر کے چلا اٹھے... اور گھر والے بیدار ہو جائیں۔

اس کا ردعمل میری توقع سے زیادہ شدید تھا۔ میں گم صم اپنی جگہ بیٹھا رہا اور گاہے بگاہے اسفند کی پیشانی کو سہلاتا رہا۔ ایک دوبار اس نے اپنی سرخ آنکھیں کھولیں اور میری طرف دیکھ کر دوبارہ بند کرلیں۔ اسے جیسے اطمینان تھا کہ میں اس کے پاس موجود ہوں۔ تھوڑی دیر بعد تاجور کی والدہ کے کھانسنے کی آواز آئی اور وہ تسبیح لے کر میرے پاس آن بیٹھیں۔ میں نے اندازہ لگایا کہ تہجد کا وقت ہونے والا ہے۔

وہ دعائیہ انداز میں بولیں۔ ’’یا اللہ سب کی خیر، سب کا بھلا۔ پتا نہیں اس پنڈ کو کیا ہوتا جارہا ہے۔ ہر روز کچھ نہ کچھ برا سننے کو مل رہا ہے۔‘‘

پرسوں والے خونی واقعے نے جیسے ابھی تک انہیں ہراساں کر رکھا تھا اور یہ خوف و ہراس چاندگڑھی کے اکثر لوگوں کے چہروں پر نظر آتا تھا۔ پُراسرار واقعات اور گاؤں میں دو بدصورت عورتوں کی موجودگی والی باتیں پہلے ہی ان لوگوں کے لیے سوہانِ روح تھیں، اب لاشیں گرنا بھی شروع ہوگئی تھیں۔

تاجور کی والدہ نے مجھ سے اصرار کیا کہ میں چارپائی پر لیٹ کر آرام کرلوں۔ مگر میں نے اشاروں کنائیوں میں بتایا کہ میں یہاں بالکل ٹھیک ہوں۔ وہ نہیں مانیں اور مزید اصرار کر کے مجھے لٹا دیا۔

میں زیادہ دیر نہیں سویا۔ اٹھا تو رات کا اندھیرا دن کے اجالے میں بدل رہا تھا۔ صحن کی طرف چڑیاں چہکار رہی تھیں۔ تاجور اور اس کی والدہ اسفند کو دوا پلا رہی تھیں۔ تاجور نے میری طرف دیکھا تک نہیں اور اسفند کو دوا دینے کے بعد تیزی سے باہر چلی گئی۔ میں اسفند کے پاس آبیٹھا اور اس سے باتیں کرنے لگا۔ اس کی طبیعت اب بہتر تھی۔ وہ میری ٹھوڑی پر انگلیاں پھیرتے ہوئے بولا۔ ’’آپ بہت اچھے ہیں گونگے بھائی۔‘‘

تاجور کی والدہ نے سرزنش کے انداز میں کہا۔ ’’گونگے بھائی نہیں کہتے... صرف بھائی کہا کرو... بھائی جان۔‘‘

اسفند نے اثبات میں سر ہلایا۔ ’’پھر ذرا چونک کر بولا۔ ’’بھائی جان! آپ بول بھی لیتے ہیں؟ میں نے رات کو آپ کی آواز سنی تھی۔‘‘

میرا دل اچھل کر رہ گیا۔ میں نے سوالیہ نظروں سے تاجور کی والدہ کی طرف دیکھا۔ انہوں نے مسکرا کر اسفند کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ’’نہیں پتر، یہ نہیں بول سکتے۔ تجھے بخار کی بے ہوشی تھی نا اس لیے الٹی سیدھی آوازیں سن رہا تھا۔ اپنے ابا جی کو ماسٹر جی کہہ کر بلا رہا تھا۔‘‘

’’نہیں امی، یہ بول رہے تھے۔ باجی سے بات کر رہے تھے۔‘‘ وہ زور دے کر بولا۔

’’اچھا چلو ٹھیک ہے کر رہے تھے بات۔‘‘ والدہ نے اسے تسلی دینے والے انداز میں کہا۔ ’’اب زیادہ باتیں کرے گا تو منہ پھر سوکھنے لگے گا۔ سو جا تھوڑی دیر۔‘‘ ننھا اسفند الجھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھتا رہا پھر اس کی پلکیں دوا کے اثر سے بوجھل ہونے لگیں۔

میں اپنے جسم میں ابھی تک سنسناہٹ محسوس کر رہا تھا۔

ناشتا میں نے دین محمد صاحب کے گھر پر ہی کیا۔

تاجور مجھے کہیں نظر نہیں آئی۔ اس کی آواز تک سنائی نہیں دی۔ جانے کس کونے کھدرے میں چھپ گئی تھی۔ مجھے بار بار اس کا نہایت روکھا لہجہ یاد آتا تھا اور سینے میں کچوکا سا لگتا تھا۔ دس بجے کے قریب میں اپنے کام پر واپس آ گیا۔ آج ایک کھیت میں ٹریکٹر کے ذریعے سہاگا پھیرنا تھا اور یہ کام آج ہی کرنا ضروری تھا۔ کیونکہ کل بوائی ہونا تھی۔

میں شام تک کام میں جُتا رہا۔ اس کے ساتھ ساتھ ذہن میں ایک پروگرام بھی بنتا رہا۔ جب میں نے انیق کو بتایا کہ کل ہم چاند گڑھی سے واپس جا رہے ہیں تو وہ حیران رہ گیا۔ ”کیوں، کیا ہوا؟“ اس نے بھاڑ جیسا منہ کھول کر پوچھا۔

”بس یہاں ہمارا دانہ پانی اتنا ہی تھا۔“

وہ غور سے میری طرف دیکھنے لگا۔ ”کیا بات ہے شاہ زیب بھائی! آج تو آپ فلم دل لگی کے ندیم نظر آ رہے ہیں... وہ کیا گانا تھا... کل کسی وقت شام سے پہلے، میں تیرا شہر چھوڑ جاؤں گا۔“

”نہیں بھئی، میں سنجیدہ ہوں۔“ میں نے کہا۔

اسی دوران میں اتفاقاً دین محمد صاحب بھی حقہ گڑگڑاتے ہوئے ہماری طرف آ گئے۔ انیق سے مخاطب ہو کر بولے۔ ”کیوں بھئی، کیا گل ہے۔ شاہ زیب نے حق نواز سے کہا ہے کہ کام چھوڑنا ہے۔“

انیق سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔

دین محمد صاحب نے کہا۔ ”کیا کسی سے کوئی ناراضگی وغیرہ ہو گئی ہے یا پھر کوئی اور بات ہے؟“

میں نے اشاروں کنائیوں میں وضاحت کی۔ انیق نے میری ترجمانی کرتے ہوئے کہا۔ ”مالک! یہ کہہ رہا ہے کہ اس کی کیا مجال کہ آپ سے ناراض ہو۔ دراصل یہ کسی کام کی بات کر رہا ہے۔ ابھی مجھے بھی پوری طرح بات سمجھ میں نہیں آئی۔ میں ابھی تھوڑی دیر میں اس سے پوچھ کر بتاتا ہوں۔“

”تو ابھی پوچھ لو نا۔ میں تو پریشان ہو گیا ہوں۔ اگر کوئی تنخواہ کا یا پیسوں کا معاملہ ہے تو بھی مجھے بتاؤ بھئی۔“

انیق نے کہا۔ ”آپ دو منٹ یہاں بیٹھیں مالک۔ میں اس سے پوچھتا ہوں۔“

دین محمد حقہ لے کر ڈیرے کی چارپائی پر بیٹھ گئے۔ انیق مجھے لے کر اندر کمرے میں آ گیا۔ ”کیا چکر ہے شاہ زیب بھائی؟“ اس نے تیز سرگوشی میں پوچھا۔

”بس وہی بات جو تم سے کہی ہے۔ ہمیں یہاں سے جانا ہے۔ تم دین محمد صاحب سے کہو کہ قصبے سے فون آیا ہے۔ میرے والد اور چچا میں جھگڑا ہو گیا ہے۔ بات بڑھ گئی ہے، میں والد کو اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔ مجھے جانا پڑے گا اگر دو چار ہفتے میں معاملہ ٹھیک ہو گیا تو ہو سکتا ہے کہ پھر آ جاؤں۔“

”شاہ زیب بھائی... تاجور باجی سے کوئی اَن بن ہو گئی ہے؟“

”یار تفصیل میں نہ جاؤ، جو کہہ رہا ہوں، وہی کرو۔“ میں نے اٹل لہجے میں کہا۔ کچھ دیر بعد میں اور انیق باہر آئے۔ انیق نے سب کچھ دین محمد کے گوش گزار کر دیا۔ دونوں آپس میں کافی دیر باتیں کرتے رہے۔ آخر دین محمد صاحب نے افسردہ دلی کے ساتھ مجھے جانے کی اجازت دے دی لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ وہ میری کمی بے حد محسوس کریں گے اور میں نے جس طرح ان کی فیملی کی مدد کی ہے وہ اسے بھول نہیں سکتے۔ انہوں نے الفاظ اور اشاروں کنائیوں کے ذریعے مجھ سے کہا کہ وہ کوئی نیا ملازم ابھی نہیں رکھیں گے اور امید کریں گے کہ میرے حالات ٹھیک ہو جائیں اور میں ایک دو ہفتے میں واپس آ جاؤں۔

میں نے نیازمندی سے اثبات میں سر ہلایا۔ انہوں نے مجھے اور انیق کو آدھے مہینے کے بجائے پورے مہینے کی تنخواہ دینے کا کہا اور یہ بھی کہا کہ مجھے جب بھی جانا ہو راحیل، اسفند اور باقی گھر والوں سے مل کر جاؤں۔

رات کو میں نے انیق سے سامان وغیرہ باندھنے کا کہا۔ وہ بھی خاصا کنفیوز تھا۔ جیسے سمجھ نہ پا رہا ہو کہ میں نے ایکا ایکی بستر بوریا کیوں سمیٹنا شروع کر دیا ہے۔ حق نواز اور اس کی بیوی نذیراں بھی افسردہ سے تھے۔ انیق کچھ دیر گہری نظروں سے مجھے دیکھتا رہا پھر بولا۔ ”آپ نے پرانی انڈین فلم ”حقیقت“ دیکھی ہوئی ہے؟“

میں نے کہا۔ ”میرے اندر تیری طرح کوئی بڈھی روح نہیں گھسی ہوئی۔ اگر کبھی دیکھنی ہو تو نئی فلم دیکھتا ہوں۔“

وہ سنی ان سنی کرتے ہوئے بولا۔ ”اس میں ایک گانا ہے۔ میں یہ سوچ کر اس کے در سے اٹھا تھا... کہ وہ روک لے گی منا لے گی مجھ کو۔ ہواؤں میں لہراتا آتا تھا دامن... کہ دامن پکڑ کر بٹھا لے گی مجھ کو... قدم ایسے انداز میں اٹھ رہے تھے کہ آواز دے کر بلا لے گی مجھ کو۔ لیکن پتا ہے جی کہ ہوا کیا تھا؟“

”کیا ہوا تھا؟“ میں نے اپنی جیکٹ ٹرنک نما صندوق میں رکھتے ہوئے کہا۔

”نہ کسی نے لہراتا ہوا دامن پکڑا تھا، نہ آواز دی تھی،

نہ روکا تھا۔ وہ چلا ہی آیا تھا اور جناب عالی! جدا ہو گیا تھا کہیں ادھر بھی ایسا ہی نہ ہو۔"

اچانک کمرے کی عقبی کھڑکی پر بہت مدھم دستک ہوئی۔ میرا دل دھڑک اٹھا۔ انیق نے آگے بڑھ کر کھڑکی کھولی۔ سلاخوں کے دوسری طرف تاجور کا ہیولا نظر آیا۔ میرے سینے میں جیسے جلترنگ بج اٹھے۔ پاؤں سے سر تک ایک دلکش لہر سی دوڑ گئی۔ میں کھڑکی کے پاس پہنچا۔ انیق معاملہ فہمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے فوراً باہر چلا گیا۔ تاجور نے شال مضبوطی سے اپنے گرد لپیٹ رکھی تھی۔ دونوں سرکش لٹیں حسب معمول رخسار کو چھو رہی تھیں۔ اس کے عقب میں کچھ فاصلے پر درختوں کے نیچے ایک اور ہیولا نظر آیا۔ میں نے دور ہی سے پہچان لیا۔ یہ ملازمہ نوری تھی۔ وہ اس طرح کھڑی تھی کہ اگر گاؤں کی طرف سے کوئی شخص ڈیرے کی طرف آتا تو وہ فوراً دیکھ لیتی اور تاجور کو آگاہ کر دیتی۔ اس کا مطلب تھا کہ تاجور اسی مقصد سے اسے اپنے ساتھ لائی ہے۔ تاجور اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے کچھ دیر مجھے دیکھتی رہی پھر بولی۔ "میں نے سنا ہے، آپ جانے کی بات کر رہے ہیں؟"

"جانے کی بات نہیں کر رہا، میں صبح جا رہا ہوں۔ اب میرا جانا ہی بنتا ہے۔" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"اور انیق؟" اس نے پوچھا۔

"وہ بھی جا رہا ہے۔"

"ابا جی کہہ رہے تھے، کئی کام اٹکے ہوئے ہیں۔ آپ دونوں چلے گئے تو انہیں مشکل ہو جائے گی۔"

"بے روزگاری بہت ہے۔ ملازم ڈھونڈنا کون سا مشکل ہے۔ ایک ڈھونڈو تو ہم جیسے دس ملتے ہیں۔"

تاریکی میں جھینگر کی آواز دور تک پھیل رہی تھی۔ چند سیکنڈ خاموشی رہی۔

"اگر آپ جانا چاہتے ہیں تو ٹھیک ہے..." وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

شاید اس کا خیال تھا کہ میں اسے فقرہ مکمل کرنے کو کہوں گا لیکن میں بھی خاموش رہا۔ اسے خود ہی بولنا پڑا۔ "اسفند بھی ابھی پوری طرح ٹھیک نہیں۔ سویرے بھی آپ کا پوچھ رہا تھا۔"

"کوئی بات نہیں، ایک دو دن میں بہل جائے گا۔ بچہ ہے، بس توجہ مانگتا ہے۔" وہ جیسے لہو کا گھونٹ بھر کر رہ گئی۔

چند سیکنڈ ہم دونوں کے درمیان گمبھیر خاموشی رہی۔ وہ جیسے سب کچھ سمجھ رہی تھی۔ آخر ایک بار پھر طویل سانس لے کر بولی۔ "شاید، میں کل رات کچھ زیادہ بول گئی... سوری۔" اس کے بعد وہ تیزی سے واپس پلٹ گئی۔

"سوری۔" اس کا یہ لفظ جیسے میری سماعت سے نکل کر میرے پورے جسم میں اور اردگرد کی ساری فضا میں گونجنے لگا۔ اس ایک لفظ میں بہت کچھ تھا۔ میں نے اندھیرے میں اس کی پیشانی کے ساتھ جو "جسارت" کی تھی اس کی معافی بھی تھی۔ مجھ سے ابھی یہیں رہنے کی درخواست بھی تھی اور شاید کہیں بہت گہرائی میں، میری تھوڑی سی حوصلہ افزائی بھی تھی۔

میں ادھ کھلی کھڑکی سے اس کا دور جاتا ہیولا دیکھتا رہا۔ اس کے ہیولے کے ساتھ ساتھ جاتا دوسرا ہیولا نوری کا تھا۔ وہ جب تک اپنے گھر کے قریب نہیں پہنچ گئیں، میں نے ان پر نظریں جمائے رکھیں۔

چند منٹ بعد انیق بھی آن وارد ہوا۔ "ہاں جی، سامان باندھنا ہے یا کھولنا ہے؟"

میں نے مسکرا کر کہا۔ "فی الحال تو کھولنا ہی ہے..."

وہ بولا۔ "لگتا ہے کہ آپ نے سامان زیادہ کس کر باندھا ہی نہیں۔ آپ کو پہلے ہی یقین تھا کہ اسے کھولنا پڑے گا۔"

"ساری بات ہی یقین کی ہوتی ہے میاں..." انیق نے کہا۔ "یعنی یقینِ محکم، عملِ پیہم، محبت فاتحِ عالم۔"

پہلوان حشمت نے اندر داخل ہوتے ہوئے شعر مکمل کیا۔ "جہادِ زندگانی میں، یہ ہیں مردوں کی شمشیریں... واہ کیا خوب صورت شعر کہا ہے اپنے استاد مرزا غالب صاحب نے۔"

انیق اور میں نے ایک ساتھ ٹھنڈی سانس لی۔ کوشش کے باوجود انیق اپنی زبان کی کھجلی کو نہیں روک سکا، بولا۔ "حشمت بھائی، یہ حکیم الامت علامہ اقبال کا شعر ہے۔ مرزا غالب کا نہیں۔"

"اس بارے میں تمہاری معلومات ٹھیک ناہیں ہیں۔" پہلوان حشمت پورے وثوق سے بولا۔ "یہ شعر اصل میں غالب کا ہی ہے۔ انہوں نے علامہ اقبال کو درست کرنے کے لیے دیا تھا اور حضرت علامہ اقبال نے اسے اتنے اچھے طریقے سے درست کیا کہ مرزا غالب نے خوش ہو کر انہی کو دے دیا۔ بعد میں حضرت علامہ نے اس وزن پر ایک شاندار غزل لکھی۔ یہ سب کچھ میرے دادا حضور کی موجودگی میں ہوا تھا۔"

"حشمت بھائی! مرزا غالب تو 1867ء میں فوت ہو گئے۔ علامہ اقبال کوئی دس سال بعد پیدا ہوئے تھے۔ وہ مرزا غالب کے شعر کی اصلاح کس طرح کر سکتے ہیں۔ (اس بات پر پہلوان حشمت گڑبڑا گیا لیکن پھر جلد ہی سنبھل گیا)

"یہ عشق اور روحانیت کی باتیں ہیں۔ تمہاری سمجھ میں ناہیں آویں گی بچے! اور نہ ہی تمہیں ان سے کوئی فائدہ ہووے گا۔ وہ کیا کہتے ہیں۔ بندر کیا جانے... آنگن ٹیڑھا۔"

انیق بولا۔ "حشمت بھائی، کم از کم اس شعر کے بارے میں تو آپ کو ضرور غلط فہمی ہو رہی ہے۔"

"لگت ہے کہ تمہاری عقل گھاس چرنے کو چلی گئی ہے جو چشم دید گواہ کے پوتے کو غلط فہم کہہ رہے ہو۔ میں تمہیں اپنے دادا جی کے ہاتھ کا لکھا ہوا روزنامچہ دکھا سکت ہوں اور مجھے لگت ہے کہ تم پیدائش کی تاریخوں میں بھی گڑبڑی کر رہے ہو۔"

یہ بیکار بحث طول کھینچ سکتی تھی لیکن اسی دوران میں سولنگی سردی میں ٹھٹھرتا ہوا اندر آ گیا۔ اس نے انگیٹھی پر ہاتھ سینکے اور بولا۔ "پولیس کے بڑے افسر کے حکم پر عالمگیر، تحصیل دار نوانہ اور ان کے گرفتار ہونے والے ساتھیوں کو گوجرانوالہ پہنچا دیا گیا ہے۔ دراصل پولیس کو خطرہ تھا کہ سجاول سیالکوٹی کہیں کوئی گڑبڑ نہ کر دے۔"

"کیسی گڑبڑ؟" انیق نے پوچھا۔

"وہ ہلا بول کر عالمگیر کو چھڑانے کی کوشش کر سکتا تھا۔ ایک دفعہ پہلے بھی یہ لوگ اسی طرح اپنے دو ساتھیوں کو چوکی سے چھڑا کر لے گئے تھے۔ یہ تھانیدار سجاد جو ہم جیسے غریبوں کے لیے فرعون بنا ہوا ہے، منہ دیکھتا رہ گیا تھا۔"

پہلوان حشمت نے بیزار لہجے میں کہا۔ "چھوڑو یار، مجھے تو پورا پورا شک ہے یہ تھانیدار بھی اندر خانے سجاول سے یارانہ جوڑے ہوئے ہے۔ اب بڑے افسر آ گئے ہیں ہو سکت ہے کہ اس کا بھانڈا بھی پھوٹ جاوے۔"

سولنگی بولا۔ "بے شک عالمگیر کو یہاں سے لے گئے ہیں پھر بھی پنڈ میں لوگ ڈرے ہوئے ہیں۔ ان کو خطرہ ہے کہ باہر سے آنے والی پولیس واپس چلی گئی تو سجاول پنڈ والوں کو نقصان پہنچا سکتا ہے۔"

اگلے روز انیق نے میری طرف سے دین محمد صاحب سے بات کی اور انہیں بتایا کہ قصبے میں میرا مسئلہ کسی حد تک حل ہو گیا ہے۔ کچھ لوگوں نے میرے والد اور چچا کے درمیان صلح کرا دی ہے۔ اب میرا واپس جانا ضروری نہیں ہے۔ ہاں ہفتے کے روز میں ایک دو دن کے لیے جاؤں گا۔

یہ اطلاع دین محمد صاحب کے لیے کسی خوش خبری سے کم نہیں تھی۔ انہوں نے میری پیٹھ تھپکی اور بولے۔ "تم لوگ ملازم نہیں، میرے بیٹوں کی طرح ہو۔ کسی طرح کی ضرورت ہو تو مجھے بے جھجک بتایا کرو۔"

میں نے نیازمندی سے سر ہلایا۔

رات کو پھر میرے لیے گھر سے بلاوا آ گیا۔ حق نواز نے آ کر بتایا۔ "اسفند کو پھر ہلکا سا بخار ہے، ضد کر رہا ہے۔ تمہیں بلا رہا ہے۔ مالک نے کہا ہے کہ تم آ جاؤ۔"

اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ میں نے اسی وقت جیکٹ پہنی اور تاجور کے گھر پہنچ گیا۔ اسفند کی چارپائی آج بھی بیٹھک میں ہی رکھی تھی۔ وہ مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ دین محمد نے بیوی سے مخاطب ہو کر کہا۔ "لو بھی حمیدہ! دیکھو تمہارے پُتر کا آدھا بخار تو شاہ زیب کو دیکھ کر ہی اُتر گیا ہے۔"

"آجا پُتر بیٹھ جا، یہاں کرسی پر۔" تاجور کی والدہ حمیدہ بی بی نے کہا پھر میرے کندھے پر ہاتھ پھیر کر بولیں۔ "اس کو اپنا ہی گھر سمجھ۔ شرم وغیرہ نہ کیا کر۔"

دین محمد نے تاجور کو آواز دی۔ "تاجاں پُتر! گرم دودھ لے آ تھوڑا سا میٹھا ڈال کر۔"

دودھ شاید پہلے سے ہی گرم تھا۔ وہ پلیٹ میں گلاس رکھ کر اندر لے آئی اور پلیٹ میز پر رکھ دی۔ دین محمد اطلاع دینے والے انداز میں بولے۔ "تاجاں پتر! اب شاہ زیب واپس نہیں جا رہا۔ اس کے والد اور چاچے میں صلح صفائی ہو گئی ہے۔"

"یہ تو بڑی چنگی گل ہے ابا جی، پر اتنی جلدی لڑائی اور اتنی جلدی صلح؟"

"پُتر! دل صاف ہوں نا... تو پھر لڑائیاں اتنی لمبی نہیں ہوتیں۔"

"ہاں جی... دل تو واقعی صاف ہونے چاہئیں۔" تاجور نے ذرا معنی خیز انداز میں کہا اور باہر چلی گئی۔

اسفند اب اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ وہ دوا نہ کھانے کی ضد کر رہا تھا۔ میرے ہاتھ سے اس نے دوا بھی کھا لی پھر ہم لوڈو کھیلنے لگے۔ کاکا یعنی راحیل بھی ہمارے ساتھ شریک ہو گیا۔ تاجور گاہے بگاہے کمرے میں آتی رہی لیکن وہ ٹک کر ہمارے پاس نہیں بیٹھی۔ اس نے اوڑھنی بھی مضبوطی سے سر پر لپیٹ رکھی تھی۔

تاہم رات گئے اسفند کا بخار تیز ہو گیا۔ میں نے

اشاروں سے تاجور کو بتایا کہ وہ والدہ اور والد کو بتا کر خوامخواہ انہیں پریشان نہ کرے۔ والد سو گئے تھے اور والدہ لیٹی ہوئی تھیں۔ میں خود ہی اسفند کے ماتھے پر ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھتا رہا۔ میں نے اس کے سر کے زخم کی پٹی بھی خود ہی بدلی۔ زخم اب بہتر ہو رہا تھا۔ پٹی بدلنے میں تاجور نے بھی میری مدد کی۔

دو بجے کے قریب اسفند کا بخار اترنا شروع ہو گیا۔ تاجور نے اسے تھوڑا سا دلیا بھی کھلایا۔ وہ سو گیا۔ میں نے تاجور سے مخاطب ہو کر سرگوشی میں کہا۔ ”اب بخار جلدی اتر جاتا ہے، لگتا ہے ایک دو دن میں اسفند بالکل بھلا چنگا ہو جائے گا۔“

اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ دیا۔ یقیناً اسے دو دن پہلے والی بات یاد آگئی تھی جب اسفند نے والدہ کے سامنے کہنا شروع کر دیا تھا کہ میں بول سکتا ہوں۔

خطرات کے پیشِ نظر چاند گڑھی میں ٹھیکری پہرا دیا جا رہا تھا۔ پانچ چھ بندوں کی ایک ٹولی گاؤں میں گشت کرتی تھی۔ تین گھنٹے بعد ڈیوٹی بدل جاتی تھی۔ گشت والی ٹولی بیٹھ کر نگرانی کرتی تھی اور دوسری ٹولی گشت کرنے لگتی تھی۔ پہرے داروں کی آوازیں گاہے بگاہے تاریک فضا میں ابھرتی تھیں۔ کسی پاس والے گھر میں شاید کوئی عاشق مزاج شخص جاگ رہا تھا اور ٹیپ ریکارڈر پر میوزک سن رہا تھا۔ خاموش فضا میں ایک حسبِ حال گیت ابھر رہا تھا۔ نہ تم ہمیں جانو، نہ ہم تمہیں جانیں مگر لگتا ہے، کچھ ایسا، میرا ہمدم مل گیا ہے...

میں گاہے بگاہے کن انکھیوں سے اسے دیکھ لیتا تھا۔ بالوں کی دونوں لٹیں دلکش انداز میں بل کھا کر اس کے رخسار کو چوم رہی تھیں۔ لالٹین کی روشنی میں رخسار قندھاری انار کی طرح دہکتے نظر آتے تھے۔ قریب ہی راحیل کی ہوم ورک والی رف کاپی اور پین پڑا تھا۔ میں نے ایک خالی صفحے پر لکھا۔ ”پیار“ اور کاپی اس کی طرف کھسکا دی۔

اس نے دیکھا اور پیشانی پر ناگواری کی شکن ابھری۔ میرے لکھے ہوئے لفظ پر قلم پھیر کر اس نے کاپی میری طرف کھسکا دی۔

میں نے لکھا۔ ”میں اپنے پیار میں تم سے کبھی کچھ مانگوں گا نہیں، لیکن خاموش پیار کرتے رہنے کا حق تو مجھے ہے۔“

فقرہ پڑھ کر وہ کچھ دیر شدید تذبذب میں نظر آئی پھر اس نے لکھ دیا۔ ”نہیں۔“

میں نے پھر لکھا۔ ”چلو پیار نہ سہی۔ کوئی نرم گوشہ... کوئی تھوڑی بہت گنجائش تو میرے لیے دل میں ہے نا؟“

اس نے فقرہ پڑھا۔ پھر کاغذ کاپی سے علیحدہ کر کے پھاڑا اور انگیٹھی میں پھینک دیا۔ میرا خیال تھا کہ اب وہ اٹھ کر چلی جائے گی لیکن وہ اٹھ کر بھی نہیں گئی... ہاں عورت ایک پہیلی ہے۔ وہ یونہی بے وجہ اسفند کی دواؤں کا ڈاکٹری نسخہ پڑھنے لگی۔

میں بھی رومانی موڈ میں تھا۔ میں نے کاپی پر لکھا۔ ”پتا نہیں کیوں میرا دل گواہی دیتا ہے کہ تمہارے دل میں میرے لیے تھوڑی بہت گنجائش موجود ہے۔ ایک کام کرتے ہیں۔ اگر تم لکھ کر یا بول کر اقرار نہیں کرنا چاہتیں تو ایک اشارہ دو۔ تمہارے بالوں کی دو لٹیں تمہارے چہرے پر جھول رہی ہیں اگر تم انہیں ہاتھ سے ہٹا کر اپنے کان کے پیچھے اڑس لو گی تو میں سمجھوں گا کہ... ہاں تھوڑی بہت گنجائش موجود ہے۔“

فقرہ پڑھ کر اس نے پھر کاغذ پھاڑ کر انگیٹھی میں جھونک دیا۔ میں امید بھری نظروں سے تاجور کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ اٹھ کر باہر چلی گئی۔

سینے میں دھواں سا اکٹھا ہونے لگا۔ میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ وہ ایک مشکل لڑکی ہے۔ میں اس کے حوالے سے سخت مصیبت میں گرفتار ہونے والا ہوں۔ اس کی والدہ کی غنودگی بھری آواز ابھری۔ ”تا جاں! جاگ رہی ہے؟“

”ہاں ای۔“ کمرے سے اس کی آواز آئی۔

اسفند کا بخار اتر گیا ہے نا؟“

”ہاں ای، ٹھیک ہے اب، سویا ہوا ہے۔“

”میری کھانسی نہیں رک رہی، تھوڑی سی چائے بنا دے مجھے۔ شاہ زیب بھی پی لے گا۔“

”اچھا ای۔“ تاجور کی آواز ابھری۔ پھر کچن میں تھوڑی دیر برتن کھڑکھڑاتے رہے۔ آخر چائے کی خوشبو آئی۔ چائے کے ساتھ گھر میں بنے ہوئے خستہ نمک پارے بھی تھے۔ وہ دونوں چیزیں میز پر رکھ کر اور اسفند کی پیشانی ہاتھ سے چھو کر واپس چلی گئی۔ بالوں کی لٹیں بدستور اس کے چہرے پر جھول رہی تھیں۔ کام کاج کے دوران میں وہ جیسے انہیں بھول ہی جاتی تھی۔ مجھے بھی اس کشمکش میں لطف آ رہا تھا۔ میں نے چائے اور نمک پاروں کی طرف دیکھا بھی نہیں۔

کچھ دیر بعد اس نے اندر جھانکا۔ دونوں اشیا جوں کی

توں پڑی تھیں۔ میں واضح طور پر گم صم نظر آرہا تھا۔ پہلے تو یوں لگا کہ وہ بھی ناراضگی دکھائے گی لیکن پھر اس نے تحمل کا ثبوت دیا۔ میری طرف دیکھ کر ہولے سے مسکرائی اور بالوں کی لٹوں کو چہرے سے ہٹا کر کان کے پیچھے اڑس لیا۔ شرم کی سرخی نے اس کے چہرے کو ڈھانپا اور وہ تیزی سے پلٹ گئی مگر دو چار قدم چل کر ہی رک گئی۔ اسے خیال آگیا تھا کہ چائے تو ٹھنڈی ہو چکی ہے۔ وہ دوبارہ اندر آئی اور ٹھنڈی چائے والا کپ اٹھا لیا۔

''میں اور بنائی ہوں۔'' اس نے ہولے سے کہا۔

''تھینک یو۔'' میں نے بھی جذباتی سرگوشی کی۔ وہ نظریں ملائے بغیر باہر چلی گئی۔

دفعتاً گاؤں کے شمالی حصے سے فائرنگ کی زوردار آواز آئی۔ یہ آٹومیٹک رائفل کا برسٹ تھا۔ میرے اندازے کے مطابق ''اے کے 47'' تھی۔ یہ خطرے کی گھنٹی تھی۔ یہ تو طے ہوا تھا کہ ٹھیکری پہرے دار آدھی رات کے بعد دو تین دفعہ وقفے وقفے سے ہوائی فائر کریں گے لیکن یہ بھی طے تھا کہ یہ سنگل شاٹ ہوں گے۔ برسٹ کیوں چلایا گیا تھا؟ چند سیکنڈ بعد پھر برسٹ چلا، اس آواز نے تاجور کے گھر میں سب کو جگا دیا۔ تاجور کی والدہ حمیدہ بی بی بلند آواز میں آیت الکرسی پڑھنے لگیں، بچے بھی سہم گئے۔ تاجور کا رنگ اڑا ہوا تھا۔ میں نے اشاروں کنایوں میں کہا کہ میں باہر جا کر دیکھتا ہوں۔

''نہیں کوئی لوڑ نہیں۔'' دین محمد نے مجھے سختی سے منع کر دیا اور دروازے کی کنڈیاں چیک کرنے لگے۔

لوہے کا یہ دروازہ انہوں نے شاید کل ہی لگوایا تھا، اس سے پہلے گھر کا داخلی دروازہ لکڑی کا تھا۔

دو برسٹ چلنے کے بعد فائرنگ تھم گئی۔ دین محمد کے اڑوس پڑوس والوں نے اب ان کا بائیکاٹ ختم کر دیا تھا اور بات چیت بحال ہو گئی تھی۔ ساتھ والے پڑوسی کی آواز آئی تو دین محمد نے بلند آواز میں پوچھا۔ ''کیا ہوا ہے بشیر محمد؟''

بشیر محمد نے بھی پکار کر کہا۔ ''اللہ نے خیر کی ہے بھائی جی۔ کوئی ایسی ڈر والی گل نہیں۔ کوئی مشکوک بندہ تھا۔ فائرنگ کے بعد بھاگ گیا ہے۔ تین چار لڑکے اس کے پیچھے گئے ہیں۔''

میں اور دین محمد بھی دروازے کی طرف بڑھے۔ میری نگاہیں ایک لمحے کے لیے تاجور کی نگاہوں سے ٹکرائیں۔ وہ جیسے خاموشی کی زبان میں التجا کر رہی تھی کہ میں گھر سے باہر نہ جاؤں، وہ میری موجودگی میں خود کو اور باقی گھر والوں کو بہت محفوظ خیال کر رہی ہے۔

میں جاتے جاتے رک گیا۔ دین محمد چلے گئے۔ لگتا تھا کہ گاؤں کے اکثر گھروں میں لوگ جاگ گئے ہیں اور صورتِ حال جاننے کے لیے باہر آ گئے ہیں۔ درحقیقت گاؤں کے باسی اس شدید نفسیاتی خوف میں مبتلا ہو چکے تھے کہ سجاول سیالکوٹی چاند گڑھی پر ایک اور شدید حملہ کرے گا اور اس مرتبہ شاید لاشیں بھی گریں گی... ٹوانے تو مریں گے ہی ممکن ہے کہ عام لوگ بھی اس رگڑے میں آ جائیں۔

پندرہ بیس منٹ بعد دین محمد واپس آئے۔ انہوں نے بتایا کہ بندہ تو بھاگ گیا ہے، پر اس کی گھوڑی درختوں میں بندھی ہوئی مل گئی ہے۔

انہوں نے کہا۔ ''اس نسل کی گھوڑیاں سجاول کے ساتھیوں کے پاس ہیں۔ ظاہر تو یہی ہوتا ہے کہ یہ سجاول کا بندہ تھا۔ شاید پنڈ کی سُن گُن لینے کے لیے یہاں پہنچا تھا۔''

چاند گڑھی میں وہ رات کافی بے چینی سے گزری۔ شہر سے آنے والی پولیس واپس جا چکی تھی اور اب گاؤں کے لوگ خود کو عدم تحفظ کا شکار محسوس کر رہے تھے۔ کچھ گھر ایسے تھے جو زیادہ پریشانی کا شکار تھے اور ان میں دین محمد کا گھر بھی تھا۔ اسحاق عرف ساقا، عالمگیر کے خاص چمچوں میں سے تھا اور ساقے کو تاجور کا رشتہ نہ ملنے کی سخت رنجش تھی۔ سجاول کے غیظ و غضب کا رخ دین محمد کے گھر کی طرف بھی ہو سکتا تھا اور دین محمد کے گھر میں وہ ہستی بھی تھی جس کی حفاظت کے لیے میں جان لڑا سکتا تھا۔ یہاں کے لوگ مجھے جانتے نہیں تھے، نہ اچھے جانتے تھے، نہ بُرے جانتے تھے اور میری خواہش تھی کہ وہ مجھے نہ ہی جانیں، میرا دوسرا روپ اس روپ سے بہت مختلف تھا۔ میں جب اس روپ کے بارے میں سوچتا تھا تو میرے ذہن میں جھماکے سے ہوتے تھے۔ خون اچھلتا تھا، دھماکے ہوتے تھے، لاشیں گرتی تھیں۔ میں نے اپنے ہاتھوں سے قتل کیا تھا۔ ایک دو افراد کو نہیں، آٹھ دس افراد کو بھی نہیں۔ ان کی تعداد درجنوں میں تھی۔ میں نے اس زندگی کو خیرآباد کہا تھا۔ ایک نئی زندگی شروع کی تھی اور میں چاہتا تھا کہ میری اس نئی زندگی میں پرانی زندگی کی جھلکیاں نظر نہ آئیں۔ اب تک میں بس ایک بار اپنے ارادے میں کچھ ناکام ہوا تھا جب میں نے فائزہ اور چچی کے قاتل کو ٹرک کے نیچے کچلا تھا۔ اس کے بعد اب تک خیریت ہی گزر رہی تھی۔

''صبح ایک پُرتکلف ناشتے نے استقبال کیا۔ دیسی گھی کے پراٹھے، انڈوں کا آملیٹ، دہی کی گاڑھی میٹھی لسی اور

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں؟ ۔

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بُک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابنِ صفی کی مکمل رینج
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو پیسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بُک کا ڈائریکٹ اور رژیوم ایبل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بُک کا پرنٹ پریویو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کُتب کی مکمل رینج
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

**We Are Anti Waiting WebSite**

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

⇦ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

⇦ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

Online Library For Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety

twitter.com/paksociety1

بادام کا حلوہ۔ میں نے اسفند کو اپنے ہاتھ سے لقمے دیے۔ وہ بہت خوش تھا۔ پانی کی موٹر پھر خراب تھی، وہ میں نے ٹھیک کر دی۔ ایک استری ٹھیک کی۔ لوہے کے نئے دروازے کو بند کرنے میں مشکل پیش آتی تھی۔ اسے بھی فکس کیا۔ مجھے لگا کہ میں دین محمد صاحب اور ان کے گھر والوں کی ضرورت بنتا جا رہا ہوں۔ یہ میرے لیے بڑی خوش آئند بات تھی۔

سارا دن عجیب سی ترنگ میں گزرا۔ میں نے خود کو کسی کھلنڈرے لڑکے کی طرح محسوس کیا۔ جی چاہا ہوا میں چھلانگیں لگاؤں۔ اپنے دونوں بازو پھیلاؤں اور کھیتوں کھلیانوں کے درمیان بھاگتا چلا جاؤں۔ پھر کسی ویران جگہ پہنچ کر کھڑا ہو جاؤں۔ اپنا چہرہ شفاف نیلے آسمان کی طرف اٹھاؤں اور پکار کر کہوں۔ ”تیرا شکریہ یارب، مجھے وہ مل گیا جو میں نے چاہا تھا۔ میں نے اسے پالیا، جسے ان گنت زمانوں سے ڈھونڈ رہا تھا۔ وہ مجھے مل گئی ہے اور اس کے دل میں میرے لیے گنجائش بھی موجود ہے۔ تیری کرم نوازی شاملِ حال رہی تو میں گنجائش کو محبت میں بدل دوں گا میرے مالک...

زندگی میں پہلی بار مجھے خدا کے وجود کا احساس اتنی شدت سے ہوا اور اس سے مانگنے کو بھی اتنی شدت سے دل چاہا۔ رات ہوئی تو میں نے ایک فیصلہ کیا۔ میں اپنی تاجور کو اور اس کے گاؤں کو ڈکیت سجاول کے خوف سے آزاد کر دوں گا جس طرح عالمگیر اور اسحاق وغیرہ کے جبر کے سائے اس کے سر پر سے ہٹے ہیں، سجاول کا سایہ بھی سمٹ جائے گا... ناپید ہو جائے گا۔

میں وہ ٹھکانا اچھی طرح دیکھ چکا تھا جہاں چند دن پہلے سجاول اور عالمگیر نے رقص و سرور کی بے ہودہ محفل جمائی تھی۔ میں نے رات کا کھانا کھانے کے بعد انیق سے کہا۔

”آج پھر ایک مہم پر نکل رہا ہوں۔“

”کس مہم پر؟“ انیق نے چونک کر پوچھا۔

”اس ٹھکانے کی طرف جہاں میں نے سجاول اور عالمگیر کو دیکھا تھا۔“

”آپ کا کیا خیال ہے، وہ اب بھی وہاں محفل جما کر بیٹھے ہوں گے اور آپ کا یا پولیس کا انتظار کر رہے ہوں گے؟“

”لیکن کوئی چانس تو بن سکتا ہے نا، ہو سکتا ہے کوئی کھوج کھرا مل جائے۔“

”میرا خیال ہے کہ میرا کچھ کہنا سننا فضول ہے، آپ پکا ارادہ کر چکے ہیں۔ لیکن ایک بات میری بھی مان لیں۔ اس خاکسار کو بھی ساتھ لے چلیں۔ کبھی کبھی کھوٹا سکہ بھی کام آ جاتا ہے۔“

”تم کھوٹے نہیں ہو، اس لیے تو سنبھال کر رکھ رہا ہوں، کہیں ضائع نہ ہو جاؤ۔“

وہ اصرار کرنے لگا کہ ساتھ جائے گا۔ میں چونکہ اپنے پوشیدہ روپ میں نکلنا چاہتا تھا، اس لیے انیق کی بات نہیں مانی۔ میں نے پتلون نکالی، ڈھاٹا نکالا، جیکٹ الٹ کر پہنی اور دیگر تیاری کر کے جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ یہ وہی روپ تھا جس میں مقامی لوگ مجھے یاسر سمجھنے لگے تھے۔ حق نواز کے بھائی کی کھٹارا موٹر سائیکل آج پھر میری ہمسفر بننے والی تھی۔ اسپائی کیمرا، ڈکٹا فون، بے ہوشی کا اسپرے اور اس طرح کی دیگر اشیا میری جیکٹ کی اندرونی جیب میں یوں سما جاتی تھیں کہ آسانی سے ان کا کھوج نہیں لگایا جا سکتا تھا۔

گیارہ بجے کے لگ بھگ جب ٹھیکری پہرے والے گاؤں کی دوسری جانب تھے میں موٹر سائیکل اسٹارٹ کر کے نکل کھڑا ہوا۔ سرد رات میں اونچے نیچے راستوں پر موٹر سائیکل کا سفر آسان کام نہیں ہوتا، پھر جب یہ خطرہ بھی ہو کہ کسی بھی وقت کسی نادیدہ دشمن سے ملاقات ہو سکتی ہے تو صورتِ حال اور گمبھیر ہو جاتی ہے۔ قریباً ایک گھنٹے کے سفر کے بعد میں ڈیرے کے قرب و جوار میں پہنچ گیا۔ اس مرتبہ میں نے موٹر سائیکل کافی فاصلے پر ہی روک دی اور اسے درختوں کے جھنڈ میں چھپا کر پیدل آگے بڑھا۔ میری جیکٹ کی جیب میں اعشاریہ 38 کا تسلی بخش بوجھ موجود تھا۔ ہر قسم کے حالات سے نمٹنے کے لیے میری حسیات پوری طرح بیدار تھیں۔

انیق کی بات کی بازگشت میرے کانوں میں گونجی۔ اس نے کہا تھا۔ ”یہ ہو سکتا ہے جی کہ سجاول اور اس کے ساتھی اس ڈیرے پر تو نہ ہوں لیکن ان کے ایک دو بندے چھپ کر ڈیرے کی نگرانی کر رہے ہوں۔ انہیں توقع ہو کہ ان کی تصویریں کھینچنے والا پھر وہاں پہنچے گا اور کیا پتا پولیس نے بھی سادہ کپڑوں میں اپنا کوئی مخبر وہاں چھوڑ رکھا ہو۔“

انیق کی کہی ہوئی بات میں وزن تھا۔ اسی لیے میں ضرورت سے زیادہ محتاط بھی تھا لیکن اگلے آدھے گھنٹے میں میرے یہ سارے اندازے غلط ثابت ہو گئے۔ یہ ٹھکانا بالکل خالی تھا، ارد گرد بھی کسی کے آثار نہیں تھے۔ عین ممکن تھا کہ پولیس والوں نے دو چار روز اس جگہ کی نگرانی کی ہو لیکن اب اس ٹھٹھرے ہوئے ویرانے میں ان کا بھی کوئی

وجود نہیں تھا۔ میرے پاس پنسل ٹارچ موجود تھی لیکن میں نے وہ بھی روشن نہیں کی۔ میں نے وہ جگہ دیکھی جہاں چند روز پہلے رقص و سرور کی محفل برپا تھی۔ وہاں اب بھی شراب کے ٹوٹے ہوئے گلاس، چھوڑی ہوئی ہڈیاں اور مرجھائے ہوئے گجرے پڑے تھے۔ آدم نہ آدم زاد۔ میرے کانوں میں اس شب کی بدمست آوازیں گونجنے لگیں۔ گھنگروؤں کی جھنکار، شیشے کی کھنا کھن، سرشار قہقہے... اور رات بھر جام سے جام ٹکرائے گا۔ جب نشہ چھائے گا، تب مزہ آئے گا۔ نشہ چھا گیا تھا اور ''مزہ'' بھی آگیا تھا۔ مزہ لینے والے جسمانی ریمانڈ پر تھے اور یہاں بس تاریکی تھی اور جھینگروں کی آواز تھی۔ میں اس جگہ کے خستہ حال کمروں میں گھومنے لگا۔ عقبی سمت میں احاطہ تھا اور آگے کھلی جگہ تھی۔ یہاں گھنی جھاڑیاں تھیں اور مٹی کے چھوٹے چھوٹے ٹیلے بھی تھے۔ اچانک ایک مدھم سی آواز سنائی دی۔ پہلے تو لگا کہ شاید میرے کان بجے ہیں مگر جب دوسری بار آواز ابھری تو میں چوکنا ہوگیا۔

یہ کسی عورت کے کھانسنے کی بہت دھیمی سی آواز تھی۔ میرے چہرے پر ڈھاٹا تھا۔ میں نے پستول نکال کر ہاتھ میں لے لیا اور محتاط قدموں سے آواز کی طرف بڑھا۔ آواز ایک جھاڑی کے عقب سے ابھری تھی۔ بلکہ یہ جھاڑی بھی نہیں تھی، بس جھاڑ جھنکاڑ ہی تھا۔ یہاں کوئی چھپ تو نہیں سکتا تھا مگر جب ذرا دھیان سے دیکھا تو پتا چلا کہ کچے ٹیلے کے اندر یہ ایک کھوہ سی ہے۔ ویران ٹیلوں میں ایسے قدرتی خلا اکثر موجود ہوتے ہیں۔ یہ آواز بھی اسی خلا کے اندر سے ابھری تھی۔ میں جھاڑ جھنکاڑ میں سے گزر کر اس چھوٹی سی کھوہ کے دہانے پر پہنچا۔

''کون ہے؟'' میں نے سرسراتی آواز میں پوچھا۔ آواز زیادہ بلند نہیں تھی۔

اندر سے کوئی جواب نہیں آیا۔ ''تم جو کوئی بھی ہو، باہر آجاؤ۔ میرے ہاتھ میں پستول ہے، کوئی ایسی ویسی حرکت کی تو تمہارا نقصان ہوجائے گا۔''

جواب میں پھر خاموشی طاری رہی۔ بس جھینگروں کی آوازیں تھیں۔

میں نے خطرہ مول لیتے ہوئے پنسل ٹارچ روشن کی اور پستول کے ٹریگر پر انگلی رکھ کر اندر داخل ہوگیا۔ اندر داخل ہونے کے لیے مجھے گھٹنوں اور کہنیوں کے بل چلنا پڑا۔ یکایک پنسل ٹارچ کی روشنی کسی عورت کے ننگے پاؤں پر پڑی۔ میں نے ٹارچ کو حرکت دی اور ایک سکڑی سمٹی لڑکی نظر آئی۔

اس نے اپنے دونوں ہاتھ جوڑے اور گھگیائی۔ ''مجھے کچھ نہ کہنا۔ خدا کے لیے مجھ پر رحم کرو۔''

میں اس کی صورت دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ یہ وہی ماڈل گرل جاناں تھی جسے میں نے چند روز پہلے سامنے والے کھنڈر گھر میں رقص کرتے دیکھا تھا۔ اس سے پہلے جاناں سے میری ملاقات لاہور میں پلپلے جسم والے پاشا کی عالی شان کوٹھی میں ہوئی تھی۔ وہاں بھی یہ بے چاری بہ حالت مجبوری پاشا کا بیڈ روم آباد کررہی تھی۔

میرا چہرہ ڈھاٹے میں چھپا ہوا تھا۔ کوئی سوال ہی نہیں تھا کہ وہ مجھے پہچان سکتی، میری آواز کے ساتھ بھی اس کی جان پہچان معمولی سی تھی۔

میرے ہاتھ میں پستول دیکھ کر اس کی خوب صورت آنکھوں کی دہشت میں اضافہ ہوا۔ وہ یقیناً مجھے سجاول سیالکوٹی کا کوئی ساتھی ہی سمجھ رہی تھی۔ اس نے ہاتھ اب تک جوڑ رکھے تھے۔ ملتجی لہجے میں بولی۔ ''م... میرا کوئی قصور نہیں۔ جو کچھ ہوا، اس کی وجہ سے ہوا... وہ... اپنے ہوش میں ہی نہیں تھا۔''

مجھ سے ڈر کر وہ پہلو کے بل گر گئی تھی اور گٹھڑی کی طرح بالکل ایک گوشے میں سمٹ گئی تھی

''سیدھی ہوکر بیٹھو۔'' میں نے ذرا تحکم سے کہا۔

وہ لرز کر سیدھی ہوگئی۔ ''تت... تم جو کہو گے، میں مانوں گی... اس کو پیچھے ہٹالو۔'' اس کا اشارہ میرے پستول کی طرف تھا۔

میں نے پستول کی نال نیچے جھکانے سے پہلے احتیاط سے دیکھا، اس کے پاس کوئی ہتھیار یا آلہ نہیں تھا۔ کھوہ میں کسی دوسرے شخص کے آثار بھی نہیں تھے۔ میں نے ٹریگر پر سے انگلی ہٹالی اور بیرل نیچے جھکالیا۔

''تم نے کیا سمجھا تھا، اس طرح بچی رہو گی۔'' میں نے اندھیرے میں تیر چلایا۔

''م... میں کیا کرتی۔ وہ بالکل ہوش میں نہیں تھا۔ م... مجھے لگ رہا تھا میرا دل رک جائے گا۔ وہ مجھے مار بھی رہا تھا۔ میں نے خود کو بچانے کے لیے اس کے سر پر بوتل ماری...''

جاناں کی باتوں سے میرے اندازے کی تصدیق ہوئی۔ یہ سب کچھ اسی رات ہوا تھا جب یہاں رقص و سرود اور شباب و کباب کی محفل جمی تھی۔ یہاں کل تین لڑکیاں تھیں اور یہ محفل کے اہم شرکاء کی رات کو رنگین کرنے کے لیے

تھیں۔ ان شرکاء میں سے کوئی ایک شخص زیادہ ہی مدہوش تھا۔ پہلے سے تھکی ماندی جاناں کی برداشت جواب دے گئی اور اس نے اس مدہوش شخص کو وہسکی کی بڑی بوتل مار کر زخمی کر دیا۔ اس کے بعد وہ بھاگ نکلی اور یہاں چھپ گئی۔

میں نے ٹارچ کی روشنی میں جاناں کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔ وہ بے بس و بدحالی کی تصویر نظر آئی تھی۔ اس نے ٹراؤزر پہن رکھا تھا۔ بالائی جسم ایک شال سے چھپا ہوا تھا۔ اس کے چہرے اور ہاتھوں پر اس وحشت کے نشان تھے جو اس منحوس رات میں ان بدمعاشوں نے اس لڑکی کے ساتھ روا رکھی تھی۔

میں نے جاناں سے کہا۔ ''بڑی کڑک لڑکی ہو تم، آٹھ دن ہو گئے ہیں، اور تم نے خود کو یہاں چھپا رکھا ہے، کھاتی پیتی کیا رہی ہو؟''

''میں وہاں کمروں میں گئی تھی۔ کچھ سوکھے ہوئے نان ملے تھے اور تھوڑا سا پانی۔ نانوں کے ٹکڑے پانی میں بھگو بھگو کر کھاتی رہی ہوں۔''

میں نے ٹارچ کے روشن دائرے کو حرکت دی۔ ایک گوشے میں اسٹیل کا ایک جگ پڑا تھا۔ پاس ہی ایک شاپر میں سوکھے ہوئے نان کے ٹکڑے تھے۔

''پولیس والے بھی تو پھرتے رہے ہیں یہاں، انہوں نے بھی تمہیں نہیں دیکھا؟''

وہ پہلو بدل کر بولی۔ ''شروع کے دو تین دنوں میں، میں نے گاڑیوں کی آوازیں سنی تھیں۔ ایک دو بار پولیس کی گاڑی والا سائرن بھی سنائی دیا تھا مگر اس طرف تو کوئی نہیں آیا۔''

''تم نے یہ نہیں سوچا کہ باہر نکل کر پولیس کی مدد مانگو؟''

''مجھے ٹھیک سے پتا نہیں تھا کہ یہ پولیس والے ہی ہیں یا کوئی اور ہے۔ پھر پولیس والوں میں بھی تو اچھے برے ہیں...'' وہ کہتے کہتے چپ ہو گئی۔ ہو سکتا ہے کہ اسے لاہور کے واقعات یاد آ گئے ہوں۔ جب وہ اپنے ایک ''گاہک'' کے ساتھ تھی اور پکڑی گئی تھی پھر قیصر چودھری جیسے بے لگام انسپکٹر نے اسے ایسا پھنسایا تھا کہ وہ بلا معاوضہ پاشا جیسے بندے کی رکھیل بننے پر مجبور ہو گئی تھی اور اب یقیناً پاشا کے ذریعے ہی دربدر ہوتی پھر رہی تھی۔

''تو کیا، اب تمہارا ارادہ مستقل طور پر یہیں رہنے کا تھا؟'' میں نے ذرا چبھتے ہوئے لہجے میں اس سے پوچھا۔

''نن... نہیں... میں اب یہاں سے نکلنا چاہتی تھی لیکن سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کروں۔ میں بہت تھک گئی ہوں... بہت تھک گئی ہوں۔ میں اب اپنے گھر جانا چاہتی ہوں۔ میری مدد کرو... پلیز میری مدد کرو۔'' وہ سسکیاں لینے لگی۔

مجھے اس پر بے تحاشا ترس آیا۔ وہ اپنی شال کو بار بار مضبوطی سے اپنے جسم کے گرد لپیٹتی تھی۔ جیسے میرے اور اپنے درمیان ایک دیوار کھڑی کرنا چاہ رہی ہو لیکن ایسی ''دیواریں'' بے بس عورتوں کا ساتھ کب دیتی ہیں۔ جلد ہی مجھے یہ اندازہ بھی ہو گیا کہ اس بے چاری کے بالائی جسم پر اس شال کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے۔ کپڑے کا ایک تار بھی نہیں اور وہ سخت سرد راتوں میں اسی ایک شال کے ساتھ... اور پانی میں نان بھگو بھگو کر زندہ رہنے کی کوشش کرتی رہی تھی۔ میرا دل چاہا، اس اجڑی پجڑی لڑکی کو پکڑوں اور لاہور جا کر اسے سیدھا کسی ٹی وی چینل پر لے جاؤں۔ اپنے ملک کی ہزارہا نوجوان لڑکیوں کو اس ''جاناں'' کی کہانی سناؤں۔ انہیں بتاؤں کہ ''شوبز'' میں نام کمانے کے شوق میں جو لڑکیاں گھروں سے نکلتی ہیں اور بے مہار ہوتی ہیں، وہ کبھی کبھی کس انجام کو پہنچتی ہیں۔

جاناں مجھے کافی کچھ بتا رہی تھی لیکن کافی کچھ چھپا بھی رہی تھی۔ ظاہر ہے کہ وہ مجھے ابھی تک ڈکیت سجاول کا ساتھی ہی سمجھ رہی تھی۔ میں نے اس کا خوف دور کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں نے اپنا پستول لاک کر کے جیکٹ کی جیب میں رکھ لیا۔ اس کے بعد میں نے اپنی جیکٹ اتاری اور قمیص بھی اتارنے لگا۔ جاناں کی آنکھوں میں خوف کچھ اور بڑھ گیا۔

میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''لگتا ہے کہ تم نے شال کے سوا اور کچھ نہیں پہنا ہوا۔ کم از کم یہ قمیص اور بنیان پہن لو۔ میں دو منٹ کے لیے باہر چلا جاتا ہوں۔''

وہ حیرت سے میری طرف دیکھنے لگی۔ یقیناً یہاں لانے والے کسی بھی شخص نے اسے کچھ پہننے کے لیے نہیں کہا ہو گا۔ ہر ایک نے اس کے برعکس ہی بات کی ہو گی۔

قمیص اور بنیان اسے دے کر میں باہر نکل گیا۔ ٹارچ بھی میں نے اندر ہی چھوڑ دی تھی۔ دو تین منٹ بعد واپس آیا تو وہ میری ہدایت پر عمل کر چکی تھی۔

میں نے کہا۔ ''تمہارے لیے ایک اچھی خبر ہے جاناں! میرا تعلق سجاول وغیرہ سے نہیں، سمجھو کہ میں ایک قریبی آبادی سے آیا ہوں۔''

پہلے تو اسے بھروسا نہیں ہوا لیکن جب میں نے اپنی بات اصرار کے ساتھ کہی تو وہ کچھ سوچنے پر مجبور ہو گئی بولی۔

’’تم پڑھے لکھے لگتے ہو۔ تمہاری بول چال سے مجھے کچھ شک تو ہو رہا تھا لیکن... تمہارا حلیہ؟ اور یہ پگڑی جس میں تم نے منہ چھپایا ہوا ہے؟‘‘

’’سمجھو کہ سجاول اور اس کے ساتھیوں کی طرح میری بھی یہ مجبوری ہے...‘‘

’’کیا تم... میری مدد کر سکتے ہو؟‘‘ وہ آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی۔

’’ہاں، لیکن اس صورت میں جب تم مجھے اپنے اور سجاول وغیرہ کے بارے میں سب کچھ بتاؤ۔‘‘

’’کیا بتاؤں؟‘‘ وہ روہانسی آواز میں بولی۔

’’تمہیں یہاں لانے والا کون تھا؟‘‘

’’اس کا نام پاشا ہے۔ وہ لاہور میں رہتا ہے۔ بڑا بااثر بندہ ہے۔ اس کی پہنچ اوپر تک ہے۔ میں ایک معاملے میں پھنس کر اس کے پاس چلی گئی تھی۔ اب اس کے پاس رہتی ہوں۔ وہ مجھے اپنے دوستوں اور جاننے والوں کے پاس بھی بھیجتا رہتا ہے... اب اس نے دو دوسری لڑکیوں کے ساتھ مجھے یہاں بھیجا تھا۔‘‘

جاناں نے اپنی رام کہانی کے اکثر حصے مجھے صاف صاف سنا دیے۔ بہرحال کئی باتیں وہ چھپا بھی گئی۔ مثلاً پاشا کے اصل پشت پناہ شکیل داراب کا نام وغیرہ۔

میں نے کہا۔ ’’جشن کی رات میں نے یہاں درختوں میں ایک مرسیڈیز گاڑی کھڑی دیکھی تھی سفید رنگ کی... وہ کس کی تھی؟‘‘

وہ ذرا جھجک کر بولی۔ ’’مجھے ٹھیک سے اس کا نام معلوم نہیں۔ وہ لاہور کا ایک مالدار زمیندار ہے۔ اسے ’’لالہ‘‘ بھی کہتے ہیں۔‘‘

’’لالہ وریام تو نہیں۔‘‘ میں نے پوچھا۔

’’ہاں... شاید یہی ہے۔‘‘

’’کیا اس جشن کی رات وہ بھی یہاں تھا؟‘‘

’’ہاں وہ آیا تھا لیکن پینے پلانے سے اس کی طبیعت کچھ خراب ہو گئی تھی۔ اس لیے وہ سونے چلا گیا تھا۔‘‘

میں نے کہا۔ ’’میں نے اخبار میں ایک خبر پڑھی تھی۔ یہ لالہ وریام وہی تو نہیں جس کا ایک بڑا بھائی لالہ نظام ٹریفک کے ایک حادثے میں مارا گیا تھا۔ ایک بھاری ٹرک نے اس کی مرسیڈیز کا کچومر نکال دیا تھا؟‘‘

’’ہاں... ہاں... یہ بات میں نے بھی سنی ہے۔‘‘

اس رات یہاں درختوں میں دیکھی ہوئی مرسیڈیز گاڑی پھر میری نگاہوں میں گھومنے لگی۔ یہ ہو بہو وہی گاڑی تھی اور مجھے تو لگتا تھا کہ اس کا نمبر بھی وہی ہے، یہ ایک معما سا لگتا تھا۔ ایسی تباہ حال گاڑیوں کو تو اسکریپ والے ہی قبول کرتے ہیں پھر وہ گاڑی یہاں صحیح سالم حالت میں کیسے موجود تھی؟

مجھے خاموش دیکھ کر وہ بولی۔ ’’میں نے تمہیں اپنے بارے میں اتنا کچھ بتایا ہے لیکن تم نے ابھی نام تک نہیں بتایا۔‘‘

میں نے کہا۔ ’’نام میں کچھ نہیں رکھا ہوتا۔ اصل چیز تو کام ہوتا ہے اور مجھے امید ہے کہ میرا کام تمہیں پسند آئے گا۔ میں تمہیں حفاظت کے ساتھ یہاں سے نکالوں گا اور محفوظ ٹھکانے تک پہنچاؤں گا۔‘‘

’’پھر بھی... مجھے... نام کا تو پتا ہونا چاہیے۔‘‘

پتا نہیں کہ میرے دل میں کیا آئی۔ میں نے کہا۔ ’’تم مجھے یاسر کہہ سکتی ہو۔‘‘

’’یاسر؟‘‘ اس نے چونکے لہجے میں کہا۔

’’ہاں یاسر، لیکن تم حیران کیوں ہوئی ہو؟‘‘

اس کے چہرے پر ہلچل کے آثار تھے۔ وہ مجھے سر تا پا دیکھ رہی تھی اور اس کے ہونٹ بے ساختہ لرز رہے تھے۔ وہ ہکلائی۔ ’’تم وہی ہو جسے علاقے کے لوگ یاسر بھائی کہتے ہیں... اور... تم نے پچھلے ہفتے یہاں سجاول اور اس کے ساتھیوں کی تصویریں وغیرہ بھی اتاری تھیں؟‘‘

’’ہاں میں وہی ہوں۔ لیکن... یہ تصویروں کی بات تم کیوں کر رہی ہو۔ کس نے بتایا ہے تمہیں؟‘‘

’’انہی لوگوں سے پتا چلا ہے۔ تم نے ان کی تصویریں کھینچیں، ویڈیو بنائی... اور ان تصویروں اور ویڈیوز کی وجہ سے سجاول سیالکوٹی کے کسی دوست کو بہت نقصان پہنچا۔ وہ ایک جھگڑے میں ملوث ہو کر گرفتار ہو چکا ہے۔ کیا یہ سب صحیح ہے؟‘‘

’’پہلے تم مجھے یہ بتاؤ کہ تمہیں یہ سب پتا کیسے چلا؟‘‘

’’میں نے تم سے جھوٹ بولا تھا کہ یہاں چھپنے کے بعد میں نے ڈکیت سجاول کے کسی ساتھی کو نہیں دیکھا۔ کل رات وہ اس کھوہ کے باہر گھوم رہے تھے۔ اتنے قریب تھے کہ میں ان کی رائفلوں کی کھڑ کھڑ بھی سن سکتی تھی۔ قدرت نے مجھ پر خاص الخاص مہربانی کی ہے کہ میں کل رات ان کے ہتھے نہیں چڑھی۔ ورنہ پتا نہیں میرا کیا حشر ہوتا۔ وہ تین یا چار بندے تھے اور مجھے لگتا ہے کہ مجھے ڈھونڈنا بھی ان کے پروگرام میں شامل تھا۔ ویسے وہ اپنا کچھ اسلحہ لینے آئے تھے جو انہوں نے یہیں کہیں جھاڑیوں میں دبایا ہوا تھا پلاسٹک

وغیرہ لپیٹ کر۔"

"انہوں نے اس کھوہ کے اندر نہیں جھانکا؟" میں نے جاناں سے پوچھا۔

"اسی لیے تو کہتی ہوں کہ مجھ گناہ گار کی کوئی چھوٹی موٹی نیکی کام آئی ہے۔ وہ کھوہ کے اندر آئے۔ ان میں سے ایک بندے نے ٹارچ بھی گھمائی۔ پتا نہیں میں کس طرح روشنی میں آنے سے بچ گئی۔ کھوہ کے اندر آنے والا نشے میں جھومتا ہوا باہر چلا گیا۔ وہ لوگ یہاں پاس ہی درختوں کے نیچے آگ جلا کر بیٹھ گئے۔ وہ پیتے رہے اور باتیں کرتے رہے۔ ان کی باتوں سے ہی مجھے تمہارے نام کا پتا چلا اور یہ بھی پتا چلا کہ جشن والی رات تم ان کے دو بندے زخمی کر کے بھاگ گئے تھے..."

باتیں کرتے کرتے جاناں ایک دم رک گئی۔ لرز کر بولی۔ "اگر تم ہی یاسر بھائی ہو تو پھر ذرا سی دیر بھی نہ کرو۔ فوراً اپنے گھر پہنچو... فوراً پہنچو۔"

"یہ کیوں کہہ رہی ہو تم؟"

"کل میں نے جو کچھ سنا ہے، اس سے پتا چلتا ہے کہ آج کی رات تمہارے گھر والوں پر بہت بھاری ہے۔ کیا ٹائم ہوا ہے تمہارے پاس۔" وہ ہیجانی انداز میں بولی۔

میں نے رسٹ واچ دیکھی۔ یہ ڈیڑھ بجے کا عمل تھا۔ میں نے اسے وقت بتایا۔ وہ لرزیدہ آواز میں بولی۔ "تمہارا گھر یہاں سے کتنی دور ہے؟"

"زیادہ دور نہیں۔" میں نے گول مول جواب دیا۔ مجھے اس گاؤں کا نام تو معلوم تھا جہاں یاسر کے گھر والے رہ رہے تھے لیکن یہ پتا نہیں تھا کہ وہ کتنے فاصلے پر ہے۔

وہ کراہی۔ "تم مجھے بھلے آدمی لگے ہو۔ وقت ضائع نہ کرو۔ اپنے گھر والوں کی خبر لو۔ اگر پولیس کی مدد حاصل کر سکتے ہو تو وہ کرو۔ رات آخری پہر تمہارے گھر میں کچھ بہت برا ہونے والا ہے۔"

اگر یاسر نامی اس شخص کے گھر والوں کے ساتھ کچھ برا ہونے والا تھا تو اس میں میرا کوئی قصور نہیں تھا۔ علاقے کے لوگوں نے خود ہی میری کارروائیوں کو اس یاسر نامی بندے سے منسوب کر دیا تھا۔ اب یہ بات خود ہی ہر خاص و عام تک چلی گئی تھی اور نتیجے میں یاسر کے گھر والوں کے لیے کوئی سنگین مشکل پیدا ہو رہی تھی۔ بہرحال جو کچھ بھی تھا، یہ میرے لیے کسی طور قابل قبول نہیں تھا۔

اگلے ڈیڑھ دو منٹ میں فیصلہ ہو گیا۔ میں جاناں کو لے کر اس ویران جگہ سے نکل آیا۔ پستول میں نے ہاتھ میں لے لیا تھا اور ہر صورتِ حال کے لیے بالکل تیار تھا۔ چند منٹ بعد ہم موٹر سائیکل تک پہنچ گئے۔ میں نے موٹر سائیکل میں چابی لگائی اور اس وقت مجھے احساس ہوا کہ کوئی آس پاس موجود ہے۔

میں نے جاناں کو گردن سے پکڑا اور نہایت تیزی سے نیچے جھکا دیا، خود میں بھی جھک گیا تھا۔ ہمارا یوں جھکنا ہم دونوں کی زندگی کی ضمانت بن گیا۔ دھماکے کے ساتھ ایک شعلہ سا ہمارے سروں کے اوپر سے گزر گیا۔ جاناں کے چلانے کی آواز دور تک گونجی تھی۔ میں نے جوابی فائر کیا۔ گولی مدمقابل کے سینے میں لگی اور وہ سرکنڈوں میں گر کر اوجھل ہو گیا۔

تب ایک شخص پہلو سے حملہ آور ہوا۔ میں نے بھانپ لیا کہ اس کے ہاتھ میں کوئی تیز دھار آلہ ہے۔ میں تڑپ کر پیچھے ہٹا اور چاقو کا وار مجھے چھوتا ہوا نکل گیا۔ بالکل اسی طرح جیسے پچھلی مرتبہ ہوا تھا اور میری جیکٹ پر کئی انچ لمبا کٹ آ گیا تھا۔ میں نے مدمقابل کے سینے پر لات رسید کی۔ وہ دور تک لڑھک گیا۔ غیر متوقع طور پر دوبارہ میری طرف آنے کے بجائے اس نے سرکنڈوں میں گھس کر دوڑ لگا دی۔

میں اپنا ڈھاٹا مضبوطی سے باندھتا تھا اور مزید احتیاط کے طور پر سیفٹی پنیں بھی لگاتا تھا۔ پھر بھی پتا نہیں کیسے ڈھاٹا کا ایک پلو لٹک گیا اور وہ کھلتے کھلتے بچا۔ میں نے اسے دوبارہ درست کیا اور زخمی تک پہنچا۔ وہ چت لیٹا تھا اور ختم ہو چکا تھا۔ اس کی عمر ستائیس اٹھائیس سال سے زیادہ نہیں رہی ہو گی۔ دیہاتی لباس کے بجائے پتلون اور سویٹر پہن رکھا تھا۔ اس کا حلیہ گواہی دے رہا تھا کہ وہ سجاول سیالکوٹی کے ساتھیوں میں سے ہے۔ میں نے اس کی جیبیں ٹٹولیں، جیبوں سے ملنے والی سب سے اہم شے کسی گاڑی کی چابی تھی۔ میں نے اردگرد نگاہ دوڑائی۔ جھاڑیوں کی اوٹ میں کھڑی ایک پک اپ نظر آئی۔ یہ چابی اسی سیاہ پک اپ کی تھی۔ یہاں دو فائر ہو چکے تھے، اب یہ جگہ رکنے کے لیے بالکل بھی مناسب نہیں تھی۔ میں نے پک اپ کا عقبی دروازہ کھول کر موٹر سائیکل کو پک اپ پر چڑھایا۔ ہلاک ہونے والے ڈکیت کا مشین پسٹل اٹھا کر ڈیش بورڈ میں رکھا۔ جاناں کو اپنے پہلو میں بٹھایا اور پک اپ کو حتی الامکان رفتار سے چاند گڑھی کی طرف دوڑا دیا۔

یہ بات تو مجھے تاجور سے معلوم ہو گئی تھی کہ یاسر کے مفرور ہونے کے کچھ عرصے بعد یاسر کے گھر والے بھی چاند

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN

گھڑی سے نکل کر پاس والے گاؤں میں چلے گئے تھے۔ اس گاؤں کا نام اس نے ’’ٹیپل والی‘‘ بتایا تھا۔ جاناں جو کچھ بتا رہی تھی اگر وہ درست تھا تو پھر مجھے جلد از جلد اس ’’ٹیپل والی‘‘ گاؤں پہنچنا تھا۔

ہم نے ایک جگہ رک کر ٹیپل والی کا راستہ ایک کھیت مزدور سے پوچھا۔ اس نے بتایا کہ ہم بمشکل ڈھائی تین کلو میٹر دور ہیں۔ جاناں بہت ڈری ہوئی تھی۔ اس نے مری مری آواز میں کہا۔ ’’یاسر! آپ مجھے یہیں کہیں اتار دیں، مجھ میں اب اور سہنے کی ہمت نہیں ہے۔ میں اب اس جگہ سے نکل جانا چاہتی ہوں۔‘‘

میں نے کہا۔ ’’تم بالکل فکر نہ کرو۔ میں تمہیں ٹیپل والی اور وہاں کی صورت حال سے بہت دور رکھوں گا۔ مجھے اچھی طرح پتا ہے کہ مجھے تمہیں کہاں اتارنا ہے۔‘‘

☆☆☆

قریباً دس منٹ بعد میں پک اپ ڈرائیو کرتا ہوا، طوفانی رفتار سے ’’ٹیپل والی‘‘ گاؤں میں داخل ہوا۔ جاناں اب میرے ساتھ نہیں تھی۔ میرے پیچھے تاریک گلیوں میں گرد کا بادل اٹھ رہا تھا اور آوارہ کتوں کی ٹولیاں میرے پیچھے لپک رہی تھیں۔ پتا نہیں کیوں، گاؤں میں داخل ہوتے ہی مجھے احساس ہوا کہ یہاں کوئی سنگین گڑبڑ ہو چکی ہے۔ یہ رات کا پچھلا پہر تھا۔ اس کے باوجود لوگ ٹولیوں میں یہاں وہاں کھڑے تھے۔ تین چار گھڑ سوار افراتفری کے عالم میں گھوڑے بھگاتے میرے سامنے سے گزرے۔

میں نے پک اپ روک کر ایک ہراساں شخص سے پوچھا۔ ’’کیا ہوا؟‘‘

وہ دُہائی دینے والے انداز میں بولا۔ ’’سیالکوٹی کے لوگ اماں برکتے کی بیٹی کو اٹھا کر لے گئے۔ زیادہ دور نہیں گئے ہوں گے، کوئی ان کو پکڑے۔‘‘

میں نے پک اپ کی ہیڈ لائٹس میں دیکھا کچھ فاصلے پر ایک عورت بے حس و حرکت زمین پر پڑی تھی۔ اس کے سر کے بال اور کپڑے خون اور مٹی میں لتھڑے ہوئے تھے۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا وہ یاسر کی والدہ ہی تھی۔ اس نے آخر وقت تک بیٹی کو بچانے کی کوشش کی تھی اور اس کے ساتھ گھسٹتی ہوئی گاؤں کے چوراہے تک پہنچ گئی تھی۔ یہاں ڈاکوؤں نے اس کے سر پر بندوقوں کے بٹ مارے تھے اور اسے نیم جان کر کے چھوڑ گئے تھے۔

اتنے میں تین چار مزید افراد پک اپ کے پاس پہنچ گئے تھے۔ وہ تذبذب کے عالم میں میری طرف دیکھ رہے

دسمبر 2015ء جاتے سال کا آخری تحفہ
خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ
ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ
مزید
ملک صفدر حیات کی تفتیش
محفلِ شعر و سخن
اور آپ کے خط

قرض
ہماری زندگی پر صرف ہمارا ہی حق نہیں بلکہ کچھ لوگوں کا قرض بھی ہوتا ہے جسے اتار کر ہی دل کا بوجھ ہلکا ہوتا ہے...... آخری صفحات پر عمر عبداللہ کی سوغات

خدنگ عثمانی
تاریخ کے گم شدہ لمحات کا احاطہ کرتے صفحات کا دلکش انداز...... الیاس سیتاپوری کے قلم کا سحر

شیش محل
دنیا کو فتح کرنے کے زعم میں خود کو ہار جانے والی ایک دوشیزہ کی دلخراش داستان...... اسما قادری کے قلم کی روانی

ماروی
محبت کا پیغام دینے والے محبوب کا ایک دلربا انداز......
محی الدین نواب کے خیالات کی بلند پرواز

اس کے علاوہ
طاہر جاوید مغل، تنویر ریاض، کاشف زبیر، علی اختر
ڈاکٹر شیر شاہ سید اور سلیم انور کی خوبصورت تحاریر

To Download Sipense Visit

تھے۔ میں نے کہا۔ ”کوئی مجھے بتا سکتا ہے کہ وہ لوگ کس طرف گئے ہیں؟“

لمبی داڑھی اور روشن چہرے والا ایک درمیانی عمر کا شخص تیزی سے پک اپ میں داخل ہوگیا۔ ”مجھے پتا ہے وہ کس طرف گئے ہوں گے۔“ اس نے پھولی ہوئی سانس کے ساتھ کہا۔

میں نے دیکھا، اس شخص نے کندھے سے ہولسٹر لٹا رکھا تھا۔ ”تم کون ہو؟“ میں نے اس سے دریافت کیا۔

”امام مسجد کا بھائی ہوں... اور تم؟“

”ایک ہمدرد ہی سمجھو۔ عزت سب کی سانجھی ہوتی ہے۔“ میں نے بھاری آواز میں مختصر جواب دیا۔

”یہاں سے دائیں موڑو۔“ باریش شخص نے پورے اعتماد کے ساتھ کہا۔

میں نے پک اپ کو نشیب میں ایک سخت ناہموار راستے پر اتار دیا۔ مجھے اردگرد کھیتوں.... اور درختوں میں جگنو سے چمکتے نظر آرہے تھے۔ یہ گاؤں کے وہ مسلح لوگ تھے جو دو تین ٹولیوں کی صورت میں اغوا کنندگان کے پیچھے گئے تھے۔ وہ وقفے وقفے سے ہوائی فائر بھی کررہے تھے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ باریش شخص نے ایک نہایت مشکل راستہ اختیار کیا ہے مگر یہ شارٹ کٹ بھی ہے۔ ایک دو جگہ تو یوں لگا کہ کھلی چھت والی یہ پک اپ الٹ ہی جائے گی۔ بہرحال میں کسی نہ کسی طور اسے سنبھالنے میں کامیاب رہا۔ باریش شخص اغوا کنندگان کے خلاف غصے سے بھرا ہوا تھا اور انہیں بے نقط سنا رہا تھا۔ وہ بار بار کہہ رہا تھا۔ ”اب یہ علاقہ تو شریف لوگوں کے رہنے کے قابل ہی نہیں رہا۔ چاند گڑھی میں خون خرابے کے بعد اب یہاں بھی یہی کچھ ہونے لگا ہے۔“

وہ بار بار اپنے موبائل فون پر پولیس چوکی کا نمبر ملانے کی کوشش بھی کررہا تھا لیکن وہاں سے وہی جانا پہچانا جواب مل رہا تھا۔ مطلوبہ نمبر سے رابطہ ممکن نہیں۔

باریش شخص گلوگیر آواز میں بولا۔ ”یہ سب کچھ سمجھ سے باہر ہے۔ آج جو کچھ ہوا ہے، اس کے بعد تو لگتا ہے کہ بہت سے لوگ گاؤں چھوڑنا شروع ہوجائیں گے۔“

بات کرتے کرتے اس نے ایک بار پھر مجھے دھیان سے دیکھا۔ میرا منہ سر ڈھاٹے میں چھپا ہوا تھا۔ وہ پھولی ہوئی سانس کے ساتھ بولا۔ ”کہیں تم... کہیں تم... یاسر کے کوئی دوست تو نہیں ہو؟“

”کون یاسر؟“ میں نے انجان لہجے میں پوچھا۔

اس سے پہلے کہ وہ جواب میں کچھ کہتا۔ دور نشیب میں دو سرخ روشنیاں دیکھ کر ہم ٹھٹک گئے۔ میں نے پک اپ کی لائٹس آف کرکے رفتار دھیمی کردی۔ باریش شخص نے لرزاں آواز میں کہا۔ ”مجھے لگتا ہے کہ یہ وہی ہیں۔ شاید ان کی جیپ کہیں رک گئی ہے یا پھنس گئی ہے۔“

ہم پک اپ کی بجھی ہوئی لائٹس کے ساتھ ہی تقریباً پچاس میٹر آگے گئے اور پھر اس امر کی تصدیق ہوگئی کہ یہ وہی لوگ ہیں۔ اس وقت جسم میں سنسناہٹ سی دوڑ گئی جب دو تین بار کسی لڑکی کے چلانے کی بہت مدھم سی آواز بھی سنائی دی۔ میں نے پک اپ کا انجن بھی بند کردیا۔ ڈیش بورڈ سے مشین پسٹل نکال کر میں باہر نکل آیا۔ میرے اندر وہی آگ بھڑک چکی تھی جو مجھے ہر خطرے سے بے نیاز کرتی تھی۔ سینے میں دھڑکن کا نقارہ پوری شدت سے گونج رہا تھا۔ وہی میٹھا میٹھا درد جو ہر فائٹر کے جسم میں، میدان میں اترنے سے قبل جاگتا ہے۔ باریش شخص نے بھی پستول اپنے ہولسٹر میں سے نکال لیا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ ابھی تک اپنے موبائل فون کے ذریعے چوکی کا نمبر ملانے کی ناکام کوشش بھی کررہا تھا۔

اب ہم جیپ کے اتنے قریب پہنچ گئے تھے کہ جیپ سواروں کی آوازیں سنائی دینے لگی تھیں اور انجن کا شور بھی۔ انجن کے شور اور شور کے اتار چڑھاؤ سے اس بات کی تصدیق ہوتی تھی کہ جیپ واقعی کہیں پھنسی ہوئی ہے۔

میں جانتا تھا، اب خطرناک ترین مرحلہ شروع ہونے والا ہے۔ میں نے باریش شخص سے کہا۔ ”آپ آگے جانا چاہتے ہو یا یہیں رکنا چاہتے ہو یا پھر یہ بھی ہوسکتا ہے کہ آپ پیچھے جاؤ اور لوگوں کو بلاؤ...“

اس سے پہلے کہ باریش شخص کوئی جواب دیتا، اس کے سر پر قیامت ٹوٹ گئی۔ وہ لڑکھڑا کر اوندھے منہ گرا۔ اس کے ساتھ ہی کڑک دار آوازیں آئیں۔ ”خبردار اسلحہ نیچے رکھو... گولی ماردیں گے... نیچے رکھو اسلحہ۔“

وہ لوگ نظر نہیں آرہے تھے اور یہی چیز سب سے زیادہ خطرناک تھی۔ مارشل آرٹ کی تربیت کی الف ب بھی یہی ہے کہ نادیدہ دشمن کے وار سے بچنا چاہیے...

میرے قیافے کے مطابق ان کی تعداد تین سے زیادہ نہیں تھی۔ ایک تو وہ تھا جو میرے ساتھی کو چوٹ لگا کر واپس درختوں کی اوٹ میں ہوگیا تھا اور اس کے دو ساتھی مزید ہوسکتے تھے۔ مشین پسٹل نیچے پھینکنے کے سوا میرے پاس چارہ نہیں تھا۔ میرے باریش ساتھی کا پستول خودبخود

اس کے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔

ان لوگوں نے ہمیں گن پوائنٹس پر لیا اور بڑی احتیاط سے چلاتے ہوئے موقع پر لے آئے۔ وہ تین نہیں دو تھے لیکن اپنے کام میں ایک دم ماسٹر تھے۔ ہم موقع پر پہنچے تو نقشہ ہماری توقع کے مطابق تھا۔ بڑے سائز کی لینڈ روور جیپ بائیں طرف جھکی ہوئی تھی۔ اس کا ایک پہیا بری طرح کیچڑ آلود کھڈے میں دھنسا ہوا تھا۔ پہیا گھومنے سے جو چھینٹے اڑے تھے انہوں نے جیپ سواروں کے کپڑے داغ دار کر رکھے تھے۔ یہ کل چھ افراد تھے۔ دو کے پاس کلہاڑیاں تھیں باقی آتشیں ہتھیاروں سے مسلح تھے۔ تین افراد نے ڈھاٹے باندھ رکھے تھے، باقی کھلے منہ تھے۔ وہ شکلوں سے ہی بدترین قاتل ڈکیت دکھائی دیتے تھے۔ ان میں سے گھنی مونچھوں والا ایک شخص زیادہ لمبا چوڑا تھا اور اس کے بال کندھوں تک پہنچ رہے تھے۔ اس کے ہاتھ میں آٹومیٹک رائفل تھی۔ میرے قیافے کے مطابق یہی اس ٹولی کا سرغنہ تھا۔

یہ قیافہ درست ثابت ہوا۔ وہ دہاڑ کر بولا۔ ”اپنا ڈھاٹا کھولو اور شکل دکھاؤ۔“ ساتھ ہی اس نے رائفل کو خطرناک انداز میں حرکت دی۔

میں ساکت کھڑا رہا۔ کہیں پاس سے لڑکی کے رونے کی گھٹی گھٹی آواز آرہی تھی۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا گیا تھا۔

”میں تمہارا باپ کیا بکواس کر رہا ہوں تم سے۔ اپنا تھوبڑا دکھاؤ مجھ کو۔“

”اور اگر نہ دکھاؤں تو؟“ میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”تیری تو...“ اس نے گالی بکی اور رائفل کو بیرل کی طرف سے پکڑ کر مجھ پر جھپٹا۔ اس سے بڑی غلطی کیا ہوسکتی تھی اور میں کسی ایسی ہی غلطی کا منتظر تھا۔

میں نے جھک کر سرغنہ کا خطرناک وار بچایا اور اس سے بغلگیر ہو کر اسے اس طرح دھکیلا کہ وہ اپنے دو ساتھیوں سمیت نشیب میں لڑھکتا چلا گیا۔ میں بھی لڑھک کر ایک جھاڑی میں گرا۔

”فائر نہ کرنا... فائر نہ کرنا۔“ سرغنہ چلایا۔

کلہاڑی بردار خطرناک انداز میں میری طرف بڑھے۔ میں الٹے قدموں پیچھے ہٹتا چلا گیا۔ دو رائفل برداروں نے بھی اپنی رائفلیں نال کی طرف سے پکڑ لی تھیں۔ لگتا تھا کہ وہ اسی جگہ مار مار کر میری ہڈیوں کا سرمہ بنانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ میں نے یہ دیکھ کر اطمینان کی سانس لی کہ ”چپل والی“ کا باریش شخص نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ جان بچانے میں کامیاب ہوا تھا۔

میرے عقب میں کانٹے دار جھاڑیاں تھیں۔ وہ لوگ تین طرف سے میرے قریب آرہے تھے۔ اب یہ بات بھی سمجھ میں آگئی تھی کہ وہ فائر کیوں نہیں کرنا چاہ رہے تھے۔ انہیں پتا تھا کہ انہیں تلاش کرنے والے آس پاس انہیں ڈھونڈ رہے ہیں اور وہ بڑی تعداد میں ہیں۔ اگر یہاں فائرنگ ہوجاتی تو وہ فوراً اس طرف متوجہ ہوجاتے۔

وہ اپنی طرف سے احتیاط برت رہے تھے لیکن یہ احتیاط انہیں بہت مہنگی پڑنے والی تھی۔ اپنی لاعلمی کے سبب انہوں نے دست بدست لڑائی لڑنے کے لیے ایک نہایت غلط شخص کو چن لیا تھا۔ یہ کون لوگ تھے؟ یہ جو بھی تھے لیکن ان کے ڈانڈے لالہ وریام اور لالہ نظام سے مل رہے تھے اور یہی لالے تھے جو میری چچازاد فائزہ اور چچی آمنہ کے سفاک قتل میں براہِ راست ملوث تھے۔ (نوجوان سیاست دان شکیل داراب براہِ راست اس دہرے قتل کا ذمے دار نہیں تھا)

فائزہ اور چچی آمنہ کی موت کے دلدوز مناظر یاد آئے تو میری آنکھوں میں خون اتر آیا۔ جھاڑ جھنکاڑ سے گھری ہوئی اس ویران جگہ پر اگلے تین چار منٹ میں ایک خوفناک لڑائی ہوئی۔ میرے مقابل پانچ افراد تھے اور یہ پانچوں بے رحم اور خونخوار قسم کے لڑاکے تھے۔ وہ مسلح ہونے کی وجہ سے مجھ پر غالب آسکتے تھے لیکن ان کی بدقسمتی یہ تھی کہ وہ فائر کرنا نہیں چاہ رہے تھے۔ میں نے انہیں مارا ہی نہیں، حیرت زدہ بھی کردیا۔ پہلے دو منٹ کے اندر ہی ان میں سے ایک شخص کی ٹانگ ٹوٹ گئی اور دو... بُری طرح زخمی ہو گئے۔ ایک شخص کی آنکھوں میں خون اس طرح بھر گیا تھا کہ وہ کچھ دیکھنے کے قابل ہی نہیں رہا تھا۔

جب میرے ہاتھ ایک کلہاڑی آگئی تو وہ سمجھ گئے کہ اب فائر کیے بغیر چارہ نہیں۔ لیکن اب ان کے لیے دیر ہو چکی تھی۔ سرغنہ نے مجھے گولی مارنے کے لیے اپنی سیون ایم ایم رائفل سیدھی کی تو کلہاڑی کے زوردار وار نے اس کا ہاتھ کلائی پر سے اس طرح کاٹا کہ وہ قریب قریب علیحدہ ہوگیا۔ دوسرے شخص کے فائر کرنے سے پہلے ہی میں جھک گیا تھا۔ پگھلا ہوا سیسہ موت کی سرگوشی سناتا میرے سر پر سے گزرا اور گڑھے میں پھنسی ہوئی لینڈ روور جیپ کے ٹائر میں لگا۔ ٹائر ایک بلند دھماکے سے برسٹ ہوگیا۔ میں نے فائر کرنے

والے پر جوابی وار کیا۔ یہ گردن پر تھا مگر اس کی کنپٹی پر لگا۔ کلہاڑی کا تیز دھار پھل کئی انچ تک اس کے کھوپڑے میں گھس گیا۔ میں نے کلہاڑی باہر کھینچنے کی کوشش نہیں کی، وہ اسی طرح اس کے سر میں اٹکی رہی اور وہ مردہ چھپکلی کی طرح لمبی گھاس میں جا گرا۔ میں نے اس کی رائفل اٹھائی اور اس طرف لپکا جدھر سے لڑکی کی گھٹی گھٹی آوازیں آرہی تھیں۔ مجھے بھاگتے قدموں کی آوازیں آئیں۔ یقیناً یہ وہی شخص تھا جو لڑکی کو سنبھالے بیٹھا تھا۔ اس کے پاس کوئی آتشیں ہتھیار نہیں تھا ورنہ وہ مجھ پر فائر کرنے کی کوشش ضرور کرتا۔ اس کے بھاگتے قدموں میں دہشت زدگی کی جو جھلک تھی اس نے مجھے مزہ دیا۔ یقینی بات تھی کہ اس نے جھاڑیوں کی اوٹ سے میرے اور اپنے پانچ چھ ساتھیوں کی لڑائی کے خونی مناظر دیکھے ہیں۔ وہ جان گیا تھا کہ میرے سامنے آنا اس کے بس کا روگ نہیں ہے۔

لڑکی کی گھٹی گھٹی آواز ابھری۔ ”بچاؤ... بچاؤ۔“

میں وہاں پہنچا۔ وہ کانٹے دار جھاڑیوں میں اوندھی پڑی تھی۔ اس کے ہاتھ اسی کے دوپٹے سے پشت پر باندھ دیے گئے تھے۔ پاؤں چپل سے محروم تھے۔ میں نے پنسل ٹارچ کی روشنی ڈالی۔ وہ قبول صورت تھی مگر اس وقت بے چارگی کی تصویر نظر آتی تھی۔ اس کے منہ میں ٹھونسا گیا کپڑا جزوی طور پر نکل چکا تھا۔

”بچاؤ... خدا کے لیے بچاؤ۔“ وہ مجھے دیکھ کر بھی زور زور سے پکارتی رہی۔

میرے سیاہ ڈھاٹے کی وجہ سے وہ مجھے بھی اغوا کنندگان کا ساتھی ہی سمجھ رہی تھی۔ ”حوصلہ کرو، ابھی آتا ہوں۔“ میں نے کہا اور پلٹ کر سرغنہ کی طرف آیا۔

اس کا کٹا ہوا ہاتھ بھیانک انداز میں لٹک رہا تھا اور اس نے دوسرے ہاتھ سے خون اگلتی کلائی دبا رکھی تھی۔ میرے دل میں ان لوگوں کے لیے ذرہ بھر رحم نہیں تھا۔ میں نے صرف چھ انچ کے فاصلے سے اس کے سر میں گولی ماری اور اسے ٹھنڈا ٹھار کر دیا۔ جس شخص کی ٹانگ ٹوٹی تھی، وہ گھسٹتا ہوا ایک رائفل کی طرف جا رہا تھا۔ میں نے اس کی پشت پر دو فائر مار کر اسے بھی پار کر دیا۔ ایک سورما بے ہوش پڑا تھا۔ اس کی رائفل اس کے چوڑے چکلے جسم کے نیچے دبی ہوئی تھی۔ بس اس کے دستے کا ذرا سا حصہ ہی نظر آرہا تھا۔ میں نے یہ رائفل بھی کھینچ کر اس کے نیچے سے نکال لی۔ باقی دو افراد شدید چوٹیں کھانے کے بعد راہِ فرار اختیار کر چکے تھے۔

مجھے آوازوں اور روشنیوں سے اندازہ ہوا کہ متلاشی لوگ ہماری طرف آرہے ہیں۔ پھر مجھے موٹر سائیکل کی پھڑ پھڑاہٹ سنائی دی۔ یہ ایک نہیں دو موٹر سائیکلز تھیں۔ ننانوے فیصد امکان یہی تھا کہ یہ تھپل والی کے ہی لوگ ہوں گے۔ میں بندھی ہوئی لڑکی کے قریب رائفل بدست چوکس کھڑا تھا۔ وہ لوگ نزدیک آئے۔ ایک ایک موٹر سائیکل پر تین تین افراد سوار تھے۔ یہ تھپل والی کے لوگ ہی تھے۔ دو کے ہاتھ میں رائفلیں بھی نظر آرہی تھیں۔ ایک موٹر سائیکل پر وہی باریش شخص بھی نظر آیا جو دلیری کا مظاہرہ کر کے میرے ساتھ یہاں تک پہنچا تھا۔ اس نے اچھا ہی کیا تھا کہ ”میدانِ جنگ“ گرم ہونے سے پہلے مدد لینے کے لیے نکل گیا تھا۔

اس نے آس پاس پڑی ہوئی تین لاشوں کو دیکھا اور دنگ رہ گیا۔ وہ لاش سب سے خوفناک منظر پیش کر رہی تھی جس کے سر میں کلہاڑی اٹکی ہوئی تھی۔

”تت... تم ٹھیک ہونا بھائی صاحب؟“ باریش شخص ہکلائی ہوئی آواز میں بولا۔

”ہاں ٹھیک ہوں۔“ میں نے مخصوص بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”دو بھاگ گئے ہیں۔ میں ان کو دیکھتا ہوں، یہاں کا معاملہ دیکھو۔“

اس سے پہلے کہ وہ جواب میں کچھ کہتا، میں پک اپ پر سوار ہو چکا تھا۔ اس کا انجن ابھی تک اسٹارٹ تھا۔ میں نے دیکھا گاؤں کے لوگ ٹولیوں کی صورت میں موقع پر پہنچنا شروع ہو گئے تھے۔ ان میں سے کچھ گھوڑوں پر اور کچھ بائیکس وغیرہ پر سوار تھے۔ زیادہ تر لاٹھیوں اور کلہاڑیوں سے مسلح تھے۔

میں زیادہ لوگوں کا سامنا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے گیئر لگایا اور سیاہ پک اپ کو تیزی سے آگے بڑھا دیا۔

☆☆☆

میں نے جاناں کو اسی قریبی گاؤں میں چھوڑا تھا جہاں رام پیاری اپنے بیمار شوہر وکرم کے ساتھ نقل مکانی کر کے آئی تھی۔ رام پیاری اور وکرم میرے مداح ہو چکے تھے۔ مارواڑیوں کی بڑی حماقت تھی کہ انہوں نے اپنے بچے کی موت کا ذمے دار وکرم اور اس کی بیماری کو ٹھہرایا تھا اور بے قصور میاں بیوی پر چڑھ دوڑے تھے۔ ان دونوں کو بچانے کے لیے مرحوم مولوی فدا نے بھی اہم کردار ادا کیا تھا۔

کئی دیگر لوگوں کی طرح رام پیاری اور وکرم نے بھی ابھی میری شکل نہیں دیکھی تھی مگر مجھے دیکھے بغیر ہی وہ مجھے

اپنے گھر کے فرد کی طرح محسوس کرنے لگے تھے۔ مارواڑی ذات کے لوگوں سے ڈر کر رام پیاری یہاں اپنے ماموں سیوک رام کے پاس آچکی تھی۔ سیوک رام اور اس کی ادھیڑ عمر پتنی کے سوا اس گھر میں اور کوئی نہیں تھا اور وہ دونوں بھی بھلے مانس لوگ تھے۔

پک اپ میں نے راستے میں ہی درختوں کے ایک جھنڈ میں چھوڑ دی اور موٹر سائیکل اتار لی۔ میں موٹر سائیکل پر سیوک رام کے گھر پہنچا۔ دروازہ کھولنے والی رام پیاری ہی تھی۔

”ہائے رام، اتنی دیر لگا دی آپ نے۔ میرے من میں تو پتا نہیں کیا کیا وسواس اٹھ رہے تھے۔“

”میں بالکل ٹھیک ہوں... لڑکی کہاں ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”میں نے اس کو اپنے کپڑے دے دیے ہیں۔ نیا لحاف بھی نکال دیا ہے۔ دو تین بار بھوجن کا پوچھا ہے۔ کھاتی پیتی کچھ نہیں ہے۔ بہت ڈری ہوئی ہے۔ ابھی آپ نے دروازے پر دستک دی تو بے چاری کا رنگ ہلدی ہو گیا۔“

”یہ کئی دن سے بھوکی ہے۔ سیالکوٹی کے بندوں کے ڈر سے چھپی ہوئی تھی۔ تم کھانا لاؤ۔ میں کھلاتا ہوں اس کو۔“

”آپ خود بھی تو کھائیں گے نا بھائی جی؟“

”دو چار نوالے لے لوں گا۔“ میں نے کہا۔

ڈھاٹے کا نقاب بدستور میرے منہ پر تھا۔ میں رام پیاری کے ساتھ اس کمرے میں پہنچا جہاں جاناں سکڑی سمٹی لحاف کے اندر بیٹھی تھی۔ اس کے جسم پر اب ڈھنگ کا لباس نظر آ رہا تھا۔ رونے سے اس کی آنکھیں سرخ تھیں۔ وہ ذرا سی آہٹ پر جیسے بدک اٹھتی تھی۔ رقص و سرود کی رات یقینا اس کے ساتھ ناروا سلوک ہوا تھا۔ وہ کوئی شریف زادی نہیں تھی، مگر گوشت پوست کی زندہ انسان تو تھی جو تکلیف بھی محسوس کرتی تھی اور توہین بھی۔

اس نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا اور سرگوشی میں بولی۔ ”سب ٹھیک تو ہے نا؟“

”سب ٹھیک نہیں تھا۔ مگر تم بروقت اطلاع نہ دیتیں تو کچھ بہت برا ہو جاتا تھا۔ اس کے لیے تمہارا شکریہ۔“

”وہ... لوگ تمہارے گھر پر پہنچ گئے تھے؟“

”ہاں... پہنچ گئے تھے۔“

”مم... مجھے تفصیل بتاؤ یاسر۔“ وہ لرزاں سرگوشی میں بولی۔ (وہ اس بات پر یقین کر چکی تھی کہ میں ہی وہ یاسر ہوں جس کا نام اس نے سیالکوٹی کے ساتھیوں کی زبانی سنا تھا)

میں نے اسے مختصر الفاظ میں بتایا کہ حویلی والی میں کیا ہوا ہے۔ میں نے یاسر کی سگی بہن کا ذکر بھی کیا جسے وہ لوگ اٹھا کر لے جانے میں تقریباً کامیاب ہو چکے تھے۔ وہ آبدیدہ ہو گئی۔ بولی۔ ”اوپر والے نے تم پر بڑی مہربانی کی ہے یاسر کہ تمہاری بہن ان درندوں کے ہتھے چڑھنے سے بچ گئی ہے۔“ پھر ذرا توقف سے کہنے لگی۔ ”میں تمہارے بارے میں نہیں جانتی یاسر، لیکن اتنا دیکھ لیا ہے کہ تم اچھے بندے ہو، تمہاری ہمت اور دلیری میں بھی کوئی شبہ نہیں لیکن ایک... دوست اور ہمدرد کی حیثیت سے تم کو میرا ایک مشورہ ہے۔“

”کیا؟“

”تم ان لوگوں سے متھا نہ لگاؤ۔ یہ بہت بڑا گینگ ہے۔ ان کے ٹانکے بہت آگے تک جڑے ہوئے ہیں۔ تم نے وارا فیملی کا نام سنا ہوا ہے؟“

”نہیں۔“ میں نے انجان بنتے ہوئے کہا۔

اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی، رام پیاری کھانا لے کر آ گئی۔ ہم دونوں خاموش ہو گئے۔ سبزی اور چاول تھے۔ مرغی کا سالن تھا۔ ساتھ میں دودھ تھا۔ رام پیاری ہماری تسلی کے لیے بولی۔ ”جھٹکے کا گوشت نہیں ہے۔ ہمسائی کے گھر سے آیا ہے۔ برتن بھی بالکل صاف ستھرے ہیں۔“

ٹرے سامنے پڑی تھی۔ جاناں اور رام پیاری دونوں ہی تجسس سے میری طرف دیکھ رہی تھیں۔ درحقیقت میرا ڈھاٹا میرے اردگرد موجود ہر شخص کو زبردست الجھن میں مبتلا رکھتا تھا۔ شاید اب ان دونوں عورتوں کا خیال بھی یہی تھا کہ میں جب کھانا کھاؤں گا تو مجھے اپنا ڈھاٹا تھوڑا بہت نیچے کھسکانا پڑے گا اور وہ زیادہ نہیں تو تھوڑی بہت میری صورت دیکھنے میں کامیاب ہو جائیں گی لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ میں نے کھانے کی طرف ہاتھ نہیں بڑھایا۔ بس ایک گلاس نیم گرم دودھ پیا، اور وہ بھی اس طرح کہ ڈھاٹا کھسکانے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ یہ سب کچھ ان دونوں کے لیے تعجب خیز تھا۔

رام پیاری اپنے کراہتے اور کھانستے ہوئے شوہر کے پاس واپس چلی گئی تھی۔ وہ گھر میں پھیلی ہوئی غربت اور بیماری کے باوجود زرق برق کپڑوں میں تھی۔ دن کے وقت وہ ہلکا سا میک اپ بھی کیے رہتی تھی۔ یہ سب کچھ وہ اپنے قریب المرگ شوہر کی شدید خواہش پر کرتی تھی۔ وہ اپنی زندگی کے آخری دنوں میں بھی اپنی دھرم پتنی کو ہشاش بشاش

اور خوب صورت دیکھنا چاہتا تھا۔

میں نے اصرار کر کے جاناں کو کھانا کھانے پر مجبور کیا۔ وہ واقعی فاقہ زدگی کی حالت میں تھی۔ میں نے کہا۔ ”تم داراب فیملی کی بات کر رہی تھیں؟“

”یہ ایک بہت بااثر سیاسی خاندان ہے۔ ان کا بڑا عطاءاللہ داراب ہے۔ وہ ان لوگوں میں سے ہے جو بادشاہ نہیں... بادشاہ گر ہوتے ہیں۔ کوئی بے وقوف سے بے وقوف بندہ بھی ان سے ٹکر لینے کا نہیں سوچ سکتا۔ بلکہ یہ تو دور کی بات ہے جن لوگوں کا داراب فیملی سے تعلق ہوتا ہے، کوئی ان سے بھی اونچی نیچی بات نہیں کر سکتا۔“

”کیا تم نے بھی کوئی اونچی نیچی بات کی تھی جس کی وجہ سے تمہارا یہ حال ہو رہا ہے؟“ میں نے اچانک پوچھا۔

اس کے شفاف چہرے پر رنگ سا آ کر گزر گیا۔ آہ بھر کر بولی۔ ”ہمارے جیسے لوگ تو ان کے لیے کیڑے مکوڑوں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔ ہم نے ان سے کیا اونچ نیچ کرنی ہوتی ہے۔ بس میری بدقسمتی کہ ایک دوست کے ساتھ پولیس کے ہتھے چڑھ گئی اور پھنس پھنسا کر یہاں تک پہنچ گئی۔“

”لیکن میری سمجھ میں ایک بات نہیں آ رہی جاناں، جن لوگوں کے پاس تم پھنسی ہوئی ہو، یعنی پاشا اور لالہ دریام وغیرہ... وہ لاہور سے اتنی دور یہاں چاندگڑھی کے آس پاس کیا کر رہے ہیں؟“

وہ بولی۔ ”اس رات میرے کانوں میں تھوڑی سی بات پڑی تھی۔ لالہ دریام نے بہت زیادہ پی ہوئی تھی اس لیے وہ سجاول وغیرہ کے ساتھ اونچی آواز میں بول رہا تھا۔ بڑی بھاری آواز میں باتیں کر رہا تھا۔ کسی سڑک کی بات تھی جو اس علاقے میں آنے والی ہے۔ بہت بڑی سڑک ہے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ یہ سڑک شروع ہو گئی تو یہاں بہت کچھ بدل جائے گا۔“

”اور کیا کہہ رہے تھے؟“

”وہ ایک دو دیہات کی بات بھی کر رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ وہاں کی مٹی سونا بننے والی ہے۔ لالہ دریام کی یہ بات سن کر سجاول سیالکوٹی نے کہا تھا... آپ فکر ہی نہ کرو لالہ جی۔ سونے کا خزانہ آپ کا ہے اور خزانے پر جو سانپ بیٹھا ہوا ہے اسے ہٹانا ہمارا کام ہے پھر سب زور زور سے ہنسنے لگے تھے۔“

سانپ، خزانہ، سونا... ان باتوں کا کیا مطلب تھا۔ یہ بات تو مجھے اچھی طرح معلوم تھی کہ جو لوگ حکومت میں ہوتے ہیں یا سیاسی طور پر بہت فعال ہوتے ہیں، انہیں ترقیاتی منصوبوں کا علم پہلے سے ہو جاتا ہے اور پاکستان جیسے ملکوں میں تو بہت ہی پہلے سے ہو جاتا ہے۔ اس طرح وہ ان منصوبوں کے اردگرد بڑے بڑے رقبے خرید لیتے ہیں اور بے بہا فائدہ اٹھاتے ہیں۔

کڑی سے کڑی مل رہی تھی۔ اچانک میرے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا اور میں حیران رہ گیا... کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ خزانہ ”چاندگڑھی اور اردگرد کے دیہات“ کی زمین کو کہا جا رہا تھا اور اس پر بیٹھے ہوئے سانپ سے مراد وہ لوگ تھے جو اس زمین کو آباد کر کے یہاں بیٹھے ہوئے تھے۔

اچانک ایک اور خیال ذہن میں آیا اور میں سناٹے میں رہ گیا۔ چاندگڑھی اور اس کے آس پاس کے علاقے میں رہنے والے لوگوں کو گاہے بگاہے سجاول سیالکوٹی کی جارحیت کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ یہ ڈکیت شمال کی جانب کے ویران علاقے سے نکلتے تھے اور تباہی مچا کر واپس چلے جاتے تھے۔ علاقے کے لوگ بددل اور خوف زدہ ہو رہے تھے۔ شروع میں تو سجاول گینگ کے لوگ صرف لوٹ کھسوٹ تک محدود تھے مگر اب وہ باقاعدہ زندگیاں بھی چھین رہے تھے اور اسی پر بس نہیں، اب وہ لوگوں کو عزت آبرو کے خوف میں بھی مبتلا کر رہے تھے۔ پچھلی واردات میں انہوں نے باقاعدہ ایک لڑکی کو اٹھانے کی کوشش کی تھی۔ میں نے تاجور کو بھی بمشکل ان کی یورش سے بچا پایا تھا۔

”تم کس سوچ میں کھو گئے ہو؟“ جاناں نے کہا۔

”کچھ نہیں۔ یہی سوچ رہا ہوں کہ ان لوگوں کی ہوس کی کوئی حد بھی ہوتی ہے یا نہیں۔ یہ لوگ کتنی کتنی دور مار کرتے ہیں اور اس کے بعد مزید آگے کی سوچنے لگتے ہیں۔“

”میں ان سے بہت ڈر گئی ہوں۔ میرا جی چاہتا ہے کہ کچھ دنوں کے لیے کہیں روپوش ہو جاؤں۔ پلیز مجھے کسی طرح اس علاقے سے کہیں نکال دو۔“

”تھوڑا سا صبر کرنا پڑے گا۔ اس وقت یہ لوگ بڑے بھڑکے ہوئے ہیں۔ میں نے تمہیں بتایا ہے نا، ابھی دو گھنٹے پہلے ان کے کچھ بندے قتل بھی ہوئے ہیں۔ ابھی تمہارا یہاں سے نکلنا کسی طور ٹھیک نہیں۔ بے شک یہ میاں بیوی ہندو ہیں لیکن مجھے ان پر پورا بھروسا ہے۔ تم یہاں بالکل محفوظ ہو۔“

”کتنے دن یہاں رہنا ہو گا؟“ وہ مری مری آواز میں بولی۔

"یہ حالات پر ہے۔ ہوسکتا ہے کہ تین چار دن میں، میں تمہیں یہاں سے نکال لوں۔"

کسی قریبی کمرے سے وکرم کے کھانسنے کی آواز آرہی تھی۔ برآمدے کی طرف سے بکری کے ممیانے کی آواز بھی آتی تھی۔ یقیناً یہ وہی بکری تھی جسے کچھ دن پہلے مولوی فدا مرحوم نے بڑی نیک نیتی کے ساتھ رام پیاری کے گھر پہنچایا تھا تاکہ اس کے بیمار پتی کو اچھی خوراک مل سکے۔

میں نے کمرے میں جاکر وکرم کی عیادت کی۔ وہ جوں کا توں تھا۔ اس کے بچنے کی امید کم تھی۔ بہرحال اس کی بیوی اس کے جیون کے آخری ایام کو آرام دہ بنانے کی پوری کوشش کررہی تھی۔

رام پیاری مسلسل میری طرف دیکھ رہی تھی۔ سر پر دوپٹا درست کرتے ہوئے بولی۔ "آپ نے ہم دونوں کے لیے بہت کچھ کیا ہے۔ بھگوان سے پرارتھنا ہے کہ آپ سکھی رہیں۔ آپ پر اور آپ کے پریوار پر کوئی آنچ نہ آئے۔"

رام پیاری کو معلوم نہیں تھا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے یہ آنچ آتے آتے رہ گئی ہے۔ یاسر کی نوجوان بہن بدترین حالات سے دوچار ہوتے ہوتے بچی ہے۔

"ایک بات پوچھوں اگر آپ برا نہ مانیں تو؟" وہ لجاجت سے بولی۔

"پوچھو۔"

"آپ... یاسر بھائی ہی ہیں نا..."

"تمہیں کیا لگتا ہے؟"

"میں نے آپ کو بس دور سے دیکھا ہوا ہے۔ ہاں میرا پتی وکرم آپ سے دوچار بار ملا ہے۔"

"وہ کیا کہتا ہے؟"

"وہ کہتا ہے... آپ یاسر بھائی ہی ہیں۔ بس... آپ کی آواز اسے کچھ بدلی ہوئی لگتی ہے۔ آپ کی گردن پر چوٹ بھی آئی تھی نا جب آپ عالمگیر کے بندوں سے لڑے تھے؟"

"تم خود سوال کررہی ہو اور خود ہی جواب بھی دے رہی ہو۔"

وہ گڑبڑا سی گئی۔ ہکلا کر بولی۔ "وکرم کی بڑی اکھشا (خواہش) ہے کہ ایک بار آپ کی شکل دیکھے..."

"چلو دکھا دوں گا شکل بھی، لیکن اس وقت بہت جلدی میں ہوں۔ جو باتیں میں نے تمہیں بتائی ہیں ان کا پورا دھیان رکھنا ہے۔ جاناں کے بارے میں بھولے سے بھی کسی سے ذکر نہیں کرنا۔"

رام پیاری کو کچھ ضروری ہدایات دینے کے بعد میں یہاں سے جانے کے لیے تیار ہوگیا۔

میں موٹر سائیکل پر سوار تھا۔ ایک جگہ درختوں کے ایک سنسان تاریک جھنڈ میں گھس کر میں نے اپنا لباس تبدیل کیا۔ شلوار میں پتلون کے نیچے ہی پہنے رکھتا تھا اور کسی وقت پتلون کے اوپر شلوار پہن لیتا تھا۔ اب بھی میں نے ایسا ہی کیا۔ پتلون نیچے کردی اور شلوار اوپر۔ جیکٹ کو الٹ کر پہن لیا اور ڈھاٹا اتار لیا۔ اب میں پھر سے گونگے شاہ زیب کے روپ میں تھا۔ دین محمد کا ٹریکٹر ڈرائیور۔ جو بس اپنے کام سے کام رکھتا تھا۔

موٹر سائیکل پر سوار میں چاند گڑھی پہنچا تو ڈیرے پر انیق حسب معمول میرے انتظار میں جاگ رہا تھا۔ اس تک یہ خبر پہنچ چکی تھی کہ قریبی گاؤں پھپل والی میں سجاول سیالکوٹی کے لوگوں نے پھر واردات کی ہے اور یاسر کی بہن کو اٹھانے کی ناکام کوشش کے دوران میں کچھ افراد قتل ہوگئے ہیں۔

"آج تو بڑی دھواں دھار رات گزاری ہے آپ نے؟" اس نے میری طرف دیکھ کر معنی خیز لہجے میں کہا۔

"آگے آگے دیکھو ہوتا ہے کیا۔"

"آپ ٹھیک تو ہیں نا؟"

"پہلے سے زیادہ ٹھیک ہوں۔ یہاں گاؤں میں کیا پوزیشن ہے؟"

"لوگ پہلے سے زیادہ خوف زدہ ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ عالمگیر اور اس کے ساتھیوں کی گرفتاری کے بعد سجاول زخمی درندے کی طرح ہوگیا ہے۔ وہ ضرور مزید کارروائیاں کرے گا۔ اب بھی چودھری محمد نیاز کی بیٹھک میں گاؤں کے بڑے بیٹھے ہوئے ہیں اور بات چیت ہورہی ہے۔"

اگلی صبح پورے چاند گڑھی میں رات والے واقعے کا چرچا تھا۔ عام لوگوں کے لیے یہ بڑی جوشیلی خبر تھی کہ سجاول کے لوگ یاسر کی بہن کو اٹھانے کے لیے آئے اور یاسر نے بڑے ڈرامائی انداز میں نمودار ہوکر ان کا راستہ روک لیا۔ موقع پر جو دست لڑائی ہوئی تھی اس کا بھی خوب چرچا تھا۔ اس لڑائی کی گواہی یقیناً امام مسجد کے باریش بھائی نے بھی دی ہوگی۔

چاند گڑھی کے لوگوں کے لیے یہ سب کچھ حیران کر

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN

دینے والا تھا۔ اکیلے ”یاسر“ نے کم از کم چھ افراد کا مقابلہ کیا تھا اور ان میں سے تین کو موت کی نیند سلا دیا تھا۔ کچھ لوگ اس کو مزید بڑھا چڑھا کر بیان کر رہے تھے۔ ہر طرف یاسر بھائی کے نام کی گونج تھی۔ درحقیقت یاسر نامی اس نوجوان کو لوگ پہلے ہی ایک ”ہیرو“ کا درجہ دیتے تھے۔ اب اوپر تلے پیش آنے والے واقعات نے ان کے خیالات کو مزید تقویت دی تھی۔ وہ اس کے دیوانے سے ہو گئے تھے۔ ان میں سے کچھ تو یہ کہتے ہوئے بھی سنے گئے کہ یاسر دو چار دن میں کھل کر سامنے آنے والا ہے۔ پولیس کے بڑے افسروں سے اس کا معاملہ طے ہو گیا ہے۔ کچھ پولیس افسر خود یہ چاہتے ہیں کہ یاسر آگے آئے اور سیالکوٹی کا سامنا کرے۔

کئی طرح کی باتیں کہی جا رہی تھیں۔ یاسر چونکہ کچھ عرصہ فوج میں بھی رہا تھا لہٰذا گاؤں کے سیانوں کا یہ بھی خیال تھا کہ انتظامیہ اس کے لیے نرم گوشہ رکھتی ہے۔ بہرحال تھوڑی دیر بعد یہ بات غلط ثابت ہو گئی... اور اس کا ثبوت مجھے انیق نے دیا۔

میں کمرے سے باہر نکلا تو سامنے ٹیوب ویل کے پاس درختوں کے نیچے ڈیرے کی جہازی سائز کی چارپائی پر پہلوان حشمت، انیق، حق نواز اور سوہنگی وغیرہ بیٹھے تھے۔ کچھ دیر پہلے تک یقیناً رات والے واقعے پر ہی گرما گرم گفتگو ہوتی رہی تھی لیکن اب حسب معمول حشمت اور انیق میں علمی بحث چھڑی ہوئی تھی۔ انیق کی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ ”حشمت بھائی، آپ ماسٹر جی کو بلا لیں، دو چار اور پڑھے لکھوں کو بلا لیں۔ ”گبرو“ کا لفظ طاقتور، صحت مند جوان کے لیے استعمال ہوتا ہے۔“

حشمت بگڑ کر بولا۔ ”پتا نہیں کس الو کے پٹھے نے تم کو اردو پڑھائی ہے۔ جی چاہت ہے کہ تم کو کچھ نا کہوں، تمہارے استاد کو ڈھونڈوں اور اس کا سر پھوڑ دوں۔ تم ذرا سی بھی عقل استعمال کر سکتے ہوتے تو بات تمہاری سمجھ دانی میں آ جاتی۔ تم اس لفظ پر ہی غور کر لو۔ گھبرو... یعنی گھب رو... یہ گھبرانے سے نکلا ہے۔ ڈرنے والا، خوف زدہ ہونے والا۔“

”یعنی ہم اس طرح کہیں گے کہ محمد شاہ رنگیلا بہت بڑا گھبرو تھا۔ کیونکہ جب نادر شاہ نے دہلی پر حملہ کیا تو وہ اس قدر گھبرایا کہ لڑے بغیر ہی ہتھیار ڈال دیے۔“

”بالکل اگر اس نے واقعی ہتھیار ڈال دیے تھے تو پھر اس کو گھبرو کہنا چاہیے۔“

”یعنی آپ کو پتا ہی نہیں کہ اس نے ہتھیار ڈال دیے تھے، اور کل آپ یہ کہہ رہے تھے کہ آپ نے حضرت عیسیٰ تک کی تاریخ گھول کر پی رکھی ہے۔“

یہ بحث مزید طول کھینچ سکتی تھی مگر اسی دوران میں دین محمد صاحب ڈیرے کی طرف آتے دکھائی دیے۔ سب چارپائی سے اٹھ گئے اور اپنے اپنے کام میں لگ گئے۔ میں اور انیق بھی ٹریکٹر کی طرف آ گئے۔ ریڈی ایٹر میں پانی ڈالتے ہوئے انیق نے کہا۔ ”ویسے شاہ زیب بھائی، آپ سے کچھ زیادتی نہیں ہو رہی؟“

”کیا مطلب؟“ میں نے پوچھا۔

”جگہ جگہ اپنی جان خطرے میں آپ ڈال رہے ہیں اور ڈنکا یاسر کے نام کا بج رہا ہے۔“ وہ دھیمی آواز میں بولا۔

”اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔“ میں نے بھی سرگوشی میں جواب دیا۔

وہ ذرا چونک کر بولا۔ ”آپ کے لیے ایک تازہ خبر کا کھوج لگایا ہے میں نے۔“

”فرماؤ۔“

”کل رات سیالکوٹی کے لوگوں نے یاسر کے گھر پر جو حملہ کیا، اس میں یاسر کی والدہ اور پھوپی شدید زخمی ہوئی تھیں۔ آج صبح سویرے اس کی پھوپی نے دم توڑ دیا ہے۔ ابھی دوپہر سے پہلے اسے سپردِ خاک کر دیا جائے گا۔“

”بری خبر ہے۔“ میں نے کہا۔

”لیکن ایک اس سے بھی بری خبر ہے۔“

”وہ کیا؟“

”یاسر کو اپنی اس پھوپی سے بہت پیار تھا۔ پولیس والوں کا خیال ہے کہ یاسر اس کے جنازے میں شریک ہونے کی کوشش کرے گا یا کم از کم کسی وقت اس کی قبر پر ضرور پہنچے گا۔“

”تمہیں کیسے پتا چلا؟“

”داؤد بھائی جیسے گینگسٹر کے پاس رہ کر آنکھیں اور کان کھلے رکھنے تو آ ہی گئے ہیں جناب۔ چوکی کے پاس جو چائے خانہ ہے، وہاں جا کر چائے شائے پیتا ہوں۔ آپ کا کیا خیال ہے، وہاں کیوں جاتا ہوں۔“

”میرا تو خیال ہے کہ وہاں ڈی وی ڈی پر انڈین اور پاکستانی فلمیں لگتی ہیں اور فلموں کے بغیر تمہیں حاجت میں مشکل ہوتی ہے۔“

”آپ کی بدظنی سر آنکھوں پر... لیکن وہاں اس

لیے بھی جاتا ہوں کہ کئی پولیس والے بھی وہاں چائے پینے کے لیے آتے ہیں۔ ایسے ہی ایک حوالدار نیامت سے علیک سلیک بنا رکھی ہے میں نے... نیامت سے ہی پتا چلا ہے کہ آج رات سے ہی چاپل والی کے قبرستان کی نگرانی شروع ہو جائے گی۔''

''مگر کیا وہ اتنا ہی سیدھا سادہ ہے کہ گھوڑا دوڑاتا ہوا قبرستان میں پہنچ جائے گا؟''

''ہو بھی سکتا ہے جی، آج رات نہ سہی چار پانچ دن بعد اس سے یہ غلطی ہو سکتی ہے۔ جذبات میں بندہ بہت کچھ کر جاتا ہے۔ لالہ وریام بھی تو ایسے ہی کپلا گیا تھا۔'' انیق نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

یہ اسی رات کا واقعہ ہے۔ میں اور انیق ساتھ ساتھ چارپائیوں پر لیٹے تھے۔ میں تاجور کے بارے میں سوچ رہا تھا اور اس کی پیشانی کے اس حسین بوسے کے بارے میں سوچ رہا تھا جو بدھ کی رات اچانک ہی میرے ہونٹوں پر جگمگایا تھا اور میری روح کو نہال کر گیا تھا۔ یورپ کے خونی کلبوں کا چیمپئن فائٹر جسے بڑے بڑے تگڑم نیچا نہیں دکھا سکے تھے ایک دھان پان سی دیہاتی لڑکی کے ہاتھوں چاروں شانے چت ہو گیا تھا اور اس وقت لالٹین کی مدھم روشنی میں کھدر کا لحاف اوڑھے ایک کچے کمرے میں پڑا تھا۔

بڑی عجلت میں دروازہ کھٹکھٹایا گیا۔ انیق نے حق نواز کی آواز پہچان کر دروازہ کھولا۔ باہر بڑی سرد ہوا چل رہی تھی۔ حق نواز کے ساتھ چھوٹے قد کا ایک جواں سال شخص کھڑا تھا۔ حق نواز نے کہا۔ ''انیق یہ اقبال ہے، تمہیں پتا ہی ہوگا کریانے کی دکان کرتا ہے۔ یہ بڑی مشکل میں ہے۔ شادپور میں اس کی بڑی بہن ہے۔ اس کو بچہ ہونے والا ہے۔ بڑی تکلیف میں ہے۔ اس کا گھر والا کراچی گیا ہوا ہے۔ یہ اس کے پاس جانا چاہتا ہے، فوراً۔''

''ہم کیا کر سکتے ہیں؟'' انیق نے ہمدردی سے پوچھا۔

''میں تو موٹر سائیکل چلا نہیں سکتا۔ تم شاہ زیب سے کہو یہ اسے شادپور پہنچا دے۔ پانچ چھ میل سے زیادہ کا فاصلہ نہیں ہے۔ بڑی نیکی کا کام ہوگا۔''

ٹھیک پندرہ منٹ بعد میں اقبال نامی اس دکان دار نوجوان کو کھٹارا موٹر بائیک پر اپنے پیچھے بٹھائے کچے ناہموار راستے پر جا رہا تھا۔ اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا ہوا تھا اور بار بار شکریہ ادا کرنے والے انداز میں میرا شانہ سہلا رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر زچگی کے سلسلے میں عورت کی مدد کرنے کے لیے مجھے آگے بھی جانا پڑا تو چلا جاؤں گا۔

اسی دوران میں میرے پیچھے بیٹھے ہوئے شخص کے بوسیدہ کوٹ کی جیب میں موبائل فون کی بیل ہونے لگی۔ اس نے موبائل نکالا اور بولا۔ ''ہیلو... کون... بشارت بھائی؟... ہاں ہاں ٹھیک ہے... میں جا رہا ہوں... موٹر سائیکل پر... ہاں دین محمد کا گونگا ملازم چلا رہا ہے... بس دعا کرو کہ یاسر بھائی گھر پر ہی ہو...''

دوسری طرف سے کچھ کہا گیا جسے اقبال خاموشی سے سنتا رہا پھر بولا۔ ''نہیں... نہیں... سب کچھ بتاؤں گا اس کو۔ میں ابھی خود دیکھ کر آیا ہوں۔ قبرستان کے باہر دو پولیس والے موجود ہیں... ہاں ٹھیک ہے... اللہ حافظ۔''

اس نے فون بند کر دیا۔ میں اس کے لیے گونگا بہرا تھا۔ اس نے میرے سامنے بڑی آزادی سے ایک اہم گفتگو کی تھی۔ اس گفتگو نے مجھ پر انکشاف کیا کہ یہ اقبال مجھے دھوکا دے رہا ہے۔ یہ کسی زچگی کے سلسلے میں نہیں جا رہا۔ اس نے جس شخص کا نام لیا تھا اس نے میری رگوں میں خون کی گردش نہایت تیز کر دی تھی۔ اس نے یاسر کا نام لیا تھا۔

اچانک میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ مجھے وہ کہانی یاد آئی جو تاجور نے سنائی تھی۔ ایک سال پہلے یاسر یعنی یاسر بھائی نے گاؤں کے غریب کریانہ فروش کے لیے عالمگیر سے ٹکر لی تھی اور نتیجے میں وہ ایک بندے کا قاتل بن گیا تھا۔ جو شخص میرے پیچھے بیٹھا ہوا تھا اور یاسر کو پولیس کی موجودگی سے باخبر کرنے جا رہا تھا وہ بھی ایک کریانہ فروش ہی تھا۔ میرے دل نے گواہی دی کہ یہی وہ بندہ ہے جس کی خاطر یاسر نے سر اٹھایا اور مشکلات کا شکار ہوا۔

اب شبہے کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی۔ اس ابر آلود یخ بستہ رات میں آدھ پون گھنٹے کے اندر اندر میری ملاقات اس شخص سے ہونے والی تھی جو یاسر بھائی کے نام سے پہچانا جاتا تھا اور آج کل ہر خاص و عام سے ''خراجِ تحسین'' وصول کر رہا تھا۔

میں نے موٹر سائیکل کی رفتار کچھ اور تیز کر دی۔

**خونریزی اور بربریت کے خلاف**
**صف آرا نوجوان کی کھلی جنگ**
**باقی واقعات آئندہ ماہ پڑھیے**

Downloaded From Paksociety.com
READING Section

Downloaded From Paksociety.com

# ناکام فاتح

**تنویر ریاض**

دل کی دنیا پر راج کرنے والا ہی اصل فاتح کہلانے کا مستحق ہے... وہ دلیر تھا... بہادر تھا... مظلوم و بے بس لوگوں کی زندگی کو دکھوں سے بچانے کے لیے بنا سوچے سمجھے دشمنوں کے کارواں سے ٹکرا جاتا تھا... کیمپوں میں مقیم پناہ گزینوں پر زندگی تنگ کر دینے والے وحشی درندوں کی سفاکیاں... انسانی جان و مال کی ان کی نظر میں کوئی قیمت نہیں تھی...

**ظلم و ناانصافی کے نفرت کدۂ دہر میں ایثار و وفا کی بھڑکتی چنگاری کا احوال...**

**یونگ** نے شمالی کوریا کے سپاہیوں کی خاکی وردی پر ایک نظر ڈالی جو کیمپ سے لحہ بہ لحہ دور ہوتی جا رہی تھیں اور تقریباً تین چوتھائی میل کا فاصلہ طے کر چکی تھیں۔ وہ رات کے چوکیدار ہونگ ڈو سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ”تم نے مجھے پہلے فون کیوں نہیں کیا؟“

”میں ڈر گیا تھا۔“ ہونگ ڈو نے جواب دیا۔ وہ اب بھی آدھا لکڑی کے کاؤنٹر کے پیچھے چھپا ہوا تھا۔ ”وہ تعداد میں بہت زیادہ تھے اور انہوں نے مجھے دھمکی بھی دی تھی۔“

”کیا ان کے پاس بندوقیں تھیں؟“

”ان کے پاس چاقو اور ڈنڈے تھے۔“

”جیپ نکالو۔ جلدی سے۔“ جیسے ہی خوف زدہ چوکیدار دوڑا، یونگ نے پیچھے سے آواز لگائی۔ ”اور ڈینگ سان کو بھی جگا دو۔“

ہونگ ڈو نے مخالف سمت میں دوڑ لگا دی۔ اس کی ڈھیلی ڈھالی وردی صبح کی تیز ہوا میں پھڑپھڑا رہی تھی۔ یونگ نے اسے کوسا اور نظریں اس سمت جما دیں جہاں شمالی کورین جا رہے تھے۔ پانچ منٹ پہلے ہی اسے فون پر اطلاع ملی تھی۔ ہونگ ڈو کی سانس پھولی ہوئی تھی اور وہ بے ربط لہجے میں بول رہا تھا۔ ”کیمپ پر حملہ ہو گیا ہے۔ وہ شمالی کوریا کے سپاہی لگتے ہیں۔ انہوں نے نرس کرو ڈی کو اس کے کوارٹر سے باہر نکالا اور اپنے ساتھ لے جا رہے ہیں۔ انہوں نے اس کے کوارٹر سے ایک ریڈیو، مائیکرو ویو، کمپیوٹر اور بھی قیمتی چیزیں اٹھا لی ہیں۔“

یہ پیغام ملتے ہی یونگ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا خیال تھا کہ شاید یہ حملہ شمالی کوریا کے فاقہ کش سرحدی محافظوں نے کیا ہے۔ یہ ویسے ہی موذی لوگ ہیں جو چین کے دور دراز علاقوں میں گھس کر لوٹ مار کرتے اور وہاں کی آبادی کو نقصان پہنچاتے ہیں لیکن اس سے پہلے کبھی اغوا کا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا تھا۔ یونگ نے ریسیور رکھا اور تھوڑی ہی دیر میں کیمپ پہنچ گیا۔ اسے لباس بدلنے کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ وہ ہمیشہ کسی ممکنہ کارروائی کے لیے وردی میں ملبوس رہتا تھا البتہ باہر نکلتے وقت اس نے فوجیوں کا اوورکوٹ اور فر کی بنی ہوئی ٹوپی پہن لی تھی۔ اس نے اپنی کمر کے گرد بیلٹ کس کر باندھ لی جس میں اعشاریہ پینتالیس کا آٹومیٹک ریوالور لٹک رہا تھا۔

حملہ آور اب سفیدے کے درختوں میں غائب ہو چکے تھے جنہوں نے ایک اونچی منڈیر بنا رکھی تھی اور اس کی وجہ سے وہ دو میل طویل نشیبی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا جو دریائے یالو کی طرف جاتا تھا جو ایک طرح سے کوریا اور چینی علاقے منچس کے درمیان قدرتی سرحد کا کام دیتا تھا لیکن اب کورین اور چینی بادشاہوں کا دور ختم ہو چکا تھا اور ان کی جگہ کوریا میں کمیونسٹ آمر اور چین میں کمیونسٹ پارٹی نے لے لی تھی۔

وہ تقریباً سفیدے کے درختوں کے نزدیک پہنچ چکا تھا کہ اسے اپنے عقب میں جیپ کی آواز سنائی دی۔ ہونگ ڈو جیپ کی پچھلی نشست پر بیٹھا ہوا تھا اور اب بھی اس کی آنکھوں میں خوف کی پرچھائیاں لرز رہی تھیں، ڈرائیونگ سیٹ پر ڈینگ سان بیٹھا ہوا تھا۔ یہ کیمپ میں واحد شخص جس پر یونگ کو مکمل بھروسا تھا۔ اس کے ہاتھ بھاری اور جلد موٹی تھی۔ سر چوڑا اور سیاہ بالوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ دیکھنے میں وہ ایک عجیب و غریب مخلوق نظر آتا تھا جیسے کسی جادوگر نے تخلیق کیا ہو۔

”بیٹھ جاؤ۔“ ڈینگ سان چلاتے ہوئے بولا۔ اس کا لہجہ دیہاتی چینیوں جیسا تھا۔

یونگ نے جیپ میں چھلانگ لگائی اور پسنجر سیٹ پر بیٹھ گیا۔ ڈینگ سان نے لمحہ بھر کی تاخیر کیے بغیر جیپ آگے بڑھا دی اور وہ سفیدے کے درختوں کے ساتھ ساتھ آگے بڑھنے لگے۔ تھوڑی سی چڑھائی کے بعد نشیبی راستہ شروع ہو گیا جو دریا کی طرف جا رہا تھا۔ یونگ نے آگے کی طرف جھکتے ہوئے کہا۔ ”مجھے تو کوئی نظر نہیں آ رہا۔“

”وہ نیچے دریا کی طرف ہی گئے ہیں۔ میں شرطیہ کہہ سکتا ہوں۔“ ڈینگ سان بولا۔

یونگ اس کی بات سمجھ گیا۔ اسے یہاں آئے ہوئے چھ ماہ ہوئے تھے اور اس دوران اس نے اچھی خاصی چینی زبان سیکھ لی تھی۔ اس کا واسطہ قریبی گاؤں میں کام کرنے والی بار گرلز اور ان لوگوں سے پڑتا تھا جنہیں کیمپ میں مقیم غیر ملکیوں کے کمرے صاف کرنے، کپڑے دھونے اور کھانا پکانے کے لیے ملازم رکھا جاتا تھا۔ یونگ کے لیے یہ زبان سیکھنا اس لیے بھی ضروری تھا کہ وہ کیمپ کی سیکیورٹی کا انچارج تھا اور اسے منتخب کرنے کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ نہ صرف انگریزی اور کوریائی زبان روانی سے بول سکتا تھا بلکہ اس کے پاس بوسنیا میں کام کرنے کا تجربہ بھی تھا گوکہ اس کے کام کی نوعیت خفیہ تھی لیکن واشنگٹن کو ہونے والی چند فون کالز نے اس کے موجودہ مالکان کو قائل کر دیا تھا کہ وہ شمالی کوریا کی سرحد کے قریب پیش ہونے والی صورت حال سے نمٹ سکتا ہے۔

اس کیمپ کا سرکاری نام بہت مشکل تھا جسے ادا کرتے ہوئے اس کے جبڑے دکھنے لگتے لیکن اسے اس سے کوئی غرض نہیں تھی۔ تنخواہ معقول تھی اور کیمپ میں کام کرنے والے لوگ بھی اچھے تھے۔ دکھاوے کے لیے ان کا چینی حکومت سے معاہدہ تھا کہ وہ اس الگ تھلگ دیہاتی علاقے کے پس ماندہ لوگوں کو طبی سہولتیں بہم پہنچائیں گے اور وہ یہ کام بخوبی انجام دے رہے تھے لیکن بعض اوقات وہ چینی حکام کی نظر بچا کر فاقہ کش شمالی کوریا کے باشندوں کو بھی خوراک، کپڑے اور خیمے فراہم کرتے جو کسی طرح دریا پار

کر کے اس طرف آنے میں کامیاب ہو جاتے تھے۔

کیمپ کا مرکزی جزو ایک ڈسپنسری تھی جسے ایک چھوٹا اسپتال بھی کہا جا سکتا تھا گو کہ غیر ملکی عملہ اور ڈاکٹر اپنی طرف سے ہر ممکن طبی سہولتیں فراہم کرتے لیکن شمالی کوریا کے مہاجرین میں اموات کی شرح بہت زیادہ تھی۔ بعض اوقات وہ سخت محنت کی وجہ سے اتنے لاغر ہو چکے ہوتے کہ کوئی بھی انہیں نہیں بچا سکتا تھا۔ ان میں سے کچھ لوگوں کو پیچیدہ آپریشن اور مہنگے علاج کی ضرورت ہوتی جو اس ڈسپنسری میں ممکن نہ تھا۔ اس کے باوجود یہاں کام کرنے والے رضاکاروں نے کئی لوگوں کی جان بچائی لیکن کیمپ کے قریب پہاڑی پر واقع قبرستان کی آبادی روز بروز بڑھتی گئی۔

”وہ دیکھو۔“ ڈینگ سان چلّایا۔

”کچی سڑک کے خاتمے پر دریا کے کنارے سو گز شمال کی جانب شمالی کوریا کی وردی میں ملبوس کچھ لوگ لکڑی کے چبوترے پر کھڑے ہوئے ایک چھوٹی کشتی میں سامان لاد رہے تھے۔

”وہ لڑ رہے ہیں۔“ ہونگ ڈو چلایا۔

یونگ نے نظریں جما کر دیکھا۔ اسے وہاں جدوجہد کے آثار نظر آئے۔ نرس کروڈی آخری وقت تک کوشش کر رہی تھی کہ کشتی میں سوار نہ ہونے پائے۔ مزید کچھ چیخنے چلانے کی آوازیں پھر ایک گھونسا فضا میں بلند ہوا اور نرس کی جدوجہد رک گئی۔

جب تک ڈینگ سان دریا کے کنارے پر پہنچا، کشتی وہاں سے روانہ ہو چکی تھی اور اب وہ تیزی سے چپو چلا کر اسے کنارے سے دور لے جا رہے تھے۔ یونگ نے جیپ سے چھلانگ لگائی اور چبوترے کے ساتھ دوڑنے لگا پھر اس نے اپنا ریوالور نکالا اور پوری قوت سے چلاتے ہوئے بولا۔ ”رک جاؤ، ورنہ گولی چلا دوں گا۔“ پھر اسے احساس ہوا کہ وہ انگریزی بول رہا ہے۔ اس نے یہی الفاظ چینی زبان میں ادا کیے لیکن کشتی ساحل سے دور ہوتی جا رہی تھی۔ یونگ نے جھنجلا کر ایک ہوائی فائر کیا اور گہری گہری سانس لینے لگا۔

”وہ چلے گئے۔“ یونگ نے کہا۔

ڈینگ سان نے اس کا بازو پکڑا اور بولا۔ ”غور سے سنو۔“

انہوں نے دیکھا کہ کشتی میں فرار ہونے والے دھیمی آواز میں ایک دوسرے کو احکامات دے رہے تھے پھر اچانک ہی ایک دوسری کشتی کے انجن کی آواز آئی۔

”انہوں نے سامان ایک بڑی کشتی میں منتقل کر دیا ہے۔“ ڈینگ سان نے کہا۔

”لیکن کیوں؟“ یونگ نے پوچھا۔ ”وہ پہلے ہی آدھا فاصلہ طے کر چکے ہیں۔“

”سنو۔“ ڈینگ سان نے کہا اور وہ تینوں کشتی کی جانب متوجہ ہو گئے۔ انہوں نے دیکھا کہ بڑی کشتی نے اپنا رخ تبدیل کر لیا تھا اور وہ شمال مشرق کی طرف جا رہی تھی۔ آہستہ آہستہ اس کی آواز دور ہوتی گئی۔ وہ کشتی منچوریا کی طرف جا رہی تھی۔

”یہ مقامی سرحدی محافظ معلوم نہیں ہوتے۔“ یونگ نے کہا۔

”نہیں۔“ ڈینگ سان نے اس سے اتفاق کیا۔ ”ان کی رسائی ایک موٹر بوٹ تک نہیں ہو سکتی۔“

”اس کا مطلب ہے کہ یہ کسی اور کے لیے کام کر رہے ہیں۔“

”ہاں اور ممکن ہے کہ یہ سرے سے سرحدی محافظ ہی نہ ہوں۔“

یونگ مڑا اور ہونگ ڈو سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ”انہوں نے تم سے بات کی تھی۔ وہ کون سی زبان بول رہے تھے، چینی یا کوریائی؟“

”چینی...“ ہونگ ڈو اس کی لاعلمی پر حیران ہوتے ہوئے بولا۔ ”تم جانتے ہو کہ میں کوریائی زبان کیسے سمجھ سکتا ہوں۔“

”کیا تمہیں وہ چینی لگ رہے تھے یا وہ کوریائی تھے۔ کیا وہ سب چینی بول رہے تھے یا ان میں سے کوئی ایک؟“

ہونگ ڈو نے اپنا سر پکڑ لیا اور بولا۔ ”مجھے یاد نہیں۔ میں بہت خوف زدہ ہو گیا تھا۔“

یونگ نے اس کی قمیص کا کالر پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور بولا۔ ”اچھی طرح سوچ کر بتاؤ۔ ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ تمہیں پہلی بار ان کے آنے کا پتا کس طرح چلا؟“

ہونگ ڈو پسینے میں شرابور ہو چکا تھا۔ اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔ ”میں نے ان کے قدموں کی آواز سنی پھر ایک آدمی تاریکی میں سے برآمد ہوا۔ وہ اتنی تیزی سے میرے سامنے آیا کہ میں فوری طور پر کوئی حرکت نہ کر سکا۔ اس نے میرے کیبن کی کھڑکی سے جھانکا۔ اس کے ہاتھ میں ایک کلہاڑی تھی پھر اس نے مجھے حکم دیا کہ اپنی جگہ سے نہ حرکت کروں۔“

”یہ بات اس نے چینی زبان میں کہی تھی؟“

”ہاں، اور اس کے بعد مزید لوگ تاریکی سے باہر آئے اور مرکزی گیٹ سے اندر داخل ہو گئے۔“

”اس کے علاوہ بھی اس نے کچھ کہا؟“

”اس نے کہا کہ ان کا تعلق شمالی کوریا سے ہے اور وہ امیر سرمایہ داروں سے کچھ چیزیں لینے آئے ہیں جن کے پاس ضرورت سے زیادہ دولت ہے اور اگر میں نے مزاحمت کی کوشش کی تو وہ کلہاڑی سے میرا سر پھاڑ دیں گے۔“

”گویا اس نے شمالی کوریا کے سپاہی کی وردی پہن رکھی تھی لیکن وہ چینی تھا۔“

”ہاں، اس میں کوئی شبہ نہیں۔“

”اور باقی لوگ۔ ان کے بارے میں کیا کہو گے؟“ یونگ نے پوچھا۔

”میں نہیں جانتا۔ میں نے انہیں بولتے ہوئے نہیں سنا۔“ ہونگ ڈو لمحہ بھر کے لیے رکا۔ ”اس وقت بھی نہیں جب وہ واپس جا رہے تھے۔ نرس کروڈی مسلسل جدوجہد کر رہی تھی۔ گوکہ اس کے ہاتھ بندھے ہوئے لیکن پاؤں آزاد تھے اور وہ کوشش کر رہے تھے کہ اسے کمپاؤنڈ سے باہر لے جائیں لیکن وہ چلنے کے بجائے انہیں ٹھوکریں مار رہی تھی جس پر وہ اسے زبردستی اٹھا کر لے گئے۔“

”اور ان میں سے ایک نے کچھ کہا بھی تھا؟“

”ہاں جب نرس نے ایک آدمی کے پیٹ میں لات ماری تو اس نے غصے میں آ کر اسے ایک گالی دی تھی۔“

یونگ جانتا تھا کہ کوریائی باشندے گالی نہیں دیتے۔ اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”گویا وہ بھی چینی ہی تھا۔“

”ہاں۔“ ہونگ ڈو نے اس کی تائید کی۔ ”ہاں، اب میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔ وہ سب چینی ہی تھے۔“

کیمپ واپس آنے کے بعد یونگ کی ملاقات ایگزیکٹو ڈائریکٹر ڈاکٹر ہینس البرڈو سے ہوئی جو نرس کے اغوا ہو جانے سے کافی پریشان تھا۔ اس نے اپنے گنجے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ”مجھے یقین نہیں آ رہا کہ وہ نرس کروڈی کو لے گئے لیکن سوال یہ ہے کہ انہوں نے ایسا کیوں کیا؟“

یونگ کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا لیکن وہ نرس کے بارے میں خود بھی فکرمند تھا۔ ان دونوں کی پہلی ملاقات کیمپ کے ڈائننگ ہال میں ہوئی تھی۔ وہ ایک سادہ سی عورت تھی۔ آنکھوں پر موٹے شیشوں کا چشمہ لگاتی اور اپنے بھورے بالوں کو پونی ٹیل کی شکل میں باندھ کر رکھتی لیکن وہ بڑی مہربان تھی۔ اس وقت یونگ ایک چمچے کی مدد سے پاستا کا ٹکڑا کاٹنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اسے کامیابی نہیں ہو رہی تھی۔ نرس نے اس کی مدد کی اور ایک مستطیل ٹکڑا کاٹ کر اس کی پلیٹ میں ڈال دیا۔ یونگ نے اس کا شکریہ ادا کیا اور دل میں فیصلہ کر لیا کہ وہ اس نرس کا ہمیشہ خیال رکھے گا۔ وہ اسے کیمپ میں مریضوں کی خدمت اور دیکھ بھال کرتے دیکھتا تو بے اختیار اس پر پیار آنے لگتا۔ وہ ہر ایک کے ساتھ اخلاق سے پیش آتی۔ خاص طور پر بچوں کے وارڈ میں اس کا رویہ مثالی ہوتا۔ وہ جب کمرے میں داخل ہوتی تو سب بچے اسے دیکھ کر بستر سے اٹھ جاتے اور ان کے چہروں پر مسکراہٹ پھیل جاتی۔ وہ ہر بچے کے پاس بیٹھ کر اس سے باتیں کرتی اور محبت و شفقت کے ساتھ اس کی تیمارداری کرتی۔ یونگ نہیں جانتا تھا کہ وہ اس کے بارے میں کیا سوچتی ہوگی۔ وہ آدھا کورین اور آدھا امریکن تھا۔ گو کہ سیکیورٹی انچارج ہونے کی وجہ سے اسے اچھی تنخواہ اور بہتر سہولتیں مل رہی تھیں لیکن وہ حیران تھا کہ کیا نرس کروڈی جیسی پڑھی لکھی اور ذہین عورت اس کی جانب متوجہ ہو سکتی ہے لیکن اسے یہ پختہ یقین تھا کہ اگر اس نے حملہ آوروں کا سراغ لگا کر اسے بازیاب نہ کرایا تو وہ یہ حقیقت کبھی نہیں جان سکے گا۔

”لیکن تمہارا کہنا ہے کہ وہ لوگ شمالی کوریا کے سرحدی محافظ نہیں تھے؟“ ڈاکٹر البرڈو نے کہا۔ ”پھر وہ کون تھے؟“

”ان کے نکل جانے کے بعد ہم تینوں یعنی ڈینگ سان، ہونگ ڈو اور میں نے دریا کے کنارے چینی علاقے کی تلاشی لی، وہاں ہم نے صبح کا پورا وقت گزارا۔ ہمیں وہاں سے یہ بیگ ملا ہے۔“

یونگ نے کینوس بیگ کھول کر اس میں سے ایک ٹوٹا ہوا الارم کلاک نکالا اور بولا۔ ”ہمیں یقین ہے کہ یہ نرس کروڈی کا ہے اور یہ حملہ آوروں سے راستے میں گر گیا۔“

ڈاکٹر نے یونگ کے ہاتھ سے کلاک لیا اور اسے دیکھتے ہوئے بولا۔ ”اس میں پانچ بجے صبح کا الارم لگا ہوا ہے، اس کی شفٹ چھ بجے سے شروع ہوتی ہے۔“

یونگ سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”ہمیں کچھ اور چیزیں بھی ملی ہیں جو اتنی اہم نہیں۔ مثلاً یہ ایک شمالی کورین کیپ ہے جو شاید تیز ہوا چلنے سے گر گئی ہوگی۔“

ڈاکٹر نے کیپ کا بغور معائنہ کیا۔ اسے اندر باہر سے دیکھا لیکن اسے وہاں کسی کا نام لکھا ہوا نظر نہیں آیا۔ اس نے وہ کیپ اپنی میز پر رکھ دی اور بولا۔ ”اس کے علاوہ کچھ

READING Section
RSPK.PAKSOCIETY.COM PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

اور؟"

"صرف یہ۔" یونگ نے کہا اور ایک تعویذ ڈاکٹر کے حوالے کر دیا جو ایک باریک سی ڈوری میں بندھا ہوا تھا۔ پیتل کے بنے ہوئے اس تعویز پر کسی بدروح کی شبیہ کندہ تھی۔

"تمہارا خیال ہے کہ یہ تعویذ حملہ آوروں میں سے کسی ایک کا ہے؟" ڈاکٹر نے پوچھا۔

"یہ مجھے لکڑی کے پلیٹ فارم سے ملا تھا۔ یہ کافی قیمتی ہے۔ اس لیے کافی دیر سے وہاں موجود نہیں ہوگا البتہ مجھے یقین ہے کہ جب وہ کشتی میں سامان لاد رہے تھے تو اس دوران یہ کسی کی گردن سے نکل گیا ہوگا۔"

"کیا تم جانتے ہو کہ اس تعویذ پر کس کی شکل بنی ہوئی ہے۔"

"نہیں، البتہ ہونگ ڈو کو معلوم ہے۔"

"اس نے تمہیں کیا بتایا؟" ڈاکٹر نے دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔ وہ اس مخلوق کو دیکھ کر اتنا خوف زدہ ہوا کہ اس نے اپنا سامان باندھا اور کسی سے ایک لفظ کہے بغیر ہی یہاں سے چلا گیا۔"

"چلا گیا؟" ڈاکٹر نے حیرت سے کہا۔ "کیا تمہیں یقین ہے؟"

"ہاں، میں نے اس کا بس اسٹیشن تک پیچھا کیا۔ کاؤنٹر پر بیٹھی ہوئی لڑکی بھی حیران تھی کہ اس نے یک طرفہ ٹکٹ کیوں لیا جبکہ یہاں وہ بہت اچھی ملازمت کر رہا تھا۔"

"یقیناً وہ بہت زیادہ خوف زدہ ہوگا۔" ڈاکٹر البرڈو نے کہا۔ اس نے تعویذ کو ایک بار غور سے دیکھا اور یونگ کو واپس کرتے ہوئے بولا۔ "ہونگ ڈو کہاں گیا ہے؟"

"بیجنگ۔" یونگ نے جواب دیا۔

"وہاں تو اسے ہم کبھی نہیں ڈھونڈ پائیں گے۔"

"ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔ مجھے وہاں جانا ہے جہاں یہ تعویذ لے جائے۔ نرس کروڈی خطرے میں ہے۔ اسی لیے میں یہاں آیا ہوں تاکہ تم سے ڈینگ سان کو اپنے ساتھ لے جانے کی اجازت طلب کر سکوں۔"

ڈاکٹر البرڈو نے بھویں چڑھاتے ہوئے کہا۔ "تم صرف ڈینگ سان کو لے جانے کی اجازت مانگ رہے ہو، اپنے لیے نہیں۔"

"مجھے تو ہر حال میں جانا ہے۔"

ڈاکٹر البرڈو نے ایک لمحے کے لیے یونگ کے چہرے کی طرف دیکھا پھر اپنی میز کی دراز سے ایک کاغذ نکال کر اس پر کچھ لکھا اور یونگ کو دیتے ہوئے بولا۔ "یہ رقم کیشیئر سے لے لو۔ تمہارے اخراجات کے لیے ہے۔"

یونگ نے کاغذ پر نظر ڈالی۔ اس پر ایک ہزار امریکی ڈالر اور اتنی ہی مالیت کی چینی کرنسی لکھی ہوئی تھی۔

ڈینگ سان اچھی طرح جانتا تھا کہ کہاں جانا ہے۔ "نجوی" اس کی زبان سے بے اختیار نکلا۔ "وہ ایک پڑھا لکھا شخص ہے۔ وہی اس تعویذ کے بارے میں کچھ بتا سکے گا۔"

وہ گوڈنگ زی کی تنگ گندی سڑکوں سے گزرتے ہوئے مطلوبہ جگہ تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ یہ گاؤں شمال مشرقی چین میں واقع ہے۔ ڈینگ سان نے دستک دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی اور لکڑی کے بنے ہوئے پرانے سے گیٹ کو ہلکے سے دھکا دیا۔ اس نے بآواز بلند اپنا نام لیا تو کسی نے جواب میں کہا۔ "اندر آ جاؤ۔"

اس کمرے کی دیواروں اور چھت پر ٹائل لگے ہوئے تھے جہاں روایتی چینی لباس پہنے ایک جوان عورت نے ان کا استقبال کیا۔ ان کے آنے کا مدعا جان لینے کے بعد اس عورت نے چار سو ین طلب کیے۔ اپنی میز پر رکھے ہوئے رجسٹر میں اس رقم کا اندراج کیا اور اس کی رسید یونگ کو پکڑا دی۔ پندرہ منٹ بعد وہ دونوں ایک کمرے میں داخل ہوئے جہاں پیتل کے چولھے سے خوشبودار دھواں اٹھ رہا تھا۔ فرش کے وسط میں ایک داڑھی والا شخص گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھا ہوا تھا اور اس کے سامنے ایک قطار میں چند موم بتیاں روشن تھیں۔ اس نے یونگ اور ڈینگ سان کو اپنے سامنے فرش پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ یونگ چینی زبان سے واقف تھا جبکہ ڈینگ سان بھی اچھے خاصے لفظ سمجھ لیتا تھا۔ اس لیے ان تینوں کو گفتگو کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی تھی۔ بوڑھے نے ان سے آمد کا مقصد دریافت کیا تو یونگ نے اسے وہ تعویذ پکڑا دیا۔

بوڑھے نے کانپتی انگلیوں سے وہ تعویذ پکڑا اور مدھم روشنی میں اس کا بغور معائنہ کیا پھر اس نے اپنے پتلے ہونٹ مضحکہ خیز انداز میں سکیڑے اور وہ تعویذ فرش پر پھینکتے ہوئے بولا۔ "تمہاری ہمت کیسے ہوئی اسے میرے پاس لانے کی؟"

یونگ اور ڈینگ سان نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر یونگ نے کہا۔ "ہم نہیں جانتے کہ یہ کیا ہے؟"

"یہ تمہیں کہاں سے ملا؟" بوڑھے نے پوچھا۔

یونگ نے اسے نرس کروڈی کے اغوا اور حملہ آوروں کے تعاقب میں بتانا شروع کیا لیکن چینی زبان پر عبور نہ ہونے کے سبب وہ اپنی بات وضاحت سے بیان نہ کرسکا چنانچہ بقیہ بات ڈینگ سان نے پوری کی۔ بوڑھے نے بڑے سکون سے اس کا بیان سنا۔ درمیان میں کچھ سوالات بھی کیے۔ جب ڈینگ سان اپنی بات پوری کر چکا تو بوڑھے نے ایک بار پھر تعویذ کی طرف دیکھا لیکن اسے ہاتھ نہیں لگایا۔

''کیا تم منچورین ہو؟'' بوڑھے نے یونگ سے پوچھا۔

''میں کورین ہوں۔'' یونگ نے جواب دیا۔

''اور اس کے علاوہ؟'' بوڑھے نے کہا۔

''ہاں، میرا باپ امریکن تھا۔''

''کیا وہ مر چکا ہے؟''

''نہیں لیکن وہ میرے لیے مر چکا ہے۔''

بوڑھے نے لمحہ بھر کے لیے یونگ پر نظریں جمائیں پھر ڈینگ سان سے بولا۔ ''تم بے وقوف نہیں لگتے یا پھر بہت بہادر ہو۔''

ڈینگ سان اور یونگ خاموش رہے۔ بوڑھا اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''یہ تعویذ منچورین نسل کے ایک فرقے سے تعلق رکھتا ہے جس کا سربراہ سفید ریچھ کے نام سے مشہور ہے۔ وہ چینیوں سے نفرت کرتا ہے اور وہ یہ کبھی برداشت نہیں کرے گا کہ کوئی کورین اس کے علاقے میں قدم رکھے۔ اس کوشش میں بہت سے لوگ جان سے ہاتھ دھو بیٹھے، اگر وہ یا اس کے آدمی اس نرس کو لے گئے ہیں تو اس کی کوئی وجہ ہوگی۔ وہ واپس نہیں آئے گی۔ پولیس، فوج کوئی بھی اس کے علاقے میں نہیں جاسکتے۔''

''اس کا علاقہ کہاں پر ہے؟'' یونگ نے پوچھا۔

بوڑھے نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں یہ جاننے کی ضرورت نہیں۔''

''میں جاننا چاہتا ہوں۔'' یونگ نے اصرار کیا۔

''اگر تم وہاں گئے تو واپس نہیں آسکو گے۔''

''کچھ بھی ہو۔ میں جاننا چاہتا ہوں۔'' یونگ اپنی بات پر قائم رہا۔

بوڑھے نے ایک گہری سانس لی اور علاقے کا پتا بتا دیا پھر اس نے بلند آواز سے اپنی پوتی کو بلایا۔ وہی لڑکی اندر آئی جس نے یونگ سے فیس لی تھی، بوڑھے نے کہا۔ ''ان لوگوں کو فیس واپس کر دو۔ ممکن ہے کہ بہت جلد پسماندگان کو ان کی تجہیز و تکفین کے لیے پیسوں کی ضرورت پیش آجائے۔''

☆☆☆

ٹرین شمال کی جانب سفر کر رہی تھی۔ وہ ہر چھوٹے اسٹیشن پر رکتی اور مسافر چڑھتے اترتے رہتے۔ وہ سیتکیا نامی اسٹیشن پر اترے جس کے اطراف میں دو اور تین منزلہ عمارتیں بنی ہوئی تھیں جس سے لگتا تھا کہ یہاں زراعت پیشہ لوگ رہتے ہیں لیکن شہر کے باہر خاصی غیر آباد زمین تھی اور شمالی حصہ پہاڑوں سے گھرا ہوا تھا۔ یونگ نے ایک گہری سانس لی اور اسے لگا کہ وہ اپنے گھر میں ہے۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ بچپن میں اس کی ماں نے ہمیشہ یہی بات اس کے ذہن میں بٹھانے کی کوشش کی کہ وہ امریکن نہیں بلکہ کورین ہے اور اسے یہ بات کبھی نہیں بھولنی چاہیے۔

''اب ہم کیا کریں؟'' ڈینگ سان نے اس اجنبی ماحول کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

اسٹیشن کے باہر تین چھکڑے ٹٹو سمیت کھڑے ہوئے تھے اور ان کے چلانے والے حیرت سے ان اجنبیوں کو دیکھ رہے تھے۔

''ہمیں ان میں سے کوئی گاڑی کرائے پر لینی چاہیے۔'' یونگ نے کہا پھر اس نے آگے بڑھ کر چینی زبان میں ایک گاڑی بان سے کچھ کہا لیکن اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ بقیہ دونوں نے بھی اس کی تقلید کی اور ایک ایک کرکے اپنی گاڑیوں سمیت وہاں سے کھسکنے لگے۔ اس سے پہلے کہ آخری گاڑی بان بھی نکل جاتا، ڈینگ سان نے اسے گردن سے دبوچ لیا اور بولا۔ ''تمہیں اس گاڑی اور گھوڑے کے کتنے پیسے چاہئیں؟''

اس شخص نے خوف زدہ انداز میں ڈینگ سان کے چہرے کی طرف دیکھا اور آنکھیں بند کرلیں جیسے موت اس کے سر پر آن کھڑی ہو۔ شاید وہ پوری طرح ڈینگ سان کی بات سمجھ نہیں پایا تھا۔ یونگ نے چینی زبان میں یہی بات دہرائی اور اشاروں سے کچھ کہا تب گاڑی بان کچھ سمجھ پایا۔ یونگ نے اپنی جیب سے چینی کرنسی نکالی اور گاڑی بان کے حوالے کر دی۔ اس نے نوٹ گننے کے بعد انکار کر دیا۔ یونگ نے اس میں مزید کچھ رقم کا اضافہ کیا تو وہ گاڑی سے نیچے اتر آیا اور اس نے چابک ڈینگ سان کے حوالے کر دیا۔ پھر اس نے وہ رقم جیب میں رکھی اور ریل کی پٹری پار کرکے پہاڑیوں کی جانب چلا گیا۔

وہ دونوں گاڑی میں سوار ہوگئے۔ ڈینگ سان نے لگام سنبھالی اور ہلکے سے ٹٹو کی پیٹھ تھپتھپائی۔ گاڑی کے

پہیوں نے ایک چرچراہٹ کے ساتھ حرکت کی اور وہ قصبے کے وسط سے گزرنے لگے۔ بہت سے لوگوں نے انہیں نظر انداز کر دیا اور اپنے کام میں لگے رہے البتہ چند ایک رک گئے اور انہیں گھورنے لگے۔ شاید وہ اجنبیوں کو دیکھنے کے عادی نہ تھے۔ قصبے کے باہر کھلی چمنیوں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ وہاں سڑک کے دونوں جانب دو تین ایکڑ تک خیموں کا شہر پھیلا ہوا تھا جس میں مرد، عورتیں اور بچے مقیم تھے۔

”یہ کون لوگ ہیں؟“ یونگ نے پوچھا۔

”ہجرت کر کے آنے والے کارکن۔“ ڈینگ سان نے جواب دیا۔ ”یہ یہاں فصل کی کٹائی کے لیے آئے ہیں۔“

”ہمیں ان سے بات کرنا چاہیے۔ شاید یہ کچھ جانتے ہوں۔“

ڈینگ سان نے تائید میں سر ہلایا اور گاڑی کو سڑک کے کنارے کھڑا کر دیا۔ وہ دونوں اس جانب بڑھے جہاں کچھ لوگ آگ کے پاس سمٹے ہوئے بیٹھے تھے۔ ڈینگ سان نے قریب جا کر انہیں ہیلو کہا لیکن سامنے بیٹھا ہوا شخص اس کی بات نہ سمجھ سکا۔ اس نے ایک دوسرے شخص کو بلایا۔ وہ ایک گول چہرے والا منحنی سا آدمی تھا جس کے سامنے کے دانت ٹوٹے ہوئے تھے۔ اس نے رواں چینی میں بولنا شروع کیا اور ڈینگ سان نے بھی اسی تیزی کے ساتھ جواب دیا۔ پھر یونگ سے کہنے لگا۔

”یہ میرے آبائی صوبے کا ہے۔ اس کا نام ژیاؤ منگ ہے۔“

یونگ نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں اور دیکھا کہ عورتیں کھانے کے برتنوں میں سے بچا کھچا کھانا پلیٹوں اور پیالوں میں ڈال رہی تھیں جبکہ بچے کھانے کی کمی کی شکایت کر رہے تھے۔

”ان لوگوں کو پیسے کب ملتے ہیں؟“ یونگ نے پوچھا۔

”جب کٹائی مکمل ہو جاتی ہے۔“ ڈینگ سان نے جواب دیا۔ ”اس سے پہلے نہیں۔“

”ممکن ہے کہ ہم ان کی زبان کھلوا سکیں۔“ یونگ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

وہ دونوں گاڑی لے کر واپس قصبہ چلے گئے اور جب واپس آئے تو ان کی گاڑی میں آٹے اور چاول کی بوریاں لدی ہوئی تھیں اور گاڑی کے ساتھ رسی سے بندھی ہوئی بارہ بھیڑیں چل رہی تھیں۔

دوسری صبح یونگ اور ڈینگ سان کو یہ بات کرنے کی ضرورت نہیں پڑی کہ انہیں کہاں جانا ہے۔ ان کے لائے ہوئے راشن نے کام دکھایا اور شکر گزار پناہ گزینوں نے انہیں منزلِ مقصود کا پتا بتا دیا۔ جھیل کے شمال میں سفید ریچھ کی پناہ گاہ تھی۔ یہ پناہ گزین اس سے ڈرتے اور نفرت بھی کرتے تھے۔

”اگر تم اسے مار دو۔“ ژیاؤ منگ نے کہا۔ ”خدا تمہیں اس کا اجر دے گا۔ اگر تم اسے نہیں مارتے تو مجھے ڈر ہے کہ وہ تمہیں مار ڈالے گا۔“

ابھی انہوں نے پہاڑی کی طرف جاتے ہوئے آدھا راستہ ہی طے کیا تھا کہ گاڑی ایک چٹان سے ٹکرائی اور ایک آواز کے ساتھ بائیں طرف کا پہیا نکل گیا۔ ڈینگ سان نے گاڑی سے اُتر کر نقصان کا معائنہ کیا اور گاڑی کو کوسنے لگا۔ ان کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ واپس جا کر پہیے کی مرمت کرواتے۔ انہیں جلد از جلد نرس کروڈی تک پہنچنا تھا۔ اس کے بجائے انہوں نے ضروری سامان ٹٹو کی پیٹھ پر لادا، اور اسے کھینچتے ہوئے پہاڑی کی جانب روانہ ہو گئے۔

ایک جگہ رک کر انہوں نے کھانا کھایا اور کچھ دیر ستانے کے بعد دوبارہ سفر پر روانہ ہو گئے۔ ابھی وہ آدھا میل ہی گئے ہوں گے کہ زمین سے بھاپ نکلنا شروع ہو گئی۔ وہ بڑی احتیاط سے قدم بڑھاتے آگے چلے۔ کچھ دیر بعد فضا صاف ہو گئی۔ سورج غروب ہونے سے پہلے وہ جھیل تک پہنچ چکے تھے جس کے آخری سرے پر ایک کیمپ نظر آ رہا تھا جس میں صرف خیمے ہی نہیں بلکہ لکڑی سے بنا ہوا ایک گودام بھی تھا اور خیموں کے درمیان کچھ لوگ حرکت کرتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔

گزشتہ شب کھانے کے دوران ژیاؤ منگ اور دوسرے مزدوروں نے یونگ اور ڈینگ سان کو سفید ریچھ کی کارروائیوں کے بارے میں بتایا تھا۔ ”وہ شمالی کوریا سے فرار ہو کر آنے والوں پر حملے کرتے ہیں۔“

”جیسے بھیڑیے ہرنوں پر جھپٹتے ہیں۔“ کسی اور نے لقمہ دیا۔

ژیاؤ منگ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”بوڑھوں کو سردی سے ٹھٹھر کر مرنے کے لیے چھوڑ دیا جاتا ہے۔ جوان مردوں اور عورتوں کو الگ الگ بیچتے ہیں۔ یہ عورتیں چینی زمینداروں کی بیویاں بن جاتی ہیں اور اگر اچھی قیمت مل جائے تو انہیں جسم فروشی پر لگا دیا جاتا ہے جبکہ مرد کھیتی باڑی یا کان کنی میں لگ جاتے ہیں۔“

”اور بچوں کے بارے میں کیا کہو گے؟“ ڈینگ سان نے پوچھا۔

”یہ سب سے زیادہ قیمتی ہوتے ہیں۔ چینیوں کو وارث کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ وہ بڑھاپے میں ان کی دیکھ بھال کرسکے اگر ان کے اپنے بچے نہیں ہوتے تو وہ مہنگے داموں کوئی لاوارث بچہ خرید لیتے ہیں۔“

”خاص طور پر لڑکے۔“ کوئی بیچ میں بولا۔

”اور لڑکیوں کا کیا ہوتا ہے؟“ یونگ نے پوچھا۔

ثریاؤ منگ کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔ ”بعض اوقات وہ بھی فروخت ہوجاتی ہیں اور کبھی نہیں۔“

یونگ پوچھتے ہوئے ڈر رہا تھا کہ جو لڑکیاں فروخت نہیں ہوتیں، ان کے ساتھ کیا سلوک ہوتا ہے لیکن آہستہ آہستہ اس کے دماغ میں ایک نظریہ قائم ہو رہا تھا کہ نرس کروڈی کو کیوں اغوا کیا گیا۔ اگر لڑکے اتنے ہی قیمتی ہیں تو یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ بچوں کے وارڈ میں کام کرنے والی نرس کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ جب سے انہوں نے یہ سفر شروع کیا تھا، یونگ کو پہلی بار امید کی کرن نظر آئی۔ اگر یہ سچ تھا تو سفید ریچھ اور اس کے ساتھیوں کے پاس نرس کروڈی کے ہونے اور اسے زندہ رکھنے کی معقول وجہ موجود تھی۔

”وہ خیمہ دیکھو۔“ ڈینگ سان نے کہا۔ ”یہ خیمہ سب سے بڑا ہے اور کیمپ کے وسط میں ہے۔“

”اس کے علاوہ گودام سے بھی قریب ہے۔“ یونگ نے کہا۔

انہوں نے اپنی نظریں اس طرف جمادیں۔ کئی لوگ اس خیمے کے اندر باہر جارہے تھے۔

”یہ یقینا ان کا ہیڈ کوارٹر ہے۔“ ڈینگ سان نے کہا۔

کیمپ کے باہر مسلح افراد پہرا دے رہے تھے اور ان کے کندھوں پر ایم آئی رائفلیں لٹک رہی تھیں۔ یہ ہتھیار کوریا کی جنگ میں استعمال کیے گئے تھے۔

سورج غروب ہونے تک وہ دونوں ڈھلوان سطح پر بیٹھے اپنے پروگرام کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ انہوں نے رات میں کیمپ پر حملہ کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ انہیں کسی مدد کی توقع نہیں رکھنی چاہیے۔ مقامی چینی پولیس یقینا سفید ریچھ کے لیے کام کرتی ہوگی اور اگر معجزاتی طور پر ایسا نہیں تھا تب بھی انہیں شمالی کوریا سے ملحقہ علاقے میں کوئی کارروائی کرنے کے لیے بیجنگ سے اجازت لینا پڑتی اور اس میں کئی روز لگ سکتے تھے۔

”ہمیں صرف ایک ہی فائدہ حاصل ہے۔“ یونگ نے کہا۔ ”اور وہ یہ کہ ہم ان پر اچانک حملہ کر کے انہیں حیرت زدہ کردیں۔“

”اور ان کے ساتھ بے رحمی سے پیش آئیں۔“ ڈینگ سان نے اپنے تھیلے میں سے ایک قدیم چینی تلوار نکالتے ہوئے کہا۔

”تم تو بہت نرم مزاج ہو۔“ یونگ نے کہا۔ ”پھر سفید ریچھ سے اتنی نفرت کیوں؟“

”تم وہ سب کچھ نہیں سمجھ سکے جو پناہ گزین مزدور کہہ رہے تھے۔“

”نہیں۔“ یونگ نے اعتراف کرتے ہوئے کہا۔

ڈینگ سان نے پیار سے تلوار کی دھار پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ”ویسے تو اس کا اصل نشانہ شمالی کوریا سے آئے ہوئے پناہ گزین ہیں لیکن بعض اوقات سرحد پر سختی ہونے کی وجہ سے ان کی آمد میں کمی ہوجاتی ہے۔ اس کے باوجود سفید ریچھ اور اس کے ساتھیوں کی کارروائیاں جاری رہتی ہیں۔“

”وہ کیسے؟“

”ایسی صورت میں وہ ان عارضی مزدوروں کو نشانہ بناتے ہیں جو لاکھوں کی تعداد میں یہاں موجود ہیں کیونکہ حکومت ان کے تحفظ کا کوئی بندوبست نہیں کرسکتی۔ اس لیے ان مزدوروں کے کیمپ بہت بڑے ہوتے ہیں اور وہ حفاظت کی خاطر اکٹھے رہنا پسند کرتے ہیں۔“

”اور ثریاؤ منگ پر کیا گزری؟“

”ایک دن اس کی بہن کو اٹھالیا گیا جب وہ دریا کے کنارے کپڑے دھو رہی تھی۔“

”اگر ایسا ہے تو پھر اسے ہمارے ساتھ آنا چاہیے تھا۔“ یونگ نے کہا۔

”وہ خوف زدہ تھا۔“ ڈینگ سان نے جواب دیا۔

یونگ نے سفید ریچھ کے کیمپ کے گرد دو درجن مشعلیں دیکھیں تو وہ بھی اپنے آپ کو خوف زدہ محسوس کرنے لگا۔ اس خوف پر قابو پانے کے لیے نرس کروڈی، اس کے مسکراتے چہرے اور خوش اخلاقی کے بارے میں سوچنا شروع کردیا، اگر وہ اسے سفید ریچھ کے چنگل سے آزاد نہ کروا سکا تو اس کی زندگی میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ایک خلا پیدا ہوجائے گا۔

اب انہیں سب سے پہلے ایک رائفل چھیننا تھی۔ اس

مقصد کے لیے جس محافظ کا انتخاب کیا گیا، وہ آدھ گھنٹے سے اپنی جگہ سے نہیں ہلا تھا۔ یونگ اور ڈینگ سان کو یقین تھا کہ وہ سوچکا ہے۔ اس کے باوجود انہوں نے کوئی خطرہ مول نہیں لیا۔ وہ بڑی احتیاط سے اس کی جانب بڑھے۔ ڈینگ سان اس کے بائیں اور یونگ دائیں جانب رینگ رہا تھا۔ ڈینگ سان پہلے اس تک پہنچ گیا۔ اس نے سوئے ہوئے محافظ کی جیبوں کی تلاشی لی پھر رائفل اور بڑی مقدار میں گولیاں یونگ کے حوالے کر دیں جبکہ رائفل میں پہلے ہی آٹھ راؤنڈ موجود تھے۔

کیمپ کی جانب رینگنے کے بجائے وہ بائیں جانب موجود دوسرے گارڈ کی جانب بڑھے۔ انہیں ایک اور رائفل کی ضرورت تھی اور اس کے ساتھ ہی وہ فرار کے لیے ایک محفوظ راستہ بھی چاہ رہے تھے۔ دوسرا محافظ بیدار لیکن تھکا ہوا نظر آرہا تھا۔ وہ ایک پتھر سے دوسرے پتھر تک جاتا اور پھر ایک جگہ رک کر اپنے دونوں ہاتھ فضا میں بلند کرتا۔ وہ خاصا چوکس تھا اور براہِ راست اس کی جانب بڑھنا خطرے سے خالی نہ ہوتا چنانچہ یونگ نے ایک اور طریقہ استعمال کرنے کا فیصلہ کیا جو وہ بوسنیا میں بھی آزما چکا تھا اور اسے امید تھی کہ یہاں بھی وہی طریقہ کام آئے گا۔ اس نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا حالانکہ وہ خود سگریٹ نہیں پیتا تھا لیکن بعض اوقات کسی کو سگریٹ پیش کر کے اسے اپنا کام نکلوانے میں آسانی ہوتی تھی۔ اس لیے اس کی جیب میں سگریٹ کا پیکٹ ہمیشہ موجود ہوتا تھا۔ اس نے ایک سگریٹ نکال کر ہونٹوں میں دبایا پھر اس نے دیا سلائی سے سگریٹ سلگایا اور آہستگی سے محافظ کی جانب بڑھا۔

''کومنگ! یہ تم ہو؟'' گارڈ نے اپنی آواز دھیمی رکھتے ہوئے کہا۔ ''تم جانتے ہو کہ ڈیوٹی کے دوران سگریٹ پینے کی اجازت نہیں ہے۔''

یونگ نے کوئی جواب دینے کے بجائے زوردار کش لگایا تاکہ سگریٹ کی آگ تیز ہو جائے۔

محافظ نے حیرت سے اسے دیکھا اور دوبارہ بولا۔ ''کومنگ!''

اچانک ہی اس کے عُقب سے ایک سایہ نمودار ہوا۔ اس سے پہلے کہ وہ پلٹتا، ڈینگ سان نے اس کا ماتھا پکڑا اور تلوار اس کی گردن پر پھیر دی۔ محافظ ڈگمگایا اور خاموشی سے فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ ڈینگ سان نے جھک کر دیکھا۔ وہ مر چکا تھا۔ انہوں نے دوسری رائفل بھی قبضے میں کی اور کیمپ کے وسط میں موجود گودام کی طرف بڑھے۔ یونگ نے گیٹ میں لگے ہوئے زنگ آلود کنڈے کا معائنہ کیا اور سرگوشی میں بولا۔

''اس میں تالا لگا ہوا ہے۔''

''پھر کیا ہوا۔ ہم اسے توڑ سکتے ہیں۔'' ڈینگ سان نے کہا۔

''نہیں، اس طرح آواز ہو گی۔''

''اس کی چابی یقیناً ہیڈ کوارٹر میں ہو گی۔'' ڈینگ سان نے خیال ظاہر کیا۔

''وہاں روشنی ہو رہی ہے۔''

''وہاں موجود شخص کو اگر ہم باہر نکال سکیں تو چابیوں تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں۔''

یونگ نے اس بارے میں سوچا۔ اس میں خطرہ ضرور تھا لیکن ان کے پاس اس کے سوا کوئی اور راستہ نہیں تھا، وہ بولا۔ ''ٹھیک ہے۔ ہم خیمے کی طرف چلتے ہیں۔''

وہ گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اپنا منصوبہ بنانے لگے۔ پوری طرح مطمئن ہونے کے بعد وہ اٹھے اور رات کی تاریکی میں گم ہو گئے۔ انہیں ایک محافظ کا نام معلوم ہو گیا تھا چنانچہ اسی کو استعمال کرنے کا فیصلہ ہوا۔ ڈینگ سان خیمے کی طرف بڑھا اور چینی زبان میں بڑبڑاتے ہوئے بولا۔ ''کومنگ بالکل ہی ناکارہ شخص ہے۔ اسے معلوم نہیں کہ ڈیوٹی کے دوران سونا منع ہے، ایسے آدمی کو تو گولی ماردینی چاہیے۔''

یہ کہہ کر اس نے خیمے کا پردہ اٹھایا اور اندر داخل ہو گیا۔ وہاں ایک باوردی افسر میز کے پیچھے بیٹھا اسے حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ اس کا ہاتھ اپنے پستول تک پہنچتا، ڈینگ سان اس کے سر پر سوار ہو چکا تھا۔ اب اس کی پوری کوشش تھی کہ اپنی بھاری ہتھیلی سے اس کا منہ بند کر دے۔ یونگ بھی اندر آ گیا تھا۔ اس نے باوردی افسر کا بازو پکڑا اور اسے زمین پر گرا دیا۔ تھوڑی ہی دیر میں انہوں نے اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا اور ہاتھ پاؤں باندھ کر میز کے پیچھے ڈال دیا۔ یونگ نے اس کا چینی ساختہ ریوالور بھی قبضے میں کر لیا۔

دونوں نے دفتر کی تلاشی لی اور جلد ہی مطلوبہ شے انہیں مل گئی۔ وہ اسٹینڈ پر رکھا ہوا لکڑی کا ایک بڑا باکس تھا جس میں تالا لگا ہوا تھا۔ ڈینگ سان نے آفیسر کی جیبوں کی تلاشی لی تو انہیں چابیوں کا گچھا مل گیا۔ چند سیکنڈ میں یونگ نے بکس کھولا اور اس میں سے ویئر ہاؤس کی چابی نکال لی۔ اس پر ٹیگ لگا ہوا تھا۔ انہوں نے چابی قبضے میں کی اور خیمے

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN

سے باہر آ گئے۔

گودام کا دروازہ ہلکی سی چرچراہٹ کے ساتھ کھل گیا اور وہ دونوں اندر داخل ہو گئے۔ انہوں نے لائٹ آن کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ چند لمحے رک کر اندھیرے میں ہی دیکھتے رہے۔ انہوں نے دروازہ بند کر دیا تھا لیکن اسے مقفل نہیں کیا۔ ڈینگ سان کو وہاں لکڑی کا روشن دان نظر آیا تو اس نے وہ کھول دیا اور اس کے ذریعے چاند کی روشنی گودام میں داخل ہو گئی۔ یونگ نے اپنی دانست میں جوا کھیلا تھا کہ نرس کروڈی، گودام میں ہو گی کیونکہ پورے کیمپ میں یہی ایک مستقل عمارت تھی لیکن یہ یقینی نہیں تھا۔ وہ کسی خیمے میں بھی ہو سکتی ہے اور یہ امکان بھی تھا کہ اسے رسی یا زنجیروں سے باندھ دیا گیا ہوتا کہ وہ بھاگ نہ سکے۔ اس کے باوجود گودام کسی قیدی کو رکھنے کے لیے بہترین جگہ ہو سکتی تھی۔

وہ تختوں کے پاس سے گزرے جن پر لکڑی اور گتے کے باکس رکھے ہوئے تھے اور ہر ایک پر چینی یا جاپانی زبان میں کچھ لکھا ہوا تھا۔ چند ایک پر انگریزی عبارت بھی نظر آئی۔ ان میں زیادہ تر ڈبوں میں بند اشیا مثلاً پھل، سبزیاں، گوشت اور کھانے پینے کا دوسرا سامان تھا۔ ایک لکڑی کی سیڑھی کے ذریعے وہ محتاط انداز میں دوسری منزل پر پہنچے۔ یونگ رک گیا اور نتھنے سکیڑتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ انسانی غلاظت کی بو بے حد شدید تھی۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ لکڑی کے شہتیروں سے ستاروں کی روشنی چھن چھن کر آ رہی تھی۔ یونگ آگے بڑھ کر جھکا اور اس نے دیکھا کہ وہاں چار فٹ اونچی لوہے کی سلاخیں گڑی ہوئی تھیں۔ یہ پنجرے تھے اور ان میں گھاس پر کچھ لوگ سمٹے پڑے ہوئے تھے۔ ان میں سے کسی نے حرکت نہیں کی۔ یونگ دوسرے پنجرے کی جانب گیا، وہاں بھی سب لوگ بے حس و حرکت پڑے ہوئے تھے۔

یونگ نے ڈینگ سان کو اشارہ کیا۔ اس نے جیب سے ایک ٹارچ نکالی اور یونگ کو پکڑا دی۔ اس نے یہ ٹارچ خیمے سے اٹھائی تھی۔ یونگ نے ٹارچ روشن کی اور اس کی روشنی پنجرے میں بیٹھے ہوئے شخص پر ڈالتے ہوئے پوچھا۔ ”تم ٹھیک تو ہو؟“

اس شخص کی آنکھ میں آنسو آ گئے اور وہ زار و قطار رونے لگا۔ یونگ نے ٹارچ کی روشنی اطراف میں ڈالی تو اسے مزید کئی آنکھوں میں خوف و دہشت کے سائے لرزتے نظر آئے۔

”بہت ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔“ یونگ نے ان سے کورین میں کہا۔ ”تم ہمارے ساتھ ہی یہاں سے جاؤ گے۔“

ڈینگ سان نے گچھے میں سے چابیاں ٹٹولیں اور ایک ایک کر کے تمام لوہے کے پنجرے کھول دیے۔ وہ سب گودام کے بیرونی دروازے پر جمع ہو گئے۔ یونگ نے ان کی گنتی کی تو معلوم ہوا کہ قیدی بنائے جانے والے ان افراد میں چھ مرد اور آٹھ عورتیں تھیں۔ وہ سب زمین پر سر جھکائے بیٹھے ہوئے تھے۔ یونگ نے انہیں بتا دیا تھا کہ یہاں سے نکلنے کے بعد زبان کے بجائے ہاتھ کے اشاروں سے کام لیا جائے گا۔ وہ سب کیمپ سے نکلنے کے بعد ڈینگ سان کے پیچھے چلیں گے لیکن اس سے پہلے اسے امریکن نرس کو بھی ساتھ لینا ہے۔ ان قیدیوں نے سرگوشی میں اسے بتایا کہ نرس کو علیحدہ خیمے میں رکھا گیا ہے۔ جہاں بیماروں کا علاج ہوتا ہے۔ یونگ کے پوچھنے پر انہوں نے بتایا کہ اس وقت اس خیمے میں ایک ہی بیمار بچہ موجود ہے جسے لوگ چھوٹے ریچھ کے نام سے جانتے ہیں اور وہ سفید ریچھ کا اکلوتا پوتا ہے۔

”گویا وہ اس کی تیمارداری کے لیے یہاں لائی گئی ہے؟“ یونگ نے کہا۔

”ہاں۔“ ایک قیدی نے اسے بتایا۔ ”وہ سفید ریچھ کا اکلوتا وارث ہے۔ اس کا باپ ایک جھڑپ میں مارا گیا تھا اور اب اس کی بیماری نے سفید ریچھ کو پریشان کر رکھا ہے۔ وہ لڑکا ہر وقت کھانستا رہتا ہے اور اسے اندیشہ تھا کہ کہیں وہ مر نہ جائے لیکن امریکن نرس کے آنے کے بعد اس کی حالت میں بہتری آئی ہے۔“

یہ نرس کروڈی کا کردار اور پیشے سے اس کی لگن تھی کہ وہ ایک ایسے شخص کے پوتے کی تیمارداری کر رہی تھی جس نے اسے قید میں رکھا ہوا تھا۔

”اس لڑکے کے صحت یاب ہو جانے کے بعد وہ نرس کے ساتھ کیا سلوک کریں گے؟“ یونگ نے پوچھا۔

قیدی سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”شاید وہ اسے بیچ دیں جس طرح انہوں نے ہمیں بیچنے کا منصوبہ بنا رکھا تھا۔“

یونگ گودام سے نکل کر اس خیمے کی جانب چل دیا جہاں نرس کے ملنے کا امکان ہو سکتا تھا۔ وہ خیمہ ہیڈ کوارٹر کے پیچھے کیمپ کے عقبی حصے میں تھا۔ اس وقت وہاں بالکل خاموشی چھائی ہوئی تھی لیکن کسی وقت بھی محافظوں کی ڈیوٹی تبدیل ہو سکتی تھی۔ یونگ کے علم میں تھا کہ زیادہ تر محافظوں

کی ڈیوٹی ہر دو گھنٹے بعد بدل جاتی ہے۔ اس کے بعد اچھے سے اچھا سپاہی بھی چوکس نہیں رہ سکتا۔ یونگ کو اندازہ تھا کہ اسے کیمپ میں آئے ہوئے دو گھنٹے ہونے ہی والے تھے اور اب اس کے پاس زیادہ وقت نہیں تھا۔

خیمے میں موم بتی روشن تھی۔ یونگ نے پردہ ہٹا کر جھانکا تو اس کی نظر ایک طویل قامت شخص پر گئی۔ ناکافی روشنی میں اس کا ہیولا واضح نہیں تھا لیکن اس کے لمبے قد سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ نرس کروڈی نہیں ہے، پھر رات کے اس پہر کون یہاں آسکتا ہے پھر فوراً ہی اسے اپنے سوال کا جواب مل گیا۔ ایک ہی شخص ہے جو اپنے قانونی وارث کے لیے فکرمند ہو سکتا ہے۔ اس نے رائفل کا سیفٹی کیچ ہٹایا اور آندھی طوفان کے مانند خیمے میں داخل ہو گیا۔ آہٹ سنتے ہی سفید داڑھی والا شخص اس کی جانب گھوم گیا۔

”ایک بھی آواز نکالی۔“ یونگ غراتے ہوئے بولا۔ ”تو میں تمہیں کھڑے کھڑے مار دوں گا۔“

اس شخص نے براؤن رنگ کی اونی پتلون اور اسی رنگ کی جیکٹ پہن رکھی تھی۔ یونگ کی دھمکی کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ دبنگ لہجے میں بولا۔ ”تم یہاں سے زندہ نہیں جا سکتے۔“

”اگر میں مرا تو تمہیں بھی ساتھ لے کر مروں گا۔“ یونگ نے کہا۔

اس شخص کے پیچھے ایک سفید چادر رسی پر لٹک رہی تھی۔ یونگ نے اس کی طرف رائفل کا رخ کرتے ہوئے آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔ اس نے احتیاط سے چادر ہٹائی اور خیمے کے عقبی حصے میں داخل ہو گیا۔ وہاں بستر پر ایک آٹھ نو سال کا لڑکا لیٹا ہوا تھا۔ اس کے برابر میں ایک فولڈنگ چیئر پر نرس کروڈی بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ بہت نڈھال اور تھکی ہوئی لگ رہی تھی۔ اس نے سر گھما کر دیکھا اور اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ وہ اپنی جگہ پر کھڑی ہو گئی۔ اس کے ٹخنے میں ایک زنجیر بندھی ہوئی تھی۔

یونگ، تم!“ وہ بے یقینی کے عالم میں بولی۔

یونگ کے ایک ہاتھ میں رائفل تھی۔ دوسرے ہاتھ سے اس نے چابیوں کا گچھا نکالا اور اسے نرس کی طرف اچھالا جسے اس نے بڑی پھرتی سے اچک لیا پھر وہ کسی ہچکچاہٹ کے بغیر جھکی اور مطلوبہ چابی تلاش کرنے لگی۔

یونگ نے بوڑھے آدمی پر سے نظریں ہٹائے بغیر نرس سے انگریزی میں پوچھا۔ ”یہ شخص کون ہے؟“

”سفید ریچھ۔“ نرس کروڈی نے کہا۔ وہ باری باری ہر چابی کو اپنے ٹخنے کی زنجیر میں پڑے ہوئے تالے میں لگا کر دیکھ رہی تھی۔ ”یہ لڑکا اس کا پوتا ہے اور اسے کالی کھانسی ہو گئی ہے۔ ان کا خیال تھا کہ میں اس کے لیے کچھ کر سکتی ہوں لیکن یہ ٹھیک نہیں ہو رہا کیونکہ یہاں علاج معالجے کی کوئی سہولت نہیں ہے۔ میں زیادہ سے زیادہ اسے آرام پہنچا سکتی ہوں۔ یہ خود بخود ٹھیک ہو جائے گا یا نہیں۔“

پھر وہ کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ ”تم بولنے میں احتیاط سے کام لو۔ یہ تھوڑی بہت انگریزی سمجھ لیتا ہے۔“

”یہ تو اچھی بات ہے۔“ یونگ نے جواب دیا۔ ”امید ہے کہ یہ بات اس کی سمجھ میں آ گئی ہوگی کہ اگر اس نے ہمیں مشکل میں ڈالا تو میں اسے گولی مار دوں گا۔“

نرس کی زنجیر کا تالا کھل گیا اور وہ اپنے ٹخنے کو سہلانے لگی۔ یونگ نے کہا۔ ”اب ہمیں چلنا چاہیے۔“

”ایک منٹ۔“ نرس نے کہا پھر وہ آگے بڑھی۔ اس نے چھوٹے ریچھ کے گرم گالوں کو چھوا پھر جھک کر ان کا بوسہ لے لیا۔

## قرض

ایک آدمی تالاب میں ڈوب رہا تھا، اس کے دوست نے چھلانگ لگا کر اسے بچا لیا۔ لوگوں نے پوچھا: ”تم تو اتنے ڈرپوک ہو، اسے بچانے کے لیے پانی میں چھلانگ کیسے لگا دی؟“

وہ بولا۔ ”مجھے اس آدمی سے اپنے پانچ سو روپے وصول کرنے تھے۔ اگر یہ ڈوب جاتا تو میرے پانچ سو روپے بھی ڈوب جاتے۔“

☆☆☆

## تکرار

ایک بس میں کنڈیکٹر اور ایک نوجوان عورت کے درمیان بچے کی عمر کے بارے میں تکرار ہو رہی تھی۔ ”میرا لڑکا چار سال کا کس طرح ہو سکتا ہے، تم ہی بتاؤ میری شادی کو ابھی تین سال پورے نہیں ہوئے۔“

کنڈیکٹر زچ آ کر بولا۔ ”میڈم! میں صرف بچے کا ٹکٹ لینے کا کہہ رہا ہوں، کیونکہ وہ چار سال کا لگتا ہے لیکن آپ خوامخواہ اپنی شادی اور بچے کی پیدائش کے بارے میں ایسی صفائی پیش کر کے شبہات پیدا کر رہی ہیں۔“

سید خواجہ ممتاز علی، راولپنڈی

یونگ نے کہا۔ ''اسی زنجیر سے اس بوڑھے کے ہاتھ پشت کی جانب باندھ دو اور زنجیر کا دوسرا سرا اس بانس کے گرد لپیٹ کر اسے مقفل کردو۔''

نرس احتیاط سے آگے بڑھی اور یونگ کی ہدایت کے مطابق سفید ریچھ کو خیمے کے وسط میں گڑے ہوئے بانس کے ساتھ باندھ دیا۔

''اب اس کے منہ میں بھی کپڑا ٹھونس دو تاکہ یہ شور نہ مچاسکے۔''

نرس نے دراز کی تلاشی لی تو اسے وہاں کپڑے کی پٹی اور ٹیپ مل گیا۔ اس نے کپڑا اس کے منہ میں ٹھونس کر اس پر ٹیپ لگادیا۔ جب وہ اپنا کام ختم کرچکی تو یونگ سفید ریچھ کی جانب بڑھا اور رائفل کی نال سے اس کی دونوں آنکھوں کے درمیان نشانہ لینے لگا۔

''نہیں، ایسا مت کرو۔'' نرس نے کہا۔

''کیوں؟ یہ ایک چور، زانی اور بردہ فروش ہے۔ اسے مرجانا چاہیے۔''

''نہیں، ایسا نہیں کرو۔'' نرس نے دوبارہ کہا تو یونگ نے رائفل کا رخ چھوٹے ریچھ کی طرف کرلیا۔ سفید ریچھ نے یہ دیکھ کر اپنے آپ کو زنجیر سے آزاد کرانے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہیں ہوسکا۔ یونگ نے نال کا رخ آسمان کی طرف کیا اور بولا۔ ''اگر تم نے ہمارا پیچھا کیا تو میں واپس آکر تم دونوں کو جان سے ماردوں گا۔''

سفید ریچھ نے اسے گھورا۔ اس کی آنکھوں سے نفرت ٹپک رہی تھی۔ یونگ اسے بے بسی کے عالم میں چھوڑ کر نرس کے ہمراہ گودام میں آیا جہاں سب لوگ ان کا انتظار کررہے تھے۔ چند لمحوں بعد یہ قافلہ واپسی کے سفر پر روانہ ہوگیا۔ وہ لوگ جھیل تک پہنچ پائے تھے کہ کیمپ سے الارم بجنے کی آواز سنائی دی۔ کچھ قیدیوں کو دوڑنے میں تکلیف ہورہی تھی۔ ان کی ٹانگیں گھنٹوں ایک ہی پوزیشن میں بیٹھے بیٹھے اکڑ گئی تھیں تاہم نرس اور دوسرے صحت مند قیدیوں نے ان کی مدد کی اور وہ چلنے کے قابل ہوگئے۔

کچھ دور آگے چلنے کے بعد ڈینگ سان ایک جگہ رک گیا تاکہ ان مسلح لوگوں کا راستہ روک سکے جو سفید ریچھ کے کیمپ میں جمع ہورہے تھے۔ یونگ نے کہا کہ اسے زیادہ دیر رکنے کی ضرورت نہیں۔ اس پر ڈینگ سان نے اسے یقین دلایا کہ وہ صرف چند فائر کرے گا تاکہ ان لوگوں کو آگے بڑھنے سے روکا جاسکے۔ ڈینگ سان کو وہیں چھوڑ کر یہ قافلہ ڈھلان کی جانب بڑھ گیا۔ ابھی ان لوگوں نے آدھے میل کا فاصلہ طے کیا تھا کہ فائر کی آوازیں آنے لگیں۔ یونگ کو امید تھی کہ ڈینگ سان اتنا احمق نہیں کہ اس سلسلے کو دیر تک جاری رکھے۔

یونگ نے جس جگہ اپنی گاڑی اور ٹنو کو چھوڑا تھا، وہاں پہنچ کر اس نے قافلے کے لوگوں کو کچھ دیر آرام کرنے کے لیے کہا۔ اب وہ لوگ خطرے کی حدود سے باہر نکل آئے تھے اور فائر کی آوازیں آنا بند ہوگئی تھیں۔ یونگ نے نرس کروڈی اور کورین پناہ گزینوں کو ہدایات دیں اور سمجھایا کہ وہ کس طرح پناہ گزینوں کے کیمپ تک پہنچ سکتے ہیں۔

''کیا تم ہمارے ساتھ نہیں جاؤ گے؟'' نرس نے پوچھا۔

''میں یہاں رک کر ڈینگ سان کا انتظار کروں گا۔ اس کے آنے کے بعد ہم دونوں کوشش کریں گے کہ جہاں تک ممکن ہو سفید ریچھ اور اس کے ساتھیوں کی پیش قدمی روک سکیں۔''

نرس کروڈی اپنا سرد ہاتھ اس کے بازو پر رکھتے ہوئے بولی۔ ''اپنا خیال رکھنا۔''

اس نے سر ہلایا اور ٹیلے کے عقب میں پوزیشن لے کر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد ڈینگ سان بھی آگیا۔ وہ پسینے میں شرابور تھا اور اس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔

''سفید ریچھ غصے سے پاگل ہوگیا ہے۔'' اس نے کہا۔ ''میں نے اس کے چیخنے چلانے کی آوازیں سو گز دور سے سنی تھیں۔''

''اس کے ساتھ کتنے آدمی ہیں؟'' یونگ نے پوچھا۔

''بیس کے قریب تو ہوں گے۔''

''کیا وہ سینکیا میں داخل ہوسکتے ہیں؟''

''ممکن ہے۔ ایسے موقع پر پولیس اپنا منہ چھپالیتی ہے کیونکہ سفید ریچھ نے انہیں خرید رکھا ہے اور وہ یہی ظاہر کرتے ہیں کہ انہیں کچھ معلوم نہیں۔''

یونگ سوچ رہا تھا کہ اگر وہ سفید ریچھ اور اس کے ساتھیوں کو اتنی دیر روک سکے کہ نرس کروڈی اور دوسرے لوگ سینکیا اور وہاں سے مہاجر کیمپ تک پہنچ سکیں۔ ایسی صورت میں وہ وقتی طور پر محفوظ رہیں گے۔''

جب سفید ریچھ اور اس کے ساتھی وہاں پہنچے تو شفق کی لالی آسمان پر نمودار ہورہی تھی۔ اب ڈینگ سان اور یونگ کو بڑی احتیاط سے اپنا اسلحہ استعمال کرنا تھا۔ وہ ایک ایک کرکے اپنا شکار منتخب کررہے تھے۔ کچھ دیر تو سفید ریچھ کے ساتھیوں نے بے دریغ گولیاں چلائیں پھر انہیں اپنے نقصان کا اندازہ ہوا تو وہ پیچھے ہٹنے پر مجبور ہوگئے۔ سورج اب پوری طرح نکل آیا تھا اور یونگ سوچ رہا تھا کہ وہ اس

موقع سے فائدہ اٹھا کر بھاگ جائے یا یہیں رک کر ان کا مقابلہ کرے تبھی دیوتاؤں نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔

اچانک زمین ہلنے لگی اور جس ٹیلے کے پیچھے انہوں نے آڑ لے رکھی تھی، وہ بھی ڈگمگانے لگا۔ ڈینگ سان تیزی سے پیچھے ہٹا جبکہ یونگ اپنی جگہ بیٹھا سفید ریچھ اور اس کے ساتھیوں پر نظریں جمائے ہوئے تھا پھر جو کچھ اس نے دیکھا، وہ اسے حیران کر دینے کے لیے کافی تھا۔ سفید ریچھ اور اس کے ساتھی اپنی پناہ گاہ سے باہر آئے۔ ان کی پشت یونگ کی جانب تھی اور وہ پہاڑی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ پھر سفید ریچھ نے اپنے دونوں ہاتھ سر سے بلند کیے اور کوئی دعائیہ گیت گانا شروع کر دیا۔ دوسروں نے بھی اس کی تقلید کی۔

ایک بار پھر زمین میں گڑگڑاہٹ ہوئی۔ اس مرتبہ ایک شعلہ بلند ہوا پھر دھوئیں کے بادل چھا گئے۔ یوں لگتا تھا کہ آتش بازی ہو رہی ہے۔ پھر وہ شعلہ غائب ہو گیا لیکن سفید ریچھ اور اس کے ساتھی اور زیادہ بلند آواز میں دعائیہ گیت گاتے رہے پھر سفید ریچھ گھٹنوں کے بل جھکا اور اس نے اپنا سر زمین پر رکھ دیا۔ عین اسی وقت فضا میں ایک سرسراہٹ سی سنائی دی۔ اس نے فوراً سر جھکا دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ ٹیلا کنکروں اور راکھ سے بھر گیا۔ یونگ اپنے سر کو بچاتے ہوئے نیچے کی جانب جھکا اور لڑھکتا ہوا ڈینگ سان کے قریب پہنچ گیا۔

''اب ہمیں چلنا چاہیے۔'' یونگ نے کہا اور وہ دونوں ڈھلان پر چلنے لگے۔ کبھی کبھی وہ پیچھے مڑ کر دیکھ لیتے کہ سفید ریچھ کے ساتھی ان کا تعاقب تو نہیں کر رہے۔

انہیں لے جانے والی ٹرین دوسری صبح آئی۔ اسی گاڑی سے ژیاؤ منگ اور دوسرے عارضی مزدوروں کو زرعی کیون میں جانا تھا جہاں انہیں آئندہ کٹائی کے لیے کام مل سکتا تھا۔ وہ سینکیا کے کھیتوں میں اپنا کام ختم کر چکے تھے۔ پلیٹ فارم لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ ان میں عارضی مزدوروں کے علاوہ مقامی شہری بھی تھے جو دوبارہ لاوا پھوٹنے کے ڈر سے عارضی نقل مکانی کر رہے تھے۔

یونگ ٹکٹ خرید کر آیا تو ڈینگ سان نے اسے کہنی سے ٹہوکا دیا۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ سفید ریچھ اپنی جیکٹ میں ملبوس نصف درجن لوگوں کے ساتھ کھڑا ہوا تھا جو شکل سے ہی ٹھگ لگ رہے تھے۔ ژیاؤ منگ وعدہ کر چکا تھا کہ وہ شمالی کوریا کے پناہ گزینوں کو اپنے قافلے میں شامل کر لے گا اور انہیں کام پر بھی لگوا دے گا۔ اس لیے اس بات کا بہت کم امکان تھا کہ چینی حکام ان کے کاغذات چیک کریں گے۔

## بجو

ایک نوجوان شاعر جب پہلی بار عینک لگا کر مشاعرے میں نظم پڑھنے گیا تو بوڑھے میزبان شاعر نے کہا۔ ''عینک لگا کر تم بالکل بجو لگتے ہو۔''

نوجوان شاعر بولا۔ ''عینک اتار دو تو پھر آپ مجھ کو بجو لگیں گے۔''

## ٹریجڈی

مادہ کینگرو گھر میں داخل ہوئی تو نر کینگرو نے پوچھا۔

''منا کہاں ہے؟''

مادہ کینگرو نے جھک کر نیچے دیکھا اور چلا اٹھی۔

''اوہ میرے خدا... ! کسی نے میری جیب کاٹ لی...!''

یونگ اور ڈینگ سان پہلے ہی محافظوں سے چھینی ہوئی رائفلوں سے چھٹکارا حاصل کر چکے تھے کیونکہ وہ غیر قانونی اسلحہ رکھنے کے الزام میں گرفتار ہونا نہیں چاہتے تھے اور نہ ہی وہ انہیں بیچ سکتے تھے کیونکہ یہ اس سے بڑا جرم تھا۔ لہٰذا انہوں نے اس اسلحہ کو مزدوروں کے کیمپ کے باہر گڑھا کھود کر دفن کر دیا۔ سفید ریچھ اور اس کے ساتھی ٹھگ بھی مسلح نہیں تھے۔ یونگ کا خیال تھا کہ وہ لوگ ژیاؤ منگ کے ساتھیوں کی آڑ میں ٹرین تک پہنچنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

اچانک سفید ریچھ کے ساتھیوں میں سے ایک نے اس کورین عورت کی جانب اشارہ کیا جسے مزدور عورتوں نے اپنے گھیرے میں لے رکھا تھا۔ اس شخص نے سفید ریچھ کے کان میں سرگوشی کی اور وہ بھڑک اٹھا جیسے کوئی اس کی قیمتی شے لے جا رہا ہو۔ اس نے اپنے ساتھیوں کو احکامات دینا شروع کیے اور اس کے نصف درجن ساتھی مجمع میں گھس گئے۔ یہ دیکھ کر ژیاؤ منگ بھی خاموش نہ رہ سکا اور اس نے چلا کر اپنے ساتھیوں کو چوکس کرنا چاہا۔ اس پر ایک عورت نے ٹھگوں کو روکنے کی کوشش کی لیکن سب سے آگے والے ٹھگ نے اسے پیچھے دھکیل دیا۔ اس پر شمالی کوریا کے پناہ گزینوں نے بلند آواز میں آہ و زاری شروع کر دی۔

یہ منظر چینی مزدوروں کے لیے ناقابل برداشت تھا۔ ان کے چہرے غصے سے سرخ ہو گئے اور انہیں یاد آ گیا کہ

ماضی میں سفید ریچھ اور اس کا گروہ ان کے ساتھ کیا سلوک کر چکا ہے لیکن اس بار حالات مختلف تھے۔ شاید یہ بے بس کورین عورتوں کی موجودگی تھی یا پھر ان کے اندر نرس کروڈی جیسی تعلیم یافتہ عورت کو دیکھ کر ہمت پیدا ہوگئی تھی لہٰذا وہ خونخوار بھیڑیوں کی طرح سفید ریچھ اور اس کے ساتھیوں پر ٹوٹ پڑے۔

ٹرین نے سیٹی دی تو سب لوگ چیختے چلاتے اس کی طرف بھاگے۔ سفید ریچھ اور اس کے ساتھی بھی ان کے ہمراہ تھے۔ چینی مزدور انہیں لاتیں گھونسے مار رہے تھے۔ سفید ریچھ نے مقابلہ کرنے کی کوشش کی لیکن مجمع کے سامنے ٹھہر نہ سکا۔ تھوڑی دیر میں وہ زمین پر گر چکا تھا اور اس کی حفاظت کرنے والے ٹھگ بھی ایک ایک کر کے پسپا ہورہے تھے۔ تھوڑی سی جدوجہد کے بعد تمام چینی مزدور اور کورین پناہ گزین ٹرین پر سوار ہونے میں کامیاب ہوگئے۔ یونگ، ڈینگ سان اور نرس کروڈی کو آخری بوگی میں جگہ ملی۔ ٹرین کے جانے کے بعد تین پولیس والے زمین پر چت پڑے ہوئے ٹھگوں کے سر پر پہنچ گئے۔ ان میں سے ایک نے سفید ریچھ کے منہ پر تھوکا اور دوسرا اپنے جوتے سے اس کے جسم پر ضربیں لگانے لگا۔ سفید ریچھ کے منہ سے خون بہنے لگا اور اس کی آنکھیں خلا میں جم کر رہ گئیں۔ اس کی دہشت اور طاقت ختم ہوچکی تھی اور اب وہ ایک بے وقعت انسان کی طرح چینی سپاہیوں کے قدموں میں پڑا ہوا تھا۔

کیمپ واپس پہنچنے پر ڈاکٹر البرڈو نے نرس کروڈی کا پرتپاک خیر مقدم کیا پھر اس نے اسے ایمرجنسی روم میں بھیج دیا تاکہ اس کا طبی معائنہ کیا جاسکے۔ اس کے جانے کے بعد وہ یونگ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ”اب ہمیں یہاں کی سیکیورٹی بڑھانی ہوگی۔ میں نہیں چاہتا کہ دوبارہ اس طرح کا واقعہ ہو۔“

یونگ نے ڈینگ سان کی پیٹھ تھپتھپائی اور بولا۔

”اب یہ تمہارا نیا سیکیورٹی انچارج ہوگا۔“

”تم کیا کہنا چاہ رہے ہو؟“ ڈاکٹر نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔

”میرا استعفیٰ کل صبح تمہاری میز پر پہنچ جائے گا۔“

”لیکن کیوں؟ اتنا اچھا کام کرنے کے بعد تم یہاں سے جارہے ہو؟“

”ہاں، میرے جانے کا وقت آگیا ہے۔“ یونگ نے کہا۔ ”اگر زیادہ عرصہ کوئی کام کرلوں تو بے چینی ہونے لگتی ہے۔“

”ٹھیک ہے۔ میں تمہیں تعریفی خط دوں گا اور تمہارے جانے کا ہمیشہ افسوس رہے گا۔“

بیجنگ جانے والی بس میں سوار ہوتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا کہ اس کی اگلی منزل کون سی ہوسکتی ہے لیکن جلد ہی اس کے خیالات کا رخ نرس کروڈی کی طرف ہوگیا اور اسے ٹرین کے سفر میں ہونے والی گفتگو یاد آنے لگی۔ نرس نے اس سے پوچھا تھا۔ ”کیا وہ محفوظ رہیں گے؟“ اس کا اشارہ شمالی کوریائی پناہ گزینوں کی جانب تھا۔

”ہاں۔“ یونگ نے جواب دیا۔ ”ژیاؤمنگ نے انہیں کام دلوانے کا وعدہ کیا ہے۔ وہ محنتی لوگ ہیں اور ان کے لیے یہی بہتر ہے کہ وہ چینی مزدوروں کے درمیان رہ کر کام کریں۔“

”چھوٹے ریچھ کا کیا ہوگا؟“ وہ فکرمندی سے بولی۔

”اس کا باپ اور دادا، دونوں ہی دنیا سے چلے گئے۔“

”اس کی فکر نہ کرو۔ وہ اپنے لوگوں کے درمیان ہے۔“ یونگ نے کہا۔

”مجھے امید ہے کہ تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔“

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد یونگ نے وہ بات کہہ دی جو وہ عرصے سے کہنا چاہ رہا تھا۔ یہ الفاظ منہ سے نکالنا آسان نہ تھا اور نہ ہی وہ ایسی گفتگو کا عادی تھا مگر اس نے ہمت کر ڈالی۔ نرس نے پیار سے اس کی جانب دیکھا اور اس کا ہاتھ تھام کر ایک ٹھنڈی سانس لی۔

پہلے تو اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہہ رہی تھی پھر اسے احساس ہوا کہ اس کی توجہ کا مرکز وہ نہیں بلکہ کوئی اور ہے۔ نرس کروڈی کو اپنے کام سے محبت تھی۔ وہ بچوں پر جان چھڑکتی تھی اور وہ کسی ایسے مرد کو اپنی زندگی کا ساتھی بنانا چاہتی تھی جو اسی کی طرح مہربان، حساس اور جذباتی ہو۔ نرس کروڈی نے جو کچھ کہا، اس کا مفہوم اب اس کی سمجھ میں آیا تھا۔ وہ اسے پسند کرتی تھی لیکن اس کے لیے جذباتی نہیں تھی اور اسے یقین تھا کہ وہ ایک روز اپنے لیے کوئی مناسب لڑکی تلاش کرلے گا۔

بس بیجنگ کے اسٹیشن پر رکی تو اس نے اپنا سامان سنبھالا اور نیچے اتر آیا۔ اس کے دائیں بائیں لاتعداد عورتیں چل رہی تھیں۔ ان میں سے کئی بہت خوب صورت اور اسمارٹ تھیں لیکن کوئی بھی نرس کروڈی جیسی نہیں تھی۔ اس نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے اتنے بڑے ہجوم میں اپنے آپ کو بہت تنہا محسوس کیا۔ اسے یوں لگا کہ وہ جیت کر بھی ہار گیا تھا پھر اس کی نظر ایک بار پر گئی اور وہ اس جانب بڑھ گیا۔

◆

# چھٹکارا

سلیم فاروقی

شطرنج کا کھیل سکون... سوچوں اور ذہنی قلابازیوں کا نام ہے... ایک مہرہ آگے بڑھانے کے لیے دور تک سوچنا پڑتا ہے... ورنہ ایک غلط چال پوری بازی کو پلٹ دیتی ہے... ہار سے بچنے کے لیے مہرے کو پٹوانا بھی پڑتا ہے... زندگی کی بساط پر بکھرے کچھ ایسے ہی مہروں کا شاطرانہ کھیل... جو پرانے اور بیکار مہروں سے نجات کے لیے آخری حد تک جا پہنچے تھے...

**ازدواجی زندگی کی نازک ڈوریں... جو سخت اور غلط سمتوں میں بندھ چکی تھیں...**

جمشید نے اسے ایک پارٹی میں دیکھا تھا۔ وہ لڑکی اتنی ہی حسین تھی کہ جمشید کی آنکھیں گویا چندھیا گئی تھیں۔ اگر رضوانہ ساتھ نہ ہوتی تو وہ ایک لمحے کی بھی تاخیر کیے بغیر حسینہ سے ملاقات کرلیتا۔

وہ اس وقت تنہا تھی اور ایک طرف بیٹھی مہمانوں کو گھور رہی تھی۔ شاید اسے کسی دوست کی آمد کا انتظار تھا۔

اچانک رضوانہ اپنی جگہ سے اٹھی اور بولی۔ ”جمشید، میں ذرا واش روم کی طرف جارہی ہوں۔“

جمشید نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا، بس مسکرا کر رہ گیا۔

رضوانہ کے جاتے ہی وہ حسینہ اپنی جگہ سے اٹھی اور خراماں خراماں چلتی ہوئی جمشید کے پاس آئی اور بہت ادا سے بولی۔ ''اگر میں غلطی نہیں کر رہی ہوں تو آپ آرٹس کرافٹس ایڈورٹائزنگ کے اونر مسٹر جمشید ہیں؟''

جمشید چونک اٹھا۔ وہ شہر کی جانی پہچانی شخصیت تھی۔ اکثر اخبارات اور ٹی وی پر اس کے انٹرویوز آتے رہتے تھے۔ اس نے مسکرا کر جواب دیا۔ ''آپ بالکل غلطی نہیں کر رہی ہیں۔ میں ہی جمشید ہوں۔''

''میں شائلہ ہوں۔'' اس نے اپنا تعارف کرایا۔ ''آپ نے شاید مجھے ایک ٹالکم پاؤڈر کے اشتہار میں دیکھا ہو؟''

''ہاں، چہرہ کچھ جانا پہچانا تو لگ رہا ہے۔ گویا آپ ماڈل ہیں؟''

''جی ہاں۔'' وہ بولی۔ ''آپ نے درست فرمایا۔''

''آپ ایسا کریں۔'' جمشید نے اپنا وزیٹنگ کارڈ نکالتے ہوئے کہا۔ ''یہ میرا کارڈ رکھ لیں اور کل کسی وقت ٹیلی فون کر کے میرے آفس آجائیے گا۔''

شائلہ نے کارڈ لیا اور مسکرا کر بولی۔ ''میں ضرور حاضر ہو جاؤں گی۔'' وہ لہراتی ہوئی واپس چلی گئی۔

کچھ دیر بعد رضوانہ واپس آگئی۔

وہ لوگ ڈنر کے بعد واپس آئے تو جمشید کے حواس پر شائلہ سوار تھی۔ اس کی عمر ایسی نہیں تھی کہ کسی بھی خوب صورت لڑکی کو دیکھ کر اس کے دل کی دھڑکن بڑھ جائے۔ وہ چالیس سال کی عمر سے تجاوز کر چکا تھا۔ یہ بھی نہیں تھا کہ اس کے لیے خوب صورت چہروں کی کوئی کمی ہو۔ وہ ملک کی ایک بڑی ایڈورٹائزنگ کمپنی کا مالک تھا۔ شہر کے پوش علاقے میں اس کا بہترین آفس تھا۔ روزانہ اس کا واسطہ ماڈل لڑکیوں سے پڑتا رہتا تھا۔ اس کے دفتر میں بھی کئی خوب صورت اور طرح دار لڑکیاں ملازمت کرتی تھیں لیکن شائلہ میں نہ جانے کیا بات تھی کہ وہ پہلی ہی نظر میں اس کے حسن کا اسیر ہو گیا تھا۔

جمشید کی بیوی رضوانہ بھی بہت خوب صورت تھی اور جمشید نے اس سے پسند کی شادی کی تھی۔ اس سلسلے میں رضوانہ زیادہ جنونی تھی۔ وہ جمشید پر صرف اپنا حق سمجھتی تھی۔ جمشید اس سے دبتا بھی تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس پورے کاروبار کی مالک رضوانہ تھی۔ پندرہ برس پہلے جمشید اس ایڈورٹائزنگ فرم میں کلائنٹ ایگزیکٹو کے طور پر کام کرتا تھا، وہ بہت محنتی تھا۔ کمپنی کے مالک غزالی صاحب اس کی کارکردگی سے بہت خوش تھے۔ ان کی اکلوتی بیٹی رضوانہ بھی اکثر آفس آتی رہتی تھی۔ جمشید کی پہلی ملاقات رضوانہ سے غزالی صاحب کے دفتر ہی میں ہوئی تھی۔ رضوانہ نے جمشید کو دیکھا تو اس کی مردانہ وجاہت پر مر مٹی۔ جمشید کو بھی رضوانہ پسند آئی تھی۔

پھر دونوں کی کئی ملاقاتیں ہوئیں اور یہ ملاقاتیں بالآخر شادی پر ختم ہوئیں۔ غزالی صاحب بھی جمشید کو پسند کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ جمشید ان کی فرم کو زیادہ بہتر طریقے سے سنبھال سکتا ہے۔ جمشید نے اپنی محنت سے ثابت کر دیا کہ ان کا خیال غلط نہیں تھا۔

دو سال پہلے غزالی صاحب کا انتقال ہو چکا تھا لیکن انہوں نے شادی کے فوراً بعد ہی کمپنی کے تمام اختیارات جمشید کو سونپ دیے تھے۔ اب کمپنی کی مالک تو رضوانہ تھی لیکن عملی طور پر کمپنی کی تمام ذمے داریاں جمشید پر تھیں۔

جمشید کے لیے زیادہ تکلیف دہ رضوانہ کی شکی فطرت تھی۔ وہ بات بات پر جمشید پر شک کرتی تھی۔ وقفے وقفے سے دفتر ٹیلی فون کر کے یہ معلوم کرتی رہتی تھی کہ جمشید دفتر ہی میں موجود ہے یا نہیں۔ وہ اچانک دفتر بھی آجاتی تھی۔ وہ اتنی شکی مزاج تھی کہ محض شک کی بنا پر جمشید کی تین پرسنل سیکریٹریز کو ملازمت سے فارغ کر چکی تھی۔

جمشید اگر کسی وقت رضوانہ سے محبت کرتا بھی تھا تو اب اس کا جذبہ مر چکا تھا۔ اب تو وہ رضوانہ کو محض اس کی دولت اور جائداد کی خاطر برداشت کر رہا تھا۔ اگر رضوانہ اس فرم کی مالک نہ ہوتی تو جمشید اب تک اس سے علیحدگی اختیار کر چکا ہوتا۔

''تم ابھی تک سوئے نہیں؟'' رضوانہ کی آواز پر جمشید چونک اٹھا۔

وہ نہ جانے کب سے بستر پر کروٹیں بدل رہا تھا۔ نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ رہ رہ کر اسے شائلہ کا خیال آرہا تھا۔

''آج پتا نہیں کیوں مجھے نیند نہیں آرہی ہے۔'' جمشید نے بیزاری سے کہا۔

''بیڈ کی سائڈ دراز میں میری سلیپنگ پلز ہیں۔'' رضوانہ نے کہا۔ ''اس میں سے ایک ٹیبلیٹ لے لو۔'' رضوانہ نے اسے مشورہ دیا اور کروٹ بدل لی۔

''میرے سونے اور جاگنے کا اسے بہت خیال ہے؟''

READING Section
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

جمشید نے چڑ کر سوچا۔ ”ہر جگہ آسیب بن کر میرے ذہن پر سوار رہتی ہے۔ اب میرے سونے اور جاگنے پر بھی اس کا حکم چلے گا۔ کم بخت کو اندھیرے میں بھی نظر آتا ہے بلی کی طرح۔“

پھر کروٹیں بدل بدل کر رات کے نہ جانے کس پہر جمشید سو گیا۔

صبح اس کی طبیعت کافی بوجھل تھی۔ وہ تیار ہو کر ناشتے کی میز پر پہنچا تو رضوانہ پہلے سے وہاں موجود تھی اور اخبار پر نظر دوڑا رہی تھی۔

جمشید نے بہ غور اس کا جائزہ لیا۔ وہ آج بھی پہلے کی طرح پُرکشش اور متناسب جسم کی مالک تھی۔ اس کی فگر اب بھی وہی تھی جو شادی کے وقت تھی لیکن اسے اپنی اس خوب صورتی کا بہت بھاری معاوضہ دینا پڑا تھا۔

شادی کے ابتدائی دنوں میں وہ ماں بننے کو تیار ہی نہیں ہوتی تھی۔ جمشید اس سے کہتا تو وہ ترش لہجے میں کہتی۔ ”کیا تم چاہتے ہو کہ میں بھی گنوار عورتوں کی طرح بچے پیدا کرتی رہوں اور اپنے اس متناسب جسم سے ہاتھ دھو لوں۔ نہیں جمشید، ایسی بھی کیا جلدی ہے۔ ابھی تو عمر پڑی ہے۔ ابھی ہماری شادی کو صرف ایک ہی سال تو ہوا ہے۔“

”رضوانہ! ماں بننے سے تمہاری خوب صورتی میں کوئی کمی نہیں آجائے گی بلکہ...“

”جمشید پلیز۔“ رضوانہ اس کی بات کاٹ دیتی۔ ”میں تمہارا لیکچر سننے کے موڈ میں نہیں ہوں۔ میری ساس بننے کی کوشش مت کرو۔“

”عورت تو اولاد کے بغیر ادھوری ہوتی ہے، پھر تم کیسی عورت ہو؟“ جمشید نے تلخ لہجے میں کہا۔

”میں ابھی لڑکی ہوں۔“ رضوانہ نے ناک سکیڑ کر کہا۔ ”عورت کہہ کر مجھے ڈی گریڈ مت کرو۔“

غزالی صاحب نے بھی کئی مرتبہ دبے لفظوں میں اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ ”بیٹا! اب تو گھر کا سونا پن کاٹنے کو دوڑتا ہے۔ میرے کان کب سے کسی ننھے بچے کی قلقاریاں سننے کو ترس رہے ہیں۔“

رضوانہ ان کی بات کا بھی کوئی جواب نہیں دیتی تھی۔

وہ بے چارے نواسے، نواسی کی آرزو لیے اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔

ان کی شادی کو دس برس سے زیادہ ہو چکے تھے۔

☆☆☆

ایک رات وہ سونے لیٹے تو رضوانہ نے کہا۔ ”جمشید! آج مجھے سیما ملی تھی۔“

”کون سیما؟“ جمشید نے پوچھا۔

”ارے تم سیما کو بھول گئے۔ وہ بھولی کوئین جو...“

”اچھا اچھا، وہ سیما۔“ جمشید کو یاد آگیا۔ ”وہ جو تمہاری بیسٹ فرینڈ تھی اور جس نے ہماری شادی میں بہترین ڈانس کیا تھا۔“

”ہاں وہی سیما۔“ رضوانہ نے کہا۔ ”پھر عجیب سے لہجے میں بولی۔ ”اس کی شادی ہماری شادی کے ایک سال بعد ہوئی تھی۔ اب اس کا نو سال کا بیٹا ہے۔ سیما خود بھی ابھی تک پہلے ہی کی طرح اسمارٹ اور پُرکشش ہے۔ کتنا اچھا لگ رہا تھا جب اس کا بیٹا اسے مما کہہ کر پکار رہا تھا۔“

”تمہیں اچھا لگ رہا تھا؟“ جمشید نے تلخ لہجے میں کہا۔ ”تم تو بچوں کو پسند ہی نہیں کرتی ہو۔“

”فار گاڈ سیک جمشید۔“ رضوانہ نے کہا۔ ”آج مجھے احساس ہوا کہ میں غلطی پر تھی۔ سیما تو ماں بننے کے بعد پہلے سے بھی زیادہ خوب صورت ہو گئی ہے۔“

”شکر ہے تمہیں احساس تو ہوا۔“ جمشید کے لہجے میں گہرا طنز تھا۔ ”یہی میں تم سے کہتا تھا تو تم مجھے ساس ہونے کا طعنہ دیتی تھیں۔“

”طعنے تو تم اب بھی دے رہے ہو۔“ رضوانہ نے کہا۔ ”سوری... میں سوچتی ہوں کہ اب مجھے بھی ماں بن جانا چاہیے۔“

پھر رضوانہ واقعی اٹھتے بیٹھتے بچے کی آرزو کرنے لگی۔ جمشید اس کی بے تابی دیکھتا تھا اور مسکراتا تھا۔ رضوانہ کو ہر چیز کی جلدی ہوتی تھی۔ صبر تو اسے چھو کر بھی نہیں گزرا تھا۔

”آخر وہ ایک دن شہر کی معروف ڈاکٹر شمسہ کے پاس جا پہنچی۔ اس کی خواہش پر ڈاکٹر نے اس کے کئی لیبارٹری ٹیسٹ کیے اور یہ بھیانک انکشاف کیا کہ رضوانہ کبھی ماں نہیں بن سکتی۔

”کیوں ڈاکٹر؟“ رضوانہ چیخ کر بولی۔

”اس کی ذمے دار آپ خود ہیں مسز جمشید۔“ ڈاکٹر نے سرد لہجے میں کہا۔ ”آپ نے ابتدا میں فطرت کو اپنے ڈھب پر چلانا چاہا، مختلف طریقوں سے اولاد کا راستہ روکا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اللہ نے آپ کو اس بوجھ سے ہمیشہ کے لیے آزاد کر دیا۔“

”اس کا علاج دنیا میں کہیں تو ہوگا؟“ رضوانہ نے کہا۔ ”میں علاج کے لیے یورپ اور امریکا جاؤں گی۔“

”میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کی خواہش پوری

کرے۔'' ڈاکٹر نے کہا۔

وہاں سے واپسی پر رضوانہ بہت اُداس تھی۔ وہ دیر تک روتی رہی۔

جمشید نے اسے سمجھایا۔ ''رضو! یہ کوئی بیماری نہیں ہے کہ جس کا علاج نہ ہو۔ تم میں خدانخواستہ کوئی کمی بھی نہیں ہے۔ تم نے تو خود کئی بار اس بوجھ سے نجات حاصل کی ہے۔ یہاں نہ سہی، دنیا میں کہیں تو اس کا علاج ہوگا۔ سائنس نے بہت ترقی کرلی ہے۔ تم دل چھوٹا مت کرو۔ ہم امریکا جائیں گے۔''

پھر وہ دونوں چھ مہینے تک امریکا، برطانیہ اور یورپ کے کئی شہروں کے ماہر ڈاکٹروں کے پاس گئے لیکن رضوانہ کا علاج کوئی بھی نہ کرسکا۔

امریکا سے واپس آئی تو رضوانہ پہلے سے زیادہ چڑچڑی ہوگئی تھی۔ وہ اب جمشید پر پہلے سے زیادہ شک کرنے لگی تھی۔

ان کے گھر میں خالہ زینت برسوں سے کام کرتی تھیں۔ کام کیا کرتی تھیں، وہ گھر کے ایک فرد کی طرح تھیں۔ ان کی صرف ایک ہی بیٹی تھی، شکیلہ۔

اس دن خالہ زینت کے بدلے شکیلہ چائے لے کر آئی تھی، رضوانہ اسے دیکھ کر چونک اٹھی۔ چند برسوں میں اس نے خوب رنگ روپ نکال لیا تھا۔ تروتازہ چہرہ، متناسب جسم۔

رضوانہ نے کن انکھیوں سے جمشید کی طرف دیکھا جو۔ ٹی وی پر کرکٹ میچ دیکھنے میں مصروف تھا۔

''اماں کہاں ہے تمہاری؟'' رضوانہ نے سرد لہجے میں پوچھا۔

''امی کو رات سے بخار آرہا ہے۔ بخار میں بھی ناشتا وہی بنا کر گئی تھیں۔ مجھ سے کہہ گئی تھیں کہ میں کوارٹر میں جارہی ہوں۔ تم صاحب اور بیگم صاحبہ کو چائے دے آنا۔''

''اچھا اچھا۔'' رضوانہ نے سرد لہجے میں کہا۔ ''اب تم جاؤ، ضرورت ہوئی تو تمہیں بلالوں گی۔''

''جی اچھا بیگم صاحبہ۔'' شکیلہ نے کہا اور واپس چلی گئی۔

جمشید بظاہر ٹی وی دیکھ رہا تھا لیکن رضوانہ کی باتیں سن کر چونک اٹھا تھا۔ اسے محسوس ہوگیا تھا کہ اب خالہ زینت یہاں زیادہ دن نہیں رہیں گی۔

جمشید کے اندازے کے برعکس رضوانہ نے دوسرا کام کیا، شکیلہ کی شادی اپنے دفتر کے ایک سیلز آفیسر سے کرا دی۔ اس نے اپنے خیال میں یہ نیکی کا کام کیا تھا لیکن جمشید جانتا تھا کہ اس نیکی کے پیچھے کون سا جذبہ کارفرما ہے۔

''آج تمہارا کیا پروگرام ہے؟'' رضوانہ نے جمشید سے پوچھا۔

''آفس جانے کا پروگرام ہے۔'' جمشید نے ہنس کر کہا۔

''میرا مطلب ہے کہ آفس میں کوئی میٹنگ تو نہیں ہے یا تمہیں کسی کلائنٹ کے پاس تو نہیں جانا؟''

جمشید چونک اٹھا۔ اسے محسوس ہوا جیسے رضوانہ کو شائلہ کے بارے میں علم ہوگیا ہو۔ اس نے کہا۔ ''ایسا کوئی خاص پروگرام تو نہیں ہے، کوئی کلائنٹ آ بھی سکتا ہے۔ تم کیوں پوچھ رہی ہو؟''

''مجھے آج جیولرز کی طرف جانا تھا۔ میں نے نیکلس کے کچھ ڈیزائن پسند تو کیے تھے۔ میں چاہتی ہوں کہ ایک نظر تم بھی دیکھ لو، آفٹر آل تمہاری چوائس تو زبردست ہے۔''

''کس وقت جاؤ گی؟'' جمشید نے پوچھا۔

''میں لنچ کے بعد آؤں گی۔'' رضوانہ نے کہا۔

''ٹھیک ہے۔'' جمشید نے اٹھتے ہوئے کہا اور بریف کیس اٹھا کر روانہ ہوگیا۔

راستے میں وہ ڈرائیو کرتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ شائلہ کو آج کے بجائے کل بلا لے۔ پھر اس نے سوچا، لیکن میرے پاس تو شائلہ کا سیل نمبر بھی نہیں ہے۔ اس نے کبھی کسی ماڈل یا کسی اور لڑکی سے اس کا سیل نمبر نہیں لیا تھا۔ ماڈلز تو خود ہی اس سے رابطہ کرنے کو بے چین رہتی تھیں۔ خیر دیکھا جائے گا۔ اس نے سر جھٹک کر سوچا۔

وہ آفس پہنچ کر معمول کی مصروفیات میں لگ گیا۔

اچانک انٹرکام کی گھنٹی بجی تو وہ چونکا۔

''یس۔'' اس نے ریسیور اٹھا کر کہا۔

''سر، یہ کوئی مس شائلہ آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔'' آپریٹر نے کہا۔

''اچھا انہیں اندر بھیج دو۔'' اس نے انٹرکام کا ریسیور رکھ کر دیوار گیر گھڑی پر نظر ڈالی۔ کام کی وجہ سے اسے لنچ کرنے کا خیال ہی نہیں آیا تھا۔ یہ کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ پریشانی یہ تھی کہ لنچ کے بعد رضوانہ نے بھی آفس آنے کو کہا تھا۔

''اب کیا کروں؟'' جمشید ہاتھ مل کر بولا۔ پھر اس نے خود ہی کہا۔ ''کرنا کیا ہے۔ رضوانہ آتی ہے تو آئے۔ شائلہ ایک ماڈل ہے اور ماڈلز تو میرے پاس آتی ہی رہتی

READING Section
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

ہیں۔ بس یہ کروں گا کہ شائلہ کا بھی نمبر لے لوں گا۔‘‘

دروازے پر دستک ہوئی، دوسرے ہی لمحے شائلہ اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ اس کے سامنے کھڑی تھی۔ اس نے بہت مسحور کن پرفیوم لگا رکھا تھا۔

’’آیئے مس شائلہ۔‘‘ جمشید نے خوش دلی سے کہا۔

شائلہ خراماں خراماں چلتی ہوئی اس کی طرف بڑھی، یوں لگ رہا تھا جیسے وہ آفس کے کمرے میں نہیں بلکہ ریمپ پر چل رہی ہو۔ وہ جمشید کے سامنے آکر کھڑی ہوگئی۔

’’بیٹھیے نا، آپ کھڑی کیوں ہیں؟‘‘ جمشید نے کہا۔

’’تھینک یو۔‘‘ شائلہ نے کہا اور بہت ادا سے اس کے سامنے پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئی۔

جمشید نے انٹرکام کا ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کیا اور کہا۔ ’’میرے لیے کافی بھجوائیں اور اب مجھے کوئی کال مت دیجیے گا۔‘‘ پھر وہ شائلہ سے مخاطب ہوا۔ ’’مس شائلہ! آپ کتنے عرصے سے ماڈلنگ کر رہی ہیں؟‘‘

’’مجھے ماڈلنگ کرتے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا ہے سر۔‘‘ شائلہ کھنکتی ہوئی آواز میں بولی۔ ’’صرف تین مہینے ہی ہوئے ہیں۔‘‘

’’اور آپ نے کتنے ایڈ کیے ہیں؟‘‘ جمشید نے پوچھا۔

’’میں نے چار... سوری پانچ ایڈز کیے ہیں سر۔‘‘

’’ویری گڈ!‘‘ جمشید نے کہا۔

’’میں ٹاپ کی ماڈل بننا چاہتی ہوں سر۔‘‘ شائلہ نے کہا۔ ’’اگر آپ مجھے موقع دیں تو میرا یہ خواب پورا ہوسکتا ہے۔‘‘

’’دیکھیں شائلہ...‘‘

انٹرکام کی گھنٹی سے اس کی بات ادھوری رہ گئی۔

جمشید نے جھنجلا کر ریسیور اٹھایا اور ناگواری سے بولا۔ ’’فوزیہ! میں نے منع...‘‘

’’فوزیہ نہیں، میں بول رہی ہوں رضوانہ۔‘‘ دوسری طرف سے رضوانہ کی آواز سنائی دی۔

’’اچھا، تم ہو... تو باہر کیوں کھڑی ہو، اندر آؤ نا۔‘‘

فوراً ہی دروازہ کھلا اور رضوانہ بہت طمطراق سے اندر داخل ہوئی۔ وہ خاصی باوقار اور دلکش عورت تھی۔ شائلہ بھی اس سے مرعوب نظر آرہی تھی۔

’’میں نے... تمہاری آپریٹر کا مزاج درست کر دیا ہے۔ وہ مجھے بھی اندر آنے سے روک رہی تھی۔‘‘

’’اس کی اتنی جرأت ہو ہی نہیں سکتی کہ وہ تمہیں روکے۔‘‘ جمشید نے کہا پھر شائلہ سے بولا۔ ’’مس شائلہ، یہ میری وائف رضوانہ ہیں اور رضوانہ! یہ شائلہ ہیں، نئی ماڈل ہیں اور...‘‘

’’ہاں میں نے انہیں ایڈز میں دیکھا ہے۔‘‘

’’ہیلو مسز جمشید۔‘‘ شائلہ نے کہا۔ ’’آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔‘‘

’’رسمی بات کر رہی ہو یا تمہیں واقعی خوشی ہوئی ہے؟‘‘ رضوانہ نے طنزیہ لہجے میں کہا پھر وہ جمشید سے بولی۔ ’’میں نے تم سے کہا تھا کہ لنچ کے بعد آؤں گی۔‘‘

’’ہاں تو چلو، مجھے کوئی خاص مصروفیت نہیں ہے۔‘‘ پھر وہ شائلہ سے بولا۔ ’’مس شائلہ! آپ اپنی کچھ تصویریں مجھے بھجوا دیجیے گا۔ اگر کلائنٹ نے آپ کو اپروو کر دیا تو ہم آپ کو چانس ضرور دیں گے۔‘‘

’’تھینک یو سر۔‘‘ شائلہ نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ’’میں آپ کو اپنی پروفائل بھجوا دوں گی۔‘‘

جمشید اسے چائے کے لیے بھی نہ روک سکا۔ وہ رضوانہ کی فطرت سے واقف تھا۔

اس کے جانے کے بعد پیون چائے کی ٹرے لے کر اندر داخل ہوا۔

رضوانہ ہنس کر بولی۔ ’’یہ فوزیہ تو بہت ایکٹو ہوگئی۔ فوراً چائے بھی بھجوا دی لیکن میرا موڈ بالکل نہیں ہے چائے پینے کا۔‘‘

’’اگر تمہارا موڈ نہیں ہے تو پھر چلو، میں تو اس وقت یوں بھی چائے نہیں پیتا ہوں۔‘‘ جمشید نے جلدی سے کہا۔

رضوانہ نے اپنے پرس سے چھوٹا سا آئینہ نکالا اور اپنا میک اپ درست کرتے ہوئے بولی۔ ’’اس لڑکی کو میں نے پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔‘‘

’’کس لڑکی کی بات کر رہی ہو؟‘‘ جمشید نے تجاہل سے کام لیا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ رضوانہ، شائلہ کی بات کر رہی ہے۔

’’میں اس لڑکی شائلہ کی بات کر رہی ہوں۔‘‘ رضوانہ نے کہا۔

’’تم نے خود ہی تو اس سے کہا تھا کہ تم نے اسے کسی اشتہار میں دیکھا ہے۔‘‘ جمشید نے بیزاری کا مظاہرہ کیا۔

’’میری یادداشت اتنی کمزور نہیں ہے۔‘‘ رضوانہ نے کہا۔ ’’میں نے اسے حال ہی میں کہیں دیکھا ہے۔‘‘

’’اچھا دیکھا ہوگا۔‘‘ جمشید نے کہا۔ ’’اب چلو، مجھے واپس آکر کام بھی نمٹانا ہے۔‘‘

''اتنے چڑچڑے کیوں ہو رہے ہو؟'' رضوانہ ہنس کر بولی۔

''آج کام کچھ زیادہ ہی ہے۔ احمر برادرز کی نئی کمپین بنانا ہے۔ انہیں یہ کمپین ارجنٹ چاہیے۔''

''چلو بھئی، تم تو کام کی ٹینشن لے لیتے ہو۔'' رضوانہ مسکرا کر بولی۔

جمشید اسے کیسے بتاتا کہ ٹینشن کام کی نہیں بلکہ تمہارے نازل ہونے کی ہے۔

وہ دو گھنٹے بعد آفس پہنچا تو ذہنی طور پر بہت تھک گیا تھا۔ اسے رہ رہ کر رضوانہ پر غصہ آرہا تھا۔ وہ وقت بے وقت نازل ہو کر اس کا دماغ خراب کر دیتی تھی۔ اس نے بے دلی سے کچھ کام کیا، پھر آفس سے باہر نکل آیا۔ گھر جانے کے بجائے اس نے جم خانہ کا رخ کیا۔

وہ ابھی ٹھیک سے بیٹھ بھی نہ سکا تھا کہ اس کے کانوں میں رضوانہ کی آواز آئی۔ ''تم تو آفس میں کام کرنے والے تھے؟''

جمشید نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کا دل چاہا کہ رضوانہ کے چہرے پر اتنی زور سے جھانپڑ مارے کہ اس کی ساری خوب صورتی دھری کی دھری رہ جائے۔ اس نے دل پر جبر کر کے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''یار، وہ احمر برادرز کے ذکی صاحب اپنے نئے پراجیکٹ پر مجھ سے ڈسکس کرنا چاہتے تھے۔ میں نے انہیں آفس کے بجائے یہاں بلالیا۔''

وہ جواب میں کچھ کہنے ہی والی تھی کہ کسی خاتون کی آواز آئی۔ ''ہائے رضوانہ!''

''ہائے!'' رضوانہ نے جواب میں کہا اور اس خاتون کی طرف بڑھ گئی۔

اسی وقت جمشید کو ذکی صاحب نظر آئے۔ جمشید جانتا تھا کہ ذکی صاحب اکثر وہاں آتے ہیں لیکن اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ ذکی صاحب آج ہی وہاں آجائیں گے۔ وہ جلدی سے ان کی طرف بڑھ گیا۔ یہ جھوٹ ایک طرح سے جمشید کے حق میں بہتر ہی ثابت ہوا تھا۔ ذکی صاحب واقعی اس سے اپنے نئے پراجیکٹ پر بات کرنا چاہتے تھے لیکن اس کے لیے کوئی وقت طے نہیں ہوا تھا۔

رضوانہ جم خانہ کا ایک چکر لگا کر لوٹی تو ذکی صاحب اور جمشید کو بات کرتے دیکھ کر کچھ مطمئن ہو گئی۔ ایسے موقعوں پر وہ دخل اندازی نہیں کرتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ جمشید اس وقت بھی آفس ہی کا کام کر رہا ہے۔

رسمی بات چیت کے بعد ذکی صاحب نے جمشید سے اپنے نئے پراجیکٹ کے بارے میں بھی سرسری سی بات چیت کی، پھر وہ اٹھ کر اکبر موتی والا کی طرف چلے گئے۔

جمشید تو یہاں کچھ تفریح کے لیے آیا تھا لیکن رضوانہ نے یہاں بھی نازل ہو کر اس کا موڈ خراب کر دیا تھا۔ وہ اب یہاں آکر پچھتا رہا تھا۔

اسی وقت اس کے دل میں پہلی مرتبہ یہ خیال آیا کہ اگر رضوانہ نہ ہو تو پھر زندگی کتنی خوش گوار ہو جائے مگر فوراً ہی اسے خیال آیا کہ اگر رضوانہ نہیں ہوگی تو پھر یہ عیش و آرام بھی نہیں ہوگا۔ وہ اس وقت جم خانہ میں بیٹھا تھا۔ یہاں کی ممبر شپ بھی لاکھوں روپے کی تھی اور سات ہندسے ماہانہ سے کم آمدنی والا شخص یہاں کا ممبر ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ ہاں، ایک صورت ہے۔ رضوانہ اگر اس دنیا میں ہی نہ ہو تو... فوراً ہی اسے خیال آیا کہ یہ میں کیا سوچ رہا ہوں۔

اسی وقت رضوانہ اس کے پاس آگئی اور بولی۔ ''جمی! تم نے ڈنر نہیں کیا ہوگا ابھی؟''

''میں تمہارے بغیر کیسے ڈنر کر سکتا ہوں۔'' جمشید نے منافقت سے کام لیا۔

''چلو، پھر ڈائننگ ہال میں چلتے ہیں۔ مجھے بہت بھوک لگ رہی ہے۔''

جم خانہ سے واپسی پر رضوانہ چہک رہی تھی۔ جمشید اس کی ہنسی سے اتنا ہی بیزار ہو رہا تھا۔ وہ ڈرائیور کے ساتھ آئی تھی اور اب جمشید کے ساتھ واپس جا رہی تھی۔

رات کو جب وہ سونے لیٹا تو رضوانہ سو چکی تھی۔ جمشید کا دل چاہا کہ اس کی نازک سی گردن مروڑ دے یا تکیہ اس کے منہ پر رکھ کر دبا دے اور اس وقت تک دبائے رہے جب تک رضوانہ کی سانس بند نہیں ہو جاتی۔

اس نے سر جھٹک کر سوچا، یہ میں کس انداز میں سوچ رہا ہوں۔ ''تم ٹھیک سوچ رہے ہو، اس کے اندر سے آواز آئی۔ ''اس عورت نے تمہاری زندگی اجیرن کر رکھی ہے۔ اس نے تمہیں ذہنی مریض بنا دیا ہے۔ اس کا مر جانا ہی بہتر ہے۔'

اچانک رضوانہ نے کروٹ بدلی اور جمشید کے چہرے پر نظر پڑتے ہی چونک کر اٹھ بیٹھی۔ ''جمی! تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں، کچھ بدہضمی سی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے ٹیبلیٹ لے لی ہے۔''

''تو پھر سو جاؤ اور فارگاڈ سیک سونے سے پہلے لائٹ

آف کر دیا کرو۔ پتا نہیں تمہارا دماغ کہاں ہوتا ہے؟'' وہ بڑبڑاتی ہوئی پھر سو گئی۔

اگلے دن جمشید لنچ کے لیے اٹھنے ہی والا تھا کہ شمائلہ آ گئی۔

''مس شمائلہ! لنچ تو آپ نے ابھی یقیناً نہیں کیا ہو گا؟''

''جی ہاں، لنچ تو میں نے نہیں کیا ہے۔''

''تو پھر آیئے، لنچ میرے ساتھ کریں۔ میں لنچ کے لیے اٹھنے ہی والا تھا۔''

شمائلہ بھلا کیوں انکار کرتی۔ شہر کی ایک بہت بڑی ایڈورٹائزنگ ایجنسی کا سی ای او اسے لنچ پر لے جا رہا تھا۔ وہ خوشی خوشی جمشید کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گئی۔

''آپ کی گاڑی بہت شاندار ہے۔'' شمائلہ نے سیٹ کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔

''میری گاڑی اب شاندار ہو گئی ہے۔'' جمشید نے کہا۔ وہ عموماً ماڈلز سے اس لہجے میں بات نہیں کرتا تھا لیکن شمائلہ تو اس کے حواس پر چھا گئی تھی۔ اس لیے تو وہ اسے دوسری ہی ملاقات میں لنچ پر لے جا رہا تھا۔

وہ شمائلہ کو ایک فائیو اسٹار ہوٹل کے ریسٹورنٹ میں لے گیا۔

لنچ کرتے ہوئے شمائلہ نے کہا۔ ''سر! ایک بات کہوں، آپ برا تو نہیں مانیں گے؟''

جمشید نے مسکرا کر کہا۔ ''میں خوب صورت لڑکیوں کی باتوں کا بُرا نہیں مانتا۔''

''آپ کی مسز کا رویہ کچھ عجیب سا ہے آپ کے ساتھ۔''

جمشید کا موڈ خراب ہو گیا۔ ''عجیب سا نہیں بلکہ انتہائی تکلیف دہ۔'' جمشید نے کہا۔ ''دولت نے اس کا دماغ خراب کر دیا ہے۔''

''آپ نے انہیں اتنا موقع ہی کیوں دیا؟'' شمائلہ نے کہا۔ ''سوری، مجھے آپ کے گھریلو معاملات کو ڈسکس نہیں کرنا چاہیے لیکن...''

''ارے اس عورت نے میری زندگی اجیرن کر رکھی ہے۔'' جمشید گویا پھٹ پڑا۔ ''میں اس سے چھٹکارا بھی نہیں پا سکتا۔''

''کیوں سر؟'' شمائلہ نے پلکیں جھپکا کر پوچھا۔

''اس لیے کہ اس تمام دولت اور کاروبار کی مالک رضوانہ ہے۔'' جمشید کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ ''لیکن اب میں نے بھی سوچ لیا ہے کہ میں بھی اپنی من مانی کروں گا۔ رضوانہ کہاں تک میری نگرانی کرے گی۔''

''سر، میں آپ کی ذہنی کیفیت کو سمجھ رہی ہوں۔'' شمائلہ نے ہمدردی جتائی۔ وہ دل ہی دل میں خوش تھی کہ اتنی بڑی ایڈورٹائزنگ ایجنسی کا مالک یوں اس سے اپنے گھریلو معاملات پر بات کر رہا تھا۔

''چھوڑو ان باتوں کو، تم بتاؤ تمہاری ہوبیز کیا ہیں؟''

''میری ہوبیز۔'' شمائلہ ہنس کر بولی۔ ''مجھے رائیڈنگ کا بہت شوق ہے لیکن اس کا موقع نہیں ملتا ہے۔ سوئمنگ کا شوق بھی ہے۔ میرا یہ شوق پورا ہوتا رہتا ہے۔''

''رائیڈنگ تم نے کہاں سیکھی؟'' جمشید نے پوچھا۔

''نواب شاہ میں۔'' شمائلہ نے جواب دیا۔ ''میرا ایک کزن نواب شاہ میں رہتا ہے۔ وہ لوگ چھوٹے موٹے زمیندار ہیں لیکن اس نے دو تین اچھی نسل کے گھوڑے پال رکھے ہیں۔ میں اکثر نواب شاہ جاتی رہتی ہوں۔''

''ویری گڈ!'' جمشید نے کہا۔ ''رائیڈنگ کا شوق تو مجھے بھی ہے۔''

وہ یونہی ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔

پھر اٹھنے سے پہلے جمشید نے کہا۔ ''میں نے ہاکس بے پر ایک ہٹ بھی لے رکھا ہے۔ اس کا علم رضوانہ کو نہیں ہے۔ جب بھی تھک جاتا ہوں تو وہیں جا کر چند گھنٹے آرام کر لیتا ہوں۔''

''میں وہ ہٹ ضرور دیکھوں گی۔'' شمائلہ نے کہا۔

شمائلہ کو رخصت کر کے جمشید دوبارہ آفس چلا گیا۔ آپریٹر نے بتایا کہ آپ کی مسز آئی تھیں اور آپ کا انتظار کر کے ابھی کچھ دیر پہلے یہاں سے گئی ہیں۔

جمشید نے اس خبر پر کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا۔ وہ تو اس وقت شمائلہ کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس نے چند ماہ پہلے ملیر کے علاقے میں ایک بہت بڑا فارم ہاؤس خریدا تھا۔ فارم ہاؤس میں آم اور امرود کے بہت سے درخت تھے۔ وسیع و عریض لان تھا اور ایک سوئمنگ پول بھی تھا۔ اس کا علم بھی رضوانہ کو نہیں تھا۔ جمشید نے فارم ہاؤس کی دیکھ بھال کے لیے ایک چوکیدار اور مالی بھی رکھ لیا تھا۔ وہ کبھی کبھار اس فارم ہاؤس پر بھی چلا جاتا تھا۔

اس وقت اسے یہ فکر تھی کہ شمائلہ کو کس کلائنٹ کے اشتہار میں ماڈل کے طور پر لیا جائے۔ اگر شمائلہ بلا جواز آفس آتی رہتی تو نہ صرف رضوانہ بلکہ آفس کا دوسرا اسٹاف بھی جمشید کی طرف سے مشکوک ہو جاتا۔

جمشید کوئی ایسا پارسا نہیں تھا لیکن وہ ہر کام بہت احتیاط سے کرتا تھا۔ اکثر ماڈل گرلز کو وہ ہاکس بے والے ہٹ پر لے جاتا تھا اور وہیں سے رخصت کر دیتا تھا۔

شائلہ کے لیے اچانک اسے جنید فیبرکس والوں کا خیال آیا۔ وہ لوگ بھی اس سے کسی اچھی ماڈل کی فرمائش کر رہے تھے۔ شائلہ کی پروفائل اس کے پاس تھی۔ اس نے کلائنٹس منیجر کے ہاتھ وہ فائل انہیں بھجوا دی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے جنید فیبرکس کے مالک فرید صاحب صاحب سے ٹیلی فون پر رابطہ کیا اور انہیں شائلہ کے بارے میں بتایا۔

شام تک کلائنٹ ایگزیکٹو فرید صاحب کا اپروول لے کر آ گیا۔ یوں شائلہ آزادی سے آفس آنے لگی۔

جمشید کو یہ معلوم نہیں تھا کہ آفس کی ایک لڑکی نسرین اور کمپیوٹر آپریٹر بلال، رضوانہ کے مخبر تھے۔ وہ رضوانہ کو پل پل کی رپورٹ پہنچایا کرتے تھے۔

اس دن بھی شائلہ آفس میں موجود تھی۔ لنچ کے وقت جمشید اٹھا تو شائلہ کو بھی لنچ کے لیے لے گیا۔ اس سے غلطی یہ ہوئی کہ اس نے ٹیلی فون پر ایک کلائنٹ سے بات کرتے ہوئے بتا دیا کہ میں لنچ کے لیے شیرٹن جا رہا ہوں۔ اگر آپ میرے ساتھ لنچ کرنا چاہیں تو وہیں آ جائیں۔ وہ کلائنٹ بھی کسی اچھی ماڈل کی تلاش میں تھا۔ جمشید نے سوچا کہ وہیں وہ شائلہ کو اس سے ملوا کر اپروول لے لے گا۔

اس کے نکلتے ہی نسرین نے رضوانہ کو اطلاع دے دی۔

جمشید نے لنچ کا آرڈر دیا ہی تھا کہ رضوانہ شیرٹن کے ریسٹورنٹ میں داخل ہوئی۔ اسے دیکھ کر جمشید لمحے بھر کو تو ٹپٹا گیا پھر فوراً ہی اس نے خود پر قابو پا لیا۔

رضوانہ سیدھی اس کے پاس پہنچی اور تلخ لہجے میں بولی۔ ”تم لنچ کرنے کے لیے روز آفس سے اتنی دور آتے ہو؟“

”روز تو نہیں۔“ جمشید نے کہا۔ ”کبھی کبھی۔“

”جب یہ ڈریم گرل تمہارے ساتھ ہوتی ہے۔“ رضوانہ کا لہجہ انتہائی تلخ تھا۔

”کیسی باتیں کر رہی ہو رضوانہ؟“ جمشید نے کہا۔

”میں اس قسم کی لڑکیوں کو خوب جانتی ہوں۔“ رضوانہ نے بلند آواز میں کہا پھر وہ شائلہ سے مخاطب ہوئی۔ ”تم ماڈلنگ کرتی ہو تو ماڈلنگ ہی کرو، اپنی حد سے آگے بڑھنے کی کوشش مت کرو۔“

”مسز جمشید!“ شائلہ نے آہستہ سے کہا۔ ”آپ میری انسلٹ کر رہی ہیں۔“

”تمہاری انسلٹ!“ رضوانہ نے تلخ لہجے میں کہا۔ ”تمہاری انسلٹ ابھی میں نے کی ہی کہاں ہے؟ اور انسلٹ تو ان لوگوں کی ہوتی ہے جن کی کوئی عزت ہوتی ہے۔“

”رضوانہ!“ جمشید نے کہا۔ ”آہستہ بولو۔ ہم لوگ اس وقت اپنے ڈرائنگ روم میں نہیں بیٹھے ہیں۔“

رضوانہ نے گھور کر جمشید کی طرف دیکھا اور ہونٹ چبا کر بولی۔ ”تم سے تو میں گھر جا کے نمٹوں گی۔“ پھر وہ شائلہ سے مخاطب ہوئی۔ ”چلو اٹھو اور چلتی پھرتی نظر آؤ۔ ہمیں تمہاری کوئی ضرورت نہیں ہے۔“

شائلہ جھٹکے سے کھڑی ہو گئی اور بغیر کچھ کہے اپنا پرس اٹھا کر تیز قدموں سے چلی گئی۔

اسی وقت ویٹر لنچ لے کر آ گیا۔ جمشید نے اس سے کہا کہ لنچ پیک کر دو، مجھے ایک ضروری کام سے جانا ہے۔

ویٹر سر ہلا کر چلا گیا۔

جمشید، رضوانہ کو لے کر سیدھا گھر پہنچا اور غصے سے بولا۔ ”تمہیں آخر کیا ضرورت تھی اس کی بے عزتی کرنے کی؟“

”میں ایسی لڑکیوں کو بہت اچھی طرح جانتی ہوں، وہ تمہیں بے وقوف بنا کر اپنا کام نکال رہی ہے۔“

”رضوانہ!“ جمشید بلند آواز میں بولا۔ ”تم ہوش میں تو ہو، کیا بکواس کر رہی ہو؟“

”میں بکواس نہیں کر رہی ہوں بلکہ ہوش و حواس میں کہہ رہی ہوں، میں بھی اب تمہیں برداشت نہیں کر سکتی۔ مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی۔ آج تم اس حرافہ کو پہلی دفعہ لنچ پر لے کر نہیں گئے تھے بلکہ اکثر اسے لے کر جاتے رہتے ہو۔“

جمشید سناٹے میں رہ گیا۔ اس کا مطلب تھا کہ رضوانہ اس کی ٹوہ میں رہتی ہے اور اس کی نگرانی کراتی ہے۔

”میں نے کب کہا ہے کہ میں اسے پہلی دفعہ لنچ پر لے گیا تھا۔ وہ اس وقت بہترین ماڈل ہے اور ایڈورٹائزنگ ایجنسی والوں کو ماڈلز کے نخرے تو اٹھانا پڑتے ہیں۔“

”میں اس لڑکی کو ایک سیکنڈ بھی برداشت نہیں کر سکتی۔“ رضوانہ نے کہا۔ ”اگر اب وہ لڑکی آفس میں نظر آئی تو میں اس کی وہ بے عزتی کروں گی کہ ساری ماڈلنگ بھول جائے گی۔“

”تم نے اس بات کو ایشو کیوں بنا رکھا ہے؟“ جمشید

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN

نے کہا۔ ”اگر تم کہتی ہو تو میں اس کا کنٹریکٹ کینسل کر دوں گا۔ میرے لیے کوئی عام ماڈل نہیں بلکہ تم زیادہ اہم ہو۔“

”تمہاری نظروں میں تو میری اب کوئی وقعت ہی نہیں رہی ہے۔“ رضوانہ نے شکوہ کیا۔

”وہم ہے تمہارا۔“ جمشید نے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔ ”میں نے تمہارا ہاتھ یہ سوچ کر تھاما تھا کہ اب یہ مر کے ہی میرے ہاتھ سے چھوٹے گا۔“

”ایسی باتیں مت کرو جی۔“ رضوانہ نے لگاوٹ بھرے لہجے میں کہا۔ جمشید نے سکون کا سانس لیا۔ وہ تو سمجھ رہا تھا کہ آج رضوانہ اور اس کی اربوں روپے کی دولت اور کاروبار اس کے ہاتھ سے گیا۔

وہ شام اس نے رضوانہ کے ساتھ گزاری اور وہ اسے ڈنر کے لیے باہر لے گیا۔

اس نے سیل فون پر شمائلہ سے بھی بات کی اور اس سے معذرت کی کہ میری بیوی کی وجہ سے تمہیں صدمہ پہنچا ہے۔ میں اس کی معافی چاہتا ہوں۔ اب تم آفس مت آنا بلکہ کل اسی ہٹ پر پہنچ جانا۔ میں وقت تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔“

شمائلہ ہٹ پر آئی تو جمشید نے اسے بھی اپنی چکنی چپڑی باتوں سے منا لیا ورنہ وہ تو جمشید سے مزید ملنے کو تیار ہی نہیں تھی۔

شمائلہ کے آفس آنے پر پابندی لگی تو جمشید کو احساس ہوا کہ وہ تو شمائلہ سے محبت کرنے لگا ہے، اس کے بغیر رہ ہی نہیں سکتا۔

اس نے شمائلہ سے مل کر پروگرام بنایا کہ ہم لوگ ایک ہفتہ فارم ہاؤس پر گزاریں گے۔

”ایک ہفتہ؟“ شمائلہ حیرت سے بولی۔ ”ایک ہفتے تک آپ گھر سے غائب رہیں گے تو رضوانہ کا کیا حال ہوگا۔ وہ تو سارے شہر میں آپ کو ڈھونڈتی پھرے گی۔“

”ایسا نہیں ہوگا۔“ جمشید مسکرا کر بولا۔ ”میں بزنس ٹرپ کے لیے نکلوں گا۔“

”ویری گڈ آئیڈیا سر۔“ شمائلہ خوش ہو کر بولی۔

”بس تم تیاری کر لو۔ ہم پرسوں فارم ہاؤس پر چلیں گے۔“

جمشید نے رضوانہ کے سامنے سیل فون پر کوریا کی ایک پارٹی سے بات کی اور یوں ظاہر کیا جیسے اس کا کوریا جانا بہت ضروری ہو، اس نے یہ بھی کہا کہ میں اپنے منیجر کو بھیج دیتا ہوں لیکن پارٹی شاید اس پر راضی نہیں ہوگی۔

## بیماری

ڈاکٹر نے مریض کا معائنہ کرنے کے بعد بتایا۔ ”یہ کوئی پرانی بیماری ہے جو آپ کی صحت اور ذہنی سکون کو تباہ و برباد کر رہی ہے۔“

مریض نے جلدی سے کہا۔ ”ڈاکٹر صاحب خدا کے لیے آہستہ بولیے۔ وہ بیماری باہر ہی بیٹھی ہے۔“

## کترنیں

ایک ہوائی جہاز میں کچھ پاگلوں کو علاج کے لیے بیرونِ ملک لے جایا جا رہا تھا۔ وہ سفر میں تھے اور پاگل شور کرنے لگے۔ تو پائلٹ نے اپنے ساتھی سے کہا تم جاؤ دیکھ کر آؤ کیا ہو رہا ہے۔ وہ گیا اور دیکھا تو وہاں پاگل فٹ بال کھیل رہے تھے۔ وہ پریشان ہو گیا کہ ان کو کیسے سمجھائے۔ اس نے دیکھا کہ ایک پاگل کتاب پڑھ رہا تھا۔ وہ ایک کونے میں بیٹھا تھا۔ وہ ساتھی اس کے پاس گیا اور کہا۔

”تم مجھے کچھ ٹھیک لگتے ہو ان سے کہو کہ ہم بہت اونچائی پر پرواز کر رہے ہیں۔ کھیلنا بند کرو خطرہ ہو سکتا ہے۔“

یہ کہہ کر ساتھی چلا گیا۔ کچھ لمحوں بعد وہاں سکون ہو گیا۔ تو پائلٹ نے ساتھی کو کہا کہ دیکھ کر آؤ یہ چپ کیسے ہو گئے۔ وہ وہاں گیا اور دیکھا کہ اس ایک پاگل کے سوا... کوئی نہیں ہے۔ اس نے اس پاگل سے پوچھا کہ باقی کہاں گئے تو اس نے جواب دیا۔

”میں نے ان سے کہا کہ تم باہر جا کر کھیلو، مجھے پڑھنے میں دقت ہو رہی ہے تو وہ باہر چلے گئے۔“

☆☆☆

ایک سردار کو ایک نوجوان فون پر بڑا تنگ کیا کرتا تھا تو سردار نے اپنی سم بدل دی اور بڑے جذبے سے اس نوجوان کو فون کر کے کہا۔ ”اس نمبر پر فون کر کے دکھاؤ تو مانوں۔“

خیام پیرزادہ، پاک پتن

اس نے کوریا تو کال ہی نہیں کی تھی۔ وہ تو اپنے ایک دوست سے باتیں کررہا تھا۔

’’اگر بہت ضروری ہے تو چلے جاؤ۔‘‘ رضوانہ نے کہا۔

’’تمہارے بغیر تو میں ہرگز نہیں جاؤں گا۔‘‘ جمشید نے کہا۔ وہ جانتا تھا کہ رضوانہ کو کوریا بالکل پسند نہیں ہے۔ وہ صرف ایک مرتبہ کوریا گئی تھی اور آئندہ کبھی نہ جانے کا عہد کر چکی تھی۔

’’میں... تمہارے ساتھ کوریا چلوں؟‘‘ رضوانہ نے منہ بنا کر کہا۔ ’’امپاسیبل! ہاں یورپ کے بزنس ٹور میں ضرور تمہارے ساتھ چلوں گی۔‘‘

’’کتنے دن کا ٹرپ ہے؟‘‘ رضوانہ نے پوچھا۔

’’میں سوچ رہا ہوں کہ لگے ہاتھوں جاپان اور ملائیشیا کا وزٹ بھی کرلوں۔ تقریباً دس بارہ دن تو لگ جائیں گے۔‘‘

پھر اس نے پیکنگ شروع کردی۔ رضوانہ کو سنانے کے لیے جمشید نے پھر ایک فرضی کال کی اور کہا کہ کل تک مجھے ٹکٹ چاہئیں۔

اگلے روز وہ دن کے دس بجے کے قریب گھر سے روانہ ہوا تو رضوانہ نے کہا کہ میں ایئرپورٹ تک تو تمہارے ساتھ جا ہی سکتی ہوں۔‘‘

’’یار، اگر تم ایئرپورٹ گئیں تو شاید میں نہ جاسکوں۔‘‘ جمشید نے کہا۔ ’’تم جانتی ہو کہ میں تمہاری جدائی برداشت نہیں کرسکتا ہوں۔ تم بس ہنستے ہنستے مجھے گھر ہی سے رخصت کردو۔‘‘

’’اچھا بابا، میں ایئرپورٹ نہیں جارہی ہوں۔‘‘

جمشید نے سکون کا سانس لیا۔ رضوانہ اگر ایئرپورٹ جاتی تو بھانڈا پھوٹ جاتا۔ جمشید نے تو سرے سے ٹکٹ ہی نہیں بنوایا تھا۔ وہ ڈرائیور کے ساتھ ایئرپورٹ روانہ ہوا۔ ڈرائیور نے اسے ڈپارچر لاؤنج میں چھوڑا اور واپس آگیا۔

جمشید نے ایک دن پہلے ہی ایئرپورٹ کی پارکنگ میں اپنی پراڈو پارک کروی تھی۔ ڈرائیور کے جانے کے بعد وہ ٹہلتا ہوا پارکنگ لاٹ میں پہنچا اور اپنی گاڑی میں بیٹھ کر پارکنگ سے باہر نکل آیا۔

اس نے باہر نکلتے ہی شائلہ کو ٹیلی فون کردیا کہ تم فوری طور پر شاہراہ فیصل پر آجاؤ۔ میں کارساز پر تمہارا انتظار کررہا ہوں۔‘‘

دس منٹ کے اندر شائلہ بھی وہاں پہنچ گئی اور دونوں فارم ہاؤس کی طرف روانہ ہوگئے۔

فارم ہاؤس کا مالی چھٹیوں پر تھا۔ چوکیدار کو کھانا پکانا نہیں آتا تھا اس لیے جمشید نے کھانے پینے کا سامان اور ایزٹائنٹ خوراک کے ڈبے فارم ہاؤس پر پہنچا دیے تھے۔

پہلے دن ان لوگوں نے خوب انجوائے کیا۔ سردی کا موسم تھا اس کے باوجود شائلہ نے خوب سوئمنگ کی۔ جمشید کو سوئمنگ کا شوق نہیں تھا لیکن شائلہ کو دیکھ کر وہ بھی پانی میں اتر گیا۔ رات کو وہ دونوں دیر تک جاگتے رہے اور میوزک سنتے رہے، پھر تھک ہار کے بیڈروم میں چلے گئے۔

صبح ناشتے کے بعد شائلہ امرود کے درختوں کی طرف جانکلی اور خوب امرود کھائے۔

رات کو وہ دونوں لنچ کی تیاری کررہے تھے کہ جمشید کے کانوں میں کسی گاڑی کے انجن کی آواز آئی، گاڑیاں تو وہاں سے گزرتی ہی رہتی تھیں۔

اس وقت جمشید نے شائلہ کو کوئی لطیفہ سنایا تھا اور وہ کھلکھلا کر ہنس رہی تھی۔ جمشید بھی ہنس رہا تھا۔

اچانک اس کی ہنسی رک گئی۔ اس کی نظریں سامنے جمی ہوئی تھیں۔ شائلہ نے اسے اس حال میں دیکھا تو الجھ گئی اور بولی۔ ’’کیا ہوا جی؟‘‘

جمشید کی نظروں کے زاویے میں کوئی فرق نہیں آیا تو اس نے مڑ کر دیکھا اور بوکھلا کر کھڑی ہوگئی۔

دروازے کے عین درمیان... رضوانہ کھڑی تھی اور غضب ناک نظروں سے شائلہ کو گھور رہی تھی۔

اس نے آگے بڑھ کر اچانک شائلہ کے چہرے پر زنانے دار تھپڑ رسید کردیا اور بولی۔ ’’آوارہ، بدچلن لڑکی! تجھے اور کوئی نہیں ملا تھا؟ اب نوبت یہاں تک آگئی ہے کہ میرا شوہر تیرے لیے جمشید سے جی ہوگیا۔‘‘ اس نے دوسرا تھپڑ مارا، پھر وہ اسے مارتی ہی چلی گئی۔

اچانک شائلہ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور چیخ کر بولی۔ ’’اپنے ہاتھوں کو قابو میں رکھو ورنہ دو ہاتھ میرے بھی ہیں۔‘‘

رضوانہ اس بات سے اور مشتعل ہوگئی اور شائلہ کے چہرے پر ایک زبردست تھپڑ ماردیا۔ جوابی طور پر شائلہ نے بھی اس کے چہرے کو نشانہ بنایا اور دونوں ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہوگئیں۔

جمشید کی سمجھ ہی نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے؟

اچانک شائلہ نے رضوانہ کو زوردار دھکا دیا۔ رضوانہ الٹ کر گری۔ گرتے ہوئے ٹیبل کا کونا رضوانہ کے سر پر لگا۔ وہ فرش پر گر کے تڑپنے لگی۔

جمشید گھبرا گیا۔ وہ رضوانہ کو اٹھانے کے لیے اس کی طرف بڑھا لیکن اٹھا نہ پایا۔ رضوانہ نے زور سے ہچکی لی اور اس کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔ جمشید نے دیوانہ وار رضوانہ کو آوازیں دیں، اسے بری طرح جھنجوڑ ڈالا لیکن اس کے جسم میں حرکت نہ ہوئی۔ جمشید نے اس کی نبض دیکھی، اس کی سانس کی آمدورفت محسوس کرنے کی کوشش کی لیکن بے سود، رضوانہ مر چکی تھی۔

''کک... کیا... یہ مر گئی؟'' شمائلہ نے وحشت زدہ ہو کر کہا۔

''ہاں، یہ مر چکی ہے۔'' جمشید نے بھرائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

شمائلہ بری طرح بوکھلا گئی اور بولی۔ ''اب... اب کیا ہوگا جمی؟''

''گھبراؤ مت۔'' جمشید نے اسے تسلی دی۔ ''مجھے سوچنے دو۔''

''یہ سوچنے کا وقت نہیں ہے جمی۔'' شمائلہ نے کہا۔ ''اگر پولیس آگئی تو ہم دونوں پکڑے جائیں گے۔''

''شمائلہ، پلیز خاموش رہو۔'' جمشید نے کہا۔ ''پولیس یہاں کیوں آئے گی؟ سکون سے بیٹھو اور مجھے کچھ سوچنے دو۔'' پھر وہ چند لمحے بعد بولا۔ ''اب ایک ہی طریقہ ہے۔ رضوانہ کی لاش کو یہیں فارم ہاؤس میں دبا دیا جائے۔''

''کون دبائے گا؟'' شمائلہ نے کہا۔

''میں خود دباؤں گا۔ اس کی قبر چوکیدار کھودے گا۔''

''چوکیدار؟'' شمائلہ چونک کر بولی۔ ''یوں تو چوکیدار قتل کا گواہ بن جائے گا۔''

''فکر مت کرو، میں چوکیدار کو اتنی رقم دوں گا کہ وہ منہ کھول ہی نہیں سکے گا۔''

''جو کچھ کرنا ہے جلدی کرو جمی۔ مجھے یہاں وحشت ہو رہی ہے۔''

☆☆☆

سلمان اور جاوید بہت دیر سے ایک جگہ بیٹھے تھے۔ چند دن پہلے تک دونوں بے روزگار تھے لیکن کچھ دن پہلے جاوید کو جاب مل گئی تھی۔

جاوید کا اپنا گھر تھا۔ ملازمت بھی تھی اس لیے وہ سلمان کے مقابلے میں خوش حال تھا۔ سلمان گلستان جوہر کے ایک چھوٹے سے فلیٹ میں رہتا تھا۔

رات گئے وہ دونوں وہاں سے اٹھے۔ جاوید کے پاس پرانی سی ایک موٹر سائیکل بھی تھی۔ اس نے سلمان سے کہا۔ ''جوہر موڑ تک تو میں تمہیں چھوڑ دوں گا۔''

''ٹھیک ہے، وہاں سے پندرہ بیس منٹ کا تو پیدل کا راستہ ہے۔ میں چلا جاؤں گا۔''

اصل میں جاوید کی موٹر سائیکل میں اتنا پیٹرول ہی نہیں تھا کہ وہ اندر تک جا کر سلمان کو چھوڑے۔

جاوید نے اسے جوہر موڑ پر چھوڑ دیا۔ اس وقت رات کے دو بج رہے تھے۔ سلمان پیدل ہی اپنے فلیٹ کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہ فلیٹ میں بالکل تنہا رہتا تھا۔ اس کے ماں باپ اور بہن بھائی سکھر میں تھے۔ دو مہینے پہلے تک وہ ایک معقول ملازمت کر رہا تھا۔ اس کی فرم اچانک ہی مالی بحران کی زد میں آگئی تھی اور اس کی ملازمت ختم ہو گئی تھی۔ جاوید بھی اسی کمپنی میں تھا یوں دونوں ایک ساتھ بے روزگار ہو گئے تھے۔ جاوید کو گزشتہ دنوں ملازمت مل گئی تھی۔

سلمان یہ سوچتا ہوا فلیٹ کی طرف جا رہا تھا کہ فلیٹ میں چائے کا تو انتظام ہے۔ دودھ چینی اور چائے کی پتی موجود تھی۔ وہ صبح ناشتے میں چائے تو پی ہی سکتا تھا۔

اچانک اس کے نزدیک سے شاندار سی ایک گاڑی گزری، پھر گاڑی کی رفتار کم ہوئی اور وہ ریورس ہو کر اس کی طرف آنے لگی۔ گاڑی سلمان کے نزدیک آکر رک گئی۔

سلمان نے حیرت سے دیکھا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بہت خوب صورت سی ایک لڑکی بیٹھی تھی۔ وہ حیران تھا کہ رات کے اس پہر یہ لڑکی کہاں سے آگئی اور آ ہی گئی تھی تو اس کے نزدیک گاڑی کیوں روک دی؟

لڑکی نے گاڑی کا شیشہ اتارا اور کھنک دار آواز میں بولی۔ ''آپ اتنی رات کو پیدل کہاں جا رہے ہیں؟''

''آدمی اتنی رات کو تو اپنے گھر ہی جا سکتا ہے۔'' سلمان نے کہا۔

''آیئے میں آپ کو ڈراپ کر دوں۔'' لڑکی نے ہنس کر کہا۔

''آ... آپ... مجھے ڈراپ کریں گی... آپ؟''

سلمان ہکلایا۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ کوئی لڑکی اسے لفٹ کی پیشکش بھی کر سکتی ہے۔ اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔ ''رہنے دیں، آپ کو خوامخواہ زحمت ہوگی۔''

''زحمت کیسی؟'' لڑکی پھر مسکرائی۔ ''میں بھی اسی طرف جا رہی ہوں۔ اگر آپ بھی میری گاڑی میں بیٹھ جائیں گے تو مجھے کون سی زحمت ہوگی؟ آیئے۔''

لڑکی کے اصرار پر سلمان جھجکتا ہوا گاڑی میں بیٹھ

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN

گیا۔ گاڑی کا دروازہ کھلنے پر روشنی ہوئی تو لڑکی کا حسن دیکھ کر سلمان کی آنکھیں چکاچوند ہو گئیں۔

”آپ پڑھتے ہیں؟“ لڑکی نے پوچھا۔

”جی نہیں، میں ماسٹر تو کر چکا ہوں۔ ایک کمپنی میں ملازمت کرتا تھا لیکن آج کل بے روزگار ہوں۔“

”نو پرابلم؟“ لڑکی مسکرا کر بولی۔ ”میرے کچھ کونٹیکٹ ہیں آپ کو جاب مل جائے گی۔“

”میں آپ کا احسان مند رہوں گا۔“ سلمان نے ممنونیت سے کہا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ لڑکی کسی انتہائی دولت مند شخص کی بیٹی ہے لیکن اس کے دل میں انسانیت کا درد ہے۔

”آپ کے والدین اور بہن بھائی بھی آپ کے ساتھ ہی رہتے ہیں؟“ لڑکی نے یوں پوچھا جیسے اپنی بات کی تصدیق کرنا چاہتی ہو۔

”جی نہیں۔“ سلمان نے جواب دیا۔ ”میری فیملی سکھر میں ہے، میں اس فلیٹ میں تنہا رہتا ہوں۔“

”آپ جاب کیا کرتے تھے؟“ لڑکی نے پوچھا۔

”میں سیلز منیجر تھا۔“

”ویری گڈ۔“ لڑکی ہنس کر بولی۔ ”سیلز کی جاب تو بہت آسانی سے مل جاتی ہے۔“

”بس یہیں روک لیں۔“ سلمان نے ونڈ اسکرین سے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔ ”وہ جو سامنے کمپلیکس ہے، میرا فلیٹ اسی میں ہے۔“

”میں آپ کو ڈراپ کرنے اتنی دور آئی ہوں، کیا آپ مجھے ایک کپ چائے بھی نہیں پلائیں گے؟“ لڑکی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

سلمان بُری طرح چونکا۔ اس نے سوچا یہ لڑکی یقیناً کال گرل ہے اور راتوں کو اسی طرح اپنا شکار ڈھونڈتی ہے ورنہ کوئی شریف لڑکی تو رات کے اس پہر کسی اجنبی کو لفٹ دینے سے رہی۔ رات تو رات کوئی تنہا لڑکی کسی اجنبی کو دن میں لفٹ نہ دے۔ آج کل کراچی کے حالات بھی تو نامساعد ہیں۔

”کیا سوچنے لگے؟“ لڑکی نے ہنس کر کہا۔

”دیکھیے محترمہ!“ سلمان نے سرد لہجے میں۔ ”اگر آپ یہ سمجھتی ہیں کہ میں کوئی پیسے والی آسامی ہوں تو یہ آپ کی غلط فہمی ہے۔ میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ میں آج کل بے روزگار ہوں۔“

”کیا آپ مجھے کوئی ایسی ویسی لڑکی سمجھ رہے ہیں؟“ لڑکی کو غصہ آ گیا۔ ”اگر آپ ایسا سمجھ رہے ہیں تو مجھے آپ کی سوچ پر افسوس ہے۔ میں نے تو آپ کو شریف انسان سمجھ کر لفٹ دی اور آپ...“ لڑکی نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

”میں معذرت خواہ ہوں۔“ سلمان نے جلدی سے کہا۔ ”اگر آپ کو میری کسی بات سے تکلیف پہنچی ہو تو معاف کر دیجیے گا۔“

”تو۔“ لڑکی نے سر ہلا کر کہا۔ ”پہلے آپ مجھے چائے پلائیں۔“

سلمان نے طویل سانس لی اور بولا۔ ”آیئے میرے ساتھ۔“

لڑکی نے گاڑی لاک کی اور اس کے ساتھ چلنے لگی۔ چلتے چلتے وہ بولی۔ ”کتنی عجیب بات ہے کہ ہم دونوں اتنی دیر سے ساتھ ہیں اور آپ نے اب تک اپنا نام بھی نہیں بتایا۔“

”تو آپ نے کون سا بتا دیا ہے۔“ سلمان ہنس کر بولا۔ ”میرا نام سلمان احمد ہے۔“

”میں شائلہ ہوں، شائلہ سرفراز، سرفراز صاحب کو تو آپ یقیناً جانتے ہوں گے؟“

”وہ سرفراز صاحب جو بہت بڑے صنعت کار اور سیاست داں ہیں؟“ سلمان کے لہجے میں حیرت تھی۔

”جی ہاں، وہی سرفراز صاحب۔“ شائلہ نے جواب دیا۔ وہ میرے شوہر ہیں۔“

”لیکن... وہ تو...“

”بوڑھے ہیں۔“ شائلہ نے ہنس کر اس کا جملہ مکمل کر دیا۔ ”یہ میری بدقسمتی ہے کہ میری شادی ایک بوڑھے سے کر دی گئی۔“

”زینے پہ اندھیرا ہے۔“ سلمان نے چلتے چلتے کہا۔ ”ذرا سنبھل کر چلیے گا۔ ہمیں صرف سیکنڈ فلور تک جانا ہے۔“

”کوئی بات نہیں۔“ شائلہ نے کہا۔ پھر گلوگیر لہجے میں بولی۔ ”جس کے دل میں اندھیرا ہو، باہر کا اندھیرا اس کا کیا بگاڑے گا۔“

سلمان اس کے جواب پر خاموش رہا۔ دونوں خاموشی سے سیڑھیاں چڑھ کر سیکنڈ فلور پر پہنچے۔ کوریڈور میں مدھم لائٹ کلر کا ایک انرجی سیور روشن تھا۔

سلمان نے چابی جیب سے نکال کر فلیٹ کا دروازہ کھولا اور بولا۔ ”آ جائیے۔“

شائلہ اندر داخل ہو گئی۔ ڈرائنگ روم بہت سلیقے سے سجایا گیا تھا۔ فرنیچر بھی بہت اچھا تھا اور کھڑکیوں پر پردے بھی قیمتی تھے۔ اس کا مطلب ہے کہ سلمان واقعی کوئی

معقول ملازمت کرتا تھا۔

''آپ بیٹھیں۔ میں چائے لے کر آتا ہوں۔''

شائلہ اس دوران میں ڈرائنگ روم کا جائزہ لیتی رہی۔ سلمان ٹرے میں دو کپ رکھ کر لے آیا۔ شائلہ چائے پیتے ہوئے مسلسل سلمان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ اچھا خاصا خوب رو اور وجیہہ مرد تھا۔ اسے دیکھ کر کوئی بھی لڑکی اپنا دل ہار سکتی تھی لیکن شائلہ تو شادی شدہ تھی۔

''میں آپ سے ایک بات کہوں؟'' شائلہ نے اچانک کہا۔

''جی کہیے۔'' سلمان چونک کر بولا۔

''وہ اصل میں جب میں یونیورسٹی میں پڑھتی تھی تو میرا ایک کلاس فیلو جمال تھا۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔''

سلمان نے سوچا کہ یہ لڑکی مجھے یہ سب کیوں بتا رہی ہے؟

شائلہ نے جیسے اس کا ذہن پڑھ لیا اور بولی۔ ''آپ بھی سوچ رہے ہوں گے کہ عجیب پاگل لڑکی ہے۔ مجھے یہ سب کیوں بتا رہی ہے؟ تو بات یہ ہے سلمان صاحب کہ جمال بالکل آپ کا ہم شکل تھا۔ وہی دراز قد، گھنے سیاہ بال، کسرتی جسم، سیاہ آنکھیں، آپ تو بالکل جمال کی تصویر لگتے ہیں۔ جب میں نے آپ کو سڑک پر پیدل چلتے دیکھا تو بری طرح چونک اٹھی تھی۔ مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ جمال یہاں کیسے آگیا؟ میں نے بے اختیار ہو کر آپ کو لفٹ کی آفر کر دی کہ مزید کچھ دیر آپ کو دیکھ سکوں۔ میرے والدین نے جمال سے میری شادی نہیں ہونے دی اور اس بڈھے کے حوالے کر دیا۔''

''وہ... میرا مطلب ہے کہ جمال اب کہاں ہے؟''

''جمال...'' لڑکی نے سسکی سی لے کر کہا۔ ''وہ اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ اس سے میری جدائی برداشت نہ ہو سکی اور اس نے خودکشی کر لی۔'' شائلہ کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

''آپ... پلیز مت روئیں...'' سلمان گھبرا کر بولا۔ وہ کسی لڑکی کو روتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا تھا۔

''میری ایک خواہش پوری کر دیں گے؟'' شائلہ نے کہا۔

''جی کہیے، اگر میرے بس میں ہوا تو ضرور پوری کروں گا۔''

''دیکھیے پھر آپ مجھے ایسی ویسی لڑکی سمجھیں گے۔'' شائلہ نے جھجکتے ہوئے کہا۔

''نہیں سمجھوں گا۔'' سلمان جواب دیا۔ اسے اب اس معصوم جذباتی لڑکی پر ترس آرہا تھا۔

''دیکھیے کچھ اور مت سمجھیے گا۔'' شائلہ نے کہا۔ ''شاید آپ جانتے ہیں کہ سرفراز آج کل ملک سے باہر ہیں۔''

''جی ہاں، میں جانتا ہوں۔ میں نے کسی اخبار میں بھی پڑھا تھا ان کے بارے میں۔''

''میں چاہتی ہوں کہ آپ... کچھ دن کے لیے... جمال بن جائیں۔'' شائلہ نے کہا۔

''جی...!'' سلمان نے غیر یقینی انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

''مجھے غلط مت سمجھیے۔'' شائلہ جلدی سے بولی۔ ''میں بس آپ کو جی بھر کے دیکھنا چاہتی ہوں، پلیز... میری یہ خواہش پوری کر دیں۔''

''لیکن آپ... اس فلیٹ میں تو نہیں رہ سکتیں۔'' سلمان نے کہا۔

''میں اس فلیٹ میں رہنا بھی نہیں چاہتی۔ ملیر کی طرف سرفراز کا بہت بڑا فارم ہاؤس ہے۔ ہم وہاں جا کر رہیں گے۔''

''آپ اتنے بڑے آدمی کی بیوی ہیں اگر سرفراز صاحب کو معلوم ہو گیا تو آپ کا تو کچھ نہیں بگڑے گا، میں فضول میں مارا جاؤں گا۔''

''انہیں معلوم کیسے ہوگا۔ فارم ہاؤس پر میرے اور آپ کے سوا کوئی بھی نہیں ہوگا۔'' شائلہ نے کہا۔ ''آئیے نا پلیز۔''

اس کے لہجے میں ایسی خوشامد تھی کہ سلمان مزید انکار نہ کر سکا اور اس کے ساتھ چلنے پر راضی ہو گیا۔

''آپ بھی سوچ رہے ہوں گے کہ عجیب پاگل لڑکی ہے۔'' شائلہ نے کہا۔ ''یوں سینہ زوری سے ایک نوجوان کو لے جا رہی ہے، آپ پریشان نہ ہوں۔ مجھے جمال پر پورا بھروسا تھا۔ اس نے کبھی مجھے ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا۔ مجھے امید ہے کہ جمال کا ہم شکل بھی مجھے میلی نظر سے نہیں دیکھے گا۔''

''صرف اس یقین کی بنیاد پر آپ نے اتنا بڑا فیصلہ کر لیا؟'' سلمان نے کہا۔

''جی ہاں۔'' شائلہ نے کہا۔ ''مجھے جمال پر پورا بھروسا ہے۔''

وہ دونوں ایک مرتبہ پھر گاڑی میں آ بیٹھے۔ شائلہ نے گاڑی آگے بڑھا دی اور بولی۔ ''اب تو آپ کو یقین آ جانا چاہیے کہ آپ کی جاب میرے لیے کوئی پرابلم نہیں ہے۔

سرفراز صاحب کے آتے ہی آپ کی جاب پکی۔''

''میں ہمیشہ آپ کا شکر گزار رہوں گا۔'' سلمان نے کہا۔

''مجھے جمال سے اس غیریت کی توقع نہیں ہے۔''

سلمان خاموش ہو گیا۔ وہ فطری طور پر عیاش نہیں تھا۔ نہ اسے لڑکیوں سے کوئی دلچسپی تھی۔ اسے صرف ایک لڑکی سے دلچسپی تھی۔ وہ اس کی منگیتر تھی اور سکھر میں رہتی تھی۔ سلمان سوچ رہا تھا کہ اب جاب ملتے ہی میں فوری طور پر فرح سے شادی کرلوں گا۔

''دیکھیے مجھے کہتے ہوئے کچھ عجیب سا لگ رہا ہے۔'' شائلہ نے کہا۔ ''آپ کو فوری طور پر پیسوں کی ضرورت بھی ہوگی۔'' اس نے ڈیش بورڈ پر رکھا ہوا پرس اٹھایا اور اسے اپنی گود میں رکھ کر بائیں ہاتھ سے اسے کھول لیا اور نوٹوں کی ایک گڈی نکال کر سلمان کی طرف بڑھائی۔ ''دیکھیے انکار مت کیجیے گا۔ جمال بھی میری بات کو ٹالتا نہیں تھا۔''

سلمان کا دل چاہا کہ لڑکی کو ایک زوردار جھانپڑ رسید کرے اور کہے کہ بھاڑ میں گیا تمہارا جمال، تم خود تو پاگل ہو، مجھے بھی پاگل کر کے دم لوگی لیکن وہ اس سے ایسا کہہ نہیں سکتا تھا۔ لڑکی سے اسے صرف ایک لالچ تھا۔ وہ اسے بے روزگاری سے نجات دلا سکتی تھی۔ اس وقت جاب سلمان کی سب سے بڑی کمزوری تھی۔ اس نے خاموشی سے لڑکی کے ہاتھ سے نوٹوں کی گڈی لے لی۔ وہ اس قسم کے پیسے کو اپنے لیے ناجائز سمجھتا تھا لیکن اس وقت مجبوری یہ تھی کہ وہ جمال بنا ہوا تھا اور جمال اس پاگل لڑکی کی کوئی بات نہیں ٹالتا تھا۔

باتوں ہی باتوں میں وہ لوگ فارم ہاؤس تک پہنچ گئے۔ لڑکی نے اتر کے گیٹ کھولا اور گاڑی اندر لے جانے کے بعد ایک مرتبہ پھر اتر کر گیٹ بند کر دیا۔

''فارم ہاؤس تو بہت شاندار ہے۔'' سلمان نے توصیفی انداز میں کہا۔

''میں تمہیں یہاں مزیدار کھانے بھی کھلاؤں گی۔'' شائلہ نے کہا۔

''ہم کتنے دن یہاں رہیں گے۔'' سلمان نے پوچھا۔ وہ لڑکی کی جذبات بھری باتوں میں آکر یہاں آتو گیا تھا لیکن اب پچھتا رہا تھا۔

''صرف تین دن۔'' شائلہ ہنس کر بولی۔ ''کیونکہ چوتھے دن سرفراز صاحب واپس آرہے ہیں۔''

''تین دن۔'' سلمان کراہا۔ لڑکی نے غصے سے اس کی طرف دیکھا تو وہ جلدی سے بولا۔ ''صرف تین دن؟ میں تو سمجھ رہا تھا کہ ہم ہفتے بھر یہاں قیام کریں گے۔''

''اگر تم چاہو تو زندگی بھر یہاں قیام کر سکتے ہو۔'' شائلہ ہنس کر بولی۔

''کیا مطلب؟'' سلمان نے کہا۔ ''میں سمجھا نہیں؟''

''مطلب یہ کہ تم تو میرے دل میں رہتے ہو۔ میں جب بھی یہاں آؤں گی تم میرے ساتھ آؤ گے۔''

وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے فارم ہاؤس کے ایک شاندار بیڈروم میں داخل ہوئے۔

''تم ایک کام کرو۔'' شائلہ نے کہا۔ ''اس الماری میں سرفراز صاحب کے کئی سلیپنگ سوٹ بھی ہیں۔ تم ان میں سے ایک نکال کر پہن لو تاکہ تم ایزی ہو جاؤ۔ چاہو تو غسل بھی کرلو۔''

سرفراز اس الماری کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے جونہی الماری کھولی کوئی اس کے اوپر آگرا۔ سرفراز بری طرح چونک کر پیچھے ہٹا۔ وہ کوئی عورت تھی۔ انتہائی دلکش اور باوقار عورت۔ لیکن اس میں ایک خرابی تھی کہ وہ زندہ نہیں تھی۔ اس نے آہستگی سے عورت کی لاش کو فرش پر رکھ دیا اور گھوم کر دیکھا تو کمرے کا دروازہ بند تھا۔ وہ جھپٹ کر دروازے تک پہنچا اور اسے کھولنے کی کوشش کی لیکن کمرا باہر سے لاک کر دیا گیا تھا۔

سلمان نے عورت کی لاش کو دیکھا، اس کے جسم سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اسے مرے ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی۔ سلمان سوچ رہا تھا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟

اچانک کمرے کا دروازہ کھلا اور پولیس کا ایک سب انسپکٹر اور سپاہی اندر آگیا۔ ان کے ساتھ جمشید بھی تھا۔

جمشید نے چیخ کر انسپکٹر سے کہا۔ ''انسپکٹر صاحب! یہ آدمی کافی عرصے سے میری بیوی کو پریشان کر رہا تھا۔ شاید اسے بلیک میل کر رہا تھا۔ آج بھی یہ رقم لینے آیا تھا۔ رضوانہ نے اسے پیسے دے دیے ہوں گے پھر اس نے رضوانہ کو قتل کیوں کیا؟''

انسپکٹر نے آگے بڑھ کر سلمان کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال دیں اور سلمان کو گھسیٹتے ہوئے جمشید سے بولا۔ ''سر! آپ کو پولیس اسٹیشن تک آنا پڑے گا۔ آپ کا بیان بہت ضروری ہے۔''

''میں حاضر ہو جاؤں گا۔'' جمشید نے کہا۔

پولیس انسپکٹر کے جانے کے بعد ایک کمرے سے شائلہ بھی نکل آئی اور وہ جمشید کے ساتھ دیوانہ وار رقص کرنے لگی۔

* * *

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN

# خام گواہی

جمال دستی

خوشی کے لمحات حاصل کرنے کے لیے کتنی جدوجہد کرنی پڑتی ہے... اس کی کسمپرسی کا اندازہ وہی شخص کر سکتا ہے... جو اس کرب سے گزرا ہو... سختیوں کے بعد اب اسے زندگی کی آسانیاں میسر ہونے والی تھیں... وہ بے حد سرشار و مخمور تھا... مگر حسرت ان غنچوں پہ جو بن کھلے مرجھاگئے...

**کرنیں بکھیرتے سورج کی کارکردگی جس نے یکدم پانسا پلٹ دیا...**

مجھے بالکل واضح طور پر وہ صحیح لمحہ اچھی طرح یاد ہے جب میں نے پہلی مرتبہ اس حقیقت کو سمجھا کہ مجھے اپنی بیوی کو لازمی قتل کرنا ہوگا۔ یہ میرے ریٹائرمنٹ سے ٹھیک تین ہفتے پہلے کی بات ہے۔

میں نے اپنی زندگی کے پینتیس طویل اکتا دینے والے سال اس کمپنی کی نذر کر دیے تھے اور یہ احمقانہ یقین رکھتا تھا کہ میری کمی شدت سے محسوس کی جائے گی۔ لیکن بعد میں پتا چلا کہ اس بارے میں، میں نمایاں طور پر خوش فہمی کا شکار تھا۔ میرے اعزاز میں ایک لنچ کا اہتمام کیا گیا اور تحفے میں مجھے ایک سنہری گھڑی پیش کر دی گئی۔

میں نے اپنی ذاتی اشیا جوتے کے ایک ڈبے میں بھر لی تھیں۔ جب میں نے دفتر کی عمارت سے باہر قدم رکھا تو برسوں بعد مجھے اپنے آزاد ہونے کا احساس ہوا۔ میری ذاتی اشیا کا ڈبا میرے ہاتھ میں تھا اور میرے ذہن پر کسی قسم کا کوئی بوجھ نہیں تھا۔

میری یہ خوش فہمی صرف اس وقت تک برقرار رہی جب تک میں اپنے گھر کے داخلی دروازے تک نہیں پہنچ گیا۔ ابھی میں نے گھر میں قدم رکھنے کے بعد دروازہ بند ہی کیا تھا کہ میری بیوی ڈورس نے دھڑلے کے ساتھ حسب معمول اپنے دکھڑوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔

تب میں نے اسی لمحے یہ عزم کر لیا کہ میں اپنی بقیہ زندگی یہاں بیٹھ کر اس کی طویل اکتا دینے والی شکایتیں سننے میں نہیں گزاروں گا۔

بے شک ڈورس کو دل کا عارضہ تھا لیکن مجھے یہ گوارا نہیں تھا کہ میں اپنی بقیہ زندگی اس کے مستقل مطالبات اور شکوے شکایات سننے میں برباد کر دوں۔ اگر میں اسے اس بات کی اجازت دوں گا تو مجھ پر لعنت ہو۔

اب جبکہ میرے پاس وقت اور پیسا دونوں تھا تو میں حقیقت میں زندگی سے لطف اندوز ہونا چاہتا تھا۔ میں ہر اس دیس اور ملک کی سیر کرنا چاہتا تھا جن کا میں نے زندگی بھر خواب دیکھا تھا۔ چاہے اس کے لیے مجھے ڈورس کو تنہا ہی کیوں نہ چھوڑ کر جانا پڑے۔

لیکن میں بے وقوف تھا جو یہ سوچ رہا تھا کہ وہ مجھے اپنے شکنجے سے نکلنے کی اجازت دے دے گی۔

ایک رات قبل میرے اس اچانک انکشاف کے بعد کہ میں جزیرہ ہوائی کی سیر کا ارادہ رکھتا ہوں، ہمارے درمیان خاصی بحث ہوئی۔ ڈورس نے کہا کہ میں اسے تنہا گھر پر چھوڑ کر امیر بیواؤں کے گروپ کے ہمراہ گل

چھرے اڑانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ جب میں نے یہ کہا کہ وہ بھی میرے ساتھ چلے تو اس نے مجھ پر الزام لگایا کہ میں اسے مار ڈالنا چاہتا ہوں۔ اس نے کہا کہ وہ جانتی ہے کہ وہ کبھی بھی زندہ گھر واپس نہیں لوٹے گی۔

مجھے اس کی ان باتوں پر طیش آرہا تھا۔ اپنی صحت کے بارے میں اس کی شکایات ایک عرصے تک سنتے سنتے میں عاجز آچکا تھا اور یہ نوبت آچکی تھی کہ مجھے اب اس کی صحت سے کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ وہ دل کی مریضہ تھی لیکن اگر اس کا خیال یہ تھا کہ میں اپنی بقیہ زندگی اس کی دیکھ بھال کے لیے گھر ہی میں محدود رہ کر گزار دوں گا تو یہ اس کی سراسر غلط فہمی تھی۔

اگلے روز صبح جب میں باتھ روم میں آئینے کے سامنے کھڑا اپنی داڑھی تراش رہا تھا تو اچانک مجھ پر منکشف ہوا کہ ڈورس کو لازمی مرنا ہوگا۔

اس لیے کہ میں نے زندگی بھر سخت محنت مشقت اس لیے نہیں کی تھی کہ وہ مجھ سے وہ خوشیاں چرا لے جن کی خاطر میں نے اتنی کٹھن زندگی گزاری تھی۔

درحقیقت اس سارے معاملے کا مشکل ترین مرحلہ اس پر عمل کرنے کے فیصلے تک پہنچنے کا تھا۔ اس کے بعد کے تمام مرحلے حیرت انگیز طور پر نہایت آسان لگ رہے تھے۔ ڈورس کو یہ یقین دلانا مشکل نہیں تھا کہ میں نے اس کے مطالبے کے سامنے ہتھیار ڈال دیے ہیں اور اب میرا جزیرہ ہوائی یا کسی اور تفریحی مقام پر جانے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔

اب میں نے روزانہ مقامی لائبریری میں جانا شروع کر دیا۔ ڈورس رومانی ناول پڑھنے کی رسیا تھی۔ وہ تقریبا روزانہ ہی دوڑتی ہوئی لائبریری جایا کرتی تھی اور پڑھنے کے لیے ایک نیا ناول لے آتی تھی۔ اس کے اس مشغلے کو مدِنظر رکھتے ہوئے میں نے موقع غنیمت جانا اور اسے پیشکش کی کہ میں خود لائبریری جا کر اس کے لیے روزانہ ایک نیا ناول لا سکتا ہوں۔

ڈورس نے میری یہ پیشکش بہ خوشی قبول کر لی۔

میں نے لائبریری پیدل آنا جانا شروع کر دیا۔ میں اس بات کا خاص خیال رکھتا تھا کہ میری روزانہ کی آمدورفت کے اوقات بھرپور طریقے سے لوگوں کی نگاہ میں رہیں۔

میں روزانہ عین نصف النہار کے وقت مقامی سوئمنگ پول کے پاس پہنچ جاتا تھا جہاں نوعمر لڑکے پانی میں اٹھکیلیاں کر رہے ہوتے تھے۔ میں نے ان سے ایک آدھ جملہ کہنا اپنا معمول بنا لیا تھا۔ میں ہمیشہ ان کو متوجہ کرتے ہوئے اپنی گھڑی کو دیکھتا تھا اور یہ کہتا تھا کہ یہ عین دوپہر کا وقت ہے اور سورج نصف النہار پر ہے۔

مجھے معلوم تھا کہ وہ پیٹھ پیچھے میرا مذاق اڑاتے تھے اور مجھے ایک خبطی اور احمق بوڑھا کہتے تھے لیکن میں نے کبھی اس کی پروا نہیں کی۔ اس لیے کہ اس حوالے سے وہ مجھے یاد رکھتے تھے اور یہ بات میرے مقصد کے لحاظ سے نہایت موزوں تھی۔

پھر میں وہاں سے آگے بڑھ جاتا تھا اور گھڑی پر نگاہ رکھتے ہوئے عین ساڑھے بارہ بجے لائبریری میں ہوتا تھا۔ میں اپنی گھڑی کو دیکھتے ہوئے لائبریرین سے کہتا تھا کہ وہ میری پابندی کو دیکھتے ہوئے اپنی گھڑی سیٹ کر سکتا ہے۔ چند ہفتوں کے بعد میرا یہ معمول ہر ایک کے ذہن میں نقش ہو چکا تھا۔ اگست کے آخر میں، میں نے محسوس کیا کہ اب اپنے منصوبے کے اگلے حصے پر عمل کرنا میرے لیے محفوظ رہے گا۔

اس روز میں اپنے معمول سے ایک گھنٹا قبل گھر سے روانہ ہوا تو ڈورس اپنے ناول کے مطالعے میں اتنی منہمک تھی کہ اس نے نظریں اٹھا کر میری جانب دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا۔

سوئمنگ پول تک پہنچ کر میں اپنی مخصوص جگہ پر رک گیا، میں نے اپنی دستی گھڑی پر نگاہ ڈالی اور پانی میں موجود لڑکوں سے کہا کہ یہ نصف النہار کا وقت ہے جبکہ حقیقت میں اس وقت صرف گیارہ ہی بجے تھے۔ پھر ان سے چند جملوں کا تبادلہ کرنے کے بعد میں لائبریری کی جانب چل دیا۔

جب میں سوئمنگ پول میں موجود تیراکوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا تو جلدی سے درختوں کے جھنڈ میں چلا گیا اور گھوم کر واپس اپنے گھر کی جانب تیز تیز قدموں سے چلنے لگا۔

گھر پہنچ کر ڈورس کو قتل کرنا میری توقع سے کہیں زیادہ آسان رہا۔ میں نے صوفے پر سے ایک تکیہ اٹھایا اور اسے مضبوطی کے ساتھ ڈورس کے چہرے پر رکھ کر اس پر اپنا پورا دباؤ ڈالنا شروع کر دیا۔ ڈورس نے اتنی جدوجہد نہیں کی جتنی کہ میں اس سے توقع کر رہا تھا۔ میں نے تکیے پر اس وقت تک پوری احتیاط کے ساتھ اپنا دباؤ برقرار رکھا جب تک مجھے یقین نہیں آگیا کہ وہ جان کی بازی ہار چکی ہے۔

ڈورس کی پسندیدہ کرسی کے برابر والی میز پر ایک

قدیم نادر گھڑی رکھی رہتی تھی۔ مجھے اچانک خیال سوجھا تو میں نے اس گھڑی کا وقت آگے بڑھا دیا اور اسے بارہ بج کر پینتیس منٹ پر سیٹ کر دیا۔ ساتھ ہی اسے نیچے فرش پر لڑھکا دیا۔

پھر احتیاط کے ساتھ ڈورس کی لاش فرش پر رکھ دی اور اس کا ہاتھ ٹیلی فون کی جانب بڑھتے ہوئے کر دیا۔

واپسی میں، میں نے احتیاط برتی اور سوئمنگ پول کی جانب سے لائبریری جانے سے گریز کیا اور راستہ تبدیل کرتے ہوئے اپنے معمول کے وقت پر لائبریری پہنچ گیا۔ میں نے اس بات کا خاص خیال رکھا کہ لائبریرین میری وقت کی پابندی کو خاص طور پر نوٹ کر لے۔

پھر جونہی میں گھر واپس پہنچا تو میں نے فوراً ہی ہمارے فیملی ڈاکٹر کو فون کیا اور ڈورس کے ’ہارٹ اٹیک‘ کی خبر دی۔ وہ چند منٹوں میں ہی پہنچ گیا۔

ڈورس کے دل کی کیفیت کو مدِنظر رکھتے ہوئے مجھے توقع تھی کہ وہ ہارٹ فیل ہونے کی بنا پر موت کے سرٹیفکیٹ پر فوراً ہی دستخط کر دے گا۔ لیکن اس وقت مجھے ایک جھٹکا سا لگا جب اس نے میرا فون استعمال کرنے کی اجازت چاہی اور شیرف کے دفتر کا فون نمبر ڈائل کیا۔

شیرف ایڈمز تقریباً بیس منٹ میں آ گیا۔ اسے دیر اس وجہ سے ہوئی کہ وہ راستے میں سوئمنگ پول سے اپنے بیٹے بوبی کو لینے چلا گیا تھا۔

جونہی ان دونں باپ بیٹے نے ہمارے گھر میں قدم رکھا، ڈاکٹر جونسن، شیرف ایڈمز کو ایک جانب لے گیا اور دبے دبے لہجے میں اس سے بات چیت کرنے لگا۔ مجھے جو کچھ سنائی دیا، وہ یہ تھا کہ ڈاکٹر ڈورس کی موت کے بارے میں کچھ شبہ کا اظہار کر رہا تھا اور کہہ رہا تھا کہ اس کی آنکھوں سے معاملہ کچھ گڑبڑ سا لگ رہا ہے۔

’’جب تم گھر پہنچے اور اپنی بیوی کو فرش پر پڑے ہوئے پایا تو تم نے کیا کیا؟‘‘ شیرف نے مجھ سے پوچھا۔

’’جب میں گھر پہنچا اور میں نے اسی طرح اسے فرش پر پڑا ہوا پایا تو سب سے پہلا کام میں نے یہ کیا کہ اس کی نبض ٹٹولی۔ جب مجھے اس کی نبض نہیں ملی تو میں نے فوری طور پر ڈاکٹر جونسن کو فون کیا۔‘‘ یہ جواب دیتے ہوئے میں نے بھرپور کوشش کی کہ میری آواز سے یہ ظاہر ہو جیسے میں اپنے آنسوؤں کو روکنے کی جدوجہد کر رہا ہوں۔

’’کیا تم نے کوئی ایسی بات نوٹ کی جس کی بنا پر تمہیں یہ خیال آیا ہو کہ کوئی چوری چھپے زبردستی گھر میں گھس آیا ہو؟‘‘ شیرف ایڈمز نے پوچھا۔

’’اب جبکہ تم نے تذکرہ کیا ہے تو مجھے یاد آیا کہ عقبی دروازہ کھلا ہوا تھا۔ مائی گاڈ، لگتا ہے کہ میری اچانک آمد نے میری بیوی کے قاتل کو لازی عقبی دروازے سے بھاگ کھڑا ہونے پر مجبور کر دیا ہوگا۔‘‘

’’اس بات کی زیادہ امید نہیں ہے۔ جیسا کہ تم اپنی اس ٹوٹی ہوئی گھڑی کو دیکھ رہے ہو، اس کے مطابق تمہاری بیوی کی موت بارہ بج کر پینتیس منٹ پر واقع ہوئی تھی اور یہاں موجود ڈاکٹر جونسن کا کہنا ہے کہ تم نے اسے دو بجے کے بعد فون کیا تھا۔ یہ وہ وقت ہے جب تم عام طور پر لائبریری سے واپس گھر آتے ہو، درست؟‘‘

’’بالکل ٹھیک کہا، شیرف ایڈمز، بالکل ٹھیک! میں گھر سے گیارہ بج کر چالیس منٹ پر نکلا تھا۔ سوئمنگ پول پر ٹھیک بارہ بجے پہنچا تھا اور لائبریری ٹھیک ساڑھے بارہ بجے پہنچ گیا تھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ تمہارا بیٹا بھی میری پابندی وقت کی تصدیق کر سکتا ہے۔ میں نے آج بھی اس سے بات کی تھی جیسا کہ میں اکثر کیا کرتا ہوں اور وہ ٹھیک بارہ بجے دوپہر نصف النہار کا وقت تھا۔

آپ لوگ میرے خوف و دہشت کا تصور کر سکتے ہیں جب شیرف کے بیٹے نے اپنی ان بڑی بڑی معصوم نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور جائے واردات سے میری عدم موجودگی کو مکمل طور پر برباد کر دیا۔

’’آئی ایم سوری سر۔ لیکن اس وقت بارہ نہیں بجے تھے۔ بوائز اسکاؤٹ میں ہمیں وقت سورج کی پوزیشن کو دیکھ کر بتلانا سکھایا جاتا ہے۔ لہٰذا میں نے یہ بات نوٹ کی تھی کہ جب آپ نے اپنی گھڑی کی طرف دیکھا تھا اور یہ کہا کہ یہ نصف النہار کا وقت ہے تو اس وقت سورج اپنے درست مقام پر موجود نہیں تھا۔ آپ جب بھی ہمارے پاس سوئمنگ پول پر آتے ہیں تو میں ہمیشہ سورج کو چیک کرتا ہوں۔ وہ اس وقت عین دریا کے اوپر ہوتا ہے۔ لیکن آج وہ وہاں پر نہیں تھا۔ آج وہ مشرق کی جانب تھا اور دریا کے عین اوپر نہیں پہنچا تھا۔ مجھے اس وقت حیرانی ہوئی تھی جب آپ نے یہ کہا تھا کہ یہ عین دوپہر کا وقت ہے اور سورج نصف النہار پر ہے۔ آپ نے ہمیں ایسا کیوں کہا تھا جبکہ نصف النہار ہونے میں کم از کم ایک گھنٹا باقی تھا؟‘‘

اور یہی وہ لمحہ تھا جب شیرف ایڈمز نے مجھے میرے حقوق پڑھ کر سنانا شروع کر دیے۔

# آوارہ گرد

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

قسط نمبر: 20

مندر، کلیسا، سینی گاگ، دھرم شالے اور انند آشرم... سب ہی اپنے اپنے عقیدے کے مطابق بہت نیک نیتی سے بنائے جاتے ہیں لیکن جب بانیوں کے بعد نکیل بگڑے ذہن والوں کے ہاتھ آتی ہے تو سب کچھ بدل جاتا ہے... محترم پوپ پال نے کلیسا کے نام نہاد راہبوں کو جیسے گھناؤنے الزامات میں نکالا ہے، ان کا ذکر بھی شرمناک ہے مگر یہ ہو رہا ہے... استحصال کی صورت کوئی بھی ہو، قابل نفرت ہے... اسے بھی وقت اور حالات کے دھارے نے ایک فلاحی ادارے کی پناہ میں پہنچا دیا تھا... سکھ رہا مگر کچھ دن، پھر وہ ہونے لگا جو نہیں ہونا چاہیے تھا... وہ بھی مٹی کا پتلا نہیں تھا جو ان کا شکار ہو جاتا... وہ اپنی چالیں چلتے رہے، یہ اپنی گھات لگا کر ان کو نیچا دکھاتا رہا... یہ کھیل اسی وقت تک رہا جب اس کے بازو توانا نہ ہو گئے اور پھر اس نے سب کچھ ہی الٹ کر رکھ دیا... اپنی راہ میں آنے والوں کو خاک چٹا کر اس نے دکھا دیا کہ طاقت کے گھمنڈ میں راج کا خواب دیکھنے والوں سے برتر... بہت برتر قوت وہ ہے جو بے آسرا نظر آنے والوں کو نمرود کے دماغ کا مچھر بنا دیتی ہے... پل پل رنگ بدلتی، نئے رنگ کی سنسنی خیز اور رنگا رنگ داستان جس میں سطر سطر دلچسپی ہے...

**تحیر... سنسنی اور ایکشن میں ابھرتا ڈوبتا دلچسپ سلسلہ...**

Downloaded From

READING
Section

ماں جی کی بات نے جیسے وقت کی نبض تھام لی تھی۔ ایسی نبض کہ جس کی حرکت دل کی ہموار ”ردھم“ کا پتا دیتی ہے کہ زندگی ابھی رواں دواں ہے، لیکن صرف دھڑکتے دل کا نام ہی تو زندگی نہیں... بعض زندہ لوگ تو مُردوں سے بھی بدتر ہوتے ہیں یا کردیے جاتے ہیں۔ ماں جی کی بات بھی شاید میرے لیے کچھ ایسا ہی پیغام لائی تھی۔ جس نے مجھے گردوپیش سے تو کیا اپنے آپ سے بھی بیگانہ کر دیا تھا۔

کمرے... کی فضا اچانک ہی دم بہ خودسی ہوگئی تھی۔ ہر سُو ایک سناٹا طاری ہوگیا تھا۔ ہاں! شور... زدہ سناٹا۔ بھلا سناٹا بھی شورزدہ ہوتا ہے؟ لیکن بعض سناٹے ایسے ہی ہوتے ہیں۔ جو بہ ظاہر خاموش ہوں مگر اندر اپنے ایک طوفان چھپائے ہوتے ہیں۔

میں ماں کے دائیں جانب اور زہرہ بانو اُن کے بائیں طرف بیٹھی تھی۔

میں ابھی تک جیسے ایک شاک کی سی کیفیات سے دوچار تھا۔ میرا ہاتھ ابھی تک زہرہ بانو کے نرم و نازک ہاتھ پر تھا، ان کے ہاتھ میں واضح طور پر لرزش محسوس کی جاسکتی تھی۔

چند نہیں بلکہ کئی ثانیے اسی طرح گم صم سی گھڑیوں کی نذر ہوگئے، اور جب حواسوں کو عقل و خرد کا یارا ہوا تو میں نے ماں جی کے دائیں جانب بیٹھی زہرہ بانو کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اس کی کشادہ آنکھیں.... مزید پھیلی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں۔ چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ نگاہیں میرے چہرے پہ جم سی گئی تھیں۔ لگتا تو یہی تھا کہ میری طرح وہ بھی ایک شاک سے گزر رہی ہو۔

آخر کیا سوچ کے ماں جی نے اتنی بڑی بات اور اتنی آسانی سے کہہ دی تھی؟ کیا انہیں اندازہ نہیں تھا کہ میرا اور عابدہ کا تعلق، احساسات و جذبات کی غیر مرئی ڈور میں بندھ چکا ہے؟ عابدہ کی وجہ سے میں کس قدر پریشان اور تشویش زدہ تھا، کیا ماں جی کو پھر بھی اس بات کا احساس نہ ہوسکا تھا کہ عابدہ میرے لیے میری سانسوں سے بھی زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔

ماں جی کو زہرہ بانو اور میری عمر کے تفاوت کی بھی پروا نہ تھی؟ یا... ان کا دل صرف اپنے بڑے بیٹے لئیق شاہ کے لیے دھڑکتا تھا؟ اور جو بیٹا، یعنی میں... ان کی نگاہوں کے سامنے تھا۔ ماں جی کو اس کے جذبات و احساسات کی کوئی فکر نہ تھی؟ آخر کیا سوچ کر ماں جی نے اتنی بڑی بات کہہ ڈالی تھی؟ مجھے اپنے اس خیال پر فوراً شرمندگی کا احساس بھی ہوا تھا کہ میں.... ماں کے ممتا بھرے اور بے لوث پیار پر ”شبہ“ کررہا تھا۔ ماں باپ کے لیے تو سب اولاد سانجھی ہوتی ہے۔ ہاں! یہ الگ بات ہے کہ ان میں سے ”لاڈلا“ کوئی کوئی ہوتا ہے۔

ماں جی کی ممتا بھری محبت کو میں نے آج دوسری بار شک کی نگاہ سے دیکھا تھا۔ اور خود ہی مجھے اپنی اس غلط فہمی پر ندامت اور شرمساری بھی محسوس ہونے لگی تھی۔

ایک خیال اور بھی اچانک ہی کسی برچھی کی طرح میرے سینے میں کھب کے رہ گیا۔

”کہیں اس سارے چکر میں زہرہ بانو کا تو ہاتھ نہیں تھا؟ ماں جی کو اپنے ساتھ بہ صد اصرار بیگم ولا لے جانا، ان کی تندہی کے ساتھ خدمت کرنا۔ اور ماں جی کو اپنا بنا لینا کہ ماں جی کا دل ہی بیگم ولا میں زہرہ بانو کے ساتھ لگ کر رہ گیا تھا۔ کک... کہیں غیر محسوس طور پر زہرہ بانو نے ہی تو نہیں میری اور عابدہ کی محبت پر شب خوں مارا تھا۔

یہ خیال آتے ہی میں نے بڑی تیز اور آتش فشاں... نظروں سے زہرہ بانو کے سکتہ زدہ چہرے کو دیکھا اور یہ اندازہ لگانے کی ناکام کوشش کرنے لگا کہ کہیں یہ ساری ”شرارت“ اور ”شرانگیزی“ اسی کی تو نہیں پھیلائی ہوئی۔ مگر خود اس کے چہرے پر بھی تو ایسے ہی تاثرات، ڈوبتی ناؤ کی طرح ہلکورے لے رہے تھے کہ جیسے اسے کچھ معلوم ہی نہ تھا۔

میری آنکھوں سے یکلخت پھوٹتے شراروں کی تپش کو شاید زہرہ بانو نے بھی پل کے پل بھانپ لیا تھا اور یہی سبب تھا کہ ایک لمحے کو اس کی آنکھوں میں خوف، آنسوؤں کی طرح بہہ کر اس کے پورے چہرے پر پھیل گیا۔

”تت... تم دونوں خاموش کیوں ہوگئے؟ جواب نہیں دیا میری بات کا۔“

دفعتاً ہی ماں جی کی آواز نے جیسے پُرسکوت گھڑیوں کو تھپک کر رقصاں کیا۔ تب ہی میں نے زہرہ بانو کے ہاتھ پر سے اپنا ہاتھ فوراً کھینچ لیا، یوں، جیسے میں نے کسی ناگن کے پھن پر اپنا ہاتھ رکھ دیا ہو۔ ماں جی نے میری اس حرکت کو خاص طور پر نوٹ کرتے ہوئے مجھے شاکی... نظروں سے گھور کے دیکھا۔

”مم... ماں جی! ی ی ی... یہ آ... آپ کیا کہہ رہی ہیں؟“

میری آواز میں ایسی لڑکھڑاہٹ تھی گویا میرا پورا جسم

ہی ڈگمگا رہا ہو۔ یکدم ہی میں ماں جی کے پاس سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''شہزی پُتر!''

ماں جی نے مجھے پکارا۔ ان کی ٹھہری ہوئی اور سپاٹ آواز محسوس کر کے میں اپنی جگہ کھڑے کھڑے ہی ان کی طرف گھوما تو ایک منظر دیکھ کر میں زہرہ بانو کی شر انگیزی اور چالاکی کی جھلک محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا۔ کیونکہ اس کا ہاتھ ابھی تک ماں جی کے ہاتھ میں تھا اور وہ ان کے پاس سے اٹھی بھی نہیں تھی۔

یہی وہ وقت تھا، جب پہلی بار میرے پورے وجود میں اس کے لیے نفرت کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ جبکہ ماں جی مجھے آواز دینے کے بعد اب میرا چہرہ تکے جا رہی تھیں۔ اپنی آواز پر متوجہ پا کر وہ دوبارہ بولیں۔

''تجھے پسند نہیں آئی میری بات شہزی پُتر؟''

میں ابھی ماں جی کو ایسا کوئی جواب نہیں دینا چاہتا تھا جس سے ان کا دل دکھتا۔ لہٰذا میں نے پل کے پل اس گمبھیر اور لاینحل سی صورتِ حال کو ماں کی بغیر کسی ناراضگی کے ہینڈل کرنے کا سوچ کر، مصالحانہ انداز اختیار کرتے ہوئے، ماں جی کے قریب آ کر کہا۔

''ماں جی! میرے لیے آپ کا یہ فیصلہ بہت اچانک اور بالکل ہی غیر متوقع ہے۔ جس کا ابھی میں اتنی جلدی بھلا کیا جواب دے سکوں گا؟''

یہ کہہ کر میں تھما اور پھر جیسے ان عذاب ناک گھڑیوں کا کچھ بوجھ زہرہ بانو کی گود میں ڈالنے کی غرض سے دوبارہ ماں جی سے بولا۔

''بلکہ یہ سب کچھ تو زہرہ بھابی کے لیے بھی غیر متوقع اور اچانک ہی ہو گا۔ اب بھلا وہ یا میں اتنی جلدی اتنا بڑا فیصلہ کیسے کر سکتے ہیں؟''

دفعتاً ہی مجھے احساس ہوا کہ میرے منہ سے کچھ غلط نکل گیا۔ یہ احساس مجھے ماں جی کے چہرے پر خوش امیدی کے ابھرتے تاثر کو بھانپ کر ہوا۔ وہ میری اس بات سے شاید مجھے نیم رضامند سمجھ رہی تھیں، یہی وجہ تھی کہ وہ مجھ سے ممتا بھری رسانیت سے بولیں۔

''ہاں، ہاں... شہزی پُتر! تم دونوں سوچ لو پھر فیصلہ کر لینا۔ ایک دوسرے سے تو تم پہلے سے واقف ہو ہی۔ ویسے ایک بات میں تم دونوں سے ہی کہوں گی کہ یہ سارے تقدیر کے کھیل ہوتے ہیں۔ کس کا کہاں اور کس کے ساتھ لکھا ہے، یہ کاتبِ تقدیر پہلے ہی لکھ چکا ہوتا ہے اور میں تم دونوں کا ایک لکھا دیکھ رہی ہوں۔ کاش! میرا یہ سوہنا خواب پورا ہو جائے۔''

ماں جی کی بات سن کر میں دہل کر رہ گیا۔ ''کیا واقعی کاتبِ تقدیر نے ایسا کچھ میرے نصیب میں لکھ ڈالا تھا کہ...'' اس سے آگے کا تصور میرے لیے محال تھا۔

میں نے ایک سلگتی ہوئی نظر زہرہ بانو کے چہرے پر بھی ڈالی تھی۔ اس بار اس نے اپنا چہرہ جھکایا ہوا تھا۔ مجھے اس کا یہ انداز سراسر فدویانہ لگا۔ جیسے اسے ماں جی کی بات پر کوئی اعتراض ہی نہ ہو۔ اس میں بھی مجھے اس کی چلتر کاری کا شبہ ہوا تھا کہ وہ خاموش کیوں تھی؟ اسے بھی انکار میں بولنا چاہیے تھا ماں جی سے، تاکہ ماں جی اپنے اس خیال پر نظرِ ثانی کرنے پر مجبور ہو جاتیں۔

میں نے اپنی رسٹ واچ پر ایک نگاہ ڈالی اور بالآخر ایک گہری سانس کھینچ کر ماں جی سے کہا۔

''ماں جی! مجھے ایک ضروری کام کے سلسلے میں آج شام اول خیر کے ساتھ لاہور کے لیے روانہ ہونا ہے۔ ابھی تیاری بھی کرنی ہے۔ آپ کو اور کوئی بات تو نہیں کرنا تھی؟''

میری بات پر ماں جی نے ایک سوچتی ہوئی سی نظر میرے چہرے پہ ڈال کر ہولے سے اپنے سر کو اثبات میں جنبش دی، پھر بولیں۔

''شہزی پُتر! اپنا خیال رکھنا۔ کب تک لوٹے گا خیر سے؟''

''ارادہ تو جلد لوٹنے کا ہے، اگر کام بڑھ گیا تو مزید کتنے دن رکنا پڑے اس کا نہیں معلوم مجھے۔''

''چنگا۔ پر میری بات پر تو غور تو کرے گا ناں شہزی پُتر؟''

ماں جی نے مجھے جس بات پر غور کرنے کے لیے کہا تھا، وہ میرے لیے قابلِ غور تو کیا، اس کا تصور کرنا بھی میرے لیے ناممکنات میں سے تھا لیکن ماں جی کو میں کیا جواب دیتا؟

میں نے اپنے ہونٹ بھینچ کر بہت ہولے سے فقط اپنے سر کو اثبات میں جنبش دینے پر اکتفا کیا تھا۔ جبکہ ماں جی نے وقتِ رخصت میری خیریت اور سلامتی کی اتنی بہت سی دعائیں دیں کہ بے اختیار میرا دل بھر آیا۔ ماں جی انہی دعاؤں کا تو میں پیاسا تھا، جو وہ مجھے ہر وقت دیتی رہتی تھیں۔ میں ان کی طرف دیکھ کر ہولے سے مسکرایا اور پھر جب ماں جی کو سلام کر کے اور دانستہ زہرہ بانو کو نظر انداز کرتے ہوئے، کمرے سے نکلنے لگا تو وہ ایک دم ماں جی

کے پاس سے اٹھ کھڑی ہوئی اور مجھ سے بڑی نرم آواز میں بولی۔

”شہزی کھانے کا وقت ہو رہا ہے۔ کتنا اچھا ہوتا، اگر ہم ماں جی کے ساتھ اکٹھے بیٹھ کر کھانا کھاتے۔“

مجھے صاف لگا تھا کہ اس نے ”ہم“ کا صیغہ جان بوجھ کر لگایا تھا اور ”ماں جی“ کا لفظ الگ سے استعمال کیا تھا بلکہ اس نے اس حساس موضوع کے چھڑنے پر، دانستہ ہی تھوڑی دیر مزید روکنے کی کوشش کی تھی۔

میں نے اس کی طرف ایک بار پھر برہم سی نگاہ ڈالی اور خاصی رکھائی سے انکار کرتے ہوئے کہا۔ ”مجھے ذرا جلدی ہے، ویسے بھی ابھی مجھے بھوک نہیں پھر سہی۔“ کہہ کر میں دروازے کی طرف بڑھا اور اچانک کچھ سوچ کر میں مڑا، زہرہ بانو کی نگاہیں ابھی تک میرے تعاقب میں جمی ہوئی تھیں، مجھے اس طرح یکدم اپنی جانب پلٹتا دیکھ کر وہ بھی تھوڑا چونکی۔ میں نے اس سے مخاطب ہو کر کہا۔

”آپ ذرا..... میرے ساتھ آئیں گی؟“ میرا لہجہ یکسر اجنبی تھا۔

”ابھی آتی ہوں۔“ میں دروازے سے نکل کر دوسرے کمرے میں آگیا۔

یہ کمرا، ماں جی کے کمرے سے ذرا الگ اور فاصلے پر تھا.... اور خالی بھی۔

یہاں آکر میں بیٹھا نہیں، کھڑا رہا اور اپنے اندر کے ابال پر قابو پانے کی کوشش کرتا رہا۔ ابھی میرے پاس کچھ وقت تھا۔ اتنے میں وہ بھی آگئی۔

میں اس کی طرف پلٹا۔ ہم دونوں آمنے سامنے تھے اور نگاہیں چار تھیں۔

”کیا آپ ماں جی کے ساتھ اسی لیے اتنی محبت جتا رہی تھیں کہ وہ ایک دن آپ کی خدمت گزاری کے نتیجے میں آج میرے ساتھ اتنی بڑی بات کہہ ڈالیں جو میری سوچ میں تو کیا تصور میں بھی کبھی نہیں ہو سکتی۔ جواب دیں مجھے؟“

میں نے ایک ایک لفظ چبا کر سخت لہجے میں کہا تو اس کے شادابی چہرے پہ بیک وقت کئی رنگ چھلک گئے۔ ان میں برہمی کا رنگ بھی تھا اور ایک نامعلوم اداسی کا شائبہ بھی، کہیں ناگواری کی کروٹ تھی تو کسی رخ پر کم گشتہ دکھ بھی امڈا ہوا تھا، کشادہ آنکھوں کی گہرائیوں میں حسرت و یاس کی تاثراتی چمک بھی ابھری تھی، لیکن سب سے آخر میں اس کے چہرے پہ جو کیفیت گویا ٹھہر کے رہ گئی تھی، اسے محسوس کر کے ایک لمحے کو تو میں بھی قدرے چونکنے پر مجبور ہو گیا۔

زہرہ بانو کے چہرے کی اس آخری اور مجسم ٹھہر جانے والی کیفیت میں ایکا ایکی ایک سرکشی نمودار ہونے لگی۔ وہ جواباً آتش فشاں لہجے میں گویا ہوئی۔

”شہزاد احمد صاحب! تم نے کس برتے پر اتنا بڑا الزام مجھ پر تھوپ دیا؟ ماں جی سے میری محبت، میرا خلوص تمہیں ڈھونگ لگا؟ یہی کہنا چاہتے ہو نا تم؟“

”ہاں!“ میں اندر سے بھڑکا ہوا تھا اس لیے دوٹوک انداز میں کہہ ڈالا۔

”کیوں؟“

”کیوں؟“ میں نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ”کمال ہے۔ آپ جانتے بوجھتے ہوئے بھی انجان بن رہی ہیں؟ آخر ماں جی نے اتنی بڑی بات کیسے اور کیا سوچ کر کہہ ڈالی ہم دونوں سے؟ ضرور اس میں آپ کے ڈھونگی رویے کا بھی دخل ہوگا کہ ماں جی مجھ سے ایسا کہنے پر بالآخر مجبور ہو جائیں۔ صحیح کہا نا میں نے زہرہ بیگم!“

زہرہ بانو کے چہرے پر اب شدید اتار چڑھاؤ کی کیفیت طاری ہونے لگی۔ کچھ ایسا بھی محسوس ہوتا تھا کہ وہ ضبط اور تحمل سے کام لینے کی کوشش کر رہی تھی۔

”مجھے تم سے یہ توقع نہیں تھی شہزی! کہ تم میرے بارے میں ایسی گری ہوئی اور گھٹیا سوچ رکھو گے۔ مجھے ماں جی سے واقعی سچی محبت ہے۔ ان سے میری محبت کا صرف یہی حوالہ کافی ہے کہ وہ میرے مرحوم شوہر لئیق شاہ کی ماں ہیں اور میں ان کی بہو۔“

”تو پھر یہ سب آپ کیوں خاموشی اور فرماں برداری سے سنتی رہیں، جو ماں جی نے ہم دونوں سے کہا تھا۔“ میں نے تلخی سے اس کی طرف گھورتے ہوئے کہا۔

”آپ کو چاہیے تھا کہ آپ اسی وقت ان کے پاس سے اٹھ جاتیں اور ایک دم انکار کر ڈالتیں مگر آپ تو ایسے فدوایانہ انداز میں ان سے لگی بیٹھی رہیں جیسے آپ کو ماں جی کے اس فیصلے پر کوئی اعتراض ہی نہ ہو۔ میں بھی تو تھا ناں۔ ماں جی کی بات سنتے ہی ایک دم ان کے پاس سے اٹھ گیا۔ مقصد اشارتاً ان پر یہی ظاہر کرنا تھا کہ میرے لیے ان کا یہ فیصلہ قابلِ قبول نہیں۔“

”تو پھر کہہ ڈالتے یہ بات ماں جی سے... کیوں خاموش رہے تھے؟“ وہ بھی تنک کر بولی۔ ”اس طرح تو تم نے بھی دوغلے پن سے کام لیا۔ اور اس بات پر ہی ماں جی کو احساس ہوا تھا کہ ان کی بات تمہارے لیے قابلِ قبول ہے۔“

زہرہ بانو کی اس بات نے مجھے لاجواب سا کر دیا۔ کیونکہ اپنی اس غلطی کا مجھے بھی احساس ان کے چہرے پر ایک طرح کی خوش امیدی کا تاثر ابھرتے وقت ہوا تھا۔ تاہم میں نے کہا۔

”میں ابھی صاف بات کہہ کر ماں جی کا دل نہیں توڑنا چاہتا تھا لیکن اب یہ ذمے داری صرف آپ کی بنتی ہے زہرہ صاحبہ کہ آپ ماں جی کو اشاروں کنایوں سے سمجھانے کی کوشش کریں، انہیں میرے اور عابدہ سے متعلق اصل حقیقت بتا دیں۔ میں اس کے لیے کیا ہوں اور وہ میرے لیے کیا ہے۔“

”لیکن تم نے جو مجھ پر اتنا بڑا الزام لگایا ہے، اس کی کیا حیثیت ہے؟“ اس نے عجیب سے لہجے میں مجھ سے پوچھا تو میں نے بھی صاف صاف کہہ دیا۔

”اس کی وہی حیثیت ہے جو میں آپ سے کہہ چکا ہوں اور جو آپ اچھی طرح سن چکی ہیں۔“

”تمہیں اپنے یہ الفاظ واپس لینا ہوں گے شہزی!“ اچانک وہ بدلے لہجے میں بولی تو مجھے ایسا لگا جیسے وہ میرے سامنے کسی محاذ پر خم ٹھونک کر آ گئی ہو۔

”تم نے مجھ پر ایک غلط اور گھٹیا الزام لگایا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ تم اس پر ڈٹے ہوئے بھی ہو۔“

”تو پھر آپ کو اپنے الزام کی خود ہی نفی کرنا ہوگی۔“ میں نے بھی اٹل لہجے میں کہا۔ ”جس طرح آپ نے اپنے سلوک سے ماں جی کو یہ باور کروانا چاہا کہ آپ ان کو ابھی تک اپنی ساس سمجھتی ہیں، بالکل اسی طرح انہیں آپ نے یہ احساس دلانا ہے کہ ان کی بات، ان کا خیال، میرے لیے ہی نہیں بلکہ آپ کے لیے بھی ناقابلِ عمل ہے۔“

”پہلے تمہیں اپنے الفاظ واپس لینا ہوں گے شہزی!“

”میں نے جو دیکھا، جو محسوس کیا وہ کہہ دیا۔ اس کی نفی آپ کو خود کرنا ہوگی، اپنے عمل سے۔“

یہ کہہ کر میں انہیں سوچتا ہوا چھوڑ کر کمرے سے نکل گیا۔ اول خیر دوسرے کمرے میں اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے اسے بلوا لیا اور پھر ہم بیگم ولا سے اپنے ٹھکانے کی طرف روانہ ہو گئے۔

اس بار بھی کار اول خیر ہی ڈرائیو کر رہا تھا۔ میں خاموش تھا۔ اول خیر نے ایک دو بار میری طرف گردن موڑ کر دیکھا بھی تھا، شاید وہ منتظر تھا کہ میں خود بات کروں گا، مگر میری خاموشی کو طول پکڑتے دیکھ کر اسی نے بات کی ابتدا کی اور اپنے مخصوص لہجے میں بولا۔

”او خیر، کاکا! ماں جی سے ملنے کے بعد تو تیرے چہرے پہ بارہ بج گئے ہیں، خیریت ہے؟“

میری سوچتی نظریں کار کی ونڈ اسکرین پر جمی ہوئی تھیں۔ میں اسی انداز میں بولا۔ ”پتا نہیں کیوں یار اول خیر! آج میرا دل بڑا خراب سا ہو رہا ہے۔“

”او خیر! کیا بات ہو گئی ایسی کاکے؟ ماں جی نے تجھے کوئی ضروری بات کرنے کے لیے بلایا تھا۔ کہیں تیری خرابیِ دل کا تعلق اسی بات سے تو نہیں؟“

کوئی اور موقع ہوتا تو میں اس کی بات پر بے اختیار ہنس پڑتا، مگر اس وقت میں اندر سے تلخ ہو رہا تھا۔ ایک کڑواہٹ سی تھی جو کسی زہر کی طرح میرے پورے وجود میں گھل رہی تھی۔ چند ثانیوں کے بعد میں نے اول خیر کو ساری بات بتا دی، یہ بھی کہ آخر میں آتے ہوئے میری زہرہ بانو سے بھی تلخی ہو گئی تھی۔

اول خیر یہ سن کر سنجیدہ رہا۔ مگر پھر فوراً ہی اس نے ایک عجیب بات کہہ کر مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا۔

”شہزی کاکے! پتا نہیں تو کیا سمجھے، لیکن بات سچ ہے۔ چاہتا تو میں یہی تھا کہ تجھے پہلے ہی سے بتا دیتا، لیکن یہ موضوع ہی حساس نوعیت کا تھا کہ میں چپ رہا۔ درحقیقت مجھے انہی دنوں یہ شبہ ہونے لگا تھا، جب ماں جی کا بیگم ولا میں دل لگ گیا تھا۔ اور پھر جب ماں جی کی زبانی ہی یہ پتا چلا کہ ان کا وہاں دل لگنے لگا ہے تو میں کچھ کچھ کھٹک گیا تھا لیکن...“ وہ کہتے کہتے تھما تو بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔

”لیکن کیا؟“

”میرا خیال ہے تجھے بیگم صاحبہ سے ابھی اتنی بڑی بات نہیں کہنا چاہیے تھی۔ میں ان کی فطرت سے واقف ہوں۔ وہ اپنی شخصیت پر کوئی الزام بھی برداشت نہیں کرتی ہیں۔ اگر ایسا کچھ ہو بھی جائے تو وہ اس کی تردید کرنے کے بجائے، ضد میں آ کر الٹا وہی کرتی ہیں، جیسا انہیں سمجھا جا رہا ہوتا ہے۔“

”کیا مطلب ہے تمہارا؟ کیا میں نے ان پر غلط الزام لگایا تھا؟“ میں نے سوالیہ نظروں سے اول خیر کی طرف دیکھ کر کہا۔

”غلط تو نہیں کہا تھا کاکے! پر تجھے یہ بات ابھی نہیں کہنی چاہیے تھی۔ جبکہ ماں جی کو تو نے صحیح جواب دیا تھا۔ یعنی، نا انکار نا اقرار۔“ وہ بولا۔

”مگر مجھے اب بھی یقین ہے کہ زہرہ بانو نے میرے اور عابدہ کے بیچ سیندھ لگانے کی کوشش کی ہے۔ وہ پہلے ہی

میری طرف ملتفت رہتی تھی۔ اشاروں کنایوں میں اکثر یہ اندازہ لگانے کی کوشش کرتی رہتی تھی کہ مجھے عابدہ سے کتنی محبت ہے۔ لیکن وقت گزرتے کے ساتھ اسے جب خود ہی احساس ہو گیا کہ عابدہ میرے لیے کیا حیثیت اختیار کر چکی ہے تو...."

"او کاکے! تو واقعی کاکا ہی ہے۔" اول خیر نے اچانک میری بات کاٹ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

"کچھ ایسی باتوں بلکہ حقیقتوں سے انسان کو خود ہی مصلحتاً چشم پوشی کرنی چاہیے جس کا تعلق انسانی فطرت اور نفسیات سے ہو۔ دیکھ کاکے! میں کوئی زیادہ پڑھا لکھا آدمی نہیں ہوں، مگر ایسا تجربہ ضرور رکھتا ہوں، جو کسی یونیورسٹی یا کتابوں میں کم ہی ملتا ہے۔ تجھے تو اسی دن ہی یہ بات سمجھ لینی چاہیے تھی جب پہلی بار بیگم صاحبہ کا تجھ سے سامنا ہوا تھا اور وہ تجھے دیکھ کر کیوں بے ہوش ہو گئی تھیں۔" وہ ذرا تھما، پھر ایک موڑ کاٹنے کے بعد گرد و پیش پر اچٹتی سی نظر ڈالنے کے بعد دوبارہ سامنے نظر جماتے ہوئے بولا۔

"انسان اپنی پہلی محبت کو کبھی فراموش نہیں کرتا، اور وہ بھی ایسی محبت جو دائمی جدائی کا جاں گسل احساس بھی رکھتی ہو۔ یہی شے انسان کو ہمیشہ ایک ایسے احساسِ محرومی سے دوچار رکھتی ہے کہ۔۔ لاشعوری طور پر اپنے محبوب جیسی جھلک سے متعلق کوئی بھی نشانی کے لیے اس کا دل تڑپتا رہا ہے۔ اور پھر کاکے! تو تو پورا ہی لئیق شاہ ہے۔ اس لیے یہ بات سمجھنے کی کوشش کر، دل نرم رکھا کر کہ کچھ حقیقتوں کے آگے ایک کمزور انسان بے بس ہوتا ہے۔ یہی حال اس بے چاری بیگم صاحبہ کا بھی ہے۔

"کاکے! تو نہ صرف اس کی دید کے لیے سکون کا... باعث ہے بلکہ ان کے غمِ دل کے لیے ایک عذابِ مسلسل بھی ہے وہ تیری صورت میں رسائی و نارسائی کے کرب سے بھی دوچار رہتی ہوں گی۔ ممکن ہے کہ ماں جی کی بات نے شعوری و لاشعوری طور پر ان کی ازلی احساسِ محرومی کو اندر سے تڑپا کر رکھ دیا ہو۔ ان کی خاموشی بھی اسی بات کا مظہر ہو..... تمہیں بیگم صاحبہ کی یہ خاموشی "نیم رضامند" سی محسوس ہوئی ہو۔ لیکن تم نے ان کے آگے اس کا ورانہ دار اظہار کر کے بلکہ الزام لگا کے ان کی اس احساسِ محرومی کو ضد اور سرکشی میں بدل ڈالا ہے۔

بس! اب آگے اللہ خیر ہی کرے۔ لیکن تو تسلی رکھ... کاکے! ایسا کچھ ہوگا نہیں۔ بیگم صاحبہ کبھی بھی تیرے اور عابدہ کے حق میں ڈاکا نہیں ڈالیں گی۔ پر تو نے ان کا دل توڑ کر اچھا نہیں کیا۔"

اول خیر کی باتوں نے مجھے حیران سا کر دیا۔ زہرہ بانو کے بارے میں اس کے خیالات ایک طرف ان سے ہمدردی کے غماز نظر آتے تھے تو دوسری طرف ان کی حمایت میں مجھے بھی غلط ثابت کر رہے تھے۔

میں اس کی بات سن کر خاموش رہا۔ پتا نہیں کیوں میرا اس موضوع پر زیادہ بات کرنے کو جی نہیں چاہا۔ مجھے خاموش دیکھ کے اس نے بھی اپنی توجہ ڈرائیونگ پر مبذول کر دی۔

☆☆☆

لاہور روانگی کے سلسلے میں، کچھ سوچ بچار کے بعد میں نے پروگرام کچھ تبدیل کر دیا تھا۔

ثریا کے جس ساتھی نے مجھے فون کر کے لاہور کے ایک ہوٹل کے کمرا نمبر 19 میں آج رات نو بجے شارپلی پہنچنے کا کہا تھا، اس پر کلی طور پر بھروسا کرنا غیر دانشمندانہ قدم تھا، اگرچہ اس نے اپنی سچائی کے کچھ ثبوت میرے ساتھ "شیئرز" کیے تھے، اس کے باوجود احتیاط کا دامن تھامے رکھنا ضروری تھا۔

چنانچہ اول خیر اور میرا یہی پلان فائنل ہوا تھا کہ ہم لاہور کم از کم دو گھنٹے قبل پہنچ کر پہلے خود سے اس سارے معاملے کی ریکی کر کے تسلی کر لیں۔ ہمارے ساتھ شکیلہ نے بھی جانے کی ہامی بھر لی تھی۔

پی ایس ایس (پاور سیکریٹ سروس) والوں کے ہیڈ کوارٹر میں ہمارے مستقل قیام پذیری کے دوران میں اول خیر اور شکیلہ بھی کمانڈو ٹریننگ لیتے رہتے تھے بلکہ میں خود بھی اس میں شامل تھا، میجر ریاض باجوہ نے میری ہی سفارش پر ان دونوں کی رضاکارانہ بھرتی کا خیر مقدم کرتے ہوئے، میرے ہیلپرز کی حیثیت سے اجازت دے دی تھی۔

جیسا کہ پہلے بھی ذکر ہوا ہے کہ وطنِ عزیز میں موجود کالی بھیڑوں کا خفیہ طور پر قلع قمع کرنے کے لیے، جو مختلف لبادوں میں وطنِ عزیز کی جڑیں کھوکھلی کرنے اور لوٹ مار، کرپشن کے ذریعے اپنی تجوریاں بھرنے میں مصروف تھے، رینجرز کے ہی ایک ایسے ونگ کو عمل میں لایا گیا تھا جو کلی طور پر خود کو وطن کا گمنام مگر سچا سپاہی سمجھتے ہوئے اس میں رضاکارانہ طور پر بھرتی کیے گئے تھے۔ جو خود بھی اپنی ذاتی زندگی میں ایسے لوگوں کے ساتھ برسرِ پیکار تھے، مگر خاطر خواہ سورسز نہ ہونے کی بنا پر وہ بے بس تھے یا پھر مقدور بھر اپنی سی کوشش جاری رکھے ہوئے تھے۔ ان میں

سے ایک میں بھی تھا۔ میری چوہدری ممتاز اور روزیر جان کے ساتھ ہونے والی چوکھی جنگ میں ان دونوں دشمنوں کے خلاف چونکا دینے والے انکشافات کے بعد سے میجر ریاض باجوہ میرا انتخاب ایک ''پاور ایجنٹ'' کے طور پر کر چکے تھے۔

بہر حال اول خیر اور شکیلہ اس اہم مہم میں خاصے پُراعتماد نظر آرہے تھے۔ ماں جی گھر پر نہیں تھیں، ورنہ شکیلہ کو میں ساتھ نہیں لے جاتا۔

البتہ آنسہ خالدہ سے ہر وقت رابطے میں رہنے کے لیے میرے پاس اسمارٹ فون تھا اور اس میں تیز رفتار نیٹ کی سہولت موجود تھی۔

ہم لاہور کے لیے ملتان سے اپنی کار میں تقریباً تین بجے سہ پہر نکل پڑے۔ بائی روڈ سفر تھا اور کار بھی اچھی کنڈیشن کی تھی۔ درمیانی رفتار سے ملتان سے لاہور لگ بھگ چار سے ساڑھے چار گھنٹوں کا سفر تھا، میں نے اول خیر کو اسی رفتار سے کار چلانے کا کہا تھا۔

چونکہ یہ ایک اہم مشن تھا اور ہمارے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا تھا اسی لیے ہم نے ''اسلحہ خیز'' تیاری پوری کر رکھی تھی۔ کار اول خیر چلا رہا تھا اور اس کے برابر میں شکیلہ بیٹھی تھی، جبکہ میں دانستہ عقبی سیٹ پر براجمان تھا اور میری گود میں ایک ہلکی ساخت کی مشین گن تیار حالت میں تھی۔

اوکاڑہ پہنچ کر ہم.... ایک روڈ سائڈ ہوٹل میں بہ مشکل بیس منٹ رکے اور کار کے ریڈی ایٹر میں پانی ڈالا اور چائے کا ایک ایک کپ اپنے معدے میں اتارنے کے بعد دوبارہ روانہ ہو گئے۔ اب کار میں چلا رہا تھا اور میرے ساتھ والی سیٹ پر شکیلہ تھی جبکہ اول خیر عقبی سیٹ پر محتاط بیٹھا تھا۔

موسم گرم اور خشک تھا۔ کار کے شیشے چڑھے ہوئے تھے اور اے سی آن تھا۔ پنجاب کی گرمیاں یوں بھی بڑی خشک ہوتی ہیں۔ ٹھنڈے پانی کی بوتلیں ہمارے پاس موجود تھیں، تاکہ بلا وجہ راستے میں رکنا نہ پڑے اور سفر جاری رہے۔

لاہور کے لیے روانہ ہوتے وقت ـــــ شبہ تھا کہ ممکن ہے ہمارا تعاقب کیا جائے۔ مگر ابھی تک ایسی کوئی بات ظہور پذیر ہونے کے امکانات دور نزدیک نظر نہیں آرہے تھے۔

خلافِ توقع اول خیر اور شکیلہ کی ابھی تک راستے میں کوئی جھڑپ نہیں ہوئی تھی۔ وجہ مجھے یہی سمجھ میں آئی تھی کہ اس وقت ہم ٹوٹلی رسکی حالات سے دوچار تھے، کسی بحث میں پڑتے تو دشمن ہم پر وار کر سکتا تھا۔ بشرطیکہ انہوں نے ہی یہ جال بچھایا ہوتا، یہی سبب تھا کہ ہم غیر معمولی طور پر احتیاط کا دامن تھامے ہوئے تھے۔ البتہ گاہے بہ گاہے... موجودہ سچویشن پر تبادلۂ خیال ضرور کر رہے تھے۔

''اگر تو واقعی یہ سچ ثابت ہوا تو ہمیں ثریا کی روح کو سلام پیش کرنا چاہیے کہ وہ..... اپنی جان کی پروا کیے بغیر ان درندوں کے بیچ میں رہتے ہوئے، اپنے چند مٹھی بھر ساتھیوں کا ایک ایسا ٹولا بنانے میں کامیاب رہی جو اس کی موت کے بعد بھی اپنے اس خطرناک مشن میں معروف کار ہیں جو بھیڑیوں کی کچھار میں رہتے ہوئے ان کی بیخ کنی کرنے کو کوئی موقع ـــ جانے نہیں دیتے تھے۔

میرا خیال تھا کہ یہی گنتی کے چند بھیدی اسپیکٹرم کی لنکا

## تلاش

سردار دلیپ سنگھ لندن گئے۔ ایک روز ہائیڈ پارک کی وسعتوں کو ناپتے ناپتے تھک گئے تو ایک بینچ پر لیٹ کر ستانے لگے۔ چند منٹ بعد ایک ادھیڑ عمر خاتون ادھر سے گزری۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''آر یو ریلک سنگ (ARE YOU RELAXING)۔''

انہوں نے جھٹ کہا۔ ''نو... آئی ایم دلیپ سنگھ!''

پھر ایک چلبلی دوشیزہ نے جاتے ہوئے وہی کہا۔ سردار جی نے پرانا جواب دہرا دیا۔ جب چار پانچ لوگوں کے ساتھ یہی قصہ ہوا تو سردار جی بینچ سے اٹھ گئے۔ انہوں نے طے کر لیا کہ اتنے لوگ ریلک سنگھ کو ڈھونڈتے پھر رہے ہیں تو یہ مہم ان کو سر کر لینی چاہیے۔ وہ ایک طرف چل پڑے۔ راستے میں انہوں نے کئی لوگوں سے سوال کیا۔ ہر ایک ہنس کر عجیب نظروں سے ان کو دیکھتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ ایک دور افتادہ گوشے میں ایک عمر رسیدہ شخص بینچ پر لیٹا ہوا تھا۔ سردار جی نے اپنا سوال دہرایا۔ ''آر یو ریلک سنگھ؟'' اس نے غنودہ آواز میں کہا۔ ''یس۔''

سردار جی تیزی سے اپنی ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں بولے۔ ''تم یہاں پڑے موج کر رہے ہو... ادھر سارے لوگ تم کو ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔''

امرتسر سے سردار خشونت سنگھ کا تجربہ

ڈھا سکتے تھے۔ مگر تنہا یہ لوگ بہر حال کچھ کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھے، جب تک کہ انہیں کوئی بیرونی سپورٹ نہیں مل جاتی۔ ثریا جب زندہ تھی تو وہ بھی انہی بنیادوں پہ اپنا مشن جاری رکھے ہوئے تھی اور اسی سلسلے میں اسے میری مدد کی ضرورت تھی۔

ہم ساڑھے سات بجے تک بہ خیریت لاہور پہنچ گئے۔ میرے اندازے کے مطابق ہم نصف گھنٹا لیٹ ہوئے تھے۔

ہم نے سب سے پہلے ائرپورٹ کے قریب واقع مذکورہ ہوٹل کا رخ کیا۔ ملکی حالات کے پیشِ نظر راستے میں چند جگہوں پر ہونے والی چیکنگ کی وجہ سے ہم ریڈی میڈ میک اپ کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔ کیونکہ چیکنگ کے دوران شناختی کارڈ دکھانے کا سب سے پہلے تقاضا کیا جاتا تھا۔ ظاہر ہے اس میں ہمارے اصل فوٹو چسپاں تھے، چہرہ بدلنے کی صورت میں مشکل پڑ جاتی۔ جبکہ اسلحہ بھی ہم نے کار کے خفیہ خانوں میں چھپا رکھا تھا۔ پکڑے جانے کی صورت میں آخری ہتھیار میرا ”پاور ایجنٹ“ کا وہ کارڈ رہ جاتا تھا جس کے سلسلے میں، میں احتیاط ہی کرتا تھا کہ اسے بار بار شو نہ کرنا پڑے تو بہتر ہے۔

جیسے ہی ہم شہر میں داخل ہوئے تو مذکورہ ہوٹل کا رخ کرنے کے بجائے ہم نے کسی الگ تھلگ مقام پر کار کے اندر ہی یہ ”کام“ نمٹا دیا۔ اس میں مزید بیس سے پچیس منٹ صرف ہوگئے۔

ہمارے پاس اب ثریا کے ساتھی کی ”ریکی“ کرنے کے لیے کم و بیش ایک گھنٹا ہی بچا تھا۔

معاملہ حساس تھا اسی لیے میں اپنے منصوبے کو بے داغ رکھنا چاہتا تھا۔

سب سے پہلے ہم نے ایک نسبتاً عام سے قریبی ہوٹل میں ایک کمرا لیا۔ وہاں کچھ مزید ضروری تیاریاں کیں، جس میں ریڈی میڈ میک اپ بھی شامل تھا اور اسلحے کی ترتیب بھی۔

اس کے بعد ہم تینوں اس ہوٹل سے روانہ ہوئے اور ائرپورٹ والے ہوٹل کا رخ کیا۔

میں نے اب اپنی کار کو استعمال کرنے سے اجتناب برتا، اور وہی پرانا طریقہ اختیار کیا جو ایسے مواقع میں اکثر کرتا تھا۔ یعنی کار کسی گیراج میں روک کر اس کی ٹیوننگ اور آئل چینج کرنے کے لیے چھوڑ دی اور وہاں سے ہم تینوں ایک ٹیکسی میں روانہ ہوگئے۔

کسی اہم اور حساس نوعیت کے مشن کا ٹارگٹ حاصل کرنے کے لیے اپنے لائحہ عمل کو زگ زیگ انداز میں ترتیب دے کر آگے بڑھانا میری تربیت کا حصہ تھا۔

مذکورہ ہوٹل پہنچ کر جانے کیوں میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ حالانکہ ہم تینوں میک اپ میں تھے اور ہمارے پہچان لیے جانے کا احتمال کم ہی بلکہ نہ ہونے کے برابر تھا، لیکن اسپیکٹرم کے گھاگ اور انتہائی تربیت یافتہ ایجنٹ بھی غضب کی نظر رکھتے تھے۔ ایک تجربہ اس کا مجھے ہو چکا تھا۔ وہ ”متوقع“ صورتِ حال میں بدلے ہوئے چہروں کے پیچھے اصل چہرہ تاڑنے کی بھی صلاحیت رکھتے تھے۔

ہوٹل ائرپورٹ کے قریب واقع ہونے کی وجہ سے یہاں اندر باہر سخت سیکیورٹی کا انتظام تھا۔ اس کے لیے میں نے ادل خیر اور شکیلہ کو باہر ہی کہیں محتاط ہو کے کھڑے رہنے اور انہیں کانوں کی ”لو“ پہ اسپائی ائرفون چپکائے رکھنے کی ہدایت کر دی تھی۔ تاکہ میرا ان سے رابطہ بحال رہے۔

میری ہدایت کے مطابق یہ دونوں کسی عام سے فرد کو بھی شک میں مبتلا کیے بغیر اپنا کام بہ خوبی سر انجام دینا جانتے تھے۔ یعنی انہیں ایک ہی جگہ مسلسل کھڑے نہیں رہنا تھا۔

میں اب نہتا تھا اور ہوٹل کے گیٹ کی طرف بڑھ رہا تھا۔

گیٹ پر ہی مجھے روک لیا گیا۔ ایک وردی پوش سیکیورٹی گارڈ نے ”میٹل فائنڈر“ میرے پورے جسم پہ پھیرا، اس کے بعد مجھے ایک فل باڈی اسکیننگ (میٹل ڈیٹکٹر) ڈور کے اندر سے گزارا گیا اور پھر وہاں سے میں نے فرش پر بچھے دبیز کارپٹ پر قدم رکھتا، پُراعتماد چال چلتا ہوا دانستہ استقبالیہ پر جانے کے بجائے لابی کا رخ کیا۔ جہاں کہیں کہیں ہوٹل کے عملے کے افراد ڈبل پیس سیاہ سوٹ پہنے ہوئے تھے، ان میں گوری چٹی اسمارٹ لڑکیاں بھی تھیں۔

اس طرح کے اسٹارز ہوٹلز میں عام سے لباس والے کسٹمر کو یہ لوگ خوامخواہ ہی چبھتی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ شاید یہ ان کی پیشہ ورانہ تربیت کا حصہ تھا۔ ان کے خیال کے مطابق ایسا ہلکا کسٹمر ان کے مالی فائدے کے لائق نہیں ہوتا تھا۔ تاہم میں نے اپنی ڈریسنگ کا خاص خیال رکھا تھا تاکہ کسی معمولی آدمی کو بھی مجھ پر کسی قسم کا کوئی شبہ نہ ہو۔

میں نے بیش قیمت گرے کلر کا بہترین تراش کا سکینڈ کلاس ڈبل بٹن سوٹ زیبِ تن کر رکھا تھا، جو میرے دراز قد

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں؟ ۔

- ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ

سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی

- عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابنِ صفی کی مکمل رینج
- ایڈ فری لنکس، لنکس کو پیسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور رژیوم ایبل لنک
- ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو ہر پوسٹ کے ساتھ
- پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- مشہور مصنفین کی کُتب کی مکمل رینج
- ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

⇦ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

⇦ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

Online Library For Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety

twitter.com/paksociety1

اور کسرتی جسم پر بہت عمدہ نظر آتا تھا۔

یہی سبب تھا کہ لابی کی طرف جاتے ہوئے قریب کھڑے عملے کے ایک سوٹڈ بوٹڈ شخص نے میری پُر وجیہہ شخصیت سے مرعوب ہوتے ہوئے مجھ سے کچھ استفسار کرنے کی ضرورت ہی نہیں محسوس کی۔ اس کے برعکس اس نے نہایت ادب سے قدرے جھک کر ہاتھ کے اشارے سے لاؤنج کی طرف میری راہنمائی کرڈالی۔

اپنے چہرے پہ بُردبارانہ تاثرات لیے میں نے اس پر ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالی اور ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ اِدھر اُدھر ایک طائرانہ سی نگاہ ڈالنے کے بعد میں نے اسی مذکورہ شخص کی طرف دیکھا وہ کہیں اور دیکھ رہا تھا، مگر پھر مجھ پر نظر پڑی تو میں نے ہلکے سے اپنے سر کو اثباتی جنبش دی، اشارہ بھانپتے ہی وہ تیر کی طرح میری جانب بڑھا۔

''سر؟'' میرے صوفے کے قریب آکر وہ نہایت احترام سے بولا۔

''میری کراچی کی فلائٹ کینسل ہوگئی ہے، دوسری فلائٹ میں ابھی چند گھنٹے باقی ہیں، کوئی روم مل سکتا ہے؟''

مجھے معلوم تھا کہ اس کا جواب کیا ہوگا اسی لیے میں نے ساتھ ہی..... معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے یہ بھی کہہ ڈالا ''میں بہت تھکا ہوا ہوں، استقبالیہ پہ کھڑے ہونے کی ہمت نہیں ہے۔ بس! جلدی سے میرے لیے ایک کمرے کا بندوبست کردو جو گراؤنڈ پر ہی ہو۔ پندرہ اور بیس کی رو میں ہو تو زیادہ بہتر رہے گا۔ اس طرف ذرا میں ماحولیاتی سکون محسوس کرتا ہوں۔''

مجھے موٹی اسامی سمجھ کر اس نے چند سیکنڈوں میں میرا کام نمٹا دیا۔

میں نے دانستہ اسی کمرے کا انتخاب کیا تھا جو کمرا نمبر انیس کے قریب ہی ہو، تاہم ساتھ ہی میں نے اپنی قریب ترین چوائس بھی بتا ڈالی تھی۔

مجھے کمرا نمبر اکیس ملا تھا۔ میں نے تگڑی ٹپ کے ساتھ پے منٹ کی اور اسی آدمی کے ہمراہ مذکورہ کمرے میں آگیا۔

ثریا کے ساتھی نے چونکہ پہلے ہی سے مجھے کمرا نمبر انیس کا کہہ رکھا تھا جس کا صاف مطلب تھا کہ یا تو وہ وہاں موجود تھا یا آنے والا تھا، گویا کمرا بک تھا۔

یہاں آتے ہی میں نے اپنے لیے کچھ ہلکا پھلکا کھانے کو منگوایا اور کھانا سرو ہونے کے بعد میں نے اسی شخص سے ''یہ کمرا نمبر انیس میں میرے ایک عزیز کو بھی آنا تھا۔ کیا نام تھا اُس کا... ہاں، یاد آیا، زبیر، بتا سکتے ہو، وہ آگیا ہے؟''

وہ جواباً مودبانہ بولا۔ ''یس سر! وہ تو ابھی دو تین گھنٹے قبل ہی آئے تھے مگر میرا خیال ہے سر کہ وہ آپ کے مطلوبہ عزیز نہیں ہیں۔''

''کیا مطلب؟''

''وہ دو افراد ہیں، اور ایک ان میں مس سوزی نامی خاتون ہیں اور مرد کا نام شاید عبید تھا۔''

''اوکے! مجھے شاید مغالطہ ہوا ہوگا۔ تم جاسکتے ہو، ضرورت پڑی تو میں کال کرلوں گا تمہیں۔'' میں نے اس سے کہا۔ اس کے جاتے ہی میں نے اسپائی ٹرانسمیٹر پر اول خیر سے رابطہ کرکے اپنا کمرا نمبر بتا دیا۔

دو افراد میں ہمارا مطلوبہ آدمی عبید ہی ہوسکتا تھا، کیونکہ میرے سیل پر رابطہ کرنے والا مرد ہی تھا۔ جبکہ سوزی نامی عورت پر مجھے کچھ الجھن سی ہوئی تھی۔ ابھی یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ آیا یہ دونوں دشمن تھے یا خیرخواہ۔ یعنی آنجہانی ثریا کے ساتھی۔

عبید نے (اگر تو یہ وہی تھا) مجھے فون کرنے سے منع... کر رکھا تھا۔ البتہ خود وہ کسی وقت بھی مجھ سے رابطہ کرسکتا تھا۔

اگلے دس منٹوں بعد میں روم سے نکلا، گردوپیش پر طائرانہ سی نگاہ ڈالی اور میری نظریں کمرا نمبر انیس پر ٹھہر گئیں۔ پھر میں اسی طرف بڑھ گیا۔

عملے کی ایک سوٹ پوش حسینہ مسکراتی ہوئی میرے قریب سے گزرتی چلی گئی، جواباً میں بھی اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ وہ آگے بڑھ گئی تو میں مطلوبہ دروازے کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

میں نے دروازہ تھوڑا دھکیلا، وہ اندر سے بند تھا۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا، مجھے ایک ایسی آڑ کی تلاش تھی جہاں رک کر میں اس کمرے پر نگاہ رکھ سکوں۔ جلد ہی مجھے اوپر جاتے زینے کا ایک خلا دکھائی دے گیا، وہاں سے میں کسی کی نظروں میں آئے بغیر دروازے پر نگاہ رکھ سکتا تھا۔

اس طرف ایک نصف قدِ آدم کھڑکی بھی تھی جو باہر کی طرف کھلتی تھی۔ میں ادھر ہی جا کھڑا ہوا اور یونہی باہر کا نظارہ کرنے لگا۔

ہوٹل چونکہ سینٹرلی ائرکنڈیشنڈ تھا اس لیے کھڑکیاں ائرٹائٹ تھیں۔

کھڑکی کے پاس کھڑے ہو کر میں نے رسٹ واچ

میں وقت دیکھا۔ اسی وقت مجھے اپنے سیل کی تھرتھراہٹ محسوس ہوئی۔ میں نے دانستہ سیل کو ''خاموش'' حالت میں رکھا ہوا تھا۔

ڈسپلے پر اسی کا نمبر آرہا تھا۔ میرا دل یکبارگی ایک جوش کے احساس تلے دھڑکا اور کال اٹینڈ کر ڈالی۔

''ہیلو، کہاں ہو تم؟'' دوسری جانب سے عجلت آمیز آواز ابھری۔

''راستے میں ہوں لیکن فکر نہ کرو میں ٹھیک نو بجے۔۔۔''

''اوکے، رائٹ۔'' اس نے میری بات کاٹی۔

''میں نے یہی تسلی کرنے کے لیے فون کیا تھا۔ سنو، میں اس وقت اپنی جان داؤ پہ لگائے ہوئے ہوں، ممکن ہے تھوڑی دیر ہوجائے۔'' وہ آگے بولا۔

''میرے ساتھ ایک ساتھی لڑکی بھی ہے۔ وہ تنظیم کی وفادار ہے۔ میں اسے چالاکی سے ڈاج دے کر روم نمبر انیس میں آکر تم سے ملاقات کروں گا اور ایک اہم بات شیئر کرکے آئندہ کا کوئی لائحہ عمل بھی طے کریں گے۔''

''کیا تمہاری ساتھی لڑکی کو کمرا نمبر انیس کا علم ہے؟'' میں نے اس کا ایک جھوٹ پکڑنے کی غرض سے پوچھا۔

''ہاں! اوکے بائے۔'' اس نے یہ کہہ کر رابطہ منقطع کر دیا۔ میری تسلی تو ہوگئی تھی لیکن ایک بات پر الجھ گیا تھا میں۔ اگر وہ کمرا انیس میں مجھ سے کوئی خفیہ بات کرنا چاہتا تھا تو پھر اس نے اپنی ساتھی لڑکی یعنی تنظیم کی وفادار کو اس کمرے کے بارے میں کیوں بتایا تھا؟ یا پھر ہوسکتا ہے اس کی کوئی مجبوری ہو؟ وہ خود بھی کسی تنظیمی اہم مشن پر وہاں پہنچنے والے ہوں یا پھر پہنچ چکے ہوں؟

اس ضمن میں بہت سی باتیں ذہن میں آرہی تھیں جس کے چند اہم نکات پر میں غور کرچکا تھا۔

میں نے ہونٹ بھینچ کر پُرغور انداز میں اپنی رسٹ واچ میں وقت دیکھا، ساڑھے آٹھ بج چکے تھے۔ پہلے میرے دل میں خیال آیا کہ دروازے پر نوک کرکے اندر گن پوائنٹ پر گھسنے کی کوشش کروں لیکن اس طرح معاملہ بگڑ سکتا تھا۔ اگر وہ سچا تھا تو اس کا بھی سارا منصوبہ غارت ہو جاتا اور زندگی اس کی الگ اپنے لوگوں کے ہاتھوں داؤ پہ لگ جاتی۔ اسی لیے اب صبر کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

میرا اب وہاں کھڑے رہنا بے کار ہی تھا۔ لہٰذا میں واپس اپنے کمرے میں آگیا اور ایک بار پھر اول خیر سے رابطہ کیا۔ اسے مزید چند ضروری ہدایات دیں۔

پورے نو بجے تو نہیں، البتہ نو بج کر بیس منٹ پر اس نے مجھے کال کی اور پوچھا کہ میں اس وقت کہاں ہوں اور کتنی دیر میں پہنچ سکتا ہوں؟''

''مجھے پندرہ، بیس منٹ تو لگ ہی جائیں گے۔''

''ٹھیک ہے، لیکن اس سے زیادہ دیر نہیں ہونی چاہیے۔''

''میں استقبالیہ پر کیا کہوں کہ کس سے ملنا ہے مجھے۔ ایسے ہوٹلوں میں سیکیورٹی سخت ہوتی ہے۔ تم کس نام سے مقیم ہو؟''

''عبید۔'' اس نے جواب دیا اور میرا اثباتی جواب سننے کے بعد رابطہ منقطع کر دیا۔

میں نے مزید پندرہ منٹ اپنے کمرے میں گزارے، پھر اول خیر سے رابطہ کرکے اسے موجودہ سچویشن کے بارے میں آگاہ کیا اور پھر اپنے کمرے کا دروازہ کھول کے کمرا نمبر انیس کے دروازے پر آکر دستک دی اور ایک ہاتھ اپنا کوٹ کی جیب کے اندر ڈال لیا۔

''کون؟'' اندر سے ایک مردانہ آواز ابھری۔

''میں شہزی، جسے تم نے فون کیا تھا۔'' میں نے ہولے سے کہا۔ اسی وقت دروازہ کھلا۔ سامنے ایک درمیانی عمر اور مناسب قدوقامت کا حامل شخص کھڑا نظر آیا۔ اس نے مجھے فوراً اندر آنے کا اشارہ کرتے ہوئے راستہ دیا۔

میں محتاط روی کے ساتھ اندر داخل ہوگیا۔ اور ایک ہی نگاہ ڈال کے سمجھ گیا کہ وہ کمرے میں تنہا تھا۔

اس نے جلدی سے دروازہ بند کر دیا۔ جب تک وہ پلٹتا میں باتھ روم اور واش روم چیک کرچکا تھا کہ وہاں اس کا کوئی ساتھی تو نہیں چھپا ہوا۔

''میں تو سمجھتا تھا کہ ثریا کا حوالہ دینے کے بعد تمہارے لیے شک و شبے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہے گی؟'' وہ ہولے سے مسکرا کر بولا۔

میں نے اس کی بات کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھا اور دروازے کی چٹخنی چڑھا دی۔ تاکہ بعضی قفل کی دوسری چابی سے اس کا کوئی ساتھی اندر نہ در آئے۔

''اگر تمہاری تسلی ہوگئی ہو تو ہم آرام سے بیٹھ کر گفتگو کرلیں؟''

وہ کچھ کچھ بیزار سا نظر آنے لگا۔

''لو! یہ بھی میں میز پر ڈالے دیتا ہوں۔۔۔۔۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی جیب سے ایک پستول نکال کر قریب دھری میز کی سطح پر رکھ دیا۔

''تم شاید میک اپ میں ہو؟'' میں اس کی بات پر چونکا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ ثریا کے کتنے ساتھی میری صورت سے آشنا تھے؟

''تمہیں کیسے شک ہوا؟ کیا تم نے میری صورت دیکھی ہے؟''

''بچکانا سوال۔'' وہ بولا۔ ''تم اسپیکٹرم کے انتہائی مطلوب دشمنوں میں سے ایک ہو۔ تمہاری تصاویر تک پوری دنیا میں، جہاں جہاں اس کی شاخیں پھیلی ہوئی ہیں، پہنچا دی گئی ہیں۔ اب ذرا کام کی بات ہوجائے؟''

''شیور۔'' میں نے ہولے سے کہا۔ میں اب اس کی طرف سے کافی حد تک مطمئن ہو چکا تھا۔

اب ہم دو کرسیوں پر آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ میں نے ایک بار پھر اپنے کان کی لو پر ہاتھ رکھ کر اول خیر سے مختصراً بات کی اور اس سے بولا۔

''ہاں! اب کہو۔ کیا بات ہے؟'' وہ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔

''آرک لوچن کی تمہارے ہاتھوں ہلاکت کے بعد سے اسپیکٹرم کی لوکل کمانڈ کو زبردست دھچکا لگا ہے۔ کیونکہ وہ تنظیم کا ایک مقامی ہینڈلر ایجنٹ تھا۔ جس کے زیرِ اثر اسٹیشن چیف اور کینٹسا ایجنٹ ہوتے ہیں۔'' اس نے تھوڑا توقف کیا، اس کے بعد دوبارہ سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے آگے کہنا شروع کیا۔

''شاید تمہارے علم میں ہو کہ اسپیکٹرم بڑے بڑے عالمی گروہوں اور ممالک سمیت بھاری معاوضے پر ان کے مفادات کے لیے پوری رازداری کے ساتھ کام کرتی ہے بلکہ بسا اوقات تو انہیں بھی ساتھ ملا لیتی ہے جہاں ان کے مشترکہ مفادات ہوں۔ ان میں ''بلیوتلسی'' کا نام قابلِ ذکر ہے۔ بلیوتلسی کے بارے میں تمہیں کچھ بریفنگ ہے؟'' وہ رکا۔

''ہاں!'' میں نے کہا۔

''کیا؟''

''یہی کہ یہ بھارتی بدنامِ زمانہ خفیہ ایجنسی ''را'' کی ایک ذیلی شکل ہے جسے خصوصی طور پر بھارت نے پاکستان کے خلاف اپنے مذموم اور ناپاک مقاصد کے حصول کے لیے جدید بنیادوں پر تشکیل دیا ہے۔'' میں نے میجر ریاض باجوہ سے حاصل کردہ معلومات کے مطابق کہا تو عبید مسکرا کے عجیب سے لہجے میں بولا۔

''بس؟''

''کیا مطلب؟'' میں نے الجھن آمیز سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ بولا۔

''بھارت شروع ہی سے پاکستان کے خلاف دوغلی پالیسی چلاتا رہا ہے۔ بہ ظاہر وہ وطنِ عزیز کے خلاف جو ہتھکنڈے استعمال کرتا ہے، اس کے درپردہ کچھ اور ہی ہوتا ہے۔ را کے وطنِ عزیز میں ملک دشمن سرگرمیوں کے ٹھوس شواہد ملنے اور یو این او میں پاکستان کے خاطر خواہ احتجاج کے بعد سے معاملہ بہ ظاہر ٹھنڈا کر دیا جاتا ہے اور لگتا یوں ہے کہ اب سب ٹھیک ہو گیا۔ لیکن اس کے بعد را کا اصل ونگ ''بلیوتلسی'' اپنی کارستانیاں آگے بڑھاتا رہتا ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ را کا ایک ونگ بہت پہلے سے ہی کام کر رہا ہوتا ہے۔''

وہ اتنا بتا کر تھما اور ایک نگاہ اپنی رسٹ واچ پر ڈالنے کے بعد آگے بولا۔ ''اب میں اصل بات کی طرف آتا ہوں۔ آج بارہ بجے کی فلائٹ سے ایک عام مسافر کے بھیس میں بلیوتلسی کا ایک اسپیشل سپر ایجنٹ جس کا اصل نام سندرداس ہے، نبیل کے نام سے یہاں پہنچنے والا ہے، جو درحقیقت اسپیکٹرم کے ساتھ کیے گئے ایک معاہدے کے تحت اس کی۔۔ لوکل کمانڈ کو سنبھالا دے گا، اور اسے اسپیکٹرم کا ہینڈلر ایجنٹ کا عہدہ تفویض کیا جائے گا۔ یوں سمجھ لو اسپیکٹرم نے یہاں اپنے ذوتل ونگ کو سپورٹ دینے کے لیے بلیوتلسی سے ایک مدد لی ہے۔ اور اب وہ دونوں مشترکہ طور پر اپنے مذموم مقاصد کو یہاں پروان چڑھانا چاہتے ہیں۔'' وہ رکا۔

اس کی بات شاید ابھی مکمل نہیں ہوئی تھی۔ تاہم میں خاموش اور مستفسرانہ نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ آگے بولا۔

''پہلے میں خود سندرداس کو موت کے گھاٹ اتارنا چاہتا تھا۔ لیکن بعد میں غور کرنے پر میں نے سوچا کہ اس سے بھلا کیا فرق پڑتا؟ بلیوتلسی اپنا ایک اور ایجنٹ بھیج دیتی۔ یہ مسئلے کا خاطر خواہ حل نہ ہوتا۔ لہٰذا بعد میں اپنے ساتھیوں سے مشورہ کرنے کے بعد میں.... اس نتیجے پر پہنچا کہ تم سے مدد لینی چاہیے، جو پلان میں نے سوچ رکھا ہے، اس کے مطابق ہمیں اسپیکٹرم کے خلاف دوررس نتائج حاصل ہو سکتے ہیں۔''

''کیا پلان ہے تمہارا؟'' میں نے بے اختیار پوچھا۔ وہ میرے چہرے پہ اپنی نظریں مرکوز کرتے ہوئے بولا۔

''تمہیں سندرداس کی جگہ لینا ہوگی۔''

''واٹ؟'' میں بری طرح چونکا۔ ''یہ... یہ... کیسے ممکن ہے، بھلا؟ اسپیکٹرم کی پوری عالمی قیادت کی نظروں

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN

میں، میں اب اجنبی نہیں رہا، وہ میرے سامنے آئے بغیر میری ایک ایک ہسٹری اور تصویر تک سے واقف ہے۔ اگر تم یہ سوچ رہے ہو کہ میں میک اپ... کرلوں تو بھی یہ ناممکن ہے، باوجود اس کے بہت سی قباحتیں ہیں۔ سندر داس کا بھی پورا ریکارڈ، مع کوڈز وغیرہ کے سب ان کے پاس محفوظ ہوگا۔''

''تم کیا سمجھتے ہو شہزی... ! ہم اتنے بے وقوف ہیں کہ ہم نے ان ساری باتوں پہ غور نہیں کیا ہوگا؟'' عبید میری طرف دیکھ کر اسرار بھرے انداز میں مسکرایا۔

میں اس کا چہرہ تکتا رہا۔ وہ اس بار وضاحت آمیز اور صراحت سے اپنے پلان کی تفصیل بتانے لگا۔

''سنو شہزی! جب ہم نے ان ساری باتوں پہ غور کیا تو ہمیں بھی یہ ناممکن سا لگا تھا، لیکن اس میں سارا کھیل چونکہ ٹائمنگ کا ہے اس لیے یہ منصوبہ ہمارے لیے قابلِ غور ہے۔''

''ٹائمنگ سے تمہاری کیا مراد ہے؟'' میں نے اس کی بات پر غور کرنے کے انداز میں کہا تو وہ بولا۔

''ہمارا پلان اس پر زیادہ دیر متحرک نہیں رہ سکتا۔ یعنی یہ دنوں یا مہینوں پر محیط نہیں ہوسکتا، یہ صرف چند منٹوں کا کھیل ہوگا۔''

''چند منٹوں کا کھیل؟'' میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

''ہاں''۔ اس نے اثبات میں اپنے سر کو جنبش دی۔ ''ایک مقررہ اور مختصر وقت تک اس منصوبے پر عمل پیرا رہتے ہوئے دشمن پر ایسی کاری ضرب پڑے گی کہ وہ ایک طویل عرصہ تک اپنے زخم چاٹتا رہے گا۔''

''تو پھر یہ کارنامہ تم یا تمہارا کوئی ساتھی بھی بہ خوبی انجام دے سکتا ہے۔ اس کے لیے تم لوگوں نے میرا ہی کیوں انتخاب کیا؟'' میرے اس روایتی سوال پر وہ بولا۔

''مجھے پتا تھا تم یہ سوال ضرور کرو گے، شاید ثریا نے تمہیں اس سلسلے میں زیادہ معلومات نہیں دی کہ... اسپیکٹرم کی اصلیت سے واقف ہونے کے بعد اپنی جان پر کھیل کر اس نے خود سمیت، اسپیکٹرم کے جال میں پھنسنے کے بعد کتنے لوگوں کے ضمیر کو جگایا تھا، یہ محض گنتی کے تھے، یوں سمجھ لو آٹھ، دس، ان میں ثریا سمیت تو بہت سے مارے گئے، اب صرف میں اور میرے دو ساتھی کریم اور سجاد نامی ساتھی بچے ہیں، وہ دونوں وزیر جان کی اسپیشل کمانڈ کے زیرِ اثر ہر وقت اس کی نظروں کے سامنے رہتے ہیں، رہا میں تو، مجھے تم دیکھ ہی رہے ہو، میں خود اس وقت تنظیم کی ایک وفادار سوزی کے ساتھ، سندر داس کو پروٹوکول دینے کے لیے آیا ہوا ہوں۔

''بات اگر تمہاری سمجھ میں آگئی ہے تو میں آخری بات کہہ ڈالوں، کیونکہ اب وقت کم بچا ہے، اور ہمیں بلکہ تمہیں بہت سا کام نمٹانا ہے۔ اگر دل نہیں مان رہا تمہارا تو تم واپس جاسکتے ہو۔''

''آخری بات بھی کہہ ڈالو، میں سب سمجھ رہا ہوں۔'' میں نے سنجیدگی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں آگے بڑھنے کے لیے ہی قدم اٹھاتا ہوں، پیچھے نہیں۔''

''گڈ'' وہ توصیفی لہجے میں بولا۔ ''دیکھو، سندر داس کو ائرپورٹ ریسیو کرنے کے لیے میں اور سوزی جائیں گے، یہاں اسی ہوٹل میں کمرا نمبر اکیاون میں اسے کچھ دیر رکنا ہے، اس کے بعد ایک گاڑی ہمیں لینے کے لیے آئے گی۔

''اس میں ہمارے ساتھی یعنی تنظیمی وفادار ہوں گے، وہ ہمیں سندر داس سمیت ساہیوال لے جائیں گے۔ یہ سارے معاملات چک نواں میں واقع اسپیکٹرم کے فلاحی آفس اسٹیشن نور میں طے پائیں گے۔

''معاہدے کی اس بلیک کوبرا فائل پر سندر داس سمیت، وزیر جان اور چوہدری ممتاز خان کے دستخط ہوں گے۔ اس کے بعد وزیر جان سندر داس کو اپنی ذاتی گاڑی میں اپنی رہائش گاہ ''کینال لاج'' لے جائے گا، سندر داس وہیں رہے گا، جب تک وزیر جان اسے کھلاں والی میں زیرِ تعمیر ایک نئے ''زیرو ہاؤس'' میں منتقل نہیں کر دیتا۔''

''کھلاں والی۔'' میں اس نام پر بری طرح چونکا تو عبید کو بھی میرے اس طرح بدکنے پر حیرت ہوئی، وہ اسی لہجے میں بولا۔

''کیا ہوا؟ تم کھلاں والی کے ذکر پر اتنا چونک کیوں گئے ایک دم؟''

میں اگر اسے زبیر خان عرف خان جی کے بارے میں بتاتا تو بات لمبی ہو جاتی اسی لیے اس سے سرِ دست پہلوتہی کرتے ہوئے بولا۔

''کوئی خاص بات نہیں، یہ نام ذرا سنا ہوا لگا تھا، تم آگے کہو۔''

''معاہدے کی اس فائل کو ''بلیک کوبرا'' کا نام دیا گیا ہے۔ جس میں اسپیکٹرم سمیت بلیو تلسی کا گٹھ جوڑ، اور وزیر جان اور ممتاز خان کا سارا کچا چٹھا درج ہے۔ اگر ہمارا یہ منصوبہ کامیاب ہو جاتا ہے تو یوں سمجھو ان دونوں نے اپنی موت کے پروانے پر دستخط کیے ہیں، بہ صورتِ دیگر یہ بلیک کوبرا معاہدہ... اسپیکٹرم اور بلیو تلسی کو ایک نئی زندگی دے

ڈالے گا۔ جو ظاہر ہے ہمارے ملک کے لیے خیر کا باعث نہیں بن سکتا۔ لہٰذا تمہیں سندرداس کی جگہ لینا ہوگی اور فائل پر دستخط ہوتے ہی تمہیں، سجاد اور کریم فرار کروادیں گے۔ تم وہ فائل لے کر نکل جانا اور اسے پادر والوں کے سپرد کردینا۔ یہ منصوبہ اسپیکٹرم کی لوکل کمانڈ کو نیست و نابود کر کے رکھ دے گا۔ ڈن۔''

''ڈن!'' میں نے بھی مستحکم لہجے میں کہا پھر سوچتے ہوئے بولا۔ ''مگر سندرداس کو یہاں سوزی کے ہوتے ہوئے ٹھکانے لگانا اور اس کی جگہ لینا، کیا اتنا ہی آسان ہوگا؟''

''تم نے ہامی بھرلی، شہزاد صاحب! بس یہی کافی ہے۔ باقی کا کام میں سرانجام دے ڈالوں گا۔''

''لیکن سندرداس کی شکل و صورت جیسا میک اپ اور یقینی طور پر اس کے بائیوڈیٹا کا مفصل ریکارڈ، یہ سب اس قلیل مدت میں کرنا کیسے ممکن ہوگا؟''

''فون پر تم سے بات اور ہامی بھرتے ہی میں اور سجاد اس کا پہلے ہی سے بندوبست کر چکے ہیں۔ اس طرح ہماری جانیں بھی داؤ پہ لگی ہوئی ہیں۔ اب ہماری زندگی کا دارومدار اس منصوبے کی کامیابی پر منحصر ہے۔ سندرداس کا بائیوڈیٹا کریم اور سجاد نے گول کر کے دوسرا بناڈالا ہے، حتیٰ کہ سندرداس کی تصویر بھی تبدیل کردی گئی ہے، اور اس کی جو تصویر سجاد اور کریم نے وزیر جان اور ممتاز خان کو دکھائی ہے وہ اصل سندرداس کی نہیں ہوگی بلکہ یہ وہ ہوگی جو میں تمہارا ریڈی میڈ میک اپ کرنے کے بعد ظاہر کروں گا۔''

یہ کہہ کر اس نے اپنی جیب سے وہ تصویر نکال کر مجھے دکھائی۔ میں نے بھویں سکیڑ کر اس تصویر کو غور سے دیکھا۔ تو دیکھتے ہی سمجھ گیا کہ یہ جس شخص کی تصویر تھی وہ عام سی اور میک اپ کی رُو سے بہت آسان سی تصویر تھی، یعنی اس شخص کا میک اپ بہ آسانی میرے چہرے پہ کیا جاسکتا تھا۔ یہی تصویر وزیر جان اور ممتاز خان کو دکھائی گئی تھی۔ جبکہ بائیوڈیٹا تبدیل کرنے کی یوں بھی کوئی ضرورت نہ تھی۔

اس کے علاوہ عبید نے احتیاط کے پیش نظر سندرداس کے اصل چہرے کی بھی تصویر مجھے دکھادی، جو کہ ظاہر ہے اسے اسی کے ساتھی کریم یا سجاد نے اسے دی ہوگی، جو انہیں را کی طرف سے برقی رابطے کے ذریعے ہی موصول ہوئی ہوگی، تاکہ یہ لوگ (اسپیکٹرم) ان کے ساتھی کو پہچان لیں، جبکہ منصوبے کے مطابق اصل تصویر کو وزیر جان وغیرہ سے چھپایا ہی گیا ہوگا۔ بہرحال میں نے اصل سندرداس کی تصویر بھی دیکھ کر اسے اچھی طرح ذہن نشین کرلیا۔

مگر پھر یکایک میرے ذہن میں ایک خیال ابھرا اور میں نے اس سے پوچھا۔

''تم نے جو نقلی سندرداس کی تصویر انہیں دکھائی ہے، اسے سوزی نے بھی تو دیکھا ہوگا، جبکہ وہ تمہارے ساتھ ائرپورٹ پر اصل سندرداس کو ریسیو کرنے جارہی ہے، وہ اس بدلی ہوئی صورت والے اصل سندرداس کو دیکھ کر...''

''میں سرے سے ایسا ہونے ہی نہیں دوں گا۔'' وہ میری بات کا مطلب سمجھ کر درمیان میں بولا۔ ''اول تو میری یہی کوشش ہوگی کہ صرف میں ہی سندرداس کو لے کر ہوٹل پہنچوں اور سوزی کو روم نمبر اکیاون میں ہی ٹکے رہنے کا مشورہ دوں گا، اس کے بعد اپنے شکار کو میں روم نمبر اکیس میں لاکر اناشغفیل کرنے کے بعد تمہیں بلالوں گا اور پھر تم سندرداس بن کر ہمارے ساتھ اسٹیشن فور کی طرف روانہ ہوجاؤ گے۔''

''سوچ لو دوست! اگر سوزی نے بھی تمہارے ساتھ لاؤنج تک جانے کا ارادہ کرلیا تو پھر کیا کرو گے؟ کیونکہ وہ آخر کار اپنے ''بڑوں'' کی ہی ہدایت پر عمل کرے گی، تم پر ہرگز نہیں۔'' میں نے خدشہ ظاہر کرتے ہوئے اس کی طرف دیکھ کر کہا تو وہ بولا۔

''اس کا حل بھی میں نے سوچ رکھا ہے۔ یہ بات میرے ذہن میں بھی ہے کہ سوزی انکار کرسکتی ہے، جبکہ میرے ساتھ جانے میں وہ اصل سندرداس کو دیکھ کر چونک جائے گی۔ تب میں اسے ائرپورٹ پر ہی کسی طرح ڈاج یا جُل دینے کی کوشش کروں گا، بلکہ ممکن ہوا تو میں اسے بہانے سے وہیں کہیں پبلک ٹوائلٹ میں ٹھکانے لگادوں گا۔''

''پھر اپنے بڑوں کو کیا جواب دو گے سوزی کے بارے میں۔''

''آسان سی بات ہے، کہہ دوں گا میں کہ نامعلوم دشمنوں نے ہم پر حملہ کرڈالا تھا اور میں بڑی مشکل سے تمہیں، یعنی سندرداس کو لے کر پہنچا ہوں۔'' وہ بولا۔

یہاں مجھے اس کے منصوبے میں کئی سقم محسوس ہوئے تھے، جو بہ ظاہر تیر بہ ہدف بھی نظر آتے تھے، لیکن ذرا غور کرنے پر ہی مجھے اس امر کا بھی اندازہ ہو چلا کہ اس کے سوا اور کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ منصوبہ جہاں سو فیصدی کامیابی کا ضامن نظر آتا تھا وہیں، خطرناک بھی محسوس ہوتا تھا۔

لہٰذا اب مجھے ادراک ہونے لگا کہ یہ منصوبہ کس وجہ سے اتنا قلیل اور مختصر مدت میں انجام دینے کا متقاضی تھا؟ ظاہر ہے اسے طول نہیں دیا جاسکتا تھا۔ اس میں بھانڈا پھوٹنے

.... کا سو فیصد خطرہ تھا۔ اس کی بات پر مجھے بالآخر بتانا پڑا۔

'' اگر منصوبے کو جلد اور زیادہ آسانی سے نمٹانا چاہو تو میں تمہارے ساتھ ہوں بلکہ میرے دو ساتھی بھی ہوٹل کے باہر موجود ہیں۔''

میری بات پر وہ چونکا اور جانے کیوں اس کی پیشانی پر شکنیں سی نمودار ہوئیں پھر وہ اسی انداز میں بولا۔

'' ہرگز نہیں۔ ہمارے منصوبے میں مزید کسی اور کی بالکل بھی گنجائش نہیں ہے، رہے تم تو تم ہمارے ساتھ ہو ہی۔ لیکن فی الحال تم بھی نہیں۔ میں سیل پر تم سے رابطے میں رہوں گا۔ یہ بتاؤ، تم نے یہاں کمرا لے رکھا ہے؟''

'' ظاہر ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر میرے زیادہ دیر یہاں رہنے کا کیا جواز باقی رہ جاتا۔''

'' گڈ! اب تم ذرا تیار ہو جاؤ میں تمہارا سندر داس جیسا میک اپ کیے دیتا ہوں، باقی کپڑوں کا بندوبست تو اسے ٹھکانے لگانے کے بعد ہو ہی جائے گا۔''

اس نے آخر میں کہا اور میں نے دھیرے سے اپنے سر کو اثباتی جنبش دے ڈالی۔

وہ اپنے کام میں خاصا ماہر ثابت ہوا بلکہ مجھ سے بھی دو ہاتھ آگے محسوس ہوا تھا، میں اگر ایسا میک اپ کرتا تو مجھے کم از کم آدھے سے پونا گھنٹا تو لگ ہی جاتا۔ حالانکہ سندر داس جیسی صورت اختیار کر کے میک اپ کرنا کوئی مشکل بات نہ تھی۔

اس نے یہ کام بہ مشکل پندرہ، بیس منٹ میں نمٹا دیا۔ اس کے بعد میں واپس اپنے کمرے میں آ گیا۔

اس منصوبے کا کلی طور پر انحصار مجھ پر تھا اسی لیے میں اس میں ترمیم کرنے کا حق رکھتا تھا۔ میں اسی پر ہی غور کر رہا تھا لیکن سب سے پہلے مجھے اول خیر سے رابطہ کرنا تھا، ورنہ رابطے میں دیر ہونے کی صورت میں وہ مجھے کسی خطرے میں پھنسا سمجھ کر اندر گھسا چلا آتا۔

اول خیر کو میں نے ابھی صرف عبید کے ساتھ ہونے والی ''تسلی بخش'' ملاقات کے بارے میں ہی بتایا تھا، اور اپنی تسلی کروا کے رابطہ منقطع کر دیا۔

اس میں کوئی شک نہ تھا کہ منصوبے کی کامیابی کی صورت میں وزیر جان اور ممتاز خان پاور والوں کی گرفت میں آ جاتے اور پھر قید خانہ ہمیشہ کا ان دونوں کا مقدر ہوتا۔ جبکہ اسپیکٹرم کی لوکل کمانڈ کا بھی قلع قمع ہو جاتا۔ پھر کیا ہوتا؟ کیا لولووش اس زخم کو بھلا پاتا؟ جبکہ اس صورت میں عابدہ کی زندگی داؤ پہ لگی ہوئی تھی۔ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ لولووش، سی آئی اے کے باسکل ہولارڈ کا چہیتا داماد تھا۔ جس کی ٹائیگر فینگ فورس کے ایجنٹ پاکستان میں میری گرفتاری کے لیے عنقریب ایک خفیہ آپریشن کرنے کے لیے پر تول رہے تھے۔ تو کیا میں عابدہ کی خاطر اپنے وطن کو ملک دشمن عناصر کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتا؟ کیا میرا قومی آدرش اور ملی حمیت اس بات کی اجازت دیتی تھی کہ میں اپنے وطن پر اپنی محبت کو ترجیح دیتا؟ جبکہ مجھ پر تو سرحد کے ایک گمنام اور بہادر سپاہی کا بیٹا ہونے کی حیثیت کا بھی اطلاق ہوتا تھا۔

'' کاتبِ تقدیر نے آخر یہ سارے امتحان میرے اور عابدہ کے نصیب میں ہی کیوں لکھے تھے؟'' میں نے کڑھتے دل کے ساتھ سوچا۔

پہلے عابدہ مجھ سے دور ہوئی اور اتنی دور ہوئی کہ سات سمندر پار چلی گئی۔ پھر جدائی کی اس طول پڑتی عذاب ناک گھڑیوں میں وہاں اس کے ساتھ کیا ہوا؟ ایک نیک مقصد اور کارِ خیر ادا کرنے کی اسے اتنی بڑی اور بھیانک سزا سے دوچار ہونا پڑا کہ ایک معصوم اور بے گناہ لڑکی کو ''عالمی دہشت گردوں'' اور امریکی دشمنوں کا آلۂ کار قرار دے دیا گیا۔ اب اسے امریکا کی خطرناک جیلوں میں سے ایک میں بھیجنے کا ناپاک ارادہ کیے ہوئے تھے۔ کاش! میں عابدہ کو امریکا بھیجتا ہی نہیں تو آج اس کے ساتھ یہ سب نہ ہوا ہوتا۔

اچانک ہی میرے دل و دماغ پر مایوسی اور بددلی کا غلبہ سا طاری ہونے لگا۔ ایسے وقت میں مجھے اپنے غم خوار اور بے جگر... یار اول خیر کے ساتھ کی ضرورت محسوس ہونے لگی تھی کہ ایسے مایوسی کے لمحات میں ایک وہ ہی میری ہمت بڑھاتا تھا۔ مگر نہیں، وہ جب میرے قریب نہ بھی ہوتا تھا تو اس کی بے لوث باتیں اور نصیحتیں تو میرے ساتھ رہتی ہی تھیں۔ ایسے موقع پر وہ اپنی پوری زندگی کے تجربے کا نچوڑ، میری سوچ اور میرے حوصلے کے خشک پڑتے سوتوں پر نچھاور کر دیتا تھا۔ ایسے میں اسی کی ایک کہی ہوئی بات مجھے بے اختیار یاد آ گئی۔

'' او خیر، کاکے! تو بہت جلدی اپنا دل چھوٹا کر لیتا ہے، پر دیکھ، انسان فطری طور پر کمزور واقع ہوا ہے۔ زیادہ خوشی ملتی ہے تو وہ اسے ''خوشی کے آنسو'' کہہ کر اپنی اس فطری... کمزوری کو چھپانے کی کوشش کرتا ہے جبکہ دکھ کی گھڑی میں وہ اپنے آنسوؤں کے ذریعے اسے ''تقدیر کا لکھا'' کے الزام میں دھونے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن ایسا تب ہی ہوتا ہے جب وہ یہ سمجھنے لگتا ہے کہ وہ اپنی بقا کے لیے جو کچھ بھی

کررہا ہے، وہ صرف اور صرف اپنے بل بوتے اور اپنے زورِ بازو پر کررہا ہے۔ درحقیقت وہ اس طرح اللہ کی اس مدد کو بھولنے لگتا ہے جو حق کی جنگ میں ایک کمزور سے کمزور تر انسان کے ساتھ بھی درپردہ شامل رہتی ہے۔ ''بس! مایوس نہ ہونا'' یہ اس مولائے کریم کی شرط ہے۔''

اول خیر کے کہے ہوئے یہ جملے یاد آتے ہی ایکا ایکی مجھے اپنے اندر ایک حیرت انگیز سی تبدیلی کا احساس ہونے لگا۔ شاید یہ سچ تھا کہ میں ایسا سوچنے لگا تھا اور یہ بھول گیا تھا کہ ہمتِ مرداں، مددِ خدا، یہ خیال آتے ہی میں اپنے اندر ایک نئی طاقت اور نیا جوش اور ولولہ سرایت کرتا محسوس کرنے لگا۔ اور صدقِ دل کے ساتھ اللہ سے معافی بھی مانگی کہ میں کیوں بھول گیا تھا یہ کہ میں جس جنگ میں مصروف ہوں، وہ صرف میری ہی جنگ نہیں ہے، یہ ایک حق کی باطل کے خلاف جنگ ہے اور اللہ کی مدد تو اس میں لازماً شامل ہے ہی، تو پھر کیوں اس زعم میں مبتلا ہوگیا تھا کہ یہ سب کچھ میں اپنے زورِ بازو کے بل بوتے پر کررہا ہوں۔

میں نے سر جھٹک کر خیالات کی بڑھتی ہوئی کثافت کو ذہن دل سے نکال پھینکا اور عبید کا انتظار کرنے لگا۔

سندرداس جیسے تربیت یافتہ بلیو ٹکسی ایجنٹ کو قابو کرنا اور پھر اس سلسلے میں اسپیکٹرم ایجنٹ سوزی کو ڈاج دینا، یہ دونوں ایسے مختلف اور ''رسک فل'' کام تھے، جسے عبید تن تنہا انجام دینے کا ارادہ کیے ہوئے تھا۔ مجھے وہ ''اوور کانفیڈنس'' کا شکار محسوس ہوتا دکھائی دے رہا تھا، اسی لیے میں نے بھی اسے اپنے ساتھیوں اور اپنی مدد کی پیش کش بھی کرڈالی تھی۔ اگرچہ سچویشن کچھ ایسی ہی تھی جو سوزی اور سندرداس کے لیے طمانیت کا باعث بنتی تھی کہ عبید ان کا ہی ''ساتھی'' تھا اور عبید کے لیے ظاہر ہے کہ ''ساتھی'' بن کر یہ کام نمٹانا نسبتاً زیادہ آسان ہوتا، لیکن پھر بھی اسے اکیلے یہ کام سرانجام نہیں دینا چاہیے تھا۔

میں نے وقت گزاری کے لیے سوچا کہ کیوں نہ اب اول خیر سے بھی ٹرانسمیٹر کے ذریعے رابطہ کرکے ساری بات بتادی جائے، یہ سوچ کر ابھی میں اس سے رابطہ کرنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک میرے سیل پر عبید کی کال آگئی۔ اور پھر جب میں نے اس کی دوسری طرف سے ذرا بوکھلائی ہوئی آواز سنی تو میں خود بھی پریشان ہوگیا۔

''ایک گڑبڑ ہوگئی ہے۔''

''کیسی گڑبڑ''؟

''یہ کم بخت سوزی ڈاج میں نہیں آسکی ہے، زیادہ کوشش کی تو وہ میری طرف سے فوراً شک میں پڑ جائے گی اور کوئی بعید نہیں وہ مجھ پر بھی قابو پالے، کیونکہ وہ میرے مقابلے میں زیادہ تربیت یافتہ ہے، اور اس وقت مجھے خود بھی اسی کی کمانڈ میں دیا گیا ہے۔'' وہ بولا۔ میں نے فکرمندانہ انداز میں اپنے ہونٹ بھینچ لیے پھر ذرا ایک لمحہ کے توقف سے مستفسر ہوا۔

''ویسے سوزی کا تم کرنا کیا چاہتے ہو؟''

''میں اسے تھوڑی دیر کے لیے خود سے دور کرنا چاہتا ہوں۔ تاکہ اپنے منصوبے کو رازداری سے عملی جامہ پہنا سکوں، تم کوئی مدد کرسکو تو...''

''مجھے سوچنے دو۔'' میں نے کہا۔

''ذرا جلدی۔ وقت کم ہے۔ ورنہ یہ سارا زرخیز منصوبہ پل بھر میں مٹی ہوجائے گا۔'' وہ بولا۔ میرا ذہن تیزی سے کام کررہا تھا۔ پھر اس سے پوچھا۔

''تم ہو کہاں اس وقت؟''

''ائرپورٹ سے ہوٹل کی طرف آرہا ہوں، کمرا نمبر اکیاون میں آنا ہے ہمیں۔''

''ٹھیک ہے۔''

''تم کرنا کیا چاہتے ہو؟ مگر دیکھو... تم اس کے سامنے مت آنا، ہوسکتا ہے وہ تمہیں پہچان لے۔ میں خود اس وقت تمہیں ائرپورٹ کے لاؤنج کے پبلک ٹوائلٹ سے فون...''

اچانک دوسری طرف سے عبید کی کراہ آمیز گھٹی آواز ابھری، اور اگلے ہی لمحے رابطہ منقطع ہوگیا۔ میرے پورے وجود میں جیسے سرد لہر سی دوڑ گئی بلکہ پل کے پل میں نے اپنی پیشانی پر ٹھنڈے پسینے کی ننھی بوندیں بھی محسوس کی تھیں۔

صاف لگتا تھا کہ عبید پر بات کرتے ہوئے کسی نے حملہ کردیا تھا۔ شاید اس کا بھانڈا پھوٹ گیا تھا۔ جس کا مطلب تھا کہ یہ بنا بنایا زرخیز منصوبہ ناکام ہوچلا تھا، کیونکہ عین ممکن تھا کہ سوزی کو اس پر کسی بات کا شبہ ہوگیا ہو۔ اور وہ اس کی ریکی کرتے ہوئے اس تک پہنچ کر گفتگو کا کافی حصہ سن چکی ہو۔ ابھی یہ میرا صرف قیاس تھا۔

میں تیر کی طرح اپنے کمرے سے نکلا اور چکنے فرش والے کوریڈور پر اندھا دھند دوڑتا چلا گیا، ساتھ ہی اول خیر سے رابطہ کرکے ہانپتی آواز میں بولا۔

''اول خیر! تم دونوں جلدی سے ائرپورٹ کے لاؤنج تک پہنچو، میں بھی وہیں پہنچ رہا ہوں۔ جلدی۔'' میں نے فوراً رابطہ منقطع کردیا اور دوڑتا ہوا ہوٹل کی لابی سے سیدھا گیٹ

پر پہنچا۔ عملے کے اور دیگر لوگ مجھے اس طرح بے تحاشا دوڑتا پا کر چونکے مگر مجھے اب ان کی پروا نہیں تھی۔

ہوٹل کے گیٹ سے نکلتے ہی میں نے ائرپورٹ کا رخ کیا۔ اور اس طرف جانے والی سڑک پر آکر اپنی رفتار بڑھا دی۔ ڈبل پیس سوٹ کے ساتھ میں دوڑتا ہوا کسی گھاگ جاسوس کی طرح ہی نظر آتا تھا۔ جو فرار ہوتے ہوئے کسی خطرناک مجرم کا تعاقب کرتا ہے۔

چند منٹوں میں ہی ائرپورٹ کے گیٹ پر میں پہنچ چکا تھا، یہاں چیکنگ ہو رہی تھی۔ میرے پاس وقت ضائع کرنے کا کوئی چانس نہ تھا اسی لیے میں نے فوراً سے پیشتر ہی اپنی جیب سے اپنا اسپیشل سروس والا کارڈ نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا تھا اور سیکیورٹی اہلکاروں کو وہ دکھا کر میں اندر داخل ہو گیا۔ اول خیر اور شکیلہ مجھے ایک طرف کھڑے، منتظر دکھائی دیے تھے، میں نے انہیں ادھر ہی رکنے کا اشارہ کیا۔ اگرچہ میں انہیں بھی اپنے ''ریفرنس'' سے اندر لے جا سکتا تھا، مگر کچھ سوچ کر میں نے ایسا نہیں کیا۔

مجھے عبید کی جان بچانا تھی اور سوزی پر بروقت قابو پانا تھا۔ بہ صورت دیگر وہ اپنے لوگوں کو عبید کی ''غداری'' کے علاوہ... کسی منصوبے کی بھنک کی اطلاع بھی کر سکتی تھی بلکہ کوئی بعید نہ تھا کہ وہ عبید پر قابو پا کر یہ اطلاع دے بھی چکی ہو، اس صورت میں سارا منصوبہ ہی فیل ہو جاتا۔

اندر ارایول لاؤنج میں آتے ہی میں نے خود کو نارمل رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے، عقابی نظروں سے گرد و پیش کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ اور آنے والے ایک ایک مسافر کا چہرہ دیکھنے لگا۔

مجھے زیادہ تر...... سندر داس اور اس کے ساتھ موجود سوزی نامی لڑکی ..... کی ایک ساتھ نظر آنے کی امید تھی، اگر عبید، سوزی کے ہتھے چڑھ گیا تھا تو سوزی نے بھلا اس بے چارے کو کہاں زندہ چھوڑا ہوگا۔ جلد ہی مجھے ایک نہیں بلکہ دو مطلوبہ چہرے دکھائی دے گئے اور میں بری طرح ٹھٹک گیا، خوشی اور طمانیت کی ایک لہر سی میرے وجود میں دوڑ گئی، ان میں ایک تو سندر داس تھا (جس کی اصل تصویر عبید مجھے کسی احتیاط کے پیش نظر ہوٹل میں ہی دکھا چکا تھا) جبکہ دوسرا چہرہ عبید کا تھا۔

عبید کو دیکھ کر بے اختیار میرے حلق سے ایک گہری سانس خارج ہو گئی۔ مجھے حیرت بھی ہوئی کہ میں تو یہ توقع کیے بیٹھا تھا کہ سوزی نے اس پر قابو پا لیا ہوگا، یا بے بس کر دیا ہوگا، لیکن ہو سکتا ہے کہ خوش قسمتی سے وہ سوزی کے قابو میں آنے کے بجائے، وہ اس کے نرغے میں آ گئی ہو۔ اگر ایسا تھا تو بلاشبہ عبید نے بڑی ہمت اور جواں مردی سے کام لیا تھا، یہی تو وہ حوصلہ ہوتا ہے جو خود سے زیادہ طاقت ور دشمن پر حاوی کرتا ہے، لیکن مجھے تو فون کر کے عبید کو آگاہ کرنا چاہیے تھا، کیونکہ جب متوقع طور پر مجھ سے بات کرتے ہوئے سوزی نے ہی اس پر حملہ کیا تھا تو عبید کی فون پر مجھ سے بات ادھوری رہ گئی تھی۔

لیکن میں اب عبید کو زندہ دیکھ کر خوش تھا کہ منصوبہ اپنی جگہ جوں کا توں تھا لیکن پھر بھی عبید ہی مجھے کچھ بتا سکتا تھا۔

میں ان کے پیچھے ہو لیا اور ہوٹل تک جا پہنچا۔ راستے میں اول خیر کو بھی.... دوبارہ اسی پوزیشن میں کھڑے رہنے کی ہدایت کر دی تھی، وہ بھی اس گھن چکر پر کچھ الجھ سا گیا تھا۔

ہوٹل آتے ہی میں نے سیدھا اپنے روم کا رخ کیا اور عبید کے آنے کا بے چینی سے انتظار کرنے لگا۔ اس کو سندر داس کو ٹھکانے لگا کر ہی آنا تھا۔ لہٰذا میں یہ دعا مانگنے لگا کہ سندر داس کے سلسلے میں کوئی گڑبڑ نہ ہو جائے۔

تھوڑی دیر گزری تھی کہ میرے کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی۔ میرا دل یکبارگی زور سے دھڑکا اور تیزی سے میں نے دروازے کا رخ کیا۔

''کون؟'' میں نے دروازے سے لگ کر ہولے سے پوچھا۔

''میں ہوں عبید، جلدی کھولو دروازہ۔'' دوسری جانب سے عبید کی آواز ابھری اور میں نے فوراً دروازہ کھول دیا۔ وہ اکیلا تھا۔ وہ تھکا تھکا ہانپتا سا ایک قریب رکھی کرسی پر گرنے کے انداز میں بیٹھ گیا اور بڑبڑایا۔

''اف! آج تو میں بھی جان سے گیا تھا اور منصوبہ بھی سارا خاک میں ملنے والا تھا شکر ہے۔ سب ٹھیک رہا۔''

میں تب تک دروازہ بند کر کے اس کی جانب پلٹا تو وہ میری طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ اس کا چہرہ تھکا تھکا سا تھا مگر وہاں کامیابی کا جوش بھی ایک دبی دبی سرخی کی صورت میں نظر آتا تھا۔

''جب تم سے فون پر میری بات ادھوری رہ گئی تھی تو میں یہی سمجھا تھا کہ تم سوزی کے نرغے میں آ چکے ہو، کیونکہ فون پر بات کرتے ہوئے میں نے تمہاری کراہ کی آواز سنی تھی۔'' میں نے کہا تو وہ بولا۔

''ہاں! اس کم بخت کو مجھ پر شبہ ہو گیا تھا'' وہ بولا۔ ''یہ اسپیکٹرم کے ایجنٹ بہت زیرک اور گھاگ ہوتے ہیں، ذرا

ذرا سی بات پر کھٹک جاتے ہیں، خیر، میں نے سوزی کو وہیں پبلک ٹوائلٹ میں ہی ٹھکانے لگا دیا ہے۔ تھوڑی گڑبڑ تو ہو گئی ہے، اس کے لیے مجھے چیف (وزیر جان) کو مطمئن کرنا پڑے گا، وہ میں کرلوں گا۔ اب سندرداس کو بھی اسی کمرے میں...''

''کیا تم نے اسے بھی ہلاک کر دیا ہے؟'' میں نے کسی خیال کے تحت جلدی سے پوچھا۔

''نہیں، فی الحال تو میں نے دھوکے سے اسے بے ہوش کر دیا ہے، اب اسے بہ آسانی جہنم واصل کیا جاسکتا ہے۔''

''نہیں، اسے ابھی زندہ رہنے دو۔''

''کیا؟ تم پاگل تو نہیں ہو گئے ہو؟'' وہ جیسے یکدم مجھے گھور کے بولا۔ وہ میری حیثیت نہیں جانتا تھا اسی لیے بے اختیار اس کے منہ سے یہ نکلا تھا۔ جبکہ میں سندرداس کو پاور والوں (میجر ریاض باجوہ) کے حوالے کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔

''میں اسے خفیہ فورسز والوں کے حوالے کرنا چاہتا ہوں۔ یہ بہرحال دشمن ملک کا جاسوس ہے اور وطن دشمن کارروائیوں کے لیے یہاں آیا تھا، اس کے منہ سے بہت کچھ اگلوایا جاسکتا ہے۔''

''ہمارے پاس اس سارے کھڑاگ میں پڑنے کا وقت نہیں ہے۔ وہ لوگ ہمیں لینے کے لیے یہاں ہوٹل پہنچنے والے ہیں۔'' وہ بولا۔

''کسی کھڑاگ کی ضرورت نہیں ہو گی۔'' میں نے اطمینان سے کہا۔ ''باہر موجود میرے ساتھی یہ کام بہ خوبی سر انجام دے سکتے ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے میں اس سے پوچھا۔

''تم نے اب تک کی کیا رپورٹ دی انہیں؟''

''یہی کہ نامعلوم دشمنوں نے حملہ کر دیا تھا، جس کے نتیجے میں سوزی ہلاک ہو گئی اور میں سندرداس کو بچا کے ہوٹل تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا ہوں، لیکن یہاں بھی مجھے خطرہ ہے۔ اسی لیے میں نے دانستہ ان سے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ میں اور سندرداس خود ہی آجائیں، لیکن انہوں نے منع کرتے ہوئے یہ حکم صادر کر دیا ہے کہ وہ خود ہمیں لینے کے لیے یہاں پہنچنے والے ہیں۔''

''تم کیا سمجھتے ہو کہ اس گڑبڑ کے بعد ان لوگوں کو تم پر کسی قسم کا شبہ تو نہیں ہو گیا؟'' میں نے کسی خیال کے تحت پوچھا تو وہ اعتماد سے... بولا... ''نہیں، ہم نے ویسے بھی اپنے منصوبے میں شبہے کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑی ہے۔ رہی بات موجودہ گڑبڑ کی تو یہ وہ لوگ بھی جانتے ہیں کہ خفیہ فورسز کے ادارے ان کے پیچھے لگے ہوئے ہیں، ممکن ہے یہ انہی کی حرکت ہو۔''

باقی کے کام ہم نے ترنت نمٹائے، بے ہوش سندرداس کو انتہائی رازداری کے ساتھ کمرے کی کھڑکی سے اول خیر اور شکیلہ کے حوالے کر دیا گیا۔ اس کو رسن بستہ کر دیا گیا تھا، تاکہ ہوش میں آنے کے بعد کوئی مسئلہ نہ پیدا ہو۔

بے ہوش اور رسن بستہ سندرداس کو اول خیر اور شکیلہ کے حوالے کرتے وقت میں نے انہیں مختصر ترین الفاظ میں ایک ''ڈکٹیشن'' بھی دے ڈالی تھی۔ میں چونکہ اس منصوبے کی مدد سے اسپیکٹرم کی لوکل کمانڈ کے تابوت میں آخری ٹھونکنے کا پختہ ارادہ کر چکا تھا، اسی لیے میں چاہتا تھا کہ کسی بھی صورت میں ہونے والی متوقع گڑبڑ میں ''پاور'' والوں کی مدد بھی میرے ساتھ شامل ہو۔

اگرچہ اس سے پہلے انہیں اس مشن میں شامل نہ کرنے کا میرا ایک مقصد تھا، جس کی تکمیل کے لیے... میں اب تک درحقیقت میجر باجوہ صاحب کے مشوروں پر ہی عمل کر رہا تھا، کیونکہ بہ قول ان کے پاور والوں کا ابھی براہ راست اسپیکٹرم پر ہاتھ ڈالنا مناسب نہیں تھا، اس کے لیے پہلے کسی گوریلا کارروائی کے ذریعے ان کے خلاف کوئی ٹھوس ثبوت حاصل کر لیا جاتا۔ اس کے بعد پاور سیکریٹ سروس اپنا ایکشن پلان ترتیب دیتے۔ پاور سیکریٹ سروس جیسا ادارہ ہو خواہ انٹرسروسز یا آئی ایس آئی، ان کا ایک اپنا طریقہ کار ہوتا ہے، وہ خاموشی سے پہلے اپنے ''گوریلوں'' کے ذریعے ٹھوس ثبوت وشواہد اکٹھے کرتے ہیں اس کے بعد ہی ایکشن لیتے ہیں، بہ صورت دیگر ایسے اداروں کو بعض شرپسند عناصر بدنام کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

''اسپیکٹرم'' کے سلسلے میں بھی یہی قباحتیں تھیں، اس نے خود کو ایک بین الاقوامی فلاحی ادارے کی حیثیت سے ظاہر کر رکھا تھا۔ اور ملکی سطح پر کچھ کارنامے بھی انجام دیے تھے، جس کی بنا پر انہیں (اسپیکٹرم کو) بعض سیاسی اور عوامی حلقوں میں خاطر خواہ پذیرائی بھی ملی تھی۔

لیکن اب صورتِ حال اور تھی۔ عبید کے منصوبے کے مطابق اس بار کی کارروائی اسپیکٹرم کی لوکل کمانڈ کا شیرازہ بکھیر کے رکھ دیتی، بلکہ عالمی سطح پر بھی اسے ایک بدنام زمانہ مجرم تنظیم کے طور پر... ڈیکلیئر کیا جاسکتا تھا۔ لیکن یہ اسی صورت ممکن تھا جب ان کے خلاف ٹھوس ثبوت ہاتھ

آجاتے، اور اب اس کے حصول کا یہ سنہری موقع تھا۔ اسی لیے میں یہ موقع ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا اور نہ ہی صرف اپنے بل بوتے پر اس اہم مشن کو پورا کرنے کا رسک لے سکتا تھا۔ چنانچہ اس بارے میں، میں نے اول خیرا اور شکیلہ کو اچھی طرح بریف کر دیا تھا کہ وہ دونوں بلیوتلسی کے ایجنٹ سندرداس کو میجر ریاض باجوہ صاحب کے حوالے کرتے وقت انہیں ساری صورتِ حالات بتا دیں۔ تاکہ وہ کسی بھی وقت گڑبڑ کی صورت میں اسٹیشن فور پر اپنی خفیہ فورس ''پاور'' سمیت کامیاب چڑھائی کر سکیں۔ عبید کو میں نے اعتماد میں لے لیا تھا۔ اور اس نے میری اس حکمتِ عملی پر اطمینان کا بھی اظہار کیا تھا۔

اس کے بعد ہم موجودہ منصوبے کی لائن آف ایکشن ترتیب دینے میں مصروف ہو گئے۔

بہ قول عبید کے، میرے لیے صرف سندرداس کا بھیس بھرنا ہی کافی نہ تھا، اس سے متعلق دیگر اہم نوعیت کی باتوں اور معاملات سے میرا ''اَپ ڈیٹ'' ہونا لازمی تھا، جو اس کی جامہ تلاشی لینے کے بعد ہمیں سوچنا تھا۔

سندرداس کے پاس ایک بریف کیس تھا۔ اس کے اندر کچھ ضروری کاغذات تھے، انہی میں ایک فائل ہمیں نظر آئی تھی جس کا رنگ سیاہ تھا، جس پر بلیوتلسی کے ایجنٹ ہونے کی حیثیت سے سندرداس اور اس کے متعلقہ عہدے دار کے دستخط پہلے سے موجود تھے، یہ آرڈنری دستخط تھے، تاہم ثبوت کے لیے یہی کافی تھا جو اسپیکٹرم کے، را کے ایک ذیلی ونگ ''بلیوتلسی'' سے گٹھ جوڑ ظاہر کرتے تھے۔ مگر عبید نے فائل کا جائزہ لینے کے بعد مجھے بتایا کہ اسی طرح کی ایک فائل وزیر جان کے پاس بھی تھی۔ اور یہ دونوں فائلیں ''کمپائل'' ہونے کے بعد ہی ایک مکمل ''بلیک کوبرا'' فائل کہلاتی، اور اس میں جو حصہ ان کے پاس تھا، وزیر جان اور ممتاز خان دستخط ہونا تھے۔ تاہم عبید نے حفظِ ماتقدم کے تحت مجھے سندرداس کے دستخط دکھا دیے تھے۔ ہوسکتا تھا کہ مجھے بھی وہاں دوبارہ دستخط کرنا پڑ جاتے۔ اتنا وقت تو نہیں تھا کہ میں وہاں سندرداس کے دستخط کی پریکٹس کرتا، تاہم ایک سادے سے کاغذ پر میں نے دو تین بار سندرداس کے دستخط کر کے کچھ ہاتھ ''صاف'' کرنے کی کوشش چاہی تھی۔ فرق ہوسکتا تھا مگر دیگر شواہد اس قدر مضبوط تھے کہ وزیر جان کا اس طرف دھیان کم ہی جاتا۔ یوں بھی فائل میں اصل دستخطوں کی اہمیت وزیر جان اور چوہدری ممتاز خان کی تھی۔

سندرداس کی جامہ تلاشی کے دوران میں اس کا سیل، والٹ اور دیگر ضروری اشیا ہم نے اپنے قبضے میں کر لی تھیں۔ اس کے علاوہ اور کوئی قابلِ ذکر شے برآمد نہ ہوئی تھی۔ تاہم اس کے پاس جو کچھ بھی تھا، اس سے جس قدر اپ ڈیٹ ہونا لازمی تھا میرا، وہ میں ہو چکا تھا۔ لیکن ایک خطرہ تھا کہ اگر سندرداس سے اس کے اپنے کسی باس یا ساتھی کا رابطہ ہوتا تو میں اسے کیا جواب دیتا؟ اور کیسے دیتا؟ میں نے جب اسی خطرے کا اظہار عبید سے کیا تو وہ ایک پھیکی سی مسکراہٹ سے بولا۔

''شہزی! اس لیے ہماری یہی کوشش ہونی چاہیے کہ یہ معاملہ جلد از جلد نمٹ جائے کیونکہ ---- لیٹ ہونے کی صورت میں سارا منصوبہ ہی خاک میں مل جائے گا اور ہماری جان کو بھی خطرہ لاحق ہوگا۔

چنانچہ ہماری کوشش یہ تھی کہ یہ معاملہ یا معاہدہ راتوں رات ہی نمٹ جائے۔

یہ سارے امور نمٹانے کے تھوڑی ہی دیر بعد اسپیکٹرم کے چار ایجنٹ ہمیں لینے کے لیے وہاں آن پہنچے۔

اب اصل خطرناک کام کی ابتدا ہونے لگی تھی۔ پیش آئندہ حالات غیر یقینی تھے۔ کچھ پتا نہیں تھا کہ آگے ہمارے ساتھ یا میرے ساتھ کیا ہونے والا تھا؟ تخت یا تختہ۔

بہت سے خطرات اندیشناک خیالات، وسوسہ بن کر دل و دماغ مین کلبلا رہے تھے۔

میں نے بغور اسپیکٹرم کے ان چاروں ایجنٹوں کی حرکت و سکنات سے جائزہ لینے کی سعی چاہی تھی، مجھے بہ ظاہر ان کی حرکات و سکنات میں کوئی ایسی بات محسوس نہیں ہوئی تھی جس سے پتا چلتا ہو کہ انہیں ہم پر کسی قسم کا کوئی شبہ ہوا ہو۔

روم اکیاون میں آ کر انہوں نے مجھ سے مسکرا کر خیر مقدی انداز میں ہاتھ ملایا۔ میں نے عبید کی ہدایت کے مطابق اپنے چہرے کو سنجیدہ اور رعب دار بنا رکھا تھا، تاہم اس میں ہلکی سی پریشانی اور تشویش کا ''تڑکا'' بھی لگا دیا تھا، تاکہ وہ سب حقیقی محسوس ہو، جو تھوڑی دیر قبل ائرپورٹ کے پبلک لاؤنج میں ہمارے ساتھ ہو چکا تھا، جس کے نتیجے میں سوزی کو جہنم واصل کرنا پڑا۔

ان چار ایجنٹوں میں دو تو مناسب قد و قامت کے تھے اور وہ مقامی ہی نظر آتے تھے، جبکہ ایک متناسب الاعضاء جسامت کی خاتون تھی، بادی النظر میں وہ مقامی ہی لگتی تھی لیکن میری عقابی نگاہوں نے اس کی آنکھوں کی پتلیوں اور جلد کی رنگت میں غیر مقامی پن کو تاڑ لیا تھا۔ جبکہ چوتھا دراز

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN

قامت تھا، اس نے اپنی اصلیت چھپانے کی ذرا بھی سعی نہیں کی تھی، وہ غیر ملکی ہی نظر آتا تھا۔ اسی نے ہی سب سے پہلے مجھ سے مخاطب ہو کر چند مخصوص کوڈ ورڈز کا تبادلہ کیا۔ جو ظاہر ہے عبید مجھے پہلے ہی بتا چکا تھا۔ اس کا لہجہ بھی غیر مقامی ہونے کی چغلی کھاتا تھا۔ وہ انگریزی میں ہی مخاطب تھا۔ مجھ سے بات کرتے ہوئے وہ خاصا بارعب اور تحکم مزاج نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جبکہ مجھے اس خطرناک ڈرامے میں رنگ بھرنے کے لیے اپنی حیثیت کے مطابق اس سے گفتگو کر کے یہ جتانا تھا کہ میں ان کا محکوم نہیں، بلکہ مستقبل میں ان کا چیف کی سطح کا "ہینڈلر ایجنٹ" ہوں۔ جسے اسپیکٹرم کی سپریم اتھارٹی کی حمایت حاصل ہونے والی تھی۔ لہٰذا میں بھی اپنے لہجے کو پُراعتماد اور بارعب بناتے ہوئے اس سے انگلش میں ہی بولا۔

"میں تو سمجھ رہا تھا کہ میرے سلسلے میں بڑی رازداری برتی گئی ہوگی، لیکن یہاں آ کر مجھے اندازہ ہو رہا ہے کہ کتنی رازداری سے کام لیا گیا ہے۔"

اس سے تخاطب ہوتے وقت میں نے اپنے لب و لہجے کا بھی خیال رکھا تھا کہ کہیں وہ میری اصلیت سے واقف نہ ہو جائے۔

بہرحال میری بات اور شکایت میں وزن تھا، اس پر مستزاد میرے بارعب لہجے اور طنز کا اس دراز قامت پر خاطر خواہ اثر بھی ہوا، لہٰذا اسے اس حقیقت کا بھی فوراً اندازہ ہو چلا تھا کہ میں خود بھی اپنی آئندہ کی (معاہدے کے بعد کی) حیثیت کا بہ خوبی ادراک رکھتا ہوں۔ یہی سبب تھا کہ اگلے ہی لمحے اس کے چہرے پہ خجالت کے آثار نمودار ہو گئے اور پھر وہ اسی لہجے میں بولا۔

"ہم نے پوری رازداری ہی برتی تھی لیکن بدقسمتی سے یہاں ہمارے کچھ مخالف گروپس بھی ہماری ٹوہ میں لگے رہتے ہیں۔ یقیناً یہ انہی میں سے ہی کسی کی حرکت ہو سکتی ہے۔ مگر ہمیشہ انہیں منہ کی ہی کھانی پڑتی ہے، جس کا ثبوت آپ کا ہمارے سامنے صحیح سلامت موجود ہونا ہے۔"

میں نے اب اس کی بات پر حوصلہ افزا انداز میں مسکرانا ضروری سمجھا۔

وہ ایک بڑی سی انٹر کولر گاڑی میں آئے تھے۔ تھوڑی دیر بعد ہم سب ساہیوال کی طرف گامزن ہو چکے تھے۔ وہ خاتون، جس پر مجھے غیر مقامی ہونے کا شبہ تھا، اپنے چیف (اسٹیشن چیف) وزیر جان کو مودبانہ انداز میں مطلع کر رہی تھی کہ ہم سب لاہور سے بخیریت ساہیوال کی جانب روانہ ہو چکے ہیں۔

اول خیر کو میری (عبید کے) اس منصوبے میں.... شمولیت پر تشویش لاحق تھی بلکہ اسے تو یہ سارا منصوبہ ہی ایک پل صراط پر چلنے کے مترادف لگ رہا تھا۔ یہ خونی بھیڑیوں کی کچھار میں گھس کر ان کے خوفناک جبڑوں سے شکار کھینچ کر لانے والی بات تھی۔

لیکن میں سمجھتا تھا، جس قدر اس میں خطرات تھے، اس کی کامیابی کی صورت میں اتنے ہی اس کے دور رس نتائج برآمد ہونے کے قوی امکانات بھی موجود تھے۔

ہمارا سفر خاموشی سے جاری تھا۔ وہ دراز قامت ڈرائیور کے ساتھ اگلی سیٹ پر براجمان تھا، میں اس خاتون کے ساتھ درمیانی سیٹ پر تھا، جبکہ ان کا چوتھا ساتھی عبید کے ہمراہ پچھلی سیٹ پر موجود تھا۔

انٹر کولر ایک طاقت ور انجن کی لگژری گاڑی تھی، یہی سبب تھا کہ خاصی تیز رفتاری کے باوصف، جھٹکوں کا بالکل بھی پتا نہیں چلتا تھا۔

ہلکی پھلکی گفتگو کے دوران میں یہ نان اسٹاپ سفر لگ بھگ تین گھنٹوں پر محیط رہا اور پھر منزل پر پہنچ کر ہم سب نیچے اتر آئے۔

فضا میں حبس کی کیفیت تھی۔ ہوا رکی ہوئی تھی۔ رات کا پچھلا پہر تھا۔ ہر سُو سناٹے کا راج تھا۔ میرے سامنے اسٹیشن فور کی وہی عمارت تھی جہاں میں اس سے پہلے بھی دو تین بار آ چکا تھا اور بڑی معرکہ آرائیاں ہوئی تھیں۔ اب مجھے کچھ ایسا ہی لگتا تھا جیسے اس بار میں اس کے تابوت میں آخری کیل ٹھونکنے والا ہوں۔

ہم سب اندر داخل ہوئے۔ بہ ظاہر میرا چہرہ پُرسکون اور پُراعتماد تھا۔ اگرچہ اندر میرے دل میں ایک دھکڑ پکڑ کی سی کیفیات طاری تھی، لیکن میں نے اپنی چال ڈھال اور شخصیت کو مستحکم بنائے رکھا۔

ایک ہال نما کمرے میں، جہاں خاصا قیمتی اور آرام دہ فرنیچر بچھا ہوا تھا۔ وہاں مجھے بٹھا دیا گیا۔ اس کے تھوڑی ہی دیر بعد کسی نے آ کر مجھے مطلع کیا کہ ابھی کچھ دیر میں "چیفس" (اسٹیشن چیف اور کیٹسا ایجنٹ) تشریف لانے والے تھے۔

میں محتاط ہو کر بیٹھ گیا اور اپنے دل کی دھڑکنوں کو معمول پر لانے کی کوشش میں مصروف ہو گیا۔

تھوڑی ہی دیر بعد مجھے اپنی کنپٹیوں پہ سنسناہٹ محسوس ہوئی، وجہ میرے ان دونوں ازلی دشمنوں کی اس ہال

کمرے میں آدھی۔

"ویلکم! ویلکم۔" سب سے پہلے وزیر جان مجھے دیکھتے ہی اپنے دونوں بازو... پھیلاتا ہوا، میری طرف بڑھا، اور میں بھی اپنے ہونٹوں پہ دوستانہ انداز کی مسکراہٹ سموئے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے بعد چوہدری ممتاز میرے ساتھ پُرتپاک انداز میں بغل گیر ہوا۔ اس مردود کو طوعاوکرہا ہی سہی، اپنے سینے سے لگاتے ہوئے، مجھے اپنے بڑے بھائی لئیق شاہ کے خون کی بو آتی محسوس ہوئی، یہ خونی میرے بھائی کا قاتل تھا اور اسے اپنے سینے سے لگاتے وقت میں نے بڑی مشکل سے خود پر قابو پائے رکھا تھا، ورنہ جی تو میرا یہی چاہا تھا کہ اس خونی کا گلا دبوچ لوں۔

ان دونوں کے علاوہ ان کے چار ساتھی بھی تھے جو بہ ظاہر تو غیر مسلح ہی نظر آرہے تھے لیکن میں جانتا تھا کہ انہوں نے اپنے چست لباس کے پیچھے جدید طرز کے ہتھیار چھپا رکھے ہوں گے۔ ان میں عبید بھی شامل تھا۔

اس کے بعد ہم آمنے سامنے دونوں صوفوں پر براجمان ہو گئے۔ کچھ کھانے پینے کا دور چلا، پینے کے لیے جو کچھ وہاں میرے سامنے سرو کیا گیا تھا اس میں وہسکی بھی تھی اور مشروب بھی۔ میٹھا چیوڑا، تس اور بھنے ہوئے تیتروں کے سالم پٹھور بھی دھرے تھے۔

شراب کو تو میں نے آج تک چھوا بھی نہیں تھا اور یہاں یہی مشکل آن پڑی تھی کہ اگر میں پینے سے انکار کرتا تو وہ دونوں گھاگ "چیفس" میرے بارے میں کھٹک سکتے تھے۔

بہت جبر و کراہ کے بعد میں نے بالآخر وہسکی کا پیگ تھام ہی لیا اور ان دونوں سے "چیئرز" کرنے کے بعد دل ہی دل میں اللہ سے معافی مانگتے ہوئے پیگ اپنے ہونٹوں سے لگا لیا، ایک ہلکی چسکی لی تو شراب کی تلخی نے میرے دماغ کی نسوں تک کو جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ اور جب اس کا آب ارغواں کا وہ گھونٹ میرے حلق سے اترنے لگا تو مجھے یوں لگا جیسے گلے سے لے کر سینے تک یہ تلخ گھونٹ مجھے چیرے ڈال رہا ہو۔ ایک جلن کا احساس ہوا تھا۔ مگر جلد ہی میں نے اپنی اس کیفیت پر قابو پا لیا۔

"ہم کرنل سی جی بھجوانی کے دل سے مشکور ہیں کہ انہوں نے ہمیں اس قابل سمجھا کہ ہماری لوکل کمانڈ کی سپورٹ کے لیے اپنا ایک اہم آدمی ہمیں سونپ دیا۔"

وزیر جان نے آب تلخ کا گھونٹ بھرتے ہوئے میری طرف دیکھ کر کہا۔

چونکہ عبید نے موقع کی مناسبت سے اس بارے میں مجھے اچھا خاصا بریف کر دیا تھا کہ مجھے کیسی اور کس نوعیت کی گفتگو کرنی ہے۔ نیز وزیر جان کے منہ سے کسی کرنل سی جی بھجوانی کا نام سن کر میں نے اندازہ قائم کیا کہ یہ سندرداس کا ہی کوئی چیف ٹائپ کا شخص ہوگا۔ اب مجھے یہ خدشہ لاحق تھا کہ کہیں وہ اسی وقت سی جی نامی اس شخص سے رابطہ نہ کر بیٹھے، یا خود اس کی کوئی کال نہ آجائے، اگرچہ عبید نے اس سلسلے میں پہلے ہی میری تشفی کر دی تھی کہ اسٹیشن فور کے کنٹرول اینڈ پاور روم میں اس کے دونوں ساتھیوں سجاد اور کریم کا ہی کنٹرول ہے، لہٰذا وہ ایسا کچھ ہونے نہیں دیں گے، یا اس طرح کی کوئی کال ہی ڈراپ کر دیں گے' یا انہیں کسی طرح مطمئن کر دیں گے وغیرہ، لیکن پھر بھی احتیاط کا تقاضا یہی تھا کہ باتیں مختصر کرتے ہوئے، میں ان دونوں پر یہی زور دوں کہ معاہدہ بلیک کوبرا کو جلد از جلد فائنل کر دیا جائے۔

لہٰذا وزیر جان کے بعد اس کے تقریباً ہم رتبہ چوہدری ممتاز خان نے بھی لقمہ دینا ضروری سمجھا اور مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔

"اس کے ساتھ ہم یہ امید بھی کرتے ہیں کہ ہمارا اور آپ کا یہ ساتھ بلیک کوبرا معاہدے کی صورت میں کافی عرصے تک رہے گا اور مددگار بھی ثابت ہوگا۔"

"کیوں نہیں بلکہ مجھے پورا وشواش ہے کہ اس معاہدے کے بعد تو بلیو تلسی اور اسپیکٹرم کا یہ مثالی اتحاد ثابت ہوگا۔ سی جی صاحب خود اس کا ایک شاندار جشن منانے کے لیے یہاں ہوں گے۔" میں نے بھی ان کا من پسند جواب دیا۔

"زبردست، پھر تو بگ باس لولوش کو بھی ہم یہاں مدعو کرنے کی کوشش کریں گے۔ وہ یقیناً اس جشن میں شرکت کے موقع کو نظر انداز نہیں کریں گے۔" وزیر جان بولا۔

لولوش کے ذکر پر میرا حلق بغیر پیے کڑوا ہونے لگا۔ یہی بدبخت اور ملعون تو میرا اصل شکار تھا۔ تاہم میں اس کے ذکر پہ کچھ چونکا ضرور تھا۔

جی تو میرا کر رہا تھا کہ میں باتوں باتوں میں ان سے اور بھی کچھ اگلوا لوں، لیکن اب اس کا موقع تھا نہ کوئی فائدہ، کیونکہ اس منصوبے کی کامیابی کے بعد یہ دونوں پاور والوں کی گرفت میں ہوں گے۔

وہ دو پیگ چڑھا چکے تھے، جبکہ میرا پہلا ہی نہیں ختم ہوا تھا۔ البتہ نصف ہو چکا تھا، اور اسی نے ہی میرا دماغ گھما کر

رکھ دیا تھا۔ کیونکہ پینا تو ایک طرف میں نے اس اُمِ خبیثہ کو ہاتھ تک نہیں لگایا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مجھے یہ ہال کمرا گھومتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ مگر معاملہ یہاں بہت حساس اور اہم تھا اسی لیے میں نے اپنے مچل پڑتے اعصاب پر قابو رکھا تھا۔

اسی دوران میں باتوں باتوں میں چالاکی سے میں ان دونوں جغادریوں کو اصل مقصد کی طرف لے آیا۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں یہ معاہدے کی فائل پر دستخط کرنے والے معاملے کو طول نہ دے ڈالیں اور میں اس وقت ذرا سی دیر کا بھی متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ عبید کی بھی مجھے سختی کے ساتھ یہی ہدایت تھی۔

بھانڈا کسی وقت بھی پھوٹ سکتا تھا۔ لہٰذا معاملے کی بات چھیڑتے ہی ان دونوں نے فوراً اس کی ہامی بھر لی۔ میں نے اسی وقت اپنا (سندر داس کا) بریف کیس کھول کر سامنے رکھ دیا اور بلیک کوبرا کی فائل سے متعلق کاغذات کے صفحات ان کے سامنے پھیلا دیے، تب تک وزیر جان .... وہاں موجود اپنے ایک ساتھی کو مخصوص اشارہ کر چکا تھا، جو ذرا سی دیر میں ایک سیاہ رنگ کی فائل ہاتھ میں اٹھائے اس کے رُوبرو پیش ہو چکا تھا۔

یہی اصل کوبرا فائل تھی۔ سامنے رکھی شیشے کی ٹاپ پر فائل کے دونوں حصوں کا یکجا کر دیا گیا۔ پہلے وزیر جان نے اس پر اپنے دستخط کیے اس کے بعد چوہدری ممتاز خان اپنے دستخط کرنے کے لیے فائل پر جھکا۔

دونوں مہا شیطانوں کو اس فائل پر دستخط کرتا دیکھ کر میرے دل و دماغ کی عجیب و غریب کیفیات ہو رہی تھیں۔ جی کر رہا تھا کہ اسی وقت میرے پر نکل آئیں اور میں یہاں سے اُڑ کر اپنے ٹھکانے جا پہنچوں اور پھر ان دونوں شیطانوں ... کے عبرت ناک انجام کا تماشا دیکھوں۔

مجھے یہ دونوں خبیث گویا اپنی موت کے پروانے پر دستخط کرتے محسوس ہو رہے تھے اور ظاہر ہے حقیقت بھی یہی تھی۔

اس فائل اور اس وقت کے لیے میں نے اپنی جان کی بازی لگا رکھی تھی۔ اس منصوبے کے پایۂ تکمیل تک پہنچنے پر میرے آئندہ کے کئی کامیاب منصوبوں کا انحصار تھا۔ میں اب تک بہت غور و فکر کے ساتھ بہت کچھ سوچ چکا تھا۔

ممتاز خان بھی بلیک کوبرا فائل پر دستخط کر کے سیدھا ہو گیا تو میں نے کسی جلد بازی کا مظاہرہ نہیں کیا اور بہ ظاہر بے پروا سا نظر آنے لگا، کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ فائل میرے ہی حوالے کی جائے گی، جبکہ ایک کاپی اس کی ان کے پاس موجود تھی۔ اس پر میرے دستخط ہونا تھے۔ وہ فائل میری جانب سرکا دی گئی تو میرے دل کی دھڑکنیں تیز سی ہونے لگیں۔ وجہ یہی تھی سندر داس کے دستخط کی مجھے کچھ زیادہ پریکٹس نہیں تھی، تاہم اپنی غیر معمولی زود فہمی اور سمجھداری کے بل بوتے پر میں نے اللہ کا نام لے کر پورے اعتماد کے ساتھ فائل اپنی جانب کھسکائی اور قلم سنبھالے فائل پر جھک گیا۔ ساتھ ہی لمحے بھر کو ان دونوں خبیثوں کی طرف بھی دیکھا۔ وزیر جان اپنے لیے ایک اور پیگ بنانے میں مصروف تھا جبکہ چوہدری ممتاز خان ٹرے میں رکھے بھنے ہوئے تیتروں میں سے ایک سالم پھٹور کو اٹھا کے بھبھوڑنے میں مصروف تھا۔

میں نے فائل پر سندر داس سے ملتے جلتے دستخط کر دیے اور پھر فائل دانستہ بند کر کے تھوڑا آگے کھسکا دی اور اپنی فائل خود سنبھالتے ہی میں نے ان کا دھیان بٹاتے ہوئے فوراً تہنیتی لہجے میں کہا۔

''بدھائی ہو آپ سب کو۔ آج سے ہم سب ایک ہو گئے، شانت ہو گئے۔''

''بدھائی، بدھائی۔'' وہ دونوں بھی بھونڈے انداز میں اپنے پیگ والے ہاتھ بلند کرتے ہوئے غرور کے نشے تلے کورس میں بولے لیکن دوسرے ہی لمحے جیسے وزیر جان نے ایک دھماکا کر دیا۔ وہ اپنا سیل فون نکال کر بولا۔

''میں ابھی اس خوشی کے موقع کی اطلاع چیف باس لولوش کو دیتا ہوں، وہ یہاں کی لوکل کمانڈ کے مستقبل کے لیے بہت فکرمند تھا۔ اب اسے بہت تسلی ہو جائے گی۔''

میں اپنی جگہ سن ہو کر رہ گیا اور غیر ارادی طور پر فائل پر میری گرفت مضبوط ہو گئی ـــ میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ میں اسی وقت یہاں سے بھاگ کھڑا ہوں، لیکن یہ بچوں کا کھیل نہ تھا کہ گیند چھین کر بھاگ نکلتا۔ میں اس وقت اسٹیشن نور کی عمارت کے اندرونی گوشے میں اور دا سپیکٹرم کے گھاگ کارندوں کے نرغے میں تھا۔

میں نے اس کی ہاں میں ہاں ملانا ضروری سمجھا اور ہنستے ہوئے بولا۔ ''شیور، شیور۔ وائے ناٹ۔ لولوش کو بتا دو کہ بلیو ٹلسی انہیں کبھی بھی مایوس نہیں کرے گی۔ ہاں! ہمارے سی جی صاحب کا بھی انہیں دھنے واد دے دینا۔''

وہ دونوں میری بات پر ہنستے ہوئے اپنا سر دھننے لگے۔ میرا پیگ نصف سے کم ہو گیا تھا، جو میں میز پر ہی رکھ چکا تھا اور دانستہ میں نے پلیٹ میں سے تھوڑا میٹھا چھوڑا اٹھا کر منہ میں رکھا۔

RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

''اونہہ، رابطہ نہیں ہو پا رہا۔ لگتا ہے چیف باس کہیں بزی ہیں۔ خیر بعد میں بات کریں گے۔''

معاً وزیر جان کی اس آواز نے میرے اندر دور تک خوشی کی لہریں دوڑا دیں، اچھا ہی ہوا تھا کہ لولوش سے اس کا رابطہ نہیں ہو پایا، ورنہ بات لمبی بھی ہو سکتی تھی اور خطرناک بھی۔

''مسٹر سندر داس! کیا تم اس طے معاہدے کی خوش خبری اپنے سی جی صاحب کو نہیں دو گے؟''

اچانک چوہدری ممتاز خان نے مجھ سے کہا تو میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ لولوش سے رابطہ کرنے یا بات کرنے سے زیادہ برا کرنل سی جی بھجوانی سے میرا رابطہ کرنا تھا، کیونکہ اس سے براہِ راست مجھے ہی بات کرنا تھی۔

میں نے پل کے پل کچھ سوچا اور پھر ایک متانت آمیز سی ہلکی مسکراہٹ سے بولا۔

''میں کرنل صاحب کے اوقاتِ کار سے واقف ہوں، وہ اس وقت آرام...''

یہی وہ وقت تھا جب اچانک وزیر جان کے سیل فون کی بیل گنگنائی اور میری بات ادھوری رہ گئی۔

''اوہ، چیف باس کی کال ہے، جسٹ اے منٹ۔''

وزیر جان نے اپنے سیل فون کی بڑی سی اسکرین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور اس کے ساتھ ہی اس نے سیل اپنے کان سے لگا کر انتہائی مودبانہ لہجے میں پہلے اسے ہائے ہیلو کہا اور پھر بولا۔

''یس چیف! میں نے اسی لیے فون کیا تھا کہ آپ کو بلیک کوبرا معاہدہ طے پانے کی خوش خبری سنا دوں۔''

یہ کہہ کر وہ رکا اور شاید دوسری طرف سے لولوش کی بات خاموشی سے سننے لگا۔ ادھر میرے پورے وجود میں لاتعداد چیونٹیاں سی رینگ رہی تھیں، میں جانتا تھا کہ عبید اور اس کے دونوں ساتھی سجاد اور کریم کی جان بھی میری طرح گویا حلق میں اٹکی ہوئی تھی۔

میرے اندازے کے مطابق اگر لولوش امریکا میں تھا تو وہاں اس وقت شام کے چار یا پانچ ہی بجے ہوں گے، کیونکہ امریکا اور پاکستان کے اسٹینڈرڈ ٹائمنگ میں کم از کم چوبیس گھنٹے کا فرق تھا۔

''یس چیف! شیور۔ وہ اس وقت ہمارے سامنے ہی موجود ہے۔ سوری... او... سمجھ گیا۔ آواز ذرا ہلکی تھی، اسی لیے آپ کی بات نہیں سمجھ پایا، ہاں تو آپ اس وقت رنگون میں ہیں؟ سو نائس، یہ تو اور بھی اچھا ہو جائے گا کہ اس اہم معاہدے کے بعد آپ دونوں کی ملاقاتیں بھی ہو جائیں۔ بھارت سے برما کون سا دور ہے۔ اس عظیم معاہدے کے بعد اگر آپ کی اور کرنل سی جی بھجوانی کی ملاقات بھی ہو جاتی ہے تو یہ اور بھی اچھا ہوگا۔ یس، یس چیف! بٹ، ہم چاہ رہے تھے کہ آپ پاکستان کا بھی ایک چکر...'' وہ رکا۔ سیل فون اپنے کان سے لگائے میری طرف دیکھتے ہوئے فون پر بولا۔

''یس چیف! مسٹر سندر داس اس وقت ہمارے سامنے موجود ہیں۔ لیجیے بات کریں۔''

یہ کہتے ہوئے اس نے فون میری طرف بڑھا دیا اور ایک پُرجوش سی مسکراہٹ سے بولا۔ ''یہ لو مسٹر سندر داس! چیف باس لولوش آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔''

وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ میں نے اپنے سوکھے حلق کو تر کرنے کے لیے کچھ نگلنے کی سعی چاہی اور چہرے پہ مسکراہٹ لیے، دھڑکتے دل کے ساتھ وزیر جان سے سیل فون تھام لیا۔

میں اس وقت عالمی حیثیت کے حامل ایک انٹرنیشنل ڈان ''اسپیکٹرم'' جیسی ہشت پا اور بین الاقوامی گینگ کا چیف باس، برموڈس کے کسی گمنام دور افتادہ، پُراسرار جزیرے میں پیدا ہونے والا، اور وہیں کا رہائشی اور بودوباش اختیار کرنے والے، خوف و دہشت کی علامت، سفاکی اور بربریت میں تاتاری فطرت کے مالک برازیلین نژاد لولوش سے مخاطب ہونے والا تھا۔

لولوش سے متعلق اب تک مجھے مختلف ذرائع سے جو معلومات حاصل ہوتی رہی تھیں، اس کی تعریف میں، میں نے اب تک یہی کچھ سنا تھا، اور اس وقت اس سے بات کرنے والا تھا میں، جو میری زندگی کا پہلا موقع تھا۔

''ہیلو... چیف... مسٹر لولوش! میں سندر داس آپ سے شرفِ کلامی حاصل کرنے پر آپ کا اور کے دونوں ساتھیوں، مسٹر وزیر جان اور ممتاز خان کا مشکور ہوں۔''

میں نے اس کے رتبے اور گٹھ جوڑ کے حوالے سے نہایت مودبانہ اندازِ تخاطب اپناتے ہوئے اس سے کہا تو دوسری جانب چند ثانیوں کے لیے خاموشی سی طاری رہی۔ جانے کیوں اس کی یہ خاموشی مجھے بری طرح کھل رہی تھی کہ جانے کیا بات تھی کہ وہ جواب نہیں دے رہا تھا۔ پھر جب بدستور اسی خاموشی کا دورانیہ کچھ طویل ہوا تو میں سمجھا شاید کال ڈراپ ہو گئی ہے۔ میں نے دوبارہ ہیلو، کرنے کا ارادہ کیا ہی تھا کہ دفعتاً ہی دوسری جانب سے ایک

کھرکھراتی، بھاری اور کھردری سی آواز ابھری۔

’’ہائے۔ ہمیں بھی بہت خوشی ہوئی تم سے بات کرکے اور اس سے زیادہ مسرت ہمیں اس معاہدے کے طے پا جانے پر ہوئی ہے۔ مسٹر سندرداس سکسینہ!‘‘

اس نے میرا، یعنی سندرداس کا پورا نام لیا تھا۔ اس کے لہجے میں جانے کیوں مجھے ایک خوفناک سی سرسراہٹ کا احساس ہوا تھا، جسے محسوس کرکے میرے پورے ٹھٹکے ہوئے وجود میں ان گنت چیونٹیاں سی رینگ گئیں۔ اس کا کھردرا اور سپاٹ لہجہ اس کی دوستانہ گفتگو کی نفی کرتا لگتا تھا یا پھر یہ میرا وہم تھا۔ میرا منہ خشک سا ہونے لگا تھا۔ پتا نہیں اس کم بخت کی آواز اور لہجے میں ایسا کیا تھا کہ مجھے اپنا اعتماد متزلزل سا ہوتا محسوس ہوا۔

پھر اس سے پہلے کہ میں اس سے مزید کچھ کہتا، اس نے فوراً بھنچی بھنچی آواز میں کہا۔

’’فون وزیر جان کو دو۔‘‘

میں نے ایسا ہی کیا اور فون وزیر جان کی طرف بڑھا دیا۔ جو اس نے فوراً اپنے کان سے لگا کر مودبانہ انداز میں ہیلو بھی کہہ دیا۔

میری دھڑکتی نظریں وزیر جان کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں اور اس کے اطراف میں گردش کر رہی تھیں، تب ہی اچانک کیا ہوا کہ اس کا کھلا کھلا چہرہ، دھواں دھواں سا ہونے لگا، یوں، جیسے بالکل ست کے رہ گیا ہو۔ اور اس کی اِدھر اُدھر گردش کرتی نظریں یک بیک میرے چہرے پر مرکوز ہو کے رہ گئیں۔ اس کی آنکھوں سے میرے لیے جو تھوڑی دیر قبل دوستانہ جذبات مترشح ہو رہے تھے، وہ ایکا ایکی ایک عجیب سے سناٹوں میں بدل گئے۔ میرا دل یکبارگی ۔۔۔ زور سے دھڑکا۔ اور پورے وجود میں ایک سنسنی ۔۔۔ سی دوڑ گئی۔

’’اوکے چیف! آئی گیٹ اِٹ۔‘‘

یہ کہہ کر اس نے رابطہ منقطع کر دیا اور میرے چہرے سے یک دم نظریں ہٹا کر اپنے قریب بیٹھے ممتاز خان سے کچھ کہا۔

میں ٹھٹک گیا۔ یہ مخصوص کوڈ ورڈز تھے۔ جس میں ’’ڈی‘‘ اور ’’ایس‘‘ کا استعمال بار بار آتا تھا۔ اپنی ٹریننگ کے دوران مجھے ’’ڈی کوڈنگ‘‘ کی جو تربیت دی گئی تھی، اس کے مطابق کوڈ ورڈز کی گفتگو میں بار بار ڈی اور ایس کا صاف مطلب (suspicious+dummy) کا ہی لیا جاتا تھا۔ یعنی ’’مشتبہ۔‘‘

میری بھانپتی ہوئی نظریں پہلے ہی ان دونوں کے چہروں کا طواف کر رہی تھیں تب ہی میں نے دیکھا کہ چوہدری ممتاز خان کا چہرہ بھی یک دم بھونچکا سا رہ گیا۔

ٹھیک اسی وقت میرے اندر کوئی زور سے چیخا۔۔۔۔

’’شہزی! تمہارا پول کھل چکا ہے۔ ہوشیار باشد!‘‘

ظاہر ہے میری موجودگی میں بھلا وزیر جان کو ممتاز خان سے کوڈ ورڈز میں کیوں گفتگو کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی تھی۔ دال میں یقینی طور پر کالا تھا۔

لیکن میں بہ ظاہر اپنے چہرے پہ طمانیت کے آثار طاری کیے اسی طرح بیٹھا رہا۔ بے شک اگر لولوش کو مجھ پر کسی قسم کا شبہ ہوا بھی تھا تو وہ یقینی پھر بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لیے کہ وہ مجھ سے ہزاروں میل دور تھا اور محض فون پر وہ بھی یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا کہ اصل میں، میں کون تھا؟ جبکہ کوڈ ورڈ کی گفتگو سے مجھے تھوڑا بہت اس امر کا بھی اندازہ ہوا تھا کہ ابھی یہ دونوں میرے سلسلے میں کسی جلد بازی کا مظاہرہ کرنے کے موڈ میں نہیں تھے۔ لیکن مجھے اس سلسلے میں کچھ زیادہ خوش فہمی بھی نہیں تھی۔ ہاں البتہ لولوش کا میرا یعنی سندرداس کا پورا نام لینا مجھے چونکا ضرور گیا تھا، جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ یا تو سندرداس سے رابطے میں رہ چکا تھا یا اس کے بارے میں اسے پوری جان کاری تھی۔

اب صورتِ حال یہ تھی کہ کسی بھی وقت کچھ بھی ہو سکتا تھا۔

میں ان کے بارے میں اندازے قائم کرتا رہ گیا اور انہوں جو کرنا تھا، وہ کر ڈالا۔ وزیر جان کے ایک ذرا مخصوص اشارے پر ان چاروں نے بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ حرکت کی اور اپنے لباس سے پستولیں نکال کر مجھ پر تان لیں، ان میں عبید کو بھی ان کا ساتھ دینا پڑا، وہ ابھی مجبور تھا، اور ان کا محکم بھی۔ میں چونکہ ذہنی طور پر چند سیکنڈ قبل ہی خود کو اس ناخوش گوار واقعے کے لیے تیار کر چکا تھا اس لیے بہ ظاہر آرام سے اپنی جگہ جما بیٹھا رہا۔

اس دوران میں ان دونوں نے بھی اپنی پستولیں نکال کر اس کا رخ میری جانب کر دیا تھا۔

’’یہ کیا حرکت ہے؟‘‘ میں نے ان دونوں کی طرف دیکھ کر قدرے درشتی سے کہا تو وزیر جان نے قدرے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

’’ہمیں افسوس ہے کہ ہمیں آپ کی اصلیت سے متعلق کچھ شبہ ہوا ہے کہ آپ ہمارے مطلوبہ آدمی نہیں ہو۔‘‘

اس کا محتاط لہجہ اس بات کی غمازی کر رہا تھا کہ ابھی وہ

خود بھی اس سلسلے میں ابہام کا شکار تھا۔ اسے ڈر تھا کہ اگر ان کا شک غلط نکلا تو کہیں میں ان سے ناراض ہی نہ ہو جاؤں، یہی وہ نقطہ تھا، جسے میں نے فوراً بھانپتے ہوئے وزیر جان سے تلخ لہجے میں کہا۔

''حیرت ہے، آپ کو اپنے لوگوں پہ بھی بھروسا نہیں رہا یا پھر یہ سب اس قدر نکمے ہیں کہ تمہارے کسی بھی دشمن کی چال میں آرام سے پھنس سکتے ہیں۔''

''ابھی پتا چل جاتا ہے۔'' اس بار ممتاز خان نے کہا اور اپنے ایک پستول بہ دست ساتھی کو اشارہ کیا۔ وہ تیزی کے ساتھ کمرے سے نکلا تھا جبکہ دوسرا ساتھی میری جانب بڑھا۔

''یہ فائل ہمارے حوالے کر دو۔'' ممتاز خان نے اپنے پستول کا رخ میری جانب کر دیا۔ عین لبِ بام شکست پر میں اندر ہی اندر بری طرح تلملا کر رہ گیا اور اس گھڑی کو کوسنے لگا جب اس مردود لولووش سے میری فون پر گفتگو ہوئی تھی، جو مختصراً سہی مگر اس گرگِ باراں دیدہ شخص کو نجانے کیسے مجھ پر کسی قسم کا شبہ ہو گیا تھا۔ اس نے فوراً اپنے کارپرداز کو اس کی بھنک دے دی تھی۔

وہ اہم فائل میری گود میں پڑی تھی، ناچار وہ میں نے اس کے ساتھی کی طرف بڑھا دی، جو اپنا پستول تانے میرے سامنے آچکا تھا، اس کا انداز خاصا محتاط تھا اور اس نے بالکل میرے آگے آنے کی کوشش نہیں کی تھی، بلکہ ایک سائڈ سے میری جانب بڑھا تھا۔ اور تب ہی اچانک میری سماعتوں نے ایک چلاتی ہوئی آواز سنی تھی، جس نے مجھے ہی نہیں وہاں موجود سبھی کو بری طرح چونکنے پر مجبور کر دیا تھا۔

''خبردار! کوئی بھی اپنی جگہ سے حرکت نہیں کرے گا۔ ورنہ چیف کے سر میں روشن دان بنا دوں گا۔''

یکلخت سب کو سانپ سونگھ گیا۔ یہ عبید تھا۔ اپنے منصوبے کی اب تک کامیاب آبیاری کرتے ہوئے عین آخری لمحات میں اس کی ناکامی اسے بھی راس نہ آسکی تھی اور وہ جوشِ جنوں میں مجھ سمیت اپنی جان بھی داؤ پہ لگا گیا تھا۔ میری نظریں اس پر جمی ہوئی تھیں اور اس نے صوفے کی جانب پیش قدمی کرتے ہوئے، عقب سے اپنے اسٹیشن چیف وزیر جان کی کنپٹی پر اپنے پستول کی نال رکھ دی تھی۔

''سب اپنے ہتھیار پھینک دو، وزیر جان تم بھی ورنہ گولی چلا دوں گا میں۔'' وہ پھر جنونی انداز میں چیخا۔

وزیر جان اور ممتاز خان کے چہرے مسخ ہو گئے۔ ان کے باقی ساتھی بہ ظاہر سپاٹ انداز میں کھڑے رہ گئے، جو جہاں تھا وہیں کھڑا رہ گیا۔ عبید کے لہجے اور ورانہ وار انداز نے جلد ہی وزیر جان کو یہ باور کرا دیا تھا کہ جب اپنا کوئی ساتھی باغی ہوتا ہے تو اس نے سر سے اپنے کفن ہی باندھے ہوتا ہے، وہ صرف مرنے اور مارنے کے لیے ہی اپنے کسی پر ہتھیار اٹھاتا ہے۔

اس نے نہ صرف فوراً اپنا پستول پھینک دیا بلکہ اپنے ساتھیوں سے بھی ہتھیار پھینک دینے کا کہا۔

''شہزی! فائل لے کر بھاگ جاؤ۔ میں زیادہ دیر...'' عبید نے چلا کر مجھے مخاطب کرتے ہوئے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ اچانک گولی چلنے کا دھماکا ہوا۔ عبید کو میں نے بغیر آواز نکالے گرتے دیکھا۔

نامعلوم سمت سے آنے والی جو گولی اسے چاٹ گئی تھی، وہ یقیناً انہی کے کسی ساتھی نے داغی ہوگی، یہ کوئی کھلی کچہری نہیں تھی، مجرموں کا اپنا ٹھکانا تھا، کہاں کب کون سا ان کا ساتھی یہاں دھیان لگائے بیٹھا تھا، کون جانتا تھا؟

یقیناً عبید کو بھی اس خطرے کا اندازہ تھا لیکن باوجود اس کے اس نے مجھے ایک قلیل سا موقع دینے کے کی خاطر اپنی جان داؤ پر لگا دی تھی، ساتھ ہی ''بھری محفل'' میں میرا نام بھی پکار چکا تھا، جو یقیناً وزیر جان اور ممتاز خان پر بم ہی بن کر گرا ہوگا۔

گولی کا دھماکا اور عبید کی چیخ کے فوراً ہی بعد میرے حرکت کرنے کی باری آگئی تھی، وہ ایک پل ایسا تھا کہ جس نے میرے پورے ٹھٹکے ہوئے وجود میں گویا پارا دوڑا دیا۔

میں نے فائل دبوچ لی۔ صوفے پر بیٹھے بیٹھے سب سے پہلے اس آدمی کو ایک لات رسید کی جو گولی کی آواز اور اپنے ''غدار'' ساتھی کی چیخ پر اپنا پستول اٹھانے کی فوری کوشش میں آگے کو جھکا تھا۔ لات اسے میں نے اس زاویے سے ماری تھی کہ وہ ''قائمہ'' بن گیا تھا، یعنی لڑکھڑا کر اور ذرا ترچھا ہو کے تیزی سے وہ اپنے دونوں گرو گھنٹال، وزیر جان اور ممتاز خان پر جا گرا تھا۔ باقی دونوں ساتھی ایجنٹ اپنے پستول اٹھا چکے تھے، جبکہ مجھے پہلے ہی ان کی اس متوقع حرکت کا ادراک تھا جس کے تدارک میں ... پہلے والے کو لات رسید کرتے ہی اس کے پستول پر قبضہ جما چکا تھا، لیکن میرے پاس دوبارہ سنبھل کے اٹھنے کی مہلت نہیں تھی، لہٰذا میں نے ایک ہاتھ میں بلیک کوبرا فائل سنبھالی اور دوسرے میں پستول تولتے ہوئے، تلے اوپر دو فائر ٹھونک دیے، میرے پستول کی ایک گولی کارگر ثابت ہوئی، دشمن کریہہ انگیز چیخ کے ساتھ گرا تھا جبکہ دوسرا...... اپنے دائیں شانے پر گولی کا داغ سہتے ہوئے لڑکھڑایا ضرور تھا مگر خود کو

ڈھنے سے بچانے کی کوشش کرتے ہوئے، مجھ پر ایک فائر جھونک دیا۔ عین اسی وقت میں نے بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ اسی طرف جست لگادی تھی، جدھر دروازہ تھا، چھلانگ کارآمد تو ثابت ہوئی تھی مگر بال کمرے کے چکنے فرش پر میں گھسٹتا ہوا اس کی چوکھٹ سے اپنے سر کو ٹکرانے سے نہ بچا سکا۔ بے اختیار میرے حلق سے ایک کراہ آمیز چیخ سی خارج ہوگئی تھی، اور مجھے اپنا پورا دماغ جھنجھناتا محسوس ہوا۔ آنکھوں کے گرد تاریکی سی سمٹ آئی۔ فائل پر میری گرفت ڈھیلی پڑی اور وہ چھوٹ کر دروازے کی چوکھٹ سے باہر، کوریڈور کی طرف سرکتی چلی گئی۔

بلیک کوبرا فائل سے محرومی کے احساس نے مجھے جیسے ایک دم ہوش دلا دیا، اور بکھرے حواسوں کو پل کے پل سمیٹتے ہی میری متلاشی نظریں اس پر جم گئیں، عقب میں گولی کا دھماکا گونجا، مگر جب تک میں بہ سرعت رینگ کر چوکھٹ چھوڑ چکا تھا۔ گولی کسی چوبی حصے سے ٹکرائی تھی اور لکڑی کے چھلتر، مع برادوں کے میرے چہرے پر لگے۔ مجھے کچھ خراشوں کا احساس ہوا۔ اس کی پروا کیے بغیر میں نے نظر آجانے والی کوبرا فائل پر جھپٹا مارا اور اٹھ کر دوڑ لگادی۔ اپنے عقب میں مجھے وزیر جان اور ممتاز خان کے تحکمانہ انداز میں پاگلوں کی طرح چیخنے چلانے کی آوازیں سنائی دیں۔ ساتھ دوڑتے قدموں کی گونج عمارت میں ہڑبونگ کا پتا دیتی تھی۔

میری کوشش یہاں سے باہر نکلنے کی تھی، جبکہ اس کے بہت سے گوشوں سے میں اتنا واقف بھی نہ تھا۔ اچانک میرے سامنے تین چست لباس میں ملبوس افراد کسی کمرے سے طلوع ہو کر ملک الموت کی طرح میرے سامنے آن کھڑے ہوئے، ان کے ہاتھوں میں طاقت ور گنز تھیں۔

''ہالٹ۔'' ان میں سے ایک حلق کے بل چیخا۔ میں ایک گہری سانس خارج کر کے وہیں جم کر کھڑا ہو گیا۔ میرا اور ان کا فاصلہ بہ مشکل چند قدموں کا تھا۔ صاف لگتا تھا کہ میرا کھیل ختم ہو گیا تھا مگر ایسے ہی وقت میں ایک چونکا دینے والا واقعہ رونما ہوا، انہی میں سے ان کے ایک ساتھی نے عجیب حرکت کی، اس نے مجھ پر تانی ہوئی گن کو حرکت دی اور اس کا کندا، اس کے ساتھ کھڑے ساتھی کے جبڑے پر لگا۔ ظاہر ہے یہ حملہ اس کی توقع کے بالکل برخلاف تھا۔ وہ اپنے حلق سے ''اوغ'' کی آواز خارج کرتا ہوا اپنے تیسرے ساتھی سے جا ٹکرایا، دونوں ہی لڑکھڑائے تو اس نے پوزیشن بنا کر ان پر برسٹ فائر کر دیا۔

میں ابھی حیرت زدہ نظروں سے یہ ''معجزانہ'' منظر دیکھ

سچی کہانیوں، آپ بیتیوں، جگ بیتیوں کا بے مثال مجموعہ

ماہنامہ سرگزشت

شمارہ دسمبر 2015ء کی جھلکیاں

جہد برق

ڈاکٹر ساجد امجد کی تحقیق، اردو کے نامور قلم کار کا زندگی نامہ

نانگا پربت کا عقاب

ندیم اقبال کے شرربار قلم کا شہکار، سیر پاکستان

بگ تھری

مریم کے خان کا کرکٹ کے دیوانوں کی خاطر چونکا دینے والی تحریر

اپنے حصے کی شمع

سلمیٰ اعوان کی وہ تحریر جسے عرصہ تک آپ بھلا نہ پائیں گے

درست غلط فیصلہ

رومانہ شعیب کی بستر مرگ سے ارسال کردہ سچ بیانی

اس کے علاوہ

اور بھی بہت سی دلچسپ سچ بیانیاں، تاریخی واقعات، سچے قصے، یادرہ جانے والی تحریریں

آج ہی نزدیکی بک اسٹال پر اپنا شمارہ مختص کرالیں

خاص شمارہ..... ہر شمارہ، خاص شمارہ..... ہر شمارہ، خاص شمارہ

ہی رہا تھا کہ اچانک مجھے اپنے عقب میں بھاری قدموں کے دوڑنے کی آوازیں قریب آتی محسوس ہوئیں۔ جبکہ میرے اس دشمن نما ہمدرد نے اپنے ہی دونوں ساتھیوں کو جہنم واصل کرنے کے بعد یکدم مجھ پر بھی گن تان لی۔ میرا چہرہ دھواں دھواں سا ہو گیا مگر دوسرے ہی لمحے وہ حلق کے بل چلا کر مجھ سے بولا۔

''نیچے گر جاؤ۔'' اس نے ہاتھ کا اشارہ بھی کیا تھا۔ میں فوراً نیچے گر گیا۔ اس نے برسٹ کھول دیا، گولیوں کی بھیانک تڑتڑاہٹ مجھے اپنے عین سر پہ سنائی دیتی محسوس ہوئی تھی اور عقب میں متعدد انسانی چیخیں، لیکن چند ہی سیکنڈوں بعد میں نے اپنے اس ہمدرد کو بھی گولیوں سے چھلنی ہو کے گرتے دیکھا۔ جس کے بارے میں اب تک میں یہ اندازہ قائم کر چکا تھا کہ وہ عبید کے انہی آخری دو ساتھیوں، سجاد اور کریم میں سے ہی کوئی ہو سکتا تھا۔

میں نے لیٹے لیٹے پیچھے اپنی گردن گھما کر دیکھا تو میں اس کی قربانی کو دل ہی دل میں سلام پیش کیے بنا نہ رہ سکا، میرے تعاقب میں آنے والے مسلح دشمنوں کو وہ مرتے مرتے بھی جہنم واصل کر چکا تھا۔ جو کم و بیش تین چار کی تعداد میں تو تھے ہی۔ ایک دو کراہ رہے تھے۔ میں اٹھ کر دوڑا۔ میں نے اس کی گن اٹھائی اور پستول بیلٹ میں اڑس لیا، جبکہ فائل کو میں اپنی شرٹ کے اوپری بٹن کھول کر اس میں رکھ چکا تھا۔

میں جانتا تھا کہ نکاسی کے سارے راستے بند کیے جا چکے ہوں گے یا انہیں پہلے ہی سے ٹریپ کر دیا ہو گا۔ اس لیے میں نے کسی جلد بازی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ مجھے بس چند لمحوں کے لیے ٹھہرنے کی مہلت درکار تھی کہ میں میجر باجوہ صاحب کو ''گرین سگنل'' دے دوں۔

جس طرف سے میرے ہمدرد سمیت وہ تین مسلح دشمن اچانک طلوع ہوئے تھے، میں نے اسی طرف کا ہی رخ کیا تھا، میں سمجھا تھا کہ شاید وہ کوئی کمرا ہو گا لیکن موڑ کاٹنے پر معلوم ہوا وہ ایک زینہ تھا جو اوپر جاتا تھا، پہلے میں نے زینے چڑھنے کا ارادہ کیا لیکن پھر کچھ سوچ کر میں فوراً اس کے خلا میں جا چھپا۔ اور وہاں سے میں نے ذرا ٹھہر کر اپنا سیل فون نکالا اور باجوہ صاحب سے رابطہ کرنے لگا۔

میرا سانس بری طرح پھولا ہوا تھا جس میں ایک جوش کی سی کیفیت تھی۔ ایک اہم مشن. کامیابی کے بالکل نزدیک پہنچ چکا تھا۔ اس بار اسپیکٹرم کو آخری چوٹ لگنے والی تھی، اس کا شیرازہ بکھرنے کو تھا۔ بلیک کوبرا فائل کی صورت میں اس کی تباہی میری شرٹ کے اندر سینے میں ایک ''بٹن'' کی طرح چسپاں تھی، جسے دبانے کی دیر تھی۔ یہ اسپیکٹرم کے لیے ایک ایسا ٹائم بم تھا جس کی ''کاؤنٹ ڈاؤن'' شروع ہو چکی تھی، اور یہ پھٹنے کو تھا۔ یہی سبب تھا کہ اس اہم فائل کے حصول کے لیے. عبید سمیت اس کے ساتھیوں (سجاد یا کریم) نے بھی اپنی جان کی بازی لگا دی تھی۔ ان کا ایک ساتھی ابھی زندہ تھا، اور اسپیکٹرم میں ابھی وہی بچا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میں ان کی قربانی زائل جانے کیسے دے سکتا تھا؟

باجوہ صاحب سے رابطہ ہوا تو میرے اندر گہری طمانیت ..... سی پھیل گئی۔ وہ اپنی پاور سیکریٹ سروس سمیت پہلے ہی سے اسٹیشن فور کی عمارت کو گھیرے میں لیے ہوئے تھے، اور میری طرف سے گرین سگنل کے منتظر تھے۔

جیسے ہی انہیں اس بات کی تشفی ہو گئی کہ بلیک کوبرا فائل میرے پاس محفوظ تھی، انہوں نے ایکشن لے لیا۔

لیکن میرا کام اب چھپ کر تماشا دیکھنا ہی نہیں رہ گیا تھا۔ میں نے اسٹیشن فور کے اندر اچھی خاصی کھلبلی مچا دی تھی۔ میری سماعتوں میں ابھی تک وزیر جان اور ممتاز خان کی بوکھلائی ہوئی ہسٹریائی چیخیں سنائی دے رہی تھیں۔

آج کا دن اسپیکٹرم کا آخری دن ثابت ہونے والا تھا۔ میرے گرین سگنل دینے کے بعد ''پاور'' والے اب تک حرکت میں آ گئے ہوں گے۔ کچھ لمحات مزید بیت گئے، کوئی ہلچل محسوس نہ کر کے مجھے ذرا حیرت سی ہوئی۔ میں نہیں جانتا تھا کہ موجودہ آپریشن میں انہوں نے کیا طریقہ اختیار کیا تھا، تاہم میرے اندر بے چینی نے دستک دی تو مجھ سے وہاں دبکا بیٹھا نہیں گیا اور گن سنبھالے زینے سے نکلنے کے ارادے سے تھوڑا سرکا ہی تھا کہ اچانک مجھے پہلے سے زیادہ کھلبلی کا شور سنائی دیا۔ اسی وقت مجھے عمارت کے اندر متعدد انسانوں کے در آنے کا احساس ہوا۔ میں اپنی جگہ ایک بار پھر جم گیا، اسی وقت پہلے وقفے وقفے سے برسٹ فائر ہوئے، اس کے فوراً بعد ہی تواتر کے ساتھ گولیاں چلنے کی سمع خراش آوازیں ابھریں۔ لیکن یہ سلسلہ بھی جلد ہی ختم گیا مگر بھگدڑ بہ دستور مچی ہوئی تھی۔ اس میں انسانی آوازوں کے زور زور سے بولنے کا شور بھی تھا۔ انہی آوازوں میں مجھے ایک شناسا آواز سنائی دی۔

''اس طرف اوپر... اوپر۔''

یہ میجر ریاض باجوہ کی آواز تھی۔ میں فوراً اوٹ سے نکل آیا۔ ان کے ہمراہ پاور سیکریٹ سروس کے چار ایجنٹ تھے۔ سب جدید اسلحے سے مسلح تھے۔ باقی پھیلے ہوئے

تھے۔ مجھے دیکھتے ہی سب چونک پڑے۔

تاہم میجر باجوہ نے اپنے تین ساتھیوں سے ہدایتاً کہا۔ ''اوپر کوئی بھی ہو پہلی کوشش یہی کرنا کہ وہ ہتھیار ڈال دیں، ورنہ بھون دینا گولیوں سے۔''

وہ تینوں بجلی کی سی پھرتی سے اوپر کو چلے گئے۔ ان کے ساتھ اب میں اور ایک ساتھی رہ گیا۔ پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوکر بولے۔

''شہزی! تمہارے ساتھ اور کون ہے؟''

''کوئی نہیں سر! لیکن ایک احتیاط کیجیے گا۔'' میں نے کہا۔ ''اسپیکٹرم کے ایجنٹوں کے درمیان میں ایک ہمارا آدمی بھی ہے۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے انہیں عبید کے دونوں ساتھیوں کریم اور سجاد کے بارے میں بتا دیا۔ یہ بھی کہ عبید اور اس کا ایک ساتھی مشن پر قربان ہو چکے تھے۔ اب پتا نہیں کریم بچا تھا یا سجاد۔

''بے فکر رہو۔ پاور ایجنٹ اندھا دھند حرکت نہیں کرتے۔'' وہ بارعب اور مستحکم لہجے میں بولے۔ ''میں پھر بھی کیپٹن افتخار جنجوعہ کو ہدایت کیے دیتا ہوں۔''

کیپٹن افتخار جنجوعہ سے میں بھی بہ خوبی واقف تھا۔ یہ تقریباً میری ہی عمر کا وہی نوجوان تھا جس کے ساتھ میں نے پی ایس ایس کے ٹریننگ سینٹر میں تربیت حاصل کی تھی۔

میجر باجوہ نے ایک مختصر ڈیوائس پر کیپٹن جنجوعہ سے رابطہ کر کے اس کے بارے میں بتا دیا پھر دوبارہ مجھ سے مخاطب ہوکر بولے۔

''شہزی! وہ فائل کہاں ہے؟''

''میرے پاس ہے سر!'' میں نے فرطِ جوش سے کہا اور ابھی میں نے اپنی شرٹ کے اوپری بٹن کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ اچانک.... میرے دائیں جانب کوریڈور میں ایک ساعت شکن دھماکا ہوا اور ہر طرف دھواں پھیل گیا۔ ہم یکدم زینے کے خلا میں آگئے۔ لیکن اسی وقت میری ٹھٹکی ہوئی سماعتوں نے کسی ٹھوس شے گرنے.... کی آواز سنی۔ جسے صرف میں ہی نہیں میجر ریاض اور ان کے ساتھی نے بھی بھانپ لیا تھا، اور پھر ہم تینوں نے ہی بیک وقت بڑی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک لمبی جست بھری، جس وقت ہم تینوں اپنے بائیں ہاتھ والی مختصر راہداری کے فرش پر آ رہے تھے، ٹھیک اسی وقت دوسرا ساعت شکن دھماکا ہوا۔ اس بار دشمنوں نے ہینڈ گرینیڈ بہت قریب پھینکا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے کچھ شیل آتشی ذروں کے مانند.... میرے چہرے اور ہاتھوں سے ٹکرائے۔ یہ جلتے ہوئے ٹکڑے تھے۔ مارے تکلیف سے میرے حلق سے کراہ آمیز چیخ خارج ہوگئی۔

''شہزی! آر یو او کے؟'' دفعتاً میں نے دھوئیں کے کثیف بادلوں میں میجر ریاض کی فکر بھری آواز سنی، اور مجھے احساس ہوا کہ دوسرے ہینڈ گرینیڈ سے صرف مجھے ہی خراشیں آئی تھیں۔

''یس سر! آئی ایم او کے۔ آر' یو؟''

''فرار... دشمن فرار ہونے کے لیے یہ آخری ہتھکنڈا آزما رہا ہے۔''

میجر ریاض باجوہ کی اس بات نے مجھے فکر مند سا کر دیا۔ اچانک ان کے وائرلیس ڈیوائس میں سے مخصوص بپ کی آواز ابھری۔

''یس۔'' انہوں نے فوراً کال ریسیو کی۔ کچھ سیکنڈ دوسری جانب سے اپنے کسی ماتحت وغیرہ کی بات سنتے رہے پھر بارعب اور تحکمانہ لہجے میں بولے۔

''نکاسی کے ہر راستے پر چار چار جوانوں کی ٹولی مقرر کردو۔ اور تمام گاڑیاں ٹاپ آف رکھو۔ کوئی دشمن بھاگنے نہ پائے۔ کلیئر۔''

اس کے بعد انہوں نے کیپٹن جنجوعہ سے رابطہ کیا۔

''دشمن ہلکی ساخت کے بم استعمال کر رہا ہے۔ مقصد فرار ہونا ہے۔ بی کیئرفل۔ اپنے اصل ٹارگٹ پر خود کو فوکس رکھو۔ وہ دونوں بچ کے جانے نہ پائیں اور نہ ہی ان کی ہلاکت ہو۔ کلیئر۔''

وہ بات سے فارغ ہوئے تو اسی وقت اوپر سے فائرنگ کی آواز ابھری اور ساتھ ہی کوئی چلایا۔ ''ہتھیار پھینک دو ورنہ گولیوں سے بھون دیے جاؤ گے۔''

یہ ہمارے ساتھی تھے، انہوں نے شاید اوپر موجود دشمنوں پر غلبہ پالیا تھا۔ لیکن اگلے ہی لمحے تلے اوپر دو برسٹ فائر ہوئے، انسانی چیخ کی آواز بھی ابھری۔ میجر ریاض متفکر سے ہوگئے۔ وہ تیزی سے زینے کی طرف دوڑے، میں اور ان کا ساتھی گن لے کر ان کے پیچھے لپکے۔ اوپر فائرنگ جاری تھی۔ پتا چلا پاور اور اسپیکٹرم کے ایجنٹ ایک دوسرے سے برسرِپیکار تھے۔ ہم بھی ان میں شامل ہوگئے۔ اوپری منزل میں بھی چھوٹے بڑے کمرے اور طویل راہداریاں تھیں۔ ہم سب پوزیشنیں سنبھالے ہوئے وہاں پہنچے۔ میجر ریاض نے اپنا پستول نکال لیا تھا۔ دو ساتھیوں نے ہمیں دیکھ کر اپنے ہاتھ کے اشارے سے وہیں روک دیا۔

اسی وقت وہاں سے دو چست لباس میں مسلح افراد،

اندھا دھند فائرنگ کرتے ہوئے نمودار ہوئے۔ اگر ہم سامنے ہوتے تو وہ بے دریغ ہم تینوں کو بہ آسانی نشانہ بنا سکتے تھے، میں دل ہی دل میں اپنے ان دونوں ساتھیوں کے چوکنے پن کی داد دیے بنا نہ رہ سکا۔ وہ ان دونوں دشمنوں کی پوزیشنیں پہلے ہی تاڑ چکے تھے، جیسے ہی وہ فائرنگ کرتے ہوئے ایک تنگ راہداری سے نمودار ہوئے تو ہمارے دونوں ساتھیوں نے ان پر برسٹ فائر کر دیا۔ وہ چیخ مار کر گرے مگر دوسرے نے زخمی ہونے اور گرنے کے باوجود لیٹے لیٹے اپنی گن کا رخ ہمارے دونوں ساتھیوں کی طرف موڑ دیا۔ انہیں اس حملے کی توقع نہ تھی۔ یہی وہ وقت تھا جب میجر باجوہ نے اپنے پستول سے اس پر تلے اوپر دو فائر جھونک دیے۔ وہ آواز نکالے بغیر ڈھیر ہو گیا۔ اسی وقت ان کے دونوں ساتھیوں نے اپنے افسر کی طرف دیکھ کر اپنے دائیں ہاتھ کے انگوٹھے کھڑے کر کے مخصوص اشارہ کیا اور پھر ہم تینوں بھی ان میں شامل ہو گئے۔

"باقی ساتھی کہاں ہیں؟" میجر باجوہ نے پوچھا۔

"سر! وہ اندر دشمنوں کے پیچھے گئے ہیں۔ ہمیں یہاں رکنے کو کہا گیا ہے تا کہ کوئی اِدھر سے فرار نہ ہونے پائے۔" ایک نے مودبانہ انداز میں جواب دیا۔

"اصل شکار کدھر ہیں؟" میجر باجوہ نے پوچھا۔

"ابھی ان کے بارے میں کچھ پتا نہیں لیکن یہاں وہ نہیں ہیں۔" اس نے جلدی سے جواب دیا۔ اس کی بات سنتے ہی وہ ہمیں اشارہ کرتے ہوئے واپس پلٹے۔

نیچے آتے ہی ہم نے آگے کی طرف پیش قدمی کی۔ میرے اندر ہلچل سی مچ گئی تھی۔ وزیر جان اور ممتاز خان کے ابھی تک ہتھے چڑھنے کی خبر نہیں آئی تھی۔ اگرچہ پاور والوں کی اسٹیشن فور پر خاطر خواہ انداز میں چڑھائی ہوئی تھی۔ لیکن ابھی تک اس کے سو فیصدی نتائج سامنے نہیں آئے تھے۔

اچانک میں نے اپنی سمت بدلی اور ان سے الگ ہو کر اپنی گن تھامے ایک طرف کھسک گیا۔

میرے ذہن میں اچانک ہی اس خفیہ تہ خانے کا خیال ابھرا تھا، جہاں ایک دن وزیر جان نے دھوکے سے مجھے اور اول خیر کو قید کر دیا تھا۔ میں اسی طرف بڑھا تھا۔

میں اکیلا تھا۔ میں نے اسی کمرے کا رخ کیا جس کے فرش پر اس تہ خانے کا راستہ جاتا تھا۔ بہ ظاہر وہ... اسپیکٹرم کا ایک آفیشل روم تھا۔ میں اسی طرف جانے والی راہداری میں دیوار کے ساتھ چپکا ہوا آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ فائرنگ اب وقفے وقفے سے ہو رہی تھی۔ بارود کی بو چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ جس سے دم گھٹتا محسوس ہو رہا تھا۔ ظاہر تو یہی ہوتا تھا کہ پاور والوں نے یہاں بڑی موثر کارروائی کر کے دشمنوں پر قابو پا لیا تھا۔ لیکن مجھے اندازہ تھا کہ اصل شکار کے سلسلے میں انہیں ابھی کوئی خاطر خواہ کامیابی نہیں ہو سکی تھی۔

یہاں مجھے کچھ لاشیں بھی زمین پر پڑی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔

اپنے مطلوبہ کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے اچانک میں ایک جگہ ٹھٹک کے رکا۔ سامنے ایک کشادہ جگہ پر مجھے کیپٹن افتخار اور اس کے تین ساتھی پوزیشنیں سنبھالے ہوئے نظر آئے۔ وہ ایک کمرے کے دروازے پر ہلّا بولنے کے لیے پر تول رہے تھے۔ یہاں بھی مجھے تین چار لاشیں فرش پر پڑی نظر آئیں، ان میں ایک لاش کی وردی سے میں پہچانا تھا کہ وہ ہمارے ساتھی کی تھی، مجھے اس پر دکھ ہوا تھا۔ میں انہیں اپنے مشن میں مصروف چھوڑ کے آگے بڑھنے لگا تھا کہ اچانک کیپٹن باجوہ کی آواز پر میں بری طرح ٹھٹک کر رکا۔ وہ اپنے ساتھی سے چلا کر تحکمانہ کہہ رہے تھے۔

"اصل شکار اس کمرے میں ہیں۔ دروازہ اڑا دو، جلدی۔"

ان کے ایک ساتھی نے فوراً حکم کی تعمیل کی اور مذکورہ کمرے کے دروازے پر ہلکی ساخت کا دستی بم پھینکا۔ ایک دھماکا ہوا اور دروازے کے پرخچے اڑ گئے۔ مجھے ایک دیوار کی آڑ تھی، لیکن وہ تینوں کمرے کے دروازے کے بالکل سامنے تھے۔ دروازے کے پرخچے اڑتے ہی ایک اور بم اندر پھینکا گیا تھا۔ اور پھر کیپٹن باجوہ نے اپنے تینوں ساتھیوں سمیت پھرتی کے ساتھ اندر کی سمت پیش قدمی کی۔ میں بھی دیوار کی آڑ سے نکلا۔ ہیوی گن میرے ہاتھ میں تھی جو عبید کے آنجہانی ساتھی کی لاش پر سے اٹھا لی تھی۔ اگرچہ ایک پسٹل بھی میری بیلٹ میں اڑسا ہوا تھا۔

کیپٹن جنجوعہ کی اس بات نے مجھے چونکا دیا تھا کہ اندر اصل شکار موجود تھا۔ یقیناً ان کے کسی ساتھی نے بتایا ہوگا۔

یہ چاروں کمرے کی طرف لپکے اور لامحالہ میں نے بھی سر دست تہ خانے والے کمرے کی طرف جانے کا ارادہ بدل دیا اور اسی مذکورہ کمرے کی جانب کیپٹن باجوہ کی ٹیم کے پیچھے لپکا تھا کہ اچانک اندر سے کسی نے طاقت ور گن کا منہ کھول دیا۔ لمحے بھر کے لیے تو میرے اپنے اوسان ہی خطا ہو گئے تھے، ہوش اس وقت آیا جب میں نے اپنے ساتھیوں کی کرب ناک آوازیں سنیں۔ میری آنکھوں میں خون اتر آیا۔ انہی کی وجہ سے میں دشمنوں کی فائرنگ سے

محفوظ رہا تھا، کیونکہ وہ پہلے ہی میرے آگے تھے۔ اگرچہ انہوں نے فائرنگ کی آواز سنتے ہی فرش پر گر کے خود کو گولیوں کی زد سے بچانے کی سعی چاہی تھی، مگر سیدھی فائرنگ نے انہیں شاید چاٹ لیا تھا۔ میں جوشِ جنوں کی کیفیت میں آگیا، گن میری سیدھی تھی، میں نے لبلبی پر انگلی رکھ دی اور پھر نہیں ہٹائی۔ نشانہ اندر دھواں بھرے کمرے کا خلا تھا۔ جواب میں مجھے اندر سے ایک سے زائد دشمنوں کی چیخ سنائی دی۔ اور اسی طرح فائرنگ کرتے ہوئے میں نے جب کمرے کے ٹوٹے ہوئے دروازے سے اندر کی جانب پیش قدمی کرنی چاہی تو اچانک مجھے اپنے قریب قدموں میں پڑے کیپٹن افتخار جنجوعہ اور ان کے ایک ساتھی کی کراہ نما آواز سنائی دی۔ میں اس طرف متوجہ ہوگیا۔ یہ جان کر مجھے خوشی ہوئی کہ کیپٹن افتخار اور ان کا ایک ساتھی زندہ تھے، میں انہیں ابھی سنبھالنے کے لیے جھکا ہوا تھا کہ اچانک کوئی کمرے سے نکل کر بھاگا۔ میں نے چونک کر اس طرف دیکھا اور اپنے ازلی دشمن، اپنے بھائی لئیق شاہ کے قاتل کو اس طرح راہِ فرار اختیار کرتے ہوئے دیکھ کر اس کی طرف دوڑا۔۔۔ اور اپنے حلق سے ایک جوشِ جنوں کی سی غراہٹ خارج کرتے ہوئے میں نے اسے ایک ہی جست میں جالیا۔ اپنے بھاری بھرکم جثے کے باعث وہ زیادہ تیز نہیں دوڑ سکتا تھا۔ میرے اوپر پڑتے ہی وہ نیچے آرہا اور میں اسے فرش پر رگیدتا ہوا دور تک لے گیا۔

پھر سنبھلتے ہی میں اس کے سینے پر جا سوار ہوا میری آنکھوں میں خون اتر آیا۔ ایک ایک کر کے وہ سارے خوں ناک مناظر میری آنکھوں کے سامنے آن کھڑے ہوئے۔ کئی چہرے ان میں میرا بھائی لئیق شاہ پھر آسیہ کی لاش میری نگاہِ تصور میں آن کھڑی ہوئی، پھر معصوم آسیہ کا چہرہ، اور وہ سارے درد انگیز اور ظلم ناک مناظر جو اس سفاک شیطان کے رہینِ منت تھے، باری باری میری وحشتِ خوں رنگ آنکھوں کے سامنے گردش کرنے لگے۔

”بس ممتاز خان! آج تیری بربریت اور چنگیزی کا دور ختم ہونے والا ہے۔ اب تجھے کوئی نہیں بچا سکتا۔“ میں نے لہو رنگ لہجے میں کہا اور اپنے دونوں ہاتھوں سے اس کا گلا دبوچ لیا۔ وہ گھٹی گھٹی آواز میں میری منتیں کرتے ہوئے بولا۔

”شش... شہزی! مم مجھے... مم... معاف کر دو۔ مجھے جانے دو۔ میں تمہیں بہت سی دولت...“

مگر میں جوشِ جنوں تلے اس کا گلا دباتا چلا گیا، اور اس کے حلق سے اب محض خرخراہٹ کی آوازیں برآمد ہونے لگیں، میری آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا۔ اور پھر اس سے پیشتر کے اس کی روح بھی قفسِ عنصری سے پرواز کر جاتی اچانک مجھے اپنی سماعتوں میں میجر باجوہ کی آواز سنائی دی۔

”نہیں شہزی! چھوڑ دو اسے۔“

میجر صاحب کی آواز سن کر میرا جنون کچھ کم ہوا اور پھر ان کے دو ساتھیوں نے مجھے شانوں سے تھام کر آہستگی کے ساتھ زمین بوس ممتاز خان کے اوپر سے اٹھایا۔

ممتاز خان کو فوراً گرفت میں لے لیا گیا تھا۔ جبکہ زخمی کیپٹن افتخار اور ان کے ایک ساتھی کو فوراً ان کے ساتھیوں نے ابتدائی طبی امداد دینی شروع کر دی تھی۔ میجر صاحب کا آپریشن کافی حد تک کامیاب رہا تھا۔ اسٹیشن فور پر باور والوں کا قبضہ ہو چکا تھا، نیز اسپیکٹرم کے کئی کارندے بھی گرفت میں آچکے تھے، کچھ مارے بھی گئے تھے۔ لیکن ابھی ایک دشمن وزیر جان باقی تھا۔

میں نے اپنے حواسوں کو قابو میں کیا... اور تیزی سے اسی سمت کو دوڑا۔ جدھر تھوڑی دیر پہلے میں پیش قدمی کرنے کا ارادہ کیے ہوئے تھا۔

میں جلد ہی اس مطلوبہ کمرے میں جا پہنچا۔ یہاں بھی سب کچھ ابتری کی حالت میں ہی نظر آرہا تھا۔ میں نے تہ خانے کا راستہ تلاشنے کی بے حد کوشش کی لیکن مجھے ناکامی ہوئی۔ میں نے فرش سے وہ دبیز غالیچہ بھی اکھاڑ پھینکا تھا۔ جس کے نیچے تہ خانہ تھا لیکن مجھے ناکامی ہوئی۔ میں میز کی طرف بڑھا۔ اور وہاں چھیڑ چھاڑ کرنے پر مجھے ایک دراز کھولتے ہی ایک پینل نظر آگیا۔ پینل کے ہر بٹن پر انگریزی کے الفابیٹ درج تھے۔ اندازے سے میں نے ایک ایسے ہی... G والے بٹن کو پش کیا تو اچانک کمرے میں ایک گڑگڑاہٹ کی آواز ابھری۔ میں پینل چھوڑ کر اسی سمت کو لپکا۔ جہاں غالیچہ بچھا ہوا تھا وہاں ایک آٹھ مربع فٹ کا چوکور تاریک خلا نظر آرہا تھا۔ میں نے اپنے سیل فون کی ٹارچ جلائی اور اس کی روشنی اندر پھینکی۔ تہ خانے کی زمین زیادہ گہری نہ تھی، میں چھلانگ لگا کر اندر اتر گیا۔ اور چاروں طرف روشنی ڈالنے لگا تو اچانک میرا دل جیسے دھڑکنا بھول گیا۔ میرے سیدھے ہاتھ کی طرف تہ خانے کی دیوار پر ایک چار فٹ کا چوکور خلا دکھائی دیا۔ میرے چہرے پہ سلوٹیں نمودار ہو گئیں اور فرطِ جوش تلے میرا دل بے طرح دھڑکنے لگا۔ اس میں کیا شک تھا کہ میرا اصل شکار (وزیر جان) اسی راستے سے فرار ہوا ہوگا۔ میں نے اللہ کا نام لیا اور اس خلا میں اتر گیا جس کی چھت کافی جھکی ہوئی تھی۔ یہ

ایک سرنگ نما خلا تھا۔ میں نے اس میں جھکے جھکے دوڑتے ہوئے۔ میجر باجوہ سے رابطہ کرکے انہیں اس تہ خانے کے بارے میں آگاہ کیا اور سرنگ میں اپنا سفر جاری رکھا۔ سرنگ سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی... محسوس ہورہی تھی۔ سرنگ گہری ہونے کے باعث مجھے رفتہ رفتہ اس میں آکسیجن کی کمی کا بھی احساس ہونے لگا۔ مگر میں نے ہمت نہیں ہاری۔ ایک خدشہ یہ بھی پریشان کرنے لگا تھا کہ کہیں آگے جا کر اپنے اختتام پر یہ سرنگ بند نہ کردی گئی ہو۔ لیکن میرا نہیں خیال تھا کہ ...وزیر جان کے پاس اتنا وقت ہوگا کہ وہ سرنگ کا سرا بند کرنے کی تگ ودو کرتا۔ جلد ہی میرا یہ خیال درست ثابت ہوا۔ بائیں جانب مڑتے ہی مجھے ذرا دور ہی روشنی کی مدوّر سی جھلک دکھائی دی۔ میری رفتار تیز ہوگئی۔ میری سانس بری طرح پھولی ہوئی تھی اور جسم پسینے میں نہا گیا تھا۔ آکسیجن کی کمی اور ڈی ہائیڈریشن کے باعث میں اپنے اندر نا طاقتی بھی محسوس کرنے لگا تھا۔ لیکن ایک عزم اور حوصلے نے مجھے چٹان بنا رکھا تھا۔ اور میری قوتِ ارادی کو اس پُرغیظ ولولے نے مہمیز کر رکھا تھا کہ میں نے اپنے ان دونوں ازلی دشمن کو کسی صورت میں بھی بچ کر نہیں جانے دینا ہے۔ ایک میرے بھائی کا قاتل تھا، جو میری بروقت پھرتی کے باعث، یا ور والوں کی گرفت میں آچکا تھا تو دوسرے نے میری ماں کے ساتھ دھوکا کیا تھا اور اسے بے یار و مددگار چھوڑا تھا۔ وہ ابھی مفرور تھا۔

یہی وہ آتشِ غیظ تھی جس نے مجھے ڈھنے سے روکے رکھا تھا۔

میں جلد ہی ہانپتا ہوا اس روشن سرے کی طرف آگیا اور یہاں سے تازہ ہوا کے جھونکوں نے میرا استقبال کیا تو حواس بھی کچھ معمول پہ آنے لگے۔ میں نے رائفل پھینک دی، پستول میری بیلٹ میں اڑسا ہوا تھا۔ میں نے اس تنگ سرے میں اپنے دونوں ہاتھ پھنسائے اور باہر آزاد فضا میں ابھر آیا۔

سپیدۂ سحر نمودار ہونے لگا تھا۔ اطراف کا جائزہ لینے پر مجھے حدِ نگاہ بنجر زمین اور ٹیلوں ٹبوں کے سوا کچھ نظر نہیں آیا۔ زمین پر بھربھری مٹی پھیلی ہوئی تھی۔ میرا ذہن تیزی سے کام کررہا تھا۔ ایک لمحے کو میں نے سوچا۔ اگر وزیر جان یہاں سے فرار ہوا بھی ہوگا تو وہ ابھی زیادہ دور نہیں جاسکتا تھا۔ کیونکہ مجھے زمین کا جائزہ لینے پر کسی گاڑی کے ٹائروں کے نشان نظر نہیں آئے تھے۔ البتہ قدموں کے نشانوں نے مجھے ضرور چونکا دیا، جس کا مطلب تھا کہ میں بالکل صحیح سمت پر جا رہا تھا۔ میں انہی قدموں کے نشانات کی راہ نمائی میں آگے بڑھ گیا اور تقریباً دوڑ لگادی۔

اس سلسلے میں، میں نے فون پر میجر ریاض باجوہ کو ''لیڈ'' کرنا ضروری سمجھا تھا۔ اگرچہ وہ اس طرح میرے وہاں سے اچانک نکل جانے کا مطلب سمجھ چکے تھے۔ بہرطور انہیں اس جگہ کے محلِ وقوع سے آگاہ کرنے کے بعد میں قدموں کے نشانات کی راہ نمائی میں آگے بڑھتا رہا۔ بلیک کوبرا فائل میرے سینے سے لگی ہوئی تھی اور میں بہ دستور آگے بڑھتا جا رہا تھا۔

ایک مقام پر مجھے قدموں کے نشانات بائیں جانب کو مڑتے محسوس ہوئے، یہاں میں رکا اور جھک کر بہ غور کھوجیوں کی طرح قدموں کے نشانات کی ''ہیئت'' بھانپنے لگا۔

یہاں قدموں کے نشانات کچھ گڈمڈ سے ہوتے محسوس ہورہے تھے۔ لگتا ایسا ہی تھا جیسے یہاں پہنچ کر کوئی تھوڑی دیر کے لیے رکا تھا اور پھر اس نے یک دم اپنا راستہ بدل لیا تھا لیکن چند قدموں کے بعد پھر وہ رک کر ذرا ٹھہرا اور پھر پلٹ کر دوسری سمت چل پڑا تھا۔ یہ اس بات کا واضح اشارہ تھا کہ فراری اگر تو وزیر جان ہی تھا تو اسے راستے کا تعین کرنے میں مشکل پیش آرہی ہوگی، وہ بس اپنی جان بچانے کے لیے جس طرح بے سروسامانی کی حالت میں نکلا تھا تو جہاں اس کا منہ ہوا، وہ اس طرف نکل گیا تھا۔ ایسے شکار کو چھاپنا، کچھ زیادہ مشکل بھی نہیں ہوتا۔

یہ سوچ کر ابھی میں نے اپنے قدم آگے بڑھائے ہی تھے کہ مجھے اپنے عقب سے ایک گاڑی آتی دکھائی دی۔ یہ مخصوص، موٹے اور چوڑے ٹائروں والی جیپ تھی، اس میں میجر باجوہ اور چار ساتھی بھی براجمان تھے، ان میں دو اول خیر اور شکیلہ تھے۔ جنہیں عمارت سے باہر تعینات کیا گیا تھا۔ جبکہ زخمیوں کو اسپتال بھجوا دیا گیا تھا۔

مجھے وہاں دیکھ کر وہ سب نیچے اتر آئے اور میرے ایما پر وہ بھی قدموں کے نشانات کا تعین کرنے میں مصروف ہوگئے۔

اس کے بعد ہم سب جیپ میں سوار ہوئے اور روانہ ہوگئے۔ ہم پُرامید تھے کہ ہمارا آخری شکار وزیر جان زیادہ دور نہیں گیا تھا اور کسی بھی لمحے وہ ہمارے نرغے میں آنے والا تھا۔ بشرطیکہ وہ وہی تھا۔

**خونی رشتوں کی خودغرضی اور پرائے بن جانے والے اپنوں کی بے غرض محبت میں پرورش پانے والے نوجوان کی سنسنی خیز سرگزشت کے مزید واقعات آئندہ ماہ**

# ہتھکڑی

### سیریناراض

مطمئن اور پُرلطف زندگی گزارنے والے ایک مصنف کی روداد... گمنام رہتے ہوئے اپنی کہانیوں کے لیے کردار کھوجنا اس کا کام اور شوق تھا... وہ خاموشی اور سکون کی طلب میں شور ہنگاموں سے دور رہنا چاہتا تھا... مگر تقدیر نے اسے ایک حادثے کا گواہ بنادیا...

**قتل کی ایک فنکارانہ واردات کا قصہ... مجرم نے اپنا کردار بڑے سبھاؤ سے نبھایا تھا...**

جائے وقوعہ کے گرد پولیس نے پیلے رنگ کا ٹیپ لگا کر اس پر بورڈ لگا دیا تھا۔ میں نے ٹیپ تھوڑا سا اوپر اٹھایا اور باہر آگیا حالانکہ میں اس حد کو پار نہیں کر رہا تھا پھر بھی ایک باوردی پولیس والے نے اپنا بھاری ہاتھ میرے کندھے پر رکھتے ہوئے کہا۔ ”انسپکٹر کسی وقت بھی یہاں آسکتا ہے۔“

”بیس منٹ سے یہی کہا جا رہا ہے۔“ میں نے منہ بناتے ہوئے کہا اور پول کی جانب روانہ ہوگیا۔ اس وقت

آٹھ بج رہے تھے اور میرے علاوہ وہاں دوسرا سویلین پیراڈیسو کا جنرل منیجر تھا۔ اس نے بڑی ہوشیاری اور کامیابی سے یہ بندوبست کرلیا تھا کہ انسپکٹر کے آنے سے پہلے طبی عملہ لاش کو وہاں سے ہٹا دے۔ ممکن ہے کہ اس سلسلے میں اس نے خوشامد کے ساتھ رشوت کا بھی سہارا لیا ہو کیونکہ لاش کی وہاں زیادہ دیر تک موجودگی ہوٹل میں مقیم مہمانوں کے لیے بے چینی کا سبب بن سکتی تھی۔ اس کی یہ تدبیر کارگر رہی اور ایمبولینس کے روانہ ہوتے ہی سب مہمان اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔

مسز آرنلڈ پول کے کنارے بید کی کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے اپنے پاؤں کرسی کے نیچے موڑ رکھے تھے جس سے اس کا منحنی جسم مزید چھوٹا لگ رہا تھا۔ ایک پولیس والا اس سے کچھ فاصلے پر کھڑا ہوا تھا۔ میں نے ایک کرسی گھسیٹی اور اس پر بیٹھ گیا۔ اس نے مجھے دیکھا اور بولی۔

”تم ہی وہ شخص ہو جس نے بینوئٹ کی لاش دیکھی تھی؟“

”ہاں، مجھے اس کے مرنے کا بہت افسوس ہے۔“

”کیا اس نے مرنے سے پہلے کچھ کہا تھا؟“

”نہیں۔“

مجھے یوں لگا جیسے وہ یہ سن کر پُرسکون ہو گئی ہو لیکن میں فوری طور پہ اس کی وجہ جاننے سے قاصر تھا۔

”لیکن تم اسے جانتے تھے۔ کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟“

”ہماری ایک دو مرتبہ بات چیت ہوئی تھی۔“ میں نے اسے اپنے ہنی مون کے بارے میں بتایا۔ جب میں ایک نوآموز مصنف تھا۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ کیا میں جم کوننگ ہوں لیکن میں نے کہا نہیں۔ یہ محض اتفاق ہے کہ میری کہانی اس سے ملتی جلتی ہے۔“

”وہ یہاں آکر بہت خوش تھا۔“ یہ کہتے ہوئے مسز آرنلڈ کی آواز بھرا گئی۔

میں نے اپنا ایک ہاتھ اس کے بازو پر رکھا اور دوسرے ہاتھ سے بریسلیٹ نکالا۔ مجھے اطمینان تھا کہ میری پشت پولیس والے کی طرف ہے اور وہ مجھے نہیں دیکھ رہا۔ مسز آرنلڈ کی آنکھوں میں چمک ابھری اور اس نے جلدی سے وہ بریسلیٹ پکڑ لیا۔ انگلی سے اس کے ٹوٹے ہوئے جوڑ کو چھوا اور اسے اپنی جیب میں ڈال لیا۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ یہ بریسلیٹ اس کے لیے بہت اہم ہے۔

”یہ تمہیں کہاں سے ملا مسٹر کوننگ؟“

”تم مجھے صرف جم کہہ سکتی ہو۔“

”تمہارے شوہر کی لاش کے پاس ہی پڑا ہوا تھا۔“

”اوہ، اسے میں اپنی خوش قسمتی ہی کہوں گی کہ یہ کسی اور کے ہاتھ نہیں لگا۔ کیا میں تم سے یہ کہہ سکتی ہوں کہ یہ بات ہم دونوں کے درمیان ہی رہے۔ کسی اور کو اس کا علم نہ ہو۔“

”کیوں؟“

”اگر یہ پولیس والوں کے ہاتھ لگ گیا تو...“ وہ کہتے ہوئے رک گئی پھر بولی۔ ”مجھے یہ کہتے ہوئے اچھا نہیں لگ رہا لیکن یہاں نسلی تعصب بہت زیادہ ہے۔“

”تمہیں ڈر ہے کہ وہ اسے اپنے پاس رکھ لیں گے کیونکہ یہ بہت قیمتی ہے۔“

”ہاں۔“

یہ کہہ کر اس نے اپنا ہاتھ میرے بازو پر رکھ دیا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، ہم نے سائرن کی آواز سنی اور ایک دوسری پولیس کار ہوٹل کے سامنے آکر رک گئی۔ چند سیکنڈ بعد اس میں سے ایک چھوٹے قد کا فربہ انداز شخص برآمد ہوا جس نے سر پر بیس بال کیپ پہن رکھی تھی۔ میں نے مسز آرنلڈ کی گرفت سے اپنا بازو چھڑایا اور کھڑا ہو گیا۔

”تمہارا بہت بہت شکریہ۔“ اس نے کہا اور تالاب کے پانی پر نظریں جما دیں۔ میں دوبارہ جائے واردات پر آگیا جبکہ وہاں کوئی واردات نہیں بدقسمتی سے ایک حادثہ پیش آیا تھا۔

چھوٹے قد کا پولیس واا میرے پاس آکر بولا۔

”میں انسپکٹر سوزا ہوں۔ تم نے ہی لاش دریافت کی تھی؟“ اس نے اپنی نوٹ بک دیکھنے کے بعد کہا۔ ”مرنے والے کا نام بینوئٹ آرنلڈ ہے۔ کیا میں صحیح کہہ رہا ہوں؟“

”ہاں، بالکل صحیح ہے۔ تمہاری انگریزی بہت اچھی ہے انسپکٹر۔“

”شکریہ۔ میرے کچھ رشتے دار شکاگو میں رہتے ہیں۔ گوکہ میں خود امریکا کو پسند نہیں کرتا۔ تم نے کس وقت لاش دیکھی تھی؟“

”ساڑھے سات بجے کے قریب۔ میں سات بج کر پچیس منٹ پر ہوٹل سے روانہ ہوا تھا اور وہاں سے یہ فاصلہ پانچ منٹ کا ہے۔“

”تمہیں ایمبولینس بلانے کے لیے استقبالیہ کاؤنٹر تک جانے میں کتنی دیر لگی؟“

”چند منٹ۔“

”کیا تم نے لاش کا معائنہ کیا تھا؟“

''ہاں، میں نے اس کی نبض دیکھی تھی۔ یہ معلوم کرنے کے لیے کہ وہ زندہ ہے یا مر گیا۔''

''تم نے اس کے بدن کو ہاتھ نہیں لگایا؟''

''نہیں، وہ مر چکا تھا۔''

اس کے بعد انسپکٹر نے مجھ سے عام نوعیت کے سوالات کیے۔ مثلاً میرا پتا، پیشہ، روانگی کی تاریخ وغیرہ وغیرہ۔

ساڑھے آٹھ بجے کے قریب اس کے سوالات کا سلسلہ ختم ہوا اور اس نے مجھے جانے کی اجازت دے دی۔ میں اپنے ہوٹل واپس آ گیا۔ شارلین پیچھے کی میز پر بیٹھی وائن سے شغل کر رہی تھی اور اس کی نظریں ایک جوان جوڑے پر تھیں جو ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے بیٹھا ہوا تھا۔ میں اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا اور اپنے لیے ایک مشروب کا آرڈر دے دیا۔

''کیسا رہا؟'' اس نے میری طرف دیکھے بغیر کہا۔ وہ فکرمند نظر آ رہی تھی اور مجھے اس کا یہ انداز اچھا لگ رہا تھا۔

''وہ مجھے گھسیٹنے کی کوشش کر رہا تھا اور اس نے بار بار ایک ہی طرح کے سوال کیے۔''

''ممکن ہے کہ وہ تمہارا کوئی جھوٹ پکڑنے کی کوشش کر رہا ہو۔''

اس کی یہ بات بُری ضرور لگی پھر بھی میں نے کچھ نہیں کہا اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا لیکن اس نے اپنا ہاتھ پیچھے کرتے ہوئے کہا۔ ''کیا یہ افسوسناک نہیں ہے؟''

''ہاں، کوئی فرانسیسی ہی چھٹیوں کے دوران میں بالکونی سے گرنے کے بارے میں سوچ سکتا ہے۔''

''یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ کسی نے اسے دھکا دیا ہو؟''

''میں نے بھی اس بارے میں سوچا تھا۔ وہ بھی زیادہ تر یورپین کی طرح ٹپ دینے کے معاملے میں کنجوس تھا لیکن اتنا بُرا بھی نہیں کہ کوئی ملازم محض اس وجہ سے اسے کھڑکی سے نیچے پھینک دے۔''

''تم کتنی خوفناک باتیں کر رہے ہو۔'' وہ جھرجھری لیتے ہوئے بولی۔

''چلو جانے دو۔ ڈنر کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

''میں کھانا کھا چکی ہوں اور ویسے بھی تمہاری عادی نہیں ہونا چاہتی۔''

''کیوں، میں کوئی خطرناک شخص نہیں ہوں۔ میں نے صرف اس کی لاش دیکھی تھی۔ اسے قتل نہیں کیا۔''

''میرا یہ مطلب نہیں تھا اور تم یہ بات اچھی طرح جانتے ہو۔''

اگلے روز میں اور شارلین ساحلِ سمندر پر گئے اور اسے پیراکی کے لباس میں دیکھ کر میرے ذہن سے بریسلیٹ کا خیال نکل گیا۔ اپنے کمرے میں واپس آیا تو مجھے فون پر ایک پیغام ملا۔ میں نے بٹن دبایا تو انسپکٹر کی آواز کمرے میں گونجنے لگی۔ ''مجھے تم سے مزید کچھ سوالات کرنے ہیں۔ براہِ کرم کل صبح آٹھ بجے پولیس اسٹیشن آ جاؤ۔ میں گاڑی بھیج دوں گا۔''

اس نے مجھے سوچنے کے لیے تقریباً چوبیس گھنٹے کا وقت دے دیا تھا اور میں حیران تھا کہ کیا اس نے جان بوجھ کر ایسا کیا ہے۔ اس رات بھی شارلین کے ساتھ ڈنر کرتے ہوئے میں اسی بارے میں سوچتا رہا۔ وہ مجھے اپنی بھاوج کی کہانی سنا رہی تھی جو اپنا سب کچھ بیچ کر کینیڈا سے کیلی فورنیا منتقل ہو گئی تھی۔ جب اس نے دیکھا کہ میں اس کی باتوں میں دلچسپی نہیں لے رہا تو وہ حیران ہوتے ہوئے بولی۔ ''کیا بات ہے؟ کس سوچ میں گم ہو؟''

''نہیں، میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' میں نے سنبھلتے ہوئے کہا۔ ''کیا تم نے کبھی غور کیا کہ چھٹیوں میں ذہن پر زیادہ بوجھ رہتا ہے مثلاً آپ کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ کیا کام پڑنے والا ہے۔''

''تم کیا کام کرتے ہو؟''

''میں تمہیں پہلے ہی بتا چکا ہوں۔''

''جانتی ہوں لیکن میں نے کچھ اور سنا ہے۔ سوئمنگ پول پر باتیں ہو رہی تھیں کہ تم ایک مشہور مصنف ہو اور فرضی نام سے سفر کر رہے ہو۔ کیا واقعی ایسا ہے؟''

''نہیں، میں پرانی کشتیاں فروخت کرتا ہوں۔''

''ایک ایسے شہر میں جہاں کوئی سمندر نہیں ہے۔''

''کیا کبھی تم نے گریٹ میک کا نام سنا ہے؟''

☆☆☆

جمعے کی صبح آٹھ بج کر دو منٹ پر ایک سیاہ کار ہوٹل کے دروازے پر آ کر رکی۔ اس کے برابر میں ایک ٹیکسی ڈرائیور اپنی گاڑی میں بیٹھا اونگ رہا تھا جبکہ اطراف میں کچھ پرندے دانہ چگ رہے تھے۔ ہوٹل کے داخلی دروازے پر سناٹا تھا اور گرمی کی وجہ سے سانس لینا دشوار ہو رہا تھا۔ ڈرائیور نے انگوٹھے سے عقبی نشست کی طرف اشارہ کیا اور میں وقت ضائع کیے بغیر گاڑی میں سوار ہو گیا۔ وہ تنگ سڑکوں پر تیزی سے گاڑی دوڑاتا ہوا چند منٹوں میں پولیس اسٹیشن پہنچ گیا جو کہ وسط شہر میں واقع تھا۔ اس کے ایک جانب زیرِ آب تیراکی کا دفتر اور دوسری جانب سی فوڈ

ریستوران تھا۔ اندر کا موسم باہر سے بھی زیادہ گرم تھا اور پنکھے کی ہوا بھی ناکافی معلوم ہو رہی تھی۔

انسپکٹر ایک چھوٹے سے کمرے میں چھوٹی سی میز کے پیچھے بیٹھا ہوا تھا اور اس کی بیس بال کیپ عقب میں رکھے کوٹ ریک پر ٹنگی ہوئی تھی۔ وہ مجھے دیکھ کر مصافحہ کرنے کے لیے کھڑا ہو گیا لیکن اس کے چہرے پر مسکراہٹ نہیں تھی۔

’’اسے، میرے خدا! بہت گرمی ہے۔ بہت سے غیر ملکی سیاح اسے برداشت نہیں کر سکتے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ جنت میں جانے کی قیمت ہے۔‘‘

مجھے مسٹر آرنلڈ کا خیال آیا جو قبر کی گہرائی میں آرام سے لیٹے ہوں گے۔

’’تم حیران ہو رہے ہو گے کہ میں تم سے دوبارہ کیوں بات کرنا چاہتا ہوں؟‘‘ انسپکٹر نے کہا۔

’’حیرانی کی بات ہی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ یہ باتیں تم نے ہوٹل میں ہی کیوں نہیں کر لیں۔‘‘

’’ہوٹل میں پوچھے جانے والے سوالات رسمی نوعیت کے تھے۔‘‘ انسپکٹر یہ کہہ کر خاموش ہو گیا جیسے وہ مناسب الفاظ تلاش کر رہا ہو۔ ’’ہم ضرورت سے زیادہ اس جزیرے پر آنے والے سیاحوں کو پریشان کرنا نہیں چاہتے لیکن جب کوئی جرم سرزد ہوتا ہے تو ہمیں تفتیش کرنا پڑتی ہے، چاہے وہ کوئی بھی رخ اختیار کرے۔ پولیس کا کام بالکل ایسا ہے جیسے کسی آوارہ عورت سے محبت کی جائے۔ آپ بھی نہیں جان سکتے کہ وہ آپ کو کہاں لے جائے گی۔‘‘

میں نے جواب میں کچھ نہیں کہا۔

’’تم نے مسٹر آرنلڈ کی لاش کب دیکھی؟‘‘

’’تقریباً ساڑھے سات بجے کا وقت ہو گا۔ میں نے الباٹروس سے نکلتے وقت گھڑی دیکھی تھی۔ سات بج کر پچیس منٹ ہوئے تھے اور وہاں تک آنے میں مجھے پانچ منٹ لگے ہوں گے لیکن یہ سب میں پہلے بھی بتا چکا ہوں۔‘‘

’’تمہیں ایمبولینس کو فون کرنے کے لیے استقبالیہ تک پہنچنے میں کتنا وقت لگا؟‘‘

’’چند منٹ سے زیادہ نہیں۔‘‘

’’کیا تم نے لاش کا معائنہ کیا تھا؟‘‘

’’تمہارا مطلب ہے کہ میں نے اس کی جیبوں کی تلاشی لی ہو گی کہ شاید کچھ پیسے مل جائیں، نہیں۔ میں نے یہ حرکت نہیں کی۔‘‘ میں نے برہمی سے کہا۔

’’ناراض ہونے کی ضرورت نہیں مسٹر کوننگ۔ یہ ایک عام سا سوال ہے۔‘‘

’’جس کا جواب میں دو دن پہلے دے چکا ہوں۔ اب ان باتوں کو دہرانے کی ضرورت کیوں پیش آ رہی ہے۔ کیا تمہیں کوئی سراغ مل گیا ہے؟‘‘

اس نے میری بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ’’لاش دیکھنے کے بعد تم سیدھے استقبالیہ کاؤنٹر پر گئے تھے؟‘‘

’’ہاں، میں نے ایسا ہی کیا تھا۔ میں تمہارے اگلے سوال کا جواب بھی دے رہا ہوں۔ میں نے جائے وقوعہ پر کسی اور شخص کو نہیں دیکھا۔‘‘

’’میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ ناراض ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ ایک معمول کی کارروائی ہے۔‘‘

’’کیا تمہیں کوئی نئی بات معلوم ہوئی ہے اسی لیے تم مجھ سے یہ سوالات دوبارہ پوچھ رہے ہو؟‘‘

’’میں کسی ایسے سیاح سے تفتیش کے بارے میں گفتگو نہیں کرتا جو خود اس میں ملوث ہو۔‘‘

’’میں قطعی طور پر اس واقعے میں ملوث نہیں ہوں۔ یہ میری بدقسمتی تھی کہ میں نے اس حادثے کے شکار شخص کی لاش دیکھی۔‘‘

’’گویا تمہارے خیال میں وہ ایک حادثہ تھا؟‘‘ انسپکٹر نے معنی خیز انداز میں کہا۔

’’بالکل میں یہی سمجھتا ہوں کہ وہ ایک حادثہ تھا جب تک کہ یہ نہ سوچا جائے کہ اس کی بیوی نے انشورنس میں ملنے والی بھاری رقم کی خاطر اسے کھڑکی سے دھکا دیا ہو گا۔‘‘

’’یہ واقعہ اس طرح پیش نہیں آیا جیسا کہ تمہارے ناولوں میں ہوتا ہے۔‘‘

میں نے اس کے جواب میں کچھ نہیں کہا۔

’’تم نے مجھے یہ کیوں نہیں بتایا کہ تم ایک مشہور جاسوسی ناول نگار ہو؟‘‘

’’میں نے بدھ کے روز یہ تمہیں بتا دیا تھا کہ ایک مصنف ہوں۔‘‘

’’شاید ڈر رہے تھے کہ ہوٹل میں قیام کرنے والے دوسرے مہمان تمہیں پہچان لیں گے؟‘‘

’’نہیں، میں تعطیلات کے دنوں میں کام گھر پر ہی چھوڑ کر آتا ہوں۔ اگر لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ میں ایک کامیاب مصنف ہوں تو وہ مجھ سے زیرِ تکمیل کہانیوں کے بارے میں پوچھنا شروع کر دیتے ہیں۔‘‘

’’جیسا کہ مسز آرنلڈ نے کیا؟‘‘ انسپکٹر نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

’’تم کہنا کیا چاہ رہے ہو؟‘‘

"تم وقوعہ کے بعد مسز آرنلڈ سے باتیں کر رہے تھے۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ تمہاری گفتگو کا موضوع کیا تھا؟"

"درحقیقت ہمارے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی۔ ہم تمہارے آنے کا انتظار کر رہے تھے۔ اس دوران میں اسے تسلی دیتا رہا۔"

"جس طرح تم کینیڈا سے آئی ہوئی عورت کا دل بہلاتے رہتے ہو۔"

اس کا اشارہ واضح طور پر شارلین کی طرف تھا۔ مجھے حیرت تو ہوئی لیکن میں نے اس کا اظہار نہیں کیا۔

"تمہارے پاسپورٹ سے معلوم ہوا ہے کہ تم نے گزشتہ برس کے دوران چند مرتبہ فرانس کا دورہ کیا۔ کیا تم مسز آرنلڈ کو پہلے سے جانتے تھے؟"

میں نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ "اگر تم مجھ سے کچھ اگلوانے کی کوشش کر رہے ہو تو میں یہی کہوں گا کہ یہ وقت ضائع کرنے والی بات ہے۔ میں پہلے ہی تمہیں سب کچھ بتا چکا ہوں۔"

"مسٹر کوننگ، مجھے پورا یقین ہے کہ کوئی ایسی بات ضرور ہے جو تم مجھے نہیں بتا رہے لیکن مجھے یہ کہنے دو کہ اس جزیرے پر بھی انصاف ضرور ہوتا ہے۔ چاہے اس کا تعلق کسی غیر ملکی سیاح سے ہی کیوں نہ ہو۔"

یہ کہہ کر وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ یہ گویا اس بات کا اشارہ تھا کہ وہ اپنی بات ختم کر چکا ہے۔ جب میں واپس جانے کے لیے دروازے تک پہنچا تو اس نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "میری بیوی نے تمہاری ایک کتاب پڑھی ہے۔"

"کون سی؟" میں نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔

"دی کوراپ۔"

"اسے یہ کتاب کیسی لگی؟" میں نے پوچھا۔

"وہ نہیں سمجھتی کہ اس میں جو کچھ لکھا ہے، وہ قابلِ یقین ہے۔"

میں غصے میں دروازہ بند کیے بغیر باہر آ گیا۔ واپسی کا سفر اور زیادہ تکلیف دہ تھا۔ پچھلے ایک گھنٹے کے دوران میں گرمی اور زیادہ بڑھ گئی تھی لیکن میری پریشانی کی وجہ کچھ اور تھی۔ انسپکٹر سمجھ رہا تھا کہ میں اس سے کچھ چھپا رہا ہوں لیکن اسے بریسلیٹ کے بارے میں کیسے معلوم ہوا؟ کیا اسے یقین ہے کہ میرے اور مسز آرنلڈ کے درمیان کوئی تعلق ہے؟ کیا کسی نے مجھے اس رات وہاں دیکھا تھا؟ نہیں۔ اگر کسی نے دیکھا ہوتا تو انسپکٹر مجھ سے مختلف انداز میں گفتگو کرتا۔ اب مجھے پچھتاوا ہو رہا تھا۔ کاش میں نے وہ بریسلیٹ مسز آرنلڈ کے بجائے پولیس کو دے دیا ہوتا۔ ممکن ہے کہ انسپکٹر اس بیوہ کے پاس میری موجودگی کو غلط رنگ میں دیکھ رہا ہو اور مجھے انصاف کی راہ میں رکاوٹ ڈالنے کے الزام میں گرفتار کرے۔

انسپکٹر نے میری خاصی بے عزتی کر دی تھی۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ مجھ جیسے امیر امریکی کو تیسری دنیا کے پولیس اسٹیشن میں بلانا مجھے توڑنے کے لیے کافی ہوگا۔ میں سمجھتا ہوں کہ کسی بھی معقول شخص کے لیے یہ رویہ ناقابلِ برداشت تھا۔

ہوٹل پہنچ کر میں سیدھا اپنے کمرے میں گیا اور پانچ منٹ بعد دروازے کو تالا لگا کر اوپری منزل پر واقع مسز آرنلڈ کے سوئٹ میں چلا گیا۔ ایک کرخت چہرے والی نرس نے دروازہ کھولا جسے ہوٹل والوں نے مسز آرنلڈ کی خدمت پر مامور کیا تھا۔ وہ مجھے اندر نہیں آنے دے رہی تھی اور میرے ہسپانوی بولنے کے باوجود اس نے اپنے کھردرے ہاتھ سے میرا راستہ روک دیا۔ میں چند لمحے وہاں کھڑا رہا تبھی مسز آرنلڈ کی آواز سنائی دی۔ نرس نے میرے لیے راستہ چھوڑ دیا اور میں اس کے پاس سے گزرتا ہوا اندر چلا گیا۔

مسز آرنلڈ ایک صوفے پر لیٹی ہوئی تھی اور اس کے کمزور جسم پر ایک پتلا کمبل پڑا ہوا تھا۔ اس نے سر کے نیچے

## احتیاط

لڑکا اور لڑکی پارک کے ایک گوشے میں بنچ پر دیر سے خاموش بیٹھے ہوئے تھے یا ادھر ادھر کی باتیں کر رہے تھے۔ لڑکے میں کسی پیش دستی کا حوصلہ تھا نہ ہمت۔

اسی دوران میں کتوں کا ایک جوڑا آوارہ گردی کرتا ہوا وہاں آنکلا۔ کتے نے سونگھتے سونگھتے کتیا کی تھوتھنی سے منہ لگایا تو لڑکے کو فوری ایک بہانہ سوجھ گیا۔ اس نے جھجکتے ہوئے لڑکی سے کہا۔ "تم برا نہ مانو تو میں بھی..."

لڑکی نے اس کی بات درمیان سے ہی اچک لی اور بولی۔ "ہاں، ہاں... ضرور... لیکن احتیاط سے... کہیں کتیا تمہارا منہ نہ نوچ لے۔"

حمیرا اقبال، کراچی

دو تکیے رکھے ہوئے تھے۔ میں نے اسے پہلی بار غور سے دیکھا۔ وہ درمیانی عمر سے بھی زیادہ کی لگ رہی تھی۔ اس کی نظریں چھت پر جمی ہوئی تھیں۔ جب میں کمرے میں داخل ہوا تو وہ بولی۔

"اوہ، یہ تم ہو جم۔ کتنا اچھا لگ رہا ہے کہ تم مجھے دیکھنے آئے۔ تم واقعی ایک شریف انسان ہو۔"

نرس نے میرا بازو پکڑا اور ہسپانوی زبان میں احتجاج کرنے لگی لیکن مسز آرنلڈ نے سر کے اشارے سے اسے باہر بھیج دیا۔

میں کافی کی میز پر بیٹھ گیا۔ وہاں چائے کی آدھی پیالی اور کچھ نیپکن رکھے ہوئے تھے۔ میں نے انہیں ایک طرف کرتے ہوئے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

"تم پہلے شخص ہو جو مجھ سے ملنے آئے اور یہ نہیں پوچھا کہ میں کیسی ہوں۔" مسز آرنلڈ نے کہا۔

"مجھے رسمی گفتگو پسند نہیں۔" میں نے جواب دیا۔

"میرے شوہر کو بھی یہ پسند نہیں تھا اسی لیے وہ تم سے باتیں کر کے بہت خوش ہوتے تھے۔"

"میں تم سے اسی کے بارے میں بات کرنا چاہ رہا تھا۔"

"بینوئٹ ان لوگوں میں سے نہیں تھا جو اپنے جذبات کا اظہار کر سکیں لیکن میں جانتی تھی کہ وہ کیا محسوس کرتا ہے۔ پینتیس سال ساتھ گزارنے کے بعد ایک بیوی اپنے شوہر کو اچھی طرح سمجھنے لگتی ہے اور وہ آپس میں بہت کم بات کرتے ہیں۔ کیا تم شادی شدہ ہو جم؟"

"میری ایک شادی ہوئی تھی۔" میں نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔

"پھر کیا ہوا؟"

"ہمارے درمیان ایسا تعلق قائم نہ ہو سکا کہ تمہاری طرح سکون سے خاموشی کی زبان میں گفتگو کر سکیں۔ ہم دونوں بہت اونچی آواز میں گفتگو کرتے تھے اور ہمیشہ لڑتے رہتے تھے۔"

"اوہ، اب میں سمجھی۔" اس نے ایک نیپکن اٹھایا اور آنکھیں صاف کرتے ہوئے بولی۔ "اگلے سال ہماری شادی کی پینتیسویں سالگرہ ہونے والی تھی۔ ہم اس موقع پر یونان جانے کا پروگرام بنا رہے تھے۔"

میں نے اسے رونے دیا۔ جانتا تھا کہ کچھ کہنا بیکار ہوگا۔ جب اس کی حالت سنبھلی تو میں نے کہا۔

"مسز آرنلڈ! میں ابھی ابھی پولیس اسٹیشن سے واپس آ رہا ہوں۔ انسپکٹر نے مجھے دوبارہ بات کرنے کے لیے بلایا تھا۔"

اگر وہ یہ سن کر حیران ہوئی ہوگی تب بھی اس نے ظاہر نہیں کیا اور بولی۔ "کیوں؟"

"لگتا ہے کہ اسے مجھ پر شک ہے کہ میں نے اسے وہ چیز نہیں دی جو پولیس کو دینی چاہیے تھی۔"

"وہ بے وقوف ہے اور اکیلے ہی سب چیزوں پر قبضہ کرنا چاہتا ہے۔"

"میں خود بھی یہی سوچ کر حیران ہو رہا ہوں۔"

مسز آرنلڈ آنکھیں سکیڑتے ہوئے بولی۔ "کیونکہ وہ ان چیزوں سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ بہت سے مقامی لوگ سیاحوں سے نفرت کرتے ہیں کیونکہ ان کے خیال میں ہم امیر لوگ ہیں۔"

"تو یہ بات ہے؟" میں نے کہا۔

"وہ بینوئٹ کا کیمرا بھی لے گیا۔ کیا اس نے یہ بات تمہیں بتائی؟"

"نہیں، اس نے کچھ نہیں بتایا اور نہ ہی مجھے کوئی بات بتائے گا۔"

اس کے چہرے پر نرمی آگئی اور وہ بولی۔ "یقیناً نہیں۔ پولیس والوں کا کام صرف سوالات کرنا ہوتا ہے۔"

"وہ کیمرا کیوں لے گیا؟" میں نے پوچھا۔

"کیونکہ وہ ایسا کر سکتا تھا۔" وہ تلخ لہجے میں بولی۔

"تم مجھے بتاؤ کہ بینوئٹ کے کیمرے کا اس واقعے سے کیا تعلق ہے۔ وہ بہت قیمتی کیمرا تھا جو میں نے اس کی سالگرہ پر اُسے دیا تھا۔"

نرس ایک ٹرے ہاتھ میں پکڑے کمرے میں داخل ہوئی جس میں سوپ اور پانی کا گلاس رکھا ہوا تھا۔

"یہ میرا سوپ پینے کا وقت ہے۔ مجبوراً مجھے تم سے جانے کے لیے کہنا پڑے گا۔"

میں دروازے کی طرف بڑھا اور باہر جانے سے پہلے مڑ کے دیکھا۔ مسز آرنلڈ بڑی مشکل سے اٹھ کر بیٹھی تھی، اس نے ٹرے اپنی رانوں پر رکھ لی۔ ایک چمچہ اٹھایا اور اس سے سوپ پینے لگی۔

میں نے صبح کا بقیہ حصہ سوئمنگ پول پر گزارا، اور دو انگریز بچوں کو فٹ بال کھیلتے دیکھتا رہا جب اکتاہٹ محسوس ہونے لگی تو شارلین کے بنگلے کی طرف روانہ ہو گیا۔ دروازے کی گھنٹی بجائی اور جواب کا انتظار کیے بغیر اندر

READING Section
WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN

داخل ہو گیا۔ وہ اپنے بستر پر پیٹ کے بل لیٹی ہوئی تھی اور اس نے جسم کو ایک بڑے تولیے سے ڈھانپ رکھا تھا۔

''اوہ میرے خدا کتنی گرمی ہے۔ تیز دھوپ میں پورا بدن جھلس کر رہ گیا۔''

''تمہیں اپنے آرام کا خیال رکھنا چاہیے۔'' میں نے اسے چھیڑنے کے لیے کہا۔

''تم آج صبح کہاں گئے تھے؟'' اس نے گردن موڑ کر مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

''ساحل پر گیا تھا۔''

''کیا تم ساحل پر بھی شوفر کے ساتھ جاتے ہو؟''

''تم نے مجھے دیکھا تھا؟''

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے، میں نے نہیں لیکن کسی اور نے ضرور تمہیں دیکھا ہے۔''

''بہت اچھا ہوا کہ ہماری شادی نہیں ہوئی، میں تمہارے ہوتے ہوئے دہری زندگی نہیں گزار سکتا۔''

''یہ کوئی جواب نہیں ہے جبکہ میں نے ابھی کوئی بات بھی نہیں کی۔'' وہ بولی۔ ''کیا اس کا کوئی تعلق مسز آرنلڈ سے ہے؟''

''ممکن ہے۔'' میں نے تیل کی بوتل لے کر اس کی کمر پر مالش کرنا شروع کر دی۔

''میں نے پول پر لوگوں کو باتیں کرتے ہوئے سنا ہے کہ پولیس مسٹر آرنلڈ کی موت کو حادثہ ماننے پر تیار نہیں۔''

''تمہیں یہ بات کس نے بتائی؟''

''تم رونولفو کو جانتے ہو جو ہمارا اسنری کا گائیڈ ہے؟''

''ہاں وہی چھوٹے قد کا آدمی جو اونچی آواز میں بولتا ہے۔''

''اسے باتیں کرنے کا شوق ہے اور اس کا ایک کزن مقامی پولیس میں بھی ہے۔ بظاہر یہی لگتا ہے کہ پولیس کسی ایسے شخص کو تلاش نہیں کر سکی جس نے بدھ کے روز مسز آرنلڈ کو پورے وقت ڈائننگ روم میں دیکھا ہو۔ تم اس سے کیا نتیجہ اخذ کرتے ہو مسٹر مسٹری رائٹر؟''

میں نے یہ دیکھ کر اطمینان کا سانس لیا کہ وہ پیٹ کے بل لیٹی ہوئی تھی اور میرا چہرہ نہیں دیکھ سکتی تھی۔ دوپہر تک شارلین بہتر محسوس کر رہی تھی۔ ہم دونوں وسط شہر گئے اور بندرگاہ کے نزدیک ایک ریستوران میں سی فوڈ پر مشتمل مہنگا ترین کھانا کھایا۔ اس کے بعد سے مجھے انسپکٹر کا کوئی فون موصول نہیں ہوا تھا۔ اتوار والے دن میں اور شارلین ائرپورٹ گئے اور فیصلہ کیا کہ اپنی اپنی منزل پر روانہ ہونے سے پہلے اکٹھے بیٹھ کر کافی پئیں گے۔ اس کے بعد ہم ایک کتابوں کی دکان کے پاس سے گزرے جہاں کتابوں کے سستے ایڈیشن رکھے ہوئے تھے۔ وہ کوئی کتاب خریدنے اندر چلی گئی اور میں باہر کھڑا شوکیس میں رکھی ہوئی کتابوں کو دیکھتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد شارلین باہر آئی اور مجھے ایک کتاب پکڑاتے ہوئے بولی۔ ''ان کے پاس صرف پیپر بیک ایڈیشن ہیں۔ کیا تم اس پر اپنے دستخط کر سکتے ہو؟''

وہ میرا تازہ ترین ناول تھا۔ میں نے اس سے قلم لیا اور فلیپ کے اندرونی حصے پر دستخط کر دیے۔ اس نے وہ تحریر پڑھی اور مسکراتے ہوئے بولی۔ ''تم بہت چالاک ہو۔''

راستے میں ہم نے مسز آرنلڈ کو دیکھا جو اپنی نرس کی مدد سے ہجوم میں سے راستہ بناتے ہوئے آگے بڑھ رہی تھی۔ اس کا سر جھکا ہوا اور کندھے اوپر کو اٹھے ہوئے تھے۔ وہ اس طرح چل رہی تھی جیسے پیر اٹھانے میں بہت زور لگانا پڑ رہا ہو۔

اس کا انداز بالکل ایسا تھا جیسے وہ کسی خطرناک بیماری سے صحت یاب یا گہرے صدمے سے باہر آئی ہو۔ ہم اس گیٹ تک پہنچے جہاں سے شارلین کو رخصت ہونا تھا۔ مجھے یہ منظر کبھی بھی اچھا نہیں لگا۔ ایک دوسرے کو خدا حافظ کہنا اور رابطے میں رہنے کے وعدے کرنا جو کبھی پورے نہیں ہوئے۔

عین اسی وقت اس منحوس انسپکٹر کی شکل دکھائی دی۔ وہ دوڑتا ہوا ہماری طرف ہی آ رہا تھا۔ قریب پہنچ کر اس نے اپنی بیس بال کیپ اتاری اور ماتھے سے پسینہ پونچھنے لگا۔ ''مسز آرنلڈ۔'' اس نے پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان کہا۔

''وہ پہلے ہی جہاز پر سوار ہو چکی ہے۔'' میں نے بورڈ کی طرف اشارہ کیا جس پر جہاز کی روانگی کا نشان چمک رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے اپنے معدے میں گڑبڑ محسوس ہونے لگی۔

''کیا میں تم سے علیحدگی میں بات کر سکتا ہوں؟'' اس نے مجھے تیکھی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''یقیناً۔'' میں نے کہا اور شارلین سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ''تم مجھے چند منٹ دے سکتی ہو؟''

''بالکل۔'' وہ کچھ حیران ہوتے ہوئے بولی۔ ''لیکن

یہ سب کیا ہے؟''

انسپکٹر مجھے دھکیلتا ہوا ایک قریبی میز تک لے گیا۔ میں نے جھنجلاتے ہوئے کہا۔ ''لگتا ہے کہ تم محض مجھے خدا حافظ کہنے نہیں آئے۔''

انسپکٹر نے اپنی جیب سے پیکٹ نکالا اور ایک سگریٹ سلگاتے ہوئے بولا۔ ''میرے لیے یہ کوئی خوشگوار بات نہیں ہے۔'' اس نے اپنی ٹوپی میز پر رکھ دی اور میرے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔ ''اس کیس کے حوالے سے کوئی بات مجھے شروع سے ہی پریشان کر رہی تھی۔ پہلے میں نے مسز آرنلڈ سے بات کی اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ اتنی غمزدہ نہیں تھی جتنا کہ اسے ہونا چاہیے تھا۔ اگر کسی کے شوہر کی موت اس طرح واقع ہو تو بیوی اسے پوری طرح سمجھ نہیں پاتی اور اسے یقین نہیں آتا کہ ایسا ممکن ہے لیکن وہ اس طرح ظاہر کر رہی تھی جیسے اسے اس کی توقع ہو۔''

''تمہیں کیا توقع تھی، اسے کیا کرنا چاہیے تھا۔ وہ دوڑتی ہوئی ہوٹل کی لابی میں آتی اور بال کھول کر آنسو بہانا شروع کر دیتی؟''

''واقعی تم ایک باکمال مصنف ہو مسٹر کوننگ۔ مسز آرنلڈ نے مجھے بتایا کہ اس کا شوہر بیمار تھا اور بدھ کی شام اس کے سر میں درد ہو رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ کوئی سنجیدہ نوعیت کی بیماری بھی ہوسکتی ہے لیکن پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق وہ بالکل صحت مند تھا۔ یہاں تک کہ اس نے شراب بھی نہیں پی رکھی تھی لیکن اس رپورٹ سے مزید کچھ معلوم نہ ہوسکا جب تک کہ میں نے مسٹر آرنلڈ کے ڈیجیٹل کیمرے میں وہ تصویر نہیں دیکھی۔''

''کون سی تصویر؟ اور وہ کیمرا تم اپنے ساتھ کیوں لے گئے تھے؟''

''مسز آرنلڈ نے مجھے بتایا تھا کہ جس وقت اس کا شوہر ڈائننگ روم سے اپنے کمرے میں واپس آیا تو یہ کیمرا اس کے پاس تھا۔ اس لیے میں نے سوچا کہ اسے بھی ایک نظر دیکھ لیا جائے۔''

یہ کہہ کر اس نے اپنی جیب سے فولڈر نکالا اور ایک تصویر میرے سامنے رکھ دی۔ اس میں مسز آرنلڈ پیراڈیسو کے مرکزی ڈائننگ ہال میں ایک میز پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے بایاں ہاتھ اپنی ٹھوڑی اور دایاں ہاتھ میز پر رکھا ہوا تھا اور کلائی میں ایک بھاری سونے کا بریسلیٹ پہن رکھا تھا اور وہ بالکل ایسا ہی تھا جو مجھے مسٹر آرنلڈ کی لاش کے پاس سے ملا تھا۔

''یہ تصویر ڈنر کے دوران لی گئی جس رات مسٹر آرنلڈ کا قتل ہوا۔''

''قتل؟'' میں نے چونکتے ہوئے کہا۔

انسپکٹر نے میرے ردعمل کو نظرانداز کرتے ہوئے ایک اور تصویر نکالی اور اسے مسز آرنلڈ کی تصویر کے برابر میں رکھ دیا۔ اس میں پوسٹ مارٹم کی میز پر ایک بازو نظر آرہا تھا جو یقیناً مسٹر آرنلڈ کا ہی ہوگا۔ میں نے اسے ڈنر جیکٹ کی گہرے نیلے رنگ کی آستین کی وجہ سے پہچان لیا۔ وہ آستین اوپر کو چڑھی ہوئی تھی اور اس کلائی پر بھی ویسا ہی بھاری سونے کا بریسلیٹ نظر آرہا تھا جیسا مجھے مسٹر آرنلڈ کی لاش کے پاس سے ملا اور جسے میں نے اسی رات اس کی بیوی کے حوالے کر دیا تھا۔

''میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا۔'' میں نے معصوم بنتے ہوئے کہا۔

''تمہیں مسٹر آرنلڈ کی لاش کے پاس سے جو بریسلیٹ ملا وہ اس کی بیوی کا تھا اور یہ دونوں بریسلیٹ ایک جیسے ہی تھے۔''

''ایک منٹ۔'' میں جلدی سے بول پڑا۔ ''میں نے کبھی یہ نہیں کہا کہ مجھے مسٹر آرنلڈ کی لاش کے پاس سے کوئی بریسلیٹ ملا تھا۔ تم تو یہ بھی نہیں جانتے کہ ایسا کوئی دوسرا بریسلیٹ بھی تھا۔''

''مجھے اس دوسرے بریسلیٹ کے بارے میں علم ہے کیونکہ میں اسے دیکھ چکا ہوں۔''

''کہاں؟''

''مسز آرنلڈ نے مجھے دکھایا تھا جب میں دوسری مرتبہ اس سے ملنے گیا۔ یہ قتل بدھ کی رات کو ہوا تھا۔ جمعرات کی صبح تم سے پولیس اسٹیشن میں بات کرنے کے بعد میں نے کیمرے میں مسز آرنلڈ کی تصویر دیکھی چنانچہ میں اس سے دوبارہ بات کرنے کے لیے ہوٹل گیا۔ تب اس نے بتایا کہ ڈنر کے دوران اس نے بریسلیٹ اتار دیا تھا کیونکہ اس کی چین نکل گئی تھی۔ اس کا کہنا صحیح ہے۔ چین ضرور الگ ہوئی تھی لیکن اس وقت نہیں۔''

اچانک ہی ائرپورٹ مجھے چھوٹا اور تنگ محسوس ہونے لگا حالانکہ ہم ایک کھلی جگہ پر بیٹھے ہوئے تھے جہاں چھت سے فرش تک کھڑکیاں نصب تھیں۔ انسپکٹر نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے کہا۔ ''اس کا بریسلیٹ ڈنر کے دوران میں الگ نہیں ہوا تھا بلکہ جب اس نے اپنے شوہر کو بالکونی سے دھکا دیا تو اس نے اپنی جان بچانے کی خاطر

بیوی کا بازو پکڑ لیا اور اسی کشمکش میں وہ بریسلیٹ اس کے ہاتھ میں آ گیا۔''

میں وہاں سے اٹھ کر بھاگنا چاہ رہا تھا لیکن میری ٹانگیں پتھر کی ہو گئی تھیں۔ وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''دوسرا سرا میرے ہاتھ اس وقت آیا جب میں نے یہ تصویر دیکھی۔ میرے اسسٹنٹ نے مجھے بتایا کہ ڈائننگ روم میں موجود تمام مہمانوں سے سوالات کرنے کے بعد یہ معلوم ہو گیا کہ مسز آرنلڈ پورے وقت ڈائننگ روم میں موجود نہیں تھی۔ یہ جاننے کے بعد میں ایک اور نتیجہ پر پہنچ گیا۔''

''گویا تم یہ کہہ رہے ہو کہ وہ اپنے شوہر کے پیچھے چلتی ہوئی کمرے تک گئی اور اسے بالکونی سے دھکا دے دیا۔ یہ انتہائی احمقانہ خیال ہے۔''

''اگر اسے احمقانہ سمجھتے ہو تو شاید تم نے اس کی مختلف منصوبہ بندی کی ہو گی۔''

''کیسی منصوبہ بندی۔ تم کیا کہنا چاہ رہے ہو؟''

''مسز آرنلڈ اپنے شوہر کو قتل کرنا چاہ رہی تھی لیکن اسے طریقہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا چنانچہ اس نے تم سے رابطہ کیا کیونکہ تم ایک کامیاب جاسوسی مصنف ہو اور تمہارے ذہن میں اس طرح کے ہزاروں آئیڈیاز رہتے ہیں۔ یقیناً تم ایسا طریقہ جانتے تھے جو قابلِ یقین نظر آئے۔''

''تم یہ کہنا تو نہیں چاہ رہے کہ مسٹر آرنلڈ کی موت سے میرا کوئی تعلق ہے؟''

انسپکٹر نے ایک اور سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ ''تم نے مسز آرنلڈ کو بتایا کہ یہ کام کس طرح کرنا چاہیے اور ساتھ ہی یہ بھی سمجھا دیا کہ جائے وقوعہ سے غیر حاضری ظاہر کرنے کے لیے یہ قتل ڈنر کے دوران ہونا چاہیے جہاں بہت سارے گواہ موجود ہوں گے اور کسی کو بھی ٹھیک طریقے سے یہ یاد نہیں رہے گا کہ ڈنر کے دوران پورے وقت ڈائننگ ہال میں کون موجود تھا اور کون نہیں۔ تم نے اسے یہ مشورہ بھی دیا کہ وہ مسز اینڈرسن سے ضرور بات کرے تاکہ وہ بوڑھی عورت بعد میں بھی اسے یاد کر سکے۔''

''تمہاری کہانی میں بہت جھول ہے اگر فرض کر لیا جائے کہ یہ اس کا منصوبہ تھا تب بھی وہ کیسے یقین کر سکتی تھی کہ اس کا شوہر ڈنر کے دوران میں ضرور اٹھ کر اپنے کمرے میں جائے گا۔''

''ممکن ہے کہ اسی نے آرنلڈ کو یہ کہہ کر کمرے میں بھیجا ہو کہ وہ کوئی چیز بھول آئی ہے اور وہ جا کر اسے لے

کراچی

ماہنامہ پاکیزہ

میں، قاری بہنوں کی دلچسپی کے لیے ایک نیا اور منفرد سلسلہ باتیں بہار و خزاں کی.... پیش کیا جا رہا ہے جس میں ہر قاری بہن دیے گئے سوالوں کے جوابات دے کر شمولیت اختیار کر سکتی ہے۔ آپ کے خیالات و احساسات ہمارے لیے بہت اہمیت رکھتے ہیں۔

تو قارئین آج ہی دسمبر کا

ماہنامہ پاکیزہ

اپنے ہاکر سے بک کروا لیں

آئے اور جب وہ گیا تو وہ بھی اس کے پیچھے پیچھے چل دی۔ تم الباٹروس میں انتظار کر رہے تھے اور یہ انتظار قتل ہونے تک جاری رہا لیکن پھر تمہیں تجسس ہوا یا تم نے محسوس کیا ہوگا کہ مسز آرنلڈ اس صورتِ حال سے نہیں نمٹ سکے گی اور اسے تمہاری مدد کی ضرورت پڑ سکتی ہے لیکن تمہارے پہنچنے سے پہلے آرنلڈ مر چکا تھا۔ مسز آرنلڈ نے تمہیں بتایا کہ گرنے سے پہلے اس کا بریسلیٹ شوہر کے ہاتھ میں آ گیا تھا۔ تم نے اسے واپس ڈائننگ ہال میں جانے کا مشورہ دیا۔ اس سے پہلے کہ کوئی وہاں اس کی غیر موجودگی کا نوٹس لے پھر تم لاش کے پاس گئے اور تمہیں وہ بریسلیٹ مل گیا جو تم نے اسی رات یا شاید بعد میں مسز آرنلڈ کو دے دیا۔“

میرا سر بری طرح چکرا رہا تھا۔ میں نے بمشکل تمام اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ ”میں نے اس سے زیادہ احمقانہ بات آج تک نہیں سنی۔“

”اس کا ایک چشم دید گواہ موجود ہے۔ ہوٹل کے ٹور گائیڈ روڈولفو نے تمہیں اس وقت دیکھا جب تم ایمبولینس کے لیے فون کرنے ہوٹل کے استقبالیہ کی طرف جا رہے تھے۔“

”پھر تم نے جمعے کی صبح پولیس اسٹیشن میں یہ بات کیوں نہیں کہی؟“

”کیونکہ اس وقت مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ تم نے لاش کے پاس سے بریسلیٹ اٹھایا۔ اس کا پتا آج چلا اور صبح ٹور گائیڈ یہ بات بتانے میرے پاس آیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ کوئی اہم بات نہیں ہے لیکن جب اسے اپنے کزن سے معلوم ہوا کہ مقتول کے پاس ایک سونے کا بریسلیٹ تھا تو اس نے مجھے بتانا ضروری سمجھا۔ میں انتہائی تیز رفتاری سے گاڑی چلاتا ہوا یہاں تک آیا لیکن پھر بھی قاتل کو نہیں پکڑ سکا البتہ شریکِ جرم ہاتھ آ گیا۔“

”اگر مجھ سے کوئی جرم سرزد ہوا ہے تو صرف یہ کہ میں نے انصاف کے راستے میں رکاوٹ ڈالی۔ واقعی مجھے وہ بریسلیٹ پولیس کو دینا چاہیے تھا لیکن میں نے سوچا کہ یہ مسٹر آرنلڈ کی ملکیت ہے اس لیے ان کی بیوی کو ہی دے دوں۔“

میں ان دونوں تصویروں کو دیکھ رہا تھا۔ ایک میں درمیانی عمر کی عورت سونے کا بریسلیٹ پہنے ہوئے تھی اور دوسری تصویر میں اس کے شوہر کا ہاتھ نظر آ رہا تھا۔ اس نے بھی ویسا ہی بریسلیٹ پہن رکھا تھا۔ میرا دل چاہا کہ دہاڑیں مار کر رونا شروع کر دوں۔ میں نے اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے کہا۔ ”وہ نہیں چاہتی تھی کہ پولیس اس بریسلیٹ کو ضبط کر لے چنانچہ میں نے وہ اسے واپس کر دیا۔“ اس لمحے مجھے اپنی آواز بہت دور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہ بریسلیٹ مسز آرنلڈ کے لیے پھندا بن جائے گا۔

انسپکٹر اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا اور اپنی جیب سے ہتھکڑیوں کی جوڑی نکالتے ہوئے بولا۔ ”یہ ایک اور بریسلیٹ ہے اور میں چاہوں گا کہ تم اس کے بارے میں بھی غور کرو مسٹر کوننگ۔“

اس نے ہتھکڑی کے دونوں حصے میرے سامنے لہراتے ہوئے کہا۔ ”گو کہ یہ سونے کی نہیں ہے لیکن بریسلیٹ جیسی ہی ہے۔ کھڑے ہو جاؤ۔ میں تمہیں فرانسیسی نیشنل بینوئٹ آرنلڈ کے قتل کے الزام میں گرفتار کرتا ہوں۔“

”تم بہت بڑی غلطی کر رہے ہو۔ میں مسٹر آرنلڈ کو کیوں قتل کروں گا۔ مسز آرنلڈ کے لیے۔ تم نے دیکھا ہے کہ وہ ایک بوڑھی اور بیمار عورت ہے اور نہ ہی پیسوں کی خاطر ایسا کر سکتا ہوں۔ میرے پاس دولت کی کمی نہیں۔“

”ہمارے پاس اصل وجہ جاننے کے لیے بہت وقت ہوگا۔“ انسپکٹر نے کہا۔ ”کھڑے ہو جاؤ۔ میں دوبارہ نہیں کہوں گا۔“

میرے پاس اس کے حکم کی تعمیل کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ شارلین میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے انسپکٹر سے کہا کہ وہ اس کے سامنے مجھے ہتھکڑی نہ لگائے۔ وہ بے رخی سے بولا۔ ”یہ تمہارا مسئلہ ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے میرے ہاتھوں میں ہتھکڑی پہنا دی اور مجھے لے کر ائرپورٹ کی عمارت سے باہر نکل گیا۔ یہ سچ ہے کہ میرے پاس دولت کی کمی نہیں لیکن پیسے کی ہوس نے مجھے اندھا کر دیا تھا۔ مسز آرنلڈ اپنے شوہر سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہ رہی تھی۔ کیونکہ اس کے مرنے کی صورت میں وہ اس کی ڈھیروں دولت اور جائداد کی بلاشرکتِ غیرے مالک بن جاتی، اس کے علاوہ انشورنس کی مد میں بھی اسے لاکھوں ڈالر ملتے۔ اس نے مجھ سے رابطہ کیا۔ وہ شوہر کو قتل کرنے کا محفوظ ترین طریقہ جاننا چاہ رہی تھی۔ میں نے ہی اسے یہ راستہ بتایا۔ مسز آرنلڈ نے وعدہ کیا تھا کہ وہ مجھے اس خدمت کے عوض ایک لاکھ ڈالر دے گی لیکن وہ مجھے بتائے بغیر چپکے سے نکل گئی اور مجھے پولیس کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے شارلین کی دوستی سے بھی محروم ہونا پڑا۔ اسے کہتے ہیں... نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم...!

◆

# جوکر

### حمیرا اقبال

کمپنی کو شک تھا کہ سالانہ رپورٹ میں کوئی گڑبڑ ہے... گوشواروں میں بھی نمایاں فرق نظر آرہا تھا... کمپنی نے اپنے ایک خاص ملازم کو تمام حساب کتاب چیک کرنے کے لیے روانہ کیا... اور پھر اس کے قتل کی خبر نے سب کو ششدر کردیا...

**غیر معمولی ذہین، حافظے کے مالک شخص کا طریقۂ تحقیق...**

وہ واقعی ایک منحوس دن تھا جب اُسے اچانک ہی ہوسٹن جانے کا حکم ملا۔ اسے لون اسٹار کے ایک زیرِالتوا معاہدے میں غیر متوقع طور پر ہونے والی رکاوٹ کو دور کرنے کے لیے کہا گیا تھا۔ مارتھا کی مہربانی سے فوری طور پر پہلی پرواز اور ہوٹل میں بکنگ کا انتظام ہوگیا۔ اس نے گھر آکر جلدی جلدی اپنا ہینڈ کیری بیگ تیار کیا اور بیوی سے الوداعی ملاقات کرکے ائرپورٹ کے لیے روانہ ہوگیا۔ اور نصف شب کے قریب ہوسٹن پہنچ گیا۔ اس وقت وہاں کوئی

ٹیکسی دستیاب نہیں تھی۔ چنانچہ اس نے ائرپورٹ سے چلنے والی شٹل بس کو ہی غنیمت جانا اور رات بارہ بج کر پچاس منٹ پر وہ یعنی پال موریسن اپنی منزل اسٹار اسٹیٹ آرمز پہنچ گیا۔ وہ بولٹ مین ڈیولپمنٹ میں فنانشل آفیسر تھا۔

”میرا نام پال موریسن ہے اور میں نے یہاں ریزرویشن کروائی ہے۔“ اس نے استقبالیہ پر بیٹھے ہوئے شخص سے اپنا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔ وہ اس کی جیکٹ پر لگی ہوئی نیم پلیٹ سے اس کا نام جان چکا تھا۔ ایرون ہولٹ۔

”موریسن۔“ ہولٹ نے منہ ہی منہ میں کہا۔ اس نے باکس میں رکھے کارڈ ٹٹولنا شروع کیے پھر کمپیوٹر کے کی بورڈ کے بٹن دبا کر اسکرین پر کچھ تلاش کرتا رہا۔ اس کام سے فارغ ہو کر اس نے کہا۔ ”مجھے افسوس ہے مسٹر موریسن، ہمارے ریکارڈ میں اس نام سے کوئی ریزرویشن نہیں ہے۔“

”حیرت ہے۔ آج صبح ہی یہ ریزرویشن کروائی گئی تھی۔“

”معذرت چاہتا ہوں مسٹر موریسن لیکن......“ وہ کندھے اچکا کر رہ گیا۔

”اچھا تو مجھے ایک کمرا ہی دے دو۔“

”اس وقت کوئی کمرا خالی نہیں ہے۔“ ہولٹ نے معذرت خواہانہ انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔

”میرا خیال تھا کہ بڑے ہوٹلوں میں دو تین کمرے ریزرو رکھے جاتے ہیں۔“

”یقیناً ایسا ہی ہے لیکن یہاں ایک کنونشن ہو رہا ہے جس کی وجہ سے سارے کمرے بک ہو چکے ہیں۔“

”اوہ میرے خدا۔“ موریسن غصے سے بولا۔ ”پہلے تم نے میری ریزرویشن میں گڑبڑ کر دی اور اب تمہارے پاس ایک کمرا بھی نہیں ہے۔ تم کیا سمجھتے ہو، کیا میں لابی میں رکھی ہوئی کرسیوں پر سو جاؤں؟“

”ایک تجویز ہے جناب۔“ ہولٹ نے لجاجت سے کہا۔ ”آپ لون اسٹار پلازا میں قیام کر سکتے ہیں۔ وہ یہاں سے صرف چار بلاک کے فاصلے پر ہے۔ میں وہاں چیک کرتا ہوں۔“

”جلدی کرو۔ میں بہت تھک گیا ہوں۔“ موریسن نے زوردار جماہی لیتے ہوئے کہا۔

ہولٹ نے فون اٹھا کر بات کی اور مسکراتے ہوئے بولا۔ ”وہاں کمرا مل جائے گا۔“

”شکریہ! کیا تم میرے لیے ٹیکسی منگوا سکتے ہو؟“

اس نے مایوسی سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ”نصف شب کے بعد کوئی ٹیکسی نہیں ملتی۔“

”وہ کیوں؟“ موریسن حیران ہوتے ہوئے بولا۔ ”تمام بڑے شہروں میں رات بھر ٹیکسیاں چلتی رہتی ہیں۔“

”دراصل رات کے وقت ٹیکسی ڈرائیوروں کو لوٹنے کی وارداتیں بہت بڑھ گئی تھیں اسی لیے ٹیکسی کمپنیوں نے رات بارہ سے صبح چھ بجے تک ٹیکسی سروس معطل کر دی ہے۔“

”گویا تم یہ کہہ رہے ہو کہ مجھے پیدل جانا پڑے گا۔“

”صرف چار بلاک کا تو فاصلہ ہے۔“

”ٹیکسی ڈرائیور تو رات کے وقت ڈرائیونگ کرتے ہوئے ڈر رہے ہیں اور تم مجھ سے یہ توقع کر رہے ہو کہ پیدل چل کر وہاں تک جاؤں؟“

”کیا کیا جائے مجبوری ہے جناب۔“ ایرون نے بے بسی سے کہا۔

”اس شاندار خدمت کے لیے تمہارا شکریہ ایرون۔“ پال نے اپنا ہینڈ کیری پکڑتے ہوئے کہا اور صدر دروازے سے باہر چلا گیا۔

ہوٹل کے باہر مکمل تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ پال بائیں جانب گھوما اور تاریکی میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر راستہ تلاش کرنے لگا۔ کافی فاصلے پر اسے ٹمٹماتی ہوئی روشنیاں نظر آئیں اور اس نے سوچ لیا کہ یہی لون اسٹار پلازا ہے۔ اس پورے راستے پر صرف تین اسٹریٹ لائٹس روشن تھیں۔ اس کے علاوہ کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس نظر آئیں اور نہ ہی سڑک پر کوئی کار جاتی دکھائی دی۔

اس نے فٹ پاتھ پر چلنا شروع کر دیا۔ اس کے عقب میں ہوٹل کی روشنیاں مدھم پڑ گئی تھیں۔ بائیں جانب کی عمارتیں بھی مکمل طور پر تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ دو بلاک چلنے کے بعد اس نے فٹ پاتھ سے اتر کر سڑک کے درمیان چلنے کا فیصلہ کیا۔ اس طرح کم از کم وہ کسی حملہ آور کی آواز تو سن سکتا تھا لیکن وہ غلطی پر تھا۔ اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔ اسے لگا کہ اس کے پہلو میں کوئی نکیلی چیز چبھ رہی ہے۔ درد کی ایک شدید لہر اٹھی اور اس کے لیے اپنی ٹانگوں پر کھڑا ہونا دشوار ہو گیا۔ وہ لڑکھڑا کر سڑک پر گر پڑا۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کی جیکٹ اور پتلون کی جیبوں کی تلاشی لی جا رہی ہے۔ وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے ہوئے بولا۔

”چاقو کی ضرورت نہیں۔ اگر تم کہتے تو میں تمہیں اپنا والٹ دے دیتا۔“

درد میں کمی واقع ہوئی اور پھر بالکل ختم ہو گیا۔ وہ مر چکا تھا۔

☆☆☆

''کیا میں پرائیویٹ سراغ رساں ایل روڈ منٹگمری سے مخاطب ہوں۔'' کوئی عورت پریشانی کے عالم میں بول رہی تھی۔

''جی ہاں، میں روڈ منٹگمری ہی بول رہا ہوں۔''

''میں جون موریسن ہوں۔ فلاڈلفیا پولیس کے لیفٹیننٹ فلپس نے تمہیں فون کرنے کا مشورہ دیا تھا تا کہ میں تم سے اپنے شوہر کے بارے میں بات کر سکوں۔''

''تمہارا شوہر، کیا ہوا اسے؟''

''پال موریسن، وہ مر گیا ہے مسٹر منٹگمری۔''

''اوہ، یہ سن کر افسوس ہوا مسز موریسن۔'' میں نے رسماً تعزیت کرتے ہوئے کہا۔

''اسے ہوسٹن میں قتل کر دیا گیا۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ یہ رہزنی کی واردات تھی۔''

''وہ ہوسٹن کیوں گیا تھا؟''

''وہ فلاڈلفیا کی کمپنی بولٹ مین ڈیولپمنٹ میں کام کرتا تھا۔ انہوں نے ہی اسے کسی کام سے ہوسٹن بھیجا جہاں وہ ایک سڑک پر مردہ پایا گیا۔ اس کی موت چاقو کے وار سے ہوئی۔''

اب میری پوری توجہ اس جانب ہو چکی تھی۔ میں نے پوچھا۔ ''یہ کب کی بات ہے؟''

''تین ہفتے ہو گئے۔ میں انتظار ہی کرتی رہی کہ پولیس مجھے کچھ بتائے۔ میں انتظار کرتے کرتے تھک گئی ہوں کہ کوئی اس معاملے میں کچھ کرے۔''

''میری ہمدردیاں تمہارے ساتھ ہیں لیکن ایسا لگتا ہے کہ......''

''میں جانتی ہوں کہ تم کیا کہنا چاہ رہے ہو۔ یہی کہ یہ بھی بدقسمتی سے ایک عام اسٹریٹ کرائم ہے لیکن میں اپنے شوہر کو جانتی ہوں مسٹر منٹگمری۔ وہ ایسا شخص نہیں ہے کہ رات کے ایک بجے سڑکوں پر آوارہ گردی کرے۔''

میں نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا وہ......؟''

اس نے پھر میری بات کاٹ دی۔ ''پولیس نے بھی پہلی بات یہی پوچھی تھی لیکن وہ شرابی نہیں تھا۔ ایک بات اور مسٹر منٹگمری۔ ایئرپورٹ جانے سے پہلے اس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ اسٹار اسٹیٹ آرمز ہوٹل میں قیام کرے گا جب ہوسٹن پولیس نے فون پر مجھے یہ افسوسناک خبر سنائی تو میں نے ہوٹل فون کیا۔ ان کا کہنا ہے کہ اس کے نام سے کمرا ریزرو تھا لیکن وہ یہاں نہیں پہنچا جبکہ دو بلاک کے فاصلے پر اس کی لاش سڑک پر پڑی ہوئی تھی۔ مجھے لگتا ہے کہ اس پورے معاملے میں کوئی نہ کوئی گڑبڑ ضرور ہے لیکن دونوں شہروں کی پولیس نے اسے......'' ان کی آواز ٹوٹنے لگی۔

''عام رہزنی کا کیس قرار دے دیا۔'' میں نے اس کی طرف سے جملہ مکمل کیا۔

''لیفٹیننٹ فلپس کا کہنا ہے کہ اس سلسلے میں شاید تم کچھ مدد کر سکو۔''

''مجھے تمہاری مدد کر کے خوشی ہوگی مسز موریسن۔ تم اس وقت کہاں ہو؟''

''میں تمہارے پاس آ جاتی ہوں۔ اپنا پتا سمجھا دو۔''

بیس منٹ بعد ایک نیلے رنگ کی لیکسس کار میرے ڈرائیو وے میں آ کر رکی۔ جون موریسن درمیانے قد کی عورت تھی۔ اس نے نیوی کلر کا پینٹ سوٹ پہن رکھا تھا۔ میں اسے اپنے دفتر میں لے گیا اور کافی کی پیشکش کی۔ وہ میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ میں نے کاغذ قلم سنبھالا اور بولا۔

''مجھے کچھ معلومات درکار ہوں گی، مسز موریسن۔ تمہارا شوہر بولٹ مین میں کیا کام کرتا تھا اور کس پوزیشن پر تھا؟''

''وہ ان کے فنانشل ڈپارٹمنٹ میں کام کرتا تھا۔ اس کا کام مالی امور کی نگرانی کرنا تھا۔''

''اور اسے انہوں نے ہوسٹن بھیج دیا؟''

''ہاں، بالکل اچانک۔ وہ بمشکل تمام اپنا ہینڈ کیری پیک کر سکا۔''

''کیا اس نے تمہیں اس عجلت کی وجہ بتائی تھی؟''

''وہ خود بھی نہیں جانتا تھا۔ اس نے بس یہ بتایا کہ کمپنی کے سب سے بڑے شاپنگ مال کے کرائے داروں کے ساتھ کوئی مسئلہ ہو گیا ہے۔ اس نے وعدہ کیا تھا کہ ہوٹل پہنچتے ہی وہ مجھے فون کرے گا۔''

میں نے اپنے سامنے رکھے ہوئے کلپ بورڈ پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ''اسٹار اسٹیٹ آرمز۔ تم نے ہوٹل کا یہی نام بتایا تھا۔''

''ہاں۔'' اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''لیکن اس نے مجھے کوئی فون نہیں کیا۔ البتہ صبح چار بجے ہوسٹن پولیس کی کال ضرور موصول ہوئی تھی۔'' اس نے لمحہ بھر رکنے کے بعد کہا۔ ''انہوں نے مجھے بتایا کہ پال کو ہوٹل سے دو بلاک

کے فاصلے پر چاقو کے وار سے ہلاک کر دیا گیا ہے۔‘‘

’’کچھ یاد ہے کہ بات کرنے والا کون تھا؟‘‘

’’سارجنٹ پورٹر۔‘‘

میں نے یہ نام بھی اپنے کلپ بورڈ پر لکھ لیا اور بولا۔ ’’کیا سارجنٹ پورٹر نے ہوٹل کا ریکارڈ چیک کرنے کے بارے میں کوئی بات کی تھی؟‘‘

’’اس کا بھی یہی کہنا تھا کہ پال ہوٹل نہیں پہنچا۔ میں نے بھی اپنے طور پر معلوم کیا۔ مجھے بتایا گیا کہ اگرچہ پال کی ریزرویشن تھی لیکن وہ ہوٹل نہیں آیا۔‘‘

’’ہوں۔‘‘ میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ’’تمہارا شوہر بہت عجلت میں ہوسٹن گیا لیکن ہوٹل نہیں پہنچا بلکہ اس کی لاش دو بلاک کے فاصلے پر ملی۔ یہ عقل میں آنے والی بات نہیں لیکن مجھے یقین ہے کہ وہاں کی پولیس پہلے ہی اسے ایک اسٹریٹ کرائم سمجھ کر کیس بند کر چکی ہوگی۔‘‘

’’اسی لیے مجھے امید ہے مسٹر منٹگمری کہ تم یہ جاننے کی کوشش کرو گے کہ درحقیقت کیا ہوا تھا؟‘‘

’’میں وعدہ نہیں کرسکتا مسز موریسن لیکن جو کچھ تم نے مجھے بتایا ہے۔ اس سے میں موجودہ معلومات سے بہت زیادہ جاننے میں کامیاب ہوجاؤں گا۔‘‘

’’یہ بھی حقیقت تک پہنچنے کے لیے کافی ہوگا مسٹر منٹگمری۔‘‘

’’براہِ کرم مجھے رونڈ کہہ کر مخاطب کرو۔‘‘ یہ کہہ کر میں نے اسے اپنی فیس اور ایڈوانس کے بارے میں آگاہ کر دیا۔

اس نے باہر کی طرف جھانکا پھر سیڑھیوں کی جانب دیکھتے ہوئے بولی۔ ’’میں نے ابھی تک گھر میں کوئی آواز نہیں سنی۔ کیا تم تنہا رہتے ہو؟‘‘

’’میری بیوی نے طلاق لے لی تھی۔‘‘

جون موریسن نے کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا۔ اس نے اپنا پرس کھولا اور چیک بک نکالتے ہوئے بولی۔ ’’تم نے پانچ سو ڈالر ایڈوانس میں کہے تھے۔‘‘ یہ کہہ کر اس نے مجھے چیک پکڑایا اور گاڑی میں بیٹھ کر شیشہ نیچے کرتے ہوئے بولی۔

’’میں نے ایک بات پولیس کو نہیں بتائی جو مجھے اس لیے غیر ضروری لگی کہ پولیس اسے رہزنی کی واردات سمجھ رہی ہے۔‘‘

’’تم مجھے بتاسکتی ہو۔‘‘

’’پال اپنے دفتر میں ہونے والی کسی بات سے پریشان تھا گوکہ اس نے یہ بات مجھے کبھی نہیں بتائی لیکن میں اندازہ لگاسکتی ہوں۔‘‘

’’دفتر میں ہونے والی کوئی بات؟ وہ کیا ہوسکتی ہے؟‘‘

’’یہی تو میں بھی جاننا چاہ رہی ہوں۔‘‘ یہ کہہ کر اس نے کھڑکی کا شیشہ اوپر کیا اور گاڑی چلادی۔

اس کے جانے کے بعد میں نے سارجنٹ پورٹر کا نمبر ملایا اور اپنا تعارف کروانے کے بعد بتایا کہ میں پال موریسن کی موت کی تحقیقات کر رہا ہوں۔

’’میں تمہاری کچھ زیادہ مدد نہیں کرسکتا۔ وہ سڑک پر مردہ حالت میں پایا گیا۔ یہ سراغ بھی نہیں مل سکا کہ وہ وہاں کیوں گیا تھا۔‘‘

’’اس کی بیوی نے مجھے بتایا ہے کہ کمپنی نے اسے شارٹ نوٹس پر ہوسٹن بھیجا تھا اور وہاں اسٹار اسٹیٹ آرمز میں اس کے لیے کمرا بک تھا۔ یہ ہوٹل اس جگہ سے دو بلاک کے فاصلے پر ہے جہاں سے اس کی لاش ملی۔ کیا تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ وہ اس جگہ کیسے پہنچا؟‘‘

’’ہم نے سب سے پہلے تو یہ چیک کیا کہ وہ کون تھا۔ اس کا والٹ تو چھینا جاچکا تھا لیکن اس کی جیب میں واپسی کا ٹکٹ موجود تھا پھر اس کے ہینڈ کیری پر لگے ہوئے ٹیگ سے بھی اس کا نام اور بزنس ایڈریس معلوم ہوگیا۔ علی الصباح فلاڈلفیا فون کرنے سے یہ تصدیق ہوگئی کہ وہ موریسن تھا۔ ہم نے وہاں موجود دونوں ہوٹلوں کا ریکارڈ چیک کیا اور یہ تصدیق ہوگئی کہ اس کے لیے اسٹار اسٹیٹ آرمز میں کمرا ریزرو تھا لیکن وہ وہاں نہیں پہنچا۔‘‘

’’سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ ہوٹل سے دو بلاک کے فاصلے پر پیدل کیوں گیا۔ صرف ایک بات سمجھ میں آتی ہے کہ اس نے کسی بدمزاج ٹیکسی ڈرائیور سے بحث کی ہو اور اس نے اسے وہاں اتار دیا ہو۔ یہ ایک مفروضہ بھی ہوسکتا ہے لیکن فی الحال یہی بات ذہن میں آرہی ہے۔‘‘

’’ان دنوں یہاں رات میں ٹیکسی سروس بند ہے۔ رات بارہ بجے سے صبح چھ بجے تک ٹیکسی نہیں چلتی اس لیے یہ مفروضہ بھی غلط ہے۔ اس کے وہاں جانے کی کوئی اور وجہ ہوگی۔‘‘

’’ٹھیک ہے۔ اگر مجھے کوئی کام کی بات معلوم ہوئی تو تمہیں بتادوں گا اور تم بھی ایسا ہی کرنا۔‘‘

میں نے ٹیلی فون بند کر دیا۔ اب تک کی معلومات کے مطابق موریسن ہوٹل نہیں پہنچا لیکن اس کی لاش وہاں سے صرف دو بلاک کے فاصلے پر ملی۔ اس کے بارے میں

یہ فرض کرلیا گیا کہ کسی نے راہ چلتے ہوئے اسے چاقو کے وار سے ہلاک کر دیا کیونکہ نصف شب کے بعد شہر میں ٹیکسی نہیں چلتی۔ دو دن گزر چکے تھے اور اس دوران صرف اتنی پیش رفت ہوئی کہ میں نے ہوسٹن میں سارجنٹ پورٹر سے ٹیلی فون پر بات کرلی۔ ابھی میں نے صبح کی کافی ختم کی تھی کہ فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ اس مرتبہ پورٹر نے مجھے فون کیا تھا۔

”گزشتہ روز تمہیں یہ بات نہیں بتا سکا کیونکہ مجھے خود بعد میں معلوم ہو۔ موریسن کے مرنے کے ایک دن بعد ائرپورٹ کے صفائی والے عملے کو اس کا والٹ کچرے کے ڈرم سے مل گیا تھا۔ اس پر موریسن کے علاوہ کسی اور کی انگلیوں کے نشانات بھی ہیں۔“

”اس کی بیوی کے؟“

”نہیں، ہم نے کمپیوٹر کی مدد سے معلوم کرلیا ہے۔ یہ نشانات کارل مارٹن کی انگلیوں کے ہیں۔ ہم اس کے بارے میں مزید جاننے کی کوشش کر رہے ہیں۔ جیسے ہی کچھ معلوم ہوا، تمہیں بتا دیا جائے گا۔“

”اس تازہ ترین معلومات کے لیے شکریہ لیکن مجھے حیرت ہے کہ تم نے اس معاملے میں اتنی مستعدی کیوں دکھائی؟“

”اسے ایک فیور سمجھ لو۔“

”یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ تم مجھے اس معاملے سے دور رکھنا چاہ رہے ہو کہ کہیں میں اپنے طور پر اس شخص سے کچھ اُگلوانے کی کوشش نہ کروں۔“

”یوں ہی سمجھ لو۔ ہم نے اس شخص مارٹن کو دریافت کیا ہے۔ تمہیں اس معاملے میں مداخلت کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہم خود ہی اس سے حقیقت معلوم کرلیں گے۔ اس کے بعد میں تمہیں اچھی خبر سناؤں گا۔“

سہ پہر تین بجے سارجنٹ پورٹر نے دوبارہ فون کیا۔ اس مرتبہ اس کی آواز میں جوش نمایاں تھا، ہم نے اسے پکڑ لیا۔ وہ بالٹی مور میں اپنی بہن کے گھر میں چھپا ہوا تھا۔ اس نے فرضی نام سے سفر کیا اور یہ بھول بیٹھا کہ تین شادیاں کرنے کے بعد بھی وہ اپنے اصلی نام سے چھٹکارا حاصل کر سکے گا۔ کمپیوٹر نے ایک بار پھر اسے پکڑ لیا۔ وہ بالٹی مور کا رہنے والا نہیں ہے۔ اس کا آخری پتا نیوجرسی کا ہے۔“ وہ لمحہ بھر کے لیے رکا پھر کہنے لگا۔ ”اب تم جو کچھ بھی کرو گے وہ محض رسمی خانہ پری ہوگی۔ سوری، ہمیں افسوس ہے کہ تمہاری آمدنی ماری گئی۔“

پورٹر کا خیال بظاہر درست تھا۔ میں نے ایک ایسے

## کام کی باتیں

☆ سپنے اتنے نہ دیکھو کہ اگر ان کی تعبیر ملے تو جیون کم پڑ جائے۔

☆ خواہشوں کے سمندر میں خوابوں کے جزیرے ساحل سے دور لے جاسکتے ہیں۔

☆ کوشش تو وہ ہے جو غریبوں کی مدد کے لیے کی جائے۔

☆ علم کی محبت اور استاد کی عزت کے بغیر کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

☆ کسی دوست کو بار، بار آزمائش میں مت ڈالو۔ ہوسکتا ہے، وہ اپنی کسی مجبوری کی وجہ سے آپ کی آزمائش پر پورا نہ اتر سکے اور آپ ایک اچھے دوست سے محروم ہوجائیں۔

☆ خوش اخلاقی سے کچھ خرچ نہیں ہوتا بلکہ یہ آپ کا وقار بڑھا دیتی ہے۔

☆ دشمن کے حسنِ سلوک پر مت اعتماد کرو کیونکہ پانی کو جتنا ابال دیا جائے، وہ آگ بجھا دیتا ہے۔

☆ بوڑھے کا مشورہ جوان کی قوتِ بازو سے زیادہ طاقتور ہوتا ہے۔

## گدھا

ایک صاحب گھبرائے ہوئے گھر آئے اور بیوی سے بولے۔ ”بیگم میں دفتر سے گھر آرہا تھا کہ راستے میں ایک گدھا...“

اتنے میں ان کی ایک بچی بول اٹھی۔ ”امی ثمینہ نے میری گڑیا توڑ دی ہے۔“

”اچھا بیٹی ہم تمہیں دوسری لے دیں گے۔“

شوہر نے پھر کہنا شروع کیا۔ ”ہاں بیگم میں کہہ رہا تھا کہ راستے میں ایک گدھا...“

اتنے میں لڑکا بول اٹھا۔ ”امی، امی مجھے گڈو نے مارا ہے۔“

بیوی چلا کر بولی۔ ”بھئی خدا کے لیے چپ ہوجاؤ، مجھے گدھے کی بات سننے دو۔“

کیس میں ہاتھ ڈالا تھا جس میں کسی پرائیویٹ سراغ رساں کی ضرورت نہیں تھی لیکن اس سے ایک غلطی ہو گئی تھی۔ اس نے نقشہ نہیں دیکھا۔ نیوجرسی کا علاقہ کیمڈین، فلاڈلفیا سے گزرنے والے دریا کی دوسری طرف تھا۔ اس کے علاوہ پورٹر نے اس بارے میں بھی ایک لفظ نہیں کہا کہ پال موریسن ہوٹل سے دو بلاک کے فاصلے پر کیا کر رہا تھا۔

میں نے اپنی گاڑی روٹ نمبر چھ سو گیارہ پر واقع ایک بڑی عمارت کے پارکنگ ایریا میں اس طرح کھڑی کی کہ عمارت کے داخلی دروازے تک بہ آسانی بیدل جا سکوں۔ گراؤنڈ فلور پر دکانیں، ریسٹوران اور ایک چھوٹا سا پارک تھا جبکہ بالائی منزل پر بولٹ مین ڈیولپمنٹ ہیڈ کوارٹر کے دفاتر تھے۔ اوپر جانے کے لیے دو سیڑھیاں تھیں۔ داہنی ہاتھ والی ملازمین کے لیے مخصوص تھی جبکہ بائیں جانب والی پر کمپنی کا نام لکھا ہوا تھا۔ میں اسی راستے سے اوپر چلا گیا۔ استقبالیہ پر بیٹھی ہوئی لڑکی نے اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

’’کیا میں تمہاری کچھ مدد کر سکتی ہوں؟‘‘

’’میں تمہارے مالیاتی شعبے کے سربراہ سے بات کرنا چاہتا ہوں۔‘‘

’’وہ کمپنی کے نائب صدر وینوپین ہیں، کیا تم نے ملاقات کا وقت لے رکھا ہے؟‘‘

’’مسٹر وینوپین کو بتا دو کہ سراغ رساں منگری، موریسن کے کیس کے سلسلے میں ملنا چاہتا ہے۔‘‘

اس نے فون اٹھا کر وینوپین کو میری آمد کی اطلاع دی اور فون رکھتے ہوئے بولی۔ ’’بائیں جانب چوتھا کمرا ہے۔‘‘

’’بہت بہت شکریہ مائی ڈیئر۔‘‘

اس بار اس نے غور سے مجھے دیکھا اور مسکرا دی۔ میں بائیں جانب بنے ہوئے کمروں کی طرف چل دیا۔ چوتھے دروازے پر ایک تختی لگی ہوئی تھی جس پر لکھا ہوا تھا۔ ’’والٹر وینوپین۔ چیف فنانشل آفیسر۔‘‘

میں نے دروازے پر ہلکی سی دستک دی اور اندر چلا گیا۔ وہ ایک چھوٹا سا کیبن تھا۔ وہاں ایک چالیس سالہ عورت بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے کمپیوٹر سے نظریں ہٹاتے ہوئے کہا۔ ’’سراغ رساں منگری۔‘‘

میں نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ اندرونی دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ’’اندر چلے جاؤ۔‘‘

ایک بڑی سی میز کے پیچھے وینوپین بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔

’’میرا خیال ہے کہ تمہارا تعلق فلاڈلفیا پولیس سے ہے؟‘‘

’’نہیں، میں پرائیویٹ سراغ رساں ہوں اور میری خدمات مسز موریسن نے حاصل کی ہیں۔‘‘

’’جون نے پرائیویٹ سراغ رساں کی خدمات کیوں حاصل کیں؟‘‘

’’اسے حیرانی اس بات پر ہے کہ جب پال کی ہوٹل میں ریزرویشن تھی تو وہ ہوٹل سے دو بلاک کے فاصلے پر اس جگہ کیا کر رہا تھا جہاں سے اس کی لاش ملی اور یہی بات میرے لیے بھی باعثِ حیرت ہے۔ اس کے علاوہ بھی کچھ باتیں ہیں۔‘‘

’’مثلاً؟‘‘

وینوپین مجھ سے ملنے کے لیے جگہ پر کھڑا نہیں ہوا، نہ ہی اس نے مجھے کرسی پیش کی۔ بہرحال میں خود ہی ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ’’مثلاً یہ کہ پال نے اسٹار اسٹیٹ آرمز میں ریزرویشن کروائی تھی۔ وہ وہاں نہیں پہنچا لیکن وہاں سے چند فٹ کے فاصلے پر اس کی لاش ضرور مل گئی۔‘‘

’’ہم سب ہی اس پر حیران ہیں۔‘‘ وہ مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔

’’تمہارا کیا خیال ہے؟‘‘

’’میں چیف فنانشل آفیسر ہوں۔ سراغ رساں نہیں۔‘‘

’’یہاں موریسن کی کیا ذمے داریاں تھیں؟‘‘ میں نے پوچھا۔

’’کمپنی کی تمام مالی سرگرمیوں کو کمپیوٹرائز کرنا۔‘‘

’’پبلک ریلیشننگ نہیں؟‘‘ میں نے ایک چبھتا ہوا سوال کیا۔

’’یقیناً نہیں لیکن تم نے یہ سوال کیوں پوچھا؟‘‘

’’اس نے اپنی بیوی کو بتایا تھا کہ اسے ہوسٹن بھیجا جا رہا ہے تاکہ وہ تمہارے ایک کرائے دار کے ساتھ ہونے والا مسئلہ حل کرے۔‘‘

’’وہ مالی مسئلہ تھا اور موریسن کا شمار ہمارے مالیاتی ماہرین میں ہوتا تھا۔‘‘

’’تمہارے ڈپارٹمنٹ میں اور کتنے لوگ ہیں؟‘‘

’’صرف دو۔ چارلی ڈیون پورٹ تمام بلوں اور ادائیگیوں کو دیکھتا ہے جبکہ بارتھا فرینکلن ریکارڈ کیپنگ کرتی ہے۔ پال ہمارا کمپیوٹر ایکسپرٹ تھا۔‘‘

”کیا تم نے کارل مارٹن کا نام سنا ہے؟“

اس کی بھویں تن گئیں اور وہ ناگواری سے بولا۔ ”یہ کون ہے؟“

”یہ وہی شخص ہے جس نے پال موریسن کو قتل کیا ہے۔“

”میں نے یہ نام کبھی نہیں سنا۔ تم نے کہاں سے سن لیا؟“

”ہوسٹن پولیس سے۔ مارٹن کو گزشتہ روز بالٹی مور سے گرفتار کرلیا گیا ہے۔“

”پھر تو یہ کیس ختم ہوگیا۔“ اس نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔

”نہیں، ابھی کچھ باتوں کا جواب ملنا باقی ہے جن کی طرف میں نے اشارہ کیا تھا۔“

”اس کی گرفتاری کے بعد وہ سب دور ہوگئیں۔“

اس نے جس لہجے میں یہ بات کہی، اس سے مجھے اندازہ ہوگیا کہ مجھے جو کچھ ویوپین سے معلوم کرنا تھا، وہ میں نے معلوم کرلیا۔ میں کرسی سے کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ ”تمہارے وقت کا بہت شکریہ۔ اگر تم کوئی اور بات بتانا چاہو جو اس کیس میں مددگار ثابت ہو تو مجھے فون کردینا۔“

یہ کہہ کر میں نے اس کی میز پر اپنا کارڈ پھینکا اور کمرے سے باہر آگیا لیکن عمارت سے باہر جانے کے بجائے اس کمرے میں چلا گیا جہاں فنانس ڈپارٹمنٹ کا عملہ بیٹھا کرتا تھا۔ وہاں صرف تین میزیں رکھی ہوئی تھیں۔ ایک خالی میز کو دیکھ کر میں نے اندازہ لگالیا کہ یہ پال موریسن کی ہوگی۔ دروازے کے ساتھ والی میز پر ایک خوب صورت لڑکی بیٹھی تھی جس کی عمر بیس پچیس کے قریب ہوگی۔ اس نے اپنے بال پونی کی شکل میں باندھ رکھے تھے اور آنکھوں پر نازک سا چشمہ لگا رکھا تھا۔ اس نے کوئی زیور نہیں پہنا ہوا تھا البتہ اس کے بلاؤز کے کالر میں ایک سرخ پن لگی ہوئی تھی۔

”مارتھا فرینکلن۔“ میں نے اس کی میز پر رکھی ہوئی نیم پلیٹ پڑھتے ہوئے کہا۔

”تمہارا مشاہدہ بہت اچھا ہے۔“ دوسری میز پر بیٹھے ہوئے شخص نے کہا۔ ”میرا نام چارلی ڈیون پورٹ ہے۔ میں پولیس سراغ رساں کی کیا مدد کرسکتا ہوں۔ ہمیں تمہاری آمد کی اطلاع پہلے ہی مل گئی تھی۔“

”میرا تعلق پولیس سے نہیں بلکہ میں پرائیویٹ سراغ رساں روڈ منگمری ہوں اور جون موریسن کے لیے کام کررہا ہوں۔“ میں نے مصافحے کے لیے اپنا ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ کوئی شخص پال موریسن کو کیوں قتل کرنا چاہتا ہوگا؟“

”یقیناً یہ کسی راہزن نے اس کا والٹ چھیننے کے لیے کیا ہوگا۔“ وہ طنز آمیز لہجے میں بولا۔ ”یہ اندازہ تو تم میری مدد کے بغیر بھی لگا سکتے تھے۔“

میں نے دیکھا کہ مارتھا کی نظریں چھت کی جانب اٹھ گئی تھیں پھر چارلی سے کہا۔ ”تم کچھ زیادہ پریشان نظر نہیں آرہے؟“

”ہم سب پریشان ہیں۔ کچھ لوگ اس پر اچھے طریقے سے قابو پالیتے ہیں۔ جو کچھ ہوا، وہ بہت شرمناک ہے لیکن کوئی بھی اس بارے میں کچھ کرنے کے قابل نہیں ہے۔“

”یہ درست نہیں ہے چارلی۔ ہوسٹن پولیس نے قاتل کو گرفتار کرلیا ہے۔“

”تم مذاق تو نہیں کررہے؟“ اس نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔

”اس کا نام مارٹن ہے اور پولیس کو پال کے والٹ پر اس کی انگلیوں کے نشانات ملے ہیں۔“

”تم مذاق کررہے ہو؟“ اس نے دوبارہ کہا۔

”اسے بالٹی مور سے پکڑا گیا ہے۔“ میں نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ”وہ وہاں قتل کرنے کے بعد چھپا ہوا تھا لیکن اس کا تعلق کیمڈین سے ہے۔“

”اس کے علاوہ تمہیں کچھ معلوم ہوا؟“

”میں نہیں جانتا کہ اس کے علاوہ بھی کوئی بات ہے۔“ اس مسخرے سے کچھ معلوم نہیں ہوسکا تھا۔ لہٰذا میں اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔ ”اگر تم سمجھتے ہو کہ تمہارے پاس کچھ معلومات ہیں تو مجھے فون کردینا۔“ میں نے اس کی میز پر اپنا کارڈ رکھا اور مارتھا کے پاس آگیا۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی جب اس نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھانے میں پہل کی۔

”مجھے بڑی خوشی ہے کہ تم مسز موریسن کی مدد کررہے ہو۔“ یہ کہہ کر اس نے کاغذ کا ایک پرزہ میری مٹھی میں دبا دیا۔

میں نے اپنی کار میں بیٹھ کر وہ رقعہ پڑھا۔ ”یہاں سے آدھے میل کے فاصلے پر گریبز گرل ہے۔ میں وہاں بیس منٹ میں پہنچ رہی ہوں۔“

میں دس منٹ میں وہاں پہنچ گیا اور ایک الگ تھلگ کونے میں ایسی میز منتخب کی جہاں .... کوئی نہ دیکھ سکے۔ میں نے کافی منگوائی اور دروازے پر نظریں جما دیں۔ تقریباً نو منٹ بعد وہ آگئی۔ اس نے ہال کا جائزہ لیا اور مجھ پر نظر پڑتے ہی تیزی سے میری طرف آئی۔

”میں زیادہ دیر نہیں رک سکتی۔“ اس نے کہا پھر ویٹر

READING
Section

سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔ ''سینڈوچ اور چائے۔'' ویٹر کے جانے کے بعد میں نے مارتھا سے کہا۔ ''غالباً تم مجھے کوئی خاص بات بتانا چاہ رہی ہو؟''

''کچھ ایسا ہی ہے۔'' وہ کہتے کہتے رک گئی پھر آگے کی طرف جھکتے ہوئے بولی۔ ''گزشتہ دو ہفتوں سے پال کسی بارے میں پریشان نظر آ رہا تھا۔''

''تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ وہ کیا بات ہو سکتی ہے؟''

ویٹر چائے اور کافی لے کر آ گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے کہا۔ ''تمہارا خیال ہے کہ پال کسی وجہ سے پریشان تھا۔ کوئی ایسی بات جو اسے معلوم ہو گئی تھی یا خود اس سے کوئی حرکت سرزد ہو گئی تھی؟''

''میں کیسے بتا سکتی ہوں؟''

''وہ پشیمان لگ رہا تھا یا ناراض؟'' میں نے کہا۔

اس نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ ''کاش میں زیادہ توجہ دے سکتی۔ فی الحال صرف یہی کہہ سکتی ہوں کہ وہ پریشان لگ رہا تھا۔ میرا خیال ہے کہ شاید اس سے تمہیں کوئی مدد نہ مل سکے۔''

''اپنے آپ کو کم مت سمجھو مارتھا۔ جو کچھ ہمیں معلوم ہے۔ پہلے اس پر بات کرتے ہیں۔ یہ بتاؤ کہ کیا پال نے اسٹار اسٹیٹ آرمز میں کمرا بک کروایا تھا؟''

''ہاں، میں نے ہی فون پر اس کی ریزرویشن کروائی تھی۔''

''کیا تم جانتی ہو کہ ہوسٹن برانچ کو کیا مالی مسئلہ درپیش تھا؟''

''چارلی نے اس سلسلے میں مسٹر وینوچین کو کچھ بتایا تھا پھر انہوں نے مجھے ہدایت کی کہ پال کے لیے ہوائی جہاز کے ٹکٹ اور ہوٹل میں ریزرویشن کا انتظام کروں۔''

''لیکن پال ہوٹل نہیں پہنچا۔''

''ہاں، پولیس نے مسٹر وینوچین کو یہی بتایا تھا پھر میں نے بھی اپنے طور پر ہوٹل والوں سے پوچھا۔''

''تمہاری وہاں کس سے بات ہوئی تھی؟''

''اس کا نام ایرون ہے۔ ایرون ہولٹ۔ وہ رجسٹریشن ڈیسک پر نائٹ منیجر ہے۔ اس نے تصدیق کی کہ پال ہوٹل نہیں پہنچا تھا۔'' پھر وہ اپنی رسٹ واچ دیکھتے ہوئے بولی۔ ''اب مجھے چلنا چاہیے۔ میں جو کچھ جانتی تھی وہ میں نے بتا دیا جو کافی نہیں ہے۔ صرف اتنا جانتی ہوں کہ پال کبھی کسی اجنبی سڑک پر آوارہ گردی نہیں کر سکتا۔ وہ بہت نفیس اور نظم و ضبط میں رہنے والا شخص تھا۔'' یہ کہتے ہوئے اس کی آواز بھرا گئی۔ اس نے بل کی ادائیگی کے لیے اپنا پرس کھولا۔

''رہنے دو۔ یہ میری طرف سے ہے۔'' میں نے کہا۔ ''چلو، میں تمہیں کار تک چھوڑ دوں۔''

''نہیں، کوئی شخص ہمیں ایک ساتھ دیکھ سکتا ہے۔''

''تم اس حد تک پریشان ہو؟'' میں نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔

''مجبوری ہے۔ ہمیں محتاط رہنا ہوگا۔''

میں اسے دروازے کی طرف جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اس کی چال میں گھبراہٹ نمایاں تھی۔ میں نے ویٹر کو بلا کر بل کے لیے کہا۔ اس وقت تک میں اپنا ذہن تیار کر چکا تھا۔ یہاں بیٹھ کر کچھ نہیں ہو سکتا۔ موریسن کو ہوسٹن بھیجا گیا تھا اور وہیں اس کا قتل ہوا۔ اگر جون اخراجات برداشت کرے تو مجھے خود ہوسٹن جانا ہوگا۔

میں نے بھی فون کر کے اسٹار اسٹیٹ آرمز میں ریزرویشن کروائی اور اسی پرواز کا انتخاب کیا جس سے موریسن گیا تھا۔ دورانِ سفر میں نے ایک بار پھر تمام واقعات کا جائزہ لیا۔ ہوسٹن کی پولیس نے مارٹن کو گرفتار کر کے اسے اسٹریٹ کرائم کا کیس بنا دیا تھا اور موریسن کی سڑک پر موجودگی کو سرے سے نظر انداز کر دیا جبکہ میرے لیے یہ جاننا بہت ضروری تھا کہ موریسن رات کے ایک بجے اس سڑک پر پیدل کیوں گیا تھا؟

جہاز نے نصف شب سے قبل ہوسٹن کے ہوائی اڈے پر لینڈ کیا۔ میرے پاس صرف ایک ہینڈ کیری تھا۔ اس لیے مجھے سامان کے انتظار میں وقت ضائع کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کے باوجود جب میں ٹرمینل کی عمارت سے باہر آیا تو بارہ بج چکے تھے اور وہاں کوئی ٹیکسی نظر نہیں آ رہی تھی۔ میں ائرپورٹ کی شٹل بس میں سوار ہو گیا جس میں میرے علاوہ تین مسافر اور تھے جو ائرپورٹ کے نزدیک ہی حیات ایجنسی پر اتر گئے۔ ڈرائیور نے پیچھے مڑ کر مجھے دیکھا اور بولا۔ ''تمہیں اسٹیٹ آرمز جانا ہے؟''

''تم وہاں جا چکے ہو؟''

''ہاں، دو ہفتے پہلے میں نے ایک مسافر کو وہاں اتارا تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اسے کسی نے قتل کر دیا۔''

اوہ میرے خدا، کیسا عجیب اتفاق ہے۔ میں نے آگے کی طرف جھکتے ہوئے کہا۔ ''تم نے اسے ہوٹل کے دروازے پر ہی اتارا تھا؟''

''ظاہر ہے اور کہاں اتارتا۔''

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN RSPK.PAKSOCIETY.COM PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY

''تم نے اسے اندر جاتے ہوئے دیکھا تھا؟''

''نہیں، وہ میرا آخری اسٹاپ تھا اور میں گھر جانا چاہ رہا تھا لیکن وہ اس کے علاوہ کہاں جاسکتا تھا؟''

''اچھا سوال ہے۔'' میں نے سوچا اور اب اسی نکتے پر مجھے آگے بڑھنا تھا۔

دس منٹ بعد ہم اسٹار اسٹیٹ آرمز پہنچ چکے تھے۔ میں نے بس ڈرائیور کو دس ڈالر بطور ٹپ دیے اور بس سے اتر گیا۔ استقبالیہ پر بیٹھا ہوا شخص نیوی بلیو جیکٹ پہنے ہوئے تھا جس کی جیب پر ہوٹل کا لوگو لگا ہوا تھا۔ اس نے سفید رنگ کی قمیص اور نیوی بلیو رنگ کی ٹائی لگائی ہوئی تھی۔ اس کی عمر پینتیس کے لگ بھگ ہوگی۔ بال سلیقے سے سنورے ہوئے تھے اور وہ کلین شیو تھا۔ جب میں اس کے قریب پہنچا تو اس نے سرد لہجے میں کہا۔

''گڈ ایوننگ سر۔''

''روڈ منٹگمری۔'' میں نے کاؤنٹر پر رکھی اس کے نام کی تختی پڑھی اور کہا۔ ''مسٹر ایرون ہولٹ، میری یہاں ریزرویشن ہے۔''

اس نے کمپیوٹر کے کی بورڈ پر انگلیاں چلائیں اور اسکرین پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔ ''ہاں، تمہارے لیے ایک بہت عمدہ کمرا مخصوص ہے جہاں سے تم پورے شہر کا نظارہ کرسکتے ہو۔''

''یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ میں نے بہت شارٹ نوٹس پر ریزرویشن کروائی تھی اس لیے ڈر رہا تھا کہ کہیں تمہارے سارے کمرے بھر نہ گئے ہوں۔''

''سال کے اس حصے میں زیادہ رش نہیں ہوتا۔ ویسے بھی ہم ہنگامی ضرورت کے لیے کچھ کمرے محفوظ رکھتے ہیں۔'' اس نے میری طرف رجسٹریشن فارم بڑھایا اور میں نے اس پر دستخط کردیے۔

''کیا مجھے اپنا بیگ خود لے جانا ہوگا؟''

''میں فون کرکے لڑکے کو بلاتا ہوں۔ وہ تمہارا سامان لے جائے گا۔''

''ایک منٹ ٹھہرو۔'' میں نے مرکزی دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''چند روز قبل جو واقعہ پیش آیا، وہ بہت ہی افسوسناک تھا۔''

ایرون کا بڑھا ہوا ہاتھ رک گیا۔ ''تمہارا اشارہ کس جانب ہے؟''

''پال موریسن جسے یہاں سے دو بلاک کے فاصلے پر چاقو مار کر ہلاک کردیا گیا تھا۔''

اس نے مجھے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''وہ ایک حادثہ تھا۔ ہم سب کو اس کا بہت صدمہ ہوا۔''

میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔ ''میں نے سنا ہے کہ اس نے بھی یہاں کمرا بک کروایا تھا؟''

''یہ صحیح ہے لیکن وہ یہاں نہیں پہنچا۔''

میں نے براہِ راست اس کی آنکھوں میں جھانکا اور مجھے کچھ نظر آ گیا۔ صاف لگ رہا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ میں نے کہا۔ ''جس شٹل سے میں آیا ہوں۔ اس کے ڈرائیور کا کہنا ہے کہ اس نے پال موریسن کو بھی ہوٹل کے دروازے پر اتارا تھا۔ تمہارا خیال ہے کہ وہ بس سے اتر کر سڑک پر چل رہا ہوگا۔''

''جو واقعہ پیش آیا، اس سے تو یہی لگتا ہے۔'' اس کی پتلیاں ایک بار پھر سکڑ گئیں اور اس نے اپنے ہاتھ کاؤنٹر کے پیچھے چھپالیے۔ یہ جھوٹ بولنے کی ایک اور نشانی تھی۔

''میری سمجھ میں نہیں آتا ایرون کہ پال کو رات کے وقت سڑک پر پیدل چلنے کی کیا ضرورت تھی جبکہ اس کے پاس اس ہوٹل میں رات گزارنے کے لیے ایک محفوظ جگہ تھی اور اس نے یہاں کمرا بھی بک کروا رکھا تھا۔''

اس نے گھبرائے ہوئے انداز میں سر ہلا دیا۔ اب اس کی آنکھیں میرے بجائے کہیں اور دیکھ رہی تھیں۔ یہ جھوٹ بولنے کی تیسری نشانی تھی لیکن میں نے اس پر کچھ ظاہر نہ ہونے دیا اور دوستانہ لہجے میں گفتگو کرتا رہا۔

''مجھے یقین ہے کہ سڑک پر جو واقعہ پیش آیا، اس سے تمہیں گہرا صدمہ پہنچا ہوگا اور تم بھی یہ سوچنے پر مجبور ہوگئے ہوگے کہ وہ وہاں کیوں گیا تھا۔ اگر تم اس بارے میں کچھ جانتے ہو تو ضرور بتاؤ ورنہ تمہارے دل پر ہمیشہ ایک بوجھ رہے گا۔''

وہ اپنی جگہ سے لڑکھڑایا اور اس نے دونوں ہاتھوں سے کاؤنٹر پکڑلیا پھر مایوسی سے کندھے اچکا کر بولا۔

''ہم اسے مذاق سمجھ رہے تھے۔''

''کیسا مذاق؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے اپنی ہتھیلیاں کاؤنٹر پر رکھیں اور میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''مجھے موریسن کے پرانے دوستوں میں سے ایک کی کال موصول ہوئی۔ شاید موریسن نے کالج کے دنوں میں اس کے ساتھ کوئی حرکت کی ہوگی۔ اسی لیے اس کے لہجے سے بغض جھلک رہا تھا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ وہ موریسن سے ایک پرانا بدلہ لینا چاہتا ہے۔ اس نے سن رکھا تھا کہ ہوسٹن میں رات بارہ بجے کے بعد ٹیکسی

نہیں چلتی۔ اس طرح موریسن کو دوسرے ہوٹل تک پیدل جانا پڑے گا اور اس طرح اس کا حساب برابر ہو جائے گا۔''

''تم نے اس فون کرنے والے کا نام اور نمبر نوٹ کیا تھا؟''

''نہیں، وہ بلاک کر دیا گیا تھا اس لیے اس کا نام اور نمبر معلوم نہ ہو سکا۔''

''اور تم اس کی باتوں میں آ گئے؟''

''میں اس کھیل کا حصہ بننے کے لیے تیار نہیں تھا لیکن اس نے کہا کہ یہ کام اس کے لیے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ جب مجھے اس کا بھیجا ہوا لفافہ ملا تو اس میں ایک خط رکھا ہوا تھا جس میں لکھا تھا کہ اگر میں راضی ہوں تو اسے فون پر بتا دوں ورنہ پیسے واپس کر دوں۔''

''پیسے؟'' میں نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔

''اس میں سو ڈالر مالیت کے دس نوٹ تھے اور اس کے عوض مجھے صرف یہ کرنا تھا کہ موریسن کی ریزرویشن سے انکار کر دوں۔''

''تم نے لفافے پر ڈاک خانہ کی مہر دیکھی تھی؟''

''آرڈ مور، پی اے۔''

یہ فلاڈلفیا کا مضافاتی علاقہ تھا۔ لگتا تھا کہ لفافہ بھیجنے والا اتنا ہوشیار نہیں جتنا وہ اپنے آپ کو سمجھ رہا تھا۔ بالآخر ایرون نے مجھ سے نظریں ملائیں اور کہا۔ ''میں قسمیہ کہتا ہوں کہ اسے ایک مذاق ہی سمجھا تھا۔''

''تم نے یہ بات ہوسٹن پولیس کو کیوں نہیں بتائی؟'' میں نے پوچھا۔

''میں خیف زدہ ہو گیا تھا۔ یوں لگا جیسے میں اس قتل میں مددگار رہوں۔''

''اور اب؟''

''میں اس عملی مذاق کا بے گناہ تماشائی ہوں۔ تمہارا اندازہ تھا کہ تم سے جھوٹ بول رہا ہوں اور میں خود بھی سمجھ رہا تھا کہ ایک پرائیویٹ سراغ رساں سے کچھ چھپانا بہت مشکل ہے۔''

''بہت برا ہوا کہ تم اتنی آسانی سے بک گئے۔''

وہ رات میں نے ہوٹل کے عالی شان کمرے میں گزاری۔ اس طرح مجھے مزید غور کرنے کے لیے وقت مل گیا۔ فون کرنے والے کو بہت پہلے معلوم ہو گیا تھا کہ موریسن کو ہوسٹن بھیجا جائے گا۔ اسے اتنا وقت درکار تھا کہ ایرون کو رشوت کی پیشکش کر سکے جبکہ موریسن کو آخر وقت تک ہوسٹن جانے کا علم نہیں تھا اور اسے یہ بات روانگی کی صبح معلوم ہوئی۔ اب اس حقیقت تک پہنچنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی کہ اس ڈرامے کا مرکزی کردار موریسن سے بہت قریب تھا یا وہ بولٹ مین کمپنی میں کام کرتا تھا۔

ناشتا کرنے کے بعد میں نے واپسی کا ارادہ کیا اور ٹیکسی کے ذریعے ائرپورٹ آ گیا۔ راستے میں بھی میرا ذہن اسی کیس کے بارے میں سوچتا رہا۔ یہ بات واضح تھی کہ پال موریسن کو کسی منصوبے کے تحت ہوسٹن بھیجا گیا تھا تاکہ اسے خاموش کیا جا سکے۔ شاید وہ بولٹ مین کے چار افراد پر مشتمل فنانس ڈپارٹمنٹ کے بارے میں کچھ جان گیا تھا۔

کسی بڑی کمپنی میں گھسنا میرا کام نہیں تھا۔ اس کے لیے مجھے ایک راستہ چاہیے اور میں جانتا تھا کہ کس طرح اس میں داخل ہوا جا سکتا ہے۔ فلاڈلفیا واپس آنے کے ایک دن بعد میں مارتھا سے اس کے اپارٹمنٹ میں ملا۔ اس کا اپارٹمنٹ چھوٹا مگر بے حد صاف ستھرا تھا۔ اس میں لیونگ روم، بیڈروم اور کچن جیسی تمام سہولتیں موجود تھیں۔ کچن کے ساتھ ہی کونے میں ایک کمپیوٹر اور پرنٹر بھی رکھا ہوا تھا۔

میں نے اسے ایرون ہولٹ سے ہونے والی گفتگو کے بارے میں بتایا اور پوچھا۔ ''تمہیں پال کے کالج کا نام معلوم ہے؟'' وہ بولی۔ ''یونیورسٹی آف پنسلوانیا۔ یہ فلاڈلفیا میں ہی ہے۔''

''چارلی ڈیون پورٹ کے بارے میں کیا کہو گی؟''

''تم سمجھتے ہو کہ وہ...''

''وہ دیکھنے میں مجھے جوکر ہی لگ رہا تھا۔ لہٰذا اگر ایرون کی بیان کردہ کہانی کو ذہن میں رکھوں تو پہلا شک اسی پر جاتا ہے۔''

''تم چارلی کے بارے میں ایک بات نہیں جانتے۔ وہ میری لینڈ یونیورسٹی کا گریجویٹ ہے۔ کسی کو موریسن کے جانے کا پتا نہیں تھا۔ اس لیے جوکر کی تھیوری کو تو نظر انداز کر دو۔ یہ کہانی قتل کے محرکات پر پردہ ڈالنے کے لیے گھڑی گئی ہے۔ ذرا سوچو کہ موریسن کے کسی پرانے کالج فیلو کو جس کا تعلق بولٹ مین سے نہ ہو، یہ کیسے معلوم ہو سکتا ہے کہ موریسن ہوسٹن جا رہا ہے اور کب؟ جبکہ پال کو بھی اپنے جانے کا عین وقت پر علم ہوا، اور اسے وہاں کیوں بھیجا گیا تھا؟''

''کیونکہ چارلی نے وینو چین کو بتایا تھا کہ ہوسٹن میں ایک بڑے کرائے دار نے مسئلہ کھڑا کر دیا ہے جس کے لیے کسی کو وہاں بھیجنا بہت ضروری ہے۔ مارٹن کی بروقت آمد بھی بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ قاتل کا تعلق کیمڈین سے ہے۔ ممکن ہے کہ اسے دو دن پہلے بھیج دیا گیا ہو کہ وہ وہاں پہنچ کر موقع کا انتظار کرے۔''

وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''تم یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ چارلی نے اسے وہاں بھجوایا کیونکہ وہ موریسن کو قتل کرنا چاہ رہا تھا لیکن چارلی ایسا کیوں کرے گا۔ شاید اس لیے کہ موریسن کو وہ بات معلوم ہوگئی تھی۔''

''تم اس وقت بالکل کلیسا کے ممبر کی طرح بول رہی ہو۔''

اس کا ہاتھ اپنے کالر پر گیا اور وہ بولی۔ ''تم سرخ پن کے بارے میں جانتے ہو۔ تمہارا مشاہدہ بہت تیز ہے سراغ رساں منٹگمری۔''

''وہ میں نے اسی وقت دیکھ لیا تھا جب ہم تمہارے دفتر میں ملے تھے لیکن اس وقت تم نے وہ پن نہیں لگائی ہوئی ہے۔''

''میں اسے کام کے دوران میں لگاتی ہوں۔''

''تم بہت ہوشیار ہو۔ اب ہمیں آگے بڑھنے کے لیے کیا کرنا ہوگا؟'' میں نے پوچھا۔

''تم نے مشکل کام میرے لیے چھوڑ دیا۔ وہ کیا بات تھی جس نے پال کو پریشان کر دیا اور اسی وجہ سے وہ مارا گیا۔''

''ہم دونوں ایک ہی سمت میں سوچ رہے ہیں لیکن مسئلہ یہ ہے کہ مجھے آگے بڑھنے کا راستہ نہیں مل رہا۔''

''تم کسی غلط روی کے بارے میں سوچ رہے ہو؟''

''میرا اندازہ ہے کہ حسابات میں کچھ گڑبڑ ہے لیکن اس کے کھوج لگانے کا طریقہ سمجھ میں نہیں آ رہا۔''

''تم ڈپارٹمنٹ کے کمپیوٹر ڈیٹا کے بارے میں سوچ رہے ہو؟''

''ڈینو چین نے بتایا تھا کہ تم ریکارڈ کیپنگ کرتی ہو لیکن میں نے تمہاری میز پر ایک کمپیوٹر دیکھا تھا اور یہاں بھی......'' میں نے اس کے گھر میں رکھے ہوئے کمپیوٹر کی طرف اشارہ کیا۔

''مجھے تمام ریکارڈ کمپیوٹرائزڈ کرنا ہوتا ہے۔''

میں نے کافی کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ ''کیا تمہاری چارلی اور پال کے کمپیوٹر تک رسائی ہے؟''

''نہیں لیکن جب ان کے کمپیوٹر کام نہیں کرتے تو وہ مجھ سے مدد مانگتے ہیں۔ اس طرح مجھے ان کے پاس ورڈ معلوم ہوگئے ہیں اور میں یہاں بیٹھ کر بھی ان کے کمپیوٹر تک رسائی حاصل کر سکتی ہوں۔''

''اگر تمہیں کوئی ایسی بات معلوم ہو جس سے ہمیں آگے بڑھنے میں مدد مل سکے تو سب سے پہلے مجھے بتانا۔''

دو دن گزر گئے لیکن کوئی خاص بات معلوم نہیں ہو سکی۔ میں نے جون موریسن کو اب تک کی کارروائی سے آگاہ کیا اور خاص طور پر اسے ایرون ہولٹ سے ہونے والی

خدا کے لیے گولی نہ چلانا، میں کھڑکیاں صاف کر رہا ہوں

گفتگو کے بارے میں بتایا لیکن اب تک کوئی ایسی بات معلوم نہیں ہو سکی تھی جس سے مسئلے کے حل کی جانب پیشرفت ہو سکے۔ مجھے امید تھی کہ مارتھا اپنے کمپیوٹر کے ذریعے کچھ نہ کچھ معلوم کرنے میں کامیاب ہو جائے گی۔

تین دن بعد رات ساڑھے تین بجے مارتھا نے مجھے فون پر بتایا۔ ''میں نے چارلی کے کمپیوٹر کو پوری طرح کھنگال ڈالا اور ایک بے قاعدگی کا پتا چلا ہی لیا۔''

''کیسی بے قاعدگی؟''

''یہ تین بڑے سپلائرز کی طرف سے بھیجے جانے والے بلوں سے متعلق ہے۔ بولٹ مین سے جو ادائیگیاں کی گئیں وہ ان بلوں سے کچھ زیادہ تھیں۔''

''کتنی زیادہ؟'' میں نے پوچھا۔

''ایک منٹ، دیکھ کر بتاتی ہوں۔''

کئی منٹ بعد اس نے بتایا۔ ''میں تمہیں ایک مثال دے رہی ہوں۔ راک ہل اسفالٹ نے 1,340,045 ڈالر کا بل بھیجا تھا لیکن انہیں 1,348,045 ڈالر کی ادائیگی ہوئی۔''

''ممکن ہے کہ ٹائپنگ کی غلطی کی وجہ سے صفر کی جگہ آٹھ لکھ دیا گیا ہو۔''

''اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ راک ہل کے متعلقہ بندے کو آٹھ ہزار ڈالرز زیادہ ادا کر دیے گئے ہوں جس نے آدھی

رقم اپنی جیب میں رکھی اور آدمی......''

''چارلی ڈیون پورٹ کے حصے میں آئی۔ یہ کوئی بڑی رقم نہیں ہے لیکن اگر یہ سلسلہ چند سالوں سے چل رہا ہے تو اچھی خاصی رقم خرد برد ہو چکی ہو گی۔ اب تک تم نے ایسے کتنے بل دیکھے؟''

''گزشتہ بارہ مہینے کا ڈیٹا دیکھنے پر ایسی گیارہ مثالیں دیکھنے میں آئی ہیں۔ جن میں حال ہی میں ہونے والا سب سے بڑا غبن چالیس ہزار ڈالر کا ہے۔ اگر بارہ مہینے کا حساب لگایا جائے تو مجموعی طور پر یہ رقم ایک لاکھ ستائیس ہزار ڈالر بنتی ہے۔''

''پھر بھی یہ کچھ زیادہ نہیں ہے۔ اس رقم کے لیے اتنا بڑا خطرہ کیسے مول لیا جا سکتا ہے؟''

''چارلی پانچ سال سے کمپنی میں ہے۔ اس حساب سے اس نے کتنا کما لیا ہو گا۔''

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔'' میں نے کہا ''اور جب چارلی کو شک ہوا کہ پال اس بارے میں جان گیا ہے تو اس نے اسے راستے سے ہٹانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کے لیے ایرون کو دیے جانے والے سو ڈالر کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔ میں سوچ رہا ہوں کہ چارلی نے مارش کو کتنا معاوضہ دیا ہو گا۔ میرے دماغ میں ایک بات اور بھی آئی ہے وینوچین کے بارے میں کیا کہتی ہو؟''

''میں بھی اسی کے بارے میں سوچ رہی ہوں لیکن اس کے دفتر میں کمپیوٹر نہیں ہے لہٰذا ہمیں اخبارات کی رپورٹوں میں وسیع تحقیقات کے نتائج پر انحصار کرنا پڑے گا۔''

''میں تمہارا احسان مند ہوں مارتھا۔'' میں نے کہا۔

میں نے پولیس کی مدد حاصل کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگائی اور اپنے دوست لیفٹیننٹ اشٹین فلپ کو فون کر کے ساری کہانی گوش گزار کر دی۔ اس نے اپنی عادت کے مطابق کہا۔ ''تم نے خود ہی سارا کیس حل کر لیا۔ اب اسے میرے گلے میں کیوں ڈال رہے ہو؟''

''کسی بھی پرائیویٹ سراغ رساں کی طرح میں بھی ایک شہری کو گرفتار کر سکتا ہوں لیکن میرے پاس تو گن بھی نہیں ہے۔ میں تو بس ایک ریسرچ کرنے والا شخص ہوں۔ اب تم اسے سنبھالو، مجھے پبلسٹی کا کوئی شوق نہیں ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ میں تم سے رابطے میں رہوں گا۔''

دو ہفتے بعد چھاپے کا پروگرام ترتیب دیا گیا۔ بدھ کی صبح دس بجے بولٹ مین کے فنانس ڈپارٹمنٹ میں مجھے بھی مدعو کیا گیا تھا۔ میں چند منٹ پہلے وہاں پہنچ گیا۔ مارتھا نے گرم جوش مسکراہٹ کے ساتھ میرا استقبال کیا۔ چارلی نے مجھے دیکھا اور بولا۔ ''تم نے کوئی نئی بات معلوم کی یا مارتھا سے ملنے کے بہانے چلے آئے؟''

پھر اس نے میرے عقب میں جھانکا۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ دو سادہ لباس اور دو وردی میں ملبوس پولیس والے راہداری سے گزر کر ہماری طرف آ رہے تھے۔ چارلی نے اپنی کرسی کو پیچھے کی طرف دھکیلا اور ہال وے کی طرف جانے کی کوشش کی۔ اس موقع پر مجھے بھی اپنا حصہ ڈالنا پڑا اور میں نے آگے بڑھ کر اسے قابو کر لیا۔

جب پولیس والے چارلی کو ہتھکڑی لگا کر لے جا رہے تھے میں نے مارتھا سے کہا۔ ''میں اب بھی تمہارا احسان مند ہوں۔''

''بار بار یہ بات کہنے کی ضرورت نہیں۔'' وہ شرارت سے مسکراتے ہوئے بولی۔

''کم از کم آج کی رات ڈنر تو میرے ساتھ کر لو۔''

''ٹھیک ہے۔ میں آ جاؤں گی۔''

تھوڑی سی تفتیش کے بعد وینوچین اس معاملے میں بے قصور پایا گیا لیکن اسے بدانتظامی کا ذمے دار قرار دیا گیا اور تھوڑے عرصے بعد ہی مارتھا کو اس کی جگہ عارضی طور پر ذمے داری سونپ دی گئی جو بعد میں مستقل ہو گئی۔

جب وہ ڈنر پر آئی تو اس کی سج دھج نرالی تھی۔ اس نے جان بوجھ کر اپنے بالوں کو کھلا چھوڑ دیا تھا اور ریستوران میں داخل ہوتے ہی اپنا چشمہ اتار کر پرس میں رکھ لیا۔ اس نے سرخ بلاؤز اور سیاہ اسکرٹ پہن رکھا تھا اور اس لباس میں غضب ڈھا رہی تھی لیکن وہ سرخ پن اب بھی اس کے کالر میں لگی ہوئی تھی۔ کھانا ختم ہوا تو میں اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر بولا۔ ''مارتھا، کیا تم مجھ پر ایک احسان اور کر سکتی ہو؟''

اس نے آہستہ سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور بولی۔ ''کیا تم ساری زندگی میرے احسانوں کے بوجھ تلے گزارنا چاہتے ہو؟''

''اسے میں اپنی خوش نصیبی سمجھوں گا۔''

''ٹھیک ہے پھر مجھے کوئی اعتراض نہیں۔'' اس نے اپنی مخصوص مسکراہٹ سے کہا۔

میں نے باہر جھانک کر دیکھا۔ رات کی رنگینیاں اپنے شباب پر تھیں۔ اب میرے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں؟ ۔

- ✧ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✧ ہر ای بُک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✧ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
  سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✧ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابنِ صفی کی مکمل رینج
- ✧ ایڈ فری لنکس، لنکس کو پیسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ✧ ہر ای بُک کا ڈائریکٹ اور رژیوم ایبل لنک
- ✧ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بُک کا پرنٹ پریویو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✧ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✧ مشہور مصنفین کی کُتب کی مکمل رینج
- ✧ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✧ ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- ✧ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

⇦ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

⇦ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

Online Library For Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety

twitter.com/paksociety1

یہ ایک پرفیکٹ مرڈر ہوگا... اتنا پرفیکٹ کہ اس کا تصور ذہن میں آتے ہی ایمس کے ہونٹوں پر ایک دلآویز مسکراہٹ ابھر آئی اور اس نے اپنی پوری توجہ اپنے کام پر مرکوز کر دی۔

وہ دبے پاؤں ایمس رابرٹسن سائنٹیفک کے اپنے پارٹنر رابرٹسن کے عقب میں پہنچا اور نائیلون کی رسی اس کی گردن میں ڈال کر اسے مضبوطی کے ساتھ کسنے لگا۔

رابرٹسن نے ہاتھ پیر مارنا شروع کر دیے اور خود کو بچانے کی بھرپور جدوجہد کرنے لگا۔ اس کشمکش میں جیت بالآخر ایمس کی ہو گئی اور رابرٹسن کا جسم ڈھیلا پڑ گیا۔ اس کے چہرے کی رنگت نیلی ہو چکی تھی، زبان باہر نکل آئی تھی اور نبض بھی رک گئی تھی۔

ہاں، رابرٹسن مر چکا تھا۔

ایمس نے اپنے لیے ایک جام تیار کیا اور خاموشی کے ساتھ اپنی اس کامیابی کا جشن منانے لگا۔ اب وہ وجود میں آنے والی واحد ٹائم مشین کا اکلوتا مالک تھا۔

**چونکا دینے والے انجام سے مزین... مغرب کی جدت پسندی...**

جدید سے جدید تر ایجادات انسانوں کے لیے ہیں... ایک ایسی ہی سائنسی ایجاد کا تحیّر خیز قصہ وہ بھرپور... مستحکم اور پُریقین... مگر اچانک ہی سب کچھ تہس نہس ہو گیا... وہ یقین سے بے یقینی کے خلا میں پرواز کر گیا...

# پرفیکٹ مرڈر

## بابر نعیم

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام

اس کا نرا احمق سائنس داں ساتھی رابرٹسن اس ٹائم مشین کو انسانیت کی بہتری کے لیے استعمال میں لانا چاہتا تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ اس ٹائم مشین کے ذریعے ماضی میں جا کر ایسی تبدیلیاں لے آئے جو تاریخ کو بدل دے یا مستقبل میں سفر کر کے ان بیماریوں کا علاج ڈھونڈ کر لے آئے جو حال میں ناقابلِ علاج ثابت ہو رہی تھیں جیسے کہ ایڈز، ہیپاٹائٹس سی، شوگر وغیرہ۔

لیکن ایمس اپنی اس ایجاد کو اچھے کاموں کے لیے وقف کرنے پر قطعی آمادہ نہیں تھا۔ اسے یہ بات انتہائی مضحکہ خیز لگتی تھی کہ اس ایجاد سے بڑے بڑے فائدے اور منافع نہ حاصل کیا جائے۔ اس کا موٹو یہی تھا کہ فیض سب سے پہلے خود حاصل کرنا چاہیے۔

اور اب وہ اپنے اس موٹو پر آسانی سے عمل کر سکتا تھا۔ وہ اس ٹائم مشین کو خطیر رقوم کے عوض کرائے پر دے کر جلد ہی دولت مند بن سکتا تھا۔

لیکن اس انتہائی پرفیکٹ مرڈر کو تکمیل تک پہنچانے کے لیے ابھی ایک حتمی عمل باقی تھا... لاش کو ٹھکانے لگانا۔

وہ رابرٹسن کی لاش کو کسی جھیل میں نہیں پھینکنا چاہتا تھا۔ نہ ہی کسی بھٹی میں جلانا چاہتا تھا اور نہ ہی کسی آرے سے اس کے ٹکڑے کرنے کا ارادہ رکھتا تھا... قطعی نہیں۔

اس کا ذہن ایک نئی اختراع چاہتا تھا۔ ایک ایسا منصوبہ، ایک ایسی اختراع جس میں ڈی این اے کے امکان کی کوئی گنجائش باقی نہ رہے تاکہ ڈراؤنے خواب اس کی زندگی اجیرن نہ کر سکیں۔

ایمس نے ٹائم مشین اسٹارٹ کر دی اور رابرٹسن کی لاش کو گھسیٹ کر ٹائم مشین میں لے آیا۔

''تمہارے مستقبل میں سفر کرنے کا وقت آ گیا ہے، رابرٹسن اولڈ بوائے۔'' ایمس نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔

اسے کون سے سال میں بھیجنا چاہیے؟ ایمس نے خود سے پوچھا۔ سن 2099 میں؟ نہیں، کوئی جفت نمبر ہونا چاہیے لیکن اتنی دور کا سال ہونا چاہیے کہ اس سلسلے میں اس پر کبھی کوئی مقدمہ نہ چل سکے۔

تو پھر سال 2120ء ٹھیک رہے گا۔

ایمس نے مشین میں چند نمبر ڈائل کیے۔ مشین میں بھن بھن کی سی آواز آنے لگی۔ ایمس کو اطمینان ہو گیا۔ وہ سکون سے بیٹھ گیا اور آنکھیں بند کر لیں۔

مشین نے آن ہونے میں زیادہ وقت نہیں لیا۔ ایمس نے اپنی دستی گھڑی پر نظر ڈالی۔ بہ مشکل ایک منٹ لگا ہو گا۔

ایمس نے مشین کے ویو فائنڈر کا جائزہ لینا شروع کیا۔ اسکرین پر ایک عجیب سی دنیا کا منظر تھا۔ ہر طرف چمکدار دھاتوں کی بنی ہوئی بلند و بالا عمارتیں دکھائی دے رہی تھیں۔ متحرک روشن فٹ پاتھوں پر انسانوں کے ساتھ روبوٹ بھی رواں دواں نظر آ رہے تھے۔

ایمس نے رابرٹسن کی لاش آؤٹ کے پھسلواں چیمبر میں لڑھکا دی اور ایجیکٹ کا بٹن دبا دیا۔

''گڈ بائے اولڈ بوائے۔'' ایمس بڑبڑایا۔

پھر وہ رابرٹسن کے بے حس و حرکت جسم کو قلابازیاں کھاتے بائیسویں صدی کی دنیا کی جانب لپکتے دیکھتا رہا۔ اس دوران اس نے تیزی کے ساتھ اس مشین پر حال کا وقت اور تاریخ بھی ڈائل کر دی تھی جہاں وہ خود کچھ دیر پہلے موجود تھا۔

ایک بار پھر ابھی ایک منٹ بھی نہیں گزرا تھا کہ وہ واپس حال میں آ چکا تھا۔ ہر شے اسی طرح اپنی جگہ موجود تھی جس حالت میں وہ انہیں چھوڑ گیا تھا۔ اس کی لیبارٹری، باہر کے سمندر کا نظارہ... باہر سڑک پر اس کا پسندیدہ کیفے!

ایمس کو اب بھوک لگ رہی تھی۔ وہ اپنے پسندیدہ کیفے میں چلا گیا اور اپنے لیے اسپیشل ڈنر کا آرڈر دیا۔ کھانے سے بھرپور لطف اٹھانے کے بعد اس نے ویٹرس کو فیاضی کے ساتھ ٹپ بھی دی اور سیٹیاں بجاتا، گنگناتا ہوا اپنے گھر کی جانب چل دیا۔

اسے احساس تھا کہ آئندہ چند دنوں میں لوگ رابرٹسن کے بارے میں اس سے سوالات پوچھنا شروع ہو جائیں گے۔ لیکن اسے اس بات کی قطعی فکر نہیں تھی۔

درحقیقت اس کا منصوبہ تو یہ تھا کہ رابرٹسن کے بارے میں تشویش میں مبتلا ہونے والوں میں سب سے پہلی آواز اسی کی ہو۔ وہ اس سلسلے میں رابرٹسن کی گاہے بہ گاہے رہنے والی گرل فرینڈ کے بارے میں بھی شبہ کا اظہار کر سکتا ہے کہ کہیں اس نے رابرٹسن کو قتل نہ کر دیا ہو۔

اور اگر پولیس خود اس کے بارے میں کوئی شبہ کرتی ہے تو...

تو پھر کیا ہوا؟ کسی قسم کا ثبوت تو موجود نہیں تھا۔ رابرٹسن کی لاش سو سال کے بعد ہی سامنے آئے گی۔ اس وقت تک تو وہ خود بھی مر چکا ہو گا۔ تب کوئی اس کا کیا بگاڑ سکے گا؟

ایمس اس رات اطمینان کی نیند سو گیا۔ یہ خیال اس کے لیے انتہائی اطمینان بخش تھا کہ وہ جلد ہی ایک امیر کبیر آدمی بن جائے گا۔

☆☆☆

اس کا فوری طور پر پولیس کو خبر کرنے کا کوئی ارادہ نہیں

تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ پہلے سیدھا اپنی لیبارٹری جائے گا، وہاں چند گھنٹے گزارنے کے بعد پھر رابرٹسن کی رہائش گاہ فون کرے گا جیسے وہ اپنے پارٹنر کے بارے میں فکرمند ہو کہ وہ کہاں رہ گیا ہے۔

صبح کا وقت تیزی سے گزر گیا۔

ایس نے اس دوران رابرٹسن کے فون پر جواب ریکارڈ کرنے والی مشین پر دو پیغام چھوڑے۔ پہلے پیغام میں اس نے قدرے جھنجلاہٹ کا اظہار کیا تھا۔ البتہ دوسرے پیغام میں اس کے لہجے سے فکرمندی عیاں تھی۔

اس نے سوچا کہ وہ پولیس کو لنچ کے بعد ہی فون کرے گا۔

☆☆☆

اپنے پسندیدہ کیفے میں شاندار سلاد سے لطف اندوز ہونے کے دوران وہ خاموشی سے ان چرب زبان جملوں کی ریہرسل کرتا رہا جنہیں وہ رابرٹسن کے بارے میں اپنی تشویش کے اظہار کے طور پر پولیس کے روبرو استعمال کرنا چاہتا تھا۔

لنچ سے واپس اپنی لیبارٹری جاتے ہوئے وہ بے حد خوش تھا۔ اب وہ کسی پرائیویٹ انڈسٹری یا حکومتی اداروں کے لیے گھٹیا معاوضے پر کام نہیں کرے گا۔ آئندہ ہفتے تک اس کی حیرت انگیز ٹائم مشین تمام میڈیا پر شہ سرخیوں کی زینت ہوگی۔ اس پُرمسرت خیال سے وہ خوشی سے پھولے نہیں سما رہا تھا۔

لیبارٹری میں داخل ہوتے ہی اسے فوری طور پر کسی قسم کی گڑبڑ کا احساس ہوا۔ لیبارٹری کے تمام دروازے لاک تھے لیکن اس کے باوجود بھی...

ٹائم مشین کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔

”یہ کیا...“ ایس ٹائم مشین کی جانب لپکا۔

تب کسی نے عقب سے اسے جکڑ لیا اور اس کی گردن میں ایک رسی لپیٹ دی۔

”ہیلپ!“ ایس نے ہانپتے ہوئے پکارا۔

”اب بہت دیر ہوگئی، پارٹنر۔“ رابرٹسن کی آواز ابھری۔

ایسا ممکن نہیں ہوسکتا، ایس نے سوچا۔ اسے تو میں نے مردہ حالت میں سن 2120ء میں پہنچا دیا تھا۔

لیکن یہ ممکن ہوگیا تھا۔

اس کی وضاحت رابرٹسن نے خود ہی کر دی۔ ”تم نے مجھے ایک حیرت انگیز دور میں پہنچا دیا تھا۔ میرا جسم تو مردہ ہوگیا تھا لیکن میرا دماغ زندہ تھا۔ مستقبل کے لوگ بے حد ترقی یافتہ ہیں۔ انہوں نے نہ صرف میرے جسم کو زندہ کر دیا بلکہ مجھے واپس اپنے دور میں بھی بھیج دیا تاکہ میں انصاف کا تقاضا پورا کرسکوں۔“

”پولیس...“ الفاظ بہ مشکل تمام ایس کے حلق سے ادا ہورہے تھے۔ ”تم... تم بچ نہیں سکو گے... تم...“

”یہ تمہاری خام خیالی ہے، پارٹنر۔ میں صاف بچ نکلوں گا۔ تم نے مجھے بہت عمدہ سبق سکھایا ہے۔ میں تمہاری غلطی ہرگز نہیں دہراؤں گا۔ میں تمہیں آگے مستقبل میں نہیں بھیجوں گا۔ میں تمہیں ماضی میں پہنچا دوں گا تاکہ تم کبھی لوٹ کر واپس نہ آسکو۔“

یہ کہہ کر رابرٹسن نے ایس کی گردن میں لپٹی ہوئی رسی کو ایک جھٹکا دیا۔

ایس کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی اور اس کا ذہن تاریکیوں میں ڈوب گیا۔

## مہنگی پینٹنگز

پکاسو نے اپنے چند دوستوں کو لنچ پر مدعو کیا۔ دوستوں میں سے ایک نے کھانا کھاتے ہوئے کمرے کو بغور دیکھا اور بولا۔

”میں دیکھ رہا ہوں کہ یہاں تمہاری کوئی پینٹنگ دیوار پر کہیں نظر نہیں آرہی ہے، تمہیں اپنی پینٹنگز ناپسند ہیں۔“

پکاسو جواب دیتے ہوئے بولا۔ ”دراصل بات یہ ہے کہ مجھے اپنی پینٹنگز بے حد پسند ہیں لیکن افسوس کہ یہ اس قدر گراں قیمت ہیں کہ میں انہیں خریدنے کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتا۔“

☆☆☆

## تیسری شادی

ایک عورت (اپنی سہیلی سے): ”سنا ہے تم تیسری شادی کر رہی ہو؟“

عورت: ”بالکل صحیح اور اصل بات یہ ہے کہ میرا پہلا شوہر اللہ کو پیارا ہوگیا اور دوسرا پڑوسن کو۔“

فتح پور لیہ سے سید محی الدین اشفاق

# حرصِ دوراں

### کاشف زبیر

پربت کی اونچی چوٹی کو دیکھنے سے یوں لگتا ہے کہ وہ دور نہیں... بلکہ پربت کے دامن سے بالکل قریب تر ہے... لیکن جب پتھریلے راستے اور برف سے بچھی سرد و سخت راہیں طے کرنی ہوں تو چڑھتے جائو... بڑھتے جائو... مگر نظروں کے سامنے ہوتے ہوئے بھی وہ قدموں سے دور کھسکتی چلی جاتی ہے... وہ بھی ایک ایسے ہی ناتراشیدہ راستوں پر گامزن تھے... قدم قدم پر موت انہیں گلے لگانے کو تیار تھی... مگر ان کا حوصلہ... ہمت اور عقابی نگاہیں پہاڑوں کی چٹانوں پر مسلسل چڑھنے پر آمادہ تھیں... انہیں ہر صورت چوٹی تک پہنچنا تھا... سنسنی... تجسس... کے سنگ ہم قدم... دیوانوں اور فرزانوں کا سفرِ زروزن...

**گل وگلزار اور فطرت کے حسین نظاروں کو انسانی لہو سے داغ دار کردینے والوں کے گھناؤنے کردار کی جھلکیاں...**

وہ تقریباً چالیس برس کا خوش شکل اور کسرتی جسم کا مضبوط مرد تھا۔ اس نے بغیر آستین کی جیکٹ کے نیچے نصف آستین کی ٹی شرٹ پہنی تھی۔ جینز کی پتلون کے ساتھ اس نے ٹخنوں تک اونچے جوگر اور گلے میں فلسطینی رومال باندھا ہوا تھا۔ وہ لکڑیوں کی تکون سے لٹکی کیتلی میں چائے بنا رہا تھا۔ پکی سڑک سے ذرا دور ایک بلند ہوتے پہاڑ کے دامن میں شام کا اندھیرا بہت تیزی سے پھیل رہا تھا۔ وہ اکیلا تھا اور ابھی کچھ دیر پہلے پہنچا تھا۔ اس نے سب سے پہلے لکڑیاں جمع کر کے الاؤ روشن کیا اور چائے کی کیتلی چڑھائی تھی۔ نزدیک ہی اس کا بڑا سا رک سک رکھا ہوا تھا۔ یہ مہم جوؤں اور ہائیکرز کے استعمال میں آنے والا مخصوص بیگ تھا۔ اس میں خاصا سامان آجاتا ہے اور یہ مضبوط بھی ہوتا ہے۔ پھر اسے آسانی سے پشت پر یوں باندھا جاسکتا ہے کہ چلنے میں دشواری پیش نہ آئے۔

سورج مغرب کی طرف ڈھل چکا تھا۔ نیچے میدان کی طرف سے ایک وین نمودار ہوئی۔ کچھ دیر بعد وہ سڑک کے کنارے رکی اور اس سے ایک جوڑا اُترا۔ وہ اپنا سامان اتار رہا تھا۔ ان کے پاس تین بڑے بیگ تھے اور دو افراد کے لحاظ سے یہ خاصا سامان تھا جبکہ ان میں ایک لڑکی بھی تھی۔ اس نے جینز کے ساتھ پوری آستین کی شرٹ اور اوپر کسی قدر ڈھیلا ہاف سویٹر پہنا ہوا تھا۔ لڑکی کی عمر پچیس چھبیس سے زیادہ نہیں تھی۔ وہ دلکش اور اپنے حلیے سے قطع نظر مشرقی نقوش رکھنے والی لڑکی تھی۔ مرد پینتیس کے آس پاس تھا اور اس کے سرخی مائل بال پیچھے کی طرف جمے ہوئے تھے۔ ناک تلے سرخ رنگ کی ہلکی مونچھیں تھیں۔ اپنے انداز اور حلیے سے وہ اسمارٹ اور تیز طرار شخص لگ رہا تھا۔ وین کے آگے جانے کے بعد ان دونوں نے ایک ایک بیگ اٹھایا اور اس کی طرف آنے لگے۔

''ہیلو۔'' مرد نے نزدیک آکر کہا۔ ''کیا تم بھی کرتوک کی طرف جا رہے ہو۔''

آدمی نے سر ہلایا۔ ’’ہاں لیکن میری منزل اس سے آگے کرتوک گلیشیر ہے۔‘‘

’’ہم بھی اسی طرف جا رہے ہیں۔‘‘ لڑکی نے بے تکلفی سے کہا۔

’’میں راؤ ظفر ہوں۔‘‘ مرد نے تعارف کرایا۔ ’’یہ مائرہ ہے۔‘‘

’’تم لوگوں سے مل کر خوشی ہوئی۔‘‘ مرد نے سر ہلایا۔ ’’مجھے عمر داؤد کہتے ہیں۔‘‘

’’اگر تم اجازت دو تو ہم بھی یہیں پڑاؤ ڈال لیں؟‘‘ ظفر نے پوچھا تو عمر مسکرایا۔

’’یہ جگہ کسی کی ملکیت نہیں ہے جو چاہے رک سکتا ہے اور جہاں مرضی ہو رک سکتا ہے۔‘‘

جب تک ظفر اس سے بات کر رہا تھا، مائرہ جا کر تیسرا بیگ بھی اٹھا لائی۔ عمر کو عجیب لگا تھا۔ اصولاً مرد ہونے کے ناتے یہ کام ظفر کو کرنا چاہیے تھا۔ مگر ہو سکتا ہے کہ وہ آپس میں صنفی امتیاز کے قائل نہ ہوں۔ ظفر نے مائرہ کا صرف تعارف کرایا تھا، اس سے اپنا تعلق واضح نہیں کیا تھا۔ وہ کم سے کم میاں بیوی تو نہیں تھے یا اگر تھے تو بہت منفرد قسم کے میاں بیوی تھے۔ عمر کی طرف سے چائے کی پیشکش انہوں نے شکریے کے ساتھ قبول کر لی۔ عمر نے جہاں الاؤ جلایا تھا یہ جگہ الاؤ کے لیے ہی مخصوص تھی۔ چھوٹی سی پیالے نما جگہ کے گرد بڑے سائز کے پتھر بہ طور نشست کے رکھے تھے۔ جو مسلسل الاؤ جلانے سے سیاہ ہو چکے تھے۔ وہ دونوں پتھروں پر آ گئے۔ چائے کے لیے انہوں نے اپنے دھاتی مگ نکال لیے تھے۔ یہ دہری تہ والے تھے جن میں گرم چیز زیادہ دیر تک گرم رہتی تھی۔ چائے نوشی کے دوران عمر نے سرسری انداز میں پوچھا۔

’’تمہارا سامان کچھ زیادہ نہیں ہے؟‘‘

’’ہاں لیکن ہم نے پورٹر لیا ہے۔ وہ رات یا صبح کسی وقت اوپر سے آئے گا۔‘‘

’’آپ کا تعلق کہاں سے ہے؟‘‘ مائرہ نے پوچھا۔

’’ملک کے سب سے بڑے شہر سے۔ مگر ان دنوں میری پوسٹنگ دارالحکومت میں ہے۔‘‘

ظفر مسکرایا۔ ’’اور ہم ملک کے دوسرے بڑے شہر کے باسی ہیں۔‘‘

ان کے درمیان گپ شپ ہوتی رہی۔ عمر داؤد ایک سرکاری ادارے میں آفیسر تھا۔ وہ سارے سال تن دہی سے اپنے فرائض سر انجام دیتا تھا اور گرمیوں میں اس کا مشغلہ ہائکینگ اور ٹریکنگ تھا۔ دو مہینے کے لیے وہ سامان باندھتا اور روانہ ہو جاتا تھا۔ سفر کا بیشتر حصہ وہ پیدل چلتا تھا۔ ہاں اگر فاصلہ طویل ہو تو وہ گاڑی کر لیتا تھا۔ جیسے آج وہ ایک شمالی شہر سے یہاں تک وین سے پہنچا تھا۔ وین نے تین گھنٹے میں اسے یہاں پہنچایا تھا اور صبح وہ یہاں سے آگے سفر کا آغاز کرتا۔ سڑک یہیں تک تھی اور اس کے بعد سارا سفر کچے پکے راستوں پر تھا۔ عمر پہلی بار اس طرف آیا تھا۔ اس نے ظفر اور مائرہ کو بھی بتایا تھا۔ ان دونوں کا اس مخصوص ٹریک پر یہ دوسرا سفر تھا۔ وہ پچھلے سال یہاں آئے تھے اور یہ جگہ انہیں اتنی اچھی لگی

Downloaded From

کہ وہ اس سال بھی یہاں آئے تھے۔ مائرہ ایک بڑے اخبار کے لیے فوٹوگرافی کرتی تھی۔ البتہ ظفر نے صرف اتنا بتایا کہ وہ بزنس کرتا تھا۔ ان کی زیادہ تر گفتگو ٹریک کے بارے میں ہوئی تھی۔

تاریکی چھانے پر عمر اپنی جگہ سے اٹھا اور اس نے رک سک سے خیمہ نکال کر لگانا شروع کر دیا۔ یہ کسی قدر اِگلو نما خیمہ تھا۔ اس کا ابتدائی حصہ تقریباً چار فٹ قطر کے گنبد جیسا تھا۔ اس گنبد سے ایک حصہ باہر نکلا ہوا تھا اور خیمے کی صورت ٹیبل ٹینس کے بلے جیسی تھی۔ ظفر اور مائرہ نے اپنے لیے چھوٹے خیمے نما سلیپنگ بیگ نکالے تھے۔ عمر کا رک سک اس کے خیمے میں آگیا تھا مگر ان کے سامان کے لیے سلیپنگ بیگز میں جگہ نہیں تھی۔ جس وقت وہ خیمے لگا رہے تھے جنوب کی طرف سے ایک ہلتی روشنی نمودار ہوئی تھی جو اسی طرف آ رہی تھی۔ اس علاقے میں یہی ایک سڑک تھی، اس کے ایک طرف پہاڑ اور دوسری طرف نشیبی علاقہ تھا۔ چند منٹ بعد کسی قدر طویل قامت اور دبلے جسم کا ایک ادھیڑ عمر شخص ان کے سامنے تھا۔

اس کے الجھے بال کھچڑی ہو رہے تھے اور اس نے پشت پر ایک چھوٹا بیگ باندھ رکھا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں واکنگ اسٹک اور دوسرے ہاتھ میں چھوٹی سی ٹارچ تھی۔ اس کا پھولا سانس بتا رہا تھا کہ وہ خاصی دور سے پیدل آ رہا ہے۔ وہ الاؤ کے پاس پتھر پر بیٹھ کر سانس درست کرنے لگا۔ عمر نے بچ جانے والی چائے اسے گرم کر کے دی جو اس نے شکریے کے ساتھ قبول کر لی۔ چائے کا مگ خالی کر کے اس نے پھر شکریہ ادا کیا اور بولا۔

”جس گاڑی میں، میں آ رہا تھا وہ یہاں سے کوئی سات میل پہلے خراب ہو گئی اور اس کے بعد کسی گاڑی والے نے لفٹ بھی نہیں دی۔“

مائرہ نے ہمدردی سے کہا۔ ”سات میل بہت ہوتے ہیں، آپ تھک گئے ہوں گے؟“

”ہاں مگر کچھ دیر میں ٹھیک ہو جاؤں گا۔“ اس نے بے پروائی سے کہا۔ شاید وہ ایک عورت کے سامنے خود کو کمزور ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس کا مختصر بیگ بتا رہا تھا کہ اس کے پاس خیمہ یا سلیپنگ بیگ نہیں تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے اپنے بیگ سے ایک ربر شیٹ نکالی اور اس میں ہوا بھر کر نیچے بچھا کر اس پر لیٹ گیا۔ ظفر اور مائرہ نے باقاعدہ ڈنر کیا تھا۔ انہوں نے ٹن پیک کھانے گرم کر کے کھائے تھے۔ عمر نے خشک چنے اور ابلے ہوئے لوبیا کے ایک ٹن سے ڈنر کیا تھا۔ البتہ چوتھا فرد جس نے ابھی تک اپنا تعارف نہیں کرایا تھا اس نے کچھ نہیں کھایا تھا۔ کسی نے اس سے پوچھا بھی نہیں۔ سب ہی نو بجے تک اپنے خیموں اور سلیپنگ بیگز میں سونے چلے گئے تھے کیونکہ انہیں یہاں سے صبح سویرے روانہ ہونا تھا۔ کل کا سفر سب سے دشوار تھا جو خشک اور گرم پہاڑوں سے گزرتا تھا اور وہاں نہ تو سبزہ تھا اور نہ پینے کے لیے پانی۔ اس لیے سڑک سے سفر کا آغاز کرنے والے ہائکرز اور ٹریکرز صبح سویرے اپنے سفر کا آغاز کرتے تھے۔

صبح عمر کی آنکھ کھلی تو باہر تاریکی تھی۔ اس کے خیال میں وہ سب سے پہلے اٹھا تھا کیونکہ باہر خاموشی تھی۔ مگر جب وہ خیمے سے باہر آیا تو اس نے ادھیڑ عمر شخص کو الاؤ کے بجھتے انگاروں کے پاس بیٹھے سگار پیتے پایا۔ عمر نے ناشتے کے لیے دلیا چڑھا دیا اور پھر خیمہ سمیٹنے لگا۔ اس دوران میں ظفر اور مائرہ بھی جاگ گئے تھے۔ عمر کے پاس خشک دودھ تھا جسے اس نے دلیے کے ساتھ استعمال کیا اور کچھ دیر میں گرما گرم دلیا تیار تھا۔ اس نے ان تینوں کو بھی پیشکش کی مگر صرف ادھیڑ عمر آدمی نے اس کی پیشکش قبول کی۔ مائرہ اور ظفر کے پاس ابلے انڈے، ڈبل روٹی اور مکھن تھا، انہوں نے ان چیزوں سے ناشتا کیا تھا۔ دلیے کے ساتھ کافی تھی۔ ناشتے سے فارغ ہوتے ہی مائرہ اور ظفر نے بھی سامان باندھنا شروع کر دیا۔ ابھی تاریکی تھی کہ اوپر پہاڑ سے ایک ہیولا نیچے آتا دکھائی دیا۔ نزدیک آنے پر وہ مائرہ اور ظفر کے لیے آنے والا پورٹر ثابت ہوا۔ اس نے آتے ہی پُرزور انداز میں سلام کیا اور اپنا تعارف کرایا۔

”امارا نام گل خان پورٹر ہے۔“

عمر ہنسا۔ ”پورٹر تمہارے نام کا حصہ ہے۔“

”نہیں جی۔“ اس نے جھینپ کر کہا۔ ”ام پورٹر ہے اس لیے سب گل خان پورٹر کہتا ہے، اس سے پہچاننے میں آسانی ہوتی ہے۔“

”کیا تمہارے علاقے میں بہت سے گل خان ہیں؟“ مائرہ بولی۔

”بوت سے بھی زیادہ، ہر تیسرا آدمی اور گل خان اے۔ ام گل خان پورٹر کہلاتا ہے۔“ اس نے کہا اور ظفر و مائرہ کے بیگز کا جائزہ لیا۔ اس نے دو بیگز اٹھا لیے اور ایک ظفر نے اٹھایا تھا۔ عمر نے اپنا رک سک پیک کر لیا تھا۔ اس نے گل خان سے پوچھا۔ ”اس راستے پر اتنا سامان اٹھا کر سفر کر لو گے؟“

”اوپر گدھا ہے، وہ نیچے نہیں آسکتا۔ سامان وہ

اٹھائے گا۔"

ادھیڑ عمر آدمی سب سے پہلے اپنا سامان پیک کر چکا تھا اور اس وقت پتھر پر بیٹھا سگار پی رہا تھا۔ جب سب روانہ ہوئے تو وہ آخر میں اٹھا تھا۔ مائرہ آگے گل خان کے ساتھ تھی اور ظفر عمر کے ساتھ چل رہا تھا۔ ظفر نے کہا۔ "یہ آدمی کچھ عجیب نہیں ہے۔"

عمر نے شانے اچکائے۔ "ہم سب عجیب ہیں۔ پہاڑوں کی طرف آنے والے عجیب ہی ہوتے ہیں۔"

"اس نے تعارف نہیں کرایا اور نہ ہی ہم سے ہمارے نام پوچھے۔"

"ضرورت بھی کیا ہے، ہم جانتے ہیں وہ انسان ہے اور وہ جانتا ہے کہ ہم بھی انسان ہیں۔"

"اس کے پاس سامان بھی کم ہے۔"

"سفر کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ انسان کم سے کم سامان کے ساتھ گزارا کرے۔" عمر نے کہا۔ ذرا سی دیر میں وہ خاصی بلندی پر آ گئے تھے۔ اگرچہ موسم خنک تھا لیکن عمر نے آج پوری آستین کی شرٹ پہنی تھی اور جیکٹ اتار دی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ جیسے ہی سورج نکلے گا یہاں خشک چٹانیں تپنا شروع ہو جائیں گی اور اس کے بعد ان کے چند گھنٹے بہت سخت گزریں گے۔ وہ سورج نکلنے اور اس کی تپش پھیلنے سے پہلے زیادہ سے زیادہ فاصلہ طے کر لینا چاہتے تھے اس لیے عمر نے زبان کے بجائے پیروں کو حرکت دینا زیادہ مناسب سمجھا۔ وہ سر جھکائے تیز قدموں سے ڈھلان پر چڑھ رہا تھا۔ بلندی پر پہنچ کر اس نے مڑ کر دیکھا۔ سورج نکلنے سے پہلے روشنی ہو چکی تھی۔ وہ ادھیڑ عمر شخص کو دیکھ رہا تھا، اس کا خیال تھا کہ وہ خاصا پیچھے ہوگا مگر اسے حیرت ہوئی جب اس نے اسے مشکل سے سو قدم پیچھے پایا۔ ظفر نے حیرت سے کہا۔

"یہ اتنی جلدی یہاں تک آ گیا۔"

"یہ ہلکا ہے، سامان میں بھی اور جسمانی طور پر بھی شاید اس لیے ہم سے تیز ہے۔"

"کل تو یہ ایسے ہانپ رہا تھا جیسے دمے کا مریض ہو۔"

"سات میل چلنا آسان نہیں ہے، وہ بھی دن کے آخری حصے میں۔ ابھی یہ تازہ دم ہے، شام تک دیکھیں گے اس کا اسٹیمنا۔"

وہ جس پہاڑ کے اوپری حصے میں تھے اس کے آگے ایک پتلا سا راستہ بھوری چٹانوں کے درمیان سے گزرتا ہوا مزید بلندی کی طرف جا رہا تھا مگر یہاں پہاڑ نہیں تھے بلکہ یہ پلیٹو قسم کا میدان تھا جس میں چٹانوں کا راج تھا۔ گل خان پہلے پہنچ کر اپنے گدھے پر سامان لاد رہا تھا اور ساتھ ہی مائرہ کو اپنے علاقے کے بارے میں بتا رہا تھا۔ مائرہ کے تاثرات بتا رہے تھے کہ کوئی سنجیدہ یا تشویشناک بات ہے، اس نے آواز دے کر ظفر کو بلایا تو وہ اس کی طرف چلا گیا۔ عمر کے پاس پانی کی ایک بڑی بوتل تھی جس میں تقریباً دس لیٹر پانی تھا۔ اسے امید تھی کہ اس راستے پر پانی کی یہ مقدار کافی رہے گی۔ عمر ان کے پاس سے گزرا تو وہ آپس میں بات کر رہے تھے۔

مائرہ: "یہ کیسے ہوا ہے؟"

ظفر گل خان سے: "تم لوگ کچھ کر نہیں رہے ہو؟"

مائرہ: "تمہاری طرف پولیس ہوتی ہے؟"

پولیس کا نام سن کر عمر رک گیا۔ "کوئی مسئلہ ہوا ہے؟"

مائرہ نے سر ہلایا۔ "پچھلے ایک ہفتے میں ان کے گاؤں میں دو بچے قتل ہو چکے ہیں۔ ایک دن کے وقفے سے۔"

"ان کو جنوں نے مارا اے۔" گل خان نے یقین سے کہا۔ "اور مسجد کا مولوی سیب بتایا اے۔"

ان تینوں نے اگرچہ گل خان کی بات کا یقین نہیں کیا تھا مگر انہوں نے اس کا اظہار کرنے سے بھی گریز کیا۔ اس کے بجائے عمر نے پوچھا۔ "بچوں کی موت کیسے ہوئی؟"

"جنوں نے ان کو جنگل میں پکڑا اور درختوں سے مار مار کر مار دیا۔" گل خان نے تشویش سے کہا۔ "اب ادر بچہ لوگ گھر میں رہتا اے باہر نہیں جاتا۔"

گل خان نے سامان لاد لیا تھا اس لیے وہ فوری روانہ ہو گیا۔ اس نے انہیں بھی جلدی چلنے کو کہا۔ اس وقت مشرق کی سمت سے سورج نمودار ہو رہا تھا۔ اس کی اولین کرنوں میں بھی گرمائش تھی۔ حیرت انگیز بات تھی کل عمر سطح سمندر سے صرف ساڑھے چار فٹ بلند ایک قصبے میں تھا اور وہاں بھری دوپہر میں بھی موسم اچھا تھا۔ کمروں میں خنکی تھی اور پنکھا چلانے کی ضرورت بھی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ شاید اس لیے کہ وہاں نزدیک ہی دریا بہہ رہا تھا اور آس پاس بے تحاشا سبزہ تھا۔ جبکہ یہاں سطح سمندر سے چھ ہزار فٹ کی بلندی پر سوائے ننگی چٹانوں کے اور کچھ نہیں تھا اور یہ چٹانیں بھی کچھ اس قسم کی تھیں جو دھوپ پڑتے ہی گرم ہونا شروع ہو جاتی تھیں اور ان سے گرمائش پھوٹنے لگتی تھی۔ عمر کی گھڑی میں آلٹی میٹر بھی تھا جو بلندی بتاتا تھا۔ ایک بٹن

دبانے سے اسے معلوم ہو جاتا کہ وہ سطح سمندر سے کتنی بلندی پر ہے۔

یہاں ہوا ہلکی ہو گئی تھی اور اسے سینے میں کھینچنے کے لیے ذرا زور لگانا پڑ رہا تھا۔ عمر جانتا تھا کہ اس علاقے میں جو دنیا سے کٹے ہوئے تھے جرائم کی شرح نہ ہونے کے برابر تھی۔ چوری ڈکیتی نایاب تھی اور اگر قتل ہو جاتا تو قاتل فوری پکڑا جاتا تھا۔ اندھے جرائم نہیں ہوتے تھے۔ عورتوں کے خلاف جرائم نہ ہونے کے برابر تھے۔ کیونکہ عورتیں وہاں پوری طرح مردوں کے کنٹرول میں تھیں اور ان کی اپنی کوئی انفرادی زندگی نہیں تھی۔ ہر مرد کو علم ہوتا تھا کہ اس کی بیوی، بیٹی اور بہن کہاں ہے اور کیا کر رہی ہے؟ لوگوں میں قناعت تھی اور بیرونی ترقی کی جھلک جو یہاں سیاحوں، کوہ پیماؤں اور مہم جوؤں کی صورت میں آتی تھی وہ بھی ان میں لالچ پیدا نہیں کر سکی تھی۔ جرائم کی طرح تعلیم کی شرح بھی نہ ہونے کے برابر تھی۔

گرمی تیز ہونے لگی تھی اس لیے عمر نے مناسب سمجھا کہ رفتار تیز کر دے۔ کچھ دور جانے کے بعد اس نے مڑ کر دیکھا تو ادھیڑ عمر شخص اتنے ہی فاصلے پر تھا۔ وہ ایک مستقل رفتار اور مستقل مزاجی سے چل رہا تھا۔ مگر یہاں سے عمر کی رفتار کی وجہ سے باقی افراد سے اس کا فاصلہ بڑھنے لگا۔ صرف گل خان اس سے آگے تھا جو گدھے کو لے کر چل رہا تھا۔ دوپہر تک گرمی بے پناہ ہو گئی تھی اگرچہ یہ برداشت کرنے کے قابل نہیں تھی مگر اسے برداشت کرنا ہی تھا۔ عمر کی بوتل نصف سے زیادہ خالی ہو گئی تھی اور اب وہ بہت احتیاط سے پانی استعمال کر رہا تھا۔ ہر چند سو گز کے بعد وہ ایک گھونٹ پانی پیتا تھا جو اب بوتل میں گرم ہو گیا تھا اس کے باوجود اسے زیادہ پانی پینے سے روکنے کے لیے خود پر جبر کرنا پڑتا تھا۔ سہ پہر کے آخری حصے میں جب پانی ختم ہو گیا تھا اور پیاس اپنے عروج پر تھی تب اسے اس پورے علاقے کا پہلا سبزہ نظر آیا تھا۔ دو گھنٹے بعد وہ شام کے تیزی سے تاریک اور خنک ہوتے سائے میں ایک اسکول کے برآمدے میں بیٹھے ہوئے مقامی لسی سے اپنی پیاس بجھا رہے تھے۔ لسی گل خان ان کے لیے کہیں سے لایا تھا۔ یہ چھوٹا سا گاؤں جو راستے میں آتا تھا، پوچھنے پر گل خان نے اس کا نام شیشک بتایا تھا۔

”کرتوک یہاں سے ایک دن کی مسافت پر ہے۔“

مائرہ نے عمر کی طرف دیکھا۔ ”آپ تو کہہ رہے تھے کہ آپ پہلے یہاں آ چکے ہیں؟“

عمر نے سر ہلایا۔ ”میں دوسری طرف سے آیا تھا۔ اس راستے سے یہ میرا پہلا سفر ہے۔ میں کرتوک گلیشیر تک جانا چاہتا ہوں۔ پہلے میں ناکام رہا کیونکہ اس طرف سے راستہ بہت مشکل تھا، مجھے راستے سے واپس جانا پڑا تھا۔“

”ہم پہلے بھی آ چکے ہیں۔“ مائرہ نے کہا۔ ”ہمیں معلوم تھا کہ راستے میں شدید گرمی ہوتی ہے۔ اس لیے ہم ٹھنڈے پانی کا بندوبست کر کے آئے تھے۔“

”میرا تقریباً ختم ہو گیا تھا۔“ عمر سنجیدگی سے بولا۔ ”اگر چند منٹ اور مجھے سبزہ نظر نہ آتا تو میں گر جاتا۔“

گل خان گدھے سے سامان اتار کر اسے برآمدے میں رکھ کر گدھے کو کھیتوں میں چھوڑ آیا تھا۔ اسکول کے احاطے میں لمبی گھاس تھی اس لیے انہوں نے برآمدے میں رکنے کو ترجیح دی۔ ادھیڑ عمر شخص الگ تھلگ بیٹھا تھا اور اس نے گل خان سے دوسری بار لسی طلب کی تھی۔ عمر کو حیرت ہو رہی تھی کہ اس کے پاس زیادہ پانی نہیں تھا اور اس نے ایک چھوٹی بوتل کے سہارے یہ سفر کیا تھا۔ مگر اس کی حالت ان سب سے بہتر تھی۔ اس نے راستے میں ملنے والی پہلی پانی کی کھال جو کھیتوں کی طرف سے بہتی آ رہی تھی اس سے دل بھر کر پانی پیا تھا۔ لسی پی کر وہ ٹہلتا ہوا کھیتوں کی طرف چلا گیا۔ مائرہ نے اس کی طرف دیکھا۔ ”عجیب آدمی ہے، ذرا بھی گھلنے ملنے والا نہیں ہے۔“

عمر نے تبصرے سے گریز کیا۔ ظفر نے اپنا موبائل فون نکال کر سگنل چیک کیے۔ یہاں آنے سے پہلے اس نے اس علاقے میں کام کرنے والی سم لی تھی مگر اس کے سگنل بھی ہر جگہ دستیاب نہیں تھے۔ کم سے کم اب تک اسے سگنل نہیں ملا تھا اور وہ مایوس تھا۔ اس نے سر جھٹک کر کہا۔ ”میں نے بیکار میں سم لی۔“

”یہ اس جگہ کام کرے گی جہاں آس پاس کوئی آرمی انسٹالیشن ہو۔“ عمر نے بتایا۔ ”یہ نیٹ ورک آرمی کے لیے ہے مگر اب عام لوگ بھی اسے استعمال کر سکتے ہیں۔ بنیادی طور پر یہ ہنگامی صورت حال میں کام آتا ہے۔“

”مگر یہاں تو سگنل نہیں ہیں۔“

”یہاں آبادی ہے، جہاں آبادی نہیں ہوگی وہاں اس کے سگنل ملیں گے۔“

گل خان نے تائید کی۔ ”آپ ٹھیک کہتا اے۔ ادھر ہمارے گاؤں سے اوپر سگنل ملتا اے۔ ام کو بھی ادر سے پیغام ملا کہ پورٹر کا ضرورت اے۔“

ظفر چونکا۔ ”تمہارے پاس موبائل ہے۔“

گل خان ہنسا۔ ''اور سب کے پاس موبائل نہیں اوتا۔ ٹیکیدار کے پاس اے، اس کا اور شہر کے ٹورسٹ ایجنسی سے رابطہ اوتا اے۔ وہ ٹورسٹ بھیجتا اور ٹیکیدار کو فون کرتا۔ وہ پورٹر بھیجتا۔ ابھی ام کو بھیجا۔''

لسی اور آرام نے عمر کو تازہ دم کر دیا تھا۔ وہ اٹھا اور ٹہلتا ہوا باہر نکل آیا۔ اسکول کے عقب میں ڈھلان پر گاؤں تھا اور سامنے کھیت بکھرے ہوئے تھے جو نشیب میں خاصی دور تک گئے تھے۔ اوپر سے نالیوں میں شفاف پانی بہتا ہوا آ رہا تھا۔ گل خان کا گدھا ایک کھیت میں چر رہا تھا جس میں فصل نہیں لگائی گئی تھی مگر اس میں بے شمار پھولدار پودے اگے ہوئے تھے۔ خوراک نہ صرف دیکھنے میں اچھی بلکہ لذیذ بھی تھی کیونکہ گدھا دل جمعی سے پودے چر رہا تھا۔ ادھیڑ عمر شخص کھیت کے کنارے کھڑا سگار کے کش لے رہا تھا۔ عمر اس کی طرف بڑھا۔ اس نے عمر کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''تم لوگ میرے بارے میں متجسس ہو گے؟''

''زیادہ نہیں۔'' عمر نے سکون سے کہا۔ ''ویسے جہاں چار آدمی ہوں تو وہ ایک دوسرے کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں۔''

''احمقانہ بات، انسان انسان سے بھاگ کر ایسے ویرانوں میں آتا ہے اور پھر یہاں بھی تعارف کے چکر میں پڑ جاتا ہے۔'' اس کے لہجے میں ناگواری تھی۔

''یہ فطرت ہے اور انسان فطرت سے نہیں بھاگ سکتا۔ کیا تم بھی کر توک جا رہے ہو؟''

''ہاں لیکن ابھی میں نے راستے میں سنا ہے وہاں دو بچوں کو مار دیا ہے۔''

''میں نے بھی سنا ہے۔'' عمر نے تفکر سے کہا۔ ''اس علاقے میں جرائم بہت کم ہیں اور اس قسم کے جرائم نہیں ہوتے۔''

ادھیڑ عمر نے شانے اچکائے۔ ''کیا کہا جا سکتا ہے، جنونی کہیں بھی پیدا ہو سکتے ہیں۔''

''تم نے ابھی سے فیصلہ کر لیا کہ یہ کسی جنونی کا کام ہے مسٹر......''

''ضیا منصور۔'' اس نے پہلی بار اپنا نام بتایا۔ ''ہاں میرا خیال ہے معصوم بچوں کو کوئی جنونی ہی قتل کر سکتا ہے۔''

''عمر داؤد۔'' اس نے بھی نام بتایا۔ ''گل خان کا کہنا ہے اور شاید ان لوگوں کا یہی خیال ہے کہ بچوں کی موت میں جنوں کا ہاتھ ہے۔''

''ربش۔'' ضیا نے حقارت سے کہا۔ ''جو چیز سمجھ میں نہ آئے اس کا الزام جنوں بھوتوں پر لگا دو۔''

عمر اس سے متفق تھا۔ ''مگر ان سے بحث کا فائدہ نہیں ہے، یہ لوگ سمجھتے نہیں ہیں۔''

''وہی صدیوں پرانا مرض جہالت۔'' ضیا نے کہا اور بجھ جانے والے سگار کو جلانے لگا۔ مائرہ اور ظفر بھی باہر نکل آئے تھے وہ تاریکی چھانے سے پہلے اس علاقے کو دیکھ لینا اور اس کی خوب صورتی کو اپنے کیمروں میں محفوظ کر لینا چاہتے تھے۔ مائرہ کے پاس جدید ترین ڈیجیٹل کیمرا تھا۔ اس کی ایک تصویر میں ضیا بھی آ رہا تھا، اس نے ہاتھ اٹھا کر منع کر دیا۔ ''مہربانی کر کے مجھے فریم سے باہر رکھو۔''

''فریم میں تو آپ خود آ رہے ہیں۔'' مائرہ نے کہا۔ ضیا وہاں سے ہٹ گیا۔ وہ اسکول کی طرف چلا گیا تھا۔ ظفر نے کہا۔

''اسے تصویر میں آنا بھی پسند نہیں ہے۔''

''آپ سے اس کی بات ہوئی؟'' مائرہ نے تصویر لینے کے بعد عمر سے پوچھا۔ اس نے سر ہلایا۔

''اس نے اپنا نام ضیا منصور بتایا ہے۔''

''چلو نام تو معلوم ہوا۔'' ظفر ہنسا۔

چند منٹ بعد تاریکی اتنی تیزی سے آئی کہ آس پاس کا منظر غائب ہی ہو گیا۔ عمر نے کہا۔ ''آدھے گھنٹے بعد چاند نکل آئے گا اور آج شاید تیرھویں کا چاند ہے اس لیے بہت روشنی ہو گی۔''

''ہم تب آئیں گے۔'' مائرہ بولی۔ ''مجھے بھوک لگ رہی ہے۔''

''گل خان نے ڈنر کا بندوبست یہیں سے کرنے کو کہا ہے۔'' ظفر نے اطلاع دی۔

''یہ تو اچھی بات ہے ہمارا فوڈ بچے گا۔'' مائرہ بولی۔ عمر کا خیال تھا کہ گل خان نے صرف ان کے لیے لنچ کا بندوبست کیا ہو گا۔ جب وہ کچھ دیر بعد گاؤں کی طرف سے آیا تو اس نے روٹیوں کی چھابی پکڑی ہوئی تھی جس میں کپڑے میں لپٹی ہوئی گرم روٹیاں اور ایک چھوٹی ہانڈی میں سالن تھا۔ یہ مقامی سبزیوں اور گوشت سے بنا ہوا سالن تھا۔ عمر اپنے لیے ڈنر تیار کرنے جا رہا تھا مگر گل خان نے اسے روک دیا۔

''یہ سب کے لیے اے۔ اور گاؤں والا میمان نواز اے۔''

روٹیاں اور سالن خاصا تھا، انہوں نے سیر ہو کر کھایا۔ ڈنر کر کے عمر نے سب کے لیے کافی بنائی۔ گل خان برتن

واپس کرنے گیا تھا اس لیے اس کی کافی کیتلی میں چھوڑ دی کہ گرم رہے۔ رات ہوتے ہی خنکی تیزی سے آئی تھی۔ کافی پی کر مائرہ نے اپنا کیمرا سنبھالا اور باہر چلی گئی۔ چاند نکل آیا تھا اور صاف آسمان کی وجہ سے بہت روشن تھا۔ عمر اپنا خیمہ لگانے لگا پھر بیگ اندر رکھ کر وہ باہر آیا۔ اسے ظفر نظر نہیں آیا، اس کا خیال تھا کہ وہ مائرہ کے ساتھ ہوگا مگر مائرہ باہر اکیلی تھی اور زاویے بدل کر تصویریں لے رہی تھی۔ عمر نے محسوس کیا کہ وہ اچھی فوٹو گرافر تھی۔ وہ ایسے زاویے لے رہی تھی جس میں وادی کا حسن کھل کر سامنے آئے۔ وہ ایک درخت کے کٹے تنے پر بیٹھ گیا۔ اس نے مائرہ کے کام میں مداخلت نہیں کی تھی۔ وہ تصویریں لے کر خود اس کی طرف آئی۔ عمر نے اس کے لیے تنا خالی کیا تو وہ شکریہ ادا کر کے بیٹھ گئی۔

’’فوٹو گرافی مشکل کام ہے۔ ایک زمانے میں مجھے بھی شوق ہوا تھا مگر پھر میں نے چھوڑ دیا۔‘‘

مائرہ نے اپنے کھلے بال درست کیے۔ ’’آپ نے ٹھیک کہا۔ میں نے بہت محنت کی ہے لیکن اب بھی سیکھ رہی ہوں۔ شاید آنے والے سال میری تصویروں کی ایگزبیشن ہو۔ زیادہ تر تصویریں اسی علاقے کی ہوں گی۔‘‘

’’ظفر کو فوٹو گرافی سے دلچسپی نہیں ہے۔‘‘

’’اسے فوٹو گرافی سے نفرت ہے۔‘‘

’’میں تو سمجھ رہا تھا کہ آپ دونوں کا مشترکہ شوق ہے۔‘‘

’’صرف میرا شوق اور پروفیشن ہے۔‘‘ مائرہ نے تصدیق کی۔ عمر نے محسوس کیا کہ ظفر کے بارے میں بات کرتے ہوئے مائرہ کا لہجہ اچھا نہیں تھا۔ پھر اس نے موضوع بدل دیا۔ ’’آپ کا شوق کیا ہے؟‘‘

’’گھومنا، پھرنا اور نئی جگہوں پر جانا۔‘‘ عمر نے کہا۔ ’’میری کوشش ہوتی ہے کہ گرما میں مجھے زیادہ سے زیادہ چھٹیاں مل جائیں۔‘‘

’’آپ اکیلے ہیں، کبھی بیوی بچوں کو نہیں لائے۔‘‘

’’اگر ہوتے تو ضرور لاتا۔‘‘ عمر مسکرایا۔ ’’بیوی تھی مگر اسے میرے اسی شوق سے چڑ تھی۔ طلاق کی وجوہات میں اس نے یہ وجہ بھی شامل کی تھی کہ میں ٹک کر گھر میں نہیں بیٹھتا ہوں۔‘‘

’’اوہ! افسوس ہوا۔‘‘

’’اس کی ضرورت نہیں ہے۔ منیرہ اچھی عورت تھی۔ اب ہم دونوں ہی خوش ہیں۔‘‘

’’بچے نہیں ہوئے؟‘‘ مائرہ نے تجسس سے پوچھا۔

’’دوبارہ وہ امید سے ہوئی تھی مگر معاملہ ختم ہو گیا۔‘‘

مائرہ کی صورت بتا رہی تھی کہ اسے سچ مچ افسوس ہوا تھا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ ’’بچے رونق ہوتے ہیں۔‘‘

’’میں آپ سے متفق ہوں۔ کیا آپ کے۔۔۔۔؟‘‘

مائرہ کا چہرہ سرخ ہوا تھا۔ ’’میں ان میرڈ ہوں۔ سمجھ لیں کہ میری اور ظفر کی انگیج منٹ ہے۔ ابھی شادی نہیں ہوئی ہے۔‘‘

’’سوری، میں سمجھا کہ آپ کپل ہیں۔‘‘

مائرہ نے جھرجھری لی۔ ’’سردی ہو گئی ہے۔‘‘

’’آئیں اندر چلیں۔‘‘ عمر نے کہا۔ وہ اسکول میں آئے تو ظفر آ گیا تھا اور گل خان برآمدے میں ایک دیسی کمبل میں لپٹا ہوا سو رہا تھا۔ ضیا بھی اپنے ہوا بھرے گدے پر لیٹ گیا تھا۔ اس کے پاس اوڑھنے کو بہ ظاہر صرف ایک ہلکا سا کمبل تھا۔ عمر نے اپنے خیمے میں جانے سے پہلے اس سے کہا۔ ’’اگر تمہارے پاس خیمہ نہیں ہے تو کرتوک سے آگے نہیں جا سکو گے۔‘‘

’’تم فکر مت کرو۔‘‘ اس نے خشک لہجے میں کہا تو عمر شانے اچکا کر اپنے خیمے میں چلا گیا۔ گلیشیر یا اس کے آس پاس رات بنا خیمے کے نہیں گزاری جا سکتی تھی۔ وہاں درجۂ حرارت رات میں منفی سے نیچے چلا جاتا تھا اور ایسے میں بارش ہو جاتی تو بھیگ کر آدمی بیمار پڑ سکتا تھا اور وہاں مدد ملنا بھی محال تھا۔ مگر ضیا اس بارے میں بے فکر تھا۔ ظفر نے اطلاع دی۔

’’ہم صبح ہوتے ہی روانہ ہو جائیں گے۔‘‘

’’اگر میں نے رات اچھی نیند لی تو تمہارے ساتھ چلوں گا ورنہ تمہارے بعد آؤں گا۔‘‘ عمر نے کہا اور زپ بند کر لی۔ اس کا خیمہ ایسا تھا کہ اس کا اوپری حصہ جالی والا تھا لیکن بارش کی صورت میں ایک اور چادر سے اسے مکمل واٹر پروف کر سکتا تھا۔ اس میں چھوٹی چیونٹی سے بڑا کوئی کیڑا داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ سارے دن کی تھکن اب دکھتے جسم کی صورت میں ظاہر ہو رہی تھی۔ اسے سات آٹھ گھنٹے کی نیند کی ضرورت تھی، اس کا جسم خود ٹھیک ہو جاتا۔ جس وقت اسے نیند آئی مائرہ اور ظفر کے درمیان ہونے والی گفتگو شاید تلخ ہو چلی تھی کیونکہ کبھی کبھی مائرہ کی آواز بلند ہو جاتی تھی۔ عمر نے سنا مگر وہ اندازہ نہیں کر سکا تھا کہ ان کے درمیان وجۂ تنازع کیا ہے؟ شاید کوئی معمولی سی بات تھی کیونکہ صبح ان کے ہنسنے سے اس کی آنکھ کھلی تھی۔ وہ اس وقت خوشگوار موڈ میں تھے۔

عمر خود کو تروتازہ محسوس کر رہا تھا مگر اس کا جلدی اٹھنے کا موڈ نہیں تھا۔ البتہ اس نے ذرا سی زپ کھول لی تا کہ صبح کی تازہ ہوا کو زیادہ محسوس کر سکے۔ اس نے جھانک کر ان دونوں کو دیکھا۔

”گڈ مارننگ۔“

”مارننگ۔“ مائرہ نے کہا۔ وہ اپنا سلیپنگ بیگ لپیٹ رہی تھی۔ ”ہم نے آپ کی کیتلی استعمال کی چائے کے لیے، امید ہے آپ نے برا نہیں مانا ہوگا۔“

”بالکل بھی نہیں۔“

”اس میں چائے ہے اور انگاروں پر ہے۔“

عمر ہنسا۔ ”اس صورت میں تو بالکل برا نہیں مانا۔“

وہ ان کے روانہ ہونے کے بعد خیمے سے نکلا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ضیا جا چکا ہوگا۔ مگر وہ وہیں موجود تھا اور برآمدے کی سیڑھیوں پر بیٹھا ہوا آئینے میں دیکھ کر استرے سے شیو کر رہا تھا۔ چائے کم تھی مگر عمر نے اس کے لیے بھی تھوڑی نکال لی۔ ناشتے میں اس نے تیار دلیا دودھ کے ساتھ لیا تھا۔ عمر نے ضیا سے پوچھا۔ ”آج تم روانہ نہیں ہوئے۔“

”کل مشکل سفر تھا اس لیے جلد روانہ ہوا۔ ورنہ میں آرام سے اور آس پاس کے نظاروں سے لطف اندوز ہوتا ہوا سفر کرتا ہوں۔ مجھے منزل پر پہنچنے کی زیادہ جلدی نہیں ہوتی۔“

یہ طویل ترین جملہ تھا جو ضیا نے اس سے ملاقات کے بعد کہا تھا۔ ناشتے کے بعد عمر نے اپنا رک سک پیک کیا اور چلنے کو تیار ہو گیا۔ ضیا نے اپنا بیگ پیک کر لیا تھا مگر وہ بدستور سیڑھیوں پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے شیو کی تھی مگر بالوں میں کنگھی کرنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ رات ہلکی سی بارش ہوئی تھی اور اگر وہ کسی کھلی جگہ ہوتے تو ضیا کو مشکل پیش آتی مگر وہ اس معاملے میں بالکل بے پروا تھا۔ برآمدے میں ایک ڈبا رکھا تھا جس پر چندہ برائے ترقی اسکول لکھا ہوا تھا۔ عمر نے اس میں کچھ رقم ڈالی اور آگے روانہ ہو گیا۔ ظاہر ہے یہ ڈبا ان سیاحوں اور ٹریکرز کے لیے تھا جو یہاں رات میں مفت قیام کرتے تھے۔ اس لحاظ سے یہ اسکول کا حق بنتا تھا۔ مائرہ اور ظفر کو روانہ ہوئے ایک گھنٹا ہو گیا تھا اور گل خان اپنے گدھے کے ہمراہ منزلیں مارتا جاتا تھا اور مڑ کر نہیں دیکھتا تھا جیسا کہ پورٹرز کی عادت ہوتی ہے۔

عمر کچے راستے پر پانی سے بچتا ہوا چل رہا تھا۔ اس دوران میں اسے کچھ ملکی و غیر ملکی سیاح و ٹریکرز ملے۔ کچھ تو اسی [illegible] جا رہے تھے اور کچھ سیاح و ٹریکر اس طرف سے آ رہے تھے۔ آنے والے اطلاع دے رہے تھے کہ کرتوک گلیشیر پر موسم نہایت خراب تھا اور ان میں سے بیشتر راستے سے واپس آ گئے تھے۔ عمر فکرمند نہیں تھا۔ اس کا تجربہ تھا کہ جب ٹریکرز کسی مشکل مقام کی طرف جا رہے ہوں تو آنے والے بری خبریں ہی دیتے تھے۔ یہ آدمی کی اپنی قسمت پر ہوتا ہے کہ آگے اسے کیا ملے گا۔ اس علاقے میں موسم چند گھنٹوں میں خراب اور صاف ہو جاتا تھا۔ راستے میں جنگل اور جھاڑیوں سے بھرے ٹیلے آ رہے تھے۔ کہیں کہیں چٹانیں تھیں۔ مگر یہاں سبزہ غالب تھا۔ جا بہ جا پہاڑی جھرنے بہہ رہے تھے جن کا ٹھنڈا یخ پانی آبِ حیات سے کم نہیں تھا۔ اس نے پہلے جھرنے سے اپنی بوتل بھر لی تھی مگر اس سے ایک گھونٹ لینے کی نوبت بھی نہیں آئی تھی۔ وہ براہِ راست بہتے جھرنوں سے پانی پیتا رہا تھا۔

راستے میں ایک جگہ لگی اسٹرابیری کی جھاڑی سے اس نے بچے ہوئے پھل کھائے اور اپنا لنچ مکمل کر لیا۔ دورانِ سفر جہاں الاؤ جلانے کی گنجائش نہیں تھی وہاں وہ بھنے خشک چنوں سے لنچ کرتا تھا۔ اس کے پاس راشن محدود تھا کیونکہ زیادہ راشن لانے کی صورت میں وزن بڑھ جاتا اور اسے پورٹر کرنا پڑتا جبکہ وہ اکیلا سفر کرنا پسند کرتا تھا۔ اس لیے اس کی کوشش ہوتی کہ زیادہ سے زیادہ گزارا کرے اور اگر راستے میں کھانے کو کچھ مل جائے تو یہ سب سے اچھی بات ہوتی تھی۔ سہ پہر تک ایک مشکل درے سے گزر کر اس نے کرتوک گاؤں کی وادی میں قدم رکھا۔ یہ صدیوں پرانا گاؤں اسی نام کے گلیشیر کے عین نیچے واقع تھا۔ وادی کو چاروں طرف سے اونچے پہاڑوں نے گھیر رکھا تھا اور اس کی ڈھلانوں پر گھنے جنگل تھے۔ بالکل وسط میں کاشت کاری کے لیے زمین تھی جو تہ در تہ ڈھلانوں پر بلند ہوتی گاؤں سے جا مل رہی تھی۔

بلاشبہ یہ ایک خوب صورت جگہ تھی۔ عمر نشیب میں گاؤں کی طرف اترنے لگا۔ وہ کھیتوں تک پہنچا تو خلافِ توقع وہاں بچوں کا غول نہیں تھا جو ہر باہر سے آنے والے کا استقبال اس امید پر کرتے تھے کہ وہ انہیں کھانے کو چاکلیٹ، ٹافی یا چیونگم دے گا۔ مقامی تو نہیں مگر غیر ملکی سیاح ایسی چیزیں لاتے تھے اور فراخ دلی سے بچوں میں بانٹتے تھے۔ عمر کے پاس ایک شاپر تھا جس میں چھوٹی چاکلیٹ اور چیونگم بھری ہوئی تھیں۔ مگر انہیں لینے والا وہاں کوئی نہیں تھا۔ کھیتوں میں عورتیں کام کر رہی تھیں اور عورتیں ہی ڈھلانوں پر آنے والے سرما کے لیے گھاس کاٹ رہی تھیں اور لکڑی

جمع کر رہی تھیں۔ یہ سارے کام یہاں عورتوں کے سپرد تھے۔ مرد مویشی چراتے تھے اور پورٹر کا کام کرتے تھے، ان میں سے کچھ شہروں میں جا کر محنت مزدوری کرتے تھے۔ یہاں ذرائع زندگی کم تھے اور جو تھے ان سے بھی زیادہ آمدنی نہیں ہوتی تھی۔

گاؤں کے چوک پر بھی ویرانی تھی۔ عمر اس کی وجہ سمجھ سکتا تھا۔ چند سو نفوس اور شاید پچاس ساٹھ گھروں پر مشتمل اس چھوٹے سے گاؤں میں دو معصوم بچوں کی ہلاکت معمولی واقعہ نہیں تھی، اس نے سب کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ واقعات کی سنگینی نظر آنے والی ہر صورت پر واضح تھی اور گاؤں میں بھی بچے غائب تھے۔ دو جانیں گنوانے کے بعد لوگ سہم گئے تھے اوزانہوں نے بچوں کو گھروں میں بند کر لیا تھا۔ گاؤں کا واحد ہوٹل چوک کے پاس ہی تھا۔ یہاں کھانے اور رہائش دونوں کا بندوبست تھا۔ لیکن خستہ حال ہوٹل میں طعام و قیام دونوں کے ریٹ نہایت نامناسب تھے۔ عمر کہیں پڑاؤ ڈالنے کی سوچ رہا تھا کہ اسے گل خان آتا دکھائی دیا۔ اس نے گرم جوشی سے عمر سے ہاتھ ملایا۔

"آپ دیر کر دیا صیب، اور آپ کا انتظار اوتا۔"

انتظار گاؤں کے اوپری حصے میں ایک چھوٹے سے باغ میں ہو رہا تھا جس میں سیب اور خوبانی کے کچھ درخت تھے۔ پھل ابھی پک رہا تھا اور باغ کے وسط سے پانی کی چھوٹی سی نالی بہہ رہی تھی۔ زمین پر مخملی گھاس تھی اور اس سے سکون آمیز خنکی اٹھ رہی تھی۔ مائرہ اور ظفر اسی سبزے پر براجمان قہوے کے ساتھ مقامی طرز کے چھوٹے کلچے کھا رہے تھے۔ یہ مہمان داری گل خان کی طرف سے تھی۔ باغ بھی اسی کا تھا۔ اس نے عمر کو دعوت دی۔ "آؤ آؤ صیب اور بیٹھو۔"

عمر شرمندہ ہو گیا اس نے کہا۔ "یار میں نے تمہیں پورٹر نہیں کیا ہے جو تم میری مہمان داری اور فکر بھی کرو۔"

"فکر نہیں صیب۔" اس نے فراغ دلی سے کہا۔ "تم ادر آیا تو امارا میمان ہوا۔"

"آ جائیں۔" مائرہ نے کہا۔ "اگر یہ جگہ جنت ہے تو سمجھ لیں کہ ہم جنت کے مزے کر رہے ہیں۔ کفرانِ نعمت نہ کریں۔"

"ضیا کہاں ہے؟" ظفر نے پوچھا۔ عمر نے رک سک اتارا اور نیچے بیٹھ گیا تھا۔ گل خان اس کے لیے قہوہ نکال رہا تھا۔ کلچے کپڑے میں لپٹے ہوئے اور گرم تھے۔ یہ کچھ دیر پہلے ہی پکے تھے۔ عمر نے جواب دیا۔

"جب میں روانہ ہوا تو وہ وہیں بیٹھا ہوا تھا۔"

گل خان نے رات کے کھانے کے لیے معذرت کی۔ "سالن نہیں اے پر روٹی مل جائے گا۔"

"اس کی ضرورت نہیں ہے، میرے پاس خوراک ہے۔" عمر نے اپنا رک سک تھپکا۔ مائرہ نے اس کی تائید کی۔

"تم فکر مت کرو گل خان، تم نے پہلے ہی بہت کچھ کر دیا ہے۔"

"ام روٹی لائے گا۔ باقی خوراک آگے کے لیے رکھو۔" گل خان نے کہا اور گھر چلا گیا اس کا گھر نزدیک ہی تھا۔ تاریکی میں کچھ وقت تھا۔ مائرہ نے اپنا کیمرا نکالتے ہوئے کہا۔

"میں اس خوب صورت جگہ کے کچھ شاٹ لے لوں۔"

"میں آرام کروں گا۔" ظفر نے کہا۔

"اور میں خود کو تر و تازہ کروں گا۔" عمر نے جوتے موزے اتارتے ہوئے کہا۔ اس نے جیکٹ بھی اتار دی اور صابن نکال کر پانی کی نالی کی طرف بڑھا جس کا پانی سیدھا گلیشیر سے آ رہا تھا اس لیے تقریباً پگھلی برف تھی مگر اس نے سچ مچ عمر کو تر و تازہ کر دیا۔ آج اس نے بہت دن بعد پاؤں دھوئے تھے۔ منہ ہاتھ چھوٹے سے تولیے سے خشک کر کے اس نے جیکٹ اور جوتے موزے پہنے اور اپنا خیمہ لگانے لگا۔ ظفر ترپال بچھا کر لیٹا ہوا موبائل کے ہینڈ فری سے کچھ سن رہا تھا۔ عمر باغ سے باہر آیا تو اسے مائرہ ذرا اوپر ایک ٹیلے پر کیمرے سے گلیشیر کی تصویریں لیتی نظر آئی۔ وہ باغ کی چوڑے پتھروں سے بنی منڈیر نما دیوار پر بیٹھ گیا۔ مائرہ نے اسے دیکھا تو ہاتھ ہلا کر اپنی طرف بلایا۔ عمر اس کے پاس پہنچا تو وہ ہیجانی لہجے میں بولی۔ "میرے خدا، ذرا دیکھیں کیا منظر ہے۔"

سورج کی آخری کرنیں گلیشیر پر پڑ کر اسے مختلف رنگ دے رہی تھیں اور وہ اس وقت قوسِ قزح بنا ہوا تھا۔ یہ سارا منظر بس چند منٹ کا تھا اور مائرہ مسلسل تصویریں لے رہی تھی۔ پانچ منٹ بعد گلیشیر سنہری ہو گیا اور پھر اس کا نچلا حصہ تاریک ہونے لگا۔ دس منٹ بعد یہ تاریکی اس چوٹی تک پہنچ گئی جہاں سے گلیشیر شروع ہو رہا تھا۔ نیچے وادی گہرے رنگ کے سائے میں آ گئی تھی اور یہ سب واقعی سحر انگیز تھا۔ مائرہ نے کیمرا رکھا اور عمر سے پوچھا۔ "ظفر کہاں ہے؟"

"ترپال پر لیٹا ہے ہینڈ فری لگائے ہوئے۔"

"اسے اس جگہ بھی ایسی چیزوں کی پڑی رہتی ہے۔ میں اس سے کہتی ہوں کہ ہم یہاں فطرت کو دیکھنے آئے ہیں۔ یہ سب تو ہمیں شہر میں دیکھنے کو مل جاتا ہے۔"

"کل رات بھی شاید تم لوگوں میں یہی بحث ہو رہی تھی؟" عمر نے سرسری سے انداز میں پوچھا۔

"نہیں وہ دوسرا مسئلہ تھا...." مائرہ بولتے ہوئے رکی۔

"سوری میرا خیال ہے یہ تمہارا پرسنل ہے۔"

"نہیں۔" مائرہ ہچکچائی پھر اس نے کہا۔ "ظفر کو کہیں سے پتا چلا ہے کہ اس گاؤں کے اوپر کہیں قیمتی پتھر پائے جاتے ہیں۔ اس نے گل خان سے پوچھا تھا اور مجھے یہ بات اچھی نہیں لگی۔"

"میں نے بھی سنا ہے۔ لیکن اس علاقے میں تقریباً ہر جگہ ایسی اسٹوریز عام ہیں۔"

"ظفر کا کہنا ہے کہ اس نے کچھ پتھر دیکھے ہیں اور وہ بہت اعلیٰ درجے کے اور بہت قیمتی ہیں۔ بین الاقوامی معیار کے سمجھ لیں۔"

"ممکن ہے مگر اس قسم کے قصے ننانوے فیصد صرف قصے ہوتے ہیں اور ان میں حقیقت کا عنصر صرف ایک فیصد ہوتا ہے۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔ میں نے ظفر کو منع کیا تھا کیونکہ یہاں دو سنگین واقعات ہو چکے ہیں اور مقامی لوگ باہر سے آنے والوں کو شک کی نظر سے دیکھ رہے ہیں۔"

"آپ کو کیسے پتا چلا؟"

"گل خان نے بتایا ہے۔" مائرہ نے جواب دیا۔ "یہی وجہ ہے سیاح اور ٹریکرز اب یہاں سے جا رہے ہیں۔"

"شاید ان کی موجودگی میں یہ واقعات ہوئے ہیں۔ اس لیے وہ واپس جا رہے ہیں۔ لیکن ہم ابھی آئے ہیں اس لیے ہم پر شک نہیں کیا جاسکتا ہے۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں اس کے باوجود ہمیں احتیاط کرنی چاہیے۔ گل خان اچھا آدمی ہے مگر یہاں سب اس کی طرح اچھے نہیں ہوں گے۔"

عمر نے محسوس کیا کہ مائرہ ذہین لڑکی تھی اور مثبت انداز میں سوچتی تھی۔ اگر ظفر قیمتی پتھروں کے چکر میں تھا تو یہ چکر اس کے لیے نقصان دہ بھی ثابت ہوسکتا تھا۔ مائرہ ٹھیک کہہ رہی تھی اس علاقے کے لوگ اچھے تھے مگر وہ بہت سے معاملات میں سخت بھی تھے۔ جب وہ واپس آئے تو باغ میں ضیا بھی آچکا تھا۔ وہ اپنا ہوا سے بھرنے والا گدا بچھائے آرام کر رہا تھا۔ مائرہ نے آہستہ سے کہا۔ "یہ بالکل خالی سفر کر رہا ہے، میرا خیال ہے اس کے پاس کھانے کو بھی خاص نہیں ہے۔"

"مگر مجھے یہ غریب نہیں لگتا۔ ہوسکتا ہے اسے بالکل ہی بے سروسامانی کی عادت ہو۔"

"پتا نہیں کیوں یہ شخص مجھے اچھا نہیں لگا۔"

عمر نے موضوع بدل دیا۔ "تم لوگوں کا کل کیا پروگرام ہے؟"

"گل خان کا کہنا ہے کہ گلیشیر کی طرف جانے کے لیے صبح سویرے جانا لازمی ہے کیونکہ دس گیارہ بجے تک راستے میں آنے والے نالوں میں پانی آجاتا ہے اور انہیں پار نہیں کیا جاسکتا۔ ایک رات ایک دن اور اگلی رات ٹھہر کر ہم اسی طرح صبح سویرے واپس آسکتے ہیں۔"

"پھر کیا ارادہ ہے؟"

"مسلسل دو دن سفر نے مجھے تو تھکا دیا ہے۔ پھر میں چاہتی ہوں کہ کل دن کی روشنی میں یہاں کے کچھ شاٹس لوں ورنہ گلیشیر سے واپسی کے فوراً بعد ہم یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔"

"گل خان راستہ جانتا ہے؟"

"ہاں وہی ہمیں لے جائے گا۔"

وہ اندر پہنچ گئے تھے اور مائرہ اپنے خیمے کی طرف چلی گئی۔ وہ اب تک لی ہوئی تصاویر ایک یو ایس بی میں منتقل کر رہی تھی۔ کیمرے کی میموری ہائی ریزولیوشن تصاویر کی وجہ سے جلد بھر جاتی تھی۔ عمر ضیا کے پاس بیٹھ گیا۔ "لگتا ہے تم گھومتے پھرتے آئے ہو؟"

"ہاں اور میں دیکھ رہا ہوں کہ تم بھی بہت گھوم پھر رہے ہو۔" ضیا کا لہجہ معنی خیز ہوگیا۔ اس کا اشارہ یقیناً مائرہ کی طرف تھا۔ "یہ دونوں میاں بیوی ہیں؟"

"تم کیا سمجھتے ہو؟"

"میرا خیال ہے نہیں ہیں۔"

عمر نے آگے کچھ نہیں کہا۔ ضیا سگار پی رہا تھا اور اس کی بو یہاں کی نہایت شفاف ہوا میں بہت واضح محسوس ہو رہی تھی۔ کچھ دیر میں گل خان لکڑیاں لے آیا اور الاؤ جلانے لگا۔ الاؤ جلا کر اس نے پوچھا۔ "صبح کا کیا پروگرام اے؟"

"میرا ارادہ جانے کا ہے۔" ظفر نے کہا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN

"ٹھیک اے ام صبح آجائے گا پر روشنی سے پہلے جانا اے۔"

"میں تھک گئی ہوں اور آرام کرنا چاہتی ہوں۔" مائرہ نے احتجاج کیا۔ "ہم پرسوں بھی جاسکتے ہیں۔"

"آرام ہم واپس آکر بھی کرسکتے ہیں۔" ظفر نے حتمی لہجے میں کہا اور گل خان کی طرف دیکھا۔ "تم صبح آجاؤ ہم تیار ملیں گے۔"

مائرہ نے ظفر کو غصے سے دیکھا اور پاؤں پٹختی ہوئی ایک طرف چلی گئی۔ گل خان نے سر ہلایا۔ "اب ام صبح آئے گا۔ روٹی امارا بیٹا لائے گا۔"

عمر نے اپنے سامان سے لائٹ نکالی اور اس کی روشنی میں اپنا سامان دیکھنے لگا۔ خوراک کا جائزہ لیا اس کے پاس ٹن بند اور خشک خوراک تھی۔ اس میں خشک کیا ہوا گوشت بھی تھا، اس نے گوشت کے چند پارچے نکالے اور انہیں الاؤ پر بھوننے لگا۔ ضیا نے گل خان کے جانے کے بعد کہا۔

"گاؤں والے سہمے ہوئے ہیں۔"

"ان کے دو بچے مارے گئے ہیں۔"

"ان کا شک باہر سے آنے والوں پر ہے۔" ظفر نے کہا۔

"لیکن ہم تو ابھی آئے ہیں۔" عمر نے کہا اور بھن جانے والے ٹکڑے کو چکھ کر دیکھا۔ "جو پہلے تھے وہ یہاں سے جاچکے ہیں۔ راستے میں مجھے کم سے کم ایک درجن افراد ملے۔"

"مجھے زیادہ ملے۔" ضیا نے کہا۔ "اس کا مطلب ہے کہ گاؤں والے مختلف موڈ میں ہیں۔ ورنہ یہ لوگ سیاحوں کو پسند کرتے ہیں کہ ان سے ان کی روزی چلتی ہے۔"

"تب ہمیں محتاط رہنا چاہیے۔" عمر نے کہا۔ "اپنے کام سے کام رکھنا ایسے موقع پر سب سے بہترین پالیسی ثابت ہوتی ہے۔"

"ان معاملات سے ہمارا کوئی تعلق نہیں ہے۔" ضیا نے کہا اور اٹھ کر باغ سے باہر نکل گیا۔ آدھے گھنٹے بعد گل خان کا بیٹا روٹی لے کر آیا، یہ تقریباً دس سال کا خوب صورت اور صحت مند بچہ تھا۔ عمر کو حیرت ہوئی کہ گل خان نے اسے باہر کیوں آنے دیا جبکہ گاؤں کے سارے بچے اپنے گھروں میں قید تھے۔ شاید اس لیے کہ اس کا گھر بالکل پاس ہی تھا۔ اس کے جانے کے بعد ظفر نے کہا۔

"گل خان نے بتایا ہے کہ پہلا بچہ آج سے آٹھ دن پہلے چشمے پر پانی لینے گیا اور غائب ہوگیا۔ اگلے دن اس کی لاش اوپر جنگل سے ملی۔ دوسرا بچہ اس کے اگلے دن غائب ہوا اور وہ کھیلنے کے لیے گھر سے نکلا تھا۔ گاؤں کے کچھ لوگوں نے اسے ایک باہر کے آدمی کے ساتھ جاتے دیکھا تھا اور اگلے دن اس کی لاش بھی جنگل سے ملی۔"

"وہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ وہ باہر کا آدمی تھا۔"

"حلیہ۔" ظفر نے جواب دیا۔ مائرہ آگئی تھی اور رات کے کھانے کی تیاری کررہی تھی۔ اس نے ٹن کھول کر قیمہ نکالا اور آلو قیمہ بنانے لگی۔ روٹی مکئی کی تھی اور خاصی بڑی تھی۔ عمر نے مشکل سے ایک کھائی تھی۔ گل خان نے چار روٹیاں بھجوائی تھیں جو ان کے لیے کافی تھیں۔ مائرہ نے کہا۔

"مگر گل خان کا کہنا ہے کہ یہ جنات کی کارروائی ہے۔ تب گاؤں والے باہر سے آنے والوں کو کیوں الزام دے رہے ہیں؟"

ظفر ترپال سے اٹھ بیٹھا اور اپنے جے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ "وہ دونوں کو آپس میں گڈمڈ کررہے ہیں، ان کا خیال ہے کہ جنات غیر ملکیوں کے روپ میں یہاں آئے تھے۔"

"سوال یہ ہے کہ بچوں سے کسی کی کیا دشمنی ہوسکتی ہے؟" مائرہ نے کہا تو ظفر نے خیال ظاہر کیا۔

"جاہل لوگ اس بارے میں بے شمار مفروضے بنا سکتے ہیں کہ بچوں نے بے خیالی میں کسی جن کے بچے کو نقصان پہنچایا یا کسی جگہ کو ناپاک کیا۔ ایسی کوئی بھی وجہ پیش کی جاسکتی ہے۔ جبکہ یہ کرمنل کیس ہے۔ بچے انسانوں نے مارے ہیں اور اس کے پیچھے کوئی وجہ ہے۔"

ضیا نہیں آیا تھا۔ مائرہ اور ظفر نے بھی کھانا کھالیا اور کافی بنانے کی ذمے داری مائرہ نے لی۔ اس نے بہت اچھی کافی بنائی تھی۔ وہ الاؤ کے گرد بیٹھے تھے۔ مائرہ نے کہا۔

"ضیا کہاں گیا ہے؟"

"پتا نہیں۔" ظفر بولا۔ "ویسے اسے گئے ہوئے خاصی دیر ہوگئی ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہیں وہ کسی مشکل میں نہ پڑ گیا ہو۔"

ظفر گیا تو مائرہ نے کہا۔ "حیرت ہے اسے ضیا کی اتنی فکر ہے۔"

"فکر کرنی پڑتی ہے۔ بے شک ہم اجنبی ہیں مگر اس علاقے میں ایک دوسرے کا خیال رکھنا ضروری ہے۔" عمر نے کہا۔ "آپ نے کافی اچھی بنائی ہے۔"

"شکریہ۔" مائرہ خوش ہوگئی۔ "آپ بھی صبح چلیں گے؟"

عمر ہچکچایا۔ ''کیا یہ مناسب ہوگا؟ گل خان تم لوگوں کا پورٹر اور گائیڈ ہے۔''

''تو کیا ہوا؟'' مائرہ نے کہا۔ ''ہم گروپ بنا کر سفر کریں تو زیادہ مناسب ہوگا۔''

''ظفر اس بات کو محسوس نہ کرے۔''

''آپ اس کی فکر مت کریں۔'' مائرہ اعتماد سے بولی تو عمر نے سر ہلایا۔ وہ راضی تھا۔ کیونکہ صبح سویرے اٹھنا تھا اس لیے اس نے مناسب سمجھا کہ اب سو جائے۔ مگر وہ خیمے میں اس وقت گیا جب ظفر اور ضیا آگئے۔ دونوں خاموش تھے اور ان کے منہ بنے ہوئے تھے۔ ضیا نے اپنے حصے کی روٹی پر مکھن لگایا اور کھا کر گدے پر لیٹ گیا۔ مائرہ بھی اپنے سلیپنگ بیگ نما خیمے میں جا چکی تھی۔ سب سے آخر میں ظفر سونے کے لیے لیٹا۔ وہی سب سے پہلے اٹھا تھا اور اس نے عمر کا خیمہ ہلایا۔

''اٹھ جاؤ اگر ہمارے ساتھ چلنا ہے تو؟''

عمر نے گھڑی دیکھی صبح کے پانچ بج رہے تھے۔ وہ خیمے سے باہر آیا اور اس نے سب سے پہلے خیمہ پیک کیا۔ ناشتے کے لیے گل خان کلچے لے آیا تھا اور مائرہ نے چائے تیار کی۔ عمر، ظفر کے ساتھ اس کا سامان پیک کرانے لگا۔ وہ صرف خیمے اور ضروری سامان لے جا رہے تھے باقی سامان یہاں گل خان کے گھر چھوڑ کر جاتے کیونکہ گدھا ان کے ساتھ نہیں جا سکتا تھا۔ گل خان کے ساتھ اس کا بیٹا آیا تھا۔ اضافی سامان وہ واپس لے گیا اور جب وہ روانگی کے لیے تیار ہو رہے تھے تو لڑکا بھی آگیا۔ عمر کو پہلی بار خیال آیا اور اس نے گل خان سے پوچھا۔ ''تمہارا بیٹا بھی چلے گا؟''

''سومت خان بڑا ہو گیا اے۔'' گل خان فخر سے بولا۔ ''اس اگست میں گیارہ سال کا ہو جائے گا۔ تین سال بعد اس کا شادی بنائے گا تب تک یہ کمانے والا ہو جائے گا۔ ابھی سے کام سیکھے گا تو کمائے گا۔''

مائرہ نے حیرت سے کہا۔ ''تم صرف چودہ پندرہ سال کی عمر میں اس کی شادی کر دو گے؟''

''امارے اور بچہ لوگ جیسے ای شادی کے قابل ہوتا اے ان کا شادی بنا دیا جاتا اے۔'' گل خان نے کہا اور سامان کا بیگ اپنی پشت پر لادنے لگا۔ مائرہ اور ظفر نے ہلکا پھلکا سامان اٹھایا ہوا تھا جیسے پانی کی بوتلیں اور کیمرا وغیرہ۔ ضیا چادر اوڑھے سو رہا تھا اور بہ ظاہر اس کا ارادہ کہیں جانے کا نہیں تھا۔ وہ پانچوں سورج نکلنے سے پہلے وہاں سے روانہ ہوئے تھے۔ عمر نے اپنا سارا سامان ساتھ رکھا تھا۔ باغ سے نکلنے کے بعد اس نے ظفر سے پوچھا۔ ''ضیا تمہیں کہاں ملا تھا؟''

''ادھر گاؤں کی مسجد میں۔'' ظفر نے جواب دیا۔ ''وہ لوگوں سے بے تکلف ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے اسے منع کیا تو بک بک کرنے لگا۔''

اب عمر سمجھا کہ رات ان دونوں کا منہ کیوں بنا ہوا تھا۔ جب تک وہ اوپری جنگل میں پہنچے مشرق سے سورج نمودار ہونے لگا تھا اور آس پاس کا منظر واضح ہو رہا تھا۔ گل خان نے اشارے سے بتایا۔ ''پہلے بچہ کا لاش اودر ملا تھا۔''

زمین پر گہرے رنگ کے دھبے تھے اور ایسے ہی دھبے آس پاس درختوں کے تنوں پر تھے۔ یہ یقیناً خون کے دھبے تھے۔ شاید اسی لیے یہ کہا جا رہا تھا کہ جنوں نے بچے کو درختوں سے ٹکرا ٹکرا کر مارا تھا۔ مائرہ دکھی ہو گئی تھی اور ظفر بے پروائی سے آس پاس دیکھ رہا تھا۔ عمر نے پوچھا۔ ''گاؤں والوں نے پولیس میں رپورٹ کرائی؟''

اس نے سر ہلایا۔ ''کرائی تھی پر وہ کیا کر سکتا اے۔ یہ جنوں کا چکر اے۔''

یہ جگہ گاؤں سے خاصے فاصلے پر تھی۔ بچہ از خود یہاں نہیں آ سکتا تھا۔ اسے کوئی لے کر آیا تھا۔ دوسرے بچے کی لاش اس سے ذرا آگے ملی تھی اور یہاں بھی زمین اور درختوں پر خون آلود نشانات تھے۔ دونوں بچوں کی عمریں سات آٹھ سال تھیں۔ عمر اور گل خان ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ سومت مائرہ کے ساتھ تھا اور ظفر سب سے پیچھے تھا۔ عمر، گل خان سے سوالات کر رہا تھا اور وہ بتا رہا تھا۔ دونوں بچوں کے باپ پورٹر اور گائیڈ تھے مگر نکمے تھے۔ کام کم کرتے تھے اور زیادہ تر گھر میں پڑے رہتے تھے اس کے باوجود ان کے پاس پیسے کی کمی نہیں تھی۔ گل خان نے سرگوشی میں کہا۔ ''اور مشورا اے دونوں بندوں کو قیمتی پتھر کا جگہ پتا اے۔ وہ اودر سے پتھر نکال کر شہر لے جا کر بیچتا اے۔''

''کسی نے ان کے پاس پتھر دیکھے ہیں؟''

گل خان نے سر ہلایا۔ ''کئی لوگ نے دیکھا اے۔''

''جن لوگوں کو پتا ہے وہ دوسروں سے چھپاتے ہوں گے پھر ان دونوں کو کیسے پتا چلا کہ پتھر کہاں سے ملتے ہیں؟''

اس سوال کے جواب میں گل خان ہچکچایا۔ ''پتا تقریباً سب کو اے، پر ہر کوئی اودر نہیں جاتا۔ پتھر گلیشیر سے نکلنے والے پانی کے آس پاس ملتا اے، اودر بوت خطرہ ہوتا اے۔''

گل خان کی بات نے عمر کو چونکا دیا۔ ’’تم بھی جانتے ہو؟‘‘

اس نے سر ہلایا۔ ’’ٹھیک سے نہیں پر ام کوشش کرے تو تلاش کرسکتا اے۔‘‘

’’تب تم نے تلاش کیوں نہیں کیا؟‘‘

گل خان کچھ دیر خاموش رہا پھر اس نے جواب دیا۔ ’’ام اس طرح سے پیسا کمانے کو اچا نہیں سمجتا اے۔ ام محنت کرکے کماتا اے۔ یہ ٹیک طریقا اے۔‘‘

عمر نے اسے تعجب سے دیکھا۔ ’’تمہاری سوچ بہت اچھی ہے۔ لیکن بہت کم لوگ اس طرح سوچتے ہیں۔‘‘

’’پر ام سوچتا اے۔ ام نے دیکھا جو لوگ آسانی سے پیسا کماتا اے۔ اس کا پیسا سات پریشانی بی لاتا اے۔ امارا باپ نے ام کو یہ سوچ بتایا۔ اب ام اپنے بیٹے کو بتاتا اے۔‘‘

’’تمہارا مطلب ہے کہ ان لوگوں کے بچے مارے گئے جو قیمتی پتھر لاتے ہیں اور اس سے کماتے ہیں۔‘‘

’’سامنے کا بات اے۔‘‘ گل خان نے آہستہ سے کہا۔ ’’اب گاؤں کا سب لوگ یہ بات کرتا اے۔‘‘

وہ جنگل عبور کرکے اس کے آخری حصے میں پہنچ گئے تھے۔ سورج نکل آیا تھا اور اب وادی اور پہاڑ پوری طرح روشنی میں تھے۔ جنگل جہاں ختم ہو رہا تھا وہاں سے گلیشیر کا آغاز تھا۔ یہ کہنا زیادہ درست ہوتا کہ جہاں گلیشیر ختم ہو رہا تھا وہاں سے جنگل کا آغاز تھا۔ یہاں بلندی سطح سمندر سے دس ہزار فٹ تھی۔ جنگل ختم ہوتے ہی ان کا واسطہ اس نالے سے پڑا جس سے گلیشیر کا پانی نیچے وادی تک جاتا تھا۔ رات میں سردی سے برف پگھلنا بند ہو جاتی تھی اور نالے میں پانی نہیں ہوتا تھا، جیسے ہی سورج نکلتا برف پگھلنا شروع ہوتی اور نالے میں پانی آجاتا۔ اس کی چوڑائی پندرہ سے بیس فٹ اور گہرائی چھ فٹ تک تھی۔ ڈھلان ہونے کی وجہ سے اس میں پتھر کم تھے۔ اس لیے پانی زیادہ ہونے کی صورت میں اسے عبور نہیں کیا جاسکتا تھا، اسے صرف اسی وقت عبور کیا جاسکتا تھا جب اس میں پانی نہ ہو یا بہت کم ہو۔ اس وقت پانی بہت کم تھا۔ انہوں نے اسے آٹھ بجے عبور کرلیا۔ گل خان نے بتایا۔

’’دس بجے ادر پانی بوت اوجاتا اے۔‘‘

’’شام میں پانی کب کم ہوتا ہے؟‘‘ یہ سوال مائرہ نے کیا تھا۔

’’رات بارہ بجے تک۔‘‘ گل خان نے اوپر جانے والے راستے کو دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ ’’ادر سے راستا مشکل اے۔ دیک کر آرام سے چلنا اوگا۔‘‘

اب وہ گلیشیر کے نزدیک تھے۔ گل خان نے سومت کو اپنے پاس کرلیا تھا۔ اس کے پیچھے مائرہ تھی۔ پھر ظفر اور سب سے آخر میں عمر تھا۔ یہاں سے راستہ ایک پتلی سی ڈھلان کی صورت میں اوپر جا رہا تھا۔ اس کے ایک طرف پہاڑ تھا جس کے اوپر گلیشیر جھکا ہوا تھا اور دوسری طرف گہری کھائی تھی۔ دس ہزار فٹ کی بلندی پر بھی خاصا سبزہ تھا البتہ بڑے درخت یہاں کم دکھائی دے رہے تھے۔ زیادہ تر جھاڑیاں تھیں جن میں رنگارنگ پھول کھلے ہوئے تھے۔ بعض جھاڑیاں اتنی رنگین تھیں کہ بجائے خود ایک بڑا پھول لگ رہی تھیں۔ راستہ باریک بجری سے بنا ہوا تھا اور پاؤں رکھنے پر یہ بجری پھسلتی اور کرکراتی تھی۔ دونوں صورتوں میں اس پر سفر کرنے والے کو بہت الجھن ہوتی۔ سومت خان کچھ ہی دیر میں مائرہ سے قریب ہوگیا تھا اور وہ اس کا خیال رکھ رہا تھا۔ جہاں مشکل پیش آتی وہ اسے اپنا سہارا پیش کر دیتا تھا۔ حالانکہ وہ چھوٹا تھا مگر مائرہ اس کا دل رکھنے کے لیے ضرورت نہ ہوتے ہوئے بھی اس کا سہارا قبول کرلیتی تھی۔

عمر کی ساری توجہ راستے اور اپنے توازن پر تھی کیونکہ اس کی پشت پر تقریباً پچیس کلوگرام وزن تھا۔ اس کے ساتھ وہ اس خطرناک ڈھلان پر آس پاس کے مناظر سے لطف اندوز نہیں ہوسکتا تھا۔ وہ اسی وقت آس پاس دیکھتا تھا جب اسے کھڑے ہونے کے لیے جگہ ملتی تھی۔ رفتہ رفتہ وہ گلیشیر کے پاس ہو رہے تھے۔ نالا نیچے نشیب میں چلا گیا تھا اور وہ اس کے اوپر سفر کر رہے تھے۔ یہاں سے بائیں طرف مڑے اور گلیشیر کے دہانے سے دور جانے لگے۔ یہاں نالے کے پار ایک چھوٹا جنگل تھا۔ اس سے آگے کہیں گلیشیر کا دہانہ تھا۔ گل خان سب سے آگے ایک پہاڑی کے سامنے کھڑا تھا جس کی ڈھلان چھوٹے گول پتھروں سے بھری تھی اور انہیں اس پر چڑھنا تھا۔ عمر آگے آیا اور اس نے گل خان سے کہا۔ ’’سامان سمیت اس پر چڑھنا ممکن نہیں ہے۔‘‘

’’پہلے ام جاتا اے۔‘‘ اس نے بیگ اتارا اور خود پتھروں پر پاؤں مارتا ہوا آسانی سے اوپر چلا گیا۔ وہ ایسے راستوں اور ڈھلانوں کا عادی تھا۔ اوپر جا کر اس نے نیچے رسی پھینکی اور انہوں نے باری باری اپنا سامان اوپر بھیجا۔ مگر سامان گھسیٹا ہوا گیا تھا اور ان کے لیے اس طرح گھسیٹ کر جانا ممکن نہیں تھا۔ اگر وہ رسی کا سہارا لیتے تو پیروں تلے سے

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN

پتھر نکل جاتے اور وہ کھڑے نہیں ہو سکتے تھے۔ اس لیے رسی کو صرف حفاظتی تدبیر کے طور پر رکھا کہ لڑھک کر پتلی پگ ڈنڈی کے پار کھائی میں نہ چلے جائیں۔ سومت خان نے باپ کی پیروی کی اور اسی کی طرح پاؤں مارتا اوپر چلا گیا۔ عمر کو بھی خاص مشکل پیش نہیں آئی تھی۔ وہ ایک دو مقام پر ذرا سا ڈگمگایا تھا مگر فوراً سنبھل گیا تھا۔ مائرہ بھی اس کی طرح ڈگمگائی مگر گری نہیں تھی۔ البتہ ظفر کو سامان کی طرح اوپر کھینچنا پڑا تھا۔ اس نے جتنی بار کوشش کی اتنی ہی بار گرا تھا۔ پندرہ منٹ بعد وہ سب پہاڑی کی چوٹی پر کھڑے تھے اور ظفر ہانپ رہا تھا۔ اس جگہ سے صحیح معنوں میں کرتوک گلیشیر کا آغاز ہو رہا تھا۔ گل خان نے اشارہ کیا۔

"یہ ادر اس کا چوٹا والا برف اے۔ بڑا برف اوپر اے۔ اس پہاڑی کے پار۔۔۔"

وہ جس پہاڑی پر چڑھ کر آئے تھے اس کے اور اس سے اوپر والی پہاڑی کے درمیان گلیشیر کا ایک حصہ گھومتا ہوا نیچے جا رہا تھا۔ یہاں یہ نصف کلومیٹر طویل اور کوئی ڈیڑھ سے دو سو گز چوڑا تھا۔ مائرہ نے اشارہ کیا۔ "ہمیں برف پر جانا ہوگا؟"

"برف ٹیک نہیں اے۔" گل خان نے انکار کیا۔ "ام ادر پہاڑی سے اوپر جائے گا۔"

"یہاں سے کیوں نہیں؟" ظفر نے پوچھا تو عمر نے جواب دیا۔

"یہاں برف نرم ہے اور اس کے نیچے خلا ہو سکتے ہیں۔ اس پر چلنا خطرے سے خالی نہیں ہوگا۔"

"مگر پہاڑی تک جانے کے لیے بھی تو ہمیں اس خطرے سے گزرنا ہوگا۔"

"پانچ سو میٹرز کے مقابلے میں ڈیڑھ سو میٹرز کا سفر یقیناً کم خطرناک ہوگا۔" عمر نے اپنے رک سک سے رسی کا بنڈل نکالا۔ "سب ایک رسی سے منسلک ہو جائیں تاکہ کوئی پوشیدہ گڑھے میں گرے تو اسے بچایا جا سکے۔"

سب اس رسی سے منسلک ہو گئے اور آپس میں پانچ پانچ میٹرز کا فاصلہ دے کر گلیشیر سے گزرنے لگے۔ یہاں بھی گل خان سب سے آگے تھا۔ وہ اپنی چھڑی کی مدد سے آگے برف کی مضبوطی کا اندازہ لگاتا اور پھر آگے قدم رکھتا تھا۔ اس کے پیچھے سومت، پھر مائرہ و ظفر اور سب سے آخر میں عمر تھا۔ انہوں نے پھونک پھونک کر گلیشیر کا یہ حصہ بخیر و خوبی طے کر لیا۔ مگر اگلا مرحلہ بھی کم مشکل نہیں تھا۔ دوسری پہاڑی بھربھری مٹی پر مشتمل تھی اور اس پر قدم جمانا محال تھا۔ سب سے اہم بات کہ سرے سے کوئی راستہ ہی نہیں تھا۔ بس نہایت ترچھی ڈھلان پر پاؤں رکھ کر اوپر چڑھتے چلے جائیں۔ کیونکہ کہیں رکنے یا لڑکھڑانے کا مطلب تھا نیچے واپسی۔ یہاں کھائی میں جانے کا امکان تو نہیں تھا مگر سو گز کی بلندی سے لڑھک کر نیچے آنے کے بعد آدمی کپڑے جھاڑ کر فوری کھڑا بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ مائرہ نے انکار کیا۔ "میں اس پر نہیں چڑھ سکتی۔"

گل خان نے کہا۔ "اس پر رسی سے بی نہیں چڑ سکتا اے۔"

خلافِ توقع ظفر نے اسے حوصلہ دیا۔ "چڑھ سکتے ہیں۔ کوشش کرنے میں کیا حرج ہے۔"

"اگر نہیں چڑھ سکے تو اس کا مطلب ہوگا یہاں سے واپسی۔" عمر نے کہا تو گل خان نے واضح کیا۔

"واپسی کل صبح اوگا۔ ابی نالے میں پانی آ گیا اے۔ اور کیمپ لگانے کا جگہ بی نہیں اے۔"

گل خان کی بتائی صورتِ حال خاصی سنگین تھی۔ اس لیے مائرہ نے خود کو اوپر چڑھنے پر آمادہ کر لیا۔ اس نے پہاڑی کی ایک ڈھلان کی طرف اشارہ کیا جو گلیشیر کے عین اوپر تھی اور ذرا کم ترچھی تھی۔ "ادھر سے چلا جائے تو کیسا رہے گا؟"

"یہ بھی مشکل ہے اور لڑھکنے کی صورت میں آدمی سیدھا گلیشیر پر گرے گا۔" عمر نے جائزہ لے کر کہا۔ مگر ظفر نے مائرہ کی تائید کی تو مجبوراً گل خان اور عمر بھی راضی ہو گئے۔ گل خان اور سومت آرام سے چلے گئے۔ عمر، مائرہ کے پیچھے تھا۔ ظفر سب سے پیچھے تھا۔ ڈھلان پر تیز قدم رکھنا پڑ رہے تھے کیونکہ دو قدم اوپر جانے کے بعد آدمی پھسل کر ایک قدم واپس بھی آتا تھا۔ یہ نہایت مشکل اور مشقت بھرا کام تھا جو انہیں سو گز تک مسلسل کرنا تھا بلکہ اس کٹاؤ نما ڈھلان پر یہ زیادہ طویل تھا۔ عمر کی نظریں مائرہ کے قدموں پر تھیں۔ اس کی چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ وہ اس ڈھلان پر لازمی لڑکھڑائے گی اور وہ خود کو اس کے لیے پہلے سے تیار کر رہا تھا۔ اس کی چھٹی حس کا اشارہ درست ثابت ہوا جب مائرہ پہاڑی کی چوٹی کے پاس پہنچ کر لڑکھڑائی۔ اس کا ایک پاؤں پھسلا اور دوسرا جما رہا، نتیجے میں وہ گری اور سیدھی کٹاؤ کی طرف گئی۔

عمر آگے کی طرف گرا، اس کے بائیں ہاتھ میں نوکدار کلہاڑی تھی۔ اس نے اسے ڈھلان پر مارا اور دائیں ہاتھ سے مائرہ کی کمر سے بندھی بیلٹ سے نکلی رسی تھام لی۔ وہ جھٹکے سے رکی اور فوراً ہی عمر کے ہاتھ کو اپنے دونوں ہاتھوں

سے گرفت میں لے لیا۔ اب صورتِ حال یہ تھی کہ عمر ڈھلان پر اوندھے منہ گرا ہوا تھا۔ کلہاڑی نے اسے سرکنے سے روکا ہوا تھا مگر مائرہ کا وزن اسے کٹاؤ کی طرف کھینچ رہا تھا۔ مائرہ کے پاؤں خلا میں تھے اور سینے تک اس کا جسم کٹاؤ سے لٹکا ہوا تھا۔ عمر اسے کہہ رہا تھا کہ وہ اپنا ایک پاؤں اوپر لے آئے تاکہ بوجھ کم ہو ورنہ وہ دونوں نیچے چلے جائیں گے۔ مائرہ بدحواس ہو رہی تھی اور کئی بار کہنے کے بعد عمر کی بات اس کی سمجھ میں آئی تھی۔ اس نے کوشش کر کے اپنا دایاں پاؤں ڈھلان پر رکھا اور اسی لمحے عمر کی کلہاڑی ڈھلان سے نکل آئی۔ مائرہ جو ایک پاؤں اوپر لے آئی تھی جھٹکے سے اس کا پاؤں دوبارہ نیچے گیا اور اس کے منہ سے چیخ نکلی تھی۔

عمر بھی لڑکھڑایا تھا لیکن اس سے پہلے کہ وہ نیچے جاتا اس نے پھرتی سے کلہاڑی دوبارہ ڈھلان پر ماری۔ وہ ایک بار پھر رک گیا تھا۔ اس بار مائرہ نے ہوش سے کام لیا۔ وہ ممکن حد تک کٹاؤ سے چپک گئی اور آہستہ سے پاؤں اوپر لائی۔ جیسے ہی اس کا ایک پاؤں کنارے پر آیا۔ عمر پر اس کا وزن کم ہوا تھا اور اس نے اسے اوپر کھینچ لیا۔ وہ اب کنارے لیٹی ہانپ رہی تھی۔ مگر خطرے کی حد سے نکل آئی تھی۔ عمر نے کہا۔ ”اسی طرح لیٹے لیٹے اوپر سرکو، یہاں اٹھنا اب خطرناک ہوگا۔“

مائرہ نے اس کی ہدایت پر عمل کیا اور اوپر سرکنے لگی۔ وہ ڈھلان سے کسی چھپکلی کی طرح چپٹی ہوئی تھی۔ گل خان آگے آیا اور اس نے رسی پھینکی جو مائرہ نے پکڑ لی پھر اس نے اسے اوپر کھینچ لیا۔ پھر رسی کے سہارے ہی عمر اور ظفر بھی آئے تھے کیونکہ چوٹی کے اس آخری حصے میں ڈھلان زیادہ تھی اور یہاں ریت پھسل رہی تھی۔ چوٹی اوپر سے مسطح تھی اور اس کا ایک سرا نیچے آتے گلیشیر سے جا لگا تھا۔ یہاں بلندی بارہ ہزار فٹ سے اوپر تھی۔ ہوا ہلکی اور بہت یخ تھی۔ سانس لینے پر لگتا تھا سرد ہوا سینے میں جا رہی ہے۔ ذرا سی جدوجہد نے ان سب کو ہانپنے پر مجبور کر دیا تھا۔ دوپہر ہو چکی تھی اور ساڑھے بارہ بجے کا وقت تھا..... ان کو کچھ دیر وہاں قیام اور لنچ کرنا تھا۔ عمر نے اپنے لیے فرائی آلو کا ایک ٹن نکالا تھا۔ مائرہ اور ظفر بھی لنچ کرنے لگے۔ گل خان اپنے کھانے کے لیے میٹھی روٹی لایا تھا۔ عمر الگ بیٹھا ہوا تھا۔ مائرہ اس کے لیے کافی لے آئی۔

”شکریہ۔“ مائرہ نے کافی دیتے ہوئے کہا۔

”فارگیٹ اٹ، میری جگہ کوئی بھی ہوتا تو یہی کرتا۔“ عمر نے کافی کا مگ لیا۔ کھانے کے بعد گل خان اور اس کا بیٹا

ماہنامہ سرگزشت
ہر شمارہ خاص نمبر
لیکن خاص نمبر کی بات ہی کچھ اور ہے
نئے سال کا پہلا شمارہ جنوری 2016ء
پراسرار نمبر
انتہائی چونکا دینے والے، حیرت زدہ اور لرزا دینے والے واقعات
ایک ایسا شمارہ جسے آپ مجلد کرا کر رکھنے پر مجبور ہو جائیں
آج ہی نزدیکی بک اسٹال پر یہ شمارہ مختص کرا لیں

ٹیلے سے کچھ چن رہے تھے۔ مائرہ نے پوچھا۔ ”گل خان سے آپ کی کیا بات ہوئی تھی؟“

”کب؟“

”جب آپ دونوں جنگل میں تھے۔“ مائرہ بولی۔ ”میں ذرا فاصلے پر تھی لیکن مجھے لگا کہ آپ دونوں کے درمیان کسی خاص موضوع پر بات ہو رہی ہے۔“

”موضوع خاص نہیں تھا۔ ہم بچوں کے قتل پر بات کر رہے تھے۔ گل خان کا خیال ہے کہ بچوں کا قتل اصل میں ان کے باپ کی وجہ سے ہوا ہے جو کہیں سے قیمتی پتھر لاتے ہیں اور اسے فروخت کر کے پیسے کماتے ہیں۔“

مائرہ چونکی۔ ”کسی نے بچوں کو قیمتی پتھروں کے پیچھے قتل کیا ہے؟“

”نہیں، گل خان اسے مکافاتِ عمل کہہ رہا ہے، اس کا نقطۂ نظر ہے کہ آسان پیسا آزمائشیں لاتا ہے اور دیکھا جائے تو وہ غلط نہیں کہہ رہا ہے جب آدمی کے پاس بنا محنت کے پیسا آتا ہے تو وہ اپنے ساتھ نقصان بھی لاتا ہے۔“

مائرہ نے اسے عجیب نظروں سے دیکھا۔ ”میرا نہیں خیال کہ آپ جیسا آدمی اس طرح سوچتا ہوگا۔“

”سیدھی بات تو کوئی بھی سوچ سکتا ہے۔“

”اگر ان بچوں کے باپ قیمتی پتھر نکال رہے تھے تو اس سے کسی کا کیا نقصان ہو رہا تھا۔“

”سچی بات ہے کہ میں نے اس بارے میں زیادہ نہیں سوچا۔“ عمر نے کچھ دیر بعد کہا۔ ”میرے نزدیک یہ ایک ضمنی اور غیر متعلق معاملہ ہے۔“

”بعض اوقات ضمنی اور غیر متعلق معاملات بھی متعلق ہو جاتے ہیں۔“

”اگر ایسا ہوا تو دیکھا جائے گا۔“ عمر نے کہا اور خالی مگ اسے واپس کر کے کھڑا ہو گیا۔ وہ گل خان کے پاس آیا جو بیٹے کے ہمراہ ٹیلے سے جڑی بوٹیاں چن رہا تھا۔ عمر کے پوچھنے پر اس نے بتایا۔

”صیب یہ بوت کام کا بوٹی اے۔ یہ دیکو اس سے سردی کا علاج اوتا اے۔“ اس نے ایک عنابی پتوں والی بوٹی دکھائی۔ ”جب کسی کو سردی لگتا اے تو اسے دودھ میں ملا کر دیتا اے سردی ٹیک اوجاتا اے۔“ پھر اس نے گول گوندی جیسے پھل دکھائے۔ ”اسے کھانے سے جوڑ کا درد نہیں ہوتا۔ بوڑا لوگ اسے کھا کر ٹیک اوجاتا اے۔ ام اپنا باپ کے واسطے لے کر جاتا۔“

دونوں باپ بیٹے بوٹیاں جمع کر کے انہیں الگ الگ تھیلوں میں ڈال رہے تھے...... جڑی بوٹیوں سے فارغ ہو کر گل خان رات کو آگ جلانے کے لیے خشک جھاڑیاں جمع کر رہا تھا۔ لکڑی یہاں بھی نہیں تھی مگر سوکھ جانے والی جھاڑیاں تھیں۔ وہ کچھ لکڑی نیچے سے لایا تھا اور کچھ یہاں سے خشک ہو جانے والے چھوٹے پودے جمع کر لیے تھے۔ عمر اس کا ہاتھ بٹانے لگا۔ اس نے گل خان سے پوچھا۔ ”اب ہمیں کس طرف سے جانا ہے؟“

”ادر گلیشیر سے۔“ اس نے کہا اور دور چوٹی کے دامن کی طرف اشارہ کیا۔ ”شام تک ادر رکے گا اور رات واپس ادر رکے گا۔“

”رات ادھر کیوں نہیں رک سکتے؟“

”ادر رات سردی بوت ہوتا۔ آپ ام برداشت نہیں کر سکتا۔“

”گلیشیر کا دہانہ کہاں ہے؟“

”ادر کٹاؤ کے نیچے جدر مائرہ بی بی لٹک گیا تھا۔“

یہ اصل میں کرتوک چوٹی کا بیس کیمپ تھا اور عمر وہیں تک جانا چاہتا تھا مگر اس کے لیے ایک کلومیٹر چوڑے گلیشیر پر سے گزرنا پڑتا اور یہ اس سفر کا سب سے خطرناک حصہ تھا۔ گل خان کا کہنا تھا کہ یہ نچلے گلیشیر سے کم خطرناک تھا کیونکہ یہاں برف سخت اور جمی ہوئی تھی مگر اس کی چوڑائی زیادہ تھی اور راستے میں گڑھوں سے واسطہ پڑ سکتا تھا۔ انہیں رسی کی مدد سے اس کے پار جانا تھا۔ ڈیڑھ بجے وہ روانہ ہوئے۔ گرمی سے برف نرم پڑ گئی تھی اور ان کے پیروں تلے دب رہی تھی۔ سب نے اسٹک لی ہوئی تھیں اور آگے بڑھنے سے پہلے وہ اس سے برف دبا کر دیکھتے تھے کہ اس کے نیچے خلا تو نہیں ہے۔ گلیشیر کے اندر ندیاں رواں تھیں جن میں پانی بہنے کی آواز باہر تک صاف سنائی دے رہی تھی۔ یہ ندیاں مل کر ایک دریا کی صورت میں گلیشیر کے دہانے سے باہر آتیں اور نیچے موجود نالے سے اس کا پانی کرتوک گاؤں تک جاتا تھا۔

احتیاط کی وجہ سے آگے بڑھنے کی رفتار سست تھی اور گلیشیر پر سردی زیادہ تھی۔ ان کے ہاتھ اور چہرے سن ہوئے جا رہے تھے۔ اوپر سے تیز دھوپ انہیں جلا رہی تھی۔ عمر اور باقی سب نے اپنا سامان مسطح چوٹی پر چھوڑ دیا تھا اور اس وقت ہلکے ہو کر چل رہے تھے۔ عمر کی ساری توجہ برف پر تھی اس کے باوجود اچانک ہی اس کے پیروں تلے برف چٹخی اور وہ بے ساختہ پیچھے ہٹا۔ اس کے پیچھے ہٹتے ہی برف کا ایک ٹکڑا اندر جا گرا تھا۔ گل خان اس سے بچ کر گزرا تھا اور عمر کا اس پر پاؤں آ گیا تھا۔ اس نے نمودار ہونے

والے خلا کے کنارے اسٹک ماری تو مزید برف اندر گری تھی۔ اس نے مڑ کر ظفر اور مائرہ کو اشارہ کیا کہ وہ اس سے بچ کر آگے جائیں۔ وہ خود بھی گڑھے سے دور رہ کر آگے بڑھا تھا۔ مائرہ نے اس کے قریب سے گزرتے ہوئے اندر جھانکا اور خوف زدہ ہو گئی تھی۔ گلیشیر پار کرنے کے بعد اس نے ستاتے ہوئے بتایا کہ گڑھے کے اندر تاریکی تھی اور اس تاریکی میں عجیب سی آوازیں آرہی تھیں۔ ظفر نے طنزیہ انداز میں کہا۔

”ہوسکتا ہے کہ بچوں کے قاتل جنات اسی گلیشیر کے گڑھوں میں رہتے ہوں۔“

سومت کچھ دور بیٹھا ہوا تھا۔ مائرہ نے ظفر کو گھورا۔ ”تمہیں بچے کے سامنے ایسی بات نہیں کرنی چاہیے۔“

”تم فکر مت کرو سومت بہادر بچہ ہے۔“ ظفر نے بدستور طنزیہ انداز میں کہا۔ ”یہ جنات سے نہیں ڈرتا۔“

”ام کسی سے نہیں ڈرتا۔“ سومت نے سنجیدگی سے کہا اور اٹھ کر اپنے باپ کے پاس چلا گیا۔ اس نے اتنی سردی میں بھی ایک معمولی سوئیٹر اور ملیشیا کی شلوار قمیص پہنی ہوئی تھی۔ رات گزارنے کے لیے گل خان بھیڑ کے بالوں سے بنے کمبل ساتھ لایا تھا۔ بارش سے بچنے کے لیے اس کے پاس پلاسٹک شیٹ تھی۔ مائرہ کو اس کی فکر تھی، اس نے عمر سے کہا۔

”سومت رات کیسے گزارے گا، اس کے پاس تو سردی سے بچاؤ والا لباس بھی نہیں ہے۔“

”وہ اس سردی کا عادی ہے اگر وہ عادی نہ ہوتا تو گل خان اسے یہاں نہ لاتا۔“ عمر نے مائرہ کو تسلی دی مگر اس کی فکر کم نہیں ہوئی۔ وہ ڈھائی بجے یہاں پہنچے تھے اور گل خان نے اعلان کر دیا تھا کہ اگر موسم ٹھیک رہا تو وہ پانچ بجے تک یہاں رکیں گے۔ دوسری صورت میں موسم کی خرابی نمودار ہوتے ہی وہ واپسی کی راہ اختیار کریں گے۔ کیونکہ اگر وہ یہاں پھنس گئے تو ان کے لیے آنے والی رات بہت مشکل ثابت ہو سکتی تھی۔ کچھ ستانے کے بعد مائرہ نے اپنا کیمرا بیگ اٹھایا اور اس میں سے کیمرا اور دوسرا سامان نکالنے لگی۔ یہاں تصویر لینے کے لیے وہ پاور لینس کے ساتھ ٹرائی پوڈ بھی لائی تھی۔ کیمرے کی اضافی بیٹریاں سولر چارجر میں چارج ہونے کے لیے لگا دی تھیں۔ یہاں کہیں بجلی نہیں تھی اس لیے وہ موبائل اور کیمرے کی بیٹری چارج کرنے کے لیے سولر چارجر لائی تھی جو سورج کی روشنی کو بجلی میں تبدیل کر کے بیٹریاں چارج کرتا تھا۔ عمر نے اپنی گھڑی میں نصب آلٹی میٹر دیکھا۔ یہاں بلندی ساڑھے تیرہ ہزار فٹ تھی۔ اس نے گل خان سے کہا۔

”کیا خیال ہے ڈھلان پر چلیں جہاں تک آسانی سے جاسکتے ہوں۔“

”صیب امارے پاس بوٹ نہیں اے۔“ گل خان نے عذر پیش کیا۔ اس کا اشارہ کوہ پیمائی کے لیے مخصوص جوتوں کی طرف تھا۔

”میں چلتا ہوں۔“ خلافِ توقع ظفر بولا۔ ”میرے جوتے ٹھیک ہیں لیکن میرے پاس رسی اور کلہاڑی نہیں ہے۔“

”میرے پاس ہے۔“ عمر نے کہا۔ ”مگر فکر مت کرو ہم اتنا آگے نہیں جائیں گے کہ رسی اور کلہاڑی کے استعمال کی ضرورت پڑے۔“

وہ چوٹی کے نیچے کسی قدر پھیلی ڈھلان کی طرف بڑھے۔ بہ ظاہر یہ زیادہ بلند نہیں لگ رہی تھی مگر جب انہوں نے چڑھنا شروع کیا اور آدھے گھنٹے بعد ایک جگہ رکے تو وہ حیران ہوئے تھے۔ وہ اتنی بلندی پر آگئے تھے کہ نیچے موجود گل خان، مائرہ اور سومت نقطوں کی طرح نظر آرہے تھے۔ ظفر نے حیرت سے کہا۔ ”میرے خدا، ہم اتنی بلندی پر آگئے ہیں اور پتا ہی نہیں چلا۔“

وہ پندرہ ہزار فٹ کی بلندی پر تھے اور یہاں سانس لینا مزید دشوار ہو رہا تھا۔ اب وہ مستقل ہانپنے کے انداز میں سانس لے رہے تھے۔ یہاں سے ڈیتھ زون شروع ہو جاتا تھا اور اس سے اوپر جانا ان کے لیے خطرناک بھی ہو سکتا تھا۔ آکسیجن کی کمی جان لیوا بھی ہو سکتی تھی۔ اس لیے وہ اسی جگہ رک گئے۔ یہاں برف نہیں تھی بلکہ سیاہی مائل ریت تھی۔ جو یوں چمک رہی تھی جیسے بہت باریک سیاہ ہیرے ہوں۔ ظفر نے اسے ہاتھ میں لے کر ہوا میں چھوڑا تو وہ دھوپ میں چمکتی ہوئی نیچے گرنے لگی۔ ظفر نے کہا۔ ”تمہارا کیا خیال ہے یہاں قیمتی پتھر ملتے ہوں گے؟“

”ناردرن ایریا میں اکثر جگہوں کے بارے میں سنا ہوا ہے کہ وہاں قیمتی پتھر ملتے ہیں۔“ عمر نے سر ہلایا۔ ”میں نے چھوٹے قصبوں اور شہروں میں دکانوں پر یہ پتھر بکتے بھی دیکھے ہیں۔ مگر وہ صرف خوب صورت ہوتے ہیں ان کا شمار جواہرات میں نہیں کیا جاسکتا ہے۔“

”لیکن میں نے دیکھے ہیں۔“ ظفر نے پُراسرار سے انداز میں کہا۔ وہ سچ مچ جواہر ہیں اور بہت قیمتی ہیں۔“

”کہاں دیکھے ہیں؟“

”ایک شخص کے پاس جس نے کرتوک کے ایک آدمی سے انہیں خریدا تھا اور اس نے آگے ان پتھروں کو چار گنا زیادہ قیمت پر فروخت کیا۔ ان میں سے ایک پتھر میں نے بھی لیا تھا۔“ ظفر نے کہا اور اپنی جیکٹ کی اندرونی جیب سے کپڑے کی چھوٹی سی تھیلی نکالی اور اس کی ڈوری کھول کر اسے ہتھیلی پر الٹا تو چڑیا کے انڈے سے ذرا چھوٹا سبز پتھر باہر نکل آیا۔ یہ ناتراشیدہ تھا مگر دیکھنے میں تراشا ہوا لگ رہا تھا۔ ”میں نے یہ اسی ہزار روپے میں لیا ہے اور ایک جیولر نے مجھے اس کے بدلے ڈیڑھ لاکھ کی پیش کش کی تھی مگر میں نے فروخت نہیں کیا۔“

عمر غور سے دیکھ رہا تھا۔ کیونکہ ظفر نے اسے دیا نہیں تھا اس لیے اس نے پتھر لینے کی کوشش نہیں کی۔ ”تمہیں یقین ہے کہ یہ پتھر یہیں سے گیا ہے؟“

ظفر نے سر ہلایا۔ ”اگرچہ میں اس آدمی سے ملا نہیں ہوں لیکن جس نے پتھر خریدے تھے اس نے یہی بتایا ہے کہ فروخت کرنے والا کرتوک کا رہائشی تھا اور ظاہر ہے اسے جھوٹ بولنے کی ضرورت نہیں تھی۔“

”اگر وہ فراڈ ہوا تو؟“

”نہیں، میں اسے جانتا ہوں۔“ ظفر نے نفی میں سر ہلایا۔ ”واقفیت کی وجہ سے میں اس سے یہ پتھر اتنی کم قیمت میں لینے میں کامیاب ہوا۔“

”تم نے اور پتھر بھی دیکھے ہوں گے، کچھ اندازہ ہے کہ بیچنے والے نے کتنی بڑی لاٹ بیچی ہوگی؟“

”اس نے کم سے کم سو پتھر بیچے تھے۔ نصف اس سے کم سائز کے ہوں گے اور باقی اتنے ہی یا اس سے ذرا بڑے سائز کے ہوں گے۔“

عمر نے حیرت سے دیکھا۔ ”اگرچہ مجھے پتھروں کے بارے میں زیادہ علم نہیں ہے لیکن میرا خیال ہے کہ اتنے بڑے پتھر بہت کم ملتے ہیں۔ اگر وہ شخص ایک ہی لاٹ میں اتنے پتھر لایا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ جہاں سے لایا ہے وہاں ایسے بہت پتھر ہیں۔“

”میرا بھی یہی خیال ہے۔“

”کہیں تم ان پتھروں کے چکر میں تو یہاں نہیں آئے ہو؟“

ظفر نے سر ہلایا۔ ”ہاں، میرے آنے کا اصل مقصد یہی ہے۔“

”تم اس جگہ کی کھوج میں ہو جہاں سے پتھر مل سکتے ہیں؟“

اس بار ظفر نے انکار کیا۔ ”میں ان چکروں میں پڑنے والا آدمی نہیں ہوں میں بزنس مین ہوں۔ میں یہاں ان لوگوں کی تلاش میں ہوں، جو یہ پتھر فروخت کرتے ہیں۔ میں ان سے مستقل بنیادوں پر معاہدہ کروں گا اور وہ جتنے بھی پتھر نکالیں گے میں سب خرید لوں گا۔“

”مگر اس بزنس میں خطرہ ہے۔“ عمر نے پُرخیال نظروں سے اسے دیکھا۔ ”تم دو بچوں کے قتل کو بھول رہے ہو۔“

”یہ گل خان کی اپنی سوچ ہے۔ ضروری نہیں ہے ان بچوں کا قتل قیمتی پتھروں کی وجہ سے ہوا ہو۔“

”اگر ایک بچہ مارا گیا ہوتا تو سمجھ میں آتا کہ کسی نے دشمنی میں ایسا کیا ہے مگر دو الگ گھروں کے بچوں کی ایک جیسی موت بتا رہی ہے کہ معاملہ کچھ اور ہے۔ پھر دونوں گھرانوں کے سربراہ قیمتی پتھر فروخت کرتے ہیں۔“

ظفر نے سر ہلایا۔ ”میرا خیال ہے اب چلنا چاہیے۔ ساڑھے تین بج گئے ہیں۔“

اترائی زیادہ مشکل تھی کیونکہ اکثر جگہوں پر پھسلوان ریت تھی۔ وہ چار بجے تک نیچے پہنچے تھے۔ مائرہ بہت خوش تھی۔ اس نے جوش سے کہا۔ ”آج میں نے اپنی زندگی کی سب سے بہترین تصویریں لی ہیں۔ مائی گاڈ! کیا سین ہیں یہاں پر۔“

گل خان ایک طرف کھڑا اوپر چوٹی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ عمر اس کے پاس چلا آیا۔ ”کیا دیکھ رہے ہو؟“

گل خان نے اشارہ کیا۔ ”صیب وہ بادل دیکھو۔“

چوٹی کے پاس ایک ڈسک نما بادل تھا۔ مگر یہ زیادہ بڑا نہیں تھا۔ ”ہاں دیکھ رہا ہوں۔“

”یہ ابی دس منٹ میں بنا اے۔ اگر یہ دس منٹ میں اور بڑا ہوا تو ام ادر سے واپس جائے گا۔“

دس منٹ سے بھی پہلے عمر نے محسوس کر لیا کہ بادل کے حجم میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔ وہ مائرہ کے پاس آیا جو بدستور فوٹو گرافی میں مگن تھی۔ اس نے اس دوران میں چارج شدہ بیٹری بھی تبدیل کی تھی۔ عمر نے اسے بادل کے بارے میں بتایا تو اس نے انکار کیا۔ ”میں اتنی جلدی نہیں جانے والی۔ ابھی تو بہت سے سین ہیں۔“

ظفر بھی آگیا اس نے مائرہ سے کہا۔ ”گل خان یہاں کا رہنے والا ہے اور اسے یہاں کے موسم کا بہتر علم ہے اس لیے ہمیں اس کے مشورے پر عمل کرنا چاہیے۔“

گل خان بھی چلا آیا۔ اس نے سنجیدگی سے کہا۔

''خراب موسم آنے والا اے۔ اگر موسم خراب ہو تو گلیشیر پر سفر ٹھیک نہیں ہوتا اے۔''

اوپر بادل کا حجم اتنا بڑھ گیا تھا کہ اس نے چوٹی کو چھپا لیا تھا اور وہ تیزی سے اس کی نچلی ڈھلانوں کی طرف آ رہا تھا۔ مائرہ نے موسم کے تیور دیکھے تو بادلِ ناخواستہ اپنا کیمرا اور سامان پیک کرنے لگی۔ وہ روانگی کی تیاری کر رہے تھے۔ ساڑھے چار بجے وہ بیس کیمپ سے گلیشیر پر اترنے لگے۔ موسم بدل رہا تھا۔ ہوا میں تندی اور خنکی آ گئی تھی، اس کا اثر گلیشیر پر بھی ہوا تھا اور اس کی نرم برف اب جم رہی تھی۔ اس پر قدم اٹھانا آسان ہو گیا تھا مگر ساتھ ہی یہ زیادہ خطرناک بھی ہو گئی تھی کیونکہ جمی ہوئی برف کے بارے میں کہنا مشکل تھا کہ یہ صرف ایک پرت ہے یا پھر ٹھوس بلاک۔ ابھی وہ آغاز میں تھے کہ آسمان پر بادل چھا گئے اور دھوپ غائب ہو گئی۔ ساتھ ہی ہوا میں تندی اور یخ آنے لگی تھی۔ ہوا انہیں بائیں طرف دھکیل رہی تھی یعنی گلیشیر کی ڈھلان پر اور انہیں سیدھ میں مسطح چوٹی تک جانا تھا۔

عمر اس بار درمیان میں تھا کیونکہ اسی کے پاس برف میں گاڑنے والی کلہاڑی تھی۔ اگر کوئی برف تلے چھپے غار میں گر جاتا تو وہی اسے بچانے کے لیے کلہاڑی استعمال کر سکتا تھا۔ سب سے آگے گل خان تھا۔ اس کے پیچھے ظفر، عمر کے پیچھے بالترتیب مائرہ اور سومت تھے۔ وہ ایک لائن میں سفر کر رہے تھے۔ وہ وسطِ گلیشیر تک پہنچے تھے کہ موسم کی خرابی طوفانی صورت اختیار کر گئی...... برف گرنے لگی تھی اور تیز ہوا گالے اڑا رہی تھی۔ ہوا کے شور میں انہیں آپس میں بات کرنے کے لیے بھی چیخ کر بات کرنی پڑ رہی تھی۔ گل خان کو سومت کی فکر تھی، وہ بار بار مڑ کر اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ مگر سومت کے لیے سب سے پیچھے رہنا ہی مناسب تھا۔ برف جم کر سخت اور اب پھسلواں ہو رہی تھی اور ہر تھوڑی دیر بعد ان میں سے کوئی نیچے گر رہا تھا۔ ہوا بھی اپنا زور استعمال کر رہی تھی۔ مگر جیسے جیسے وہ گلیشیر کے کنارے کی طرف جا رہے تھے، چھپے غاروں کے خطرے سے نکلتے جا رہے تھے۔ یہاں ان کی رفتار تیز ہو گئی تھی۔

بالآخر انہوں نے گلیشیر عبور کیا اور ہموار چوٹی پر قدم رکھا۔ موسم یہاں بھی خراب تھا مگر اس میں شدت نہیں تھی۔ انہوں نے اپنا سامان اٹھایا اور چوٹی کے نچلے حصے کی طرف جانے لگے۔ جہاں ایک چھجے نما چٹان تھی اور وہ اس کے نیچے محفوظ تھے۔ مگر ذرا سی دیر میں سردی اور یخ ہواؤں نے ان کا برا حال کر دیا تھا۔ گل خان نے کمبل نکال لیے تھے اور وہ بیٹے سمیت ان میں لپٹ گیا تھا۔ مائرہ اور ظفر نے سلیپنگ بیگز بچھائے اور ان میں گھس گئے۔ عمر باہر رہ گیا کیونکہ نہ تو یہاں جگہ تھی کہ خیمہ لگاتا اور طوفان اسے خیمہ لگانے کی اجازت بھی نہیں دیتا۔ اس لیے وہ چٹان کی جڑ سے لگ کر بیٹھ گیا۔ اس نے ہاتھ اور چہرہ چھپا لیا تھا۔ رفتہ رفتہ طوفان کی شدت کم ہونے لگی۔ اوپر بادل چھٹ رہے تھے اور کچھ دیر میں سورج نکل آیا۔ گل خان نے کمبل ہٹاتے ہوئے انہیں جھاڑا اور بولا۔

''ابی نیچے جانا ہوگا۔''

''اس وقت۔'' عمر نے تاریک ہوتے آسمان کو دیکھا۔ ''کچھ دیر میں اندھیرا ہو جائے گا۔''

''اب اور بوت سردی اوگا رات میں۔'' اس نے کہا۔ ''ابھی اور نہیں رے سکتا۔''

''نالا جو رات بارہ بجے رکتا ہے۔'' مائرہ نے اسے یاد دلایا۔

''وہ ابی رک گیا اوگا۔ طوفان سے گلیشیر جم گیا اے۔ اس لیے نالا بھی رک گیا اوگا۔''

عمر محسوس کر رہا تھا کہ گل خان ٹھیک کہہ رہا ہے۔ اس وقت بھی سردی بہت زیادہ ہو گئی تھی اور رات تک اس میں نہ جانے کتنا اضافہ ہوتا۔ ان کا یہاں سے جانا ہی مناسب تھا۔ مختصر بحث کے بعد وہ تیار ہوئے۔ انہوں نے سامان پیک کیا اور نیچے اترنے لگے۔ کٹاؤ والی ڈھلان سے اترتے ہوئے انہیں بہت احتیاط کرنی پڑی تھی۔ کسی نہ کسی طرح انہوں نے اسے عبور کر کے گلیشیر کے چھوٹے حصے تک رسائی حاصل کی۔ اسے پار کر کے وہ جنگل میں پہنچ جاتے۔ گل خان کا کہنا تھا کہ وہ رات وہیں بسر کریں گے۔ مگر ابھی نالا عبور کرنا باقی تھا اگر اس میں پانی ہوتا تو انہیں انتظار کرنا پڑتا کہ پانی آنا بند ہو جائے تو نالا عبور کر سکیں۔ چھوٹا گلیشیر بھی غیر متوقع طوفان اور سردی سے جم گیا تھا، اس پر سفر کرنا آسان ثابت ہوا اور وہ اسے پار کر کے جب دوسری طرف پہنچے تو نالے میں پانی کم رہ گیا تھا۔ انہوں نے اسے بھی آرام سے پار کر لیا اور جنگل میں آ گئے تھے۔ تب تک تاریکی مکمل ہو گئی تھی اور انہوں نے برقی لالٹین نکال لی تھیں۔

''یہاں تو موسم بہت اچھا ہے۔'' مائرہ نے کہا۔ ''اوپر سردی زیادہ تھی۔''

گل خان نے ایک جگہ دیکھی جہاں آرام سے پڑاؤ

ڈالا جاسکتا تھا۔ وہ سومت کی مدد سے پتھر جمع کرکے الاؤ کی تیاری کرنے لگا۔ ظفر ابھی تک نالے کے کنارے کھڑا تھا اور اوپر دیکھ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ ان کی طرف آیا۔ عمر اپنا رک سک رکھ کر ستا رہا تھا۔ وزنی رک سک کے ساتھ سفر کرنا آسان نہیں تھا۔ ظفر اس کے پاس بیٹھ گیا اور اس نے آہستہ سے کہا۔ ”گلیشیر کا دہانہ یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔“

عمر، گل خان سے سن چکا تھا کہ قیمتی پتھر گلیشیر کے دہانے کے آس پاس سے ملتے ہیں۔ مگر اس نے مائرہ کو بھی نہیں بتایا تھا۔ اس لیے وہ ظفر کے منہ سے سن کر چونکا۔ ”اگر گلیشیر کا دہانہ یہاں سے نزدیک ہے تو ہمیں اس سے کیا؟“

ظفر نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ”واقعی تمہیں کچھ نہیں معلوم ہے۔“

”تم اپنی بات کرو۔“ عمر نے خشک لہجے میں کہا۔

”یہ چھوڑو کہ مجھے کیا معلوم ہے اور کیا نہیں۔“

”قیمتی پتھر دہانے کے آس پاس سے ملتے ہیں۔“

”تمہیں کیسے معلوم ہوا؟“

”گلیشیر اپنے وزن سے پہاڑ اور زمین کو کاٹتا ہے۔ پھر اس کے اندر پانی بہتا ہے جو مٹی اور اس کے ساتھ پتھر باہر لاتا ہے۔ ان پتھروں میں قیمتی پتھر بھی ہوتے ہیں۔ باہر آنے پر پانی دہانے کے پاس مٹی کے ساتھ پتھر بھی چھوڑتا ہے۔ اب تم جان گئے ہوگے کہ قیمتی پتھر گلیشیر کے دہانے کے پاس کیسے ملتے ہیں۔“

”لیکن ایسا اسی صورت میں ممکن ہے جب یہاں زمین تلے قیمتی پتھر کی کانیں ہوں۔“

”ضروری نہیں ہے۔“ ظفر نے نفی میں سر ہلایا۔ ”قیمتی پتھر چٹانوں میں بے پناہ دباؤ کی وجہ سے بنتے ہیں۔ یہ تھوڑے سے بھی ہوسکتے ہیں یعنی ان کی باقاعدہ کان ہونا ضروری نہیں ہے۔ باقاعدہ کانیں میدانی علاقوں میں ہوتی ہیں اور وہ بھی دریاؤں کے آس پاس پائی جاتی ہیں۔“

”لگتا ہے تم نے اس فیلڈ میں خاصی ریسرچ کی ہے۔“

”ہاں کیونکہ میں اس بزنس میں آنا چاہتا ہوں۔“

”اگر تم جانتے ہو اور گاؤں والے بھی جانتے ہیں کہ ہیرے کہاں سے مل سکتے ہیں تو تم لوگ حاصل کیوں نہیں کر لیتے؟“

”اس میں کوئی نہ کوئی مشکل ہوتی ہے۔“ ظفر نے پُرتفکر لہجے میں کہا۔ ”ویسے بھی فطرت کا اصول ہے کہ قیمتی چیز آسانی سے نہیں ملتی ہے اور مقدار میں زیادہ نہیں ہوتی ہے۔“

”جیسے اچھی عورت۔“ عمر نے پُرخیال انداز میں مائرہ کی طرف دیکھا جو ٹیب سے میموری اسٹک لگا کر اپنی کھینچی تصویروں کا جائزہ لے رہی تھی۔

ظفر مسکرانے لگا۔ ”دوست، لگتا ہے تم کسی غلط فہمی کا شکار ہو۔“

قارئین متوجہ ہوں
پرچا نہیں ملتا
کچھ عرصے سے بعض مقامات سے یہ شکایات مل رہی ہیں کہ ذرہ بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پرچا نہیں ملتا۔ ایجنٹوں کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے ہماری گزارش ہے کہ پرچا نہ ملنے کی صورت میں ادارے کو خط یا فون کے ذریعے مندرجہ ذیل معلومات ضرور فراہم کریں۔
☆ بک اسٹال کا نام جہاں پرچا دستیاب نہ ہو۔
☆ شہر اور علاقے کا نام۔
☆ ممکن ہو تو بک اسٹال کا PTCL یا موبائل فون نمبر
رابطے اور مزید معلومات کے لیے
ثمر عباس
03012454188
جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
سسپنس، جاسوسی، پاکیزہ، سرگزشت
C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی
مندرجہ ذیل ٹیلی فون نمبروں پر بھی رابطہ کرسکتے ہیں
35802552-35386783-35804200:
ای میل: jdpgroup@hotmail.com

’’اس وقت میں بھوک کا شکار ہوں۔‘‘ عمر نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ’’میں ڈنر کرنے جا رہا ہوں۔‘‘

’’مجھے بھوک نہیں ہے کہ میں نے گلیشیئر پر سفر کے دوران چاکلیٹ کا بڑا بار لیا تھا۔ میں آرام سے کھاؤں گا۔‘‘

عمر بھوک اور تھکن دونوں محسوس کر رہا تھا۔ اس نے رک سک سے اپنا خوراک کا ذخیرہ نکالا اور اس کا جائزہ لیا۔ اس نے ٹونا مچھلی اور فرائی مٹر کا ٹن نکالا اور الاؤ پر انہیں گرم کرنے لگا۔ اس نے ٹن کھولا اور مچھلی کی خوشبو پھیلی تو سومت بے چین ہو گیا۔ شاید اسے مچھلی پسند تھی۔ عمر نے اسے بھی ایک پیس دیا تو وہ خوش ہو گیا۔ اس کی خوشی دیکھتے ہوئے عمر نے آدھا ٹن اسے دے دیا۔ گل خان نے کہا۔ ’’صیب آپ کا ؤا مارے پاس خوراک اے۔‘‘

’’نہیں یار۔ بچے کو پسند ہے اسے کھانے دو۔ اگر مجھے بھوک لگی تو میں کچھ اور نکال لوں گا۔‘‘

مگر عمر کا گزارا ہو گیا تھا۔ ڈنر کے بعد وہ کافی تیار کرنے لگا۔ وہ سیاہ اور بغیر شکر کے کافی لیتا تھا۔ مائرہ کریم اور شکر کے ساتھ لیتی تھی البتہ ظفر اور گل خان دونوں سیاہ کافی کے شوقین تھے۔ اس لیے اس نے انہیں بھی کافی پیش کی۔ مچھلی سے خوش سومت نے جواب میں عمر کے لیے خیمہ لگایا۔ اس نے منع کیا مگر وہ مانا نہیں تھا۔ جہاں اس کی سمجھ میں نہیں آتا وہ عمر سے پوچھ لیتا تھا۔ بالآخر اس نے خیمہ لگا ہی لیا۔ پھر مائرہ اور ظفر کے سلیپنگ بیگز نکال کر بچھانے لگا۔ یہ کام کر کے وہ باپ کے ساتھ میٹھی روٹی کھانے لگا۔ مائرہ اور ظفر بھی ڈنر کی تیاری کر رہے تھے۔ عمر فارغ تھا اور الاؤ کے پاس بیٹھا تھا، اسے ضیا کا خیال آیا۔

’’شاید وہ اکیلے اس طرف آنے کی ہمت نہیں کر سکا۔‘‘ ظفر نے کہا۔

’’وہ اکیلے سفر کرنے والا آدمی ہے۔‘‘ عمر نے تردید کی۔ ’’اس کے لیے کہیں بھی جانا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ شاید یہاں آنا اس کے پروگرام میں شامل نہیں ہے۔‘‘

ظفر نے حیرت سے کہا۔ ’’تب کیا وہ کرتوک گاؤں دیکھنے آیا ہے۔‘‘

’’یا شاید وہ بھی قیمتی پتھروں کے چکر میں آیا ہو۔‘‘ مائرہ نے کہا تو وہ چونک گئے۔

’’لگتا تو نہیں ہے۔‘‘ عمر نے کہا۔

’’آدمی اندر سے کیا ہے ہم کیسے کہہ سکتے ہیں۔‘‘ مائرہ پاستا کا پیک الاؤ پر گرم کرنے لگی۔ یہ بھی ٹن کی طرح تیار کھانا تھا، صرف گرم کرنے کی ضرورت تھی۔

’’اگر وہ پتھروں کے چکر میں آیا ہوتا تو لازمی ہمارے ساتھ آتا۔‘‘ ظفر بولا۔ ’’پتھر اسے گاؤں میں ملنے سے رہے۔‘‘

’’ممکن ہے وہ تمہاری طرح ان لوگوں سے رابطہ کرنا چاہ رہا ہو جو قیمتی پتھر ملنے کی جگہ سے واقف ہیں۔ اس کے لیے یقیناً گاؤں ہی بہترین جگہ ہے۔‘‘

عمر کی بات پر ظفر متفکر ہو گیا۔ ’’تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ اگر وہ پتھروں کے چکر میں آیا ہے تو لازمی گاؤں میں بات کرے گا۔‘‘

گل خان اور سومت جلد سو گئے تھے۔ یہاں جانوروں کا خطرہ نہیں تھا اس لیے پہرا دینے کی ضرورت نہیں تھی اور نہ ہی چوری کا خطرہ تھا۔ سردی یہاں بھی خاصی زیادہ تھی اور درجۂ حرارت منفی کے آس پاس میں تھا۔ گل خان اور سومت دو درختوں کے درمیان چھوٹی سی جگہ میں گول مول ہو کر لیٹے تھے۔ وہاں سردی کا اثر کم تھا۔ عمر الاؤ کے قریب بیٹھا تھا اور اسے اچھا لگ رہا تھا۔ ظفر اور مائرہ نے بھی ڈنر مکمل کر لیا۔ مائرہ نے چائے بنائی تو اس نے عمر کو بھی پیش کی۔ اسے نیند آ رہی تھی۔ اس نے صرف گرمائش کی وجہ سے چائے لے لی اور مگ خالی کرتے ہی وہ اٹھ گیا۔ ظفر نے کہا۔ ’’ابھی صرف نو بجے ہیں۔‘‘

’’میں تھکا ہوا ہوں۔‘‘ عمر نے معذرت کی۔ ’’صبح ملاقات ہوگی۔‘‘

کیونکہ وہ نالا عبور کر چکے تھے اس لیے صبح اٹھنے کی فکر نہیں تھی۔ وہ آرام سے اٹھ کر دو گھنٹے میں کرتوک پہنچ سکتے تھے۔ یوں مائرہ کی خواہش پوری ہو جاتی جو ایک دن اور کرتوک میں رکنا چاہتی تھی۔ عمر لیٹا تو فوراً ہی سو گیا تھا۔ حالانکہ سردی چبھ رہی تھی اور اس کا خیمہ اندر سے گرم نہیں ہوا تھا مگر نیند ایسی تھی کہ اس حالت میں بھی حاوی آ گئی۔ عمر نے خواب میں دیکھا کہ وہ گلیشیئر پر ہیں اور وہاں گل خان اور سومت اس کے ساتھ ہیں۔ وہ احتیاط سے گلیشیئر کی نرم برف پر چل رہے ہیں۔ اچانک برف ٹوٹتی ہے اور سومت نمودار ہونے والے غار میں گر جاتا ہے۔ گل خان چلاتا ہے اور سومت کو نکالنے کے لیے بھاگتا ہے۔ وہ غار کے کنارے پہنچ کر جھک جاتا ہے اور چلا چلا کر سومت کو آوازیں دے رہا ہوتا ہے۔ پھر ان آوازوں میں مائرہ اور ظفر کی آوازیں بھی شامل ہو جاتی ہیں۔ اچانک عمر کی آنکھ کھلی تو اسے لگا باہر سے سچ مچ ان تینوں کی آوازیں آ رہی ہیں اور وہ سومت کو ہی پکار رہے تھے۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھا اور خیمے کی زپ کھولی۔

''کیا ہوا؟''

''سومت غائب ہے۔'' قریب سے مائرہ کی آواز آئی تو عمر جیکٹ کی زپ بند کرتا ہوا باہر آیا۔ سردی کی شدت میں اضافہ ہوگیا تھا اور اوپر گلیشیئر کی طرف سے یخ ہوا آرہی تھی۔ اس نے اپنی موٹی اونی ٹوپی اور دستانے بھی نکال لیے تھے۔ ظفر اور گل خان پڑاؤ سے باہر تھے۔ وہ سومت کو پکار رہے تھے مگر اس کی طرف سے جواب نہیں آرہا تھا۔ عمر نے مائرہ سے کہا۔

''تم یہیں رکو۔''

''مجھے اکیلے ڈر لگے گا۔'' اس نے عمر کا بازو تھام لیا۔ عمر نے ایک نظر اسے دیکھا اور سر ہلایا۔

''او کے، تم بھی آؤ۔''

عمر نے اپنی برقی لالٹین اور تیز روشنی والی ٹارچ نکالی۔ ٹارچ اس نے مائرہ کو دے دی تھی۔ وہ باہر آئے تو گل خان نالے تک چلا گیا تھا جبکہ ظفر نالے کے دائیں طرف موجود جنگل کے ساتھ تھا۔ اس جنگل کے پاس گلیشیئر کا دہانہ تھا۔ وہ طاقتور ٹارچ سے درختوں میں دیکھ رہا تھا۔ مائرہ اس کی طرف بڑھ گئی اور عمر، گل خان کے پاس آیا۔ وہ بیٹے کی گمشدگی پر سخت پریشان نظر آرہا تھا۔ عمر اس کے ساتھ مل کر نالے میں روشنی ڈالنے لگا۔ اس وقت پانی کی آمد بالکل رک گئی تھی اور بس کہیں کہیں تقریباً جم جانے والا پانی تھا۔ عمر نے پوچھا۔ ''سومت کیسے گیا؟''

''اسے چھوٹا حاجت ہوتا۔'' گل خان نے کہا۔ ''وہ ام کو جگا کر اور بول کر گیا۔''

''تم نے اسے اس طرف آتے دیکھا تھا؟''

گل خان نے سر ہلایا۔ ''وہ ادرای آتا۔''

''ممکن ہے وہ جنگل میں چلا گیا ہو۔''

گل خان نے انکار کیا۔ ''ادر حاجت کے واسطے جنگل یا درخت میں جانا اچا نہیں ہوتا۔ لوگ جنات سے ڈرتا۔ اور جھاڑی یا نالے میں جاتا۔''

یہاں دو طرف جنگل تھا اور ایک طرف نالا۔ اس کے پار گلیشیئر تھا اور وہاں جانے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ ایک بچہ ہرگز اس طرف نہیں جاسکتا تھا۔ عمر نے پوچھا۔ ''کیا وہ نیچے گاؤں کی طرف نہیں جاسکتا۔''

''اکیلا نہیں جاسکتا اور اس موسم میں؟'' گل خان مسلسل نفی میں سر ہلا رہا تھا پھر اس نے سومت کو آوازیں دینا شروع کر دیں۔ عمر بھی آواز دے رہا تھا۔ گل خان کے بیٹے سومت کو غائب ہوئے آدھا گھنٹا ہونے کو آیا تھا۔ اس کے جانے کے دس منٹ بعد وہ اس کی تلاش میں نکلا تھا۔ اس کی آوازیں سن کر ظفر اور مائرہ بھی آگئے تھے اور سب سے آخر میں عمر باہر آیا تھا۔ اس نے گل خان کو تسلی دی کہ سومت مل جائے گا۔ اس نے کہا۔

''ہمیں نالے میں اتر کر چیک کرنا ہوگا۔ ممکن ہے وہ اندر اترتے ہوئے گر گیا ہو اور اسے چوٹ لگی ہو۔ بچہ ہے سہم سکتا ہے اور بے ہوش بھی ہوسکتا ہے۔''

''ام نیچے جاتا اے۔'' گل خان نے کہا اور نالے میں اترنے لگا۔ عمر اسے دیکھتا رہا پھر وہ بھی نالے میں اُتر آیا۔ اس نے گل خان سے کہا۔

''تم نیچے کی طرف جاؤ، میں اوپر کی طرف جاتا ہوں۔''

گل خان نے سر ہلایا اور نیچے کی طرف بڑھ گیا۔ عمر اوپر جانے لگا۔ نالے میں موجود پانی برف بن گیا تھا اور یہ برف اس کے پیروں تلے آکر کرچ کرچ کی آواز کے ساتھ ٹوٹ رہی تھی۔ نالے کے اندر اوپر سے ہوا آرہی تھی اور یہ یخ بستہ تھی۔ پورے گرم کپڑوں، دستانوں اور اونی ٹوپی میں بھی وہ ٹھٹھر رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ سومت ہوشیار بچہ ہے اور وہ راستہ بھٹک بھی نہیں سکتا۔ اوپر چاند نکلا ہوا تھا اور جنگل میں بھی خاصی روشنی تھی۔ اس لیے اندھیرے میں بھٹک جانے کا امکان بھی نہیں تھا۔ اگر وہ کسی مشکل کا شکار ہوا تھا تو ان کی آوازوں کا جواب دے سکتا تھا۔ مگر اس کی طرف سے خاموشی بتا رہی تھی کہ یا تو وہ ہوش میں نہیں تھا یا یہاں سے دور جاچکا تھا۔ نالا اب پھیل رہا تھا اور اس کے کناروں کی اونچائی کم ہورہی تھی۔ اچانک ایسی آواز آئی جیسے کسی نے سسکی لی ہو۔ عمر رک گیا۔

☆☆☆

ظفر اور مائرہ جنگل کے پاس تھے۔ مائرہ، ظفر کے پیچھے تھی اور وہ مختلف سمتوں میں ٹارچ اور برقی لالٹین کی روشنی ڈال رہے تھے۔ اچانک مائرہ نے کہا۔ ''یہ کیا ہے؟''

مائرہ آگے بڑھی اور اس نے زمین سے کچھ اٹھایا۔ ظفر آگے آیا تو مائرہ نے اسے دکھایا۔ ''یہ ٹافی میں نے سومت کو دی تھی۔''

ظفر نے آس پاس روشنی ڈالی۔ ''اس کا مطلب ہے وہ یہاں آیا تھا۔''

''شاید وہ اسی جنگل میں گیا ہے۔'' مائرہ نے کہا اور سومت کو آواز دینے لگی۔

''ہمیں گل خان اور عمر کو بتانا چاہیے۔'' ظفر نے کہا۔

مائرہ نے مڑ کر دیکھا۔ "مگر وہ ہیں کہاں؟"

گل خان اور عمر نالے کے پاس تھے مگر اب وہ وہاں نظر نہیں آرہے تھے۔ یا تو وہ نالے میں اتر گئے تھے یا پھر نچلے جنگل کی طرف گئے تھے۔ مائرہ نے کہا۔ "ان کو چھوڑو ہمیں آگے جانا چاہیے، ہوسکتا ہے سومت کو مدد کی ضرورت ہو۔ ہم ان کے چکر میں کیوں وقت ضائع کریں۔"

ظفر جنگل میں جاتے ہوئے ہچکچا رہا تھا مگر مائرہ کے اصرار پر وہ مان گیا اور وہ دونوں اوپر کی طرف بڑھے۔ یہاں جنگل میں اونچے درخت کم تھے مگر یہ اوپر سے پھیلے ہوئے اور گھنے تھے اس لیے چاند کی روشنی نیچے تک کم آرہی تھی۔ اگر ان کے پاس برقی لالٹین اور ٹارچ نہ ہوتی تو اس جگہ سفر کرنا آسان نہ ہوتا۔ وہ محسوس کر رہے تھے کہ نیچے کے مقابلے میں یہاں سردی زیادہ تھی۔ وہ رہ رہ کر سومت کو پکار رہے تھے۔ اچانک ظفر نے مائرہ کو روک دیا۔ وہ ایک درخت کی آڑ میں ہوگیا تھا اور اس نے مائرہ کو بھی کھینچ لیا تھا۔ وہ پریشان ہوگئی۔ "کیا..... کیا ہوا؟"

"شش..... ادھر کوئی ہے۔" ظفر نے جنگل کے آخری حصے کی طرف اشارہ کیا۔

"سومت؟" مائرہ نے بے تابی سے پوچھا۔

"نہیں، وہ بڑا آدمی تھا اور ہم میں سے نہیں ہے۔" ظفر نے گھبرائے انداز میں کہا۔ "مائرہ ہمیں واپس جانا ہوگا۔ گل خان اور عمر کے ساتھ واپس آنا ہوگا۔"

"یہاں کوئی ہے اور اگر سومت اس کے پاس ہے تو ہم اسے اس کے رحم و کرم پر چھوڑ کر نہیں جاسکتے۔" مائرہ بولی۔ "ہمیں اس کی مدد کرنی چاہیے۔"

"ہم کیا کرسکتے ہیں۔" ظفر بولا۔ "اگر یہ وہی دو بچوں کا قاتل ہے تو کیا ہم ایک قاتل سے لڑسکتے ہیں؟"

"وہ ایک ہے اور ہم دو ہیں۔" مائرہ نے کہا اور آس پاس دیکھ کر اس نے زمین سے ایک لکڑی اٹھالی۔ یہ چار فٹ طویل اور خاصی مضبوط تھی۔ "ہم اسے قابو میں کرسکتے ہیں۔"

ظفر نے مائرہ کو دیکھا اور آہستہ سے بولا۔ "تم پاگل ہوگئی ہو۔ ہمیں کیا ضرورت ہے کسی دوسرے کی خاطر خطرہ مول لینے کی۔"

مائرہ نے غصے سے اسے دیکھا۔ "ٹھیک ہے اگر تم نہیں جارہے تو میں اکیلی جاؤں گی۔ میں اس بچے کو کسی درندے کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑ سکتی۔"

مائرہ نے اپنی ٹارچ بند کردی اور دبے قدموں اس طرف بڑھنے لگی جہاں ظفر نے کسی آدمی کی جھلک دیکھی تھی۔ ظفر اسے جاتا ہوا دیکھ رہا تھا، اس نے زیرِ لب کچھ کہا اور واپس پلٹ گیا۔

☆☆☆

گل خان نیچے جارہا تھا مگر کئی سو گز تک نیچے آنے کے بعد بھی اسے نالے میں کسی کا نام و نشان نہیں ملا تھا۔ اس کی چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ سومت اس سمت نہیں آیا تھا۔ وہ ایک جگہ رک گیا اور سوچ رہا تھا کہ کیا کرے۔ اپنے بچے کو کہاں تلاش کرے۔ اچانک اسے اوپر سے کسی کے چلانے کی آواز آئی اور وہ تیزی سے پلٹا۔ اسے خیال آیا کہ شاید سومت مل گیا ہے۔ اوپر آنے پر اس نے ظفر کی آواز پہچان لی جو اسے اور عمر کو پکار رہا تھا۔ گل خان نے چلا کر اسے بتایا کہ وہ نالے میں ہے۔ ظفر نالے کے کنارے نمودار ہوا۔ اس کے پاس برقی لالٹین تھی۔ گل خان ایک جگہ سے اوپر چڑھا اور نالے سے باہر آگیا۔ ظفر بدحواس تھا اس نے کہا۔ "گل خان جلدی چلو، میں نے اور مائرہ نے اوپر والے جنگل میں ایک آدمی کو دیکھا ہے۔"

"آدمی..... سومت نہیں ملا؟"

"نہیں مگر تم سوچو کہ تمہارا بیٹا غائب ہے اور یہاں ایک اجنبی آدمی بھی ہے۔ عمر کہاں ہے؟"

"وہ اوپر گیا اے۔" گل خان نے نالے کی طرف اشارہ کیا۔ "آپ نے عمر صیب کو تو نہیں دیکا؟"

"نہیں وہ طویل قامت تھا اور اس نے سیاہ رنگ کی جیکٹ پہنی ہوئی تھی۔ عمر کی جیکٹ میں اورنج رنگ بھی ہے۔" ظفر نے کہا۔ "جلدی چلو مائرہ بھی اوپر ہی ہے۔ اسے ٹافی ملی ہے جو اس نے سومت کو دی تھی۔"

گل خان اور ظفر اوپر کی طرف بڑھنے لگے۔

☆☆☆

عمر رک گیا، سسکی جیسی آواز نسوانی یا بچے کی تھی۔ مگر یہاں ہوا چل رہی تھی اور یہ آواز ہوا کی بھی ہوسکتی تھی۔ وہ رک کر سماعت پر زور دینے لگا۔ مگر آواز دوبارہ نہیں آئی تھی۔ ایک منٹ بعد وہ دوبارہ آگے بڑھنے لگا۔ یہاں ہواؤں کا شور بڑھ گیا تھا۔ ہوا چوٹی سے اتر کر گلیشیر سے ہوتی ہوئی نیچے آرہی تھی اور اس میں بہت زیادہ خنکی تھی۔ عمر احتیاط سے آگے بڑھ رہا تھا۔ وہ نالے سے تقریباً باہر آگیا تھا اور یہاں اسے کچھ نیچے چھوٹا جنگل دکھائی دیا۔ یہاں جابجا گیلی بجری کے ڈھیر تھے اور یہ اصل میں گلیشیر کا دہانہ تھا۔ زمین بہت زیادہ اونچی نیچی تھی۔ اچانک اسے لگا کہ کوئی

آس پاس ہے، اسے آہٹ سی سنائی دی تھی۔ وہ رک گیا اور پھر سماعت پر زور دینے لگا۔ پھر اسے لگا کہ سامنے والے بجری کے ٹیلے کے عقب میں کوئی تھا۔ وہ دبے قدموں اس طرف بڑھنے لگا۔ ایک لمحے کو اسے خیال آیا کہ وہ سومت کو آواز دے مگر پھر چھٹی حس کے اشارے پر اس نے خاموش رہنا مناسب سمجھا۔ اس سے پہلے وہ ٹیلے کے پاس جاتا اچانک عقب سے روشنی لہرائی، اس نے مڑ کر دیکھا تو مائرہ تھی۔ اس نے عمر کو دیکھ لیا تھا، وہ تیزی سے اس کے پاس آئی۔

''آپ.... سومت ملا؟''

''نہیں اور تم یہاں اکیلی ہو، ظفر کہاں ہے؟''

''اسے یہاں کوئی آدمی دکھائی دیا تھا اور وہ مجھے چھوڑ کر چلا گیا۔'' مائرہ نے کسی قدر تلخی سے کہا۔ ''اسے اپنی جان بہت پیاری ہے اور بچے کا ذرا بھی خیال نہیں ہے۔''

کسی آدمی کا سن کر عمر چوکنا ہو گیا۔ ''تب تمہیں بھی یہاں نہیں رکنا چاہیے تھا۔''

''مجھے اس معصوم بچے کی فکر ہے۔''

عمر نے پلٹ کر بجری کے ٹیلے کی طرف دیکھا اور آہستہ سے کہا۔ ''مجھے اس طرف کسی کی موجودگی محسوس ہوئی تھی۔''

مائرہ سہم گئی اور اس نے لکڑی مضبوطی سے تھام لی۔ عمر اسے وہیں رکنے کا کہہ کر ٹیلے تک آیا اور پھر اس نے اس کے گرد گھوم کر دیکھا۔ مگر وہاں کوئی نہیں تھا۔ وہ واپس آیا۔ ''یہاں کوئی نہیں ہے مگر اب مجھے لگ رہا ہے کہ یہاں کوئی ہے اور سومت کو اسی نے غائب کیا ہے۔''

مائرہ آس پاس دیکھ رہی تھی۔ وہ چونکی اور ایک سمت اشارہ کیا۔ ''وہاں مجھے روشنی کی جھلک دکھائی دی ہے۔''

عمر نے دیکھا مگر اس سمت اب تاریکی تھی۔ اس نے مائرہ کو پیچھے کیا اور خود آگے بڑھا۔ یہ غار تھا جو زمین کے اندر جا رہا تھا۔ عمر نے برقی لالٹین آگے کی تو اسے غار کے اندرونی حصے میں کسی کے پاؤں نظر آئے۔ اس نے مائرہ سے کہا۔ ''اندر کوئی ہے؟''

مائرہ نے جھک کر دیکھا اور جوش سے بولی۔ ''یہ سومت ہے۔''

وہ غار میں اترنا چاہتی تھی مگر عمر نے روک دیا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ ''عجلت نہیں، ہمیں اس شخص کو بھی دیکھنا ہے جو یہاں موجود ہے۔''

مائرہ نے جھک کر ٹارچ کی روشنی اندر ڈالی اور اچھی طرح دیکھ کر بولی۔ ''اندر کوئی نہیں ہے۔''

وہ دونوں پھسلتی بجری پر پاؤں رکھتے ہوئے اندر اترے۔ سومت غار میں اس حالت میں پڑا ہوا تھا کہ اس کے دونوں ہاتھ اور پاؤں بندھے تھے۔ منہ پر ٹیپ لگا ہوا تھا جس کی وجہ سے وہ بولنے سے قاصر تھا۔ مگر وہ ہوش میں تھا اور روشنی میں کسمسا رہا تھا۔ شاید اسے ان کی آوازیں آگئی تھیں اور اب وہ آزاد ہونے کے لیے بے چین تھا۔ مائرہ لپک کر اس کے پاس پہنچی اور اس کے منہ سے ٹیپ اتارتے ہوئے کہا۔ ''سومت، کیسے ہو تم؟''

''میں ٹھیک اے۔'' بچے نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔ ''وہ ادر اے۔''

''وہ کون؟'' عمر نے پوچھا۔

''وہ جس نے ام کو ادر پکڑا اور باندھا۔ وہ....''

اسی لمحے غار کے باہر سے آہٹ ہوئی اور ایک آواز آئی۔ ''میں بتاتا ہوں۔ تم دونوں اپنے ہاتھ اوپر کر لو۔ میرے پاس پستول ہے اور اس میں گولیاں بھی ہیں۔''

☆☆☆

گل خان اور ظفر جنگل میں تھے۔ انہیں آگے کہیں روشنی نظر نہیں آ رہی تھی۔ گل خان نے آہستہ سے کہا۔ ''ادر کوئی نہیں اے۔''

''میں نے آدمی کو اوپر دیکھا تھا۔'' ظفر نے اشارہ کیا۔ ''جہاں جنگل ختم ہو رہا ہے۔''

گل خان فکر مند ہو گیا۔ ''اور گلیشیر کا دآنا اے۔''

اچانک اوپر کہیں روشنی لہرائی۔ ظفر نے اس سمت اشارہ کیا اور وہ اوپر بڑھنے لگے۔ کچھ دیر بعد وہ جنگل کے آخری حصے میں تھے اور اس سے آگے کسی قدر ڈھلان کے بعد گلیشیر کا دہانہ شروع ہو رہا تھا۔ وہاں جا بہ جا پتھر اور بجری کے ڈھیر تھے۔ گلیشیر میں خاموشی تھی کیونکہ رات کے وقت ٹھنڈ کی وجہ سے گلیشیر جم جاتا تھا۔ اس کے اندر ٹوٹ پھوٹ اور برف پگھلنے کا عمل رک جاتا تھا۔ مگر اس طرف سے نہایت یخ ہوا آ رہی تھی۔ اس طرف جو روشنی نظر آ رہی تھی اب وہ غائب تھی۔ گل خان سومت کو آواز دینے جا رہا تھا مگر ظفر نے اسے بر وقت روک لیا۔ اس نے اشارہ کیا۔ ''ادھر کوئی ہے؟''

گل خان نہیں دیکھ سکا تھا۔ ''کدر کون اے؟''

''ایک سایہ مگر اس نے روشنی نہیں کی تھی۔'' ظفر بولا۔ ''اگر وہ مائرہ ہوتی تو روشنی کے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔''

گل خان کے پاس مضبوط چھڑی تھی، وہ اس نے بلند

کر لی اور آہستہ سے بولا۔ ''اگر کسی خنزیر نے امارے بچے کو ذرا بی نقصان کیا تو ام اسے مار دے گا۔''

''ہمیں ہوشیار رہنا ہوگا۔ اگر وہ مسلح ہوا تو ہم اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے۔''

''ام کو پروا نہیں اوگا۔'' گل خان کہتے ہوئے آگے بڑھا۔ ظفر اس کے پیچھے تھا۔ قریب آنے پر انہیں لگا کہ چند افراد بول رہے ہیں اور پھر انہیں غار کے اندر سے جھلکتی روشنی بھی نظر آگئی۔ وہ دونوں غار کے دہانے تک آئے اور اندر جھانکا تو انہیں عمر اور مائرہ کے ساتھ سومت نظر آیا جو مائرہ سے لپٹا ہوا تھا۔ ایک طرف ایک شخص موجود تھا اور اس کے ہاتھ میں موجود پستول صاف دکھائی دے رہا تھا۔ گل خان سومت کو دیکھ کر اتنا جذباتی ہوا کہ غار میں اتر گیا۔ ظفر اسے روکنا چاہتا تھا مگر وہ روک ہی نہیں سکا۔ جب گل خان اندر گیا تو ظفر تیزی سے پیچھے ہٹ گیا تھا۔ پستول بردار گل خان کے اندر آنے پر چونکا اور اس نے پستول کا رخ گل خان کی طرف کیا تھا کہ سومت چلایا۔

''میرے بابا پر گولی مت چلانا۔''

ضیا رک گیا تھا۔ اس نے مسکرا کر سومت کی طرف دیکھا۔ ''ٹھیک ہے تیرے باپ کو گولی نہیں مار رہا۔ اس کے بدلے تجھے مار دیتا ہوں۔''

ضیا نے پستول کا رخ سومت کی طرف کیا تھا کہ گل خان اس کے اور ضیا کے درمیان آگیا..... ''خنزیر یہ کیا کرتا اے؟''

ضیا رک گیا پھر اس نے سرد لہجے میں کہا۔ ''تم چاہتے ہو کہ میں سومت کو کچھ نہ کہوں تو اس کی ایک صورت ہے۔''

''کیسا صورت؟''

''مجھے اس جگہ کا بتاؤ جہاں قیمتی پتھر ملتے ہیں۔''

ضیا کی بات سن کر سب نے معنی خیز انداز میں ایک دوسرے کو دیکھا۔ خاص طور سے مائرہ اور عمر نے۔ گل خان نے نفی میں سر ہلایا۔ ''ام کو نہیں معلوم اگر معلوم اوتا تو ام گائیڈ اور پورٹر کا کام کرتا۔''

''جھوٹ مت بولو۔'' ضیا نے درشت لہجے میں کہا۔ ''تمہیں معلوم ہے اگر تم نے اب انکار کیا تو میں سومت کو مار دوں گا۔ پھر ایک ایک کر کے تم سب کو ختم کر دوں گا۔''

عمر نے محسوس کیا کہ ضیا جو کہہ رہا تھا وہ کر بھی گزرے گا۔ اس وقت وہ اس بے پروا اور بہ ظاہر معمولی سے ضیا سے بالکل مختلف لگ رہا تھا جسے وہ اب تک دیکھتے آئے تھے۔ وہ پوری طرح گرم لباس میں تھا اور اس نے فر کی ٹوپی کے ساتھ گرم دستانے بھی پہن رکھے تھے۔ اس کے ہاتھ میں موجود پستول اعشاریہ اڑتیس کا کولٹ ماڈل تھا۔ کم فاصلے سے اس کا شمار نہایت مہلک ہتھیاروں میں ہوتا تھا۔ ضیا نے جو جیکٹ پہنی ہوئی تھی اس پر سینے کی جگہ دو عدد ایل ای ڈی ڈسک لائٹس لگی تھیں اور ان کی تیز روشنی غار کے لیے کافی تھی مگر وہاں دو عدد برقی لالٹینیں بھی روشن تھیں۔ مائرہ نے اپنی ٹارچ بند کر دی تھی۔ ضیا کی دھمکی پر عمر نے گل خان سے کہا۔

''میری بات سنو۔''

گل خان اس کے نزدیک ہوا۔ ''بولو صیب۔''

''دیکھو اس وقت تمہارے بیٹے اور ہم سب کی جان پر بنی ہے۔ تم اسے بتا دو۔ اس طرح ہمیں مہلت مل جائے گی۔''

گل خان سوچ میں پڑ گیا۔ پھر اس نے سر ہلایا اور ضیا کی طرف دیکھا۔ ''ٹیک اے ام بتائے گا۔ مگر تم پہلے امارا بچہ کو ادر سے جانے دو۔''

''کوئی یہاں سے نہیں جائے گا۔'' ضیا نے غرا کر کہا۔ ''ظفر کہاں ہے؟''

''وہ بار اے۔'' گل خان نے بتا دیا۔ ''اندر نہیں آیا۔''

یہ سن کر ضیا چوکنا ہو گیا۔ اس نے مائرہ سے کہا۔ ''اے لڑکی ظفر کو بلاؤ، اسے آواز دو اگر وہ یہاں نہیں آیا تو میں تمہیں شوٹ کر دوں گا۔''

عمر آگے آیا۔ ''تمہارا دماغ خراب ہے۔ اگر ظفر نہیں آیا تو اسے کیوں شوٹ کرو گے؟''

''کیونکہ وہ اس کا ہونے والا شوہر ہے۔'' ضیا بولا۔

''اسے اپنی ہونے والی بیوی کی فکر ہونی چاہیے۔''

مائرہ کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا اس نے گھبرا کر کہا۔ ''پلیز اگر وہ گاؤں کی طرف جا چکا ہے تو میری یا کسی کی آواز کہاں سنے گا۔''

یہ سن کر ضیا کے تاثرات سفاک ہو گئے۔ ''اگر اس نے ایسی حماقت کر دی ہے تو اس کا خمیازہ تمہیں بھگتنا ہوگا، باہر چلو۔''

پہلے ضیا غار سے نکلا اور اس نے آس پاس دیکھا اور پھر باقی سب کو باہر آنے کا حکم دیا۔ وہ باہر آئے تو ضیا نے مائرہ سے کہا۔ ''اسے آواز دو اور کہو کہ وہ سامنے آئے۔''

''ظفر تم کہاں ہو، پلیز سامنے آؤ ورنہ یہ مجھے گولی مار دے گا۔'' مائرہ نے روہانسی آواز میں کہا۔ ''ظفر کہاں ہو..... سامنے آؤ۔''

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN

''وہ بزدل نہیں آئے گا۔'' عمر نے کہا تو گل خان نے اس کی تائید کی۔

''وہ اور بی بی کو چھوڑ کر بھاگ گیا تھا۔''

مائرہ رہ رہ کر ظفر کو پکار رہی تھی اور اس کی طرف سے کوئی جواب نہیں آرہا تھا۔ مائرہ نے کانپتی آواز میں ضیا سے کہا۔ ''وہ یہاں نہیں ہے۔''

''اگر نہیں ہے تو تم مروگی۔'' اس نے پستول کا رخ مائرہ کی طرف کر دیا اور بلند آواز سے بولا۔ ''ظفر تم جہاں ہو اگر میرے تین گننے تک سامنے نہیں آئے تو میں اسے شوٹ کر دوں گا۔ ایک..... دو..... تین۔''

''اسٹاپ!'' ایک طرف سے ظفر کی آواز آئی۔ تین کہتے ہی ضیا نے پستول گولی چلانے کے انداز میں سیدھا کر لیا تھا اور مائرہ نے خوف سے آنکھیں بند کر لیں۔ مگر خلافِ توقع ظفر سامنے آ گیا۔ وہ ایک طرف سے نمودار ہوا۔ اس نے دونوں ہاتھ بلند کر رکھے تھے۔ ''گولی مت چلانا۔''

ضیا اپنی کامیابی پر مسکرانے لگا۔ ''اچھا ہوا تم سامنے آ گئے ورنہ شادی سے پہلے رنڈوے ہو جاتے۔''

''تم کیا چاہتے ہو؟'' عمر نے پوچھا۔

''بتایا تو ہے میں قیمتی پتھروں کی جائے وقوع تک جانا چاہتا ہوں۔'' ضیا نے کہا اور گل خان کی طرف دیکھا۔ ''یہ مجھے لے کر جائے گا۔''

''ان سب کو جانے دو، میں تم کو لے کر جائے گا۔'' گل خان نے کہا۔

''نہیں، سب چلیں گے۔'' ضیا نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''اگر کسی نے انکار کیا تو میں یہاں اس کی لاش چھوڑ کر جاؤں گا۔ اب سوچ لو کس نے جانا ہے اور کون نہیں جانا چاہتا۔''

سب خاموش رہے تو ضیا نے ظفر سے کہا۔ ''سب راضی ہیں، تم اس ٹیلے کے اوپر پڑا تھیلا اٹھا لو۔''

بجری کے ایک چھ سات فٹ اونچے ڈھیر پر کینوس کا تھیلا پڑا تھا۔ ظفر نے اسے اٹھایا تو اس میں سے دھات کے ٹکرانے کی آواز آئی۔ تھیلا وزنی تھا۔ ضیا نے عمر اور گل خان کو حکم دیا کہ وہ برقی لالٹینیں اس طرح رکھیں کہ آس پاس روشنی رہے اور سب اس کی نظروں میں رہیں۔ وہ آگے روانہ ہوئے تو عمر نے اس سے کہا۔ ''اگر تمہیں وہ جگہ مل جائے جہاں قیمتی پتھر ہوتے ہیں تب بھی وہ تمہیں ایسے تو نہیں مل سکتے۔ وہ مٹی میں دبے ہوتے ہیں اور انہیں تلاش کرنا پڑتا ہے۔''

''مجھے معلوم ہے۔'' ضیا نے جواب دیا۔ ''میں تم سب کو کس لیے ساتھ لے جا رہا ہوں۔''

ظفر چونکا۔ ''کیا مطلب، تم ہم سے قیمتی پتھر تلاش کراؤ گے؟''

''بالکل۔'' ضیا نے پستول لہرا کر کہا۔ ''اور تم تلاش کرو گے اگر زندہ رہنا چاہتے ہو۔''

''یہ ایک رات میں ہونے والا کام نہیں ہے۔'' عمر نے کہا۔

''مجھے معلوم ہے اور میرے پاس وقت کی کمی نہیں ہے۔''

''ام کو کل واپس جانا اے۔'' گل خان نے کہا۔ ''اگر ام نہیں گیا تو امارا تلاش شروع او جائے گا۔''

''نہیں ہوگا۔'' ضیا نے اطمینان سے کہا۔ ''میں گاؤں والوں کو بتا کر آیا ہوں کہ ہم کرتوک گلیشیر پار کر کے دوسری طرف سے جائیں گے اور گل خان ہمارے ساتھ ہوگا۔ یہ سفر ایک ہفتے کا ہے اس لیے ایک ہفتے تک تو کوئی نہیں آئے گا۔''

''گاؤں والوں نے تمہارے جھوٹ پر یقین کر لیا۔'' عمر نے بے یقینی سے کہا۔ ''وہاں ہمارا سامان ہے۔''

ضیا مسکرایا۔ ''میں وہ سامان بھی ساتھ لے آیا ہوں۔ گاؤں والے مجھے تمہارا ساتھی سمجھ رہے تھے اس لیے انہوں نے میری بات کا اعتبار کر لیا۔''

گل خان بجری اور پتھر کے ڈھیروں کے درمیان گھوم رہا تھا اور ایسا لگ رہا تھا جیسے اسے وہ جگہ مل نہیں رہی تھی۔ ضیا نے یہ بات محسوس کر لی۔ اس نے گل خان سے کہا۔ ''کیا بات ہے، اب تک ہم اس جگہ نہیں پہنچے؟''

گل خان نے بے بسی سے کہا۔ ''ام کو وہ جگا نہیں مل رہا۔''

''تم مجھے بے وقوف بنا رہے ہو۔ یہ جگہ کتنی بڑی ہے جو تم کو وہ جگہ نہیں مل رہی۔''

''ادر اندیرا اے اور سب جگا ایک سا اے۔''

عمر نے کہا۔ ''تم صبح بھی تلاش کر سکتے ہو۔''

''نہیں، ہمیں صبح سے پہلے تلاش کرنا ہے۔'' ضیا نے غصے سے کہا اور پستول کا رخ سومت کی طرف کر دیا۔ اس نے گل خان کی طرف دیکھا۔ ''اگر تم نے آدھے گھنٹے میں وہ جگہ تلاش نہیں کی تو میں اسے گولی مار دوں گا۔''

''ام کوشش کرتا اے۔'' گل خان نے گھبرا کر کہا۔

''تم کوشش کرو۔ ان دونوں کے ساتھ۔'' اس نے عمر

اور ظفر کی طرف اشارہ کیا۔ ”بچہ اور لڑکی میرے ساتھ ہوں گے۔ جب تم پتھروں والی جگہ تلاش کر لو گے تو اسی غار میں آ جانا۔“

”میں تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گی۔“ مائرہ نے انکار کیا۔

”تم انکار نہیں کر سکتیں۔“ ضیا نے سومت کا بازو پکڑ لیا اور پستول کی نال اس کے سر سے لگا دی۔ ”بولو کیا کہتی ہو؟“

”میں چل رہی ہوں۔“ مائرہ گھبرا گئی۔ ”پلیز پستول اس سے دور کرو۔“

ضیا سومت اور مائرہ کو لے کر پیچھے ہٹا اور اس نے گل خان کو خبردار کیا۔ ”تمہارے پاس صرف آدھا گھنٹا ہے۔“

وہ تینوں اندھیرے میں غائب ہو گئے۔ ظفر نے پاؤں پٹخ کر کہا۔ ”یہ پاگل ہے۔“

”یقیناً وہ قیمتی پتھر کے لیے دیوانہ ہو رہا ہے۔“ عمر نے کہا۔ ”مگر اس وقت اس نے ہوشیاری سے کام لیا ہے۔“

”وہ کیسے؟“ ظفر بولا۔

”وہ جانتا ہے کہ اتنے سارے لوگوں پر بیک وقت نظر نہیں رکھ سکتا اس لیے وہ ہم سے سب سے کمزور فریق چن کر لے گیا ہے۔ سومت کی وجہ سے گل خان مجبور ہے اور تم مائرہ کی وجہ سے۔“

”لیکن تمہاری کوئی مجبوری نہیں ہے۔“ ظفر کے لہجے میں طنز تھا۔

”ہاں میری مجبوری نہیں ہے لیکن میں تم لوگوں کا ساتھ دوں گا۔“ عمر نے کہا اور گل خان کی طرف دیکھا۔ ”کیا تمہیں وہ جگہ یاد نہیں آ رہی؟“

اس نے سر ہلایا۔ ”ام اپنے بچے کا جان خطرے میں نہیں ڈال سکتا۔“

”تب یاد کرو بلکہ تلاش کرو۔ اس کی کوئی نشانی ہو گی؟“

گل خان نے ذہن پر زور ڈالا اور بولا۔ ”اور گلیشیر کا چھوڑا زمین غار بن گیا۔ قیمتی پتھر اسی غار میں ملتا اے۔“

”تمہارا مطلب ہے ویسا ہی غار جہاں سے سومت ملا ہے؟“

گل خان نے نفی میں سر ہلایا۔ ”ایسا نہیں ہے۔“

ظفر بولا۔ ”میں سمجھ گیا۔ جب گلیشیر کسی جگہ کی زمین چھوڑتا ہے تو وہاں مٹی اور برف رہ جاتی ہے۔ بعد میں کسی گرم سال میں برف پگھلنے سے اس زمین میں غار سے بن جاتے ہیں۔“

## شریف آدمی

ایک شریف آدمی کی خواہشات ہی کیا ہوتی ہیں۔ بس ایک بیوی جو اسے سچا پیار دے، ایسی بیوی جو امورِ خانہ داری اور کھانا پکانے میں اپنی مثال آپ ہو، ایسی بیوی جو فضول خرچ نہ ہو، وہ بیوی جو ہر وقت اپنے مجازی خدا کی خدمت کے لیے کمربستہ رہے... یہ مل جائے تو اس دنیاوی زندگی میں ہی جنت کا مزہ آ جاتا ہے... شرط صرف اتنی سی ہوتی ہے کہ اس کی چاروں بیویاں ایک چھت کے نیچے مل جل کر رہیں، فساد برپا نہ کریں۔

چیچہ وطنی سے شریف احمد کا خواب

گل خان جوش سے بولا۔ ”ظفر صیب ٹھیک بولا۔ ایسا ای غار اے۔“

عمر نے اوپر کی طرف دیکھا۔ ”ہمیں بلندی پر جا کر دیکھنا ہو گا۔ چاند بلند ہو رہا ہے، اس کی چاندنی میں یہ ساری جگہ واضح نظر آئے گی۔“

وہ برف، بجری اور پتھروں کے درمیان سے گزرتے ہوئے بلندی کی طرف آئے۔ یہ گلیشیر کا کنارہ تھا اور یہاں برف سخت تھی۔ انہوں نے یہاں سے نیچے پھیلی زمین کا جائزہ لیا۔ یہ تقریباً چار ہیکٹرز پر مشتمل جگہ تھی۔ زمین زیادہ نہیں تھی لیکن وہاں نشیب و فراز اتنے زیادہ تھے کہ آدمی گھنٹوں بھی کسی خاص جگہ کو تلاش نہیں کر سکتا تھا۔ مگر گل خان کو کچھ یاد آیا اور اس نے ایک سمت اشارہ کیا۔ ”امارا خیال اے اس طرف اے۔“

”تب تم وہاں جاؤ۔ میں یہاں سے تم پر نظر رکھوں گا۔ اگر تم غلط سمت جاؤ گے تو میں لالٹین جلا بجھا کر اشارہ دوں گا۔“ عمر نے کہا تو گل خان نیچے اترنے لگا۔ ظفر، عمر کے ساتھ ہی تھا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

”ہم اس جنونی کے لیے کام کر رہے ہیں، مجھے یقین ہے کام کرانے کے بعد وہ ہمیں مار دے گا۔“

”شاید لیکن فی الحال ہم مجبور ہیں۔“ عمر نے گل خان کو جاتے دیکھ کر کہا۔ اس نے وہ جگہ ذہن میں رکھی تھی جس کی نشان دہی گل خان نے کی تھی۔ گل خان اسی سمت جا رہا تھا

اس لیے عمر کو اسے اشارہ کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ ظفر نے اگلا اعتراض کیا۔

’’اشارے کی کیا ضرورت ہے، وہ اتنا دور نہیں ہے کہ ہماری آواز نہ سن سکے۔‘‘

’’مناسب ہوگا کہ ضیا تک ہماری آواز نہ جائے۔‘‘ عمر نے کہا۔

’’اس سے کیا ہوگا۔‘‘ ظفر کا لہجہ زہریلا ہوگیا۔’’ہوگا وہی جو وہ چاہے گا۔ مجھے لگ رہا ہے کہ ان دو بچوں کا قاتل بھی وہی ہے۔‘‘

’’اس کا کہنا ہے کہ وہ پہلی بار یہاں آیا ہے۔‘‘

’’کیا کہہ سکتے ہیں، ہوسکتا ہے پہلے وہ چپکے سے آیا ہو۔‘‘

عمر نے نفی میں جواب دیا۔’’اس علاقے میں کوئی چپکے سے آجا نہیں سکتا۔‘‘

’’ایسے آدمی کے بارے میں کیا کہا جا سکتا ہے۔‘‘ ظفر بولا۔ نیچے گل خان اب تک لالٹین لے کر گھوم رہا تھا اور اب اس نے لالٹین ایک جگہ رکھ کر اس کی روشنی میں ہاتھ ہلانا شروع کر دیا تھا۔ عمر نے نیچے کی طرف قدم بڑھائے۔

’’چلو، وہ بلا رہا ہے۔‘‘

وہ روشنی کو نظر میں رکھتے ہوئے گل خان تک پہنچنے میں کامیاب رہے۔ وہ پُر جوش ہو رہا تھا اس نے اضطرابی لہجے میں زمین سے جھانکتے تاریک سوراخ کی طرف اشارہ کیا۔

’’امارا خیال اے یہ ای اے۔‘‘

عمر آگے آیا اور اس نے اندر ٹارچ کی روشنی ڈالی۔ غار کی اونچائی اور چوڑائی کم تھی اور یہ کسی سرنگ کی طرح نیچے جا رہا تھا۔ عمر نے کہا۔’’تم دونوں یہیں رکو میں اندر جاتا ہوں اور کوئی اندر نہ آئے، نہ زمین پر زور سے چلے یہ غار بیٹھ سکتا ہے۔‘‘

گل خان نے کہا۔’’اس واسطے بی ام نے کبی اور پتھر نکالنے کا نہیں سوچا۔ گاؤں کا کئی لوگ ادر آیا اور غار میں دفن او گیا۔‘‘

ظفر نے کہا۔’’تو یہ وجہ ہے کہ ہر کوئی پتھر نہیں نکالتا۔ یہاں باقاعدہ کان بھی نہیں بنائی جا سکتی اور سرد موسم کی وجہ سے کھدائی آسان نہیں ہوتی ہے۔‘‘

’’بالکل خطرہ بہت زیادہ ہے۔‘‘ عمر کہتے ہوئے احتیاط سے اندر اتر گیا۔ اس نے چھت کی مٹی کو چھو کر دیکھا وہ سخت اور بہ ظاہر جمی ہوئی تھی لیکن کیا کہا جا سکتا تھا کہ کب یہ اپنی جگہ چھوڑ دے۔ وہ اندر داخل ہوا اور اس نے روشنی ڈالی تو غار تقریباً پانچ گز کی گہرائی میں جانے کے بعد سیدھا ہو رہا تھا اور مزید نیچے آنے پر وہ دائیں بائیں دو حصوں میں بٹا نظر آیا۔ عمر نیچے آیا۔ اسے جھکنا پڑ رہا تھا ورنہ اس کا سر چھت سے ٹکراتا۔ اس نے دائیں طرف کی سرنگ چنی اور آگے جا کر یہ مزید دو حصوں میں بٹ گئی۔ یہ سرنگوں کا پورا جال لگ رہا تھا۔ فرش پر کہیں کہیں کھدائی کی مٹی پڑی ہوئی تھی اور یہ کھدائی دائیں بائیں دیواروں سے کی گئی تھی مگر اتنی احتیاط سے کہ چھت ذرا بھی غیر متوازن نہیں ہوئی تھی۔ عمر نے دل ہی دل میں ان لوگوں کو داد دی جنہوں نے یہاں سے قیمتی پتھر نکالے تھے۔ انہوں نے سرنگوں میں حفاظت کا پورا خیال رکھا تھا۔ کہیں بھی اسے اتنا نہیں کھودا تھا کہ وہ سرنگ غیر متوازن ہو کر بیٹھ جائے۔ مگر خطرہ پھر بھی تھا۔

اسے کہیں کہیں دیواروں میں چمک سی دکھائی دی مگر جب اس نے اس جگہ کو کریدا تو وہاں سے سیاہ چمکتی ریت کا موٹا ذرا نکلا۔ یقیناً نکالنے والوں نے یہاں سے ریت اتنی احتیاط سے چھانی تھی کہ قیمتی پتھر کا معمولی سا ٹکڑا بھی ان کی نظروں سے اوجھل نہیں ہوا تھا۔ عمر سوچ رہا تھا کہ یہ ہفتوں نہیں مہینوں کا کام تھا اور ضیا ان سے چند دن میں یہ کام کروانا چاہتا تھا جو بہ ظاہر ممکن نظر نہیں آرہا تھا۔ دوسری طرف اتنے عرصے انہیں اپنے قابو میں رکھنا بھی ممکن نہیں تھا۔ ضیا نہ تو ہمہ وقت جاگ سکتا تھا اور نہ ہی بیک وقت سب کی نگرانی کر سکتا تھا۔ عمر حیران تھا کہ ضیا نے کیا سوچ کر یہ قدم اٹھایا تھا۔ اگر یہاں مارے جانے والے دو بچوں کا قاتل وہی تھا تو اس کے دیوانے پن میں شبہ نہیں تھا۔ مگر اس کی یہ دیوانگی صرف دوسروں کی زندگی سے کھیلنے کی حد تک تھی۔ اپنے لیے وہ بہت ہوشیار اور فرزانہ تھا۔

وہ واپسی کے لیے مڑا تھا کہ اس کا جوتا ریت کے ایک ڈھیر سے ٹکرایا۔ جمی ریت کا ایک ٹکڑا الگ ہو کر گرا اور روشنی میں اس میں کوئی چیز چمکتی دکھائی دی تھی۔ عمر نے جھک کر دیکھا، اس کا خیال تھا کہ یہ بھی سیاہ ریت کا کوئی ٹکڑا ہوگا۔ مگر خلافِ توقع اسے سبزی مائل چمک نظر آئی۔ اس نے ریت کا ٹکڑا اٹھایا جو سوجی کے خشک حلوے کی طرح جما ہوا تھا۔ عمر نے اسے زمین پر مارا اور ریت بکھر گئی۔ چند لمحے بعد وہ تقریباً ڈیڑھ انچ لمبے اور ایک انچ چوڑے اور موٹے سبز پتھر کو حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ اگر یہ زمرد تھا تو یقیناً بہت زیادہ قیمتی تھا۔ اس نے اسے صاف کر کے جیکٹ میں رکھا اور سرنگوں سے باہر آنے لگا۔ ہر بار دائیں طرف کی سرنگ منتخب کرنے کا فائدہ یہ ہوا کہ جاتے ہوئے اسے بائیں

سرنگ منتخب کرنی پڑی اور وہ راستہ بھٹکے بغیر باہر آ گیا۔ وہاں صرف ظفر تھا اور گل خان غائب تھا۔

”تم نے بہت دیر کر دی۔“ ظفر بولا۔ ”ہم تو ڈر گئے تھے کہ تم کسی مشکل میں پھنس گئے ہو۔“

”مشکل میں تو ہم ہیں۔ گل خان کہاں ہے؟“

”وہ ضیا کو بتانے گیا ہے کہ اس نے جگہ تلاش کر لی ہے، اسے ڈر ہے کہ دیر کی تو وہ اس کے بیٹے کو نقصان نہ پہنچا دے۔“

”یہ شخص میری سمجھ سے باہر ہے۔“ عمر نے کہا۔ ”میں جو اندر دیکھ کر آیا ہوں اس جگہ قیمتی پتھر تلاش کرنا آسان نہیں ہے۔ اندر سُرنگ در سرنگیں ہیں اور میں شاید آدھے راستے سے واپس آ گیا۔“

ظفر نے سر ہلایا۔ ”میں سمجھ رہا ہوں لیکن یہ شخص سمجھتا ہے کہ اندر قیمتی پتھر ایک ڈھیر کی صورت میں ہوں گے۔ ہم اس کے لیے بوری بھر کر لے آئیں گے۔“

عمر کو بوری پر یاد آیا۔ ”تھیلے میں کیا ہے؟“

ظفر نے تھیلا ایک طرف رکھ دیا تھا، اس نے کھول کر دیکھا تو اس میں کھدائی کے چھوٹے اوزار تھے۔ چھوٹے بیلچے اور کدالیں۔ ریت چھاننے والی چھلنیاں بھی تھیں۔

”وہ پہلے سے تیاری کر کے آیا ہے۔“

”وہ آ گئے۔“ ظفر نے اشارہ کیا۔ ایک طرف سے روشنی جھلک رہی تھی اور پھر وہ چاروں سامنے آئے۔ ضیا نے پستول کا رخ سومت کی طرف کر رکھا تھا۔ آگے آتے ہوئے اس نے گل خان سے کہا۔

”اگر یہ جگہ قیمتی پتھر والی نہ ہوئی تو میں تمہیں اور تمہارے بیٹے کو اسی جگہ دفن کر دوں گا۔“

”اس نے ٹھیک کہا ہے۔“ عمر نے کہا۔ ”قیمتی پتھر اسی جگہ سے نکالے جاتے رہے ہیں، میں اندر تک ہو کر آیا ہوں۔“

”تمہیں کوئی قیمتی پتھر ملا؟“ ضیا نے بے تابی سے پوچھا۔

”اندر قیمتی پتھروں کے ڈھیر لگے ہیں۔“ عمر نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ”کھدائی کی ضرورت بھی نہیں ہے، چل کر سمیٹ لو، لیکن تم صرف ایک بوری لائے ہو۔“

ضیا کچھ دیر اسے گھورتا رہا پھر اس نے کہا۔ ”اندر چلو۔“

ظفر غار کے دہانے کو پُرتشویش نظروں سے دیکھ رہا تھا، اس نے کہا۔ ”میں اندر نہیں جاؤں گا۔“

”سب جائیں گے۔“ ضیا نے پستول لہرا کر کہا۔ مجبوراً وہ سب باری باری اندر اترے۔ ظفر ڈرا ہوا تھا کہ غار اچانک نہ بیٹھ جائے۔ عمر انہیں غار کے اندر تک لایا۔ وہ اس جگہ پہنچ کر رکا جہاں تک وہ پہنچا تھا۔

”میں یہاں تک آیا تھا۔ تم دیکھ رہے ہو یہاں تک کھدائی کی جا چکی ہے اور ان سرنگوں کی اس سے زیادہ کھدائی ممکن نہیں ہے۔ پتھروں کی تلاش کے لیے آخری سروں پر کھدائی کرنی ہوگی۔ اس طرح سے کھدائی کے لیے بہت سا وقت درکار ہوگا۔“

ضیا کے چہرے پر چند لمحے کے لیے تفکر نظر آیا۔ مگر پھر اس نے شانے جھٹکے۔ ”تم تینوں کھدائی شروع کرو۔ اوزار اس تھیلے میں ہیں۔ ہمارے پاس ایک ہفتہ ہے۔ اگر اس ایک ہفتے میں مجھے مطلوبہ مقدار میں قیمتی پتھر مل گئے تو ٹھیک ہے۔“

”کیا ٹھیک ہے؟“ ظفر نے جلدی سے کہا۔ ”اگر ایسا نہ ہوا تو؟“

ضیا کے چہرے پر سفاک مسکراہٹ نمودار ہوئی:.... ”تب تم خود دیکھ لوگے۔“

کچھ دیر بعد غار میں وہ تینوں رہ گئے تھے۔ ضیا، سومت اور مارّہ کو لے کر چلا گیا تھا۔ جاتے ہوئے وہ ان سے کہہ گیا تھا کہ وہ کام شروع کریں۔ وہ کچھ دیر میں واپس آتا ہے۔ گل خان اور ظفر فکرمند تھے کہ وہ سومت اور مارّہ کو کہاں لے گیا ہے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ ہر کام سوچ سمجھ کر کر رہا ہے، اسے معلوم تھا کہ کس وقت اسے کیا کرنا ہے۔

عمر سوچ رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ”پہلے میں اسے دیوانہ سمجھ رہا تھا مگر اب پتا چل رہا ہے وہ ہوشیار ہے۔ اس نے یقیناً کوئی ٹھکانا تلاش کر لیا ہے جہاں وہ ان دونوں کو قید رکھے گا ہمارا سامان بھی وہیں ہوگا اور اس میں اتنی خوراک ہے جو آرام سے ایک ہفتہ چل سکتی ہے۔“

”کیسے قید رکھ سکتا ہے۔“ ظفر نے انکار کیا۔ ”کیا اس نے باقاعدہ قید خانہ بنا لیا ہے۔ وہ سوئے گا یا کہیں جائے گا نہیں جو اس کی غیر موجودگی سے ہم فائدہ نہ اٹھا سکیں۔“

”مجھے یقین ہے اس نے فول پروف بندوبست کر لیا ہوگا۔“

”ام کو کام کرنا چاہیے۔“ گل خان نے کہا۔ ”وہ ابی آئے گا اور دیکھے گا۔“

”پہلے تو ہمیں کسی سرنگ کے آخری حصے تک پہنچنا ہوگا

جہاں ہم کھدائی کر سکیں۔‘‘

’’میرے خدا یہاں کس قدر یخ ہے۔‘‘ ظفر نے جھرجھری لی۔ ’’اتنی سرد مٹی کی صفائی کیسے کر سکتے ہیں؟‘‘

عمر آگے بڑھ رہا تھا۔ اس بار وہ ہر سرنگ میں جھانک رہے تھے اور بالآخر ایک سرنگ انہیں نیم کھدی ہوئی مل گئی۔ اسے مزید کھودا جا سکتا تھا۔ انہوں نے اوزار نکالے۔ مگر عمر نے انہیں روک دیا۔ ’’سب کا ایک جگہ کام کرنا مناسب نہیں ہے اور جس طرح سرنگ کی چھت اور دیواریں ہیں بالکل اسی طرح آگے بھی کھدائی کرنی ہوگی۔ ذرا سی بے احتیاطی ہمیں اس جگہ زندہ دفن کر دے گی۔‘‘

گل خان اور ظفر اپنے لیے جگہ تلاش کرنے لگے۔ انہیں بھی نیم کھدی سرنگیں مل گئیں۔ یہ اس غار کا آخری حصہ بھی تھا اور بیشتر سرنگیں آگے سے بند مل رہی تھیں۔ عمر نے ایک بیلچہ، ایک کدال اور ایک چھلنی لے لی تھی۔ چھلنی اتنی باریک تھی کہ اس سے ایک قیراط کا پتھر بھی نہیں نکل سکتا تھا۔ وہ کدال کی نوک مار کر نیچے مٹی گرانے لگا۔ مٹی اتنی سخت تھی کہ بکھرنے کے بجائے اس کے ٹکڑے گر رہے تھے۔ خاصے ٹکڑے گرانے کے بعد عمر انہیں چھلنی میں ڈال کر چھاننے لگا۔ چھاننے کا کام سب سے مشکل اور صبر آزما تھا کیونکہ چھلنی کو مسلسل ہلانے سے ریت بکھر رہی تھی اور یہ اتنی یخ تھی کہ اسے ہاتھ لگانا بھی مشکل تھا۔ ایک کلوگرام ریت چھاننے میں ایک منٹ سے زیادہ کا وقت لگ رہا تھا۔ ایک گھنٹے کی محنت کے بعد اس نے کوئی بیس بائیس کلوگرام ریت چھان لی تھی مگر نتیجہ صفر نکلا تھا۔ اسے معمولی سا پتھر بھی نہیں ملا تھا۔

وہ تھک کر ہانپنے لگا تھا۔ اس نے سرنگ سے باہر آ کر گل خان اور ظفر کو آواز دی۔ وہ دونوں بھی تھک گئے تھے اور اس کام سے بیزار تھے اس لیے اس کی آواز سنتے ہی باہر نکل آئے۔ گل خان کو ایک چھوٹا پتھر ملا تھا۔ یہ نیلگوں رنگ کا تھا اور مشکل سے کالی مرچ کے دانے جتنا تھا۔ اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔ ’’بوت مشکل کام اے۔‘‘

’’ٹھیک کہا۔‘‘ ظفر بولا۔ ’’یہ یہاں رہنے والے ہی کر سکتے ہیں۔‘‘

’’لیکن تم تینوں کو کرنا ہے۔‘‘ ایک طرف سے ضیا نمودار ہوا تھا۔ اس نے چالاکی سے کام لیا تھا اور بنا روشنی اور آہٹ کے آیا تھا اس لیے انہیں علم نہیں تھا کہ وہ وہاں موجود ہے اور نہ جانے کب سے ہے۔ عمر نے اس سے کہا۔ ’’ہم اس طرح اندھا دھند کام نہیں کر سکتے۔ ہمارے سامنے ایک ٹارگٹ ہونا چاہیے۔ ایسا نہ ہو کہ ہم تمہیں بوری بھر کر پتھر دیں اور تم کہو کہ تم نے دو بوری کا سوچا ہوا تھا۔‘‘

ضیا مسکرانے لگا۔ ’’تم چالاک آدمی ہو۔ تم نے ٹھیک سوچا ہے۔ واقعی ایک ٹارگٹ سیٹ کرنا چاہیے اور تم تینوں اس کے مطابق کام کرو گے۔‘‘ ضیا نے اپنی جیکٹ میں ہاتھ ڈالا اور ایک چھوٹی سی تھیلی نکالی۔ اس نے وہ تھیلی زمین پر الٹ دی اور اس میں سے سبز اور نیلگوں رنگ کے کوئی نصف درجن پتھر نکل کر زمین پر بکھر گئے۔ اس میں سب سے بڑا پتھر کبوتر کے انڈے کے سائز کا تھا اور سب سے چھوٹا مٹر کے دانے جتنا۔ ضیا نے ان کی طرف اشارہ کیا۔ ’’مجھے ان سائزوں کے سو سے ڈیڑھ سو تک پتھر چاہئیں۔ یہاں زمرد کے ساتھ نیلم اور یاقوت بھی ملتا ہے مگر یاقوت کم ہوتا ہے وہ سرخ رنگ کا پتھر ہوتا ہے۔‘‘

’’سو سے ڈیڑھ سو کا تک سمجھ میں نہیں آیا۔‘‘ ظفر نے اعتراض کیا۔

’’اگر بڑے پتھر زیادہ ہوں تو سو بھی کافی ہوں گے لیکن اگر پتھر چھوٹے ہوئے تو ڈیڑھ سو ہونے چاہئیں۔‘‘

’’ام کو یہ ملا اے۔‘‘ گل خان نے نیلگوں پتھر اس کے حوالے کیا۔ اس نے لے کر دیکھا۔

’’اچھا ہے لیکن میرے معیار کا نہیں ہے۔ اس قسم کے جتنے بھی پتھر ملیں وہ تمہارے ہوں گے۔‘‘ ضیا نے کہا مگر پتھر گل خان کو واپس کرنے کے بجائے اسے بھی تھیلی میں ڈال لیا۔

’’ہم مسلسل کام نہیں کر سکتے۔‘‘ عمر نے کہا۔ ’’ہمیں آرام اور خوراک کی ضرورت بھی ہوگی۔‘‘

’’میں نے اس کا شیڈول بھی بنا لیا ہے۔ تم لوگ چھ گھنٹے کام اور چھ گھنٹے آرام کرو گے۔ خوراک آرام کے وقفے میں مہیا کی جائے گی۔ تم لوگ اسی غار میں رہو گے۔ میں تمہارے لیے سامان لے آیا ہوں۔‘‘

’’سومت اور مائرہ کہاں ہیں؟‘‘ عمر نے پوچھا۔

’’وہ محفوظ جگہ اور بالکل ٹھیک ہیں۔ میں ان کی دیکھ بھال بھی کروں گا۔‘‘ ضیا نے کہا اور انہیں غار کے آغاز میں لے کر آیا۔ وہ ان کے سلیپنگ بیگز لے آیا تھا۔ اس کے ساتھ وہ گل خان کے لیے گرم پتلون، جوتے اور جیکٹ بھی لایا تھا۔ وہ ایسے لباس میں نہیں تھا کہ آرام سے کام کر سکتا۔ ’’تم تینوں میں سے کوئی یہاں سے باہر نہیں جائے گا۔ رفع حاجت کے لیے بھی اندر کوئی جگہ بنا لو۔ اگر کوئی باہر نکلا تو وہ مجھ سے چھپا نہیں رہے گا اور اس کا انجام سب کے سامنے ہو

گا۔'' ضیا نے کہتے ہوئے گھڑی دیکھی۔ ''صبح کے چھ بجنے والے ہیں۔ تم بارہ بجے تک کام کرو گے۔ میں کسی وقت بھی دیکھنے آؤں گا۔''

ضیا انہیں وارننگ دے کر چلا گیا۔ عمر نے ان دونوں کی طرف دیکھا۔ ''میں نے ٹھیک کہا تھا نا اس نے ہر پہلو پر غور کیا ہوا ہے؟''

''لیکن اس نے سومت اور مارّہ کو کیسے قید کیا ہوگا؟''

''ممکن ہے اس نے انہیں کہیں باندھ دیا ہو۔ اس کے پاس زنجیریں اور ہتھکڑیاں بھی ہو سکتی ہیں۔ وہ دونوں کسی صورت انہیں نہیں توڑ سکتے۔'' عمر نے خیال پیش کیا اور کھڑا ہو گیا۔ ''چلو وہ چیک کرنے کی دھمکی دے کر گیا ہے۔ کہیں سچ مچ نہ چیک کرنے آجائے۔''

وہ تینوں غار میں اپنے اپنے حصوں میں آئے اور کھدائی کرنے میں لگ گئے۔ یہ بالکل اندر کے حصے تھے اس لیے یہاں مسلسل برقی لالٹینیں روشن رکھنا پڑ رہی تھیں۔ دوپہر تک ان کی بیٹری کا چارج بالکل ختم ہو گیا اور جب وہ بارہ بجے غار کے بیرونی حصے تک آئے تو یہ بند ہونے والی ہو رہی تھیں۔ مگر جب وہ آرام والی جگہ پہنچے تو انہیں وہاں چارج شدہ برقی لالٹینیں رکھی نظر آئیں۔ ان کے ساتھ وہاں ٹن بند خوراک بھی تھی اور اسے گرم کرنے کے لیے الاؤ کی لکڑیاں بھی تھیں۔ انہوں نے سب سے پہلے آگ جلائی اور خوراک گرم کرنے لگے۔ بھوک سے سب کا بُرا حال تھا۔ اس دوران میں تینوں نے اپنی کارگزاری بھی ایک دوسرے کو دکھائی۔ انہیں درمیانے اور چھوٹے سائز کے کوئی ایک درجن پتھر ملے تھے مگر ان میں کوئی بہت قیمتی پتھر نہیں تھا۔ صرف تین اس سائز کے تھے جو ضیا نے انہیں دکھائے تھے۔ باقی نو اس سے چھوٹے سائز کے تھے۔

''یہ تو لگ رہا ہے کہ سارے پتھر ہمارے لحاظ سے مل جائیں گے۔'' ظفر نے کہا۔

''پر ام اس سے فائدہ اٹھانے کا واسطے زندا نہیں او گا۔'' گل خان نے فکر سے کہا۔ ''اگر اس داؤس نے امارا بچہ کو نہ پکڑا ادتا تو ام مر کر بی اس کا کام نا کرتا۔ ام کو یقین اے اگر ام نے اسے پتھر دے بی دیا تب بی یہ کسی کو نہیں چھوڑے گا۔''

باہر تیز روشنی ہو رہی تھی۔ دن صاف اور روشن تھا۔ وہ کھا پی کر آرام کرنے لگے۔ گل خان نے رفع حاجت کے لیے ایک جگہ مخصوص کر لی تھی، وہ وہاں گڑھے کھود کر اپنا کام چلا سکتے تھے اس سے گندگی اور بدبو بھی نہیں پھیلتی۔ وہ سب بے خبر سو رہے تھے کہ ضیا نے آواز دے کر انہیں بیدار کیا۔

''اٹھ جاؤ...... کام کا وقت ہو گیا ہے۔''

وہ سب اٹھ گئے۔ انہوں نے ملنے والے پتھر ایک جگہ جمع کر لیے تھے۔ ضیا ان کا معائنہ کر رہا تھا۔ اس نے خشک سے کہا۔ ''تم لوگوں کو بس یہی ملا ہے؟''

''ظاہر ہے۔'' عمر نے کہا۔ ''اگر ہم کچھ چھپائیں گے بھی تو تم ہمیں کہاں چھوڑو گے۔''

''مارّہ کہاں ہے؟'' ظفر نے کہا۔

''سومت کدر اے؟'' گل خان نے بھی سوال کیا۔

''دونوں محفوظ ہیں۔'' ضیا نے کہا۔

''ام کو یقین نہیں اے۔'' گل خان جذباتی ہو رہا تھا۔ ''تم دو بچوں کو مار اب ان کو بی مار سکتا اے۔''

''وہ زندہ ہیں، میں تم کو یقین دلا سکتا ہوں۔'' ضیا نے کہا اور جیکٹ سے ایک واکی ٹاکی نکالا اور اس کا بٹن دبا کر بولا۔ ''مارّہ تم سن رہی ہو؟''

''ہاں میں سن رہی ہوں۔'' کچھ دیر بعد مارّہ کی آواز آئی۔

''گل خان سومت کی آواز سننا چاہتا ہے اس سے بات کراؤ۔''

''بابا تم کدر اے۔'' سومت کی آواز آئی۔ ''اس نے ام کو اور قید کیا اے۔''

''تم نے سن لیا۔'' ضیا نے گل خان کی طرف دیکھا۔

''میری مارّہ سے بات کراؤ۔'' ظفر نے کہا تو ضیا نے واکی ٹاکی اس کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے بے تابی سے پوچھا۔ ''مارّہ تم ٹھیک ہو؟''

''ہاں میں ٹھیک ہوں۔'' وہ بولی۔ ''اس نے ہمیں زنجیروں اور ہتھکڑی سے باندھ دیا ہے مگر اس کے علاوہ اور کوئی تکلیف نہیں ہے۔ تم ٹھیک ہو؟''

''ہاں میں ٹھیک ہوں۔'' ظفر نے جذباتی لہجے میں کہا اور ضیا نے اس سے واکی ٹاکی واپس لے لیا۔

''شاباش کام شروع کرو۔ مجھے رزلٹ چاہیے۔''

وہ چارج شدہ برقی لالٹینیں لے کر اندر غار میں آئے۔ پہلے والی لالٹینیں ضیا لے گیا تھا۔ اندر جاتے ہوئے عمر نے آہستہ سے ان دونوں سے کہا۔ ''میرے ذہن میں ایک خیال آ رہا ہے لیکن پہلے ہم ایک گھنٹا کام کریں گے۔ اس کے بعد میں تم دونوں کو بتاؤں گا۔''

وہ تینوں اپنے اپنے حصوں میں آگئے اور مٹی کی کھدائی اور اس کی چھان بین میں لگ گئے۔ اتفاق کی بات

تھی کہ ایک گھنٹے میں عمر کو چار بڑے پتھر ملے۔ ان میں تین زمرد تھے اور ایک نیلم تھا۔ پتھر قیمتی لگ رہے تھے۔ عمر نے انہیں اور جو پتھر اسے اتفاقی ملا تھا ان سب کو اسی غار میں ایک جگہ دیوار کی جڑ میں چھوٹا سا گڑھا کر کے دفن کر دیا اور ریت برابر کر دی۔ ایک گھنٹے بعد وہ باہر آیا اور اس نے ان دونوں کو آواز دی۔ وہ اپنے غاروں سے باہر آئے۔ عمر نے پہلے ایک لالٹین ممکنہ حد تک دوری پر رکھی جہاں سے ضیا آ سکتا تھا اور پھر وہ ایک جگہ جمع ہوئے۔ عمر نے آہستہ سے کہا۔

''ہمیں معلوم ہو گیا ہے کہ مائرہ اور سومت کس جگہ قید ہیں اور وہ جگہ یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔ اس لیے اگر ہم کسی طرح ضیا پر قابو پا لیں تو انہیں تلاش کر سکتے ہیں۔''

''پر قابو کیسے پائے؟'' گل خان نے سوال کیا۔

''میرا خیال ہے وہ چپکے سے اس طرف آتا ہے اور دیکھتا ہے کہ ہم کام کر رہے ہیں یا نہیں۔ ایسے کسی موقع پر ہم اس پر قابو پا سکتے ہیں۔''

''اگر ہم اس پر قابو پانے کے لیے گھات لگائیں گے تو کام کون کرے گا؟''

''دو کام کریں گے اور ایک گھات لگائے گا۔'' عمر نے کہا۔ ''یہ کام میں کروں گا۔''

''ہمارے پاس ہتھیار نہیں ہیں۔'' ظفر نے کہا تو عمر مسکرایا۔

''تم اوزاروں کو بھول رہے ہو، یہ بہترین ہتھیار بھی ہیں۔''

وہ گفتگو کے دوران دیکھ رہے تھے کہ ضیا تو نہیں آ رہا ہے مگر روشنی میں کوئی اس طرف آتا نظر نہیں آیا تھا۔ طے ہوا کہ وہ تین گھنٹے کام کریں گے اور اس کے بعد عمر گھات لگائے گا۔ مزید ایک گھنٹے بعد عمر سرنگ کے بیرونی حصے کی طرف آیا اور اس نے گھات لگانے کے لیے ایک نامکمل غار کا انتخاب کیا جس کے آگے چٹان آ گئی تھی اور اسے ادھورا چھوڑ دیا گیا تھا۔ عمر نے اس کی ایک طرف کی دیوار میں کھدائی کر کے چھ سات انچ کا ایسا خلا بنا لیا جس میں وہ خود کھڑا ہو سکتا تھا اور نکلنے والی مٹی اس نے زمین پر ہموار کر کے پھیلا دی۔ ضیا کو غار کے آخری حصے میں جانے کے لیے اس جگہ سے گزرنا پڑتا اور تب عمر اس پر حملہ کر سکتا تھا۔ یہ کام کر کے وہ واپس آیا۔ رات کے ساڑھے آٹھ بج رہے تھے اور سردی پھر شدت اختیار کر گئی تھی۔ انہیں رات بارہ بجے تک کام کرنا تھا۔ اس نے واپس آ کر ان دونوں کو بتایا۔

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں
گھر بیٹھے
رسالے حاصل کیجیے
جاسوسی ڈائجسٹ سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ ماہنامہ سرگزشت
باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں اپنے دروازے پر
ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زرِ سالانہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)
پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 800 روپے
امریکا کینیڈا آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 9,000 روپے
بقیہ ممالک کے لیے 8,000 روپے
آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔
یہ آپ کی طرف سے اپنے پیاروں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہو سکتا ہے
بیرونِ ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر بھاری بینک فیس عائد ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔
رابطہ: ثمر عباس (فون نمبر: 0301-2454188)
جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی
فون: 021-35895313 فیکس: 021-35802551

RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY

"میں نے جگہ بنا لی ہے اور نو بجے میں وہاں چلا جاؤں گا۔ ضیا پر حملہ کرتے ہی میں تم دونوں کو آواز دوں گا اور تم میری مدد کو آؤ گے۔ ممکن ہے میں اسے اکیلے قابو نہ کر سکوں۔"

"ام آئے گا آپ فکر نہ کرو۔" گل خان نے کہا۔

البتہ ظفر ہچکچایا۔ "لیکن ہم کیا مدد کر سکتے ہیں۔"

"جو تم اپنی جان بچانے کے لیے کر سکتے ہو۔" عمر نے سرد لہجے میں کہا۔ "یاد رکھنا میری ناکامی کا مطلب سب کی موت ہوگا۔"

ظفر کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا "بہتر ہوگا ہم اسے قابو کرنے کے بجائے اس کے لیے کام.....۔"

"اگر ہم نے اس کا مطالبہ پورا کر دیا تب بھی امکان کم ہے کہ وہ ہمیں چھوڑے گا۔ وہ ہمیں گولی مار کر ہماری لاشیں یہیں ڈال جائے گا اور کسی کو پتا بھی نہیں چلے گا کہ ہم کہاں گئے۔ اس طرح اس جگہ کا راز بھی راز رہے گا۔"

"آپ ٹھیک بولا صیب۔ وہ قاتل اے، دو قتل کر چکا اے پانچ اور کر دے گا۔"

"اس لیے ہمیں اس پر قابو پانا ہی ہوگا... اگر وہ مارا جاتا ہے تب بھی پروا نہیں کرنی چاہیے۔" عمر نے کہا اور اپنے غار کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے محسوس کیا کہ ظفر دل سے ان کے ساتھ نہیں ہے، اسے خوف تھا کہ ناکامی کی صورت میں ضیا سب کے ساتھ اسے بھی مار دے گا۔ جس حصے میں کھدائی کر رہا تھا یہاں پتھر خاصی مقدار میں تھے۔ دوسرے گھنٹے میں بھی یہاں بہت کچھ نکلا تھا اور اس کا خاص حصہ عمر نے مٹی تلے چھپا دیا تھا۔ گل خان اور ظفر کو وہی چھوٹے موٹے پتھر مل رہے تھے۔ نو بجے اس نے لالٹین غار میں چھوڑی اور ان دونوں کو اطلاع دے کر باہر کی طرف روانہ ہو گیا۔ تاریکی میں وہ ٹٹول کر چل رہا تھا جب اس نے محسوس کیا کہ وہ گھات والی جگہ کے نزدیک آ گیا ہے تو اس نے اپنا موبائل نکال کر اس کی اسکرین روشن کی۔ ضیا نے ان کے پاس موجود چیزیں نہیں لی تھیں۔ ان کے موبائل بھی ان کے پاس تھے مگر یہاں موبائل سگنل نہیں تھے۔ آرمی نیٹ ورک بھی کام نہیں کر رہا تھا۔ وہ گھات والے غار تک آیا اور موبائل آف کر کے واپس رکھ لیا۔

وہ اپنے ساتھ کدال لایا تھا، اس کا ایک سرا ہتھوڑی کی طرح چپٹا تھا اور اس کی ایک ہی ضرب کسی کے حواس اڑانے کے لیے کافی ہوتی۔ عمر کو امید تھی کہ ضیا یہاں تک آنے کے لیے روشنی استعمال کرے گا اور یہی روشنی اسے خبردار کر دے گی۔ وہ غار میں ساکت بیٹھ کر انتظار کرنے لگا۔ اس طرح سے وقت گزاری کتنا مشکل کام ہے اس کا اندازہ اسے اب ہوا تھا۔ وہ ہر کچھ دیر بعد گھڑی دیکھتا تو اسے سوئیاں اسی جگہ نظر آتیں۔ ایک گھنٹا بہت مشکل سے گزرا۔ اچانک غار کے بیرونی حصے کی طرف سے آہٹ ہوئی۔ کسی نے کوئی چیز زمین پر رکھی تھی پھر اسے سانس لینے کی تیز آواز سنائی دی۔ آنے والا ہانپ رہا تھا اور اسی طرف آ رہا تھا۔ عمر چوکنا ہو گیا۔ خلافِ توقع ضیا نے روشنی نہیں کی تھی۔ وہ تاریکی میں آ رہا تھا۔ عمر تذبذب میں رہ گیا کہ کیا وہ تاریکی میں حملہ کرے اور اگر حملہ کارگر نہ ہوا تو ضیا اسے شوٹ کر دے گا۔ وہ ہچکچاتا رہ گیا اور ضیا اس کے پاس سے گزر گیا۔

اب اسے خدشہ ستا رہا تھا کہ اگر ضیا نے دیکھ لیا کہ وہ اپنے غار میں نہیں ہے تو وہ چوکنا ہو جائے گا اور پھر اس پر قابو پانا آسان نہیں رہے گا۔ عمر غار کے بالکل کنارے آ گیا۔ اچانک اسے اندر سے ضیا کے چلّانے کی آواز آئی۔ وہ گل خان اور ظفر پر چلا رہا تھا اور پوچھ رہا تھا کہ عمر کہاں ہے۔ وہ دونوں اسے یقین دلا رہے تھے کہ انہیں نہیں معلوم۔ گل خان نے کہا کہ وہ رفعِ حاجت کے لیے جا سکتا ہے مگر ضیا اس کی بات کا یقین نہیں کر رہا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ اس صورت میں وہ لالٹین کیوں نہیں لے کر گیا؟ گڑبڑ ہو گئی تھی۔ اچانک ظفر نے بھانڈا پھوڑ دیا اس نے ضیا سے کہا۔ "وہ گھات لگا کر تم پر حملہ کرنا چاہتا تھا اور آگے غار میں چھپا ہوا ہے۔ یہ اس کا پلان تھا ہم اس میں شامل نہیں ہیں۔ ہم نے منع کیا تھا مگر وہ خاموشی سے چلا گیا۔"

عمر نے دل ہی دل میں اسے گالی دی اور تیزی سے غار کے باہر والی سمت بڑھا۔ اب غار میں رہنے کا مطلب خودکشی بھی ہو سکتا تھا۔ باہر آتے ہی وہ تیزی سے بجری کے ڈھیروں کے درمیان آ گیا۔ اسے ظفر کی بزدلی پر رہ رہ کر غصہ آ رہا تھا جس نے اس کا پلان ناکام بنا دیا اور سب کی زندگیوں کو خطرے میں ڈال دیا تھا۔ ظفر اور گل خان ضیا کے قبضے میں تھے۔ وہ ان کے ساتھ کچھ بھی کر سکتا تھا مگر عمر کو امید تھی کہ وہ انہیں کچھ نہیں کہے گا۔ کیونکہ اگر وہ انہیں مار دے گا تو اس کے لیے کھدائی کون کرے گا۔ پھر ان دونوں کی مجبوریاں ضیا کے قبضے میں تھیں۔ عمر کی مجبوری نہیں تھی۔ اس لیے ضیا اب اسے پا لیتا تو اسے مار دیتا۔ اس کی عافیت اسی میں تھی کہ اس سے دور رہے۔ عمر کے لیے آسان کام یہ تھا کہ وہ یہاں سے گاؤں چلا جاتا اور

وہاں سے مدد لے کر آتا۔ لیکن اسے خطرہ تھا کہ اگر ضیا اسے نہ پاسکا تو وہ شاید ان چاروں کو قتل کردے اور یہاں سے فرار ہوجائے۔

ضیا ان دونوں کو لے کر باہر نکل آیا تھا، اس نے بلند آواز سے کہا۔ ”عمر، اگر تم سامنے نہیں آئے تو میں ان دونوں کو گولی ماردوں گا۔“

”خدا کے لیے۔“ ظفر نے گھگیا کر کہا۔ ”وہ یہاں سے جاچکا ہوگا اور اگر کہیں چھپا ہے تب بھی ہماری خاطر کیوں سامنے آئے گا۔ ہم اس کے کچھ نہیں لگتے کہ وہ ہماری خاطر جان خطرے میں ڈالے۔“

”اگر تم ام کو ماردے گا۔“ گل خان نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔ ”تو پھر کا واسطے کدائی تمارا باپ کرے گا۔“

گل خان کی بات اور لہجے سے لگ رہا تھا کہ وہ ضیا سے ذرا بھی خوفزدہ نہیں ہے۔ اس کا رویہ ظفر کے برعکس تھا۔ ضیا نے پستول کا رخ اس کی طرف کردیا اور دانت پیس کر بولا۔ ”کسی کو نہ سہی مگر میں تمہیں ضرور قتل کروں گا لیکن پہلے تمہارے سامنے تمہارے بیٹے کو قتل کروں گا۔“

گل خان غرا کر اس کی طرف بڑھا تھا کہ ضیا نے فائر کیا اور گولی گل خان کے پیروں کے پاس لگی تھی۔ وہ رک گیا مگر اس نے سرد لہجے میں کہا۔ ”اگر امارا بچہ کا ذرا بھی نقصان ہوا تو ام تمارا ٹکڑے کردے گا۔“

”اگر میں یہ گولی تمہارے سینے میں اتار دیتا تو پھر تم کیسے میرے ٹکڑے کرتے۔“ ضیا ہنسا تو اس بار اس کی ہنسی میں دیوانگی تھی۔ ”تمہیں پتا ہے میں نے تمہارے بیٹے اور مائرہ کو کہاں رکھا ہے؟“

”وہ کدر اے؟“

”گلیشیر کے بعد جنگل کے شروع میں بڑی سی چٹان میں جو غار ہے وہ اس میں ہیں۔“ ضیا نے کہا۔ ایک بار ہنسنے کے بعد وہ سنجیدہ اور ہوشیار نظر آرہا تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے آہستہ سے کہا۔

”چلو میں تمہیں تمہارے بیٹے سے ملوادوں۔“

وہ تینوں ایک طرف روانہ ہوئے۔ ظفر آگے تھا اور اس کے پیچھے گل خان تھا۔ سب سے پیچھے ضیا تھا۔ ان کے پاس لالٹینیں تھیں مگر ضیا کی ہدایت پر سب بند کردیں۔ اب وہ چاند کی روشنی میں سفر کر رہے تھے۔

☆☆☆

عمر رفتہ رفتہ ان سے دور ہو رہا تھا مگر ان کی آوازیں اس تک آرہی تھیں اور پھر ضیا نے بتایا کہ اس نے سومت اور مائرہ کو کہاں قید رکھا ہے تو وہ حیران ہوا مگر اس کے لیے زیادہ وقت نہیں تھا، وہ تیزی سے جنگل کی طرف روانہ ہوگیا۔ بڑی سی چٹان اس نے دور سے دیکھی تھی مگر اس کے نزدیک نہیں گیا تھا۔ گلیشیر کے دہانے کے علاقے سے نکلنے کے بعد اس نے احتیاط بالائے طاق رکھی اور ہر ممکن تیزی سے چلنے لگا۔ اگرچہ اس کے پاس سوائے موبائل کے اور کوئی چیز نہیں تھی مگر وہ روشنی کے لیے اسے بھی استعمال نہیں کرسکتا تھا۔ نالے کے ساتھ ہوتے ہوئے وہ جنگل میں داخل ہوا اور اس نے چٹان کا رخ کیا۔ وہ چلنے کے دوران بار بار پلٹ کر دیکھ رہا تھا کہ کہیں ضیا اس کے پیچھے تو نہیں آرہا ہے۔ مگر اسے کوئی نظر نہیں آیا تھا۔ چٹان کے پاس آکر اس نے غار کی تلاش شروع کی مگر وہ اسے نظر نہیں آرہے تھے۔ مجبوراً اس نے آہستہ سے آواز دی۔

”سومت، مائرہ تم لوگ کہاں ہو؟“

”عمر صیب۔“ سومت کی آواز آئی مگر فوراً ایسا لگا جیسے اس کا منہ بند کردیا گیا ہو۔ پھر مائرہ کی آواز آئی۔

”عمر یہ آپ ہیں؟“

ان آوازوں سے اس نے اندازہ لگالیا کہ غار کہاں ہوسکتا تھا۔ اس کے لیے ذرا اوپر چڑھنا ضروری تھا۔ اس نے اوپر چڑھتے ہوئے کہا۔ ”ہاں، میں ہوں۔“

”اوپر آجاؤ ہم غار میں ہیں۔“ مائرہ نے کہا۔ عمر اوپر آیا اور اسے غار کا تاریک دہانہ نظر آگیا لیکن جیسے ہی اس نے غار میں قدم رکھا کوئی چیز اس کے سر سے لگی اور وہ منہ کے بل نیچے گرا تھا۔

☆☆☆

ضیا، ظفر اور گل خان کو ہینڈز اپ کرائے ہوئے جنگل میں واقع چٹان تک لایا۔ گل خان اتنے عرصے سے یہاں آجا رہا تھا مگر اسے علم نہیں تھا کہ اس چٹان میں کوئی غار بھی ہے۔ اس لیے وہ حیران ہوا اور اس وقت ظفر اور گل خان کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب ضیا نے نیچے سے مائرہ کو آواز دی اور پوچھا۔ ”عمر آگیا ہے؟“

”ہاں اور بے ہوش ہے۔“ مائرہ چٹان کے اوپر ایک لالٹین کے ساتھ نمودار ہوئی۔ ”میں نے اس کے سر پر وار کیا تھا۔“

ظفر اور گل خان حیرت سے اب پاگل ہونے کے قریب تھے۔ ظفر نے چلا کر کہا۔ ”مائرہ یہ کیا کہہ رہی ہو، تم اس شخص کے ساتھ مل گئی ہو۔“

”یہ ملی نہیں ہے شروع سے میرے ساتھ تھی۔“ ضیا

ہنسا۔ ”میں نے اسی وجہ سے غار کا پتا بتایا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ غار کا سنتے ہی اس طرف آئے گا اور مائرہ اسے قابو کر لے گی۔“

”مائرہ مجھے تم سے یہ توقع نہیں تھی۔“ ظفر نے بہ مشکل کہا۔ ”تم اس قاتل کے ساتھ ہو اس نے دو بچوں کو مارا ہے۔“

”تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔“ مائرہ بے پروائی سے بولی۔ ”اس نے ہیروں کی جگہ معلوم کرنے کے لیے ان بچوں کو تشدد کر کے مارا۔ لیکن اسے جگہ کا پتا نہیں چلا۔ یہ پلان اسے میں نے سمجھایا۔“

”لیکن یہ یہاں آیا کیسے تھا؟“ ظفر نے پوچھا۔ ”یہ تو کہہ رہا تھا کہ پہلی بار اس طرف آیا ہے۔“

اس سوال کا ضیا نے جواب دیا۔ ”پہلے میں کسی اور حلیے میں آیا تھا۔ میرا سر گنجا تھا اور پیٹ نکلا ہوا تھا۔ چہرہ بھی مختلف تھا، اب میں دوسرے حلیے میں ہوں اور یہ میرا اصل حلیہ ہے۔“

گل خان کا غصے سے برا حال تھا۔ ”واؤس تم معصوم بچہ کو اتنی بے دردی سے مارا۔“

”اگر تم چاہتے ہو کہ تمہارا بچہ ان میں شامل نہ ہو تو مجھے قیمتی پتھر تلاش کر کے دو۔“ ضیا نے سرد لہجے میں کہا۔ ”اب میں ہر وقت تمہارے ساتھ رہوں گا اور نگرانی کروں گا۔“

عمر غار کے دہانے کے پاس پڑا ہوا تھا۔ اگر سر پر ٹوپی نہ ہوتی تو اس کا سر پھٹ جاتا اور شاید وہ بے ہوش ہو جاتا مگر اسے چکر آئے تھے اور رفتہ رفتہ اس کی حالت بہتر ہو رہی تھی۔ مگر وہ یوں ساکت پڑا تھا جیسے گہری بے ہوشی میں ہو۔ ضیا نے اوپر آنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ عمر نے آنکھ کھول کر دیکھا تو مائرہ اسے چند قدم کے فاصلے پر نظر آئی۔ اس نے جس دھاتی راڈ سے اس کے سر پر وار کیا تھا وہ وہیں پھینک دی تھی اور عمر سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھی۔ جب اسے محسوس ہوا کہ اس کے حواس ٹھیک ہو رہے ہیں تو اس نے آہستہ سے ہاتھ بڑھا کر راڈ گرفت میں کر لی۔ سومت اندر بے بسی سے بندھا ہوا تھا اور مائرہ نے اس کے ہونٹوں پر ٹیپ لگا دیا تھا۔ عمر آہستہ سے اٹھا تو سومت نے اسے دیکھ لیا اور خوش ہو گیا۔ عمر پوری طرح کھڑا نہیں ہوا کہ وہ نیچے سے نظر آ جاتا۔ اس نے ذرا آگے ہو کر مائرہ کو اسی کے سکوں میں ادائیگی کی اور اس کے سر پر پیچھے سے ضرب لگائی۔ مائرہ ہلکی سی چیخ کے ساتھ نیچے گئی اور سیدھی ضیا پر گری تھی۔ ضیا نیچے گرا اور اس بلائے ناگہانی سے اس کے ہاتھ سے پستول نکل گیا۔ گل خان نے اس موقع کا پورا فائدہ اٹھایا اور جھپٹ کر پستول اٹھا لیا۔ دس سیکنڈ سے بھی پہلے صورتِ حال بدل گئی تھی۔ گل خان نے پستول کا رخ ضیا کی طرف کیا جو بے ہوش مائرہ کو خود پر سے اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ گل خان کے ہاتھ میں پستول دیکھ کر وہ ساکت ہو گیا۔ عمر نے اوپر سے کہا۔

”گولی مت چلانا۔ میں اسے زندہ گرفتار کروں گا۔“

ظفر چونکا۔ ”گرفتار؟“

عمر نیچے آیا اور اس نے سب سے پہلے ضیا کے دونوں ہاتھ پشت پر کر کے اسے پلاسٹک کی کس جانے والی ہتھکڑی لگائی اور پھر یہی سلوک مائرہ کے ساتھ کیا۔ پھر اس نے سیدھا ہوتے ہوئے کہا۔ ”ہاں گرفتار، میں ایف آئی اے کا افسر ہوں اور اس بار مہم جوئی کے بجائے ان معصوم بچوں کے قاتل کا پتا چلانے یہاں آیا ہوں۔ یہ ذمے داری مجھے اوپر سے سونپی گئی تھی اور خدا کا شکر ہے کہ قاتل ہاتھ آ گئے۔“

☆☆☆

دو دن بعد عمر کی روانگی تھی۔ اس کے ساتھ مقامی پولیس کے چار سپاہی بھی تھے جو گرفتار ضیا اور مائرہ کو دارالحکومت تک لے جاتے۔ ضیا کا تعلق مائرہ کے شہر سے ہی تھا اور وہ اسی چینل کے لیے کام کرتا تھا جہاں مائرہ فوٹو گرافر تھی۔ اس نے مائرہ کو اپنے جال میں پھنسا لیا اور پھر اسے قیمتی پتھروں کا لالچ دیا۔ بے شک اس نے مائرہ کو سبز باغ دکھائے تھے مگر یہ مائرہ کا ذاتی فعل تھا جو وہ معصوم بچوں کے قاتل کے ساتھ مل گئی۔ ظفر کو اب تک یقین نہیں آ رہا تھا کہ مائرہ ایسی ہو سکتی تھی۔ گل خان نے گاؤں کے ان افراد سے اس کی بات کرا دی تھی جو یہاں سے قیمتی پتھر نکالتے تھے اور انہوں نے ظفر سے معاہدہ کر لیا تھا کہ وہ جو پتھر نکالیں گے ظفر ان سے خرید لے گا۔ گل خان عمر کا شکر گزار تھا کہ اس نے سب کی اور خاص طور سے اس کے بیٹے کی جان بچائی تھی۔ عمر نے جانے سے پہلے اسے وہ قیمتی پتھر دیے جو اس نے کھدائی کے دوران پائے تھے۔ گل خان نہیں لے رہا تھا مگر عمر نے یہ کہہ کر دیے کہ وہ سومت کو پڑھائے گا اور ان پتھروں کی فروخت سے جو رقم ملے گی وہ سومت کی تعلیم پر خرچ کرے گا۔ گل خان نے وعدہ کیا کہ وہ ایسا ہی کرے گا۔

▲▲▲

Downloaded From

# بساط

محمد فاروق انجم

زندگی کے اہم ترین موڑ پر مختلف راستے انسان کے منتظر ہوتے ہیں... اب یہ اس کا کام ہے کہ وہ اپنے لیے کون سا راستہ منتخب کرتا ہے... اپنی پسند کی راہ چن لینے والے شخص کی داستاں... جس نے آتشِ انتقام میں ڈوب کے جرائم کو اپنے پیروں کی زنجیر بنا لیا تھا... ایک نازک اندام... معصوم صورت نے اسے اپنا اسیر کر لیا تھا... وہ ہر صورت اسے اپنی زندگی کا ساتھی بنا لینا چاہتا تھا... مگر سفاکی کا لبادہ اوڑھے اس کے انتقام کی آگ سرد ہونے کے بجائے بھڑکتی ہی جا رہی تھی... خوشنما و خوش آہنگ لمحوں سے دور خونی رنگوں سے پُر کر دینے والی زندگی کے مناظر...

**ایک مثلث کے گرد گھومتی کہانی جس میں سرکشی تھی... درندگی تھی اور وابستگی... سرورق کی عبرت ساماں تحریر...**

تالیوں کی گونج میں سرمد نثار اپنی نشست سے اُٹھا اور پُروقار انداز میں چلتا ہوا اسٹیج کی طرف بڑھا۔ اسٹیج پر شہر کا معروف صنعت کار ہاتھ میں ایوارڈ لیے مسکراتا ہوا اس کا منتظر تھا۔ سرمد نے اس کے قریب جا کر پُرجوش انداز میں مصافحہ کیا اور ایوارڈ وصول کرنے کے بعد اسے بلند کر کے تقریب میں موجود خواتین و حضرات سے داد سمیٹنے لگا۔

وہ ایک بڑے اور مقبول ٹیلی وژن چینل کی ایوارڈ تقریب تھی جو براہِ راست دکھائی جا رہی تھی۔ سرمد اس چینل

READING
Section

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں؟ ۔

- ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ

سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی

- عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل رینج
- ایڈ فری لنکس، لنکس کو پیسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

- ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور رژیوم ایبل لنک
- ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو ہر پوسٹ کے ساتھ
- پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل رینج
- ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

Online Library For Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety

twitter.com/paksociety1

کا سب سے کامیاب ڈراما رائٹر تھا جس کی ہر ڈراما سیریل نے ریکارڈ توڑ مقبولیت حاصل کی تھی اور اس سال بھی وہ بہترین ڈراما رائٹر کا ایوارڈ وصول کر رہا تھا۔

سرمد کی عمر تیس سال سے زیادہ تھی۔ وہ وجیہہ اور خوش پوش تھا۔ اپنی شکل و صورت اور جسمانی ساخت سے کسی ہیرو سے کم نہیں لگتا تھا لیکن وہ صرف لکھنا جانتا تھا اس لیے اس نے کبھی اداکاری کرنے کے بارے میں سوچا بھی نہیں تھا حالانکہ اسے اداکاری کی پیشکش بھی ہو چکی تھی۔

وہ ایک بڑے زمیندار کا بیٹا تھا، اپنے خاندان سے بالکل منفرد۔ شہر میں پڑھا اور اسی علاقے میں وہ ایک فلیٹ میں اکیلا اپنے خانساماں اور ایک ملازم کے ساتھ رہائش پذیر تھا جبکہ اس کا سارا خاندان اپنے گاؤں میں تاحدِ نگاہ پھیلی ہوئی زمینوں اور باغوں کی ملکیت کے ساتھ آباد تھا۔

سرمد پیسے کے لیے نہیں لکھتا تھا۔ پیسے کی اس کے پاس کمی نہیں تھی، وہ اشارہ کرتا تھا اور اس کے والدین اور بھائی ہر چیز اس کے سامنے حاضر کر دیتے تھے، لکھنا سرمد کے لیے تسکین کا باعث تھا، یہ الگ بات تھی کہ اب اس تسکین کے ساتھ اسے منہ مانگا معاوضہ بھی مل رہا تھا۔

سرمد نے اپنا ایوارڈ وصول کرنے کے بعد مائیک کے سامنے کھڑے ہو کر چند الفاظ کہے اور اپنے دوستوں اور ساتھ کام کرنے والوں کا شکریہ ادا کرنے کے بعد جانے لگا تو معروف صنعت کار نے مائیک سنبھالتے ہی سرمد کو روک لیا۔

”میں نے سرمد صاحب کا ایک انٹرویو پڑھا تھا جس میں انہوں نے کہا تھا کہ وہ خوبصورت گھڑیوں کے بہت شوقین ہیں۔ ان کے پاس کئی درجن گھڑیاں ہیں، وہ شرٹ پہننا بھول سکتے ہیں لیکن گھڑی باندھنا نہیں بھول سکتے۔“ صنعت کار مسکراتے ہوئے کہہ رہا تھا تو سرمد بھی اس کی بات سن کر مسکرانے لگا۔

صنعت کار پھر بولے۔ ”اس لیے آج میں ان کے لیے ایک گھڑی کا حقیر سا تحفہ لایا ہوں۔“

ساتھ کھڑی لڑکی نے اپنے ہاتھ میں پکڑی ٹرے ان کے سامنے کر دی۔ صنعت کار نے کپڑا ایک طرف ہٹایا تو خوبصورت بکس میں انتہائی خوبصورت اور چمکتی ہوئی گھڑی دکھائی دینے لگی۔ کیمرے نے فوراً اس گھڑی کا کلوز اپ لیا اس ایوارڈ تقریب میں ایک بڑی اسکرین لگی ہوئی تھی۔ اس اسکرین کی مدد سے تقریب میں موجود سیکڑوں خواتین و حضرات نے گھڑی کا کلوز اپ دیکھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے وہ سرمد کے لیے خاص ڈیزائن کی گئی ہو۔

گھڑی کے کلوز میں صنعت کار کی آواز بلند ہوئی۔ ”یہ میں نے خاص سرمد صاحب کے لیے ڈیزائن کرائی ہے۔ گھڑی کے اندر سونے سے ان کا نام بھی لکھا ہوا ہے۔“

ہال تالیوں سے گونج اُٹھا اور سرمد کے چہرے پر مسکراہٹ اور بھی گہری ہو گئی۔

”یہ گھڑی میں ان کو پہنانا چاہتا ہوں۔“ صنعت کار نے کہا اور سرمد اس کی طرف بڑھ گیا۔ صنعت کار نے خود وہ گھڑی سرمد کو پہنائی۔ سرمد نے جو گھڑی پہلے پہن رکھی تھی، وہ اتار کر اپنے کوٹ کی جیب میں رکھ لی۔

سرمد نے پہلے صنعت کار کا شکریہ ادا کیا اور پھر مائیک پر آ کر کہا۔ ”گھڑی کا یہ تحفہ میرے لیے یادگار ہے، تھینک یو۔“

ہال پھر تالیوں سے گونج اُٹھا اور سب اپنی اپنی نشست پر چلے گئے اور تقریب مزید آگے بڑھنے لگی۔

سرمد کو لاتعداد لوگ ٹیلی وژن کی اسکرین پر ایوارڈ لیتا ہوا دیکھ رہے تھے اور ان لاتعداد لوگوں میں ایک ماریہ بھی جس کے چہرے کی خوشی اور سرخی سب سے الگ تھی۔ اس کی آنکھیں ٹی وی اسکرین پر جمی ہوئی تھیں اور چہرہ خوشی سے کھلا ہوا تھا۔ اس کا دل خوشی میں معمور تھا۔ اس وقت وہ ایک بڑے پروڈکشن ہاؤس کے میک اپ روم میں اکیلی بیٹھی وہ تقریب دیکھ رہی تھی۔

ماریہ ایک چھوٹے سے شہر سے تین سال قبل اس بڑے شہر میں آئی تھی۔ اس کے والدین بچپن میں ہی فوت ہو چکے تھے اور اس کے ماموں نے اس کی پرورش کی تھی۔ ماریہ کا ماموں شوبز کی دنیا میں لائٹ مین تھا۔ اس کی وساطت سے ماریہ کو ایک بڑی میک اپ آرٹسٹ انجم جبیں نے اپنے ساتھ رکھ لیا تھا۔ ماریہ بہت جلد اپنے کام میں اتنی ماہر ہو گئی تھی کہ وہ انجم کے لیے لازم و ملزوم ہو گئی۔ ماریہ کا ماموں کام چھوڑ کر واپس اپنے شہر چلا گیا لیکن ماریہ کا اس شہر میں اچھا روزگار لگ گیا تھا اور انجم بھی اس کا بہت خیال رکھتی تھی۔ انجم نے بھی ماریہ جیسی محنتی لڑکی اپنے پیشے میں پہلے نہیں دیکھی تھی۔

ماریہ کی ملاقات آٹھ ماہ قبل سرمد سے اسی کے ڈرامے کے سیٹ پر ہوئی تھی۔ پہلی نظر نے ہی سرمد کو ماریہ کی طرف مائل کر دیا۔ وہ اس کی محبت میں گرفتار ہو گیا اور چند ملاقاتوں کے بعد ایک دن اچانک سرمد نے ماریہ کو چائے پر بلا لیا۔

ماریہ ڈری ہوئی اس کے سامنے براجمان تھی۔ اس

وقت سرمد نے ماریہ کو حیرت زدہ کر دیا جب اس نے کہا۔

”لوگ کہتے ہیں میں لفظوں کا جادوگر ہوں لیکن آج مجھے اپنی بات کہنے کے لیے الفاظ نہیں مل رہے ہیں۔“

ماریہ نے حیرت اور سوالیہ نظروں سے سرمد کی طرف دیکھا۔ تب کچھ توقف کے بعد سرمد بولا۔ ”مجھے تم سے محبت ہو گئی ہے۔“

یہ سنتے ہی ماریہ اپنی جگہ سے ایسے اچھلی جیسے کوئی انہونی ہو گئی ہو۔ ماریہ نے سرمد کے بارے میں سن رکھا تھا کہ وہ ایک بڑے زمیندار کا بیٹا ہے۔ ساری زندگی اگر وہ ہاتھ ہلائے بغیر بھی بیٹھا رہے تو دولت کے انبار ختم نہ ہوں۔ ماریہ ایک معمولی لڑکی تھی لیکن اس میں شک نہیں تھا کہ وہ بہت ہی خوبصورت اور اپنے کام سے کام رکھنے والی لڑکی تھی۔

سرمد اپنی بات کہہ کر اس کی طرف دیکھتا رہا۔ جب ماریہ کی حیرت کم نہ ہوئی تو اس نے کہا۔

”کیا میری بات کا یقین نہیں ہے؟ کہیں تم یہ تو نہیں سوچ رہیں کہ میں ان لوگوں میں سے ہوں جو حسن پر فدا ہو کر زندگی کے بڑے فیصلے کر لیتے ہیں اور پھر جی بھر جانے کے بعد راہیں جدا کر کے زندگی بھر کا روگ دے دیتے ہیں؟“

ماریہ اس بار بھی چپ رہی ، وہ پھر بولا۔ ”میں ان میں سے نہیں ہوں۔ میں تم سے شادی کروں گا۔ تمہیں عزت دوں گا اور ساری زندگی تمہیں اپنے دل میں چھپا کر رکھوں گا۔ اتنے سال اس چمکتی دنیا میں رہ کر مجھے کسی سے محبت نہیں ہوئی اور کبھی ایسے جذبات دل میں نہیں ابھرے۔ اور جب محبت ہوئی تو اچانک ہی ہو گئی اور ایسی ہوئی ہے کہ تمہیں اپنانے کے لیے دل بے چین اور مچل رہا ہے۔“

ماریہ کے لیے وہ سب مسرت کا باعث تھا جو سرمد کہہ رہا تھا۔ اس سے پہلے اسے آتے جاتے کئی جملے سننے کو ملتے تھے، جنہیں وہ بہری بن کر نظر انداز کر دیتی تھی۔ سرمد نے بڑی عزت سے اسے اپنے سامنے بٹھا کر اپنے دل کی بات کہی تھی۔

اس سے پہلے کہ ماریہ کچھ بولتی، ایک لڑکی آ گئی اور اس نے ماریہ سے کہا۔ ”آپ کو میم بلا رہی ہیں۔“

وہ پیغام دے کر چلی گئی اور ماریہ تذبذب میں تھی کہ وہ اٹھ کر جائے یا سرمد کے حکم کا انتظار کرے۔

”تم جاؤ لیکن میں تمہارے جواب کا انتظار کروں گا۔“ سرمد نے اپنا کارڈ نکال کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ ماریہ نے وہ کارڈ لیا اور چلی گئی۔ اس کے بعد ماریہ کی سوچوں میں سرمد کی باتیں گردش کرنے لگیں۔ جیسے خالی گھر میں کوئی اچانک بسیرا کر لے۔ کام کے دوران توجہ بٹ گئی اور رات بھر نیند بھی نہیں آئی پھر دوسرے دن فون کر کے ماریہ نے سرمد سے کہہ دیا کہ وہ اس سے شادی کرنے کے لیے تیار ہے۔

سرمد کو واقعی ماریہ سے بہت محبت ہو گئی تھی۔ دل اس کے حصار میں قید ہو گیا تھا۔ وہ ہر قیمت پر ماریہ کو اپنی دلہن بنانا چاہتا تھا۔ ماریہ اور سرمد کی ملاقاتیں ہونے لگیں۔ سرمد نے تب تک ہی ماریہ کو کام کرنے کی اجازت دی تھی جب تک وہ دونوں شادی کے بندھن میں نہیں بندھ جاتے تھے۔

ایک دن سرمد نے اپنے چند قریبی دوستوں کی موجودگی میں ماریہ کو ہیرے کی انگوٹھی پہنا دی۔ اس معاملے کو میڈیا سے دور رکھا گیا تھا اور پوری طرح سے رازداری کا خیال رکھا گیا تھا۔ اس مختصر سی تقریب میں راشد ادیس بھی تھا۔

راشد تقریبا سرمد کا ہم عمر تھا۔ وہ اسسٹنٹ ڈائریکٹر تھا اور کام کے دوران میں اس کی سرمد کے ساتھ اچھی دوستی ہو گئی تھی اور اب دونوں میں ایک حد تک بے تکلفی بھی آ گئی تھی۔ وہ اپنی ذاتی باتیں بھی ایک دوسرے کے ساتھ شیئر کر لیتے تھے۔

راشد ایک باتونی شخص تھا اور اپنی باتوں سے دوسرے کو متاثر کرنا خوب جانتا تھا۔ سرمد جب لکھتے ہوئے تھک جاتا تو وہ راشد کو فون کر کے اپنے پاس گپ شپ کے لیے بھی بلا لیتا تھا اگر راشد فارغ ہوتا تھا تو وہ اس کے فلیٹ میں چلا جاتا تھا۔

ماریہ کو انگوٹھی پہنانے کی اس مختصر سی تقریب میں سب خوش تھے۔ خوشی راشد کے چہرے سے بھی جھلک رہی تھی لیکن کوئی نہیں جانتا تھا کہ اس کے دل میں آگ کا ایک طوفان برپا ہے کیونکہ راشد دل ہی دل میں ماریہ کو بے حد پسند کرتا تھا۔ اس کے گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ سرمد اور ماریہ ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ سرمد نے اس بات کا تذکرہ کبھی راشد سے نہیں کیا تھا۔

سرمد اور ماریہ کا ملن راشد کے گلے میں کانٹے کی طرح پھنس گیا اور وہ اندر ہی اندر تلملاتا رہتا تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ راشد نے بھی ایک دن ماریہ سے اپنے دل کی بات کہہ کر شادی کی پیشکش کی تھی۔ اس کی بات سن کر ماریہ نے عجیب سی نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے تلخ لہجے میں کہا تھا۔

”تم سے شادی کرنے سے بہتر ہے کہ میں ساری زندگی کنواری رہ لوں۔“ ماریہ کو راشد کبھی بھی پسند نہیں تھا۔ اس کی نظروں سے ہی اسے خوف آتا تھا، جانے اس کی بات سن کر

ماریہ کے منہ سے اتنا تلخ جملہ کیوں نکل گیا تھا۔ ماریہ کہہ کر چلی گئی اور راشد دانت پیستا رہ گیا۔

ایوارڈ کی تقریب ٹیلی وژن پر دکھائی جارہی تھی اور ماریہ خوشی سے سرمد کے خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی کہ اچانک دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ ماریہ نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا اور بولی۔

”یس آجاؤ۔“

دروازہ کھلا تو راشد کا چہرہ دکھائی دیا۔ ”مصروف تو نہیں ہو۔“ راشد اندر آتے ہی ایک طرف بیٹھ گیا۔

”ایوارڈ شو دیکھ رہی ہوں۔“ ماریہ بولی۔ راشد کو دیکھ کر اس کا منہ بن گیا تھا۔

”مبارک ہو! سرمد کو اس سال بھی بہترین رائٹر کا ایوارڈ ملا ہے۔“ راشد بظاہر خوش ہوکر کہہ رہا تھا لیکن اس کا دل بھنے ہوئے گوشت کی طرح تھا۔ راشد کا یہی کمال تھا کہ وہ اپنے اندر کی نفرت اور خیالات کو کسی پر ظاہر نہیں ہونے دیتا تھا۔

”مجھے یقین تھا کہ ایوارڈ سرمد کو ہی ملے گا۔“ ماریہ کا سفید چہرہ سرخی سے بھر گیا اور وہ اپنی جگہ سے اُٹھ کر کمرے سے جانے کے لیے اپنے بیگ کی طرف بڑھی۔

”سرمد کمال کا رائٹر ہے۔ وہ زبردست کہانی لکھتا ہے۔ پھر جاندار مکالموں سے وہ ڈراما دیکھنے والوں کو اپنے سحر میں جکڑ لیتا ہے۔ وہ شکار بھی کھیلتا ہے اور اس کا نشانہ زبردست ہے۔ وہ ایسا تیراک ہے کہ منہ پر آکسیجن ماسک چڑھائے بغیر گہرے پانی میں اتر کر تیر سکتا ہے۔“ راشد مسلسل اس کی خوبیاں بیان کرنے لگا۔

”ہاں میں جانتی ہوں، انہیں قدرت نے بہت سی صلاحیتوں سے نوازا ہے۔“ ماریہ نے اپنا سامان ہینڈ بیگ میں رکھ کر اس کی زپ بند کی۔

”کیا تم اس کے بارے میں ایک بات اور بھی جانتی ہو؟“ راشد نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”وہ کیا؟“ ماریہ نے پلٹ کر راشد کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات تھے جیسے وہ راشد کی شکل بھی دیکھنا نہ چاہتی ہو۔

”ڈرامے لکھنے سے پہلے سرمد نے ایک ناول بھی لکھا تھا۔ اس ناول کی کہانی ایک ایسے قاتل کے گرد گھومتی ہے جو قتل کرتا ہے اور کوئی نشان بھی نہیں چھوڑتا۔ تم جانتی نہیں ہو کہ وہ ناول ہاتھوں ہاتھ بک گیا تھا اور پبلشر کی منتوں کے باوجود اس نے پھر کوئی ناول نہیں لکھا اور شوبز میں آگیا۔ سرمد اچھا شکاری تھا، شکار کھیلنا چھوڑ دیا۔ اس کے بعد وہ کیا کرتا ہے، مجھے معلوم نہیں کیونکہ سرمد مستقل مزاج نہیں ہے۔ وہ وقت آنے پر پہلے کو چھوڑ کر دوسرے کو پکڑنے کے لیے اس کی جانب بڑھ جاتا ہے۔“

”تم کہنا کیا چاہتے ہو؟“ ماریہ نے اپنا بیگ کندھے پر لٹکا کر پوچھا۔

راشد نے کچھ توقف کیا اور پھر اپنی جگہ سے اُٹھ کر معنی خیز انداز میں بولا۔ ”سرمد مستقل مزاج نہیں ہے۔ اگر وہ اپنے شوق چھوڑ سکتا ہے تو تمہیں تو وہ ایسے چھوڑ دے گا جیسے چٹکی بجائی جاتی ہے۔“

”تم مجھ پر ایک احسان کرو گے؟“ ماریہ کا لہجہ کچھ تلخ سا ہوگیا۔

”حکم کرو۔“ راشد مسکرایا۔

”برائے مہربانی اپنا یہ تھوبڑا لے کر میرے سامنے مت آیا کرو۔ تمہاری شکل دیکھ کر میرا خون کھولنے لگتا ہے۔“ ماریہ نے تیز لہجے میں کہا اور کمرے سے نکل کر اس نے پوری قوت سے دروازہ بند کیا۔ راشد کے چہرے پر معنی خیز مسکراہٹ تھی، بولا۔

”ایک موقع کی تلاش ہے، پھر تم تڑپتی ہوئی مچھلی کی طرح میری مٹھی میں نہ ہوئیں تو میرا بھی نام راشد نہیں۔ گن گن کر ایک ایک لفظ کا بدلہ لوں گا۔“

☆☆☆

راشد سے ماریہ کو نفرت تھی۔ وہ شروع دن سے ہی اسے اچھا نہیں لگتا تھا اور جس دن سے اس نے اپنی محبت کا اظہار کیا تھا تب سے تو وہ اسے اور بھی برا لگنے لگا تھا۔ ماریہ نے کئی بار سوچا کہ وہ اس کا ذکر سرمد سے کردے، جیسے ہی سرمد کے علم میں راشد کی باتیں آئیں گی تو پھر وہ راشد کو ایسا سبق سکھائے گا کہ کبھی راشد کی جرأت نہیں ہوگی کہ وہ ماریہ کے سامنے سے بھی گزر سکے۔ لیکن پھر وہ چپ ہوجاتی تھی کہ سرمد پہلے ہی اپنے کام میں اس قدر مصروف ہے کہ اس کو پریشان کرنا مناسب نہیں ہے۔ ویسے بھی وہ جلد ہی شادی کرنے والے تھے۔

ماریہ اپنی جگہ ٹھیک سوچ رہی تھی لیکن وہ اس بات سے بھی بے خبر تھی کہ راشد جو دکھائی دیتا ہے، وہ اس سے بالکل برعکس تھا۔ وہ ایک ایسا سانپ تھا جو وقت آنے پر دودھ پلانے والے کو ڈسنے میں دیر نہیں لگاتا۔

راشد کی باتوں کو دماغ سے نکالنے کا موقع تب ماریہ کو اچانک مل گیا جب سرمد کا فون آگیا۔

”کیا مجھ سے کوئی ناراضی ہے ماریہ۔“ سرمد نے

پوچھا۔

''نہیں... بالکل بھی نہیں۔'' ماریہ گھبرا کر سوچنے لگی۔

''مجھے ایوارڈ ملا اور تم نے مجھے مبارکباد بھی نہیں دی۔'' سرمد نے پیار سے شکوہ کیا۔

''میں دراصل آپ کی کامیابی کی مبارکباد آپ کو ڈنر ٹیبل پر دینا چاہتی تھی۔'' ماریہ جلدی سے بولی۔

''اچھا... تو پھر دیر کیسی۔ کل رات کا ڈنر ہم ایک ساتھ کرتے ہیں۔'' سرمد مسکرایا۔

''بالکل ٹھیک ہے۔'' ماریہ خوش ہوگئی۔ کچھ اور باتوں کے بعد رابطہ منقطع ہوگیا۔

دوسرے دن ایک اہم ڈرامے کی شوٹنگ ہو رہی تھی اور ماریہ میک اپ روم میں مصروف تھی کہ اچانک باہر سرمد کی کار آکر رکی۔ وہ جلدی میں بھی تھا اور چہرے پر کچھ پریشانی بھی تھی۔

ابھی سرمد نے کار سے اپنا ایک پیر باہر رکھا ہی تھا کہ کچھ فاصلے پر براجمان راشد بھاگتا ہوا اس کی طرف بڑھا۔

''آپ کے ڈرامے کی شوٹنگ تو دوسرے فلور پر ہو رہی ہے۔'' راشد نے پاس جاتے ہی مسکراتے ہوئے کہا۔

''تم جانتے ہو کہ اس وقت ماریہ کہاں ملے گی؟'' سرمد نے اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے سوال کردیا۔

''جی وہ میک اپ روم میں مصروف ہے دراصل اس ڈرامے سیریل کا کلائمیکس چل رہا ہے اور مسلسل رات تک شوٹنگ ہے اس وقت تک کسی کے پاس سر کھجانے کی بھی فرصت نہیں ہے۔'' راشد نے سرمد کا جائزہ لیا۔

''میں ماریہ سے مل لوں۔'' سرمد میک اپ روم کی طرف جانے لگا تو اچانک رک گیا۔ ''میں جانتا ہوں کہ اس موقع پر کسی سے پانچ منٹ بات کرنی بھی مشکل ہوتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ میں ماریہ کو ڈسٹرب نہ کروں۔'' سرمد پھر راشد کے پاس آگیا۔ ''مجھے ایمرجنسی اپنے گاؤں جانا پڑ رہا ہے۔ میری والدہ کی طبیعت اچانک خراب ہوگئی ہے اور مجھے شاید وہاں ہفتہ، دس دن لگ جائیں۔''

''آپ مجھے حکم کریں، میرے ذمے کیا کام لگانا چاہتے ہیں، میں حاضر ہوں۔'' راشد جلدی سے بولا۔

''میں نے ان پروڈکشنز کمپنیوں کو تو آگاہ کردیا ہے جن کے ساتھ میں کام کر رہا ہوں۔ تم جانتے ہو کہ مجھے دن میں کئی فون آتے ہیں جو میرے ساتھ کام کرنا چاہتے ہیں۔ میرا موبائل فون جیسے ہی اوپن ہوتا ہے وہ مسلسل بجنے لگتا ہے۔ کیونکہ میں اپنی والدہ کے پاس جا رہا ہے اور میں چاہتا ہوں کہ مجھے کوئی ڈسٹرب نہ کرے، اور میری والدہ بھی مجھ سے یہ شکوہ نہ کریں کہ میں ان کی عیادت کرنے آیا ہوں اور اس دوران بھی اپنے کام میں مصروف ہوں۔ اس لیے میں نے اپنے وہ نمبر فی الحال بند کردیے ہیں اور نیا نمبر لے لیا ہے۔ میرا یہ نمبر ان دو پروڈکشنز کمپنیوں کے علاوہ کسی کے پاس نہیں ہے۔ تم یہ نمبر ماریہ کو دے دینا تاکہ وہ میرے رابطے میں رہے۔'' سرمد نے یہ کہہ کر اپنے وزیٹنگ کارڈ پر نیا نمبر لکھا اور راشد کی طرف بڑھا دیا۔ ''میں ماریہ سے فون پر بھی بات کرسکتا تھا لیکن میں اسے خود مل کر بتانا چاہتا تھا لیکن اس مصروفیت میں اسے ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں ہے۔''

''ویسے بھی بھٹی صاحب کی سیریل ہے وہ تو کسی کی بھی مداخلت پسند نہیں کرتے۔ آپ بے فکر ہوجائیں میں یہ نمبر ابھی ماریہ کو پہنچا دوں گا۔'' راشد نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

سرمد نے اس کی طرف تیز نظروں سے دیکھتے ہوئے لہجے میں تغیر لا کر کہا۔ ''ماریہ میری ہونے والی بیوی ہے۔ اس کا نام تمیز سے لیا کرو۔''

راشد یکدم گھبرا گیا۔ ''سوری...''

''مجھے جلدی ہے۔ میں جا رہا ہوں۔ میرا یہ کام کردینا، میں لنچ بریک پر ماریہ سے رابطہ کروں گا۔'' سرمد نے کہہ کر اپنی گاڑی کی طرف قدم بڑھا دیے۔ کچھ دیر کے بعد اس کی کار اس عمارت سے نکل رہی تھی۔

ارشد کچھ دیر وہاں کھڑا رہا اور پیچ و تاب کھاتا رہا۔

''ماریہ کا نام عزت سے لوں... اب دیکھنا میں کیا کرتا ہوں اس کے ساتھ۔''

راشد کو جیسے موقع مل گیا تھا۔ وہ موقع جس کی اسے تلاش تھی۔ اس نے وزیٹنگ کارڈ اپنی جیب میں ڈالا اور میک اپ روم کی طرف چلا گیا۔

ماریہ ایک فنکارہ کا میک اپ کرنے میں مصروف تھی۔ میک اپ روم میں لوگوں کا رش تھا اور ایک ہلچل سی برپا تھی۔ مسلسل شوٹنگ ہو رہی تھی اور آج رات تک کام مکمل کرنا تھا اس لیے ہر کوئی مصروف تھا۔ راشد وہاں پر موجود لوگوں کے ساتھ دعا سلام کرتا ہوا ماریہ کے پاس چلا گیا۔ ماریہ کا ہینڈ بیگ ایک طرف پڑا تھا۔ راشد بہانے سے ماریہ کے ساتھ باتیں کرنے لگا اور اس دوران اس نے غیر محسوس طریقے سے ماریہ کا ہینڈ بیگ نیچے گرا دیا۔

''سوری میں اٹھاتا ہوں...'' راشد نیچے جھکا۔ سب اپنے دھیان میں مصروف تھے۔ راشد نے برق رفتاری سے ہینڈ بیگ کی زپ کھولی اور اندر سے اس کا موبائل فون نکال

کر اپنی جیب میں ڈال کر زپ بند کر کے ہینڈ بیگ اسی جگہ پر رکھ دیا۔

ماریہ اپنے کام میں مصروف تھی اس لیے اس کی توجہ اس جانب گئی ہی نہیں۔ راشد نے کچھ دیر اس سے باتیں کیں اور پھر میک اپ روم سے باہر نکل گیا۔ ماریہ نے ایک پل کے لیے بھی اس پر توجہ نہیں دی تھی۔ اس کا آنا اسے اتنا ناگوار گزرا تھا کہ اس نے اداکارہ کے چہرے پر ہاتھ چلاتے ہوئے فیصلہ کرلیا تھا کہ اب جیسے ہی وہ اس کام سے فارغ ہوگی، وہ راشد کے بارے میں سرمد کو سب کچھ بتادے گی تاکہ اس سے اس کی جان چھوٹ جائے۔

باہر جاتے ہی راشد نے ماریہ کا موبائل فون جیب سے نکالا اور اسے کھول کر اس کی بیٹری الگ کردی۔ پھر اس نے سم نکال کر اپنی دوسری جیب میں ڈال لی اور تیزی سے چلتا ہوا ایک طرف چلا گیا۔

☆☆☆

ماریہ کو تمام دن ایک پل کے لیے بھی فرصت نہیں ملی تھی۔ رات کے ساڑھے دس بجے ماریہ اپنے کام سے فارغ ہوئی تو وہ بری طرح سے تھک چکی تھی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اپنے بستر پر گر جائے۔ انجم اور ماریہ ایک ہی بلڈنگ میں آمنے سامنے رہتی تھیں۔ تھکن سے چور ماریہ نے پوچھا۔

"کب تک چلنے کا ارادہ ہے؟"

"تم چلی جاؤ، میں ابھی رکوں گی۔" انجم نے کہا اور ماریہ اجازت لے کر چلی گئی۔

پروڈکشن ہاؤس سے اس کا گھر زیادہ دور نہیں تھا۔ وہ دس منٹ میں پیدل فلیٹ پر پہنچ گئی۔ اس نے منہ ہاتھ دھویا، کپڑے تبدیل کیے اور بستر پر بیٹھ کر اپنا بیگ کھولا اور اس کی تلاش یہاں تک بڑھ گئی کہ اس نے اپنا بیگ ہی الٹ دیا۔

اس کے بعد اس نے ایک ایک چیز بیگ میں واپس ڈالی لیکن اس کا موبائل فون اسے کہیں نظر نہیں آیا۔ ماریہ کی پریشانی اور تشویش دوچند ہوگئی۔ وہ بار بار اپنے بیگ کو دیکھ رہی تھی اور یاد کررہی تھی کہ اس نے آخری کال سن کر اپنا موبائل فون کہیں وہاں شیلف میں ہی تو نہیں رکھ دیا۔ پھر اسے یاد آیا کہ کام کیونکہ بہت زیادہ تھا اس لیے انجم جبیں نے پہلے ہی اعلان کردیا تھا کہ اپنے اپنے موبائل فون بند کردو۔ کام کے دوران کوئی کسی کی کال سنے گا اور نہ ہی کسی کو کال کرے گا۔ موبائل فون اس نے...... آف کرنے کے لیے بیگ سے نکالا تھا اور اسے اچھی طرح سے یاد تھا کہ اس نے واپس موبائل فون اپنے بیگ کے اندر ہی رکھا تھا۔

"میرا موبائل فون کہاں چلا گیا؟" ماریہ خود سے بولی اور سوچ میں پڑ گئی۔ اپنے موبائل کی اچانک گمشدگی پر ماریہ کو تشویش اور پریشانی تھی لیکن شدید تھکاوٹ نے اسے مزید سوچنے کا موقع نہ دیا اور وہ بستر پر لیٹ گئی اور نیند نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔

صبح کیونکہ کام نہیں تھا اس لیے ماریہ اپنی گہری نیند سے اسی وقت اٹھی جب اس کی آنکھ خود بخود کھلی تھی۔ منہ ہاتھ دھوتے اور اپنے لیے ناشتا بناتے ہوئے وہ اپنے موبائل کے بارے میں کئی بار سوچتے ہوئے یاد کررہی تھی کہ اس نے موبائل فون کہاں رکھ دیا تھا۔

چائے کا کپ لے کر وہ باہر آگئی اور ابھی اس نے چند گھونٹ ہی لیے تھے کہ دروازے پر بیل ہوئی۔ اس کا خیال تھا کہ انجم کی ملازمہ ہوگی، کیونکہ اس وقت وہ آج کے دن بھر کا شیڈول اسی کے ہاتھ بھیجتی تھی۔ جب اس نے دروازہ کھولا تو وہ چونک گئی سامنے راشد کھڑا تھا۔

"تم؟" ماریہ نے حیرت سے کہا۔

"کیا میں اندر آسکتا ہوں؟" راشد نے اندر آنے کی اجازت چاہی۔

"کیا بات ہے، جو کہنا ہے یہاں ہی کہہ دو۔" ماریہ نے روکھے لہجے میں کہا اور دروازہ نہیں چھوڑا۔

"مجھے تم سے ضروری بات کرنی ہے۔ تمہیں یاد ہے کہ میں نے کہا تھا کہ سرمد مستقل مزاج نہیں ہے۔ وہ کبھی کوئی بھی فیصلہ کرسکتا ہے۔"

"اب کیا ہوا ہے؟ تم ایک ہی بات لے کر آجاتے ہو؟" ماریہ کو چڑ ہونے لگی تھی۔

"وہ اچانک کہیں چلا گیا ہے۔ اس کے موبائل فون بند ہیں اور ایک خبر گردش کررہی ہے کہ... سرمد نے شادی کرلی ہے۔" راشد نے گویا دھماکا کردیا اور ماریہ کے چہرے کی حیرت دوچند ہوگئی۔

"یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟" ماریہ کی حیرت کم نہیں ہورہی تھی۔

"یقین نہیں آرہا ہے تو اس کے نمبرز پر فون کرکے دیکھ لو۔ ایک بڑے نیوز چینل کا رپورٹر میرا قریبی دوست ہے۔ اسے یہ بات کئی دنوں سے معلوم تھی کہ سرمد ایک لڑکی کے ساتھ ہے اور وہ دونوں شادی کرنے والے ہیں۔ اسی نے مجھے بتایا ہے کہ اس کے ہاتھ ایک بڑی خبر لگ گئی ہے کہ سرمد نے شادی کرلی ہے۔" راشد نے بتایا۔

ماریہ کے لیے یہ خبر انتہائی کرب ناک تھی، وہ بولی۔ ’’ایسا نہیں ہوسکتا۔ اور اگر ایسا ہوا ہے تو اس وقت ٹی وی پر نیوز چل رہی ہوگی۔‘‘ یہ کہہ کر ماریہ تیزی سے ریموٹ کی طرف بڑھی۔

’’میرا وہ دوست خبر بریک نہیں کرے گا۔ وہ ایک ذمّے دار صحافی ہے۔ البتہ تم سرمد کے موبائل فون پر کال کرلو۔ اس کے دونوں فون نمبرز بند ہیں۔‘‘ راشد بولا۔

’’میرا موبائل فون کل سے کہیں گم ہوگیا ہے۔‘‘ ماریہ کے لہجے میں پریشانی تھی۔

’’یہ لو میرے موبائل فون سے کال کرلو۔‘‘ راشد نے اپنا موبائل فون اس کی طرف بڑھایا تو ماریہ نے جلدی سے موبائل فون پکڑتے ہی اس کے دونوں نمبروں پر باری باری کوشش کرلی، سرمد کے نمبرز واقعی بند تھے۔ پہلی بار ماریہ کو اس بات میں حقیقت نظر آئی کہ سرمد نے سچ میں شادی تو نہیں کرلی کیونکہ اس کے نمبرز کبھی بھی بند نہیں ہوتے تھے۔ وہ اپنے نمبرز صرف رات کو سوتے وقت بند کرتا تھا۔

’’سرمد ایک بہترین رائٹر ہے۔ اس نے کالج دور میں تیراکی سیکھی تھی کہ وہ تیراک بننا چاہتا تھا۔ ایک بار اس نے تیراک کے مقابلے میں حصہ بھی لیا تھا اور جیت بھی گیا تھا۔ لیکن اچانک اس نے پلٹا کھایا اور اس نے شطرنج سیکھی۔ وہ شطرنج کا ماہر کھلاڑی ہے... اور زندگی میں بھی مہروں کو بڑی سفاکی اور مہارت سے استعمال کرتا ہے۔ لیکن وہ واپس لکھنے کی طرف لوٹ آیا اور اس نے ایک بڑے ڈائجسٹ کے لیے ایسا قسط وار سلسلہ لکھا کہ ڈائجسٹ کی سرکولیشن محض اس کی وجہ سے آسمان کو چھونے لگی۔ ادھر اس نے وہ سلسلہ ختم کیا اور ادھر اتنی بڑی پیشکش کے باوجود پھر اس نے پلٹ کر ڈائجسٹ کی طرف نہیں دیکھا اور وہ شوبز میں آگیا۔ یہاں کامیابی کا جھنڈ الہرا کر اور تم سے منگنی کرکے اچانک غائب ہوگیا اور کسی اور سے شادی کرلی... میں نے کہا تھا نا کہ وہ مستقل مزاج نہیں ہے۔‘‘ راشد ٹھہر ٹھہر کر بتانے لگا اور ماریہ کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔

’’پھر بھی مجھے یقین نہیں آرہا ہے۔‘‘ ماریہ نے بہتے آنسوؤں میں کہا۔

’’اچھا ایک بات بتاؤ تم انجم کی بات کا کتنا یقین کرتی ہو؟‘‘ راشد نے پوچھا۔

’’بہت زیادہ۔‘‘

’’ان کی بات کا یقین کرنا بھی چاہیے۔ کیونکہ وہی تھیں جنہوں نے تمہیں سہارا دیا اور تمہارے ہاتھ میں ہنر دیا۔ اور یہ چھت بھی ان کی ہی دی ہوئی ہے۔ اگر انجم تمہیں کہہ دیں کہ سرمد نے واقعی شادی کرلی ہے تو؟‘‘ راشد کی بات نے اسے ہلا دیا۔

ماریہ نے چونک کر راشد کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ ’’انہیں کیسے پتا ہے؟‘‘

’’کیونکہ وہ رپورٹر دراصل ان کا بھانجا ہے اور سب سے پہلے انہیں ہی خبر دی تھی اور انجم کے کہنے پر ہی خبر بریک ہونے سے رکی ہوئی ہے اور اس شہر میں اس خبر سے ہم دونوں ہی باخبر ہیں۔‘‘ راشد نے نیا انکشاف کیا۔

ماریہ اس کا منہ دیکھنے لگی۔ اس کے چہرے کا کرب اور بھی بڑھ گیا تھا، اسے کہنے کو الفاظ نہیں مل رہے تھے۔

راشد نے اپنی گھڑی پر وقت دیکھا اور بولا۔ ’’انجم اس وقت سو کر اُٹھ جاتی ہیں۔ میں انہیں میسج کرتا ہوں۔‘‘ راشد اپنے موبائل فون سے ایک میسج کرنے لگا۔ ماریہ نے دروازہ بھی چھوڑ دیا تھا اور راشد اندر چلا گیا تھا۔ راشد میسج کرنے کے بعد ایک طرف بیٹھ گیا جبکہ ماریہ گم صم کھڑی تھی۔

تھوڑی دیر کے بعد بیل ہوئی۔ راشد نے دروازہ کھولا اور انجم جبیں چہرے پر ہلکا سا میک اپ کیے اندر آگئی۔

’’سوری میں نے آپ کو تکلیف دی۔ دراصل میری بات کا ماریہ کو یقین نہیں ہو رہا۔‘‘

انجم ایک پُرکشش عورت تھی۔ پچاس سال سے زائد عمر ہونے کے باوجود وہ اپنی عمر سے کہیں کم لگتی تھی۔ اس نے ایک نظر راشد کی طرف دیکھا اور پھر کہا۔ ’’راشد ٹھیک کہہ رہا ہے۔‘‘

ماریہ کے لیے اب کوئی گنجائش نہیں تھی کہ وہ انجم کی بات کا یقین نہ کرتی۔ اس کی بات سن کر ماریہ صوفے پر ہی ڈھے گئی۔

☆☆☆

راشد کی قسمت اچھی تھی کہ انجم جیسی عورت بھی اس کی مٹھی میں آگئی اور وہ ایسا کہنے پر مجبور ہوگئی تھی جیسا راشد نے کہا تھا۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ جب کل رات ماریہ کام ختم ہوتے ہی گھر جانے لگی تھی تو انجم نے کام کی زیادتی کی وجہ سے انکار کردیا تھا اور ماریہ تنہا فلیٹ تک آگئی تھی۔ ماریہ کے جاتے ہی انجم کا عاشق میک اپ روم میں آگیا تھا۔

انجم کا اس شخص کے ساتھ تقریباً دو ماہ سے چکر چل رہا تھا۔ دونوں میں یہ اچانک ہی تعلق استوار ہوگیا تھا۔ انجم شادی شدہ تھی اور اس کا شوہر اپنی کمپنی کے کام کے سلسلے میں

اکثر شہر سے باہر بھی رہتا تھا۔ اس وقت بھی وہ شہر سے باہر تھا۔ اس ملاقات کو راشد نے دیکھ لیا اور پھر وہ ان کے سر پر پہنچ گیا۔

انجم سے اس نے چپ رہنے کی قیمت یہ وصول کی تھی کہ وہ جو کہے گا، اسے ایسا ہی کہنا پڑے گا۔ یہی بات تھی کہ انجم نے وہی کہا جیسا راشد نے بولا تھا اور ماریہ کو یقین کرنا ہی پڑا۔

سرمد نے راشد کو بتایا تھا کہ وہ ہفتہ دس دنوں کے لیے اپنے گاؤں جا رہا ہے۔ راشد کے لیے یہ دن بہت اہم تھے اس لیے وہ انہیں رائگاں نہیں جانے دینا چاہتا تھا ممکن تھا کہ سرمد کی واپسی کسی بھی وقت ہو جائے۔ راشد جانتا تھا کہ وہ غیر ذمے دار نہیں ہے۔ اس نے ماریہ کے سامنے سرمد کو غیر مستقل مزاج بتایا تھا حالانکہ سرمد نے تیراکی، نشانے بازی اور شطرنج اپنے شوق کی خاطر سیکھی تھی۔ وہ ڈائجسٹ میں پلٹ کر اس لیے نہیں جا سکا تھا کہ اس کے مختلف پروڈکشنز کمپنیوں کے ساتھ ڈراما سیریل لکھنے کے معاہدے ہو چکے تھے۔ اس نے یہاں بھی ذمے داری کا ثبوت دیا تھا کہ وہ خود ماریہ کو اپنا نیا نمبر دینے آیا تھا اور ساتھ وہ ملاقات بھی کرنے آیا تھا لیکن اس کی مصروفیت کے پیش نظر اس نے ماریہ کے کام میں خلل ڈالنے کے بجائے راشد کو نمبر دے دیا تھا کیونکہ سرمد خود اپنے کام میں کسی دوسرے کی مداخلت پسند نہیں کرتا تھا لیکن شاطر راشد نے ایک نیا کھیل ہی رچا دیا تھا۔

ماریہ روتے ہوئے اپنے فلیٹ میں بند ہو گئی تھی۔ شام سے پہلے پھر راشد اس کے پاس چلا آیا۔ ماریہ کا بالکل بھی دل نہیں چاہ رہا تھا کہ وہ اس سے بات کرے لیکن وہ دروازہ کھول چکی تھی۔

”رو رو کر اپنی جان لینے کا ارادہ ہے کیا؟ جو ہو گیا اسے بھول جاؤ اور آگے کی سوچو۔“

”مجھ سے ہمدردی جتانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“ ماریہ نے صاف کہہ دیا۔

”زندگی ایسے نہیں گزرتی۔ اگر اس نے تمہیں چھوڑ دیا ہے تو تم بھی اسے چھوڑ دو۔“ راشد نے اس کی بات کی پروا کیے بغیر کہا۔

”راشد کیا تم مجھے یہی کہنے آئے ہو؟“ ماریہ کو اس کی بات اچھی نہیں لگی تھی۔ ”پلیز مجھے تنہا چھوڑ دو۔“

”میں تمہیں نہیں چھوڑ سکتا۔ جانتی ہو کہ میں کیوں نہیں چھوڑ سکتا؟ کیونکہ مجھے تمہارا احساس ہے۔ مجھے تم سے محبت ہے۔ آؤ ہم شادی کر لیں۔“ راشد نے مقصد کی بات آسانی سے کہہ دی۔

اس کی بات سن کر ماریہ نے آنکھیں نکال کر اس کی طرف دیکھا۔ ”راشد آئندہ تم ایسی بات زبان پر لانا تو دور کی بات سوچنے کی بھی غلطی نہ کرنا۔ یہ بات میں تمہیں پہلے بھی کہہ چکی ہوں، زہر لگتے ہو تم مجھے۔“ ماریہ کہہ کر اٹھی اور اس نے دروازہ کھول دیا۔ اس کا مطلب تھا کہ راشد اب دفع ہو جائے۔

”زندگی کیسے گزارو گی ماریہ؟“

”تمہیں اس کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“

”پورے شہر میں مجھ جیسا شخص تمہیں کہیں نہیں ملے گا۔“

”بھاڑ میں جاؤ تم۔“ ماریہ چیخی۔

راشد کی دانست میں تھا کہ ماریہ بھی اپنا فیصلہ بدل لے گی لیکن اس کے برعکس وہ چٹان کی طرح مضبوط کھڑی تھی۔ راشد نے کچھ سوچا اور چلا گیا۔ ماریہ نے دھڑ سے دروازہ بند کر دیا۔

☆☆☆

ماریہ فلیٹ میں بند تھی اور اس کا زیادہ وقت آنسو بہاتے ہوئے گزر رہا تھا۔ اس کے پاس موبائل فون نہیں تھا اس لیے وہ سرمد سے رابطہ کرنے کی کوشش بھی نہیں کر سکتی تھی۔

رات کے دس بجے کا عمل تھا کہ اچانک انجم جبیں کی ملازمہ نے آ کر انجم کا پیغام دیا کہ ماریہ اپنا سامان پیک کر کے میک اپ روم میں پہنچے، انہیں شوٹنگ کے لیے دوسرے شہر جانا ہے۔ ملازمہ نے یہ بھی تاکید کی تھی کہ وہ اپنے سارے کپڑے وغیرہ پیک کر لے کیونکہ انہیں پندرہ، بیس دن لگ سکتے ہیں۔

ماریہ کو حیرت ہوئی کہ اس سے قبل کہیں جانے کا کوئی ذکر نہیں ہوا تھا۔ یہ اچانک کیا ہوا؟ پھر وہ یہ سوچ کر اپنی پیکنگ کرنے لگی کہ بڑے اسٹار بھی ضد کرنے لگتے ہیں کہ وہ کسی پرفضا شہر میں جا کر شوٹنگ کریں گے۔ ایسا بھی ہوتا تھا کہ کسی پروڈیوسر کو سیریل میں بہت مالی فائدہ ہو رہا ہو تو وہ شوٹنگ خود ہی کسی دوسرے اچھے شہر میں منتقل کر دیتا تھا۔ اچانک اسکرپٹ میں تبدیلی بھی ہو جاتی تھی اور شوٹنگ کا شیڈول یکدم ہی بدل جاتا تھا۔ ایسا ایک بار اس کے ساتھ پہلے بھی ہو چکا تھا۔

ماریہ کے پاس چند کپڑوں کے جوڑے تھے اور کچھ ضروری سامان تھا۔ اس نے پیک کیا اور انجم کے بیوٹی پارلر میں پہنچ گئی۔ انجم اپنے کام میں مصروف تھی۔ اس نے ماریہ کو

اپنے آفس میں بلا لیا۔

جونہی وہ کمرے میں پہنچی، انجم جبیں نے ایک بند لفافہ اس کی طرف بڑھایا اور سپاٹ لہجے میں بغیر وقت ضائع کیے کہا۔

''اس لفافے میں تمہارے تمام بقایا جات ہیں۔ اب ہم مزید ایک ساتھ کام نہیں کریں گے اور تم اپنا رہنے کا بھی کہیں اور بندوبست کرلو۔''

انجم جبیں کی بات نے ماریہ کے پیروں تلے سے زمین نکال دی تھی۔ اس شہر میں انجم جبیں کے سوا اس کا کوئی سہارا نہیں تھا۔ وہ اس کام کے علاوہ کوئی دوسرا کام نہیں کرسکتی تھی۔ رہنے کے لیے وہ کوئی بندوبست نہیں کرسکتی تھی۔

''میم... کیا ہوا؟''

''مجھے افسوس ہے کہ اپنا فلیٹ خالی کرانے کے لیے مجھے تم سے جھوٹ بولنا پڑا۔ میرے شوہر کو یہ گوارا نہیں ہے کہ تم اس فلیٹ میں مفت رہو۔'' انجم نے کہا۔

''میں کرایہ دے دیا کروں گی۔'' ماریہ بے بسی سے بولی۔

''جتنے کرائے پر میرے شوہر نے وہ فلیٹ دیا ہے، اتنی تمہاری تنخواہ بھی نہیں ہے۔''

''مجھے کام سے کیوں نکال دیا؟ کام تو کرنے دیں۔ میں رہنے کا کوئی اور بندوبست کرلیتی ہوں۔''

''سوری میری بہن کی بیٹی آرہی ہے، اسے اب میرے ساتھ کام کرنا ہے۔'' انجم جبیں مزید بحث نہیں کرنا چاہتی تھی اس لیے وہ اُٹھ کر کھڑی ہوگئی۔

''پلیز میم... میں کہاں جاؤں گی؟ میرا اس شہر میں کوئی نہیں ہے۔ مجھے کچھ دن اپنے پاس رکھ لیں، میں کوئی اپنا بندوبست کرلیتی ہوں۔'' ماریہ کی آنکھوں سے بے بسی کے آنسو نکل آئے تھے۔

''کاش میں تمہاری مدد کرسکتی۔'' انجم کہہ کر چلی گئی۔ ماریہ کو یقین نہیں آرہا تھا کہ انجم کا دل اتنی جلدی پتھر کا ہوسکتا ہے۔

ماریہ بہت دیر تک انجم سے دوبارہ بات کرنے کی کوشش کرتی رہی لیکن انجم سے اس کی ملاقات ہو ہی نہیں سکی، وہ کہیں چلی گئی تھی۔ اسے لگ رہا تھا جیسے وہ اس جگہ بالکل اجنبی ہوگئی ہو۔ ماریہ ایک طرف بیٹھی ہوئی تھی کہ اس بیوٹی پارلر کی دیکھ بھال پر مامور سخت چہرے والی عورت نے ماریہ کا ہاتھ پکڑا اور اسے باہر لے جا کر بولی۔ ''ماریہ بی بی میری نوکری کے پیچھے کیوں پڑی ہو۔ اب کہیں اور جا کر بیٹھ جاؤ۔'' وہ کہہ کر اندر چلی گئی۔ رات کے پونے بارہ کا وقت تھا۔ ماریہ کو یہ غم کھائے جا رہا تھا کہ وہ کیا کرے اور کہاں جائے۔ اس نے شوبز میں رہتے ہوئے دوستیاں بھی نہیں بنائی تھیں۔ وہ اپنا کام کرتی تھی اور انجم جبیں تک اس کی دنیا محدود تھی۔

ماریہ نہیں جانتی تھی کہ اسے راشد کے کہنے پر ہی انجم نے نکالا ہے۔ اپنے راز کی وجہ سے انجم اس کے ہاتھ کٹھ پتلی بن گئی تھی۔ حالانکہ ایسا سب کچھ کرتے ہوئے اسے دلی رنج ہو رہا تھا لیکن اسے اپنی عزت بچانی تھی اور اپنا راز محفوظ رکھنا تھا۔ اس نے ایسا ہی کیا تھا جیسا راشد نے انجم کو کرنے کا کہا تھا۔

ماریہ ایک طرف کھڑی سوچ رہی تھی کہ وہ کیا کرے اور کہاں جائے، اس کا کوئی اور ٹھکانا ہوتا تو وہ اس جانب قدم بڑھا دیتی۔ اس کے دماغ میں یہ خیال بھی آیا کہ وہ واپس اپنے اس چھوٹے سے دور دراز شہر میں چلی جائے۔ لیکن اس کا وہاں کون تھا؟ ممانی تو پہلے ہی اسے برداشت نہیں کرتی تھی۔ ماموں نے ممانی کے قہر سے نجات کے لیے ہی تو اسے یہاں انجم کے پاس چھوڑا تھا۔

ماریہ ایک بند گلی میں کھڑی تھی۔ اس کے پاس جانے کے لیے کوئی راستہ نہیں تھا۔ وہ بغیر سوچے ایک طرف چل پڑی۔ کچھ دور جا کر وہ رک گئی۔ اس سے کچھ فاصلے پر ایک چائے کا کھوکھا تھا جہاں چند لوگ بیٹھے تھے اور ٹیلی وژن پر اونچی آواز میں ایک فلم لگی ہوئی تھی۔ وہاں دو عجیب سی شکل و صورت والے آدمی بھی بیٹھے تھے۔ دونوں نے ماریہ کو حریص نظروں سے دیکھا اور ایک دوسرے کو جانے کیا کہنے لگے۔ ماریہ ان کو دیکھ کر پریشان ہوگئی۔ دائیں بائیں سڑک ویران تھی اور اِکا دُکا کوئی کار گزر جاتی تھی۔ اچانک وہ دونوں اپنی جگہ سے اُٹھے اور ماریہ کی طرف بڑھے۔ ماریہ کا دل دھڑکنے لگا اور وہ سوچنے لگی کہ کیا کرے اسی اثنا میں ایک کار اس کے سامنے آکر رکی اور اندر راشد بیٹھا تھا۔ کار کو دیکھ کر وہ دونوں اسی جگہ رک گئے اور واپس اپنی جگہ پر بیٹھ گئے لیکن ان کی نگاہیں ماریہ پر ہی تھیں۔ پہلی بار راشد کو دیکھ کر ماریہ کے دل سے اس کے لیے اچھے الفاظ نکلے اور وہ خدا کا شکر ادا کرنے لگی۔

''کہاں جانے کی تیاری ہے؟''

راشد کا آنا ایسے ہی تھا جیسے تیز بہاؤ پانی میں کوئی ڈوب رہا ہو اور اچانک اسے بچنے کا کوئی سہارا مل جائے۔ اس وقت اسے لگ رہا تھا جیسے راشد سے بڑھ کر اس کے لیے کوئی

چارہ گر نہیں ہے۔

ماریہ کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ راشد سے کیا کہے۔ اس نے کبھی راشد سے سیدھے منہ بات ہی نہیں کی تھی۔ اب وہ اس سے اپنی پریشانی کیسے بیان کرے۔

راشد اپنی کار سے باہر نکلا۔ اس نے کار کا پچھلا دروازہ کھولا اور نرم لہجے میں بولا۔ ”کہیں جانا ہے تو میں وہاں چھوڑ آتا ہوں۔ لیکن اس وقت تم اپنے فلیٹ سے نکل کر جا کہاں رہی ہو؟“

ماریہ نے ایک نظر چائے کے کھوکھے پر بیٹھے اوباش قسم کے دونوں آدمیوں کی طرف دیکھا اور پھر وہ کار کے اندر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ”مجھے فی الحال اپنے گھر لے چلو۔“

راشد نے کار کا دروازہ بند کیا اور ایک مکارانہ مسکراہٹ اپنے چہرے پر سجا کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔

☆☆☆

راشد کا گھر ایک نئی کالونی میں تھا۔ اس کالونی میں ابھی مکمل آبادی نہیں ہوئی تھی۔ راشد کے گھر کے آس پاس بھی کئی پلاٹ خالی تھے۔ راشد نے ابھی حال ہی میں وہ گھر تعمیر کرایا تھا۔ راشد نے اپنے گھر میں باؤنڈری وال بنوائی تھی اور اس کے درمیان دو منزلہ گھر کھڑا تھا۔ گھر کی ہر کھڑکی پر آہنی گرل لگی ہوئی تھی۔ اور دروازے مضبوط تھے۔ راشد اپنے گھر میں اکیلا ہی رہتا تھا۔ اس نے کار سے باہر نکل کر گیٹ کھولا اور کار اندر لے گیا۔ گیٹ بند کر دیا اور ماریہ اپنا سامان لے کر اس کے ساتھ اندر چلی گئی۔

ماریہ ایک طرف بیٹھ گئی۔ راشد نے اسے پینے کے لیے ایک گلاس پانی کا دیا اور پھر پوچھا۔

”اگر تم چاہو تو مجھے بتا سکتی ہو کہ اچانک اس طرح سڑک پر کھڑی ہونے کا کیا مقصد تھا؟“

پانی پینے کے بعد ماریہ بولی۔ ”میں نے تم سے کبھی سیدھے منہ بات ہی نہیں کی۔ اگر رات نہ ہوتی تو میں شاید تم سے مدد نہ مانگتی۔“

”مجھے تمہاری کسی بات پر کوئی غصہ نہیں ہے۔ تم مجھے جو بھی غصے میں کہتی تھیں میں اسی وقت بھول جاتا تھا کیونکہ مجھے تم سے محبت ہے۔“ راشد کا لہجہ ریشم کی طرح ملائم تھا۔

ماریہ چپ ہو گئی۔ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد راشد نے پھر پوچھا کہ وہ اس وقت کہاں جانے کے لیے نکلی تھی۔ تب ماریہ نے جو کچھ اس کے ساتھ ہوا اسے بتا دیا۔ راشد ایسے سنتا رہا جیسے وہ اس تمام معاملے سے بے خبر ہو۔ جب ماریہ نے اپنی بات مکمل کر لی تو راشد نے پوچھا۔

”اب کیا ارادہ ہے؟ واپس جانا چاہتی ہو تو میں صبح تمہیں بس میں بٹھا دیتا ہوں۔ اور اگر اسی شہر میں اسی شعبے میں کام کرنا چاہتی ہو تو میں تمہیں انجم کے سامنے کھڑا ہونے کا موقع دے سکتا ہوں۔ تم جانتی ہو کہ میں ایسا کر سکتا ہوں۔ تم یقین کر لو کہ میں تمہیں اس حال میں بھی اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔ چاہے تم مجھ سے نفرت کرو، یا سیدھے منہ بات بھی نہ کرو۔“

جو کچھ اچانک انجم نے اس کے ساتھ کیا تھا، وہ ماریہ کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ راشد کی صورت میں اسے ایک بہترین اور مضبوط سہارا مل سکتا تھا۔ واپسی کی کشتیاں جل چکی تھیں۔ سرمد نے چپ چاپ اسے چھوڑ کر شادی کر لی تھی۔ راشد اس کے لیے فرشتہ ثابت ہوا تھا اگر وہ اس وقت نہ آتا تو جانے کیا ہو جاتا۔ راشد ایسی چال کھیل چکا تھا کہ ماریہ خود بخود اس کے جال میں آ چکی تھی۔

”کیا تم نے واقعی میری کسی بات کا برا نہیں منایا تھا؟“ ماریہ نے پوچھا۔

”بالکل بھی نہیں۔ اب میں تمہیں شادی کا نہیں کہوں گا بلکہ مخلص ہو کر تمہاری مدد کروں گا۔“ راشد بولا۔

ماریہ چپ ہو گئی۔ راشد اپنی جگہ سے اُٹھا اور اپنا لیپ ٹاپ اُٹھا لایا۔ اسے آن کر کے اس نے ایک فائل کھولی اور لیپ ٹاپ کا رخ ماریہ کی طرف کر دیا۔ راشد کا ایک دوست کمپیوٹر میں بہت ماہر تھا۔ اس کی مدد سے ایک تصویر تیار کی تھی۔ سرمد ایک خوبصورت دلہن کے ساتھ خوشگوار موڈ میں کھڑا تھا۔ ماریہ نے دیکھا تو اس کی آنکھیں بھیگ گئیں اور وہ کھڑی ہو کر بولی۔

”آپ مجھے میرے کمرے کا بتا سکتے ہیں۔“

راشد نے ماریہ کو کمرے تک چھوڑا اور عجیب انداز سے مسکرا کر اس نے اپنے آپ کو شاباشی دی اور وہاں سے چلا گیا۔

☆☆☆

راشد کے بڑے سے گھر میں رہتے ہوئے ماریہ کو دو دن ہو گئے تھے۔ راشد اپنے کام پر چلا جاتا تھا اور رات کو کسی وقت بھی اس کی واپسی ہو جاتی تھی۔ گھر میں کسی سے رابطہ کرنے کے لیے کوئی فون نہیں تھا۔ راشد کا ماریہ کے ساتھ سلوک ایسا تھا کہ ماریہ یہ سوچنے پر مجبور ہو گئی تھی کہ وہ اتنے اچھے انسان کے لیے اپنے دل میں نرم گوشہ کیوں نہیں رکھ سکی اور اس نے ہمیشہ راشد کو برا انسان ہی کیوں سمجھا۔

راشد روز ماریہ سے پوچھتا تھا کہ وہ کیا کرنا چاہتی ہے۔

ابھی تک ماریہ نے کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا، لیکن ایک خیال نے ماریہ کو مضطرب کر دیا۔ وہ سوچنے لگی تھی کہ اس کے پاس کہیں جانے کے لیے کوئی راستہ نہیں ہے، اس کا کوئی ٹھکانا نہیں ہے وہ واپس بھی نہیں جا سکتی تو پھر کیوں نا وہ راشد سے شادی کر کے ہمیشہ کے لیے اسی گھر میں رہ جائے۔ یہ سوچتے سوچتے اس نے اپنے فیصلے سے راشد کو بھی آگاہ کر دیا۔ یہ سنتے ہی راشد کے دل میں لڈو پھوٹا اور اس نے ماریہ کی اجازت سے اسی دن نکاح کا انتظام کر دیا۔

راشد اور ماریہ میاں بیوی کے رشتے میں منسلک ہو گئے۔ دونوں کا نکاح راشد کے انتہائی قریبی دوستوں کی موجودگی میں ہوا تھا۔ نکاح کے بعد راشد کا چہرہ یکدم ہی بدل گیا۔ جہاں نرمی دکھائی دیتی تھی اب وہاں سختی براجمان ہو گئی۔ اس نے نکاح ہوتے ہی اپنا بناوٹی نقاب اتار پھینکا اور اس کا اصل چہرہ اپنی جگہ پر آ گیا۔

نکاح کے دو گھنٹے بعد راشد نے کہا۔ ”میں کام پر جا رہا ہوں، رات کو واپس آؤں گا۔“

راشد کے جانے کے بعد ماریہ سوچنے لگی کہ وہ کیا کرے۔ اس نے سوچا کہ وہ اچھا سا کھانا تیار کرتی ہے کہ راشد خوش ہو جائے گا۔ وہ کچن میں گئی تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ وہاں کھانے پکانے کا سامان غائب تھا۔ گھی، چینی، مرچ مصالحہ کچھ بھی نہیں تھا۔ فریج کھولا تو وہ بھی خالی تھا حالانکہ فریج میں گوشت اور پھل موجود تھے۔ اچانک سب کچھ کہاں چلا گیا۔ ماریہ حیرت سے سوچنے لگی۔

☆☆☆

شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے۔

ماریہ نے نہا دھو کر اچھا سا سوٹ پہنا اور آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر وہ خود ہی ہلکا سا میک اپ کرنے لگی۔ ماریہ کے چہرے پر سجے ہلکے میک اپ نے اس کی خوبصورتی میں اور بھی اضافہ کر دیا تھا۔

ماریہ کو بھوک لگ رہی تھی۔ اس نے ایک بار پھر متلاشی نگاہوں سے کچن اور فریج کو دیکھا لیکن پانی کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔

ماریہ کے پاس راشد سے رابطہ کرنے کا بھی کوئی بندوبست نہیں تھا۔ وہ کرسی پر بیٹھ گئی اور ٹیلی وژن دیکھنے لگی۔ جیسے ہی ٹیلی وژن کی اسکرین روشن ہوئی سرمد کے سیریل کا پرومو چلتا دکھائی دیا۔ اور جب تحریر کے خانے میں سرمد کا نام آیا تو ماریہ کی آنکھوں میں ریت کے ذرّے اُتر آئے۔ اس نے ٹی وی بند کر دیا۔

ماریہ نے کبھی ٹہل کر اور کبھی بیٹھ کر راشد کے آنے کا انتظار کیا۔ راشد رات آٹھ بجے آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک شاپر تھا اور شاپر میں سے اُٹھتی ہوئی خوشبو بتا رہی تھی کہ وہ کھانے کے لیے کوئی مزے دار چیز لے کر آیا ہے۔

”بور تو نہیں ہوئیں؟“ راشد نے آتے ہی خوشگوار لہجے میں پوچھا۔

”بہت زیادہ۔“ ماریہ نے صاف گوئی سے کام لیا۔

”بھوک لگ رہی ہے؟“ راشد نے اگلا سوال کر دیا۔

”بھوک اس قدر ہے کہ لگتا ہے میں گر جاؤں گی۔“ ماریہ بولی۔

”تم بیٹھو میں کھانا نکال کر لاتا ہوں۔ بریانی اور شامی لے کر آیا ہوں۔ مجھے بہت پسند ہے۔“ راشد کچن کی طرف بڑھا۔

”لائیں میں نکال کر لاتی ہوں۔“ ماریہ نے کہا۔

”نہیں تم بیٹھو۔“ راشد کہہ کر اندر چلا گیا۔ ماریہ اسی جگہ بیٹھ گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد راشد ایک ٹرے میں ایک پلیٹ بریانی، دوسری پلیٹ میں دو عدد شامی، رائتا اور پانی کا ایک گلاس لے کر آ گیا۔

اس نے ٹرے میز پر رکھ دی۔ ایک فرد کا کھانا دیکھ کر ماریہ کو حیرت ہوئی لیکن دوسرے ہی لمحے وہ دل ہی دل میں مسکرا دی کہ شادی کے ابتدائی ایام میں میاں بیوی ایک ہی پلیٹ میں کھانا زیادہ پسند کرتے ہیں۔

راشد بھی بیٹھ گیا۔ ”کیسی مزے دار خوشبو آ رہی ہے۔ یہ اس شہر کی سب سے اچھی بریانی ہے۔ میں کئی بار کھا چکا ہوں اور جب بھی مجھے بریانی کھانی ہوتی ہے تو میں سیدھا اس کی دکان کا رخ کرتا ہوں۔“

”پلیز کھانا کھائیں بہت بھوک لگ رہی ہے۔“ ماریہ سے صبر نہیں ہو رہا تھا اور اپنے سامنے بریانی دیکھ کر اس کی بھوک اور بھی چمک اُٹھی تھی۔

”کھانا کھانے سے پہلے مجھے تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔“ راشد نے اطمینان سے کہا۔ ماریہ اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔

راشد مسکرایا اور اس کی مسکراہٹ ماریہ کو بڑی عجیب لگی۔ پھر وہ بولا۔ ”جانتی ہو میں تمہیں کب سے چاہتا تھا؟ اس وقت سے جب تم نے سرمد کی لکھی پہلی سیریل میں میک اپ آرٹسٹ انجم جبیں کے ساتھ کام کیا تھا۔ میں تمہیں گھنٹوں دیکھتا تھا اور تمہاری صورت دیکھنے کے لیے بے چین ہو جاتا تھا۔ کئی ماہ میری خاموش محبت میرے دل میں پلتی

رہی اور سرمد نے تمہاری انگلی میں انگوٹھی پہنا کر تمہیں اپنی منگیتر بنالیا اور میں دیکھتا ہی رہ گیا۔"

ماریہ کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ ان باتوں کا کیا جواب دے۔

"سرمد میرا دوست تھا لیکن کسی بھی ناپسندیدہ بات پر وہ بے عزتی بھی کردیا کرتا تھا۔ سرمد نے دو دفعہ میری بے عزتی بھی کی تھی اور ایک بار اس نے سیٹ پر میرے منہ پر تھپڑ بھی جما دیا تھا اور جب اس کا غصہ ٹھنڈا ہوا تو اس نے مجھے اپنے فلیٹ میں بلایا اور معذرت کرتے ہوئے مجھے اپنے ساتھ بٹھا کر رات کا کھانا بھی کھلایا تھا۔ تب میں ہنستا رہا اور یہ کہہ کر بات ختم کردی کہ غلطی میری ہی تھی۔ لیکن میں وہ راشد ہوں جو نفرت کی قبر بنا کر اپنے دل میں رکھتا ہوں اور وقت آنے پر وہ قبر کھود کر انتقام کی آگ جلا دیتا ہوں۔" راشد نے آخری جملہ اس خطرناک انداز میں کہا کہ ماریہ کے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی، وہ متوحش نگاہوں سے راشد کی طرف دیکھنے لگی۔ ماریہ کے سامنے یکدم اس کا ایک نیا روپ آگیا تھا۔

کچھ دیر کی خاموشی کے بعد راشد نے پھر کہا۔ "پہلے میں تم سے محبت کرتا تھا۔ تمہیں اپنانا چاہتا تھا لیکن جب سرمد نے تمہیں انگوٹھی پہنائی تو میں نے طے کرلیا تھا کہ تمہیں اب بھی اپنا بناؤں گا، اس سے چھین کر تمہیں اس گھر میں سرمد کی محبوبہ کے طور پر رکھوں گا۔ اپنی بیوی بنا کر بھی تمہیں اپنی بیوی کا درجہ نہیں دوں گا۔ بلکہ تمہیں اذیت دوں گا اور خوش ہوں گا کہ میں سرمد کی محبوبہ کو تکلیف دے رہا ہوں۔ اس ماریہ کو اذیت دے رہا ہوں جسے سرمد چاہتا ہے اور جس ماریہ نے سرمد کو اتنی اہمیت دی کہ اسی کی ہوگئی۔ تم نے کبھی میرے ساتھ سیدھے منہ بات نہیں کی، مجھ سے ہمیشہ نفرت کی اور مجھے کبھی حیثیت نہیں دی۔ اور جب تم پر زمین تنگ ہوئی تو تم نے پناہ کے لیے مجھے استعمال کرتے ہوئے مجھ سے شادی کرلی کہ رہنے کے لیے چھت مل جائے گی۔" راشد کا لہجہ زہر آلود ہوگیا تھا۔ ماریہ کے چہرے پر حیرت برس رہی تھی۔ اس کے گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ راشد اپنے دل میں ایسی سوچ دبائے بیٹھا ہے۔

راشد نے اس کی طرف نفرت آمیز نگاہوں سے دیکھا اور بریانی کھانی شروع کردی۔ وہ ایسے بریانی کھا رہا تھا جیسے وہ اکیلا ہی بیٹھا ہو۔ کھاتے کھاتے اس نے ماریہ کی طرف دیکھا۔

"تم اس گھر میں اپنے آپ کو قیدی سمجھو۔ جس طرح تم خود بخود میرے پاس آگئی تھیں میں تمہیں بغیر شادی کیے بھی اس گھر میں قید کرسکتا تھا۔ لیکن بیوی بنا کر تمہیں قید میں رکھنا اور پھر تم پر کسی بات پر تشدد بھی کردینا قابلِ گرفت نہیں ہوگا۔ مجھ پر کبھی اغوا کا کیس نہیں بن سکے گا۔" راشد کہہ کر پھر کھانے لگا۔ ماریہ کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ وہ بت بنی اسے دیکھے جارہی تھی۔ وہ مزے سے بریانی کھا رہا تھا۔

"اس گھر میں کوئی فون نہیں ہے کہ کسی سے تم رابطہ کرسکو۔ فرار ہونے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ ہر کھڑکی کے آگے مضبوط گرل ہے اور مین دروازہ بہت مضبوط ہے، اس کے بعد گیٹ ہے جو لوہے کا ہے۔ دیواریں اونچی ہیں کہ تم فرار نہیں ہوسکتیں۔" راشد چپ ہوا اور کھانے لگا۔ ماریہ کا ساکت جسم ایسا تھا جیسے بے جان ہوگیا ہو۔

بریانی کھانے کے بعد پلیٹ میں چند لقمے بچ گئے تھے۔ اس نے پلیٹ ماریہ کے آگے رکھ دی۔

"تم نے سرمد سے محبت کی، اس کی سزا تمہیں بھی ملے گی اور سرمد کو بھی۔ پلیٹ میں بریانی چھوڑ رہا ہوں، کھالو۔" راشد اپنی جگہ سے اُٹھا اور لمبی سی ڈکار لیتا ہوا اس جگہ سے چلا گیا۔

ماریہ کا دل پھٹ چکا تھا اور وہ سوچ رہی تھی کہ اس کے ساتھ یہ کیا ہوگیا ہے؟ زندگی کی ایسی کایا پلٹ گئی تھی کہ وہ جیسے تخت سے تختہ پر آگئی تھی۔ زندگی کی سانس زہر بن کر گھونٹ گھونٹ اس کے حلق کے نیچے اُترنے لگی۔

راشد ہاتھ دھو کر واپس آیا اور قدرے ماریہ کی طرف جھک کر زہر آلود لہجے میں بولا۔ "اب میں تمہیں بتاؤں گا کہ نفرت کیا ہوتی ہے۔"

راشد دس منٹ کے بعد اپنے کمرے سے باہر نکلا اور ماریہ کو گھر کے اسٹور میں لے گیا، جو تقریباً خالی ہی تھا۔ ایک کونے میں کچھ کاٹھ کباڑ ایک دوسرے کے اوپر رکھا ہوا تھا۔ فرش پر ایک پرانی چٹائی اور گندا سا سرہانہ اور جانے کب کا دھویا ہوا بدبودار کمبل رکھا ہوا تھا۔

"آج سے تم یہاں سویا کرو گی۔" راشد تمسخر سے مسکرایا اور چلا گیا۔

ماریہ کی ممانی ایک سخت گیر عورت تھی لیکن اس نے بھی کبھی ماریہ کو سونے کے لیے ایسا بستر نہیں دیا تھا۔ وہ رات ماریہ نے کانٹوں پر گزاری۔ صبح ہوتے ہی راشد نے دروازہ بجایا اور رعب سے بولا۔

"کچن میں دو انڈے اور بریڈ پڑی ہے۔ میرے لیے دو انڈے فرائی کردو اور ایک اچھا سا کپ چائے کا بنادو۔

میں نہا لوں۔ اور یاد رکھنا میرے نہانے سے پہلے سب کچھ تیار ہو۔''

راشد باتھ روم میں چلا گیا اور ماریہ جلدی جلدی کچن کی طرف دوڑی۔ آگ جلانے کے لیے وہ ماچس تلاش کرنے لگی۔ ایک ایک چیز دیکھ لی لیکن ماچس کہیں نظر نہ آئی۔ راشد پہلے ہی ماچس کچن سے اُٹھا کر لے گیا تھا۔

جس انداز میں راشد نے کہا تھا کہ نہانے سے پہلے ناشتا تیار ہو، وہ انداز اس قدر خوفناک تھا کہ ماریہ کی سانس پھول چکی تھی، ماچس تلاش کرتے ہوئے۔ راشد نہا کر آ بھی گیا۔ یکدم راشد کو دیکھ کر ماریہ کا سانس ہی رک گیا۔

اس نے آتے ہی پوچھا۔ ''ناشتا تیار ہو گیا؟''

''ماچس نہیں ملی۔'' ماریہ کے چہرے پر گھبراہٹ تھی۔

''ماچس نہیں ملی؟ کہاں چلی گئی۔'' راشد کچن میں داخل ہوتے ہوئے غرایا اور ماچس جیب سے نکال کر غیر محسوس انداز میں نیچے گرا دی۔ راشد نے متلاشی نگاہوں سے دائیں بائیں دیکھا اور پھر فرش پر نظر ڈالتے ہی بولا۔ ''یہ کیا پڑی ہے؟''

ماریہ کی نظر فوراً فرش پر چلی گئی۔ ماچس موجود تھی۔ ماریہ جیسے ہی ماچس اُٹھانے کے لیے جھکی، اسی اثنا میں راشد نے اس کے بال پکڑے اور پوری قوت سے اس کا سر دیوار کے ساتھ مار دیا۔

ماریہ کی چیخ نکل گئی۔ سر پھٹ چکا تھا۔ وہ رونے لگی۔

''میں نے تمہیں کہا تھا کہ میرے آنے سے پہلے ناشتا تیار ہو۔'' راشد ایک بار پھر غرایا اور اس نے مُکا اس کے منہ پر دے مارا۔ ایک بار پھر ماریہ کی چیخ نکلی اور وہ نیچے گر گئی۔ اسے لگا جیسے اس کا جبڑا ٹوٹ گیا ہو۔ اس کے چہرے پر فوراً نیل کا نشان واضح ہونے لگا۔ راشد نے اسے بالوں سے پکڑ کر اُٹھایا اور بولا۔

''تم نے مجھے فالتو سمجھا ہے۔ تمہارے آگے میری حیثیت یہ ہے کہ اگر تمہارے پاس سرمد ہے تو میری کوئی قدر ہی نہیں اور جب اس نے چھوڑ دیا تو میں تمہارے لیے اہم ہو گیا۔ جب انجم نے اپنے فلیٹ اور نوکری سے بے دخل کر دیا تو مجھ سے شادی کر لی کہ رہنے کو گھر مل جائے۔ یہ باتیں ہر مار پر میں تجھے یاد دلاتا رہا ہوں گا۔'' راشد نے کہہ کر اسے باہر کی طرف دھکا دے دیا اور کچن کا دروازہ بند کر کے اپنے لیے ناشتا تیار کرنے لگا۔

ماریہ کا سر پھٹ چکا تھا اور خون اس کی گردن تک آ گیا تھا۔ وہ بمشکل اُٹھی اور اسٹور روم میں جا کر اس نے اپنا دوپٹا اس جگہ باندھ دیا جہاں سے سر پھٹا تھا۔

راشد نے ناشتا کیا، کپڑے بدلے اور اسٹور کا تھوڑا سا دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔ ماریہ نے اپنے سر پر کپڑا باندھا ہوا تھا اور اس کا چہرہ سوج چکا تھا اور ایک طرف نیل کا نشان واضح دکھائی دے رہا تھا۔

راشد اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ ''کچن میں کچھ ناشتا بچا پڑا ہے۔ کھا لینا۔ میں جا رہا ہوں۔ اپنا خیال رکھنا۔''

راشد نے جانے کے لیے قدم بڑھائے اور پھر رک کر پلٹا۔ ''کچن میں، میں نے سبزی رکھی ہے۔ اچھی طرح دھو کر اس کی ہنڈیا تیار کر دینا۔ آج زیادہ کام نہیں ہے میں رات آٹھ بجے تک آ جاؤں گا۔ دو روٹیاں بھی بنا دینا۔ اور یاد رکھنا میرے آنے سے پہلے سالن تیار ہو اور روٹی کے لیے آٹا گوندھا ہوا ہو۔ میں آؤں گا تو گرم روٹی بنانا۔'' راشد حکم دے کر چلا گیا۔ اس نے مین دروازہ بھی باہر سے مقفل کر دیا اور گیٹ کو بھی تالا لگا دیا تھا۔

☆☆☆

ماریہ نے رات آٹھ بجے سے پہلے ہنڈیا تیار کر دی تھی۔ آٹا بھی گوندھ دیا تھا۔ سوا آٹھ بجے کے قریب راشد گنگناتا ہوا آ گیا۔ اس نے آتے ہی آواز لگائی۔

''ماریہ ڈارلنگ کہاں ہو؟ سالن تیار ہے؟''

''جی۔'' ماریہ کی گھبرائی ہوئی آواز نکلی۔

''میں منہ ہاتھ دھونے جا رہا ہوں۔ دس منٹ ہیں تمہارے پاس، میرے لیے دو روٹیاں تیار کر دو، یاد رکھنا صرف دس منٹ ہیں۔'' راشد کہہ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

ماریہ نے جلدی سے وقت دیکھا اور اس کے ہاتھ بجلی سی تیزی سے چلنے لگے۔ اس کے سر میں شدید درد تھا۔ کپڑا باندھنے سے اس کا بہتا ہوا خون رک گیا تھا لیکن تکلیف ابھی تک تھی۔ چہرے پر سوجن اور نیل کا نشان واضح تھا۔

دس منٹ میں ایک ہی روٹی تیار ہوئی تھی اور دوسری روٹی اس نے توے پر ڈالی تھی کہ راشد کچن میں آ گیا۔ اس نے اپنی کلائی کی گھڑی میں وقت دیکھا اور بولا۔ ''دس منٹ ہو چکے ہیں لیکن تم نے دو روٹیاں نہیں پکائیں۔''

''میں پکا رہی ہوں۔'' ماریہ ڈر گئی۔

''تم ڈری اور سہمی کتنی اچھی لگ رہی ہو ماریہ۔ جانتی ہو جب ایک دن میں نے تمہارا نام لیا تو سرمد نے مجھے ڈانٹ دیا کہ میں ماریہ کا نام عزت سے لوں۔ یعنی ماریہ جی کہوں۔ مجھے بڑا غصہ آیا تھا لیکن اس وقت میں اپنا غصہ پی گیا تھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY PAKSOCIETY1 PAKSOCIETY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN

اب تم نے دس منٹ میں دو روٹیاں نہیں پکائیں، اس غلطی کی سزا کے ساتھ اس دن کا غصہ بھی آج ہی نکلے گا۔"

راشد نے یکدم اسے جنونی انداز میں کھینچا اور چیختی چلاتی ماریہ کو سیڑھیوں سے نیچے دھکا دے دیا۔ ماریہ لڑھکتی ہوئی نیچے گرنے لگی اور نیچے گرتے ہی اس کا سر دیوار سے ٹکرایا اور اس کی چیخ نکل گئی۔

راشد اوپر کھڑا ہنسا۔ "سرمد کو جب پتا چلے گا کہ میں تم سے کتنا پیار کرتا ہوں تو اسے کتنا دکھ ہوگا۔ وہ سوچے گا کہ ماریہ سے شادی کر کے اسے پیار تو میں دینا چاہتا تھا۔"

راشد ہنسا۔ اس کے دل میں ماریہ کی تکلیف کا خفیف احساس بھی نہیں پیدا ہوا تھا۔

راشد کچن کی طرف چلا گیا۔ ماریہ تکلیف سے چور تھی۔ وہ اپنی جگہ سے اُٹھنے کی کوشش کر رہی تھی کہ راشد آگ بگولا ہاتھ میں جلی ہوئی روٹی لیے آ گیا۔ جس وقت راشد نے اسے کھینچا تھا اس وقت ایک روٹی توے پر تھی اس لیے وہ جل گئی۔ راشد برق رفتاری سے نیچے آیا اور اس نے آتے ہی اپنے پاؤں کی ٹھوکر ماریہ کے دے ماری۔ ماریہ چیختی ہوئی دور جا گری۔ اس کی پسلیوں میں شدید اور ناقابلِ برداشت درد اُٹھا۔

"تم نے روٹی جلا دی۔ دیکھو کیسے کوئلہ ہو گئی ہے روٹی۔ بلاؤ اب سرمد کو۔ اس سرمد کو جس نے مجھے کہا تھا کہ میں تمہارا نام عزت سے لوں۔ اب دیکھو میں نے تمہیں اپنے پیر کی ٹھوکر پر رکھا ہوا ہے۔" وہ چلا رہا تھا۔

راشد کے نتھنے غصے سے پھول چکے تھے۔ ماریہ کو کوئی ہوش نہیں تھا۔ راشد نے کچھ دیر ماریہ کی طرف دیکھا اور وہاں سے چلا گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد راشد گنگناتا ہوا اپنے لیے روٹی پکا رہا تھا۔ جب اس نے روٹی پکا لی تو کھانا ٹرے میں سجا کر کھانے کی میز کی طرف جاتے ہوئے بڑے خوشگوار لہجے میں پکارا۔

"ماریہ... ماریہ جی... ڈارلنگ... آجاؤ دیکھو میں نے روٹی پکا لی ہے اور تم میرے ساتھ بیٹھ کر کھا لو۔" ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے راشد کوئی نفسیاتی مریض ہو۔ جو پل میں قہر آلود اور دوسرے لمحے نرم ہو جاتا تھا لیکن اس کے دل میں کیا تھا، اس کا علم کسی کو نہیں ہوتا تھا۔

ماریہ جو درد کی وجہ سے بے ہوش ہو چکی تھی اور اب اسے ہلکا ہلکا ہوش آ رہا تھا۔ راشد کی آواز اس کی سماعت میں پڑ رہی تھی۔ اس کے جسم میں حرکت ہونے لگی۔ وہ اُٹھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ راشد کا خوف اس کے دل و دماغ میں تھا۔

"ماریہ ڈارلنگ... کہاں ہو آجاؤ۔" راشد جو مزے سے بیٹھا کھانا کھا رہا تھا، ساتھ ساتھ ماریہ کو بڑے پیار سے آوازیں بھی دے رہا تھا۔

روٹی کے چند لقمے اس نے چھوڑ دیے تھے۔ پلیٹ میں تھوڑا سا سالن بھی تھا۔ اس نے ٹرے ایک طرف دھکیل دی اور پھر بولا۔

"میں باہر جا رہا ہوں، چہل قدمی کے لیے۔ دو دن کے بعد میرا سخت شوٹنگ شیڈول شروع ہونے والا ہے۔ گھر سے جانے اور واپس آنے کا کوئی وقت نہیں ہوگا۔ میرے پاس دو دن ہیں مستی کرنے کے لیے۔ اسی لیے تو میں اپنی نئی نویلی دلہن کے ساتھ مستی کر رہا ہوں۔" راشد کہہ کر ہنسا اور پھر بولا۔ "میں چہل قدمی کر آؤں تب تک تم کھانا کھا لو۔ سرمد اگر یہ دیکھ لے کہ میں تمہارا کتنا خیال رکھتا ہوں۔ تمہیں کھانے کو کیا دیتا ہوں تو وہ حیرانی میں ڈوب جائے۔"

راشد نے پھر اپنے ہونٹوں پر ہنسی بکھیری اور اتراتا ہوا چلا گیا۔

ماریہ کی حالت بری ہو رہی تھی۔ اس کا پورا جسم درد سے دکھ رہا تھا۔ اس سے ہلنا بھی دوبھر ہو رہا تھا۔ رات کو جانے کب راشد چہل قدمی کر کے واپس آیا اور سیدھا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ سردی بڑھ رہی تھی۔ جس کی وجہ سے ماریہ کے جسم کا درد بھی دوچند ہو گیا تھا۔ گرم کمبل میں لیٹنا ماریہ کے لیے ناگزیر ہو گیا تھا۔ بمشکل جیسے تیسے کر کے وہ اُٹھی اور اپنی زندہ لاش کو اپنے کندھے پر ڈالے اسٹور روم تک پہنچی اور پھر پرانے کمبل میں گھس گئی۔ ماریہ کو ایک بار پھر کوئی ہوش نہ رہا کہ وہ کہاں ہے اور کس حال میں لیٹی ہوئی ہے۔

رات کے آخری پہر میں راشد نے ایک دھماکے سے دروازہ کھولا اور چلایا۔

"ماریہ اُٹھو اور میرے لیے ایک گلاس پانی کا لے کر آؤ مجھے پیاس لگی ہوئی ہے۔"

راشد نے ایسی آواز میں حکم دیا تھا کہ ماریہ کی آنکھ کھل گئی اور وہ ڈری ہوئی بمشکل اُٹھی۔ جیسے تیسے کچن تک گئی، پانی کا گلاس بھرا اور راشد کے کمرے میں چلی گئی۔

"ایسے ہی گلاس اُٹھا لائی ہو، جاؤ جا کر پہلے گلاس کسی پلیٹ پر رکھو اور میرے پاس لے کر آؤ۔" راشد نے دیکھتے ہی درشت لہجے میں حکم دیا۔ اس حکم کی تکمیل کے لیے ماریہ کا

کچن میں جانا اور واپس آنا پل صراط کے سفر کے مانند تھا۔ وہ پانی کا گلاس پلیٹ میں رکھے اس کے سامنے کھڑی تھی اور راشد پانی پینے کے بجائے بیڈ پر نیم دراز تھا۔

راشد نے تکبرانہ مسکراہٹ عیاں کی اور بولا۔ ”تم نے سرمد سے منگنی کرنے میں اتنی جلدی کی، مجھے کچھ کہنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ اتنی جلدی تمہیں نہیں کرنی چاہیے تھی۔ ویسے ایک بات بتاؤں۔ سرمد نے شادی نہیں کی تھی۔ میں نے تم سے جھوٹ بولا تھا۔ سرمد تو اپنی ماں کی تیارداری کے لیے گیا ہوا ہے۔ دیکھو میرا دماغ کتنا ذہین ہے کہ میں نے ایسی بساط بچھائی کہ تمہیں اپنی بیوی بنالیا۔“ راشد کہہ کر ہنسا اور ماریہ کے لیے یہ انکشاف بہت ہی زیادہ حیران کن تھا۔

راشد اپنے چہرے پر عجیب سی مسکراہٹ سجاتے ہوئے بولا۔ ”تمہارا یہ حسن اور شباب میرے سامنے ہے جو سرمد اپنے نام کر چکا تھا۔ تم نے کیونکہ مجھے سرمد کے مقابلے میں نمبر دو حیثیت دی ہے اس لیے تمہارا حسن اور شباب پیچھے اور میرا انتقام آگے ہے۔ تمہیں اذیت دینے میں ابھی مجھے مزہ آرہا ہے، جب اذیت دینے سے میرا دل اکتا جائے گا تو پھر تمہارا حسن اور شباب بھی دیکھ لوں گا۔“ وہ کہہ کر پھر ہنسا۔ جیسے وہ پاگل ہوگیا ہو۔ اس کی باتوں کے بجائے ماریہ کا دھیان تو اس بات پر منجمد تھا کہ سرمد نے شادی نہیں کی بلکہ وہ اپنی بیمار ماں کی تیارداری کے لیے گیا ہوا ہے۔ لیکن جانے سے پہلے اس نے مجھ سے رابطہ کیوں نہیں کیا؟ اس سوال نے ماریہ کو مزید سوچنے پر مجبور کردیا تھا۔

وہ پھر بولا۔ ”جانتی ہو میری شادی پہلے بھی ہوچکی تھی۔ وہ شادی میرے ماں باپ نے اپنی پسند سے کی تھی، تب میں اپنے شہر میں اپنے والدین اور بہن بھائیوں کے ساتھ رہتا تھا۔ مجھے میری بیوی ایک نظر بھی پسند نہیں آئی۔ جانتی ہو میں نے کیا کیا؟“ راشد نے کہہ کر سوالیہ نگاہوں اور مکارانہ مسکراہٹ سے اس کی طرف دیکھا۔ جب ماریہ چپ رہی تو وہ خود ہی بولا۔ ”میں نے اسے زہر دے کر خودکشی کا ڈراما رچا دیا اور وہ ڈراما اتنا کامیاب ہوا کہ آج تک پولیس مجھے اس کے قتل کے الزام میں پکڑ نہیں سکی۔ حالانکہ وہ انسپکٹر... کیا نام تھا اس کا... جلیس احمد... ہاں بالکل یہی نام تھا اس کا۔ وہ میرے پیچھے چپک ہی گیا تھا۔ اس کی تفتیش شیطان کی آنت کی طرح طویل ہوتی جارہی تھی، اسے شک ہوگیا تھا لیکن ثبوت کوئی نہیں تھا۔ میں بھی ہوشیار تھا، ایک بھی ثبوت نہیں چھوڑا تھا اور بچ گیا، بے چارہ پولیس والا دانت پیستا رہ گیا تھا۔“ اس کی گردن فخر سے تن گئی۔

وہ اپنی حقیقت خود ہی ماریہ کے سامنے منکشف کر رہا تھا۔ اس کا روپ دیکھ کر ماریہ کو بہت حیرت ہورہی تھی۔ کچھ توقف کے بعد وہ بولا۔

”جانتی ہو میں نے تمہیں یہ سب کیوں بتایا ہے؟ کیونکہ یہ گھر تمہاری قبر ہے۔ اس گھر کی چار دیواری سے نکلنا اب تمہارے لیے ناممکن ہے۔ باہر کی دنیا تمہارے لیے ختم ہوچکی ہے۔ اور تمہیں میں مار دوں گا۔ کیونکہ تمہاری سزا موت ہی ہے۔ جب میں نے تمہیں کہا تھا کہ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں تو تم نے مجھے بری طرح سے جھاڑ دیا تھا۔ دیکھو اچانک میں نے انجم کو اس کے عاشق کے ساتھ پکڑ لیا اور اس کا راز نہ کھولنے کی قیمت اس سے یہ وصول کی کہ جیسا میں نے کہا ویسا اس نے کیا اور تمہیں میرے کہنے پر فلیٹ اور نوکری سے نکال دیا۔“

اس کی یہ بات سن کر تو ماریہ کا منہ ششدر رہ گیا۔ اس کی آنکھیں اس کے مکار اور شاطر چہرے پر جم کے رہ گئیں۔

”سرمد اپنی ماں کی تیارداری کے لیے گیا تھا تو اس نے مجھ سے رابطہ کیوں نہیں کیا تھا؟“ جانے ماریہ کے اندر کہاں سے ہمت آئی اور اس نے کیسے اپنے اندر گرم پانی کی طرح ابلتا ہوا سوال کر ڈالا۔

اس کا سوال سن کر راشد نے گھور کر اس کی طرف ایسے ہی دیکھا جیسے کسی کے جسم پر گرم پانی کے چھینٹے پڑ جائیں اور وہ تکلیف سے دیکھنے لگے۔

”اس نے اپنے نمبر اس لیے بند کردیے تھے کہ اسے کوئی ڈسٹرب نہ کرے اور جو نمبر غیر معروف تھا وہ نمبر مجھے دے گیا تھا کہ میں تمہیں دے دوں، جو کہ میں نے تمہیں نہیں دیا۔ اس کے علاوہ کوئی اور سوال کرنا ہے تو کرلو۔ کیونکہ تم مرنے والی ہو۔ میں تمہیں مار دوں گا۔ تمہاری موت مجھے سکون دے گی جب میں سرمد کو تمہاری جدائی میں ٹوٹتے ہوئے دیکھوں گا تو مجھے بہت لطف آئے گا۔“ اس نے جواب دینے کے بعد درشت لہجہ اپنا لیا۔ ماریہ چپ کھڑی رہی۔

کچھ توقف کے بعد راشد نے ہاتھ جھٹک کر کہا۔ ”چلی جاؤ اور پانی بھی لے جاؤ۔“ ماریہ ایک بار پھر جیسے تیسے اپنے اسٹور میں پہنچ گئی۔

سرمد کے بارے میں حقیقت جان کر اسے بہت رنج ہوا تھا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ راشد ایک ظالم شخص تھا۔ جس کے سینے میں دل نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ وہ اپنی سابقہ بیوی کے قتل کا واقعہ کتنا خوش ہو کر سنا رہا تھا۔ ماریہ یہ

بھی جانتی تھی کہ وہ اب واقعی اس گھر سے بھی نہیں نکل سکے گی۔ کیونکہ اس گھر کی ہر کھڑکی پر آہنی گرل ہے اور اونچی دیواروں کے ساتھ مضبوط لوہے کا گیٹ ایستادہ تھا۔ راشد نے ٹھیک کہا تھا کہ یہ گھر اس کی قبر ہے۔

☆☆☆

صبح ہوتے ہی کسی نے زور سے اپنا پیر اس کی ٹانگ پر مارا تو ماریہ ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھی۔ اس کا انگ انگ درد میں ڈوبا ہوا تھا۔ جانے کس پہر نیند نے اسے اپنی آغوش میں لیا تھا۔ ماریہ نے دیکھا کہ راشد اپنی قہر آلود شکل کے ساتھ کھڑا تھا۔

''نہانے جارہا ہوں۔ میرے لیے ایک کپ چائے کا بناؤ۔''

راشد حکم دے کر چلا گیا۔ ماریہ بمشکل اُٹھی اور کچن تک چلی گئی۔ وہ زخمی تھی۔ اس کا سر دو جگہ سے پھٹا ہوا تھا اور ماریہ نے خون روکنے کے لیے جو دوپٹا سر پر باندھا تھا وہ بھی اس نے اتار دیا تھا کیونکہ خون رک گیا تھا لیکن درد شدید تر تھا۔

ماریہ نے اپنی طرف سے کوشش کر کے چائے جلدی جلدی بنائی اور کپ میں ڈال کر راشد کے آنے کا انتظار کرنے لگی۔

ماریہ کے لیے کچن میں کھڑے رہنا دوبھر تھا لیکن وہ راشد کے خوف سے دیوار سے ٹیک لگائے کھڑی تھی۔ آدھا گھنٹا گزر گیا تھا لیکن راشد نہیں آیا تھا۔ مزید دس منٹ گزرے تو راشد تیار ہو کر آگیا۔ اس نے آتے ہی چائے کا کپ اُٹھایا اور گھونٹ بھرتے ہی غرایا۔

''ٹھنڈی چائے...'' اس کے ساتھ ہی اس نے کپ میں موجود چائے اس کے چہرے پر پھینک دی۔ چائے ٹھنڈی ضرور ہوئی تھی لیکن اتنی بھی نہیں کہ ماریہ کو تکلیف نہ ہوتی۔ ماریہ تکلیف سے چلا اُٹھی۔

''میں ٹھنڈی چائے پیتا ہوں۔ تجھے عقل نہیں ہے۔'' وہ چلایا اور اس نے کپ بھی فرش پر دے مارا۔ ماریہ کپ ٹوٹنے کے شور سے ڈر گئی۔

''جارہا ہوں۔'' راشد کہہ کر باہر نکلا اور گیٹ کے پاس پہنچ کر وہ پھر دبے پاؤں مین دروازے کے پاس آیا اور اندر جاتے ہی اس نے دروازہ بغیر آہٹ پیدا کیے بند کیا اور ہولے ہولے قدم اُٹھاتا، بھاگنے کے انداز میں اپنے کمرے میں چلا گیا۔ ماریہ کو حیرت تھی کہ اس نے محض اس پر غصہ ہی کیوں کیا، اس بار اس نے اسے پیٹا کیوں نہیں؟

آدھا گھنٹا تک ماریہ کچن میں بیٹھی رہی۔ پھر وہ بمشکل باہر نکلی اور ٹی وی لاؤنج میں کھڑی ہو کر سوچنے لگی کہ وہ کیا کرے۔ اس اذیت سے وہ کیسے چھٹکارا حاصل کرے؟ اگر اس نے کچھ نہ کیا تو راشد اسے مار دے گا۔ وہ سرمد سے ملنا چاہتی تھی۔

اس گھر سے فرار ہونا اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔ پھر بھی اس نے ہمت کرنے کا سوچا اور مین دروازے کی طرف چلی گئی۔ وہ جانتی تھی کہ مین دروازہ باہر سے مقفل ہوتا تھا۔ لیکن آج جیسے ہی اس نے مین دروازے کا ہینڈل گھمایا، وہ کھل گیا۔ اپنے کمرے میں کھڑا راشد تھوڑا سا دروازہ کھولے مزے سے سب کچھ دیکھ رہا تھا۔

ماریہ کے لیے یہ حیرت کی بات تھی کہ مین دروازہ مقفل نہیں تھا۔ وہ باہر چلی گئی۔ گیراج عبور کرنے کے بعد اس نے گیٹ دیکھا وہ مقفل تھا۔ اس نے باؤنڈری وال کی طرف دیکھا وہ اتنی اونچی تھی کہ اس کے لیے اوپر چڑھ کر دوسری طرف کودنا بالکل ہی ممکن نہیں تھا۔

وہ چلائی۔ ''کوئی ہے... کوئی ہے جو میری مدد کر سکے۔ کوئی ہے جو مجھے اس ظالم سے چھٹکارا دلا سکے... کوئی ہے...'' ماریہ چلائی لیکن ارد گرد کوئی ہمسایہ نہیں تھا اور اس کی آواز کسی کی سماعت تک نہیں گئی۔

مایوس ہو کر جیسے ہی وہ واپس جانے کے لیے مڑی راشد مین دروازے میں کھڑا اس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ ماریہ اس کو دیکھتے ہی ڈر گئی اور اس کی نگاہیں اس پر منجمد ہو گئیں۔

''یہاں کوئی سننے والا نہیں ہے۔ اندر آجاؤ... آؤ میں تمہاری مرہم پٹی کر دوں۔ کل میں دو دن کے لیے آؤٹ ڈور شوٹنگ کے لیے چلا جاؤں گا۔ تم اکیلی ہو گی۔ اندر آجاؤ۔'' غیر متوقع طور پر راشد کا لہجہ نرم تھا۔

ماریہ زندہ لاش کی طرح اس کے پیچھے اندر چلی گئی۔ اس وقت اسے اور بھی زیادہ حیرت ہوئی جب اس نے میز پر مرہم پٹی کا سامان دیکھا۔ راشد نے اسے کندھے سے پکڑ کر کرسی پر بیٹھایا، اس کے سر کا زخم صاف کیا اور کسی ڈاکٹر کی طرح مرہم پٹی کر دی۔

اس کام سے فارغ ہو کر راشد نے کہا۔ ''کچن میں کھانے پینے کا سامان موجود ہے۔ جو چاہو کھاؤ۔ تمہاری دوائیاں میں نے کچن میں رکھ دی ہیں۔ تمہارا درد بھی دور ہو جائے گا۔'' راشد کا لہجہ ایسا تھا جیسے اس جیسا حلیم شخص ہی کوئی نہ ہو۔ لہجے میں مٹھاس تھی اور اپنائیت تھی۔ ماریہ سوچنے لگی کہ اس شخص کے ساتھ کوئی نفسیاتی مسئلہ ہے۔ یہ

اُلجھن بھی اس وقت دور ہوگئی جب راشد نے کچھ دیر کی خاموشی کے بعد اپنا منہ کھولا۔

''میں نے سوچا کہ اب تم پر کوئی تشدد نہیں کروں گا۔ دو دن کے لیے میں شہر سے باہر شوٹنگ کے لیے جا رہا ہوں۔ تم گھر میں موجود پھل کھانا اور جلدی سے ٹھیک ہوجانا۔ پھر ہم ہنی مون منائیں گے۔''

ماریہ کا ابہام دور ہوگیا۔ وہ اپنی طمع کے لیے یہ سب کر رہا تھا۔ وہ پھر بولا۔ ''مجھے تم میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ مجھے تم سے شادی کرنی تھی، سرمد سے تمہیں چھیننا تھا، وہ میں نے چھین لیا۔ تمہاری غلطیوں کی سزا دینی تھی وہ میں نے ابھی تھوڑی سی دے دی ہے۔ واپسی پر میں تمہیں ایسی سزا دوں گا کہ تم ہمیشہ کے لیے یہاں سے آزاد ہوجاؤ گی۔'' راشد کی بات سن کر ماریہ کانپ کر رہ گئی تھی۔

راشد کہہ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اس نے اپنا ضروری سامان پیک کیا اور بیگ کو ایک طرف رکھ کر اس نے پورے گھر کا جائزہ لیا، باؤنڈری وال کو دیکھا اور مطمئن ہوکر سر ہلا دیا۔ اسے یقین تھا کہ ماریہ اس کی غیر موجودگی میں کسی صورت اس گھر سے نہیں نکل سکتی۔

راشد کو کہیں نہیں جانا تھا اس لیے اس نے گھر میں اپنی پسند کی فلمیں دیکھنے کا سوچا اور ٹیلی وژن کے آگے بیٹھ گیا۔

☆☆☆

جس وقت راشد اپنے گھر بیٹھا بے فکری سے فلمیں دیکھ رہا تھا، اس وقت سرمد کی کار اسٹوڈیو میں داخل ہوئی اور اس نے کار سے باہر قدم رکھ کر دائیں بائیں متلاشی نگاہ دوڑائی۔ سرمد تقریباً ڈھائی گھنٹے قبل واپس آیا تھا۔ اس نے آتے ہی ماریہ اور پھر راشد کو فون کیا تھا۔ دونوں کے ہی فون بند تھے۔ انجم جبیں بھی جانے کہاں مصروف تھی کہ سرمد کا اس سے بھی رابطہ نہیں ہو رہا تھا۔ سرمد کو ماریہ سے ملنے کی بے چینی تھی۔

سرمد نے اپنے گاؤں جا کر جب اپنی ماں کو دیکھا تو وہ اتنی بیمار نہیں تھیں جتنا کے اسے بتایا گیا تھا۔ اپنی ماں کے پاس دو گھنٹے بیٹھنے کے بعد سرمد نے باہر نکل کر ماریہ کو فون کیا تھا تو اس کا نمبر بند تھا۔ پھر اس نے راشد کا نمبر ملایا لیکن وہ بھی بند تھا۔ انجم کا نمبر اس کے پاس نہیں تھا۔ اس کے بعد جتنے دن بھی سرمد وہاں رہا، وہ مسلسل ماریہ اور راشد کو فون کرتا رہا لیکن کسی سے بھی اس کا رابطہ نہیں ہوا۔

سرمد کی ماں ٹھیک تھی۔ وہ کچھ دن وہاں رہا اور پھر واپس آگیا۔ [illegible] نہ ملنے پر سرمد اسٹوڈیو آگیا تھا۔ دائیں بائیں پتا کرنے پر راشد کے بارے میں اسے کچھ پتا نہیں چلا تھا۔ وہ کسی سے ماریہ کے بارے میں نہیں پوچھ سکتا تھا۔ اس لیے جب اس نے انجم کے بارے میں دریافت کیا تو سرمد کو پتا چلا کہ وہ شہر سے باہر گئی ہوئی ہیں۔

سرمد نے سوچا اور پھر راشد کے گھر جانے کے لیے اپنی گاڑی کا رخ اس جانب موڑ لیا۔ سرمد نے راشد کے گھر کی بیل دی تو گیٹ پر ہونے والی تیز بیل نے راشد کو چونکا دیا لیکن دوسرے ہی لمحے اسے یاد آیا کہ اس نے پیزا کا آرڈر دیا تھا۔ اس نے اپنے پرس سے ہزار کا نوٹ نکالا اور وہ اُٹھ کر گیٹ کے پاس پہنچا اور پوچھا۔

''کون ہے بھئی۔''

''میں سرمد ہوں، گیٹ کھولو۔'' باہر سے سرمد کی آواز نے راشد کو بری طرح سے چونکا دیا۔ اس کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ باہر سرمد ہوگا۔ اس کی دانست میں تو پیزے والا تھا۔ اگر وہ پوچھنے سے قبل گیٹ کے شیشے سے دیکھ لیتا تو وہ گیٹ ہی نہ کھولتا۔ سرمد بیل دے کر چلا جاتا لیکن اب اس سے غلطی ہوگئی تھی۔

''ایک منٹ... گیٹ کی چابی لے کر آیا۔'' راشد کو کہنا ہی پڑا اور وہ تیزی سے اندر بھاگا۔

ماریہ کچن میں کچھ کھا رہی تھی۔ اسے کھانے کا موقع ملا تھا تو اس نے اس سے گریز کرنے کے بجائے اپنی بھوک اور نقاہت مٹانے کے لیے کھانا پینا شروع کر دیا تھا۔

راشد اسے بازو سے پکڑ کر کھینچتا ہوا مین دروازے کے ساتھ والے کمرے میں لے گیا۔ وہ غیر ارادی طور پر بول رہا تھا۔ ''کم بخت سرمد کہاں سے آگیا...''

سرمد کا نام سن کر جیسے ماریہ کے بے جان جسم میں جان آگئی تھی۔ راشد نے اسے اندر لے جاتے ہی فرش پر بٹھایا اس کے ہاتھ پیچھے کی طرف باندھے، منہ میں کپڑا ٹھونس کر اوپر دوپٹا باندھ دیا کہ وہ بول نہ سکے اور پھر اس کی ٹانگیں بھی کس کر باندھ دیں۔ راشد نے باہر نکل کر دروازہ مقفل کر دیا اور تیزی سے گیٹ کے پاس جا کر گیٹ کھول دیا۔

''اتنی دیر لگا دی تم نے گیٹ کھولنے میں؟''

''وہ چابی نہیں مل رہی تھی۔'' راشد زبردستی مسکرایا۔ ٹھیک اسی وقت پیزا والا آگیا۔ راشد نے اس کی طرف گھور کر دیکھا۔ اس نے طوعاً وکرہاً پیزے کے پیسے دیے اور پیزا لے کر گیٹ بند کر دیا۔

وہ سرمد کو لے کر اندر آگیا۔ دونوں لاؤنج میں بیٹھ

گئے۔

''تم اچانک آگئے۔ ماں جی کا کیا حال ہے؟'' راشد کے اندر گھبراہٹ تھی۔

''وہ ٹھیک ہیں اس لیے جلدی آ گیا۔ تمہارا موبائل فون بند ہے۔''

''آج کام نہیں تھا کل دو دن کے لیے آؤٹ ڈور شوٹنگ کے لیے جا رہا ہوں۔''

''اس سے پہلے بھی تمہارا نمبر بند تھا۔''

''ہاں وہ میں نے سم بدل لی تھی۔ نیا نمبر نہیں ہے تمہارے پاس؟''

''خیر چھوڑ دیہ بتاؤ کہ ماریہ کا نمبر کیوں بند ہے۔''

''ماریہ کا نمبر بند ہی ہوگا۔'' راشد نے یکدم اپنی آنکھیں گھما کر کہا۔

''کیوں۔'' سرمد نے اس کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا

Downloaded From Paksociety.com

''کیونکہ اس نے تمہارے جانے کے بعد شادی کرلی اور غائب ہوگئی۔'' راشد نے ڈھیلا سا منہ بنا کر کہا۔

''کیا کہہ رہے ہو تم؟'' سرمد نے آنکھیں نکال کر اس کی طرف دیکھا۔

''میں وہی کہہ رہا ہوں جو ہوا ہے۔'' راشد بولا۔

''کس سے شادی کی اُس نے اور کیوں؟'' سرمد کو اس کی بات کا یقین نہیں آرہا تھا۔

''اتنا پتا ہے کہ اس نے کسی سے شادی کرلی ہے۔ کوئی بزنس مین ہے۔ وہ کون ہے میں نہیں جانتا۔'' راشد سوچتے ہوئے بولا۔

''تم جھوٹ کہہ رہے ہو۔'' سرمد کا چہرہ سرخ ہوگیا۔

''مجھے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے۔ چاہو تو ابھی انجم کے پاس چلے جاتے ہیں اور اس سے پوچھ لو۔ جس کا اس نے راتوں رات فلیٹ خالی کر دیا تھا۔ وہ بے چاری اس کی منتیں کرتی رہ گئی لیکن ماریہ نے ایک بھی اس کی نہیں سنی تھی۔'' راشد کا لہجہ پُراعتماد تھا۔

سرمد کے لیے یہ بات ناقابلِ یقین تھی۔ اس کا دل بے چین ہوگیا لیکن اسے یقین نہیں آرہا تھا۔ ان کی باتیں آہستہ آواز میں ماریہ کے بند کمرے تک پہنچ رہی تھیں۔ کچھ باتوں کی اسے سمجھ آرہی تھی اور کچھ باتوں کا بالکل پتا نہیں چل رہا تھا۔ جلدی میں ماریہ کے ہاتھ اتنی مضبوطی سے نہیں بندھ سکے تھے اس لیے ماریہ کوشش کررہی تھی کہ اس کے ہاتھ کسی طرح سے آزاد ہوجائیں۔

''میں پیزا نکال کر لاتا ہوں۔'' راشد نے پیزا اُٹھانا چاہا۔

''نہیں مجھے کچھ نہیں کھانا ہے۔ تم ابھی میرے ساتھ چلو۔'' سرمد کھڑا ہوگیا۔

''کہاں چلنا ہے؟'' راشد نے پوچھا۔

''انجم سے جاکر پوچھتے ہیں۔'' سرمد بولا۔ ''اسے پتا ہوگا۔''

''چلو ابھی اس کے پاس چلے جاتے ہیں۔'' راشد کھڑا ہوگیا۔ وہ خود چاہتا تھا کہ وہ یہاں سے جلدی سرمد کو لے کر نکل جائے۔ ان کے چلنے کی آواز اس کے کمرے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ ماریہ کوشش کررہی تھی کہ وہ کسی طرح سے اپنے ہاتھ آزاد کرانے میں کامیاب ہوسکے۔ ایک بھی اس کا ہاتھ آزاد ہوجائے تو وہ اپنے منہ میں ٹھونسا ہوا کپڑا نکال کر چیخ سکتی تھی۔

سرمد اچانک اس کمرے کے دروازے کے پاس رک گیا جہاں ماریہ قید تھی۔ سرمد نے پوچھا۔

''ماریہ کا کوئی رشتے دار بھی تھا، کیا نام تھا اُس کا؟''

''وہ اس کا سوتیلا ماموں تھا۔ اسی نے تو ماریہ سے جان چھڑائی تھی۔ وہ اس کا بوجھ نہیں اُٹھا سکتا تھا۔ وہ خود ایک معمولی لائٹ مین تھا۔ جیسے ہی ماریہ اپنے کام میں سیٹ ہوئی وہ اسے چھوڑ کر چلا گیا۔'' راشد کہہ کر مین دروازے کی طرف بڑھا۔ سرمد بھی اس کے پیچھے چل پڑا۔ ماریہ کے بندھے ہوئے ہاتھ سرعت سے حرکت کررہے تھے لیکن وہ اپنے آپ کو آزاد کرانے میں ناکام رہی تھی۔

باہر نکل کر راشد نے مین دروازے اور گیٹ کو اچھی طرح سے مقفل کردیا۔ سرمد کی کار باہر کھڑی تھی۔ دونوں کار میں سوار ہوگئے اور سرمد نے کار آگے بڑھادی جبکہ ماریہ ایک ہاتھ آزاد کرانے کے بعد اپنا دوسرا ہاتھ بھی آزاد کراچکی تھی اور اب وہ اپنے پیروں کی رسی کھول رہی تھی۔ لیکن وہ جانتی تھی کہ اس کی کوشش بے سود گئی ہے کیونکہ سرمد جاچکا تھا۔ اُسے بہت دیر ہوگئی تھی۔ راشد نے بھی گھر سے نکل کر سکھ کی سانس لی تھی۔ گاڑی انجم کے بیوٹی پارلر کی طرف جارہی تھی اور راشد کی اُنگلیاں اپنے موبائل فون پر برق رفتاری سے حرکت کررہی تھیں، وہ انجم کو میسج لکھ رہا تھا۔

☆☆☆

راشد اپنا بندوبست پہلے ہی کرچکا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ جب سرمد واپس آئے گا تو وہ ماریہ کو تلاش کرے گا اور اس کی تلاش انجم تک بھی جائے گی۔ اس لیے اس نے انجم کو پہلے

ہی آگاہ کر دیا تھا کہ اگر سرمد اس کے پاس ماریہ کے بارے میں جاننے کے لیے آیا تو اسے کیا جواب دینا ہے۔ مزید اس نے اپنے موبائل فون سے اسے پیغام بھیج کر ہوشیار کر دیا تھا۔

انجم جبیں اپنے کام میں مصروف تھی۔ اس نے راشد کے ہاتھوں بلیک میل ہو کر ماریہ کو نکال تو دیا تھا لیکن اس کی کمی اسے شدت سے محسوس ہو رہی تھی۔ جتنی جلدی ماریہ نے اپنے کام پر عبور حاصل کر کے انجم کا تقریباً سارا کام سنبھالا ہوا تھا، وہ صلاحیت اس کی کسی دوسری شاگرد میں نہیں تھی اس لیے انجم کو ایک پچھتاوا بھی تھا۔

انجم ان دونوں کو...... ایک کمرے میں لے آئی۔ سرمد نے پوچھا۔ ”ماریہ کہاں ہے؟“

”مجھے معلوم نہیں ہے۔ وہ مجھے اچانک چھوڑ کر چلی گئی تھی۔“ جھوٹ بولتے ہوئے انجم کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔

”اچانک وہ کیسے جا سکتی ہے؟“ سرمد سوچنے لگا۔

”سنا ہے کہ اس کا کسی بڑے کاروباری شخص کے ساتھ تعلق تھا۔“ انجم نے جھجکتے ہوئے راشد کا بتایا ہوا جھوٹ اپنی زبان پر لا کر سرمد کی طرف دیکھا۔ سرمد کے چہرے پر ایک تغیر آیا اور دوسرے ہی لمحے وہ گزر گیا۔

”مجھے یقین نہیں آ رہا ہے کہ وہ ایسا بھی کر سکتی ہے۔ میرا دل ان باتوں کو ماننے سے انکاری ہے۔“ سرمد بولا۔

”لیکن حقیقت یہی ہے۔“ راشد نے اس کا شک دور کرنے کے لیے کہا۔

انجم خاموش اپنے ہاتھوں کی اُنگلیاں... اضطراری کیفیت میں دبا رہی تھی۔ سرمد غیر محسوس انداز میں انجم کی اس حرکت کو دیکھ رہا تھا۔

”ماریہ ایسی نہیں ہے۔ وہ ایسا نہیں کر سکتی۔ مجھے تم دونوں کی باتوں پر یقین نہیں ہے۔“ سرمد کا ٹھوس لہجہ دونوں کے لیے گھبراہٹ کا باعث بن رہا تھا۔ ”کیا ماریہ نے آپ سے خود یہ کہا تھا کہ وہ شادی کرنے جا رہی ہے؟“

انجم اس سوال سے گھبرا گئی۔ ”اس کے جانے کے بعد افواہیں گردش کر رہی تھیں۔“ انجم کو سمجھ نہ آئی تو اس نے یہی جواب دے دیا۔ جبکہ راشد چاہتا تھا کہ وہ ٹھوس جواب دے۔

”تم وہ بات بتاؤ جب تم نے اس سے جانے کی وجہ بار بار جاننا چاہی تو اس نے کیا کہا تھا کہ وہ اپنا گھر بسا رہی ہے۔ تم نے اس سے کہا کہ تمہاری شادی سرمد سے ہونے والی ہے تو اس نے کیا جواب دیا تھا... بتاؤ۔ چھپا کیوں رہی ہو؟“ راشد نے گویا انجم کو کہنے کے لیے ہموار راستہ دینے کی کوشش کی۔

انجم پر گھبراہٹ غالب تھی۔ اس کا ذہن الجھا ہوا تھا اس لیے جلدی میں وہ بولی۔ ”اس نے کہا تھا کہ... وہ جانا چاہتی ہے اور شادی کرنا چاہتی ہے۔“

سرمد نے محسوس کیا کہ انجم کے الفاظ اس کی زبان کا ساتھ نہیں دے رہے ہیں۔ اس کے ہاتھوں میں بھی بے چینی تھی اور چہرہ بھی گھبراہٹ میں ڈوبا ہوا تھا۔ سرمد ایک لکھاری تھا۔ دوسروں کو اپنی نظر سے جانچنے کا معیار عام لوگوں سے اس کے اندر زیادہ تھا۔ اس لیے اس نے مزید سوال کرنے کے بجائے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ مجھے جانا چاہیے.... فی الحال مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہی ہے۔ آؤ راشد میں تمہیں تمہارے گھر چھوڑ دوں۔“ سرمد اپنی جگہ سے اُٹھا۔

”میں کچھ دیر اپنے آفس رکوں گا۔ میں شام کو آؤٹ ڈور کے لیے جا رہا ہوں۔ اب آیا ہوں تو آفس سے اپنا کچھ سامان لے جاؤں۔“ راشد کہتا ہوا اُٹھا اور اس کے ساتھ ہی باہر آ گیا۔ دونوں چلتے ہوئے کار تک پہنچے پھر راشد نے ہاتھ ملایا اور ایک طرف چلا گیا۔ انجم کا بیوٹی پارلر اسٹوڈیو کے پاس ہی ایک بڑے پلازہ میں تھا۔ اس لیے راشد پیدل ہی اپنے آفس کی طرف چلا گیا۔

سرمد اپنی کار میں بیٹھ گیا۔ وہ کچھ دیر تک بیٹھا ماریہ کے بارے میں سوچتا رہا۔ زندگی میں پہلی بار اس نے کسی لڑکی سے محبت کی تھی اور اس کا ذکر اس نے اپنی ماں سے بھی کر دیا تھا اور وعدہ کیا تھا کہ وہ جلد ماریہ کو ان سے ملوانے کے لیے لے کر آئے گا۔ اس کی ماں یہ سن کر بہت پُرجوش ہو گئی تھی۔

سرمد کو کچھ شک تھا کہ کوئی گڑبڑ ضرور ہے جس پر راشد اور انجم پردہ ڈالنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اپنے اس تجسس کو ختم کرنے کے لیے وہ انجم سے اکیلے میں ملنا چاہتا تھا۔ اس لیے دس منٹ تک اپنی کار میں بیٹھا رہنے کے بعد سرمد باہر نکلا اور انجم کے بیوٹی پارلر کی طرف چل پڑا۔

سرمد جیسے ہی اس کے بیوٹی پارلر میں داخل ہوا تو ملازمہ نے بتایا کہ وہ اپنے آفس میں بیٹھی ہے۔ سرمد اس کے آفس کی طرف چلا گیا۔ اس کے آفس میں پہلے ایک کالے شیشے والا دروازہ آتا تھا اور پھر ایک مختصر سی راہداری عبور کرنے کے بعد سامنے دکھائی دینے والا دروازہ انجم کے آفس کا تھا۔

سرمد جیسے ہی دروازہ کھول کر راہداری میں داخل ہوا، انجم کے آفس کا تھوڑا سا دروازہ کھلا ہوا تھا اور اندر سے انجم

کی تیز آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ وہ کہہ رہی تھی۔

”میں نے ماریہ پر ظلم کیا ہے۔ اور یہ ظلم تم نے کرایا ہے۔ تمہارے کہنے پر میں نے اسے اپنے فلیٹ اور نوکری سے نکالا۔ تمہارے کہنے پر میں نے سرمد سے جھوٹ بولا کہ اس نے کسی کے ساتھ شادی کرلی ہے۔“

”میں نے کون سا ظلم کرایا ہے؟“ راشد کی بے پروا آواز آئی کیونکہ وہ سرمد سے الگ ہوتے ہی پلازہ کی دوسری طرف واقع دروازے سے انجم کے بیوٹی پارلر میں پہنچ گیا تھا۔ ”جب میں نے اسے کہا کہ میں تمہیں پسند کرتا ہوں اور تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں تو اس نے انکار ہی نہیں کیا بلکہ مجھے کہا کہ وہ سرمد کے علاوہ کسی اور کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی اور جب سرمد اپنے گاؤں گیا تو مجھے موقع مل گیا اور اس کے ساتھ مجھے یہ بھی موقع مل گیا کہ تم اپنے عاشق کے ساتھ میری نظر میں آگئی تھیں اور چپ رہنے کی تم سے میں نے تھوڑی سی قیمت وصول کی ہے۔ اگر تم میری بات کا انکار کر دیتیں تو میں تمہارے شوہر کو بتا دیتا کہ تمہارا چکر کس کے ساتھ چل رہا ہے۔“

”جانے وہ کیسے منحوس لمحے تھے جب مجھ سے وہ غلطی ہوئی تھی۔ اور اس غلطی کی میں نے توبہ بھی کرلی ہے۔ میں نے اپنے اس تعلق کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا ہے۔ لیکن ماریہ جیسی معصوم لڑکی مجھے شاید پھر کبھی نہ ملے۔“ انجم شاید رو دی تھی۔

”اب رونا دھونا بند کرو۔ اب تمہیں کوئی جھوٹ بولنے کی ضرورت نہیں پڑے گی کیونکہ سرمد اب دوبارہ تم سے پوچھنے کچھ نہیں آئے گا۔ ماریہ میرے گھر میں ہے۔ وہ میری بیوی ہے۔ وہ باہر نہیں نکل سکتی، اس کی آخری سانس میرے اس گھر سے ہی نکلے گی اس لیے تمہیں گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے لیکن تم سرمد کے سامنے بہت گھبرا گئی تھیں۔ تمہاری کوئی بھی غلطی میرے لیے مصیبت بن سکتی تھی۔ آئندہ اگر سرمد تمہارے پاس آئے تو ہوشیار رہنا ورنہ تمہاری ازدواجی زندگی برباد ہونے میں دیر نہیں لگے گی۔“ راشد نے کہا۔

”میرا دل چاہتا ہے میں سرمد کو سب کچھ بتا دوں۔“

”اگر تم نے ایک لفظ بھی منہ سے نکالا تو یاد رکھنا تمہارے شوہر کو جو کچھ میں بتاؤں گا، تمہارے پیروں کے نیچے سے زمین نکل جائے گی۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ میں تجھے جان سے ہی مار دوں۔ قتل کرنا میرے لیے کوئی نئی بات نہیں ہے۔“ راشد کا لہجہ انتہائی سفاک ہوگیا تھا کہ انجم کانپ کر رہ گئی۔ سرمد کے علم میں جو کچھ آیا تھا وہ اس کے لیے بہت حیران کن تھا۔ وہ ایک لکھاری تھا۔ اپنی کہانی میں کب کیا کرنا ہے، وہ خوب جانتا تھا۔ اس وقت زندگی کے قرطاس پر اس کی حقیقی کہانی بکھری ہوئی تھی۔ اس کہانی کو سمیٹنا کس طرح ہے اس نے ایک لمحے میں سوچا اور اس جگہ سے ہٹ گیا۔

☆☆☆

رات دس بجے راشد اپنے یونٹ کے ساتھ آؤٹ ڈور شوٹنگ کے لیے روانہ ہوگیا۔ اس کی واپسی کل رات کسی وقت تھی۔ جانے سے پہلے راشد نے گھر کی ایک ایک چیز دیکھی تھی۔ مین دروازے اور گیٹ کو اچھی طرح سے مقفل کیا تھا۔ ماریہ کو ہدایت کی تھی کہ وہ خوب کھائے پیے اور اس گھر میں جہاں چاہے سو جائے۔ ماریہ کے لیے وہ گھر ایک جیل تھی اور وہ جانتی تھی کہ اس جیل سے فرار اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔

جب راشد اپنے یونٹ کے ساتھ بس میں سوار ہو رہا تھا تو سرمد ایک ایسی جگہ پر براجمان تھا جہاں سے وہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ جیسے ہی ان کی کوسٹر اس جگہ سے روانہ ہوئی، سرمد تیزی سے اپنی کار کی طرف بڑھا اور کار میں بیٹھتے ہی وہ سیدھا راشد کی کالونی پہنچ گیا۔ سرمد کی کار اس کا ڈرائیور چلا رہا تھا۔ کار سے باہر نکلتے ہی سرمد نے ڈرائیور سے کہا۔

”تم جاؤ۔ جب میں فون کروں تو اسی جگہ آجانا۔“

ڈرائیور چلا گیا اور سرمد چلتا ہوا راشد کے مکان تک پہنچ گیا۔ باؤنڈری وال کافی اونچی تھی۔ سرمد نے دائیں بائیں دیکھا۔ دور تک ہُو کا عالم تھا۔ جہاں جہاں کوئی گھر بنا تھا وہاں روشنی دکھائی دے رہی تھی۔ ورنہ ہر طرف اندھیرا تھا۔ سرمد بھی اندھیرے کا حصہ لگ رہا تھا۔ اس کالونی کا واحد چوکیدار جانے کہاں لیٹا نیند کے مزے لے رہا تھا۔

وہ اس گھر کے عقب میں آگیا۔ کچھ فاصلے پر ایک پلاٹ کی بنیادیں بنی ہوئی تھیں اور کچھ انٹیں بھی بچی پڑی تھیں۔ سرمد نے وہاں سے انٹیں اُٹھا کر اس گھر کی دیوار کے ساتھ لگا کر رکھنا شروع کر دیں۔ اب وہ انٹیوں کی ڈھیری کی مدد سے اوپر چڑھ سکتا تھا۔ سرمد نے دیکھتے ہی دیکھتے ایک جست لگائی اور دیوار کے اوپر چڑھ کر دوسری جانب کود گیا۔

کچھ دیر وہ رک کر جائزہ لیتا رہا۔ سرمد نے کھڑکی کی گرل کو پکڑا اور اس کی مدد سے اوپر چڑھنے لگا۔ وہاں سے اس نے پرنالے کو ہاتھ ڈالا اور پھر اوپر کی منزل کی کھڑکی آگئی اور وہاں سے چڑھتا ہوا وہ گھر کی چھت تک پہنچ گیا۔

گھر کی چھت کشادہ تھی۔ سیڑھیوں پر لکڑی کا مضبوط

دروازہ تھا جو اندر سے بند تھا۔ سرمد نے اپنے کوٹ کی اندرونی جیب سے کچھ اوزار نکالے اور دروازے کے لاک پر کچھ زور آزمائی کرنے لگا۔ وہ بیس منٹ تک اپنے کام میں مصروف رہا۔ اس نے دروازے کا لاک کھول لیا تھا۔ دروازہ کھل گیا اور وہ دبے پاؤں سیڑھیاں اتر کر نیچے چلا گیا۔ اوپر والی منزل مکمل اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔

نیچے لاؤنج میں روشنی تھی۔ سرمد نیچے چلا گیا۔ اس نے بغیر آواز نکالے ایک ایک کمرے کا دروازہ کھولا اور پھر اسٹور کے پاس پہنچ گیا۔ خالی کمروں کو دیکھ کر سرمد پریشان ہو گیا تھا کہ اگر ماریہ اس گھر میں ہے تو پھر وہ کہاں ہے؟

اس نے اسٹور کا دروازہ کھولا تو اسے ایک ہیولا سا دکھائی دیا اور اس ہیولے نے بھی فوراً حرکت کی اور اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ سرمد نے اپنی ٹارچ کی روشنی اس پر ڈالی تو وہ چونک گیا۔ ماریہ کا زخمی چہرہ اس کے سامنے تھا اور ماریہ روشنی کی وجہ سے یہ نہیں دیکھ پا رہی تھی کہ آنے والا کون ہے۔ اس کی دانست میں یہی تھا کہ راشد کہیں نہیں گیا تھا وہ پھر واپس آ گیا ہے۔

سرمد نے بٹن تلاش کر کے اسٹور میں روشنی کر دی تو ماریہ یکدم چونک پڑی۔ اس کے سامنے سرمد کھڑا تھا۔

☆☆☆

ماریہ کی حالت دیکھ کر سرمد کو بہت دکھ ہوا تھا۔ جب ماریہ نے تمام واقعات سرمد کو بتائے تو اسے رنج کے ساتھ ساتھ راشد پر بھی شدید غصہ آیا۔ اگر اس وقت راشد اس کے سامنے ہوتا تو شاید وہ اسی وقت راشد کو موت کے منہ میں دھکیلنے سے بھی گریز نہ کرتا۔

سرمد جو کام بھی کرتا تھا وہ سوچ سمجھ کر کرتا تھا۔ وہ اپنے غصے پر بہت جلد قابو پا لیتا تھا اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ اسی وقت راشد کو پکڑ لیتا جب اس نے راشد اور انجم کے مابین ہونے والی گفتگو سنی تھی۔ سرمد اس طرح سے اپنا کام کرنا چاہتا تھا کہ راشد بھی اپنے انجام کو پہنچ جائے اور ماریہ پر بھی کوئی آنچ نہ آئے۔

''راشد نے مجھ سے دھوکا کیا ہے۔ اس کے دل میں چور تھا۔ مجھے اس کا اندازہ ہوتا تو میں اس سے کبھی بات بھی نہ کرتا اور اس پر بھروسا کرتے ہوئے اپنا ذاتی نمبر دے کر اس کے ذمے یہ کام بھی نہ لگاتا کہ وہ یہ نمبر تمہیں پہنچا دے۔'' سرمد نے نفرت سے کہا۔

''سرمد میں نے جو کچھ بھی آپ کو بتایا ہے، وہ سچ بتایا ہے۔ اس نے کھیل ہی ایسا کھیلا تھا کہ میں مجبور ہو گئی تھی کہ عزت سے رہنے کے لیے اس سے شادی کر لوں۔ کیونکہ اس نے یہ بتایا تھا کہ آپ نے بھی شادی کر لی ہے اور..... مجھے سائبان کی ضرورت تھی۔''

''میں جان گیا ہوں کہ تمہارا کوئی قصور نہیں ہے۔ اس نے بساط بچھا کر ہم سب کو مہروں کی طرح استعمال کیا ہے۔''

''اب آپ مجھے اس جگہ سے لے جائیں۔ میں اس ظالم کے پاس نہیں رہنا چاہتی۔''

سرمد نے سوچا اور بولا۔ ''راشد کتنا کھانے پینے کا راشن دے کر گیا ہے؟''

''میرا خیال ہے کہ پانچ، سات دن کا ہے۔ ایک درجن کے قریب دودھ کے ڈبے ہیں، پھل ہیں، کھانے پکانے کے لیے گوشت، دال اور سبزی بھی ہے۔ میرے زخموں پر لگانے کے لیے مرہم پٹی کا سامان بھی ہے۔ وہ مجھے جنونی، پاگل اور نفسیاتی مریض لگتا ہے۔'' ماریہ نے بتایا۔

''جس طرح یہ گھر بند ہے اسے پورا یقین ہے کہ تم اس گھر سے بھاگ نہیں سکتیں۔ اور یہ حقیقت بھی ہے کہ تم اس گھر سے بھاگ نہیں سکتی ہو۔ تم اطمینان سے اس خوبصورت جیل میں رہو۔ کھاؤ پیو۔ اپنی مرہم پٹی جاری رکھو۔ تم اس گھر سے تب ہی باہر آؤ گی جب وہ مرے گا۔''

ماریہ یکدم چونکی۔ ''کیا مطلب؟''

''وہ مرے گا تو ہم ایک ہوں گے۔ تمہیں یہاں سے نکال کر لے جانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ کیونکہ تم اس کی بیوی ہو، بس تم میرا ساتھ دو پھر دیکھنا کہ میں کیا کرتا ہوں۔ اگر وہ پاگل جنونی ہے تو میں بھی ایک رائٹر ہوں۔ اس کی بچھائی ہوئی بساط پر اب چال میری ہوگی۔''

سرمد نے اپنے کوٹ کی جیب سے موبائل فون نکال کر اس کے اندر موجود سارے نمبر ڈیلیٹ کر دیے اور ایک نمبر سیو کر دیا۔ ''اس موبائل فون میں میرا وہ نمبر ہے جو میں گاؤں لے کر گیا تھا۔ میرا یہ نمبر کسی کے پاس نہیں ہے۔ موبائل فون میں نے سائیلنٹ پر لگا دیا ہے۔ اسے تم کہیں چھپا کر رکھنا۔ اور جیسے ہی راشد واپس آئے مجھے میسج کر دینا۔ اس کے بعد ہماری بات میسج کے ذریعے سے ہوگی۔ وہ چالاک ہے۔ بتا کر دو دن کا گیا ہے لیکن ان کی شوٹنگ کا شیڈول پانچ دن کا ہے۔ ان پانچ دنوں میں تمہارے چہرے پر پڑی لالی بھی ختم ہو جائے گی۔ اور پھر ایک نیا کھیل شروع ہوگا۔''

''آپ کیا کرنے والے ہو؟'' ماریہ نے پوچھا۔

''میں راشد کو جان سے مار دوں گا۔''

"اس طرح آپ پکڑے جائیں گے اور میں پھر تنہا رہ جاؤں گی۔"

"اگر میں ہی پکڑا گیا تو پھر میرا یہ دماغ کسی کام کا نہیں۔" سرمد بولا۔ "دیکھو میں اوپر چھت کا دروازے کا لاک توڑ کر آیا ہوں۔ اس کے گمان میں بھی نہیں ہوگا اس لیے اس کا دھیان اس طرف نہیں جائے گا۔ میں اسی راستے سے آؤں گا اور تم میرے رابطے میں رہو گی لیکن یاد رہے کہ موبائل فون کا پتا راشد کو نہ چلے۔" راشد نے تاکید کی۔

"میں احتیاط کروں گی۔" ماریہ نے اثبات میں سر ہلایا۔

سرمد اپنی جگہ سے اُٹھا اور متلاشی نگاہوں سے ایک کے بعد ایک کمرے میں جانے لگا۔ پھر وہ راشد کے بیڈروم سے موبائل فون کا چارجر لے آیا۔ وہ چارجر ماریہ کو دے کر بولا۔ "یہ چارجر اس موبائل فون کو لگ جائے گا۔ اسے یہاں چھپا دینا۔"

اس کے بعد سرمد نے کچھ ہدایات دیں اور جس راستے سے وہ آیا تھا اسی راستے سے چلا گیا۔ ماریہ کا چہرہ اب مطمئن تھا۔

☆☆☆

تین دن گزر گئے تھے۔

ان تین دنوں میں ماریہ نے بے فکری سے کھایا تھا اور اپنی مرہم پٹی باقاعدگی سے کی تھی جس سے اس کے چہرے پر آئے نیل اور زخم کے نشان تقریباً ختم ہو گئے تھے جبکہ زخمی سر بھی بہت حد تک ٹھیک ہو گیا تھا۔ اس کے جسم میں طاقت اور توانائی بھی آ گئی تھی۔ ماریہ بے فکر پورے گھر میں گھومتی تھی۔

سرمد کو بے چینی سے راشد کے آنے کا انتظار تھا۔ چوتھے دن اسے پتا چلا کہ رات کو راشد کا یونٹ واپس آ رہا ہے۔ اسی دوپہر کو سرمد اپنی پروڈکشن کمپنی کے آفس میں بیٹھا تھا۔ اس وقت بھی ان کا ایک سیریل بڑی کامیابی سے ٹیلی وژن پر دکھایا جا رہا تھا۔ جس طرح سے اس سیریل کو پذیرائی ملی تھی، ان کے لیے ضروری ہو گیا تھا کہ وہ کہانی کے اختتام میں تبدیلی لاتے ہوئے اسے چونکا دینے والا بنا دیں۔

اس بارے میں ان کی بات چیت ہو رہی تھی۔ ڈیڑھ گھنٹے کی ملاقات کے بعد وہ ایک نتیجے پر پہنچے تو سرمد نے کہا۔

"میں آخری قسط میں کمال کرنا چاہتا ہوں۔ ایسی قسط لکھنا چاہتا ہوں کہ ہماری یہ ڈراما سیریل اپنے اختتام کی وجہ سے مدتوں یاد رکھی جائے اور یادگار سیریل بن جائے۔ اس کے لیے مجھے آپ کا وہ گھر چاہیے جو آپ نے اپنے آرام و سکون کے لیے الگ تھلگ بنایا ہے۔ مجھے وہاں سوائے چوکیدار کے کوئی اور بندہ نہیں چاہیے۔ تاکہ میرے کام میں کوئی مداخلت نہ کرے۔"

پروڈیوسر نے کہا۔ "وہ گھر آپ کا ہے۔ کب جانا چاہو گے؟"

"آج اور اسی وقت۔ میرا کسی سے فون پر رابطہ نہیں ہوگا۔ میرے دماغ میں بہت کچھ گھوم رہا ہے، چاہتا ہوں کہ بالکل تنہائی میں اپنی سوچ کو صفحہ قرطاس پر بکھیر سکوں۔"

"میرے لیے یہ خوشی کی بات ہے کہ آپ ایک زبردست چیز لکھیں گے۔" سیریل کا پروڈیوسر خوشی سے پھولے نہیں سما رہا تھا۔

سرمد اسی وقت واپس اپنے فلیٹ میں گیا۔ اپنا ایک بیگ اور لیپ ٹاپ لے کر ڈرائیور کے ساتھ اس خوبصورت گھر میں پہنچ گیا۔

جس جگہ وہ گھر تھا، وہ شہر سے الگ تھلگ ایسی کالونی تھی جہاں بڑے لوگوں نے کبھی کبھار آنے اور رہنے کے لیے گھر اور فارم ہاؤس بنائے ہوئے تھے۔ اکثر ان گھروں میں چوکیدار کے سوا کوئی نہیں ہوتا تھا۔ وہ بڑی وسیع اور خوبصورت کالونی تھی۔ وہاں ایک مصنوعی جھیل بھی تھی۔

جس گھر میں سرمد رہ کر لکھنا چاہتا تھا، وہ گھر وسیع اور خوبصورت تھا۔ اس گھر کے اندر ایک لان اور ساتھ سوئمنگ پول تھا۔ گھر کے کمرے کشادہ اور خوبصورت فرنیچر سے آراستہ تھے۔ وہ گھر جس جگہ واقع تھا، اس کے عقب میں کالونی کی باؤنڈری وال تھی جس کی اونچائی پانچ فٹ سے زیادہ نہیں تھی۔ اس کالونی میں دن کو دو اور رات کو تین چوکیدار ہوتے تھے۔ رات کو دو چوکیدار مین گیٹ کے پاس اپنے کمرے میں موجود رہتے تھے جبکہ ایک کالونی کا گشت کرتا تھا۔ جب وہ گشت کر کے واپس آ جاتا تو دوسرا چوکیدار گشت کے لیے نکل جاتا تھا، اس طرح وہ ساری رات باری باری کالونی میں گشت کرتے رہتے تھے۔

سرمد کے پروڈیوسر نے اپنے ملازم کے ذریعے۔۔۔ اس گھر کا فریج پھلوں اور کھانے پینے کے دوسرے سامان سے بھر دیا تھا۔ سرمد نے اپنے ڈرائیور کو جانے کا کہہ دیا تھا۔ اس کا ڈرائیور اس کے گاؤں سے تعلق رکھتا تھا اور سرمد کے باپ کے پرانے وفادار کا بیٹا تھا۔

سرمد نے گھر کے چوکیدار کو اپنے پاس بلا کر کہا۔ "اس

مین دروازے کے اندر تمہیں آنے کی اجازت نہیں ہے۔ میں ذرا بھی شور اور آمد و رفت برداشت نہیں کروں گا کیونکہ مجھے لکھنے کے لیے یکسوئی اور تنہائی درکار ہے۔ تمہیں کھانے پینے کا جو سامان چاہیے تم ابھی لے جاؤ۔"

"صاحب میرے کمرے میں فریج اور کھانے پینے کا سامان موجود ہے۔" چوکیدار نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ جب تک میں تمہیں آواز نہ دوں، تم نہیں آؤ گے۔" سرمد نے تاکید کی۔

"بہت بہتر جناب۔" وہ ہاتھ باندھ کر بولا اور چلا گیا۔

سرمد نے اپنا سامان ایک کمرے میں رکھا اور اوپر جا کر چاروں طرف کا جائزہ لیا۔ وہ اس گھر میں پہلے بھی کئی بار آچکا تھا۔ سرمد گھر کے عقب کی جانب دیکھنے لگا۔ نہر کے کنارے ایستادہ درخت کافی اونچے تھے اور ان کی شاخیں اس کالونی کی باؤنڈری وال تک بھی آتی تھیں۔ ایک درخت تو اس کالونی کی طرف جھکا ہوا تھا اور اس کی شاخیں عین اس گھر کے عقب میں باؤنڈری وال پر پڑی ہوئی تھیں۔

اچھی طرح سے جائزہ لینے کے بعد سرمد نیچے آیا اور اس نے ماریہ کو فون کیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ماریہ نے فون اُٹھایا۔

"راشد آج کسی بھی وقت پہنچ رہا ہے۔ وہ جو بتاتا ہے وہ کرتا نہیں ہے اور..."

ماریہ نے اس کی بات کاٹ دی اور سرگوشی کے انداز میں بولی۔ "راشد گھر پہنچ چکا ہے۔"

"کیا...؟" سرمد کو سنتے ہی حیرت ہوئی۔ "لیکن اس کا یونٹ تو ابھی تک واپس نہیں آیا... راشد ان سے پہلے نکل آیا ہوگا۔" سرمد نے خود ہی سوال کر کے سوچتے ہوئے جواب دیا۔

"وہ مست ہاتھی کی طرح پورے گھر میں گاتا پھر رہا ہے۔"

"میں فون بند کر رہا ہوں۔ مجھے تم میسج کرتی رہنا۔" سرمد نے کہہ کر فون بند کر دیا اور اس کے بارے میں سوچنے لگا کہ وہ واقعی شاطر تھا۔

☆☆☆

راشد نے یونٹ سے بہانہ کیا تھا کہ اس کے عزیز اس شہر میں رہتے ہیں اس لیے وہ ان سے مل کر آئے گا۔ لیکن راشد کا اس شہر میں کوئی عزیز نہیں رہتا تھا۔ جب سب لوگ دوپہر کا کھانا کھانے کی تیاری میں تھے اور دوپہر کے کھانے کے بعد وہ نکلنے والے تھے تب راشد نے ٹیکسی لی اور اپنے شہر کی طرف سفر شروع کر دیا۔

ابھی اس کا یونٹ واپس بھی نہیں آیا تھا اور راشد اپنے گھر بھی پہنچ چکا تھا۔ اس نے آتے ہی پیار بھرے لہجے میں آواز دی تھی۔

"ماریہ ڈارلنگ... آئی ایم بیک... کہاں ہو تم...؟ میری پیاری ماریہ... میرے سامنے آجاؤ..."

ماریہ اسٹور میں تھی۔ وہ جلدی سے بھاگ کر اس کے سامنے آگئی۔ راشد نے اس کی طرف دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔

"یہ تم ہی ہو ماریہ... تمہارے چہرے کے زخم کہاں گئے ہیں؟ تم تو پہلے سے بھی زیادہ خوبصورت ہوگئی ہو۔" راشد اس کی طرف تعریفی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے اس کے پاس چلا گیا اور پھر بولا۔ "مار کھانے کے بعد تم تو اور بھی خوبصورت ہوگئی ہو۔ آج تمہیں تھوڑے سے اور زخم نہ دے دوں؟ مجھے کسی کو اذیت دینے میں مزہ آتا ہے اور زخموں کے بعد تمہارا حسن اور بھی نکھر جائے گا۔"

ماریہ اس کی بات سن کر گھبرا گئی۔ یکدم راشد کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ اور پھر بولا۔ "گھبراؤ نہیں میں مذاق کر رہا تھا۔ اب میں تمہیں کوئی اذیت نہیں دوں گا بلکہ آج میں تمہیں اس اسٹور سے اپنے بیڈروم میں لے جاؤں گا۔"

ماریہ کے چہرے پر گھبراہٹ عیاں تھی اور وہ کبھی دائیں بائیں دیکھ کر اپنی گھبراہٹ پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔

"میں نہانے جا رہا ہوں۔ تم میرے لیے چکن بناؤ اور دیکھو بڑی تسلی سے بنانا۔ وقت کی کوئی قید نہیں ہے۔ شام کے سوا سات بجے ہیں۔ رات نو بجے تک تم کھانا تیار کر لو۔ تب تک میں نہاؤں گا، ٹی وی دیکھوں گا اور کچھ آرام بھی کروں گا۔" راشد نے اس کی طرف عجیب سی نظروں سے دیکھا اور پھر باہر چلا گیا۔ اس نے تسلی کی کہ گیٹ اچھی طرح سے مقفل ہے۔ پھر اس نے مین دروازے کو بھی لاک کر دیا اور چابی اپنے ساتھ بیڈروم میں لے گیا۔

ماریہ اس جگہ کھڑی رہی۔ جب اسے تسلی ہوگئی کہ راشد باتھ روم میں چلا گیا ہے تو وہ اسٹور میں چلی گئی اور جس جگہ اس نے موبائل فون چھپا کر رکھا تھا، وہ نکالا اور جلدی سے راشد کو میسج کر کے اسے صورت حال سے آگاہ کیا اور موبائل فون پھر اسی جگہ رکھ دیا۔

ماریہ نے جیسے ہی دروازہ کھولا خوف سے اس کی چیخ نکل

گئی۔ سامنے کندھے پر تولیا رکھے راشد کھڑا تھا۔

''کیا ہوا؟ مجھے دیکھ کر ڈر گئی ہو؟''

''اچانک... آپ کو دیکھا تو ڈر گئی۔'' ماریہ کی سانس پھول چکی تھی اور اس نے بمشکل فقرہ مکمل کیا۔

''میں نے تمہیں کھانا تیار کرنے کو کہا تھا، تم اسٹور میں کیا کرنے گئی تھیں؟'' راشد کا لہجہ خشک اور آنکھیں ماریہ کے چہرے پر گھوم رہی تھیں۔

ماریہ خوف سے بولی۔ ''میں... وہ کچن میں ہی جا رہی تھی۔'' ماریہ سے کوئی بہانہ نہیں بن پایا تھا۔

''اندر ہے کیا؟'' راشد نے یہ کہتے ہوئے ماریہ کو کندھے سے ایک طرف دھکیلا اور اسٹور کے اندر چلا گیا۔ اس نے متلاشی نگاہوں سے چاروں طرف نظر دوڑا کر دیکھا۔

ماریہ کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ اپنی تسلی کرنے کے بعد راشد باہر آ گیا اور اس کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''جاؤ اور کھانا تیار کرو۔''

ماریہ کچن کی طرف چلی گئی اور راشد ایک بار پھر اپنے کمرے میں داخل ہو گیا۔

☆☆☆

سرمد نے اپنا کوٹ اتار کر چمڑے کی سیاہ جیکٹ پہنی اور اندرونی جیبوں میں کچھ چیزیں رکھ کر کھڑکی کی طرف گیا اور تھوڑا سا پردہ ہٹا کر باہر جھانکا۔ اس گھر کا چوکیدار اپنے کیبن میں موجود تھا۔ دور تک سناٹا چھایا ہوا تھا۔

سرمد نے اپنے کمرے کا دروازہ اندر سے مقفل کیا اور کھڑکی کے راستے باہر نکل آیا۔ اس نے ایک جست لگائی اور باؤنڈری وال سے دوسری طرف کود گیا۔ اب وہ گھر کی حدود سے باہر تھا اور کالونی کی باؤنڈری وال کے پاس کھڑا تھا۔ پہلے اس نے رک کر جائزہ لیا اور وقت ضائع کیے بغیر کالونی کی باؤنڈری وال پر چڑھا اور دوسری طرف کود گیا۔ جہاں سے سرمد دیوار پر چڑھ کر کودا تھا وہاں جھکے ہوئے درخت کی شاخیں تھیں جس سے وہ بالکل محفوظ تھا۔

کالونی کی باؤنڈری وال کودنے کے بعد سرمد تقریباً بھاگتا ہوا نہر کے ساتھ ساتھ دائیں جانب چلنے لگا۔ کچھ ہی فاصلے پر لکڑی کا ایک چھوٹا سا پل تھا۔ سرمد نے وہ پل عبور کیا اور سڑک کی دوسری طرف چلا گیا۔ ٹریفک رواں دواں تھا۔

سرمد اب پیدل چلنے لگا۔ چلتے چلتے اس نے ایک ٹیکسی کو اشارہ کیا۔ ٹیکسی اس کے پاس رک گئی۔ وہ اسے جگہ کا بتا کر پیچھے بیٹھ گیا اور ٹیکسی آگے بڑھ گئی۔

جس کالونی میں راشد رہتا تھا، اس سے کچھ فاصلے پر ہی سرمد نے ٹیکسی رکوا لی اور کرایہ ادا کرنے کے بعد پیدل ہی اس جانب چل پڑا۔ سرمد نے کالونی میں داخل ہونے والے مین گیٹ کے بجائے دوسری طرف جانا شروع کر دیا۔ سرمد اسی راستے سے کالونی کے اندر داخل ہوا جہاں سے وہ پہلے بھی گیا تھا۔

رات کا اندھیرا تھا۔ راشد کے گھر کے اردگرد تو کچھ زیادہ ہی سیاہی چھائی ہوئی تھی۔ اس کی رکھی اینٹیں اسی طرح رکھی ہوئی تھیں۔ سرمد ان پر چڑھ کر اندر کودا اور پھر اسی راستے سے وہ اوپر چڑھ گیا۔ سیڑھیوں کا دروازہ جیسے اس نے بند کیا تھا وہ اسی طرح بند تھا۔ سرمد دبے پاؤں نیچے اُترنے لگا۔

راشد نے نہاتے ہوئے کافی وقت لے لیا تھا۔ اس دوران میں ماریہ نے سرمد کی ہدایت کے مطابق مین دروازے کی چابی اُٹھا کر جلدی سے مین دروازہ کھول دیا اور چابی اسی جگہ رکھ دی تھی۔ یہ کام کرتے ہوئے ماریہ کے ہاتھ ہی نہیں بلکہ سارا جسم کانپ رہا تھا۔

پھر آ کے ماریہ کچن میں مصروف ہو گئی۔ راشد تولیے سے اپنا سر رگڑتے ہوئے باہر نکلا اور وہ گنگنا بھی رہا تھا۔ اس نے اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر باہر جانا چاہا تو اس کا ہاتھ اسی جگہ رک گیا۔

ماریہ جلد بازی اور گھبراہٹ میں کمرے کا دروازہ پوری طرح سے بند کرنا بھول گئی تھی۔ راشد کی کیونکہ اپنی ہر چیز پر نظر ہوتی تھی اس لیے اس نے سوچتے ہوئے گھوم کر اپنے کمرے کی طرف دیکھا اور ایک ایک چیز پر نظر ڈالتے ہوئے جس جگہ اس نے مین دروازے اور گیٹ کی چابی رکھی تھی، اس کی نظر چابیوں پر رک گئی۔

ماریہ نے چابی تھوڑے بہت فرق کے ساتھ اسی جگہ رکھ دی تھی اس لیے غور کرنے کے باوجود راشد کو یہ نہیں پتا چل سکا کہ چابیاں اپنی جگہ سے ہٹی ہوئی ہیں لیکن راشد کو یہ یقین تھا کہ ماریہ اس کے کمرے میں آئی تھی۔

راشد کمرے سے باہر نکلا اور چلتا ہوا کچن کے دروازے میں کھڑا ہو گیا۔ ماریہ کو احساس ہو گیا تھا کہ اس کی پشت پر راشد کھڑا ہے لیکن وہ اپنے کام میں مصروف رہی۔

''میرے کمرے میں کیا کرنے آئی تھیں؟'' راشد کا کہنا تھا کہ ماریہ کا دل ایسے دھڑکا جیسے اس کے سینے سے باہر نکل آئے گا اور اس کے ہاتھ سے پلیٹ گرتے گرتے بچی۔

''م... میں تو نہیں گئی تھی...'' ماریہ نے گھبرا کر کہا۔

''باہر آؤ۔'' راشد کہہ کر لاؤنج میں چلا گیا۔ ماریہ ڈرتے ڈرتے اس کے سامنے کھڑی ہوگئی۔

''کیا کرنے آئی تھیں میرے کمرے میں؟ گیٹ کی چابی اُٹھانے آئی تھیں اور گھبرا کر اُٹھا نہیں سکیں اور پھر کمرے سے باہر نکل گئیں؟''

''میں نہیں گئی کمرے میں؟''

''میں چاہتا تھا کہ میں آج تم پر اپنا ہاتھ نہ اُٹھاؤں۔ میری خواہش تھی کہ آج صرف رومانس ہو۔ لیکن تم نے مجھے مجبور کردیا ہے...'' راشد نے کہا اور پلک جھپکتے اس کا ہاتھ گھوما اور سیدھا ماریہ کے منہ پر جا پڑا۔ ماریہ چیخ کر ایک طرف گر گئی۔ اس کا ہونٹ پھٹ گیا تھا اور خون بہنے لگا تھا۔ اس سے پہلے کہ ماریہ اپنی جگہ سے اُٹھتی اور راشد کے قدم اس کی طرف بڑھتے یکدم سرمد سیڑھیاں اُتر کر سامنے آگیا۔ ایک دم سرمد کو دیکھ کر راشد کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں۔

''تم... یہاں...؟'' حیرت سے راشد کے منہ سے نکلا۔

سرمد نے ماریہ کو سہارا دے کر کھڑا کیا اور بولا۔ ''اپنا یہ بہتا ہوا خون صاف مت کرنا۔ میں چاہتا تو تمہیں اس تھپڑ سے بچا سکتا تھا لیکن میں خود ایسا چاہتا تھا۔''

''تم یہاں کیا کر رہے ہو؟'' راشد اس کی طرف بڑھا۔

''تم نے مجھے دھوکا دیا۔ ماریہ سے جھوٹ بولا اور اسے مجبور کردیا کہ یہ تم سے شادی کرلے۔ میں تمہاری اور انجم کی باتیں بھی سن چکا ہوں۔'' سرمد بولا۔

''کونسی باتیں...؟ کیا بکواس کر رہے ہو؟'' راشد بولا۔ ''میں پولیس کو فون کرتا ہوں۔''

راشد کہہ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھا اور اس کے پیچھے سرمد نے قدم اُٹھائے اور راشد کو دبوچ لیا۔ راشد نے اپنے آپ کو چھڑانے کے لیے ایک جھٹکا دیا اور سرمد ایک طرف گر گیا۔ راشد نے فوراً سرمد کا بازو پکڑ کر اسے کھینچ کر کھڑا کیا اور دوسرے ہی لمحے اس کے منہ پر مُکا رسید کردیا۔ اس سے پہلے کہ راشد ایک اور حملہ کرتا، سرمد نے اپنی جیکٹ کی جیب سے کور میں موجود خنجر نکالا اور ایک پل میں گھما دیا۔ راشد کی گردن پر ایک نشان نظر آنے لگا تھا اور پھر اس جگہ سے خون کا فوارہ نکلنے لگا۔ راشد تڑپتے ہوئے فرش پر گر گیا۔ سرمد تیزی سے اس کے کمرے میں گیا۔ اس کا موبائل فون تلاش کیا اور ایک نمبر ملا کر ماریہ کی طرف بڑھا۔

''ایمرجنسی پولیس کو کال کی ہے... گھبرائی اور سرگوشی کے انداز میں کہو کہ کچھ ڈاکو گھر میں آگئے ہیں اور انہوں نے میرے شوہر کو دبوچا ہوا ہے۔ پھر یہاں کا ایڈریس بتانا...''

اسی اثنا میں موبائل فون سے ایک آواز ابھری اور ماریہ نے بھی گھبرائی اور نیچی آواز میں کہنا شروع کیا۔

''ہمارے گھر چور گھس آئے ہیں۔ میرے شوہر کی جان کو خطرہ ہے...'' دوسری طرف سے ایڈریس پوچھا گیا اور ماریہ نے جلدی سے ایڈریس بتادیا۔ سرمد نے جب ماریہ سے ملاقات کی تھی تو اس نے یہ ہدایت کی تھی کہ وہ اس گھر کا کوئی بھی یوٹیلٹی بل نکال کر اس پر لکھا ہوا ایڈریس اچھی طرح سے یاد کرلے۔ ماریہ نے ایسا ہی کیا تھا۔ اس لیے اس نے آسانی سے ایڈریس بتادیا تھا۔

جس وقت ماریہ ایڈریس بتا چکی تھی تو اسی وقت پیچھے سے سرمد نے یکدم ماریہ کی گردن دبوچ لی۔ ماریہ کو اندازہ نہیں تھا کہ اس کی گردن کس نے دبوچی ہے اس لیے اس کے منہ سے فطری چیخ نکل گئی۔ سرمد نے اس کے ہاتھ سے فون لے کر اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ سرمد نے ماریہ کی اس ہلکی سی چیخ سے پولیس کو یہ تاثر دے دیا تھا کہ کسی نے ماریہ کو بھی دبوچ لیا ہے۔ راشد فرش پر اوندھا لیٹا مرتی ہوئی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ بھی رہا تھا اور سن بھی رہا تھا۔ اس وقت وہ بہت بے بس اور ناچار تھا۔ اس کی گردن کے اردگرد فرش پر خون کا تالاب سے بن گیا تھا۔

سرمد نے گیٹ کی چابی لانے کو کہا۔ ماریہ چابی لے کر آئی تو سرمد نے گیٹ کھول کر اس کا چھوٹا دروازہ تھوڑا سا کھول دیا۔ پھر وہ اندر آیا اور ماریہ کو پکڑ کر اس نے اس کے ہاتھ باندھے اور منہ میں کپڑا ٹھونس دیا۔ پھر اس نے ماریہ کو ایک طرف بٹھا کر کہا۔

''پولیس پوچھے تو کہنا کہ چور تین تھے اور نقاب پوش تھے اس لیے تم نے کسی کا چہرہ نہیں دیکھا۔''

راشد ابھی زندہ تھا۔ اس کے دل کی دھڑکنیں مدھم ہوگئی تھیں۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا رہا تھا۔ وہ سرمد کی چال دیکھ رہا تھا۔

سرمد نے پہلے راشد کے کمرے کا سامان بکھیرا، پھر ٹی وی لاؤنج اور اس کے بعد دوسرے کمروں کا بھی سامان بکھیر دیا۔

سرمد نے ہاتھوں پر دستانے چڑھائے ہوئے تھے اس لیے اس نے خنجر ایک طرف رکھ دیا تھا۔ سرمد نے ماریہ کو پکڑ

کر صوفے کے پیچھے بٹھا دیا اور اسے کچھ باتیں بتائیں اور مین دروازے کی طرف چل پڑا۔ راشد کا جسم بے جان ہو چکا تھا۔

سرمد مین دروازے سے نکل کر گھوم کر پیچھے کی طرف آ گیا۔ اس نے جست لگائی اور دیوار پر چڑھا اور یکدم وہ چونکا۔ اس کی نظر اچانک اپنی کلائی پر پڑی تھی۔ اس کی کلائی سے گھڑی غائب تھی۔ اس وقت اس نے وہی گھڑی باندھی ہوئی تھی جو اسے ایوارڈ تقریب میں ایک بڑے صنعت کار نے تحفے میں دی تھی۔

سرمد کے جسم میں بے چینی سی دوڑ گئی اور واپس پلٹا اور ابھی وہ مین دروازے کے پاس پہنچا ہی تھا کہ باہر پولیس وین رکی اور وین کے اندر سے ایمرجنسی پولیس کے جوانوں کے اترنے کی آواز آنے لگی۔ سرمد کے لیے اب گھر کے اندر جانا مناسب نہیں تھا وہ واپس اسی دیوار کی طرف بھاگا اور اچانک ٹھوکر لگنے سے گرا اور قلابازی کھا کر وہ اٹھا اور جست لگا کر دیوار پر چڑھ گیا اور دوسرے ہی لمحے اس نے باہر چھلانگ لگا دی۔

ٹھیک اس وقت اس کالونی کا چوکیدار وہاں گشت کرتا ہوا رک گیا تھا اور اچانک پولیس کی وین کو دیکھ کر حیرت سے دیکھ رہا تھا کہ جیسے ہی سرمد نے چھلانگ لگائی، اس کی گردن گھومی اور اس نے سرمد کو گھر سے چھلانگ لگاتے ہوئے دیکھ لیا۔ سرمد کا چہرہ اوجھل تھا۔ سرمد وقت ضائع کیے بغیر کالونی کی باؤنڈری وال پر چڑھ گیا۔ چوکیدار اسے دیکھ کر چلّایا۔

”جلدی سے اِدھر آؤ، اس گھر سے نکل کر وہ بھاگ رہا ہے۔“ چوکیدار کہتے ہی سرمد کے پیچھے بھاگا۔ سرمد دوسری طرف کود چکا تھا۔ پولیس کے دو جوان بھی اس طرف بھاگ کر آ گئے تھے۔ چوکیدار بھی دوسری طرف کود گیا تھا اور پولیس والوں نے بھی یکے بعد دیگرے دیوار پھلانگ لی تھی۔

سرمد کے لیے مشکل کھڑی ہو گئی تھی۔ وہ سرپٹ بھاگ رہا تھا۔ اس کی کوشش تھی کہ اس کا چہرہ ان کو دکھائی نہ دے ورنہ سب کچھ بکھر جائے گا۔ سرمد کے پیچھے چوکیدار اور پولیس والے بھاگ رہے تھے۔ ایک پولیس والے نے فون کان سے لگایا ہوا تھا، وہ جس طرف سرمد بھاگ رہا تھا، اس سمت کے بارے میں بتا رہا تھا۔

سرمد کے لیے ان سے بچ کر نکلنا بہت ضروری تھا۔ ایک پولیس وین بھی پیچھے نکل آئی۔

سرمد کی نظر بھاگتے ہوئے ایک شخص پر پڑی۔ وہ موٹرسائیکل کے سوئچ میں چابی لگا کر اسے اسٹینڈ سے اتارنے ہی والا تھا کہ سرمد نے اس کے پاس جاتے ہی اسے زور سے ایک طرف دھکا دیا اور موٹر سائیکل پر سوار ہو کر اسے اسٹارٹ کیا اور پوری رفتار سے موٹرسائیکل آگے بڑھا دی۔

چوکیدار اور دونوں پولیس والے بھی وین میں سوار ہو گئے تھے۔ اور سرمد کا تعاقب ہو رہا تھا۔ سڑک پر ٹریفک معمول کے مطابق تھی اس لیے سرمد بڑی مہارت سے موٹر سائیکل چلا رہا تھا۔

جیسے ہی وہ اس کالونی کے پاس پہنچا جہاں وہ اپنے پروڈیوسر کے گھر میں مقیم تھا، اس نے موٹرسائیکل ایک طرف چھوڑی اور سرپٹ بھاگتا ہوا کالونی کے باؤنڈری وال پر چڑھا اور دوسری طرف کود گیا۔

پولیس وین بھی اس جگہ پہنچ گئی تھی۔ سرمد کو دیوار کودتے ہوئے انہوں نے دیکھ لیا تھا۔ چنانچہ وہ بھی دیوار کود گئے۔ لیکن اس اثنا میں سرمد اپنے گھر کی دیوار چڑھ کر اندر داخل ہو چکا تھا اور وہ کھڑکی کے راستے اپنے کمرے میں پہنچ گیا تھا۔

سرمد نے جلدی سے اپنے کپڑے بدلے۔ ان کو ایک بڑے شاپر ۔۔۔ میں ڈال کر اس نے وہ شاپر ایک محفوظ جگہ پر رکھا اور خود باتھ روم میں چلا گیا۔

☆☆☆

ایمرجنسی پولیس کی وین سے کالی وردیوں میں ملبوس نوجوان باہر نکلے جن کی جیکٹوں کی پشت پر لکھا ہوا تھا کہ انہیں کوئی ڈر نہیں ہے۔ وہ اسلحہ تانے اندر آئے، ان کی نظر لاش پر پڑی اور پھر یکدم صوفے کے پیچھے سے ماریہ کھڑی ہو گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور پھٹے ہوئے ہونٹ سے خون نکل کر رک گیا تھا۔

ایک نے آگے بڑھ کر ماریہ کے ہاتھ کھولے اور اس کے منہ میں ٹھونسا ہوا کپڑا باہر نکال دیا۔

”اندر ہے کوئی؟“ ایک نے پوچھا۔

”وہ چلے گئے ہیں۔ انہوں نے میرے شوہر کو مار دیا ہے۔“ ماریہ نے سرمد کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے راشد کی لاش کے پاس بیٹھ کر رونا شروع کر دیا۔ پولیس کے جوان گھر کا ایک ایک کمرا دیکھنے لگے تھے۔ بکھرا ہوا سامان ان کے سامنے تھا۔

پولیس کے جوانوں میں سے جو ان کا سینئر تھا اس نے ماریہ سے پوچھا۔ ”وہ گھر میں کیسے داخل ہوئے تھے؟“

ماریہ کو سرمد نے جو بتایا تھا، اس نے کہہ دیا۔ ”وہ اوپر چھت کی طرف سے اچانک آئے تھے...“

پولیس کے اہلکار اوپر چلے گئے۔ وہ ایک ایک کمرا دیکھنے لگے۔ کمروں میں بنی الماریوں کو کھول کر دیکھنے لگے۔ سرمد نے اوپر کے کمروں کی الماریوں میں موجود سامان بھی نکال کر باہر بکھیر دیا تھا۔

پولیس اہلکار ایک ایک کمرا دیکھ رہے تھے۔ اچھی طرح سے تلاشی لے رہے تھے۔

پولیس اہلکار نے اوپر تک اچھی طرح سے جائزہ لے لیا تھا۔ ٹوٹا ہوا دروازہ بھی ان کی نظر میں آ گیا تھا۔ جس سے انہوں نے یہ اندازہ لگا لیا تھا وہ سیڑھی کے دروازے کا لاک توڑ کر نیچے آئے تھے. ایک اہلکار راشد کے گھر کے عقب کا حصہ بھی دیکھ آیا تھا، دیوار کے ساتھ جوڑی ہوئی انٹیں بھی دیکھ لی تھیں۔

پولیس والے نیچے آ گئے تھے۔ اس علاقے کے متعلقہ تھانے کو اطلاع کر دی تھی۔

متعلقہ تھانے کی .... پولیس کے ساتھ انسپکٹر جلیس احمد بھی گاڑی سے اترا تو اس نے پہلے باہر سے گھر کا جائزہ لیا اور پھر اندر جانے کے لیے قدم بڑھا دیے۔

انسپکٹر جلیس احمد کی عمر پچاس سال سے زیادہ تھی اور وہ ایک صحت مند اور چاق چوبند شخص تھا۔ جلیس احمد وہی انسپکٹر تھا جو اس سے پہلے بھی راشد کی بیوی کے قتل پر تفتیش کر چکا تھا۔ اس نے سر توڑ کوشش کی تھی اور راشد کو وہ گرفتار کرنے تک پہنچ گیا تھا لیکن ایسا کوئی ٹھوس ثبوت نہیں ملا تھا جس کی بنیاد پر وہ راشد کو گرفتار کرتا۔ انسپکٹر جلیس احمد کو یقین تھا کہ قتل راشد نے ہی کیا ہے لیکن وہ بے بس تھا۔

انسپکٹر جلیس احمد جب لاش کے پاس پہنچا۔ اس نے اس کے چہرے سے کپڑا ہٹا کر دیکھا تو وہ چونک گیا۔ مکار راشد کا چہرہ وہ کسی صورت نہیں بھول سکتا تھا۔ جب وہ اسے گرفتار کرنے میں ناکام رہا تھا تو ایک محفل میں اچانک اس کی ملاقات راشد سے ہو گئی تھی تو راشد نے بڑے طنزیہ لہجے میں کہا تھا۔

”آپ کوئی اور کام دام سیکھ لیں، پولیس کی نوکری آپ کے بس کا کام نہیں ہے۔“

جلیس احمد کو اس کا فقرہ آج بھی یاد تھا۔ جلیس احمد کا تبادلہ ڈیڑھ سال پہلے اس شہر میں ہوا تھا۔

جلیس احمد نے راشد کا چہرہ پھر ڈھانپ دیا اور گھر کا جائزہ لیتے ہوئے وہاں پر موجود اہلکاروں سے سوال کیے

## نمک پارے!

☆ سُنا ہے آپ جس کے ساتھ گھومتے رہتے ہیں اس سے شادی کر رہے ہیں؟

☆ ارے اس سے شادی کر لی تو گھوموں گا کس کے ساتھ!

☆☆☆

☆ سنا ہے آپ اپنی بیوی کو آؤٹنگ پر لے جانا پسند نہیں کرتے؟

☆ درست سُنا ہے کیونکہ میں شادی شدہ عورتوں کے ساتھ گھومنا پھرنا پسند نہیں کرتا۔

☆☆☆

☆ سُنا ہے بیوی کے مرنے کے بعد آپ نے اپنی سالی سے شادی کر لی؟

☆ جی ہاں، اس طرح مجھے نئی ساس سے نجات مل گئی۔

☆☆☆

☆ دولہا کس اُمید پر اپنی شادی پر پکایا ہوا کھانا کھلاتا ہے؟

☆ اس اُمید پر کہ باقی تمام عمر اس کو پکا پکایا کھانا ملے گا۔

☆☆☆

☆ ہوٹل میں کھانے کی میز پر اَن بن ہو جائے تو کیا کرتے ہیں؟

☆ کرنا کیا ہے بل الگ الگ منگوا لیتے ہیں۔

درابن کلاں سے مرحا گل، مائدہ گل کا انتخاب

اور لاش پوسٹ مارٹم کے لیے بھیج دی۔ اس کے بعد انسپکٹر جلیس احمد نے ایک ایک کمرے کا جائزہ لیا اور ماریہ کو اپنے پاس بلالیا۔

''کیا نام ہے آپ کا؟'' جلیس احمد نے ماریہ کا جائزہ لیتے ہوئے سوال کیا۔

''میرا نام ماریہ ہے۔'' ماریہ نے مدھم آواز میں جواب دیا۔ اس نے سر جھکایا ہوا تھا اور چہرے سے وہ ایسے ظاہر کررہی تھی کہ جیسے اسے اپنے شوہر کی موت کا بہت دکھ ہو۔

''چہرے پر زخم کیسا ہے؟''

''جب میرے شوہر نے مزاحمت کی تو ایک نے میرے منہ پر بھی تھپڑ ماردیا تھا۔'' ماریہ نے بتایا

''کتنے آدمی تھے وہ؟''

''تین، یا چار تھے۔''

''تین تھے کہ چار؟'' جلیس احمد نے ٹھوس لہجے میں ایک جواب مانگا۔

ماریہ نے سوچا کہ وہ پہلے کیا جواب دے چکی ہے پھر بولی۔ ''تین تھے۔''

''ان کو پہچان لیں گی آپ۔''

''ان کے چہرے نقاب میں تھے۔''

''گھر سے کیا کیا لے کر گئے ہیں وہ؟''

''گھر میں نقدی، میرے زیورات تھے۔ وہ لے گئے ہیں۔'' ماریہ نے جواب دیا۔

ایک اہلکار نے بتایا کہ وہ چھت سے آئے تھے اور گھر کے عقب میں دیوار کے ساتھ اینٹیں جوڑ کر اوپر چڑھنے کے لیے انہوں نے انتظام کیا تھا۔

چند سوال کرنے کے بعد جلیس احمد کمروں کو دیکھتا ہوا اوپر چلا گیا۔ اور جائزہ لینے کے بعد وہ واپس آگیا۔

سرمد کی راشد سے لڑائی کے دوران گھڑی کی چین کی پن نکل جانے سے گھڑی کلائی سے اتر کر نیچے گر گئی تھی۔ اور سرمد کو یہ بھی معلوم نہیں ہوسکا تھا کہ اسی کے پیر کی ٹھوکر سے گھڑی ٹی وی لاؤنج کی بڑی لکڑی کی الماری جو دیوار کے ساتھ بنائی تھی، اس کے نیچے چلی گئی تھی۔

جلیس احمد اسی الماری کے پاس کھڑا جائزہ لے رہا تھا۔ ماریہ اپنا غم میں ڈوبا چہرہ لیے ایک طرف بیٹھی تھی۔

''میرا تجربہ کہتا ہے کہ وہ لوگ تین نہیں تھے۔ صرف ایک تھا۔'' جلیس احمد کی اس حیرت انگیز پیش گوئی پر ماریہ ایسے چونکی جیسے اس کے پیروں میں سانپ نظر آگیا ہو۔

جلیس احمد نے کچھ دیر ماریہ کا جائزہ لیا اور پھر بولا۔

''مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے یہ سامان کسی ایک آدمی نے بکھیرا ہے۔ صرف ایک آدمی کا کام ہے۔''

''آپ کو لگتا ہے کہ میں جھوٹ بول رہی ہوں مگر کیوں ؟'' ماریہ نے بڑی ہمت سے کام لیتے ہوئے سوال کردیا۔

اس سوال کا جواب جلیس احمد کے پاس نہیں تھا، یا پھر وہ فی الوقت جواب دینا نہیں چاہتا تھا اس لیے وہ چپ رہا اور اپنے ساتھیوں سے کہا کہ وہ اردگرد اچھی طرح سے تلاشی لے۔ شاید انہیں کچھ مل جائے۔ اس کے اہلکار منتشر ہوگئے اور وہ خود بھی گہری نظروں سے دیکھنے لگا۔ دیکھتے دیکھتے جلیس احمد نیچے جھکا اور اس کی نظر سرمد کی گھڑی پر پڑ گئی۔ جلیس احمد نے ہاتھ بڑھا کر وہ گھڑی اٹھالی اور اسے دیکھنے کے بعد اپنی جیب میں رکھ لی۔ ماریہ نے بھی دیکھ لیا تھا کہ جلیس احمد نے کچھ اٹھایا ہے، لیکن وہ یہ نہیں دیکھ سکی تھی اس کے ہاتھ کیا لگا ہے۔

جلیس احمد نے ایک بار پھر چاروں طرف کا جائزہ لے کر ماریہ سے پوچھا۔

''شوہر کے ساتھ آپ کے تعلقات کیسے تھے؟''

''اچھے تھے۔'' ماریہ نے جواب دیا۔

جلیس احمد نے سر ہلایا اور اپنے ایک اہلکار کو بلا کر ماریہ کا بیان لیا۔ اہلکار اس کا بیان لکھ رہا تھا۔ ابھی بیان مکمل ہوا ہی تھا کہ جلیس احمد کو ایک فون موصول ہوا۔ وہ فون اس پولیس اہلکار نے کیا تھا جو سرمد کے تعاقب میں تھا اور اس وقت وہ اس کالونی میں موجود تھا۔

☆☆☆

پولیس کی تیز نظروں نے دیکھ لیا تھا کہ بھاگنے والا اس گھر میں داخل ہوا ہے کیونکہ جب سرمد دیوار پر چڑھا تھا تو اس کا کیچڑ میں لتھڑا پیر کا نشان وہاں دیوار پر لگا ہوا تھا۔ بھاگتے ہوئے سرمد کا پیر کیچڑ میں چلا گیا تھا۔

انسپکٹر جلیس احمد کی وین بھی وہاں پہنچ گئی تھی۔ پیر کا نشان دکھادیا گیا تھا۔ کالونی کے چوکیدار بھی وہاں جمع ہوگئے تھے۔ جلیس احمد کے کہنے پر اس گھر کی بیل دی گئی۔ اندر سے چوکیدار نے ایک رخنے میں سے جھانکا اور پولیس کو دیکھ کر وہ چونکا۔

''گیٹ کھولو... ہمیں گھر کی تلاشی لینی ہے۔ وقت ضائع مت کرو کوئی اس گھر میں داخل ہوا ہے۔'' چوکیدار نے گیٹ کھولنے میں تذبذب کا مظاہرہ کیا۔ کالونی کے چوکیدار نے گیٹ کھولنے کے لیے کہا تو اس نے گیٹ کھول دیا۔

جلیس احمد کی معیت میں پولیس اندر داخل ہوگئی۔ اس وقت تک سرمد اپنے کمرے میں لیپ ٹاپ آن کر چکا تھا، اس نے بہت سے کاغذات کمرے میں بکھیر دیے تھے۔ گرم چائے تیار کر کے مگ بھی اپنے پاس رکھ لیا تھا۔ اس نے سب کچھ ٹھیک کرلیا تھا۔ بس ایک بات تھی۔ اس کی گھڑی وہاں رہ گئی تھی۔ سرمد دیکھ رہا تھا کہ پولیس اس گھر میں داخل ہو چکی تھی۔

گھر کے چوکیدار نے ڈرتے ڈرتے سرمد کے کمرے کا دروازہ بجایا تو تھوڑی دیر کے بعد سرمد نے دروازہ کھولتے ہی غصے سے کہا۔

''میں نے کہا تھا کہ مجھے ڈسٹرب نہ کرنا۔۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے باہر کھڑی پولیس کی طرف دیکھا تو اس کا جملہ ادھورا ہی رہ گیا اور اس نے پوچھا۔ ''کیا ہوا۔۔۔؟ خیریت تو ہے؟''

''مجھے انسپکٹر جلیس احمد کہتے ہیں۔ آپ کو تعارف کرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ میں آپ کو جانتا ہوں، آپ مشہور ڈراما رائٹر سرمد نثار ہیں۔ جائے وقوعہ سے ایک شخص بھاگا تھا اور وہ اس گھر میں داخل ہوا ہے۔ ہم اس گھر کی تلاشی لینا چاہتے ہیں۔''

''ضرور۔۔۔ تلاشی لیں۔'' سرمد نے کہا اور جلیس احمد کے اشارے پر اس کے اہلکار پورے گھر کی تلاشی لینے لگے۔ اس دوران میں جلیس احمد نے سرمد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''آپ نے مجھے پہچانا؟ تقریباً چھ ماہ قبل آپ نے ٹریفک رش میں معمولی سی بات پر میرے بیٹے سے الجھ کر اس کی اچھی خاصی پٹائی کردی تھی اور پھر کچھ ایسے معززین درمیان میں آگئے تھے کہ چاہتے ہوئے بھی میں آپ پر مقدمہ نہیں بنا سکا تھا۔ ورنہ ایک انسپکٹر کا بیٹا ہو اور اس کی پٹائی کرنے والا بچ جائے، یہ کیسے ممکن ہے۔'' جلیس احمد نے لگے ہاتھ ماضی کا ورق پلٹ دیا تھا۔

''اس نے اپنی غلطی سے مار کھائی تھی لیکن مجھے لگتا ہے کہ آپ کے سینے میں وہ زخم ابھی تازہ ہے۔'' سرمد بولا۔

ابھی جلیس احمد کوئی جواب نہیں دے پایا تھا کہ ایک اہلکار نے آکر اطلاع دی کہ کوئی نہیں ملا اور بیس منٹ کے بعد سب ایک جگہ جمع ہوگئے اور سب نے ہی بتایا کہ اس گھر میں کوئی نہیں ہے۔

''مجھے یقین تھا کہ یہاں کوئی نہیں آیا لیکن میں نے کوئی مداخلت نہیں کی تھی۔'' سرمد نے کہا۔

''شواہد ہیں کہ وہ اس گھر میں آیا ہے۔'' جلیس احمد کمرے کی کھڑکی کے پاس چلا گیا اور باہر دیکھنے لگا۔ کھڑکی کے ساتھ ایک طرف اسے تھوڑی سی مٹی لگی دکھائی دی۔ اس نے ہاتھ سے مٹی کو چھوا، مٹی ابھی گیلی تھی۔ سرمد نے کمرے کی اچھی طرح سے صفائی کردی تھی لیکن پھر بھی اس جگہ مٹی لگی رہ گئی تھی۔

''یہ گھر آپ کا ہے؟'' جلیس احمد نے پوچھا۔

''یہ گھر میرا نہیں ہے۔'' سرمد نے جواب دیا۔

جلیس احمد کچھ سوچنے لگا۔ اس نے سوچتے سوچتے سرمد کی طرف دیکھا اور پھر اس کی نظر کمرے سے ملحق باتھ روم کے دروازے پر چلی گئی۔۔۔۔ اس نے اپنے اہلکار سے کہا۔ ''باتھ روم کو دیکھا؟'' یہ کہتے ہی وہ خود باتھ روم کی طرف چلا گیا اور یکدم سے دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔ سرمد نے باتھ روم کو خوب صاف کیا ہوا تھا اور اپنے جوتے بھی اتار کر اس نے اسی شاپر۔۔۔ میں رکھ دیے تھے جس میں اس نے اپنے کپڑے رکھے تھے۔ جلیس احمد واپس سرمد کے پاس کھڑا ہوگیا۔

''شکریہ کہ آپ نے ہمارے ساتھ تعاون کیا۔ شاید کل مجھے آپ کی ضرورت پڑے اس لیے برائے مہربانی میرے بلانے پر آجائیے گا۔''

''میری کیوں ضرورت پڑے گی؟''

''ضرورت پڑ سکتی ہے۔ ایسا کرتے ہیں کہ میں آپ کے پاس آجاؤں گا تاکہ پریس میں کوئی خبر نہ چلی جائے۔'' جلیس احمد کا لہجہ عجیب تھا۔

''ویسے وقوعہ ہوا کیا ہے؟''

''آپ ہی کی فیلڈ کا راشد نامی شخص قتل ہوگیا ہے۔'' جلیس احمد نے بتانے کے بعد سرمد کے چہرے کا جائزہ لیا۔ سرمد سن کر کچھ حیرت زدہ ہوا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔ جلیس احمد نے اپنے اہلکاروں کو چلنے کا اشارہ کردیا۔

☆☆☆

انسپکٹر جلیس احمد جب بھی کسی کیس کو ہاتھ میں لیتا تھا تو وہ اس کی تحقیق و تفتیش میں کوئی کسر نہیں چھوڑتا تھا۔ راشد کو وہ پہلے ہی سے جانتا تھا۔

ماضی کی ان باتوں کے پیش نظر جلیس احمد سوچ رہا تھا کہ راشد ایک سخت مزاج اور سخت دل کا مالک تھا۔ پہلی بیوی کے ساتھ بھی اس کی لڑائیاں رہتی تھیں اور وہ اس پر تشدد بھی کیا کرتا تھا۔ اس شہر میں آکر جبکہ وہ پیسہ بھی کما رہا تھا۔ اس نے ماریہ سے دوسری شادی کی تھی۔ اگر راشد نے اپنی پرانی روش نہیں بدلی تھی تو وہ یقیناً ماریہ پر بھی تشدد کرتا ہوگا اور

ماریہ نے اس سے زچ ہو کر قتل جیسا قبیح قدم تو نہیں اُٹھایا تھا؟ اگر اس نے ایسا کیا تھا تو ماریہ کے ساتھ ضرور کوئی دوسرا بھی ہوگا۔ ماریہ اکیلی راشد کو قتل نہیں کر سکتی۔ جلیس احمد نے سوچا، کہیں سرمد تو ماریہ کے ساتھ نہیں ملا ہوا؟ کیونکہ قاتل کے قدموں کے نشان سرمد کے اس گھر تک جاتے تھے جہاں وہ مقیم تھا۔

جلیس احمد کا تجربہ کہتا تھا کہ جس طرح سے گھر کا سامان بکھرا ہوا تھا اسے دیکھ کر یہی لگتا تھا کہ جیسے الماریوں سے سامان نکال نکال کر باہر پھینکا ہو۔ آنے والے چور ایسا کیا تلاش کر رہے تھے کہ انہیں ایک ایک الماری کا سامان باہر نکالنا پڑا؟

بہت سے سوالات تھے جو جلیس احمد کے دماغ میں گھوم رہے تھے۔ ان تمام سوالوں کا جواب لینے کے لیے اس نے اپنے طور پر تحقیق شروع کر دی تھی۔ راتوں رات اس نے اپنے آدمیوں کے ذریعے سے سرمد، راشد اور ماریہ کے متعلق معلومات جمع کرنی شروع کر دی تھی۔

دوسرے دن وہ خود بھی سادہ لباس میں سرمد کے اس گھر تک گیا تھا جہاں وہ مقیم تھا۔ اس نے دیوار اور دائیں بائیں کا اچھی طرح سے جائزہ لیا۔ اسے شک تھا کہ راشد کو قتل کر کے بھاگنے والا سرمد ہی تھا جو بھاگ کر سیدھا اس گھر میں آ گیا۔ رات اس نے کھڑکی کے پاس گیلی مٹی بھی دیکھی تھی جو جوتے کے ساتھ وہاں لگی تھی۔ وہ اپنے بیٹے کی پٹائی بھی نہیں بھولا تھا، اب وہ حساب بھی چکتا کرنا چاہتا تھا۔ جلیس احمد بہت دیر تک اس جگہ موجود رہا اور کالونی کے چوکیداروں سے پوچھ گچھ بھی کرتا رہا۔

☆☆☆

دوپہر کے بعد انسپکٹر جلیس احمد کے سامنے ماریہ اور سرمد براجمان تھے۔ وہ راشد کے گھر میں تھے۔ اس کمرے کے باہر چند پولیس والے کھڑے تھے۔ ماریہ نے اپنا سر اور ماتھا اسکارف سے لپیٹا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ اداس تھا۔ جلیس احمد نے ان دونوں کو ایک جگہ جمع کرنے میں رازداری سے کام لیا تھا۔ وہ چاہتا تو سرمد کو بدنام کرنے کے لیے کچھ بھی کر دیتا لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ سرمد کے ساتھ ایک بڑا میڈیا گروپ بھی ہے جس کے کامیاب ترین تفریحی چینل کے لیے وہ لکھتا ہے۔ جلیس احمد اس پر ٹھوس ثبوت کے ساتھ ہاتھ ڈالنا چاہتا تھا۔

''مجھے جلیس احمد کہتے ہیں۔ میرے بارے میں مشہور ہے کہ میں کیس کے ساتھ چمٹ جاتا ہوں اور میری تحقیق اتنی تیز رفتار ہوتی ہے کہ جب دوسرا پولیس والا ابھی کاغذی کام میں مصروف ہوتا ہے تو میں اس سے کہیں زیادہ آگے نکل چکا ہوتا ہوں۔ میں نے مختصر سے وقت میں تم دونوں کے بارے میں بہت سی معلومات اکٹھی کر لی ہیں کہ تم بھی حیران رہ جاؤ گے۔'' جلیس احمد نے کہا۔

سرمد نے اپنی گھڑی میں وقت دیکھا اور بولا۔ ''میری ایک اہم میٹنگ ہے آپ کو جو بات کرنی ہے، وہ ذرا جلدی کر لیجیے گا۔''

جلیس احمد کے چہرے پر سرمد کی بے پروائی دیکھ کر ایک رنگ آیا اور معدوم ہو گیا۔ اس نے ماریہ سے سوال کیا۔ ''راشد آپ کا شوہر تھا۔ اس کی لاش کو اس کے وارث اپنے آبائی شہر لے گئے ہیں آپ اس کی تدفین کے لیے کیوں نہیں گئیں؟''

''ہماری شادی راشد کے خاندان کی مرضی کے بغیر ہوئی تھی۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ میرے وہاں جانے سے کوئی مسئلہ کھڑا ہو۔'' ماریہ کا جواب سن کر سرمد نے دل ہی دل میں اسے داد دی۔

''راشد اپنی پہلی بیوی کو قتل کر چکا تھا؟''

''ان پر یہ الزام تھا۔'' ماریہ نے جلدی سے کہا۔

جلیس احمد اپنی ٹھوڑی کھجانے لگا کیونکہ وہ اس الزام کو ثابت نہیں کر سکا تھا۔ وہ بولا۔ ''راشد پر پہلی بیوی کے قتل کا الزام تھا۔ وہ اپنی پہلی بیوی پر تشدد بھی کرتا تھا۔ وہ عجیب جنونی اور نفسیاتی مریض تھا، آپ کے ساتھ بھی اس کا رویہ پُرتشدد ہی تھا؟''

''ہماری شادی کو ابھی دن ہی کتنے ہوئے تھے کہ وہ مجھ پر تشدد شروع کر دیتا۔'' ماریہ کا لہجہ پُراعتماد تھا۔ جلیس احمد لاجواب سا ہو گیا۔

''منگنی تو آپ نے سرمد نثار سے کی تھی پھر شادی راشد سے کیسے ہو گئی؟'' جلیس احمد نے اگلا سوال کر دیا۔

''اس سوال کا جواب آپ ان سے لیں۔'' ماریہ نے جواب دینے کے بجائے سرمد کی طرف دیکھے بغیر اس کی طرف اشارہ کر دیا۔

''ان سے کیوں؟''

''کیونکہ میں نے اچانک منگنی ختم کر دی تھی۔ یہ جس سے چاہتی شادی کرتی۔'' سرمد نے بلاتامل جواب دیا۔

''آپ نے کیوں اچانک منگنی ختم کر دی تھی؟''

''میری مرضی... مجھے اس سے بہتر مل گئی اور میں نے اسے چھوڑ دیا۔ شوبز میں ایسا ہوتا رہتا ہے۔'' سرمد نے کہا۔

''یہ جھوٹ ہے۔ تم دونوں جلدی شادی کرنا چاہتے تھے

WWW.PAKSOCIETY.COM ONLINE LIBRARY PAKSOCIETY1 f PAKSOCIETY
RSPK.PAKSOCIETY.COM FOR PAKISTAN

لیکن ایسا بیچ میں کیا ہوا کہ اس کی شادی راشد سے ہوگئی اور راشد کو جان کی قیمت ادا کرنی پڑی؟'' جلیس احمد کا لہجہ تیز ہوگیا۔

''یہ آپ کا خیال ہے۔'' سرمد کے انداز میں ابھی تک بے پروائی تھی۔

''سچ یہ ہے کہ راشد اپنی اس بیوی پر بھی تشدد کرتا تھا۔ جو آپ سے ناقابلِ برداشت تھا اور تم دونوں نے مل کر راشد کو قتل کر دیا۔''

''میں ایک رائٹر ہوں، خونی نہیں ہوں۔''

''آپ خونی بن چکے ہیں۔ اس گھر میں آپ کی یہ گھڑی کیا کر رہی تھی؟'' جلیس احمد نے اچانک اس کی گھڑی نکال کر سرمد کے سامنے رکھ دی۔

''راشد میرا دوست بھی تھا اور اس کے ساتھ میں نے کام بھی کیا ہے۔ اسے کسی شادی پر جانا تھا اور چار دن پہلے اس نے مجھ سے گھڑی مانگی تھی۔'' سرمد کے چہرے پر کوئی گھبراہٹ نہیں تھی۔

''آپ کی محبوبہ کو وہ لے اُڑا اور آپ شادی پر جانے کے لیے اسے اپنی گھڑی دے رہے ہیں؟'' جلیس احمد کی مسکراہٹ میں تمسخر تھا۔

''پلیز انسپکٹر صاحب آپ سوچ سمجھ کر بات کریں۔ اگر ایسی ہی بات کرنی ہے تو میں جا رہا ہوں اور میرا وکیل آپ سے بات کرے گا۔''

''وکیل تو آپ کو کرنا ہی پڑے گا کیونکہ آپ نے راشد کو قتل کیا اور سیدھے اس گھر کی جانب بھاگے۔ چوکیدار کی نظر پڑی اور پولیس آپ کے پیچھے لگ گئی لیکن آپ اپنے اس گھر میں داخل ہونے میں کامیاب ہوگئے۔'' جلیس احمد بولا۔

سرمد نے اس کی طرف دیکھ کر مسکراہٹ عیاں کی اور بولا۔ ''آپ تو مجھ سے بھی اچھا لکھ سکتے ہیں۔ کیوں نہ ہم مل کر ایک سیریل لکھیں۔''

''میں مذاق کے موڈ میں نہیں ہوں سرمد صاحب۔ آپ کے اس گھر میں جانے کے ثبوت ہیں۔''

''تو پھر وہ ثبوت آپ عدالت میں پیش کر دیں اور مجھے گرفتار کر لیں۔'' سرمد کہہ کر کھڑا ہوگیا۔ ''مجھے آپ سے جتنا تعاون کرنا تھا میں نے کر لیا۔ اب آپ کو کوئی مسئلہ ہو تو میرا وکیل آپ سے بات کرے گا۔'' سرمد جانے لگا تو ایک اہلکار جلدی سے ہاتھ میں ایک شاپر پکڑے اندر آیا اور جلیس احمد کے کان میں کچھ بتانے لگا۔ سرمد نے وہ شاپر بیگ دیکھ لیا تھا۔ اسے حیرت ہوئی تھی لیکن اس نے اپنے چہرے سے کچھ ظاہر نہیں کیا تھا۔ سرمد جانے کے لیے بڑھا تو جلیس احمد نے اسے روک لیا۔

''ایک سنٹ سرمد نثار صاحب۔ آپ سے معذرت کہ آپ کی یہاں موجودگی پر میرے دو آدمی آپ کے اس گھر کی تلاشی لیتے رہے اور وہاں سے یہ شاپر.... اُٹھا لائے ہیں۔'' جلیس احمد کے چہرے پر خفیف مسکراہٹ تھی اور سرمد کے چہرے پر کچھ تاثرات عیاں ہو کر معدوم ہوگئے۔

''واردات کی رات جو کپڑے آپ نے پہنے تھے وہ اس شاپر.... میں ہیں۔'' وہ مسکرایا۔ کچھ توقف کے بعد جلیس احمد نے سرمد کے سامنے کھڑے ہو کر کہا۔ ''میں کسی کام کو ادھورا نہیں چھوڑتا۔ اب آپ خود ہی بتا دیں کہ یہ سارا کھیل کیسے کھیلا گیا تھا۔ آپ کی خاموشی کا اب کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اس شاپر...... کے اندر آپ کے وہ کپڑے ہیں جو آپ نے پہن کر راشد کو قتل کیا تھا اور اپنے گھر جاتے ہی سب سے پہلے ان کپڑوں کو بدلا تھا۔ اندر وہ دستانے بھی ہیں جو آپ نے چڑھائے ہوئے تھے۔ اب بتانا ہی پڑے گا کہ کیوں قتل کیا تھا تم نے راشد کو؟'' جلیس احمد کا لہجہ کرخت ہوگیا۔ ''ابھی پریس والوں کو بلاتا ہوں اور آپ کا نیا روپ سب کے سامنے دکھاتا ہوں۔''

ماریہ مطمئن اور منہ دوسری طرف کیے بیٹھی تھی لیکن وہ اندر سے بری طرح سے گھبرا گئی تھی۔ اس کی سانس تیز ہوگئی تھی اور اسے لگ رہا تھا کہ وہ اب پکڑے گئے ہیں۔ جیل اب ان کا مقدر ہوگی اور وہ کبھی ایک نہیں ہوسکیں گے۔

سرمد پُراعتماد لہجے میں بولا۔ ''اس شاپر میں بھری ہوئی ردی نکال کر پھینک دیں میں بساط کا مہرہ نہیں ہوں کہ آپ مجھے گھیر کر مات کر دیں گے۔ ایسے ہوا میں تیر چلانے کے بجائے اپنی تفتیش کا رخ بدلیں اور راشد کا جو قاتل ہے اسے گرفتار کریں۔ اس سے آپ کا اور میرا وقت بچ جائے گا۔'' سرمد نے کہہ کر جلیس احمد کا کندھا تھپتھپایا اور اس جگہ سے چلا گیا۔ ماریہ حیران تھی کہ جاتے ہوئے سرمد کو جلیس احمد نے روکا کیوں نہیں؟

سرمد کے جانے کے بعد جلیس احمد نے صوفے پر گرنے کے انداز میں بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''ہمارا اندازہ غلط تھا۔ اگر سرمد نے قتل کیا ہوتا تو وہ اس شاپر کو دیکھ کر گھبرا جاتا اور کچھ نہ کچھ بول دیتا اور ہمارا کام آسان ہو جاتا۔ کیونکہ عادی مجرم کے علاوہ باقی مجرم کسی بھی بات پر گھبرا کر سچ اُگل ہی دیتے ہیں، میری یہ چال ناکام ہوگئی ہے اُٹھا کر پھینک دو اس شاپر کو۔'' جلیس احمد کی بات سن کر ماریہ نے سکھ کی سانس

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں؟ ۔

- ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ہر ای بُک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابنِ صفی کی مکمل رینج
- ایڈ فری لنکس، لنکس کو پیسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

- ہر ای بُک کا ڈائریکٹ اور رژیوم ایبل لنک
- ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بُک کا پرنٹ پریویو ہر پوسٹ کے ساتھ
- پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- مشہور مصنفین کی کُتب کی مکمل رینج
- ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

Online Library For Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety

twitter.com/paksociety1

لی۔ جبکہ سرمد اپنی کار کو اسٹارٹ کرتے ہوئے بول رہا تھا۔

''جلیس احمد جس اسکول میں تم ٹیچر ہو وہاں میں ہیڈ ماسٹر ہوں۔ تمہارے جاتے ہی میں نے اپنے کپڑوں کو جلا کر اس کی راکھ فلش میں بہا دی تھی اور جوتے دھلے اور پالش کیے اس وقت میرے پیروں میں ہیں۔''

☆☆☆

چھ ماہ گزر گئے تھے۔

ماریہ پھر سے انجم کے پاس چلی گئی تھی کیونکہ راشد کی موت کے ساتھ ہی سب کچھ ٹھیک ہو گیا تھا۔ ان چھ ماہ میں سرمد نے ایک بھی ملاقات ماریہ سے نہیں کی تھی۔ پھر ماریہ ایک دن سرمد کے کہنے پر اس کے گاؤں چلی گئی اور... اس سے بھی پہلے سرمد اپنی کار میں گاؤں پہنچ چکا تھا۔

سرمد نے اپنے گاؤں کے لاری اڈے سے ماریہ کو لیا اور اپنی حویلی میں لے گیا۔ سب ماریہ سے مل کر خوش ہوئے اور تیسرے دن دونوں کا نکاح ہو گیا۔ جب نکاح کے بعد سرمد اپنی دلہن کے پاس جانے والا تھا تو سرمد کے بھائی نے بتایا کہ کوئی اس سے ملنے آیا ہے۔

سرمد کو حیرت ہوئی اور وہ اس سے ملنے مہمان خانے میں چلا گیا۔ تب وہ حیران رہ گیا جب اس نے اپنے مہمان خانے میں انسپکٹر جلیس احمد کو دیکھا۔

''آپ مجھے اچانک دیکھ کر حیران تو ہوئے ہوں گے۔ چھ ماہ سے آپ دونوں کی نگرانی کر رہا ہوں۔ داد دیتا ہوں آپ کو کہ آپ چھ ماہ سے ایک بار بھی ماریہ بی بی سے نہیں ملے۔ اور پھر اچانک انہیں گاؤں بھیج کر اب شادی کر لی۔''

''انسان کا کبھی بھی دل بدل سکتا ہے۔ کل جس کو چھوڑ دیتا ہے وقت آنے پر اسے اپنا بھی لیتا ہے۔ اس میں ایسی کیا بات ہے؟'' سرمد نے کہا۔

''آپ رائٹر ہو اور میں باتوں میں آپ سے جیت نہیں سکتا۔ ایک سوال کا جواب چاہتا ہوں۔ یہ بات میرے تجربے میں ہے کہ پہلا جرم کرنے کے بعد گھبراہٹ اور خوف ان کے چہرے پر بسیرا کر لیتا ہے۔ وہ چھوٹی چھوٹی بات پر خوف سے کچھ ایسا کہہ جاتے ہیں کہ وہ پکڑے جاتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ راشد کا قتل تم نے ہی کیا تھا۔ جائے وقوعہ پر گھڑی ملی تو تم نہیں گھبرائے، میں نے تمہارے سامنے شاپر.... رکھا تو تم گھبرائے کیوں نہیں؟ اعتماد کا پہاڑ اپنے چہرے پر سجائے کیسے کھڑے رہے؟''

''آپ کو یہ یقین کیوں ہے کہ میں نے ہی راشد کا قتل کیا ''سرمد اور ماریہ کی محبت اور پھر راشد کا ماریہ کو دھوکے سے اپنے گھر میں لے جا کر زبردستی اس سے شادی کرنا اور تم دونوں کا ایک ہونے کے لیے اسے قتل کرنا... بہت کچھ جاننے کی کوشش کی ہے میں نے۔ یہ حقیقت تمہارے گھر والوں کو بتا دوں تو وہ شاید اس حقیقت کو ہضم نہ کر سکیں کہ ماریہ بی بی کی پہلے بھی شادی ہو چکی ہے۔'' جلیس احمد بولا۔

''ایک بات کہوں۔ آپ کو اس سے کوئی سروکار نہیں ہے کہ راشد کو قتل کس نے کیا ہے۔ دراصل آپ اپنے بیٹے کی پٹائی کا مجھ سے حساب چکتا کرنا چاہتے ہیں اور وہ زخم آپ کو چین سے بیٹھنے نہیں دے رہا ہے۔'' سرمد کی بات سن کر جلیس احمد نے اپنے چہرے پر عجیب سی مسکراہٹ سجائی جیسے وہ یہ کہہ رہا ہو کہ تم حقیقت تک پہنچ ہی گئے ہو۔

سرمد نے جلیس احمد کے قریب کھڑے ہو کر اپنے ایک ملازم کو آواز دی۔ ایک ہٹا کٹا ملازم اندر آیا تو سرمد نے کہا۔

''یہ پولیس والا ہے۔ ایک بار میں نے اس کے بیٹے کو پیٹا تھا۔ اس کا زخم سینے پر لیے پھر رہا ہے۔ اس کے ساتھ کوئی اور بھی آیا ہے؟''

''جی ان کا ڈرائیور ہے۔ وہ بھی پولیس والا ہی لگتا ہے۔'' ملازم نے جواب دیا۔

''ایسا کرو کہ اس کا گلا کاٹ کر اس کی کار کی ڈکی میں ڈال دو اور پولیس کو بلا لو۔ آگے کیا کرنا ہے میں بتا دوں گا۔''

ملازم سنتے ہی باہر کی طرف بھاگا۔ جلیس احمد حواس باختہ ہو گیا۔ ''ارے یہ کیا... اسے روکو...'' جلیس احمد کہتا ہوا باہر کی طرف بھاگا۔ ڈرائیور کار کے اندر بیٹھا تھا۔ وہ ملازم اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ کار کی طرف بڑھ رہا تھا۔ جلیس احمد کار کے اندر بیٹھا اور عجلت سے بولا۔

''نکلو یہاں سے جلدی کرو۔''

کار اسٹارٹ ہوئی اور وہاں سے نکل گئی۔ آگے جا کر جلیس احمد نے گھبرائے ہوئے انداز میں پیچھے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''جو کھاتا بند ہو جائے، اسے دوبارہ نہیں کھولنا چاہیے، دل کی خلش کا کھاتا تو بالکل بھی نہیں کھولنا چاہیے۔ بھاڑ میں گیا راشد، اس نے اپنی معصوم بیوی کا قتل کیا تھا، اس کی سزا اسے مل گئی ہے۔ ضروری نہیں کہ سامنے والا آنکھیں نکالنے سے ڈر جائے، ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ سامنے والا اس سے بھی بڑی اور سرخ آنکھیں رکھتا ہو۔''

ڈرائیور کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، وہ کبھی جلیس احمد کا منہ دیکھتا اور کبھی سامنے دیکھنے لگ جاتا۔